رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :۔ ١٢ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

۱۱۳
جلد ۱۱۳ ماہ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آیندہ مہینہ یو۔پی کی مجلس مقننہ کا انتخاب ہے، گزشتہ ۲۶ سال کی انتخابی مہم کی طرح اس مرتبہ بھی اردو کی حمایت میں حکومت کی طرف سے تقریریں ہو رہی ہیں، اردو بولنے والے ان تقریروں کی نوعیت سے اب اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں،

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حکومت کی انتخابی مہم کی کامیابی کے بعد اردو بولنے والے اس کے آستانے پر پہنچتے ہیں تو ان کی زبان حال کہتی ہے

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر　　　یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

اس میں شک نہیں کہ اردو کے معاملہ میں کانگریسی حکومتوں کے رویے میں پہلی جیسی سختی اور بے توجہی نہیں رہی، مرکزی حکومت کی طرف سے غالب کا صد سالہ جشن دھوم دھام سے منایا گیا، دہلی میں غالب ہال بھی تعمیر ہوا، تقسیم ہند کے بعد اقبال کی نظموں کو نصاب کی کتابوں میں شامل کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا، لیکن اب مرکزی حکومت کی طرف سے اقبال کا بھی صد سالہ جشن منایا جانے والا ہے، ان پر جا بجا سیمینار بھی ہو رہے ہیں، مقالے بھی پڑھے جا رہے ہیں، ان کی تحریروں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمایش بھی منعقد کی جا رہی ہے، اب وہ پاکستان ہی کے نہیں بلکہ ہماری مادرِ وطن کے بھی دوست شاعر تسلیم کیے جا رہے ہیں، دہلی میں اردو بورڈ، لکھنؤ اور پٹنہ دونوں جگہوں پر اردو اکیڈمی بھی قائم کر دی گئی ہے، اردو کے بعض اداروں کو کبھی کبھی مالی امداد سے بھی نوازے جاتے ہیں، اردو کے فروغ کے لیے تجویزیں بھی مرتب ہو رہی ہیں،

[پر]ائمری اسکولوں میں اردو کے اساتذہ بھی مقرر کیے جا رہے ہیں، عدالتوں میں اردو میں درخواست دینے کا حکم بھی
[ج]اری کر دیا گیا ہے، کیا اردو بولنے والے ان باتوں سے مطمئن ہو گئے ہیں؟ حکومت تو یہی کہے گی کہ انکو مطمئن ہو جانا چاہیئے۔
کانگریسی حکومتیں گاندھی جی کے اصولوں پر چلنے کا دعویٰ کرتی ہیں، دار المصنفین کے سابق صدر ڈاکٹر سید محمود مرحوم
کی روایت ہے کہ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی جا بجا کمیٹیاں قائم کیں تاکہ جنگ آزادی میں وہ
مسلمانوں کو ہندوؤں سے قریب تر کریں، اس کے لیے انھوں نے ملک کا دورہ کیا، انکی ان کوششوں کی داد ہر طرف
سے ملی جس سے بقول ان کے ان کا نفس بھی موٹا ہو گیا جب انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا حال گاندھی جی کو لکھا تو
ان سے داد پانے کے بجائے جواب ملا کہ جب تمھاری تنظیم میں بڑی تعداد میں ہول ٹائم ورکر پیدا ہو جائیں اور وہ ایسا
کام انجام دیں جس کا اعتراف مسلمان عوام کسی دباؤ کے بغیر خود کریں اور دل سے سمجھیں کہ ان کیلئے واقعی کوئی مفید کام
انجام پا رہا ہے تو پھر تم صحیح معنوں میں مبارکباد کے مستحق ہو سکتے ہو۔

گاندھی جی کے اصول کے مطابق کانگریسی حکومتیں داد کی مستحق اسی وقت ہو سکتی ہیں جب انکے تمام سرکاری
ملازمین بھی اردو سے بناوٹی نہیں بلکہ سچی ہمدردی رکھیں اور اردو سے متعلق تمام احکام کی پابندی ایمانداری سے
کرائیں جس کے بعد اردو بولنے والے کسی دباؤ کے بغیر دل سے سمجھیں کہ اردو کیلئے انکی مرضی کے مطابق مفید کام انجام پا رہا ہے"
اردو مصنفوں کے انعام پانے، اردو لغت کی ترتیب دلانے، یا بلند پایہ کتابوں کے ترجمے کرانے یا اردو کے مشہور شعراء
کا صد سالہ جشن منانے کی خبریں سنکر اردو بولنے والے اپنی اشک شوئی تو کر لیتے ہیں لیکن وہ ذہنی اور جذباتی طور پر
مطمئن نہیں ہوتے، سکندر نے پورس سے پوچھا تھا کہ تم کس قسم کا سلوک چاہتے ہو شکست خوردہ پورس نے جواب دیا
تھا کہ وہی سلوک جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے، ہندی کے آگے اردو نے اپنا سپر ڈال دیا ہے، اور اردو
بولنے والے ہندی کو اپنی قومی زبان سمجھکر اسکے سیکھنے میں سرگرم ہیں، پھر بھی وہ اپنی مادری زبان کے ساتھ وہی حسن سلوک
چاہتے ہیں جو ہندوستان کے اور شہریوں کی مادری زبانوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اردو بولنے والے پورس ہی سہی مگر
ملک کے سکندر سے وہ زبانی دلجوئی کے بجائے عملی فراخدلی اور بلند نگاہی اور ادا ہی چاہتے ہیں، کیونکہ ملک کی حکومت

کہ یہاں کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز بنانے کا بار ان ہی کے سر ہے۔ ع

چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمایش ہے

اردو کے بہی خواہوں کو اگر اپنی مادری زبان سے واقعی محبت ہے تو ان کو بھی وقتی تسلیوں یا کسی اور قسم کی بیساکھیوں کا سہارا لینا ہوگا، انکی زبان، انکی خود شکستگی، بیچارگی، حکومت کی بے توجہی کی شکوہ سنجی اور نوحہ خوانی سے زندہ نہیں رہ سکتی ہے بلکہ اس کے لیے ان کو خود اعتمادی، خود شناسی، ہوشمندی، تعمیری چارہ جوئی اور ایثار پسندی سے کام لینا ہوگا، ورنہ ان کو اس کیلئے اسی طرح رونا ہوگا جس طرح ہندستان کی فارسی بولنے والی نسلیں فارسی کے لیے رو چکی ہیں، مگر اردو اور فارسی میں فرق یہ ہے کہ اردو ہندستانی نژاد ہے، یہیں وہ پیدا ہوئی اور نشو ونما پاتی رہی، اور یہیں اسکو زندہ رہنے کا حق ہے، جمہوریت میں حق کی بھیک نہیں ملتی، بلکہ حق ایثار پسندانہ اور مدبرانہ کارگذاریوں سے منوایا جاتا ہے، اسلیے خود اردو کے پرستاروں کو اپنی آزمایش کا سامنا ہے، یہ زبان نہ صرف حکومت بلکہ ان سے بھی کہہ رہی ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

اسی مہینہ مولانا شبلی ندوی کی وفات تقریباً نوے ۹۰ سال کی عمر میں لکھنؤ میں ہوگئی، وہ اپنی زندگی میں سب سے پرانے ندوی کی حیثیت سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، شروع ہی سے بڑے خاکسار، متواضع اور ایثار پسند رہے، علامہ شبلی نعمانی کے محبوب اور معتمد شاگردوں میں تھے، وہ انکو متکلم شبلی کہا کرتے تھے، اپنے بستر مرگ پر انکو نصیحت کی تھی کہ جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو، ان ہی کی خواہش سے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں مدرس ہوئے، اسکی خدمت میں پوری زندگی گذار دی، وہاں کے اختلافات کی وجہ سے کچھ دنوں اس سے علحدہ رہے لیکن پھر وہاں آگئے تھے، انکی تمنا تھی کہ اسی احاطہ میں دم توڑیں، لیکن آخر زندگی میں بعض اسباب سے انکو پھر اس سے الگ ہونا پڑا، انکی مٹی انکو لکھنؤ لے گئی، کلام و معقولات کے بڑے لائق و فاضل مدرس تھے، دار المصنفین سے بھی انکو بڑی محبت رہی، بڑے خوش نصیب باپ تھے، انکی اولاد ہند و بیرون ہند میں اچھے اچھے عہدوں پر مامور ہے، مگر وہ اپنی اصلی اولاد مدرسۃ الاصلاح ہی کو سمجھتے رہے، اپنے لڑکوں کے گھروں کی راحت و آسایش کو یہاں کی تنگی اور سادہ زندگی پر قربان کرتے رہے، اللہ تبارک و تعالیٰ انکو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں۔ آمین

مقالات

امام نووی کی شرح مسلم پر ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

امام محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ) جامع کمالات اور کثیر التصانیف محدث تھے، ان کی اکثر تصنیفات کو بڑا قبول و اعتبار حاصل ہوا، ان کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب شرح مسلم ہے، اس کا اصل نام المنہاج الشرح صحیح مسلم ہے، صحیح مسلم کی بکثرت شرحیں لکھی گئیں ان میں بعض بہت بلند پایہ اور بڑی اہم ہیں جن سے خود امام نووی نے اپنی شرح میں بڑی مدد لی ہے مگر متقدمین و متاخرین کی کوئی شرح بھی شہرت و مقبولیت اور اعتبار و استناد کے لحاظ سے نووی کی شرح کو نہیں پہونچ سکی،

یہ شرح امام نووی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے ان کو لازوال شہرت اور محدثین و شراحِ حدیث میں غیر معمولی امتیاز و تفوق بخشا، وہ شوافع شراحِ حدیث میں عدیم المثال خیال کئے جاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں" علمائے شافعیہ میں امام نووی محی السنۃ بغوی اور ابو سلیمان خطابی نہایت قابلِ اعتماد ہیں، انکا قول نہایت محکم اور ان کی بحثیں نہایت پُر مغز

ہوتی ہیں[1]

یہ شرح نہ زیادہ مفصل و مطول ہے اور نہ بہت مختصر و مجمل بلکہ متوسط و جامع شرح ہے اور بیشمار کتب کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، اس میں مصنف نے متعدد علوم و فنون کی سینکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے چنانچہ حدیث، اصول و شروح حدیث کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، کلام و عقائد، تفسیر و تاریخ، سیر و تراجم، رجال و انساب، لغت و ادب، معانی و بیان، صرف و نحو، قرأت و تجوید اور اعراب و امالی وغیرہ سے متعلق کتابوں کے جابجا حوالے ملتے ہیں۔

اس شرح کے بعض خلاصے بھی لکھے گئے ہیں، یہ شرح کئی بار مصر اور ہندوستان کے مختلف مطبعوں سے شائع ہوئی ہے، ۱۹۲۹ء میں مطبعۂ مصریہ ازہر نے اس کا ایک عمدہ اور نفیس ایڈیشن کئی جلدوں میں شائع کیا تھا، اس مضمون میں اسی ایڈیشن کی ابتدائی جلدوں کی مدد سے اس کے متعلق بعض معلومات بیان کئے گئے ہیں۔

صحیح مسلم کی طرح نووی کی شرح کا مقدمہ بھی بڑا اہم اور مفید فنی معلومات پر مشتمل ہے، اس سے اصل کتاب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، یہ کئی فصلوں میں منقسم ہے، اس میں علامہ نوویؒ نے امام مسلمؒ تک اپنا سلسلۂ اسناد بیان کیا ہے، اور اپنے اور ان کے درمیان کے چھ شیوخ اور امام مسلم کے مختصر حالات و کمالات قلمبند کئے ہیں، اس کے بعد اس زمانہ کے صحیح مسلم کے مروج و متداول نسخوں کے متعلق ضروری معلومات ہیں، پھر صحیحین کی خصوصیات، ان کے درمیان وجوہ ترجیح اور صحیح مسلم کے خصائص و امتیازات، شرائط و اصول اور اس کی تعلیقات و منقطع روایتوں

---

[1] عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ،

کا ذکر ہے، ایک فصل میں ان حدیثوں کی حیثیت و نوعیت بیان کی گئی ہے، جن کے متعلق امام مسلم نے صحت کا حکم لگایا ہے، پھر صحیح مسلم کی حدیثوں کی تعداد، اس کے حسنِ ترتیب و تبویب، امام مسلم کی تالیف و تصنیف میں غیر معمولی احتیاط ان کی دقتِ نظر، شانِ تحقیق، کثرتِ علم و وسعتِ نظر اور معرفت بالحدیث وغیرہ کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، اس کے بعد اس پر اعتراضات و استدراکات اور ان کے جواب کا ذکر اور صحیح مسلم کی تخریج و استدراک میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر اصول حدیث کے فنی مباحث و مصطلحات وغیرہ پر محققانہ بحث و کلام ہے، اس مقدمہ میں امام نووی نے اپنی شرح کی جو خصوصیات خود بیان کی ہیں پہلے ان کو نقل کیا جاتا ہے،

۱۔ اس کی ایک اہم خصوصیت تحریر و تصنیف کی خوبی و دلکشی، عبارت و بیان کی سلاست و روانی و اعتدال و توسط بتائی ہے، وہ بلند پایہ مصنف تھے اسلئے ان کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ شرح بھی حسنِ تحریر اور سلیقۂ تصنیف کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور ممتاز خیال کیجاتی ہے، اور اطناب و تکرار اور حشو و زوائد سے خالی اور جامع و پُر مغز ہے، پڑھنے والے کو نہ کوئی دشواری اور الجھاؤ نظر آتا ہے اور نہ وہ گھبراہٹ اور انتشار میں مبتلا ہوتا ہے، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :-

"اگر لوگوں کی پست ہمتی، علم سے بے رغبتی اور طوالت سے گھبراہٹ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس شرح میں زیادہ بسط و تفصیل سے کام لیتا" اور اس کی ضخامت سو جلدوں سے بھی متجاوز ہو جاتی، اس کے باوجود اس میں تکرار اور مملِ اطناب کا عیب نہ پایا جاتا، کیونکہ رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم افصح البیان تھے، آپ کا کلام گوناگوں حقائق ومعارف سے معمور ہے، اس لئے اس کی شرح و توضیح کا حق تفصیل ہی سے ادا ہو سکتا تھا مگر میں نے اعتدال و توسط سے کام لیا ہے اور اکثر موقعوں پر طوالت کے مقابلہ میں اختصار کو ترجیح دی ہے......... دلائل کی جانب محض سرسری اشارات کئے گئے ہیں، البتہ جہاں ناگزیر تھا وہاں بسط و تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن اختصار کے باوجود عبارت میں کوئی ابہام اور الجھاؤ نہیں ہے اور وہ سلیس اور رواں ہے،، (مقدمہ نووی ص ۵)

۲۔ اس کی دوسری خصوصیت جامعیت ہے یعنی حدیثوں کی شرح و وضاحت کے سلسلہ میں گوناگوں خفی نکات، متنوع مطالب وحقائق، مختلف احکام وآداب اور مفید مسائل ومباحث بیان کئے گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"انشاء اللہ یہ حدیث کے علوم ان کے اصول و فروع کے احکام وآداب اور شریعت کے قواعد وضوابط کی جامع ہوگی،، (ایضاً)

احادیث کے مشکل الفاظ ولغات کی توضیح اور رواۃ ورجال کی تحقیق میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا گیا ہے اور اس میں فقہ واحکام اور اسانید ومتون حدیث کے متعلق مفید اور بیش قیمت معلومات کا وسیع ذخیرہ ہے،

۳۔ جو حدیثیں بظاہر مختلف ومتضاد معلوم ہوتی ہیں، اُن میں جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ حدیثوں میں اشکال و تعارض انہی لوگوں کو نظر آتا ہے جنکو حدیث و فقہ میں زیادہ بصیرت نہیں ہوتی۔

۴۔ حدیث سے مستنبط ہونے والے عملی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں۔

آگے ان خصوصیات کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جائیگا اور بعض مزید خصوصیات بھی بیان کیجائیں گی، اس سے پہلے وہ دلچسپ بحث قابل ذکر ہے جو امام نووی نے صحیحین کے تقابل کے متعلق لکھی ہے۔

صحیحین میں تقابل | امام بخاریؒ کی عظمت اور ان کی صحیح کی تمام کتب حدیث میں اہمیت و برتری مسلم ہے۔ امام نووی کو بھی اس کا اعتراف ہے اور انھوں نے جابجا صحیح بخاری کے افضل و برتر ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کے نزدیک بعض مغاربہ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ صحیح مسلم حدیث کی سب سے بہتر اور صحیح کتاب ہے، اس کے باوجود انھوں نے اس کی بعض ایسی خصوصیات بیان کی ہیں جن سے اس کو صحیح بخاری پر بھی امتیاز حاصل ہوجاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"صحیح مسلم کی بعض منفرد اور امتیازی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً سہل اور آسان ہونے کی وجہ سے استفادہ میں سہولت، امام مسلمؒ ہر حدیث کو اس کے مناسب موقع و محل اور موزوں جگہ پر بیان کرتے ہیں اور اس کے تمام مختار طرق، متعدد سندیں اور مختلف الفاظ وغیرہ بھی تحریر کردیتے ہیں، اس سے طالبین فن کیلئے اس کے تمام وجوہ پر نظر کرنا اور استفادہ سہل ہوگیا ہے، اس کے برخلاف امام بخاریؒ مختلف وجوہ و طرق کو جدا جدا ابواب میں بیان کرتے ہیں اور اکثر حدیثیں ایسے ابواب میں لاتے ہیں جن کی طرف ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، گو اس سے ان کے پیش نظر ایک خاص غرض و حکمت ہوتی ہے مگر طلبۂ حدیث کے لئے اس کے جملہ طرق کو جمع کرنا دشوار ہوتا ہے اسی بنا پر متاخرین محدثین کی ایک جماعت کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے صحیح بخاری کی بعض حدیثوں کے بارہ میں یہ فیصلہ کردیا ہے

وہ اس میں نہیں ہیں حالانکہ موجود ہوتی ہیں'' (مقدمہ ص ۱۴، ۱۵)

صحیح بخاری کے مقابلہ میں صحیح مسلم کی ایک اور جگہ خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''کوئی شخص بھی علم الاسناد کی ان دقیق اور عمدہ باتوں میں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، امام مسلم کا شریک وسہیم نہیں ہے، اگرچہ امام بخاریؒ کی کتاب ان سے زیادہ صحیح، جلیل القدر، اور احکام و معانی کے بیشمار فوائد پر مشتمل ہے، تاہم امام مسلم کی کتاب میں صنعت اسناد کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو صحیح بخاریؒ سے بھی نمایاں اور ممتاز کرتی ہیں۔'' (ص ۱۵،)

امام نووی کی شرح حدیث کا طریقہ امام نووی کا طریقہ بحث اور روایات و احادیث کی تشریح و وضاحت کا انداز یہ ہے کہ پہلے وہ ہر بحث سے متعلق تمام روایتوں کے مختلف وجوہ و طرق بیان کر کے ان کے فرق اور متن کے اختلاف کی تصریح کرتے ہیں۔ پھر ان کے اسناد و رُوات پر گفتگو میں مشکل ناموں کو ضبط اور سب کے مختصر حالات و تراجم اور ان کی ثقاہت و عدم ثقاہت اور علم حدیث میں اہمیت وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد اصل متن پر مفصل بحث، مشکل الفاظ و لغات کی ضبط و تحقیق، محاوروں اور جملوں کی تشریح اور حدیث کے خاص خاص نکات اور ان سے مستنبط شدہ احکام، مسائل و آداب وغیرہ کی وضاحت اور ان کے بارہ میں اہل علم کے مختلف آراء و مسالک وغیرہ بیان کرتے ہیں اور شروع یا آخر میں اہم مباحث کا خلاصہ اور ماحصل بھی تحریر کر دیتے ہیں۔

اس طریقہ بحث و تحقیق کا اندازہ کرنے کے لئے بعض بحثوں کا خلاصہ پیش کیا

جاتا ہے،

ایک مشہور حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دین نصیحت ہے، لوگوں نے پوچھا کس کے لئے؟ ارشاد ہوا، اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول اور ائمہ و عوام مسلمین کے لئے"،

امام نووی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

"اس عظیم الشان حدیث پر اسلام کا دارومدار ہے بعض علما کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ ان چار حدیثوں میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا انحصار ہے بلکہ درحقیقت مجرد اس حدیث پر بھی اسلام کا مدار ہے، امام ابوسلیمان خطابی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "نصیحت ایک نہایت جامع اور بلیغ لفظ ہے، کسی کے لئے نصیحت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حق اور حصہ کی پوری پوری حفاظت کی جائے، اس مفہوم کی مکمل تعبیر عربی زبان کے کسی اور لفظ سے ممکن نہیں، جس طرح دنیا و آخرت کے خیر کے لئے عربی زبان میں فلاح سے زیادہ جامع اور کوئی لفظ نہیں ہے، یہ اصل میں "نصح الرجل ثوبہ" سے نکلا ہے، اس حیثیت سے منصوح لہ کے لئے ناصح کے عمل صلاح کی مثال کپڑے کے چاک کو درست کرنیوالی چیز کی ہوگی، بعض لوگوں نے اس کو "نصحت العسل" سے ماخوذ بتایا ہے جس کے معنی شہد کو موم سے خالص کر لینے کے ہوتے ہیں، اس صورت میں اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ منصوح لہ کے لئے ناصح کا عمل ہر قسم کی آلائش اور کھوٹ سے خالص اور تمام تر پاک ہے، حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ دین حق کی بنیاد اور دارومدار ایسی ہی خالص نصیحت پر ہے، اس طرز کلام کی مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں بھی ہے کہ (الحج عرفۃ) یعنی حج کا دارومدار عرفہ کے قیام پر منحصر ہے۔

امام خطابی وغیرہ نے نصیحت کی تفسیر اور قسموں پر اچھی بحث کی ہے، ذیل میں اس کی تلخیص بعض اضافوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

اللہ کے لئے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس کا کسی کو شریک نہ بنایا جائے، اسکی صفتوں میں کسی قسم کی بے راہ روی نہ اختیار کی جائے بلکہ اس کو کمال و جمال کے تمام اوصاف سے متصف اور نقائص سے منزہ قرار دیا جائے، اس کی اطاعت پر قائم رہا جائے اور اس کی نافرمانی سے بچا جائے، اسی کے لئے دوستی اور دشمنی کی جائے، اس کے مطیع و منقاد بندوں کو دوست اور نافرمان لوگوں کو دشمن سمجھا جائے، اس کے منکرین سے جہاد کیا جائے، اس کی نعمتوں پر اسکا شکر ادا کیا جائے، تمام کاموں میں اخلاص اور نیک نیتی پیش نظر رکھی جائے اور ان باتوں کی دوسروں کو بھی تلقین کی جائے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہے اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لئے نصیحت خود بندہ ناصح ہی کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔

خدا کی کتاب کے لئے نصیحت کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لائے اور کسی مخلوق کے کلام کو اس کے مشابہ یا اس سے بہتر نہ سمجھے، اس کی تعظیم کرے، اس کی عمدہ اور بہتر طور پر تلاوت کرے، اس کے حروف کی ادائگی میں اوقاف و مخارج کی صحت کا لحاظ رکھے، اس میں تحریف و تلبیس نہ کرے، اور باطل تاویلیں کرنے والوں کی آمیزشوں سے اس کو بچائے، اس میں جو کچھ بھی ہے، اسکی تصدیق اور اس کے احکام سے واقفیت حاصل کرے، اس کے علوم و امثال کو جانے اور سمجھے، اس کی نصیحتوں سے عبرت حاصل کرے اور اس کے عجائب میں

غور وفکر کرے، اس کے محکم پر عمل اور متشابہ کو تسلیم کرے، اس کے عموم وخصوص اور ناسخ ومنسوخ کی بحث وتحقیق اور اس کے علوم کی نشر واشاعت کرے، اور اسکے لئے نصیحت کے جو تقاضے بیان کئے گئے ہیں ان کی دوسروں کو بھی دعوت وتلقین کرے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نصیحت، آپ کی نبوت ورسالت کی تصدیق کرنا، آپ کی لائی ہوئی تمام باتوں پر ایمان لانا، امر ونہی میں آپ کی اطاعت اور آپ کی حمایت ونصرت کرنا آپ سے محبت کرنے والوں سے محبت اور دشمنوں سے نفرت وعداوت رکھنا، آپ کے مقام ومرتبہ کی عظمت اور آپ کی عزت وتوقیر کرنا، آپ کے حقوق ادا کرنا، آپ کے طریقہ کو اختیار کرنا اور آپ کی سنتوں کو زندہ کرنا، آپ کی دعوت وشریعت کی نشر واشاعت کرنا اسکے بارے میں الزامات واعتراضات کی تردید کرنا آپکے ارشادات وعلوم میں خود تفقہ وبصیرت سے کام لینا اور دوسروں کو بھی اسکی دعوت دینا، انکی عظمت واحترام کو ملحوظ رکھنا، ان کو پڑھتے وقت مؤدب رہنا، بغیر علم وواقفیت کے ان کے بارہ میں کلام کرنے سے احتراز کرنا، علوم نبوت کے حاملین کی توقیر وتعظیم کرنا، آپ کے اخلاق وآداب کو اختیار کرنا، آپ کے اصحاب اور اہل بیت سے محبت وتعلق رکھنا اور ان لوگوں سے مجتنب رہنا جو آپ کی سنتوں میں مبتدع اور آپ کے اصحاب کے بارہ میں نکتہ چینی کرتے ہوں،

ائمہ مسلمین کے لئے نصیحت کا مفہوم یہ ہے کہ حق بات میں ان کی معاونت اور اس کی ان کو تاکید کرنا، ان کی تنبیہ وتذکیر میں نرمی سے کام لینا اور جن امور سے وہ ناواقف ہوں اور مسلمانوں کے جو حقوق ان کو معلوم نہ ہوں ان سے ان کو

واقف کرانا، اُن کے خلاف خروج و بغاوت نہ کرنا، اور لوگوں کے دلوں کو ان کی اطاعت کی جانب مائل کرنا، امام خطابی فرماتے ہیں کہ آئمہ کے لئے نصیحت میں یہ باتیں بھی داخل ہیں کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنا، ان کے ساتھ جہاد کرنا، ان کو صدقہ و زکوٰۃ کی رقمیں دینا، ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا، ان کی جھوٹی تعریف کرکے ان کو دھوکے میں نہ ڈالنا، ان کے صلاح کے لئے دعا کرنا، مگر یہ سب اس صورت میں جب ائمۂ مسلمین وہ خلفا ہوں جو مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ امام خطابی نے ان میں علمائے دین کو بھی شامل کر لیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان کے لئے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کریں ان کو قبول کیا جائے اور احکام و مسائل میں ان کی تقلید کی جائے اور ان کے بارہ میں حسن ظن سے کام لیا جائے۔

عامۂ مسلمین کے لئے نصیحت یہ ہوگی کہ دنیا و آخرت کے اندر ان کی بہتری کے جو کام ہوں یا جن کاموں سے ان کے مصالح وابستہ ہوں ان کی ان کو تلقین کرنا، ان کو اذیت اور ضرر پہنچانا، دین کے جن امور سے وہ ناواقف ہوں ان سے ان کو آگاہ اور ان کی تحصیل میں قولاً و عملاً ان کی مدد کرنا، ان کی پردہ پوشی اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا، ضرر رساں کاموں سے ان کو بچانا، نرمی و اخلاص کے ساتھ ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا۔ ان سے شفقت کا برتاؤ، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کرنا، ان کو موعظتِ حسنہ کرنا۔ ان سے کینہ، حسد اور کپٹ نہ رکھنا، ان کے لئے وہی چیزیں پسند کرنا جو اپنے لئے پسند ہوں اور ان چیزوں کو ناپسند کرنا جو اپنے لئے ناپسند ہوں، ان کی عزت و آبرو اور مال و دولت کی حفاظت کرنا، نصیحت کے جو انواع بیان کی گئی ہیں ان کی ان کو تلقین کرنا اور

اطاعت الٰہی کے لئے ان کو آمادہ اور تیار کرنا۔ (جلد ۲ص ۳۷ تا ۳۹)

صحیح مسلم کے مقدمہ کی ایک روایت میں حضرت قتادہؓ کی ابو داؤد اعمیٰ پر نقد و جرح کے ضمن میں طاعون جارف کا ذکر آگیا ہے، اس کے متعلق ایک محققانہ بحث ملاحظہ ہو۔

"طاعون جارف کے سنہ کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں، امام ابو عمر ابن عبدالبر نے التمہید کے فروع میں لکھا ہے کہ ایوب سختیانی کی وفات ۱۳۲ھ میں طاعون جارف کے زمانہ میں ہوئی تھی اور ابن قتیبہ نے معارف میں اصمعی سے روایت کی ہے کہ ابن زبیر کے زمانہ ۶۰ھ میں طاعون جارف ہوا تھا، یہی قول ابو الحسن علی بن محمد بن ابی سیف مدائنی نے بھی اپنی کتاب التعازی میں نقل کیا ہے بلکہ انھوں نے شوال کے مہینہ کی بھی تصریح کی ہے۔ اسی کے قریب قریب کلا بازی کا قول بھی ہے، وہ رجال البخاری میں لکھتے ہیں کہ ایوب سختیانی ۶۶ھ میں پیدا ہوئے تھے، قاضی عیاض نے ۱۱۹ھ کو طاعون کا سنہ بتایا ہے، حافظ عبدالغنی مقدسی نے عبداللہ بن مطرف کے ترجمہ میں یحییٰ بن قطان کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ انکا انتقال طاعون جارف کے جو ۸۷ھ کا واقعہ ہے بعد ہوا، اور یونس بن عبید کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے انس بن مالک کو دیکھا تھا، یہ واقعہ طاعون کے بعد پیدا ہوا اور ۱۳۷ھ میں فوت ہوئے۔

یہ تمام اقوال متعارض ہیں، درحقیقت طاعون کی وبا متعدد بار پھیلی اور ہر دفعہ کا طاعون، جارف کہلاتا تھا کیونکہ جرف کے معنی سب میں موجود تھے، ابن قتیبہ نے معارف میں اصمعی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ پہلا طاعون عہد

اسلام میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام کا طاعون عمواس ہے، اس میں حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ کا انتقال ہوا تھا، دوسرا حضرت ابن زبیرؓ کے زمانہ کا ہے، پھر طاعون فتیات یا طاعون اشراف شام، بصرہ، کوفہ اور واسط میں رونما ہوا، سنہ ۱ھ میں طاعون عدی بن ارطاۃ پیش آیا، اس کے بعد سنہ ۱۲۷ھ کا طاعون غراب (غراب ایک شہر کا نام ہے) ہے، پھر سنہ ۱۳۱ھ میں طاعون مسلم بن قتیبہ کا واقعہ پیش آیا۔ یہ طاعون شعبان میں شروع اور شوال میں ختم ہوا، اسی میں ایوبؓ سختیانی کا انتقال ہوا تھا، مکہ و مدینہ ہمیشہ طاعون کی زد سے محفوظ رہے،

ابوالحسن مدائنی لکھتے ہیں کہ اسلامی عہد کے مشہور اور بڑے پانچ طاعون ہیں، ایک مدائن کا شیرویہ جو سنہ ۶ھ میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ کا طاعون عمواس جو شام میں ہوا، اور اس میں ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے، پھر ابن زبیرؓ کے زمانہ کا طاعون جارف جو سنہ ۶۹ھ کا واقعہ ہے، اس میں بھی بیشمار افراد فوت ہوئے، حضرت انسؓ بن مالک اور عبدالرحمنؓ بن ابی بکرہ کی موت اسی میں ہوئی تھی، اس کے بعد سنہ ۸ھ کا طاعون فتیات ہے اور آخری سنہ ۱۳۱ھ کا طاعون ہے جس کا زیادہ زور رمضان کے مہینہ میں تھا، اور اس میں ہزاروں اشخاص کی موت ہوئی، ایک اور طاعون کا واقعہ کوفہ میں پیش آیا تھا، اس میں حضرت مغیرہؓ کا سنہ ۵۰ھ میں انتقال ہوا تھا،

طاعون عمواس کا زمانہ سنہ ۱۸ھ ہے، ابوزرعہ دمشقی نے سنہ ۱۷ھ کی بھی روایت کی ہے، عمواس، بیت المقدس اور رملہ کے درمیان ایک گاؤں ہے، اس کی طرف طاعون کی نسبت اس لئے کی گئی ہے کہ اس کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی، ایک قول

یہ ہے کہ طاعون کی عمومیت اور ہمہ گیری کی وجہ سے یہ نام پڑا تھا۔ عبد الغنی نے حضرت ابو عبیدہؓ ابن جراح کے ترجمہ میں یہ دونوں اقوال نقل کئے ہیں۔

حضرت قتادہؓ نے ابو داؤد اعمی پر نقد وجرح کرتے ہوئے جس طاعون جارف کا ذکر کیا ہے، ان اقوال سے اس کا زمانہ متعین کرنا آسان اور قاضی عیاض کے قول کا باطل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت قتادہؒ کی ولادت ۶۱ھ میں اور مشہور قول کے مطابق وفات ۱۱۷ھ میں ہوئی، اس لئے ان کے ذکر کردہ طاعون کا واقعہ اسی درمیان میں پیش آیا ہوگا۔ اب یہ چاہے ۶۷ھ والا طاعون ہو، جب وہ چھ سال کے تھے یا ۸۷ھ والا طاعون مراد ہو اور یہی زیادہ اظہر ہے واللہ اعلم (ج ۱ ص ۱۰۵ تا ۱۰۶)

امام مسلم کے انداز بیان کی وضاحت امام نووی کی شرح کی خوبی کا ایک خاص ثبوت یہ ہے کہ صحیح مسلم پر ان کی نہایت وسیع اور گہری نظر تھی اور وہ اس کے طرز بیان اور اسلوب کلام کے پورے اداشناس تھے اور انھوں نے بعض جگہ ان کے مخصوص اسلوب بیان وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے مثلاً باب الوضوء مامست النار میں لکھتے ہیں:۔

"امام مسلمؒ نے اس باب میں پہلے وہ حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آگ سے مس کی ہوئی (پکی) چیز کھالینے سے وضو باقی نہیں رہتا اور آخر میں جو حدیثیں نقل کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وضو باقی رہتا ہے اور پکی ہوئی چیز کھالینے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا حکم یعنی وضو کا کیا جانا منسوخ ہوگیا ہے، یہ امام مسلم وغیرہ کا ایک عام طریقہ ہے کہ کسی باب میں پہلے وہ اس قسم کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کو وہ منسوخ خیال کرتے ہیں، اس کے بعد آخر میں ان کی ناسخ روایتوں

کو ذکر کرتے ہیں، (ج ۴ ص ۲۴ تا ۴۴)

تفسیر الحدیث بالحدیث۔ جس طرح قرآن مجید کی تفسیر کا سب سے عمدہ اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی ایک مقام کی آیۃ کی وضاحت اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے دوسرے مقام کی اسی قسم کے آیۃ پر غور وفکر کیا جائے کیوں کہ جو بات ایک جگہ مبہم اور مجمل بیان کی گئی ہے دوسری جگہ تفصیل و وضاحت سے ذکر کی گئی ہے اسی طرح ایک حدیث کی توضیح دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، اس بنا پر کسی حدیث کی تشریح کے لئے اس کے امثال ونظائر کی جانب رجوع کرنا شرح حدیث کا سب سے عمدہ اور بہتر طریقہ ہے، علامہ نووی نے اس اصول کے مطابق ایک حدیث کی تشریح اسی نوعیت کی دوسری حدیثوں سے کی ہے، اور ایسے مواقع پر انھوں نے خاص طور سے صحیح بخاری کے مرویات نقل کرکے صحیح مسلم کے مرویات کا مفہوم واضح اور متعین کیا ہے، مثلاً صحیح مسلم کی کتاب الایمان کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ ایک بدوی نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام کے متعلق دریافت کیا، آپ نے اس کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور حج اور زکوۃ ادا کرنے کی تلقین کی، بدوی نے کہا:۔

والله لا ازید علی ھذا ولا انقص منه — میں اس میں کوئی اضافہ کرونگا اور نہ کمی کرونگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

افلح ان صدق — اگر بدوی نے ٹھیک کہا ہے تو وہ کامیاب ہوگیا۔

یہاں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس حدیث میں تمام فرائض و واجبات اور

سنن و مندوبات کا ذکر نہیں ہے تو محض ان چند فرائض کو ادا کر لینے سے وہ کس طرح کامیاب اور صاحب فلاح ہو سکتا ہے؛ علامہ نووی نے اس اشکال کو اس طرح رفع کیا ہے کہ امام بخاری کی روایت کے اضافہ سے یہ شبہہ زائل اور حدیث کا اصل مقصد متعین اور واضح ہو جاتا ہے۔ ان کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدوی کو اسلام کے عام شرائع سے آگاہ فرمایا تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ

واللہ لا ازید و لا انقص مما فرض اللہ تعالیٰ علی شیئاً" — بخدا میں ان باتوں میں کوئی کمی بیشی نہ کروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس کی فلاح و کامیابی کو تمام فرائض اور جملہ شرائع کی ادائیگی پر موقوف قرار دیا تھا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے تمام فرائض و واجبات کو ادا کرنے والا ہو تو وہ یقیناً مفلح اور کامیاب ہوگا، رہے سنن و مندوبات تو ان کی بھی اہمیت ہے، اور ان کا مستقل ترک یقیناً مذموم ہے مگر نجات اور فلاح کا اصل دار و مدار فرائض و واجبات کی ادائیگی ہی پر منحصر ہے"[1]

حدیثوں کی شرح و توضیح میں انھوں نے قرآن مجید کی آیتوں سے بھی مدد لی ہے اور کہیں کہیں یہ دکھایا ہے کہ فلاں حدیث فلاں آیت کے موافق ہے، جن حدیثوں میں قرآن مجید کی آیات کا ذکر ہے ان کی شرح و تفسیر بھی کی ہے اور اس سلسلہ میں مفسرین کے اقوال و آراء بھی بیان کئے ہیں، خصوصاً الفاظ و لغات حدیث کی تشریح میں اکثر قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے۔ اس کی مثالیں آگے آئیں گی یہاں ایک مثال اس لئے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں قرأت و تلاوت قرآن کے متعلق ایک دلچسپ نکتہ کا ذکر ہے؛

حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی

...یں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف نہیں ہوئے تھے، اس کے ثبوت میں انھوں
...یتیں پیش کی ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے [وماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا الخ]
...ت عائشہؓ نے یہ آیت اس طرح بیان کی ہے" او لم تسمع ان اللہ تعالیٰ یقول،
...ماکان لبشر الخ   کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو (ماکان لبشر الخ)
...لم کے اکثر نسخوں میں یہ آیت اسی طرح منقول ہے یعنی ماکان لبشر سے پہلے کے واؤ
...یں کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ قرآن میں واؤ مذکور ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ روایت
...لال کی صورت میں ایسا کر دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ استدلال
...والے کا مقصد بعینہٖ تلاوت کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو صرف دلالت کے مقام
...کی وضاحت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس مقصد میں واؤ کے حذف سے کوئی فرق
...نہیں ہوتا، اس کی بےشمار نظیر حدیثوں میں موجود ہیں، چنانچہ ایک روایت
...ہے [فانزل اللہ تعالیٰ اقم الصلوٰۃ طرفی النہار] اور دوسری میں ہے [اقم
...ۃ لذکری] یہ دونوں آیتیں صحیحین کی حدیثوں میں اسی طرح مذکور ہیں حالانکہ
...ن مجید میں واؤ بھی مذکور ہے۔ (ج ۳، ص ۹)

...تطبیق   پہلے اس خصوصیت کا ذکر آچکا ہے کہ امام نووی نے متعارض
...یث کے جمع و تطبیق کی جانب خاص توجہ کی ہے، اس سلسلہ میں وہ روایتوں
...لفاظ، ان کے متن اور مضمون کے فرق و اختلاف اور مختلف روایتوں کی کمی بیشی
...کا ذکر کر کے ان کے تضاد و تعارض کو حل اور کہیں شارحین حدیث اور فقہا
...ملف اقوال کے درمیان بھی جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کرتے ہیں، روایتوں
...رق و اختلاف کو رفع کرنے میں تقدیم و تاخیر، منسوخ و ناسخ اور خصوص و عموم

ی بحثیں بھی آگئی ہیں، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

قرات علی الجن کے باب میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت ہے :۔

ما قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الجن وما رأھم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے سامنے نہ قرأت کی اور نہ انکو دیکھا۔

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

فقال اتانی داعی الجن فذھبت معہ فقرأت علیھم القرآن	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جنوں کا قائد آیا اور میں اس کے ساتھ جا کر جنوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کی

علامہ نووی اس تضاد کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علمانے انھیں دو واقعے بتایا ہے ،اس بنا پر ابن عباسؓ کی حدیث شروع زمانے اور ابتدائے نبوت کی ہوگی جسکا ذکر (قل اوحی الی انہ استمع الخ) میں ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنوں کے سننے کا علم وحی سے ہوا تھا یا وحی کے بغیر ہی ہوگیا تھا اور ابن مسعودؓ کی حدیث میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر ہے جو اس کے بعد اور اسلام کی عام اشاعت ہو جانے کے بعد پیش آیا تھا"

بدوی کی جس حدیث کا پہلے ذکر آچکا ہے، اس میں اور حدیث جبرئیل میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، حج کا ذکر نہیں ہے، اس طرح کی اور بھی حدیثوں میں بعض میں صوم کا اور بعض میں زکوٰۃ کا اور بعض میں ایمان کا تذکرہ نہیں ہے اور بعض میں صلۂ رحم اور بعض میں خمس کا ذکر ہے، اس طرح ان حدیثوں

یں خصائل ایمان کی تعداد میں فرق ہے، امام نوویؒ نے قاضی عیاض وغیرہ کے حوالہ سے اس کا یہ جواب لکھا ہے،

"یہ اختلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں نہیں ہے بلکہ راویوں کے حفظ و ضبط میں تفاوت کا نتیجہ ہے، اس لئے بعض لوگوں کے بیان میں کمی ہے، انھوں نے صرف اسی قدر بیان کیا جس قدر ان کو یاد تھا، مگر انھوں نے اس اضافہ کی کوئی تائید یا تردید نہیں کی جو دوسرے لوگوں کے بیان میں ہے، گو بظاہر ان کے اختصار سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت اسی قدر ہے مگر دوسرے ثقہ لوگوں کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسی قدر نہیں ہے بلکہ راویوں کے قصور حفظ کی وجہ سے وہ کم اور مختصر ہو گئی ہے،، (ج ۱ ص ۱۶۸)

اختلاف و تعارض رفع کرنے کے لئے وہ عموم و خصوص وغیرہ کا بھی ذکر کرتے ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ (تاکل النار من ابن آدم الا اثر السجود حرم اللہ علی النار ان تاکل اثر السجود) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کے ساتوں اعضا کو آگ نہیں جلا سکے گی، یہی بعض علماء کا خیال ہے مگر قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس سے ساتوں اعضا کے بجائے صرف پیشانی مراد ہے لیکن پہلا قول مختار ہے، اگر اس پہ یہ اعتراض کیا جائے کہ امام مسلم نے اس کے بعد ہی مرفوعاً یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ جہنم سے ایک ایسی جماعت نکالی جائے گی جس کا تمام جسم پیشانی کے سوا جل بھن گیا ہوگا تو یہ جواب دیا جائیگا کہ جہنم سے نکلنے والے لوگوں میں یہ کوئی مخصوص جماعت ہے جن کی صرف پیشانیاں ہی جلنے سے محفوظ رہیں گی مگر ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے تمام اعضا سجود سلامت رہیں گے جیسا کہ اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے

اس لئے یہ حدیث عام ہے اور وہ خاص، اس بنا پر عام پر عمل کیا جائیگا بشرطیکہ اس کو کوئی چیز خاص نکردے (ص ۲۲ جلد ۳)

اسی طرح باب الوضوء من لحوم الابل میں لکھتے ہیں:۔

" اکثر لوگوں کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خلفائے راشدین، ابن مسعودؓ، ابن عباس، ابی ابن کعب، ابو دردار، ابو طلحہ، عامر بن ربیعہ ابو امامہ رضی اللہ عنہم اور جمہور تابعین و ائمۂ ثلاثہ اسی کے قائل ہیں، لیکن امام احمد، اسحٰق بن راہویہ، یحیٰی بن یحیٰی، ابو بکر بن منذر اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ کے نزدیک ناقض وضو ہے، حافظ ابو بکر بیہقیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور محدثین اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہی مسلک بتایا ہے، ان لوگوں کا استدلال مندرجہ ذیل حدیث سے ہے (نعم فتوضا من لحوم الابل) اسی طرح براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے وضو کرنے کا حکم دیا، امام احمدؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو صحیح حدیثیں وارد ہیں، ایک جابرؓ کی حدیث دوسری براءؓ کی، اس لئے یہ مذہب دلیل کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے گو جمہور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا لیکن ظاہر ہے یہ حدیث عام ہے اور وہ حدیث خاص ہے اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے واللہ اعلم،"
(جلد ۴، ۴۸، ۴۹)

احکام وآداب کا استنباط نووی نے بعض حدیثوں سے نہایت دلچسپ حقائق و نکات اور مختلف النوع آداب و احکام متنبط کئے ہیں، اس کی بعض مثالیں یہ ہیں:۔

مرتدین و مانعین زکوٰۃ سے متعلق حدیث کے تحت لکھتے ہیں، یہ حدیث صحیح مسلم میں اس طرح بیان ہوئی ہے،

عن ابی ھریرۃ قال لما توفی	حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہو کہ جب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور آپکے
ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب	بعد حضرت ابوبکرؓ آپکے جانشین مقرر ہوئے اور
قال عمر بن الخطاب لابی بکر کیف	عربوں میں سے کچھ لوگ کافر ہوگئے تو حضرت عمرؓ
تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ	نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ کسطرح لوگوں سے
صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل	قتال کریں گے درآنحالیکہ رسول اللہ صلی اللہ
الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن	علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے اس بات کا حکم دیا
قال لا الہ الا اللہ فقد عصم منی مالہ	گیا ہے کہ میں لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں
ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ فقال	جبتک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دینے لگیں
ابوبکر واللہ لاقاتلن من فرق بین	کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، سو جس نے یہ
الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق	کہدیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس نے
المال واللہ لو منعونی عقالا کانوا	مجھسے اپنے مال اور جان کو محفوظ کر لیا، علاوہ
یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اسلام کے حق[1] کے اور انکا حساب اللہ کے ذمہ
لقاتلتھم علی منعہ فقال عمر بن الخطاب	ہوگا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں
فواللہ ماھو الا ان رأیت اللہ عزوجل	ان لوگوں سے ضرور جنگ کرونگا جو نماز اور
قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت	زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرینگے کیونکہ زکوٰۃ
انہ الحق۔	(آدمی کے) مال میں خدا کا حق ہے، خدا کی قسم

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو،

اگر ان لوگوں نے مجھکو اونٹ باندھنے کی ایک
رسی بھی جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
(زکوۃ میں) دیتے تھے ادا کرنے سے انکار کیا
تو میں اس کے روکنے پر ان سے جہاد کرونگا،
حضرت عمرؓ نے کہا قسم ہے خدا کی میرے خیال
میں یہ اس لئے تھا کہ اللہ نے حضرت ابو بکرؓ کا
سینہ جہاد کے لئے کھول دیا تھا چنانچہ میں نے
سمجھا کہ یہی حق ہے۔

۱۔ اس سے حضرت ابو بکرؓ کی شجاعت و دلیری اور لوگوں پر ان کے علم و فضل کی برتری ظاہر ہوتی ہے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک نہایت سخت مرحلہ و مقام پر جنگ کے لئے ثابت قدم رہے۔ اور ان کے ذہن رسا، دقتِ نظر اور اصابتِ فکر نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا جو ابتداءً کسی اور کو نہیں معلوم ہو سکی تھی، یہ اور اس طرح کی اور بھی متعدد وجہیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام اہل حق پر کرامت اور ساری امت پر فضیلت عطا کی تھی،

۲۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ واکابر سے مراجعت اور اظہار حق کے لئے ان سے مناظرہ کرنا جائز ہے۔

(حاشیہ ص ۲۴) لہ بعض حدیثوں میں بحق الاسلام ہے یعنی اسلام نے جرائم کی جو سزا مقرر کی ہے وہ ان پر عائد کیجائیگی اگر انھوں نے انکا ارتکاب کیا اور حسابہم علی اللہ کا مفہوم یہ ہو کہ اقرار شہادت کے بعد اگر یہ لوگ ڈھکے چھپے کچھ کریں گے تو اس کے لئے خدا کے یہاں جوابدہ ہوں گے مجھپر اسکی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی،

۳۔ ایمان کی شرط اقرار شہادتین کے ساتھ ان پر اور ان تمام باتوں پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اعتقاد رکھنا بھی ہے، جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے ﴿اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ ویومنوا بی وبما جئت بہ﴾

۴۔ اس سے جہاد کا وجوب اور کلمۂ توحید کو ماننے والوں کی جان و مال کی عصمت و حفاظت کا لازمی ہونا ثابت ہوتا ہے، خواہ اس کے لئے تلوار ہی کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے،

۵۔ احکام و قوانین کا اجرا ظاہر کے مطابق ہوتا ہے، باطن کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے،

۶۔ اس سے قیاس اور اس کے مطابق عمل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۷۔ اس میں نماز و زکوٰۃ اور دوسرے اسلامی ارکان و فرائض کے مانعین سے قتال کا ذکر ہے،

۸۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموم کو اختیار کرنا جائز ہے،

۹۔ باغیوں سے قتال کا وجوب ثابت ہوتا ہے،

۱۰۔ بکریوں کی طرح ان کے بچوں کی زکوٰۃ کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے،

۱۱۔ اس میں پیش آمدہ امور و مسائل میں ائمہ کے اجتہاد اور اہل علم سے ان کے بارے میں بحث و مناظرہ کرنے کا ذکر ہے،

۱۲۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق کے واضح ہونے کے بعد اس کو اختیار کر لینا اور اہل حق کے ساتھ ہو جانا چاہئے،

۱۳۔ فروع میں اختلاف کرنے والے مجتہدین کو ایک دوسرے کو خاطی نہیں قرار دینا چاہیئے۔

۱۴۔ اگر ارباب حل و عقد اور اصحاب الرائے میں سے ایک شخص بھی کسی مسئلہ

میں اختلاف کرے تو اس کے بارہ میں اجماع واقع نہ ہوگا، یہی صحیح اور مشہور قول ہے، لیکن بعض علمائے اصول کا اس میں اختلاف ہے،

۱۵۔ زندیق کی توبہ کی مقبولیت کا ذکر ہے، (ج ۱ ص ۲۱۱ تا ۲۱۳)

وفد عبد القیس کے متعلق امام مسلم نے مختلف سندوں سے کئی روایتیں نقل کر کے ان سب کے مجموعہ سے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، پہلے اس سلسلہ کی ایک روایت ملاحظہ ہو، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں۔

ان وفد عبد القیس اتوا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوفد
ومن القوم قالوا ربیعۃ قال مرحبا
بالقوم او بالوفد غیر خزایا ولا
الندامی قال فقالوا یا رسول اللہ
انا نأتیك من شقۃ بعیدۃ وان
بیننا وبینك ھذا الحی من کفار
مضر وانا لا نستطیع ان نأتیك
الا فی شھر الحرام فمرنا بامر
فصل نخبر بہ من وراءنا ندخل
بہ الجنۃ قال فامرھم باربع و
نھاھم عن اربع قال امرھم بالایمان

قبیلہ عبد القیس کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس آئے، آپ نے ان سے کہا کہ تم کس
جماعت سے ہو (یا یہ پوچھا کہ) تم کس قوم کے
ہو، ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ قبیلہ
ربیعہ کے ہیں، آپ نے ان لوگوں کو خوش آمدید
کہا، اور ان لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول
ہم لوگ آپ کی خدمت میں دور دراز کی
مسافت طے کر کے آئے ہیں ہمارے اور آپ کے
درمیان کفار مضر کا قبیلہ رہتا ہے (اس بنا پر)
ہم لوگ آپ کے پاس صرف ان ہی مہینوں میں
آسکتے ہیں جن میں قتال ممنوع ہے، لہذا آپ
ہم کو کوئی ایسی دو ٹوک بات بتا دیں جس سے
ہم ان لوگوں کو آگاہ کر دیں جو ہمارے پیچھے

بالله وحده وقال هل تدرون ما الایمان
بالله قالوا الله ورسوله اعلم قال شهادة
ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله
واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة وصوم
رمضان وان تؤدوا خمسا من المغنم
ونهاهم عن الدباء والحنتم والمزفت
وقال شعبة وربما قال النقیر وربما
قال المقیر وقال احفظوه واخبروا
به من ورائکم ......

رہ گئے ہیں (اور آپکے پاس نہیں آسکتے ہیں)
تو ہم لوگ (اس پر عمل کرکے، جنت میں داخل
ہو جائیں، (ابن عباسؓ نے) کہا کہ پس رسول
اللہؐ نے ان لوگوں کو چار چیزوں کا حکم دیا
اور چار سے منع کیا وہ کہتے ہیں کہ آپنے ان کو
خدائے واحد پر ایمان لانے کا حکم دیا اور پوچھا
کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان لانا
کیا ہے ان لوگوں نے فرمایا کہ اللہ اور اسکے
رسول زیادہ جانتے ہیں، آپنے فرمایا کہ اس
بات کی گواہی دینا کہ سوا خدا کے کوئی معبود
نہیں اور یہ کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں، اور
آپنے ان لوگوں کو نماز قائم کرنے، زکوٰۃ
دینے اور رمضان کے روزے رکھنے اور
مال غنیمت کا پانچواں حصہ ادا کرنے کا حکم
دیا اور (چار برتنوں) دبا، حنتم، مزفت اور
نقیر یا مقیر (میں پانی پینے) سے منع کیا اور فرمایا
کہ اس کو یاد کرلو اور اس سے ان لوگوں
کو واقف کردو جو تمھارے پیچھے رہ گئے ہیں،

۱۔ اس سے اہم امور و مسائل کو دریافت کرنے کے لئے اشراف و رؤساء کا وفد کی

صورت میں ائمہ کے پاس آنا ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ اصل مسئلہ کا حل دریافت کرنے سے پہلے تمہید یا معذرت پیش کی جا سکتی ہے،

۳۔ ان روایتوں میں حج کے علاوہ جو اس وقت تک فرض نہیں ہوا تھا تمام اہم اور بنیادی ارکانِ اسلام کا ذکر ہے،

۴۔ حاضرین کو سمجھانے کے لئے یا ان کی بات سمجھنے کے لئے عالم اپنے رفقاء سے مدد طلب کر سکتا ہے جیسے حضرت ابن عباسؓ نے کیا تھا

۵۔ فتویٰ اور خبر میں ایک شخص کا قول بھی معتبر اور کافی ہے،

۶۔ آنے والے کا خیر مقدم کرنا اور اس کو مرحبا کہنا مستحب ہے،

۷۔ اس سے آدمی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کے غرور اور فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، رہی وہ ممانعت جو منہ پر تعریف کرنے کے متعلق وارد ہے تو یہ صرف ان ہی لوگوں کے متعلق ہے جن کے بارہ میں فتنہ کا اندیشہ ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی متعدد بار لوگوں کے منہ پر ان کی تعریف کی ہے،

۸۔ اگر طالب اور مستفتی جواب کی وضاحت کرانا چاہے تو اس پر کوئی عتاب یا نکیر نہیں کرنا چاہیئے،

۹۔ مہینہ کا ذکر کئے بغیر صرف رمضان کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے،

۱۰۔ عالم سے رشد و ہدایت کے لئے رجوع کرنا جائز ہے،

۱۱۔ اس میں کلام کو بلیغ اور موثر بنانے کی تاکید کا ذکر بھی ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ پوری طرح دل پر اثر انداز نہیں ہوتا،

۱۲۔ کسی مسلمان سے جعلنی اللہ فداک کہنا جائز ہے، (جلد ۱ ص ۱۹۵، ۱۹۶)

مولفۃ القلوب سے متعلق حدیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں یہ حدیث صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے، حضرت عامر بن سعد اپنے والد حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطی رھطا وسعد جالس فیھم قال سعد فترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھم من لم یعطہ وھو اعجبھم الی فقلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالک عن فلان فواللہ انی لاراہ مومنا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او مسلما قال فسکت قلیلا ثم غلبنی ما اعلم منہ فقلت یا رسول اللہ مالک عن فلان فواللہ انی لاراہ مومنا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او مسلما قال فسکت قلیلا ثم غلبنی ما علمت منہ فقلت یا رسول اللہ مالک عن فلان فواللہ انی لاراہ مومنا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او مسلما انی لاعطی الرجل وغیرہ احب الی منہ خشیۃ ان یکب فی النار علی وجھہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو مال دیا اور سعدؓ (بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں میں ایک ایسے شخص کو چھوڑ دیا اور اسے کچھ نہیں دیا جو مجھکو سب سے اچھا معلوم ہوتا تھا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا وجہ ہے کہ آپنے فلاں شخص کو چھوڑ دیا، خدا کی قسم میں اسے مومن سمجھتا ہوں، آپنے فرمایا کہ (مومن سمجھتے ہو) یا مسلم؟) تو میں نے تھوڑی دیر سکوت کیا پھر اس شخص کے بارہ میں جو کچھ مجھکو معلوم تھا اس نے مجبور کیا کہ میں دوبارہ دریافت کروں چنانچہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول آپنے فلاں شخص کو کیوں نظر انداز فرمایا، بخدا میں اسے مومن خیال کرتا ہوں، آپنے ارشاد فرمایا یا مسلم خیال کرتے ہو (حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ میں کچھ دیر خاموش رہا مگر پھر اس کے متعلق اپنی واقفیت کی وجہ سے ضبط نہ کر سکا اور میں نے کہا کہ اے اللہ کے

رسول کیوں آپنے فلاں آدمی کو نظرانداز فرمایا،

حالانکہ خدا کی قسم میں اس کو مومن سمجھتا ہوں،

آپ نے فرمایا، یا مسلم، میں ایک شخص کو اس

خوف سے دیتا ہوں کہ اگر اسکو نہ دیا گیا تو کافر

ہو جائیگا اور وہ جہنم میں سرنگوں کر دیا جائیگا

حالانکہ دوسرا شخص جسکو نہیں دیتا مجھکو زیادہ محبوب ہوتا ہے اور اسکے کفر میں مبتلا ہونے اور جہنم میں ڈالے جانے کا مجھ کو اندیشہ نہیں ہوتا،

۱۔ اس سے ایمان و اسلام میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل حق کا یہ مذہب صحیح ہے کہ اقرار باللسان کیساتھ اعتقاد بالقلب بھی ضروری ہے ورنہ محض اقرار باللسان کافی اور مفید نہیں ہے جو کرامیہ اور غالی مرجیہ کا مسلک ہے،

۳۔ جو امور حرام نہیں ہیں انکے بارہ میں حکام و امراء سے سفارش کی جاسکتی ہے،

۴۔ ایک ہی مسئلہ میں مسئول سے سوال میں مراجعت و تکرار کرنا روا ہے،

۵۔ بر بنائے مصلحت مفضول فاضل کو کسی مناسب بات پر تنبیہ کر سکتا ہے،

۶۔ فاضل کسی مشورہ کو مطلقاً قبول کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ اس میں غور و فکر سے کام لے گا اور مصلحت و حکمت کے ظاہر و واضح نہ ہونے کی صورت میں اس پر عمل نہیں کریگا۔

۷۔ اس میں تحقیق کا ذکر ہے اور اسکا بھی کہ جن چیزوں کا قطعی ہونا معلوم نہ ہو انکے بارہ میں کوئی قطعی حکم نہیں لگانا چاہئے،

۸۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام مال کو اہم فالاہم کے اصول پر مسلمانوں کے مصالح میں صرف کر سکتا ہے۔

۹۔ کسی شخص کے متعلق قطعی انداز میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جنتی ہے سوائے ان لوگوں کے جنکے بارہ میں

شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

شیراز ہند پورب میں ہزاروں علماء و فضلاء اور مشائخ پیدا ہوئے جن کے دم قدم سے یہاں کے شہر و قصبات مدرسوں اور خانقاہوں سے معمور تھے، اور یہ خطہ بغداد اور قرطبہ کی ہمسری کر رہا تھا،

سلاطین شرقیہ جونپور کے دور سے مغل دور سلطنت تک کی پوری مدت پورب میں علمی بہار کا دور تھا، خصوصًا سلطان ابراہیم شاہ شرقی، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں یہاں علم و علماء کی بڑی چہل پہل تھی، عالمگیر نے اپنی شاہزادگی اور سلطنت کے ایام میں جونپور کے علماء و فضلاء پر خاص نظر رکھی اور اس پورے علاقہ کو اس کی توجہ نے علم کا باغ ارم بنا رکھا تھا، مولوی خیر الدین محمد جونپوری نے اس دور کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

" اورنگ زیب بادشاہ عالم باعمل اور عامل باعلم تھے، انھوں نے علماء کی زیادہ سے زیادہ قدردانی کی، اور زمانۂ شاہزادگی سے ان کا خاص خیال رکھا، شاہان شرقیہ کے دور کی طرح علماء و مشائخ کی کثرت اور طالبان علم و فیض کی زیادتی کے باعث جونپور میں علمی و دینی رونق پیدا ہوگئی، اور جب عالمگیر تخت سلطنت پر بیٹھے تو اس شہر کے

مدرسین و مشائخ کے حالات کی تحقیق کے لئے ناظم جونپور کو حکمنامہ روانہ کیا،
اور تہدیدی تاکید کی کہ اس جماعت کے احوال سے فوراً مطلع کیا جائے،
اس طرح شہنشاہ عالمگیر کے دور میں یہ خطہ گلزار ارم کا نمونہ بن گیا، اطراف
و جوانب کے تمام شہر و قصبات کے قدیم مدرسوں کی تاسیس نو ہوئی،
اور بہت سی نئی خانقاہیں تعمیر کی گئیں، خاص شہر جونپور کے محلہ محلہ
میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا، اور جگہ جگہ مدرسے قائم ہوئے،
مفتی محلہ میں میر ابوالبقاء، سید مبارک، ملا حفیظ اور محلہ شاہ مدار میں
مولانا امیر الدین، اور محلہ دریبہ میں میر عبد الباری اور محلہ سپاہ میں ملا
محمود کے فرزند درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، نیز جونپور
کے ہر محلہ میں مدرسہ موجود تھا، جہاں مدرسین طالب علموں کو تعلیم دیتے اور
ہر کوچہ میں خانقاہ تھی جہاں درویش طالبانِ فیض کی رہبری کرتے تھے[1]
اسی طرح عہد عالمگیری میں دیار پورب میں سیکڑوں علماء و مشائخ اپنے اپنے حلقہ
میں کام کر رہے تھے، چنانچہ اس عہد کے مدرسین میں حافظ امان اللہ بنارسی ۱۱۳۳ھ،
قاضی محب اللہ بہاری ۱۱۱۹ھ، ملا قطب الدین شمس آبادی ۱۱۲۱ھ، ملاجیون
امیٹھوی (احمد بن ابوسعید) ۱۱۳۰ھ، سید سعد اللہ سلونی ۱۱۳۸ھ، قاضی عصمت اللہ
لکھنوی ۱۱۳۰ھ، شیخ غلام محمد لکھنوی ۱۱۳۶ھ اور شیخ غلام نقشبند گھوسوی
لکھنوی ۱۱۲۶ھ وغیرہ ہمعصر علماء تھے، جن کی تعلیمی و تدریسی سرگرمی سے پورا دیار مشرق
دارالعلم بنا ہوا تھا، ان میں حضرت شیخ غلام نقشبند گھوسوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۵۱،

تدریسی و تعلیمی کارناموں کی وجہ سے ممتاز شخصیت کے مالک ہیں، وہ موجودہ ضلع اعظم گڈھ کے مشرقی علاقہ میں قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے۔ ان کے ہم وطن اور ہمعصر علماء میں شیخ اسمٰعیل بن مولانا ابو الخیر بھیردی سنہ ۱۱۰۶ھ، شیخ عبد اللطیف مٹھن پوری (نظام آباد) میر قیام الدین سگڑوی سنہ ۱۱۳۸ھ، شیخ مرتضیٰ چریاکوٹی سنہ ۱۱۰۹ھ، شیخ محمد شاہ بھیردی سنہ ۱۱۱۴ھ مشاہیر وقت تھے اور یہ تمام اکابر پندرہ بیس میل کے حلقہ میں اپنے مدرسوں اور خانقاہوں سے علم و معرفت کی دولت تقسیم کرتے تھے۔ البتہ شیخ غلام نقشبند نے گھوسی سے لکھنؤ جا کر اپنا فیض جاری کیا، شیخ صاحب اپنے تدریسی و تعلیمی فیوض و برکات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں خاص مقام و مرتبہ کے مالک ہیں اور ان کے تلامذہ خصوصًا ملا نظام الدین کے ذریعہ آج بھی پورے ہندوستان میں ان کا تعلیمی و تدریسی فیض جاری ہے، اس وقت دیار پورب کے اسی شیخ الکل فی الکل کا تذکرہ مقصود ہے،

ان کے تذکرہ کا اصل ماخذ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی دو کتابیں مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان ہیں، ان کے نانا اور استاد میر عبد الجلیل بلگرامی شیخ غلام نقشبند کے مخصوص تلامذہ میں تھے، اور میر غلام علی آزاد نے شیخ غلام نقشبند کی وفات کے بائیس سال بعد ملا نظام الدین سے سنہ ۱۱۴۸ھ میں لکھنؤ میں ملاقات کی تھی جو شیخ غلام نقشبند کے تلمیذ رشید تھے اور شیخ صاحب کی وفات کے چونسٹھ سال گذرنے کے بعد سنہ ۱۱۹۰ھ میں مآثر الکرام لکھی، اس لئے انھوں نے شیخ صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ پوری واقفیت سے لکھا ہے اور گویا اپنے گھر کی باتیں لکھی ہیں، انھوں نے دونوں کتابوں میں شیخ صاحب کا مستقل تذکرہ کیا، اور مآثر الکرام میں میر عبد الجلیل کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے بعض اہم واقعات درج کئے ہیں، بحر زخار میں بھی شیخ صاحب کے

حالات ہیں، مگر وہ گویا ناپید ہیں، البتہ اس کی بعض باتیں نزہتہ الخواطر میں آگئی ہیں، تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے، بہر حال شیخ صاحب کے بارے میں فی الحال جو کچھ مل سکا ہے مرتب شکل میں پیش کیا جا رہا ہے،

نام و نسب اور خاندانی حالات حضرت مولانا شیخ غلام نقشبند بن مولانا شیخ عطاء اللہ ابن شیخ قاضی حبیب اللہ بن شیخ احمد بن شیخ ضیاء الدین بن شیخ یحیٰ بن شیخ شرف الدین ابن شیخ نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی جونپوری لکھنوی رحمہم اللہ کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، حضرت ابان بن عثمان یا حضرت عمر بن عثمان کی نسل سے ہیں، اصفہانی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کے آباء و اجداد عرب سے اصفہان آئے پھر وہاں سے کوئی بزرگ ہندوستان آکر دیار جونپور میں آباد ہوئے، یہ کون صاحب تھے اور کب یہاں آئے، اس کے بارے میں تذکرہ نویس خاموش ہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ شیخ صاحب کے دادا قاضی حبیب اللہ سب سے پہلے گھوسی کے قاضی مقرر ہوئے اور یہیں رہ بس گئے،

آزاد بلگرامی نے اس سلسلہ میں صرف اتنا لکھا ہے،

آباء کرام آن جناب از قصبہ گھوسی تابع جونپور و از عظماء آن مکان اند [1]

شیخ غلام نقشبند کے آباء، علاقہ جونپور میں قصبہ گھوسی کے تھے، اور وہاں کے معزز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے،

شیخ کے دادا قاضی حبیب اللہ رح شیخ صاحب کے آباء و اجداد صاحب علم و فضل تھے، ان کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، ان میں مفتی حسین

---

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۱۳،

صاحب درس و افتاء تھے شیخ صاحب کے خاندان میں ان کے دادا قاضی حبیب اللہ سب سے پہلے گھوسی کے قاضی بنائے گئے، غالباً ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) کے دور سلطنت میں ان کو یہ منصب دیا گیا تھا، وہ عالم فقیہ اصولی اور ادیب تھے، اور ان علوم میں مہارت و شہرت رکھتے تھے، حضرت میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ سے بیعت و ارادت رکھتے تھے، گھوسی میں عہدۂ قضا پر مامور ہو کر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

والد شیخ عطاء اللہ شیخ صاحب کے والد مولانا شیخ عطاء اللہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے، اپنے زمانہ کے مشہور عالم ملا محمود بھیروی جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور دیگر اساتذۂ عصر سے تعلیم حاصل کی، اور اپنے والد کے مرشد میر علی عاشقاں سرائمیری کے مرید و خلیفہ شیخ عبد القدوس شطاری نظام آبادی متوفی ۱۰۵۲ھ کے مرید ہوئے، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں ہے،

از خلفائے شاہ عبد القدوس جونپوری علن پورہ مدفن ۱۰۵۲ھ یکے دیوان عبد الرشید جونپوری و دیگر قدوۃ العلماء و عمدۃ العرفاء شیخ عطاء اللہ والد مولوی غلام نقشبند سجادہ نشین شیخ حسام الدین مانک پوری اند[۱]	شاہ عبد القدوس جونپوری ۱۰۵۲ھ کے خلفاء میں سے ایک دیوان عبد الرشید جونپوری اور دوسرے قدوۃ العلماء عمدۃ العرفاء شیخ عطاء اللہ جو مولوی غلام نقشبند کے والد ہیں، وہ شیخ حسام الدین مانک پوری کے سجادہ نشین بھی تھے،

شیخ عطاء اللہ علم و معرفت میں قدوۃ العلماء اور عمدۃ العرفاء تھے، اور اپنے

۱؎ انتصاح ص ۱۶،

والد کی طرح فقہ، اصول فقہ، علم کلام اور ادب و عربیت وغیرہ میں مہارت و شہرت رکھتے تھے، تقوی اور دینداری میں ممتاز تھے، روحانی کشش نے آخر میں حضرت شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوی متوفی ۱۰۸۵ھ کی خدمت میں لکھنو پہونچا دیا اور یہیں کے ہو رہے، گھوسی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے اور یہیں ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ کو انتقال کیا[1]، ان کے تلامذہ میں میر محمد شفیع دہلوی متوفی ۱۱۰۹ھ مشہور علماء میں تھے، جنھوں نے شیخ غلام نقشبند کی خاک کو اکسیر بنانے میں اہم کردار ادا فرمایا تھا، انکا مفصل حال آگے آتا ہے،

پیدائش اور نشو و نما شیخ غلام نقشبند اپنے والد کے قیام لکھنؤ سے پہلے ہی گھوسی میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۰۵۱ھ میں پیدا ہوئے، نزہتہ الخواطر میں ہے،

ولد لاحدی عشرۃ بقین من	وہ ۱۹ ذو الحجہ ۱۰۵۱ھ میں گھوسی میں
ذی الحجۃ سنۃ احدی خمسین	پیدا ہوئے،
والف بقریۃ گھوسی[2]،	

بقول آزاد بلگرامی باپ نے بہ اشارۂ روحانیت اپنے بیٹے کا نام غلام نقشبند رکھا، بچپن کا زمانہ گھوسی میں گذرا اور گھر کے دینی و علمی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی، گیارہ بارہ سال کے ہوئے تو سر سے والد کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا اور وہ اپنے والد کے تلمیذ رشید میر محمد شفیع کے ظل تعلیم و تربیت میں چلے گئے،

زمانۂ طالب علمی میں منامی بشارت شیخ غلام نقشبند کا بیان ہے کہ میں نے زمانہ طالب علمی کی ابتدا میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۵ ص ۵ و ۳۰۲، [2] ایضاً ج ۶ ص ۲۱۳،

کہ آپؐ اپنے دستِ مبارک سے میرے سینہ کا بٹن کھول رہے ہیں، اور خواب ہی میں اس خواب کی تعبیر یوں سمجھ میں آئی کہ آپ شرحِ صدر فرما کر مجھ پر علم کا دروازہ کھول رہے ہیں[1]،

شیخ صاحب نے اپنے والد کی وفات ۱۰۶۳ھ کے بعد میر محمد شفیع کی خدمت میں رہ کر ابتداء سے انتہا تک پوری تعلیم و تربیت حاصل کی، اور اٹھارہ ۱۸ سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون مروجہ کی تحصیل سے فراغت پائی، اس کے بعد بطور یمن و برکت کے اپنے والد کے مرشد شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوئیؒ سے تھوڑا سا پڑھ کر ان ہی سے سند فراغت لی، اس وقت شیخ صاحب کی عمر اکیس ۲۱ سال کی تھی، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

آنجناب از ابتدا تا انتہا در ظلِ تربیت میر محمد شفیع قدس سرہ کہ برخے نزد شیخ عطاء اللہ والد شیخ غلام نقشبند تلمذ کردہ بود جا گرفت، و ہمت بہ احراز فضائل صرف کردہ و در سن ہژدہ سالگی منتہی الجموع فنون کمال گردید، و در سن بست و یک سالگی تیمنا قدرے نزدیک شیخ الشیخ خود شیخ پیر محمد قدس سرہ خواندہ رسم فاتحہ بجا آورد[2]۔	شیخ صاحب نے اپنے والد کے شاگرد میر محمد شفیع قدس سرہٗ کے سایۂ تعلیم و تربیت میں شروع سے آخر تک رہ کر کمالات و فضائل کی تحصیل میں کوشش کی، اور اٹھارہ سال کی عمر تک جملہ علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور اکیس ۲۱ سال کی عمر میں بطور برکت کے اپنے شیخ الشیخ حضرت پیر محمد قدس سرہٗ سے فاتحۃ الفراغ پڑھی۔

سبحۃ المرجان میں بھی اختصار کے ساتھ یہی درج ہے[3]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخ

---

[1] ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲، [2] ایضاً ص ۲۱۳ [3] سبحۃ المرجان ص ۸۷،

صاحب ۱۰۵۱ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی تعلیم و تربیت میں گیارہ بارہ سال تک رہے، پھر ۱۰۶۳ھ میں والد کے انتقال کے بعد چھ سات سال تک میر محمد شفیع کی خدمت میں رہ کر پوری تعلیم حاصل کی اور اٹھارہ ۱۸ سال کی عمر میں فراغت پائی، اس کے بعد شیخ پیر محمد سے شرف تلمذ حاصل کرکے اکیس ۲۱ سال کی عمر میں ۱۰۷۲ھ میں باقاعدہ سند فراغت حاصل کی، یعنی ان کے والد کے علاوہ ان کے دو اور استاد ہیں، نزہتہ الخواطر کی تصریح کے مطابق شیخ صاحب نے شیخ پیر محمد سے قدوری، شرح چغمینی اور تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا[۱۲]

۱۳۔ پیر محمد جونپوری لکھنوی حضرت شیخ پیر محمد بن اولیاء، ۲۶ رمضان ۱۰۲۷ھ میں جونپور کے ایک دیہات منڈیاہو میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا، چچا نے پرورش کی، مانک پور جاکر وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، وہیں شیخ عبد اللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، ان سے طریقت و روحانیت کی تربیت حاصل کرکے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، وہاں سے لکھنؤ آکر قاضی عبد القادر لکھنوی متوفی ۱۰۸۰ھ سے بقیہ کتب درسیہ پڑھیں، اس کے بعد دوبارہ شیخ عبد اللہ سیاح کی خدمت میں رہ کر طریقۂ چشتیہ میں مرتبۂ کمال کو پہونچے، شیخ عبد اللہ سیاح نے ان کو تاکید کی کہ پہلے علمی و تعلیمی اشغال میں کوشش کریں، پھر طریقت کے معاملات میں مشغول ہوں، اس نصیحت کے مطابق شیخ پیر محمد دہلی گئے اور شیخ حیدر کی خدمت میں رہ کر کتب درسیہ کی تکمیل کی، یہاں بھی ان کی ملاقات شیخ عبد اللہ سیاح سے ہوئی اور انھوں نے شیخ پیر محمد کو طریقت کے تمام طرق و سلاسل اور عوارف المعارف و جواہر خمسہ کی اجازت دی، علوم ظاہری اور

---

۱۲ نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳۔

علوم باطنی کی تحصیل و تکمیل کے بعد لکھنؤ واپس آکر تعلیم و تدریس اور ارشاد و تلقین کا مشغلہ اختیار کیا اور گیارہویں صدی میں دیار مشرق کے مشاہیر علماء و مشائخ میں شمار کئے گئے، ان کی تصانیف میں حاشیۂ ہدایہ، مجموعہ فتاوی، سراج الحکمۃ حاشیہ ہدایت الحکمۃ اور منازل اربعہ مشہور کتابیں ہیں، ان سے بہت سے علماء و مشائخ نے فیض پایا جن میں شیخ غلام نقشبند کے والد شیخ عطاء اللہ نمایاں ہیں، ۱۴ رجادی الاخری ۱۰۸۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور دریائے گومتی کے کنارے ایک ٹیلہ پر دفن کئے گئے جو بعد میں ٹیلہ محمد شاہ کے نام سے مشہور ہوا[1]۔

میر محمد شفیع دہلوی | میر محمد شفیع بن محمد مقیم حسینی دہلوی لاہور میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا، اور اپنی والدہ کے چچا محمد طاہر کے ساتھ جونپور چلے آئے، اور شیخ جلال الدین حسین پوری سے بیعت کرکے کچھ دنوں جونپور میں مقیم رہے، جب محمد طاہر لکھنؤ کی وقائع نگاری پر مقرر ہوئے تو ان کے ہمراہ لکھنؤ جاکر شیخ عبد القادر لکھنوی متوفی ۱۰۷۰ھ سے بعض کتابیں پڑھیں، اس وقت شیخ پیر محمد کی ذات مرجع بنی ہوئی تھی، میر محمد شفیع کچھ دنوں انکی خدمت میں رہے، اور ان ہی کے مشورہ سے دوبارہ جونپور جاکر وہاں کے اساتذہ سے کتب درسیہ کی تحصیل و تکمیل کی، اور واپس آکر شیخ پیر محمد سے باقاعدہ بیعت کی اور انکی خدمت میں رہے، اس کے بعد جب محمد طاہر کی تقرری گورکھپور میں ہوئی تو ان کے ہمراہ گورکھپور چلے گئے، یہاں حاکم شہر فدائی خاں ان کا معتقد ہوگیا، اسی دوران میں شیخ پیر محمد لکھنوی نے میر محمد شفیع کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی میں مستقل قیام کرکے خلق اللہ کی نفع رسانی کریں، چنانچہ وہ دہلی چلے گئے، فدائی خاں بھی دہلی گیا اور اس نے ان کے لئے ایک شاندار

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۴، ۳۵، نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۹۶ و ۲۷

مدرسہ اور خانقاہ | تعمیر کی، ۱۰۸۵ھ میں اپنے مرشد شیخ پیر محمد کے وصال پر لکھنؤ آئے اور اپنے شاگرد و رشید شیخ غلام نقشبند کو ان کا سجادہ نشین بنایا اس کے بعد حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اور ۸ محرم ۱۱۰۹ھ کو دہلی میں فوت ہوئے،[1]

جامعیت | شیخ غلام نقشبند علم و عرفان اور شریعت و طریقت میں جامع شخصیت رکھتے تھے، علوم دینیہ کے علاوہ علوم عقلیہ، علوم ادبیہ، نحو، لغت، اشعار عرب، ایام عرب اور شعر و ادب میں اپنے دور و دیار کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، وہ بیک وقت مدرس، مرشد، مصنف اور شاعر سب کچھ تھے، ان کے اوصاف و کمالات نے ان کو طالبانِ علوم اور طالبان فیوض دونوں کا مرجع بنا دیا تھا، آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے:-

علامہ ایست جامع عجائب و غرائب علوم خدا رسی، خازن اسرار العلوم مکتوم،[2]	وہ ایسے علامہ ہیں جو خدا تک پہنچانیوالے علوم کے عجائب و غرائب کے جامع اور علوم مخفیہ کے اسرار کے دانا ہیں،

سبحۃ المرجان میں ہے:-

ھو اوحد الزمان، والجامع بین العلم والعرفان،[3]	وہ یکتائے زمانہ اور علم و عرفان کے جامع ہیں،

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:-

یگانۂ روزگار، جامع شریعت و طریقت بود،[4]	وہ یگانہ روزگار اور شریعت و طریقت کے جامع تھے،

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۱۹، [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۳، [3] سبحۃ المرجان ص ۷۸، [4] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸،

صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:۔

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ.....	وہ شیخ عالم کبیر علامہ اور کبار اساتذہ میں
کان من کبار الاساتذۃ لم یکن	سے تھے ان کے زمانہ میں نحو، لغت، اشعار،
فی زمانہ اعلم منہ بالنحو واللغۃ	ایام عرب اور ان کے متعلقات کا ان
والاشعار وایام العرب وما	سے بڑا عالم نہیں تھا، نیز علوم حکمت و فلسفہ
یتعلق بہا، متوفر اعلی علوم الحکمۃ[1]	سے حصہ وافر رکھتے تھے،

شیخ صاحب اکیس[21] سال کی عمر میں ۱۰۷۲ھ میں تحصیل و تکمیل سے فارغ ہوئے، ۱۰۸۵ھ میں شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے تعلیم و تدریس اور ارشاد وتلقین میں مصروف ہوئے، بارہ تیرہ سال کی درمیانی مدت غالباً درس و تدریس میں گذری اور ۱۰۸۵ھ سے وفات ۱۱۲۶ھ تک اپنے مرشد کی جگہ مسلسل چالیس[41] سال تک علمی اور دینی خدمات انجام دیں،

شیخ پیر محمد کی وفات اور شیخ غلام نقشبند کی سجادہ نشینی

حضرت شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد شیخ غلام نقشبند کی جانشینی شیخ صاحب کی دینی اور علمی زندگی کیلئے مبارک ثابت ہوئی، اسی کے بعد ان کو قبول عام حاصل ہوا، اس سلسلہ میں ان کے والد کے شاگرد اور خود انکے استاد میر محمد شفیع نے اخلاص و ایثار کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ استادی اور شاگردی کی دنیا کا اہم واقعہ ہے جو آجکل کے اساتذہ و تلامذہ کے لئے سبق آموز ہے،

آزاد بلگرامی نے ماٰثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ شیخ پیر محمد قدس سرہٗ کی وفات کے بعد ان کے تمام خلفاء اور مریدوں نے باتفاق رائے میر

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳،

محمد شفیع کو اُن کا سجادہ نشین منتخب کرکے ان کے دہلی سے آنے تک سجادہ کو تہ کرکے رکھد میر محمد شفیع نے لکھنو آکر چاہا کہ اپنے بجائے اپنے شاگرد رشید شیخ غلام نقشبند کو سجادہ نشین بنائیں اور اس کو اسطرح چھپائے رکھا کہ شیخ غلام نقشبند کو بھی اس کی خبر نہیں دی، اور اس رسم کے لئے ایک دن مقرر کیا، جب لوگ جمع ہوگئے تو سجادہ کو خلفاء و مریدین کے سامنے بچھا کر شیخ غلام نقشبند کا ہاتھ پکڑا اور سجادہ پر بٹھا دیا، اور ان کے سامنے آداب مریدی کا سے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، ان کو دیکھکر تمام حاضرین نے ایسا ہی کیا، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں،

قدر و منزلت شیخ غلام نقشبند ازینجا توان دریافت کہ او را شایستہ خلافت دیدہ بجائے پیر نشاند، وآداب مریدانہ بجا آورد، فی الواقع شیخ غلام نقشبند سجادہ را رونق دیگر داد و مرجع طلاب ظاہری و باطنی گردید، و جہانے را بیمن تربیت از کمالات جبتیں گران مایہ ساخت سلسلۂ اکثر فضلائے عصر بہ آنجناب منتہی می شود، [1]

شیخ غلام نقشبند کی قدر و منزلت اسی سے معلوم کرنی چاہیے کہ میر صاحب نے ان کو سجادہ نشینی کے قابل سمجھکر اپنے پیر کی جگہ پر بٹھایا اور خود آداب مریدی بجالائے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ غلام نقشبند نے سجادہ کو کچھ اور ہی رونق بخشی اور علوم ظاہری و باطنی کے طالب علموں کے مرجع بنکر ایک دنیا کو اپنی تربیت کی برکت سے علمی و روحانی کمالات سے مالا مال کیا، اس زمانہ کے اکثر علماء و فضلاء کا سلسلۂ درس انہی پر ختم ہوتا ہے،

سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں،" ومن ھٰھنا یعرف علو منزلۃ الشیخ حیث وجدہ المیر اھلاً للسجادۃ وآثرہ علی نفسہ فی الجلوس علیھا، فزینھا الشیخ بالتمکین

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴؛

ونفع خلقاً کثیراً بالتدریس والتلقین وسلسلۃ الا کثرین من علماء العصر تنتھی الیہ[1]، نزہتہ الخواطر میں بھی شیخ غلام نقشبند کے حالات میں ان ہی کی جانشینی کی تصریح کی ہے، اگر میر محمد شفیع کے ذکر میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی مسند پر محمد آفاق بہاری کو بٹھایا　جو خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے،

میر صاحب سے خصوصی نسبت اور انکا احترام | میر محمد شفیع نے اپنے یتیم استاد زادے شیخ غلام نقشبند کی تعلیم و تربیت اور عزت و شہرت میں جس اخلاص و محبت کا ثبوت دیا، شاگرد نے ہمیشہ اس کا پورا لحاظ رکھا، چنانچہ میر صاحب کی وفات کے بعد جب لکھنؤ سے دہلی جاتے تھے تو ان کے مزار پر فاتحہ پڑھکر ایصال ثواب کرتے تھے، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

محل اقامت میر محمد شفیع شاہجہان آباد بود، و تکیۂ ایشاں دراں مصر جامع مشہور است، شیخ غلام نقشبند برائے زیارت میر قدس سرہٗ ہم در ایام حیات وہم بعد از ممات او بہ شاہجہاں می رفت و کسب برکات می نمود[2]

میر محمد شفیع کا قیام دہلی میں تھا، اور انکا تکیہ وہاں مشہور ہے، شیخ غلام نقشبند میر صاحب کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور کسب برکات فرماتے تھے؛

شیخ صاحب نے میر صاحب کی مدح میں عربی میں تین۲۰ اشعار کا ایک ..... قصیدہ بھی کہا ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

خلیلیَّ ھل ھاتان دارۃ جلجل　　ودارۃ سلمیٰ فی قفافی عقنقل

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۰، [2] مآثر الکرام ص ۲۱۴،

استاد کی شفقت اور شاگرد کے احترام کو دینی و علمی افادہ و استفادہ کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت حاصل ہے اور تعلیم و تعلم کا بھرم اسی ربط و تعلق سے قائم ہے، شیخ صاحب اور میر صاحب کا باہمی ربط اس کی بہترین مثال ہے،

تدریس و افادہ | شیخ غلام نقشبند اپنے اقران و معاصرین میں تعلیمی خدمات، تلامذہ کی کثرت اور علمی سلسلہ کی افادیت و وسعت میں خاص شہرت رکھتے ہیں، یوں تو ان کے دور میں دیار پورب میں بہت سے علماء و فضلاء اور مشائخ تعلیم و تلقین میں مصروف تھے مگر شیخ صاحب کے تعلیمی و تدریسی سلسلہ سے جتنا فیض پہنچا وہ اُن کا طرۂ امتیاز ہے، آزاد بلگرامی کا یہ بیان گذر چکا ہے "سلسلۂ اکثر فضلائے ہند بہ آن جناب منتہی می شود"، سبحۃ المرجان میں ہے "ونفع خلقا کثیرا بالتدریس والتلقین و سلسلۃ الاکثرین من علماء العصر تنتھی الیہ"،

تذکرۂ علمائے ہند میں ہے،

وتمام عمر گرامی خود بافادہ و تدریس طلبۂ علوم بسر بردہ جمعے کثیر از افاضل نامدار بسایۂ تربیتش بمراد خود رسیدند و سلسلۂ تعلیم اکثر علمائے ہندوستان بدو می پیوندد،[1]	شیخ صاحب نے اپنی پوری زندگی طالب علموں کے افادہ و تدریس میں بسر کی، اور فضلاء کی ایک بڑی جماعت انکے زیر تربیت رہکر بامراد ہوئی، ہندوستان کے اکثر فضلاء کا سلسلۂ تعلیم ان پر منتہی ہو

صاحب نزہۃ الخواطر نے "کان من کبار الاساتذہ" کے جامع الفاظ میں شیخ صاحب کی تعلیمی و تدریسی خدمات کو بیان کیا ہے،

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸،

شیخ غلام نقشبند نے شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کی جگہ سنبھالی اور تقریباً چالیس سال تک تعلیمی شغلہ جاری رکھا، یہ چالیس سالہ دور ان کی علمی زندگی کا حاصل ہے، ان کی درسگاہ میں طلبہ کی کثرت اور تعلیمی سرگرمی نے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے دور کی یاد تازہ کر دی، یوں تو ان کی درسگاہ سے صدہا طلبہ عالم و فاضل بنکر نکلے اور اپنے اپنے دیار میں علمی شہرت کے مالک ہوئے مگر ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ بانی درس نظامیہ ان سب میں شیخ صاحب کے سچے جانشین ثابت ہوئے، ان کے واسطہ سے شیخ صاحب کا تعلیمی سلسلہ پورے ہندوستان میں جاری و ساری ہوا۔

تلامذہ کے ساتھ شفقت و محبت شیخ غلام نقشبند بڑے شفیق مدرس تھے، ان کے علم و فضل کا اعتراف کر کے خوش ہوتے تھے، ان کی ترقی درجات کے لئے دعائیں اور نیک تمنائیں کرتے تھے، استاد کی اس شفقت سے طالب علموں کو بڑا فیض پہونچتا تھا، اسکی ایک مثال ملاحظہ ہو" میر عبد الجلیل بلگرامی بھی شیخ صاحب کے نامور شاگرد تھے، جن کے فضل و کمال کا وہ کھلے الفاظ میں اعتراف کرتے تھے، اور ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے تھے، آزاد بلگرامی میر عبد الجلیل کے تذکرے میں لکھتے ہیں:-

شیخ غلام نقشبند لکھنوی ہمیشہ تعریف و توصیف می نمود، شیخ غلام نقشبند ہمیشہ ان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے،

پھر یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ غلام نقشبند نے ایک تاریخی دائرہ بنا کر اپنے شاگرد امیر عبد الجلیل کے پاس بھیجا اور حروف ابجدی سے اعداد و تواریخ نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا، میر صاحب نے اس تاریخی دائرہ کا حل معلوم کر لیا اور خود

اسی طرح کا ایک دائرہ بنا کر استاد کی خدمت میں بھیجا تو استاد نے اپنے شاگرد کی فہم و فراست پر خوش ہو کر یہ خط تحریر فرمایا،

میر والا مدارج انسانی مجمع فیوضات ربانی
سلامت! گرامی نامہ خلت شمامہ مشتمل بر رسیدن
بلگرام و تفویض خدمت بخشی گری و وقائع
نگاری گجرات رسید، مسرت فراوان بخشید
الحمد للہ کہ بر وفق خواہش دوستاں با
جمعیت این طرف تشریف آوردند،
فقیر را مخلص صمیم دانستہ از یاد دعا
غافل ندانند، حق سبحانہٗ ہمیشہ در ترقی
جمعیت نشائتین دارد، دیگر رسالہ اعجاز
از دوائر رسید، زبان از مدحت آن
قاصر است، حقا کہ ذات سامی آیات
دریں زمانہ بے عدیل است، اللہ تعالیٰ
ایں افادہ مستدام دارد، زہے فطرت
صائب و ذہن ثاقب کہ سرش معلوم
نمودہ، دائرہ از خود وضع نمودند، غرض
کہ کمال سامی از تحریر بیرون است
دیگر از اشتیاق گرامی صحبت چہ برگذارد،

صاحب مدارج انسانی، مجمع فیوض ربانی
جناب میر صاحب! آپ کا محبت آمیز گرامی
نامہ پہونچا جس میں بلگرام پہنچنے اور
گجرات میں بخشی گری اور وقائع نگاری
پر تعیناتی کی خبر ہے، جس سے بہت زیادہ
خوشی ہوئی، الحمد للہ کہ دوستوں کی خواہش
پر آپ یہاں تشریف لائے، فقیر کو اپنا مخلص
سمجھئے اور اسے یاد اور دعا سے غافل نہ
سمجھئے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ علم و معرفت
کی ترقی عطا فرمائے، دوسری بات یہ ہے
کہ دوائر کا نقشہ معجز نما پہونچا، اس کی
تعریف سے زبان قاصر ہے، واقعہ یہ ہے
کہ آپ کی ذات بلند صفات اس زمانہ
میں بے مثل ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی افادیت
کو قائم و دائم رکھے، کیا ہی فطرت صائب
اور ذہن ثاقب ہے، آپ نے خود دائرہ
بنایا ہے، الغرض آپ کا کمال تحریر سے

اللہ تعالیٰ بوجہ احسن بپنہ رآورد، والسلام، بالا تر ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی صحبت گرامی کا بیحد اشتیاق ہے، اللہ تعالیٰ بخیر وخوبی اس کا موقع دے،

شیخ صاحب کے اس ایک مکتوب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شاگرد وں پر کس قدر شفیق تھے، اور ان کے فضل و کمال کا کتنا کشادہ دلی سے اعتراف کرتے تھے،

(باقی)

لہ ماثر الکرام ص ۲۵۹، ذکر میر عبد الجلیل بلگرامی،

حیات شبلی

یہ ایک ایسی ہستی کے سوانح کے اوراق ہیں جس نے ۳۲ برس یعنی ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ساری اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا یہ عہد جدید کے سب سے بڑے عالم کی زندگی کے واقعات ہیں جن میں قدیم کے ساتھ جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو تھے، اس لئے وہ قدیم و جدید کے سنگم تھے، وہ قدیم علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید علوم کے بہت سے آرا، وخیالات سے واقف بھی، قدیم علما رکی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، وہ محقق بھی تھے۔ اور شاعر بھی، انشا پرداز بھی تھے، اور خطیب بھی، اور نئے زمانہ کے اقتضا رات و مطالبات سے کسی حد تک ہم آہنگ ہونے کے باوجود بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے، اور یہ سب رنگ اُن کی زندگی میں نمایاں تھے، جن پر لائق شاگرد نے فاضل استاد کے اسلوب و طرز ہی میں پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اور اُن کی زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مقدمہ میں دیا رِ مشرق کی جن میں اعظم گڈھ بھی شامل ہے۔ مولانا شبلی کے دور تک علوم اسلامیہ کے درس و تعلیم کی پوری تاریخ آگئی ہے،

مولفہ:- مولانا سید سلیمان ندوی، قیمت:- ۱۰ روپیے ۵۰ پیسے "منیجر"

علم بلاغت کی ابتداء اور ارتقاء

از
جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے

(۲)

رسائل الانتقاد (ابن شرف، ابن شہید اور خوارزمی) خوارزمی اور ابن شرف کے ادبی رسائل کو عربی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان رسائل میں بلاغت کی بہت سے مسائل پر بحث ہے، ابن شرف کے ایک معاصر ابن شہید کا نام بھی بلاغت کی تاریخ میں آتا ہے جنھوں نے التوابع والزوابع لکھی، لیکن ان کے یہاں کوئی خاص جدت و ندرت نہیں ہے،

الشعر والشعراء (ابن قتیبہ) ابن قتیبہ نے علم بلاغت سے متعلق باقاعدہ کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی، لیکن چونکہ ابن قتیبہ کا نام ان چند گنے چنے نقادوں میں شمار ہوتا ہے، جنھوں نے پہلے پہلے بلاغت کے اصولوں اور معیاروں کے مطابق شعر و شاعری پر مبسوط و مدلل بحث کی، شاعروں کے مختلف مدارج و مراتب مقرر کیے اسلئے ان کا تذکرہ بھی غیر ضروری نہیں ہے،

ابن قتیبہ نے اشعار کی تہذیب و تنقیح اور ان کی حقیقی اقدار سے پہلی بار شائقین ادب کو آشنا کیا، اپنے کسی بیان کو دلائل سے تشنہ نہیں رکھا اور بلاغت اور نقد کے اصولوں کو شعوری یا لاشعوری طور پر بڑی حد تک برتا، الشعر والشعراء ہی طرح ایک دوسری کتاب 'ادب الکاتب' بھی اس نے لکھی،[1]

---

[1] ابن خلدون مقدمہ

امام عبدالقاہر جرجانی | عربی علوم وفنون کی تاریخ میں پانچویں صدی ہجری کے مایۂ ناز جلیل القدر فاضل امام عبدالقاہر جرجانی کا نام اور کام نہایت نمایاں ہے، عبدالقاہر نہ صرف ایک ماہر علم بلاغت کی حیثیت سے مشہور ہیں بلکہ ایک کہنہ مشق شاعر، ماہر لسان ولغت ادیب، سخن سنج نقاد اور امام النحاۃ کی حیثیت سے بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں، انھوں نے صرف، نحو، عروض اور بلاغت کے اصول وقواعد کے منتشر ذخائر کو مرتب ونسق کرکے استنباطات مسائل کے ذریعہ فن تنقید، نحو وصرف اور بلاغت کے بنیادی اصولوں کا احیاء کیا،

سچ یہ ہے کہ اگر عبدالقاہر نہ ہوتے تو قرآن کے بلاغی اعجاز تک ہماری رسائی بہت مشکل تھی۔ اہل نظر کے درمیان یہ مقولہ مشہور ہے "لولا عبدالقاهر والزمخشری لضاعت بلاغة القرآن عنا"، ڈاکٹر احمد بدوی نے مصر سے ایک مستقل کتاب عبدالقاهر وجهوده فی البلاغة العربية لکھکر تمام اہل علم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عبدالقاہر نے جاحظ، ابن المعتز، اور اپنے استاد قاضی علی جرجانی سے اکتساب فیض کرکے ایک بالغ نظر محقق کی طرح تدقیق وتحقیق کے ساتھ منظم ومستحکم بلاغی کارنامے اس طرح پیش کئے کہ ان کی اپنی جدت وجودت نمایاں ہے۔" اگر رنگ برنگے دھاگوں کی مدد سے انھوں نے ایک شاندار قبا تیار کرکے پیش کی تو یہ فنکاری ہی کیا کم اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بجا طور پر معمار بلاغت ہیں۔ یحیی بن حمزہ علوی اپنی کتاب الطراز میں رقم طراز ہیں۔

"وأول من أسس هذا الفن (أي البلاغة) قواعده وأوضح براهينه وأظهر فوائده ورتب قوانينه، الشيخ العالم علم المحققين عبد القاهر الجرجاني"[۲]

۱۔ بحوالہ احمد بدوی: عبدالقاهر وجهوده فی البلاغة العربیہ ص ۱۳۵، ۲۔ الطراز ص ۱۴۴

جرجانی علم معانی کے بانی ہیں۔ معانی، بیان اور بدیع کے مسائل کو مدون کر کے الگ الگ علوم کی حیثیت سے فروغ دینے کا کام جرجانی ہی نے کیا۔ الرسالۃ الشافیہ اسرار البلاغہ، اور دلائل الاعجاز ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ ان سب کتابوں میں منطق و فلسفہ کا الجھاؤ نہیں سجع بندی اور عبارت کی رنگینی کا بھی گزر نہیں۔ سادگی اور فصاحت کے ساتھ خالص ادبی اور بیانیہ انداز میں قرآن حکیم کے بلاغی اعجاز کے دلائل اور بلاغت کے اسرار و رموز قاری کے ذہن میں آسانی سے اتار دینا عبد القاہر کا طغرائے امتیاز ہے۔

دلائل الاعجاز دلائل الاعجاز میں شیخ عبد القاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) نے قرآن کریم کے ادبی اعجاز اور بلاغی کارنامے مدلل و مبرہن کئے ہیں، اور دکھایا ہے کہ اہل عرب اپنی بے پناہ ادبی مہارتوں اور بلاغی صلاحیتوں کے باوجود قرآن کریم کی بلاغت کو کیا اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ قرآن نے بار بار ان کی ادبی صلاحیتوں کو چیلنج کیا۔ لیکن وہ اس کے جواب سے عاجز رہے، وہ لکھتے ہیں:-

"انه لو لم یکن عجزهم عن معارضة القرآن وعن ان یاتو بمثله لانه معجز فی نفسه لکن لان أدخل علیهم العجز عنه وصرفت هممهم وخواطرهم عن تالیف کلام مثله"

جرجانی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہر نبی کو اس کے زمانہ کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی معجزہ خاص طور سے عطا فرمایا۔ حضرت عیسیٰ مسیح کو فروغ طب کے زمانہ میں مسیحائی دی گئی موسیٰ کلیم کو ساحری کے دور میں عصائے کلیمی دیا گیا۔ صنعت و صناعت کے زمانہ میں حضرت داؤد کو لحن داؤدی کے ساتھ ساتھ لوہا پگھلانے اور اسلحہ بنانے کی قدرت کا معجزہ بخشا گیا۔ آنحضرت کے زمانہ میں اہل عرب اپنی فصاحت و بلاغت پر نازاں تھے۔ دوسروں کو عجم

اس لئے آپ قرآن حکیم کی صورت میں ایک ادبی و بلاغی معجزہ لیکر مبعوث ہوئے۔
.جانی نے نحوی مباحث کی ترویج اور علم معانی کی تاسیس کے ذریعہ بکثرت معاییر
، کے سہارے اسی اعجاز کو مدلل و مبرھن کیا۔

البلاغۃ | شیخ عبدالقاہر نے اسرار البلاغہ، دلائل الاعجاز سے پہلے لکھی تھی۔
، کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ علم بلاغت کی خالص فنی کتاب ہے جس کا مقصود بحیثیت
، کے علم بلاغت کا مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں جرجانی کے بلاغی جوہر علم برائے علم، کے نقطۂ
طرسے زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔ آیات قرآنیہ سے استشہاد اس میں کم
ہے۔ شعرار، ادبار اور فلاسفہ کے اقوال سے بحث زیادہ ہے۔ ارسطو اور اس کے شاگرد
افلاطون کے حوالے بھی ہیں۔ اسرار البلاغہ میں بحیثیت ادیب ان کی حیثیت ابھری
ہوئی ہے۔

شعر اور خطاب کے درمیان فرق کرتے ہوئے ارسطو نے کہا تھا۔ خیر الشعر اکذبہ
اس کی مراد اس قول سے شاید مبالغہ و اغراق تھا۔ عبدالقاہر اس کی لطیف توجیہہ پیش
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادبیت کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک شاعرانہ مفہوم اور دوسرا حقیقی
مفہوم بیان شاعرانہ تعبیر مقصود ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ خیر الشعر اصدقہ"
البتہ شعر الشعر اکذبہ، بہرکیف ممکن ہے۔

اسرار البلاغۃ' میں علم بیان کے عناصر زیادہ نمایاں ہیں جب کہ اول الذکر میں علم المعانی
اور دیگر اصناف بلاغت سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ابن الرومی کے کلام پر علماء
تشبیہات و استعارات وغیرہ کی بحث جو انھوں نے ابن الرومی کی توصیف نرگس پر پیش کی
خصوصیت سے قابل مطالعہ ہے۔

یہ دونوں کتابیں بلاغت اور ادبی تنقید کی شاہکار ہیں۔ عربی ادب کا کوئی بھی طالب علم ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ✓

الکشاف للزمخشری | یہ کتاب بنیادی طور پر جیسا کہ سب جانتے ہیں تفسیر کی کتاب ہے۔ لیکن فن بلاغت ہی اس تفسیر کی بنیاد ہے۔ جار اللہ زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) نے علم معانی اور علم بیان کی روشنی میں قرآن کریم کی بلاغت ثابت کی ہے۔ اور اس طرح اس کے اعجاز کو ثابت کیا ہے۔ اس حیثیت سے بھی اس کی تفسیر کو دوسری تفسیروں میں خاص فضیلت و فوقیت اہل علم کے درمیان حاصل رہی ہے۔ اہل تاریخ کہتے ہیں "لولا عبد القاهر والزمخشری لضاعت بلاغة القرآن عنا" یہ مقولہ زمخشری کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عبد القاہر کے دوش بدوش انہیں جگہ ملی۔

زمخشری معتزلی تھے۔ اس لیے جا بجا عدل اور توحید، کی معتزلی اصطلاحات کے پردے میں بدعت و اعتزال سمونے سے بھی نہیں چوکتے۔ ابن خلدون اس کے پہلو سے متنبہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"زمخشری علم بلاغت کے ذریعہ تفسیر قرآن کرتے ہیں۔ وہ اس کے مرد میدان ہیں۔ تفسیر کشاف کا مطالعہ ایسے ہی شخص کے لیے مناسب و مفید ہو سکے گا۔ جو ایک طرف تو عقائد اہل سنت میں مضبوط و پختہ ہو تو دوسری طرف علم بلاغت کا بھی ایسا ماہر ہو کہ جہاں زمخشری اہل سنت کے عقیدے سے انحراف کر کے نکات بلاغت کے پردہ میں بدعت و اعتزال کی بات کرنے لگیں وہاں وہ علم کی روشنی میں اس کی تردید کر کے صراط مستقیم پر ثابت قدم رہے"[1]

---

[1] ابن خلدون فی المقدمہ ص ۵۰۳، (ترجمہ عنایت اللہ)

ابن منیر نے ایک مخصوص کتاب "الانتصاف" لکھی ہے۔ جس میں تفسیر کشاف کے معتزلی عقائد کا پردہ چاک کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بلاغت کے لعل و گہر میں ان عقائد کی حیثیت خزف ریزوں سے زیادہ نہیں، جن سے کتاب کی بلاغی قدر و قیمت پر حرف نہیں آ سکتا۔

زمخشری نے شیخ عبدالقاہر کی کتابوں سے بہت استفادہ کیا۔ تعریف و تنکیر، تقدیم و تاخیر، فصل و وصل، حذف و ذکر کے مسائل میں جرجانی کی چھاپ نمایاں ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وہ کہیں بھی اپنے پیشرو کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ اسے محض فیضان الٰہی کہہ کر اپنے نجی کمال کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ جیسا کہ مقدمۃ الکتاب میں کہتے ہیں: "وما ھی الا آیۃ من آیات اللہ وبرکۃ ھذا البیت المحرم التی افیضت علیّ"[1]

بہرحال اس سے زمخشری کے کارنامے کی بلندی میں فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ان کا اصل کمال علم بلاغت نہیں علم بلاغت کے مسائل کی تطبیق ہے۔ جو بجائے خود قابل تعریف ہے۔ انھوں نے دوران تفسیر میں بہت سے مفروضہ سوالات کے جوابات فان قلت، قلت کہہ کہہ کر دیئے ہیں۔ کہیں کہیں اگر یوں کہیں تو میں پیوندوں کی تکرار سے عبارت کی روانی اور فصاحت میں خلل پڑتا ہے۔ اور گرانی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن معترضین کی تشفی کے لیے اور صورت بھی کیا ہو سکتی تھی۔

مفتاح العلوم (سکاکی) ساتویں صدی کی ابتدا میں ابو یعقوب سکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ) کی مایہ ناز کتاب "مفتاح العلوم" نمودار ہوئی۔ اس کتاب میں علم معانی کے مسائل خصوصاً منطقی اسلوب بیان میں پیش کیے گئے۔ نحو، صرف، عروض اور علوم بلاغت کے تمام مسائل منطقی و فلسفیانہ انداز نظر کے ساتھ بکثرت درج ہیں۔ یہ کتاب بلاغت کا

---

[1] الزمخشری: مقدمہ تفسیر الکشاف۔

ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔

سکاکی نے معانی کے مباحث کو بیان سے بالکل علاحدہ کر کے پیش کیا ہے پھر تینوں فنون پر الگ الگ ابواب لکھے ہیں۔ اس کی جزئیات مقرر و مرتب کیں اور اسے صحیح معنوں میں باقاعدگی عطا کی سچ پوچھئے تو امام سکاکی ہی نے بلاغت کے مسائل کو بلو کر اسکا لب لباب پیش کیا۔ [1] ابن خلدون کے الفاظ میں "یہ کتاب متاخرین کی نظروں میں ایسی چڑھی کہ بعد میں سب نے اس کو نمونہ بنایا۔ بے شمار متون اسی کتاب کی روشنی میں تیار کئے گئے۔ جو آج تک پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ سکاکی نے خود التبیان، کے نام سے اسکا خلاصہ تیار کیا، ابن المالک نے المصباح، اور جلال الدین قزوینی نے الایضاح، میں اسی کتاب کا خلاصہ اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔ سبکی نے شرح لکھی اور سعد الدین تفتازانی نے مختصر المعانی کے نام سے ایک اور خلاصہ تیار کیا۔

المثل السائر (ابن الاثیر) | ساتویں صدی کے اہل بلاغت میں ضیاء الدین ابن اثیر (المتوفی ۶۳۷ھ) کا کام بھی کسی سے کم نہیں، اس کتاب میں آمدی اور ابن سنان سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر میں ایک مقدمہ اور دو ابواب ہیں اور منطقی طرز استدلال ابن سنان سے کچھ زیادہ ہے۔ ایک باب صناعت لفظی سے متعلق ہے، اور دوسرا صناعت معنوی سے۔ اول الذکر باب میں صیغوں کے حسن و قبح، تعقید اور منافرت وغیرہ سے بحث ہے۔ دوسرے باب میں تجرید و التفات، تقدیم و تاخیر، حروف عطف اور کنایہ و تعریف وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو ہے۔

ابن اثیر نے اشعار سے زیادہ نثری ادب سے مدد لی ہے۔ ادبی تنقید تفصیلی کے بجائے

---

[1] احمد حسن الزیات:۔ تاریخ ادب عربی۔

اجمالی ہے۔نمونے بغیر اظہار رائے کے پیش کئے ہیں۔جن کے سمجھنے اور مطابقت پیدا کرنے میں با اوقات زحمت ہوتی ہے۔ ان کی رائے میں اصل کمال ادا کا ہے، مبتذل کلمہ بھی اگر سلیقہ مندی سے استعمال کیا جائے تو غیر مبتذل ہوجاتا ہے۔جب کہ نفیس و متین الفاظ بھی بار بار دوہرانے یا ٹھیک سے ادا نہ کرنے کی بنا پر کبھی کبھی مبتذل ہوجاتے ہیں" ان النفیس یبتذل بکثرۃ الاستعمال والکلمۃ المبتذلۃ قد تنقذ ابتذالها"

حاصل کلام یہ کہ المثل السائر تقلیدی کتاب ہونے کے باوجود بھی سلسلۂ تاریخ بلاغت کی ایک اہم کڑی ہے

آٹھویں صدی ہجری کا بلاغی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اب علم بلاغت کے دو مکاتب فکر وجود میں آگئے تھے۔ ایک عام ادبی مکتب خیال اور دوسرا سکاکی کا زیر اثر خالص بلاغی اور منطقی مکتب فکر۔

یحیی بن حمزہ علوی اور ابن القیم اول الذکر طبقے سے متعلق ہیں اور قزوینی، عضد ابن سبکی اور سعدالدین تفتازانی سکاکی گروپ کے زیر اثر دونوں اسکولوں کے درجنوں اہل قلم اپنے اپنے انداز پر بلاغت کی ترویج و اشاعت میں لگے رہے لیکن کوئی تخلیقی کارنامہ سکاکی کے بعد ایجاد نہ کیا جاسکا۔

الفوائد (ابن القیم) بلاغت کے ادبی مکتب فکر کے نمائندہ ابن القیم نے اس کتاب کی تالیف میں کتابی اور غیر کتابی مصادر و مراجع سے استفادہ کیا ہے ابن المعتز اور اسامہ بن منقذ کی البدیع، حاتمی کی الحالی، اور المحاضرہ، ابن اثیر کی الجمع الکبیر، رجبانی کی نظم القرآن، عسکری کی صناعتین انصاری کی التامیل، اور

ابن ابی الاصبع کی التنزیہ سے استفادہ کا تذکرہ خود ابن القیم نے کیا ہے۔ غیر کتابی مراجع میں ان کے درجنوں مشائخ اور خود ان کی کدوکاوش اور عبقریت کو بھی دخل ہے۔
یہ کتاب بلاغت کی ۱۳۲ قسموں پر مشتمل ہے، ۲۲ قسمیں مجاز کی ، ۴۰ معانی کی اور ۴۲ الفاظ سے متعلق ہیں۔ باقی اقسام تینوں اصناف پر حاوی شاخ در شاخ مسائل پر مشتمل ہیں، موضوع اعجاز القرآن ہی ہے۔ ابن قیم کی حنبلیت بھی کتاب میں جا بجا جھلکتی ہے۔

عروس الافراح (ابن السبکی) | امام سکاکی کے مقلدین میں ابن سبکی اپنی کتاب عروس الافراح کی بنا پر مشہور ہیں۔ یہ دراصل قزوینی کی تلخیص المفتاح کی شرح ہے۔ اس کبیر الحجم کتاب کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

(ا) شارح نے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں، منطق، نحو، لغت وغیرہ کے لاتعداد مسائل جنہیں غیر متعلق رطب و یابس کی بھی کمی نہیں۔

(ب) عقلیت پسندی کا غلبہ ہے۔

(ج) شارح کی شخصیت لاتعداد افکار واشخاص کے دھندلکوں میں گم ہوگئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مصنف نے تین سو سے زیادہ اہل علم سے استفادہ کیا ہے۔

مختصر المعانی (سعد الدین تفتازانی) | علامہ تفتازانی نے قزوینی کی تلخیص المفتاح للسکاکی کی شرح وتلخیص مختصر المعانی اور مطول کے نام سے کیں۔ مختصر المعانی ہر زمانہ میں طلبار بلاغت میں مقبول رہی۔ اس کتاب میں بڑے سلیقہ سے بلاغت کے تینوں اصناف کے مسائل منطقی طرز استدلال سے

واضح کیے گئے ہیں بلاغت کے ہر طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ ضروری سمجھا جاتا ہے"

مواہب الفتاح (احمد بن یعقوب ولالی) بارہویں صدی ہجری کے شروع میں ابن یعقوب (م ۱۱۲۸ھ) نے مواہب الفتاح لکھکر مکمل تقلید کی مثال قائم کر دی۔ سعد الدین تفتازانی کے نقش قدم پر عقلی استدلالات اور تاملات کے اضافے کے ساتھ حوالوں کے ذریعہ توضیحات و تعلیقات اس کتاب کا بنیادی کام ہے۔ جو محض تقلیدی ہے۔ لیکن بہر حال مصنفین بلاغت کے زمرے میں آتے ہیں۔ ابن الخطیب، الشریف، اور ابو القاسم سبتی کا شمار بھی تاریخ بلاغت کے سلسلہ میں کیا ہے۔ جنھیں بلاغت کے کاموں سے خصوصی لگاؤ رہا۔[1]

دورِ حاضر میں علم بلاغت دورِ حاضر میں علم بلاغت پر کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا، اور نہ اس قسم کی کوئی توقع ہے۔ تاہم ایسے متعدد اہل علم موجود ہیں، جنھوں نے جدید تنسیق و تہذیب کے ساتھ علوم بلاغت کے احکام و مسائل کو نئے اسلوب سے مبوّب و مفصل کر کے پیش کیا ہے۔ جس سے نئی نسل کے بلاغت کے مشکل مسائل تک رسائی حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے۔

ان اہل قلم میں جنھوں نے بلاغت کے صہبائے کہن کو نئے جام و ساغر میں پیش کر کے بیش بہا خدمات انجام دیں، امین الخولی (البلاغۃ العربیۃ واثر الفلسفۃ فیہا)، علی الجازم و احمد مصطفیٰ (البلاغۃ الواضحۃ)، بطرس البستانی (البیان)، اور السید احمد الہاشمی (جواہر البلاغۃ فی المعانی والبیان والبدیع) کے نام اور کام نمایاں ہیں۔ ان کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] محمد بن تاویت، مقدمہ "دلائل الاعجاز" سے استفادہ

چین میں اسلام کا داخلہ

مترجمہ

ضیاء الدین اصلاحی

چین میں اسلام کے داخلہ کے ذکر سے عربی ماخذ تقریباً خالی ہیں، جن کتابوں میں اسکا کچھ ذکر بھی ہے وہ بالکل منتشر، ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چینی زبان سے عرب ناواقف ہیں اسی لئے چینی زبان وادب اور ثقافت و تاریخ کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرنا بڑا مشکل ہے، دوسرے چین مشرق بعید میں ہونے کی وجہ سے عرب ملکوں سے بہت دور ہے، اور گذشتہ کئی صدیوں سے عربوں سے اس کے تعلقات بھی منقطع تھے، اسی بنا پر وہ عالم اسلام سے بالکل الگ تھلگ ہو گیا، چین کے جو مسلمان عربی ملکوں میں جاتے ہیں، وہ محض فریضۂ حج ادا کرکے واپس چلے آتے ہیں، عربی زبان سے ان کی ناواقفیت کی بنا پر عربوں کو ان سے بات چیت اور استفادہ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

چین میں کمیونزم کے تسلط نے مسلمان علماء کی ان اہم علمی و دینی اور تاریخی کتابوں اور بیش قیمت مخطوطات و نوادر کو ضائع کر دیا، جو بہت قدیم اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی تصنیف تھے، ان میں بعض تیسری صدی کے مذہب مصاحف بھی تھے،

ان ہی وجوہ سے اس کا بہت کم پتہ چلتا ہے کہ چین میں اسلام کب آیا؟

چینی تاریخ کوان تانگ (Kwon Tung) میں بہت صراحت کے ساتھ درج ہے کہ

"اسلام ۶۱۸ء میں خاندان ٹانگ (Tang) کے بادشاہ تائی سانگ (Tai Sung) کے عہد حکومت میں چین پہنچا اور کنٹن (Canton) کے شہر میں قیام پذیر ہوا۔

اسی تاریخ میں یہ بھی ہے کہ

"مذہب اسلام ایک معبود برحق پر ایمان لانے کا داعی اور بتوں کی پرستش سے روکنے والا ہے، اس کے متبعین نمازوں کی ادائیگی کے لیے مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں، وہ شراب نہیں پیتے، نہ سور اور مردار کھاتے ہیں۔ صرف اپنے ہاتھوں سے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان مسلمانوں کو ہوئی (Huui) کہا جاتا ہے۔

کنٹن کے باشندوں کی درخواست پر مسلمان مبلغین چین میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ اور اور یہاں خاص طرز کے ایسے مکانات تعمیر کئے تھے جن کو دیکھتے ہی سے معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ان کی اجتماعی زندگی بڑی پاکیزہ اور دوسروں کے لئے عمدہ نمونہ تھی۔"

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری یعنی ۶۱۸ء میں اسلام چین میں داخل ہوگیا تھا۔ اور اسی سال مسلمان مبلغین وہاں آباد بھی ہوگئے تھے۔

مالزشی[1] مورخ استاذ عبداللہ لکھتے ہیں کہ "اسلام سے بھی پہلے سے عرب اور چین کے درمیان تعلقات قائم تھے۔ وہ تجارت کے لیے چینی بندرگاہوں اور ساحلی علاقوں سے ہوتے ہوئے کشتیوں کے ذریعہ فوکین (Fukien) کے جنوب اور کوانٹانگ (KwanTang) میں پہنچ چکے تھے۔ اور اکثر نے چین میں سکونت اختیار کرکے اسکو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔ ان کا اصلی مقصد تجارت تھا۔ اور یہ لوگ چین سے چائے، لکڑیاں ریشمی کپڑے، مسالے اور جڑی بوٹیاں اپنے ملک بھیجتے تھے، اسلام کے بعد دونوں ملکوں کے

---

[1] یہ چینی مسلمانوں کے ایک فرقہ کا نام ہے جو مالزی نام کے ایک شخص کی جانب منسوب ہے (مترجم)

تعلقات اور زیادہ مستحکم ہو گئے، کیونکہ اکثر چینی خاندانوں میں اسلام کی دعوت پھیل چکی تھی، جس وفد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فغفور چین کے پاس اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا تھا، اس کے قائد وہب بن ابی حفصہ تھے۔ اس وقت سے عرب و چین کے تعلقات محض ذاتی اور اقتصادی نوعیت ہی کے نہ رہ گئے تھے۔ بلکہ وہ دینی و اعتقادی نوعیت کے بھی ہو گئے تھے۔ وہب بن ابی حفصہ کا کنتن شہر میں انتقال ہوا۔ ابھی تک ان کی قبر یہاں موجود ہے۔"

ان دونوں بیانات میں کوئی تضاد نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پہلے بیان میں اس کا ذکر ہے کہ مسلمان مبلغین ۶۱۸ء میں چین پہنچے اور مالزی مورخ کا یہ بیان ہے کہ اسلام سے بھی پہلے سے دونوں ملکوں میں تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اسلامی دور میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے چین میں ایک وفد بھیجا۔ ظاہر ہے کہ یہ ۶۱۸ء ہی کا واقعہ ہوگا۔

کوان تانگ کی تاریخ میں اس کا بھی ذکر ہے کہ "چین میں سب سے پہلی مسجد کنتن میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا نام "ذوالمنارۃ المنیرۃ" (Kwong Tan se) ہے، یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وفد کے چین پہنچنے کے نو سال بعد ۶۲۷ء میں تعمیر ہوئی تھی۔

ایک چینی مورخ (Chien Ching lien chong) نے اپنی تاریخ چین (Kwo Kli Kse) کی چھٹی فصل میں جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں ایک صحابی کو بادشاہ چین (Sue Yang Ti) کے عہد میں بھیجا۔ یہ وفد بحری راستہ سے شہر کنتن (Can Ton) اور ریاست تین سان نام لوک (Tien San Nam Luk) پہنچا، یہاں کے اور لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور متعدد مسجدیں تعمیر کی گئیں، ایک بعد

ایک صحابی ابن حمزہ کی قیادت میں تین ہزار افراد پر مشتمل ایک وفد عرب سے آیا اور
اس نے چین کی ریاست سان کان فو (San can Fo) کو اپنا وطن اور
مستقر بنایا۔"

گو اس مورخ نے دوسرے مورخین کی طرح ۶۱۸ء کی تصریح نہیں کی ہے۔ لیکن
اس کے اس بیان سے کہ "ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں اسلام چین کے اندر پھیلا"
اسی کی تائید ہوتی ہے، اور اس پر تو سارے چینی مورخین کا اتفاق ہے کہ اسی صدی میں
یہاں اسلام داخل ہوا اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔

چین کی کتب تاریخ میں پہلے وہب بن ابی حفصہ کے نام کا ذکر ہے، مگر دوسرے مورخین
کے یہاں اس سے مختلف نام بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ بعض نے جابر بن الاسود کا نام تحریر کیا ہے
اور لکھا ہے کہ یہ شہر ہانگ کاؤ (Hongcow) پہنچے تھے۔ ان ناموں کے سلسلہ میں تحقیق
ضروری ہے۔ مورخ مالزی الحاج زین العابدین عباس اپنی کتاب "تاریخ محمد اور اسلام
کا چین میں داخلہ" میں لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے جب مسلمان نے چین پہنچ کر وہاں کے قبائل کو اسلام کی دعوت
دی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی چچا تھے۔

چین کی اسلامی تاریخ میں ایک مشہور و معروف نام سعد اللبید کا ملتا ہے، انھوں
نے وہاں اسلام کی اشاعت کی تھی۔ اور وہ مہاجرین حبشہ میں تھے حبشہ سے مکہ واپسی کے
بعد وہ چین تشریف لائے، اور بندرگاہ (Chuan chow) میں رہے،
یہاں پہلے سے عرب تاجر آباد تھے مگر ان کو اسلام کی دعوت کا کوئی علم نہیں تھا،
سعد کی دعوت پر یہ لوگ اسلام لائے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام عہد نبوت میں چین میں داخل ہوا اور اہل عرب اس سے پہلے سے وہاں آباد ہو چکے تھے۔ اور جب سعد اللہ چین پہنچے تو وہ اسلام کی دعوت سے بے خبر تھے۔ اس لئے انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔

چین کی تاریخ میں خاندان تانگ کی حکومت کا زمانہ عہد زریں سمجھا جاتا ہے، یہ بڑی فارغ البالی اور آزادی کا دور تھا، اس میں ہر شخص کو اس کا پورا اختیار تھا کہ وہ جس دین و مذہب کو چاہے اختیار کرے، اسی عہد میں اسلام کی چین کے اندر اشاعت ہوئی، لیکن حکومت نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔

اسلام سے پہلے چینی مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، جن میں سخت جنگ و جدال برپا رہتا تھا، اسلام نے آکر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور ان کو ایک عقیدہ و ایمان پر جمع کرکے ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا، حالانکہ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کے شدید جانی دشمن تھے۔

اسلام کی بلند پایہ اخلاقی تعلیمات نے چینی مسلمانوں کو خاص طور پر بہت متاثر کیا، انھوں نے قرآن مجید کو اپنا مطمح نظر بنایا اور ان کی بدولت چین میں اسلام کی بڑی نشر و اشاعت ہوئی۔ لیکن وہ پورے چین میں نہیں پھیل سکا اور اس کا دائرہ بعض متعین خطوں ہی تک محدود رہا کیونکہ چین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کی آمد و رفت میں بڑی دشواری تھی۔ لیکن عرب ملکوں کا چین سے تعلق برابر قائم رہا اور عربی و ایرانی مسلمان ہمیشہ وہاں پہنچتے رہے۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ کے زمانہ میں بھی ایک وفد ۱۵۰ھ میں چین گیا تھا۔ چین کے بادشاہ کا سفیر جب حضرت عثمانؓ کے پاس آیا تو انھوں نے اس کا

پرتپاک خیر مقدم اور بڑا اعزاز کیا۔ اور جب وہ چین واپس جانے لگا تو انھوں نے چینی بادشاہ کے لیے ہدایا و تحائف بھی بھیجے اور اس کے ہمراہ ایک مسلمان قائد کو بھی روانہ کیا۔ شہنشاہ چین نے ان دونوں کا شہر سیانگ فو (Siang Fo) میں شاندار استقبال کیا۔

چینی تاریخوں میں اس سال کو اسلامی وفد (Yong Hui) کا سال کہا جاتا ہے۔

چینی تاریخوں میں یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں تقریباً ایک سو بیس ہزار عربوں نے چین کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔ اور خاندان تانگ کی حکمرانی کے دور میں وہاں ان کو نمایاں حیثیت اور ممتاز درجہ حاصل تھا۔ یہ حالت خاندان سانگ (Sung) کے زمانہ ۹۹۰ء تک رہی۔

۷۱۳ء میں قتیبہ بن مسلم باہلی ترکستان میں بخارا و سمرقند پہنچے اور یہاں سے چین اور منگولیا آئے اس وقت کاشغر (Kashgar) کا بادشاہ مسلمانوں کو جزیہ دیتا تھا۔ قتیبہ نے چھ مسلمانوں کا ایک وفد مشموح کلابی کی سربراہی میں فغفور چین کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا۔ یہ شانگ تانگ (Shang Tung) بادشاہ کا دور تھا۔ قتیبہ نے وفد سے عہد لیا تھا کہ وہ فغفور چین کے اسلام لانے سے پہلے واپس نہ آئے گا۔ لیکن وفد کے فغفور چین کے دربار میں پہنچنے سے پہلے ہی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے قتیبہ کو دارالخلافت بلا لیا۔ جب وہ آئے تو ان کو قتل کرا دیا۔ اس طرح ان کا بھی وہی حشر ہوا جو ہندوستان میں محمد بن قاسم کا ہوا تھا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں بھی ایک وفد چین بھیجا گیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے چین سے بڑے خوشگوار اور پہلے سے بھی زیادہ اچھے تعلقات تھے بلکہ ۷۳۶ء میں ...

ایک وفد چین بھیجا گیا تھا۔ یہ وفد چینی بادشاہ کے لئے بہت قیمتی ہدیے لے گیا تھا۔

پہلی اسلامی اقتصادی کانفرنس | تاریخ چین سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۵۰ء یعنی دوسری صدی ہجری میں عرب کے مسلمان تاجروں اور چین و ہندوستان اور ترکستان کے تاجروں کا شہر کنتن (Canton) میں ایک اجتماع ہوا۔ جس میں انھوں نے تجارتی امور و مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ یہ چین کی اسلامی تاریخ میں پہلی اقتصادی کانفرنس تھی۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں فضل بن یحیٰ برمکی نے ۷۹۴ء میں والی خراسان سے کاغذ، کپڑے اور شیشے کے برتنوں کی صنعت کے چینی ماہرین کی ایک ٹیم بغداد بھیجنے کی فرمائش کی، کیونکہ اس زمانہ میں چین ان چیزوں کی صنعت اور کاریگری کے لئے مشہور تھا۔

ان کاریگروں کے بغداد پہنچنے کے بعد وہاں پہلی دفعہ ایک کارخانہ قائم کیا گیا اور اس سے اتنی پیداوار ہونے لگی کہ ان اشیاء کو دوسرے اسلامی ملکوں اور یورپ کے شہروں میں برآمد کیا جانے لگا۔

یہ چینی ماہرین تقریباً بارہ سال تک بغداد میں رہے، ان میں سے بعض تو چین واپس لوٹ گئے اور بعض نے بغداد ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ جو لوگ واپس گئے تھے وہ چین میں اسلام کے داعی اور مبلغ بن گئے، ان میں سے ایک شخص نے "میرا سفرنامہ" (Tim Hsim Chee) کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں اسلامی ملکوں میں اسلام کے حالات و کوائف بیان کئے گئے ہیں، اسلام کے بارے میں ایک چینی مصنف کی چینی زبان میں یہ سب سے پہلی تصنیف تھی جو دورِ عباسیہ میں لکھی گئی۔

یہ چین جیسے دور دراز مقام میں اسلام کے پہنچنے اور مسلمان مبلغین کے وہاں داخل ہونے کی مختصر تاریخ تھی۔

چینی تصنیفات میں مسلمانوں کے جو نام درج ہیں ان میں چینی زبان کے تلفظ کے اعتبار سے رد و بدل اور تحریف و تصحیف ہو جانا بعید نہیں ہے، جیسے ابو العباس کا نام چینی زبان کے تلفظ کے مطابق چینی تاریخ میں (A bo Lo ba) ابو جعفر المنصور (A Pu cha Fo) ہو گیا اور ہارون رشید (A lun) کا امین (Hoang seng) کا جمیل (Jang Ming) کا عبد المعطی (A Pu see) کا اور خاندان عباسیہ (A Po Ti) کا ملتا ہے، اسی طرح اور ناموں میں تحریف ہو کر وہ خالص چینی بن گئے ہیں۔

جن عربوں نے چین میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی وہ چین والوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان ہی کے افراد معلوم ہونے لگے۔ اس لئے اب ان کے متعلق امتیاز کرنا مشکل ہے۔ تاہم ناموں کا موضوع ابھی محتاج بحث و تحقیق ہے، میں نے بعض چینی مسلمانوں سے سنا ہے کہ عرب خاندان ابھی تک وہاں موجود ہیں۔ بلکہ بعض تو اپنے کو ان صحابۂ کرام کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ جو چین میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے آئے تھے۔ اس لئے عرب خاندان کے ان ناموں پر جو چینی ناموں میں محرف ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تک وہاں پائے جاتے ہیں۔ پوری بحث و تدقیق کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا محنت طلب کام ہے اور اس کے لئے نہایت عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔

"ض"

(از مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی)

مقالہ نما

مضامینِ الندوہ

از

جناب مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی

متفرقات

" اس عنوان کے تحت متفرق موضوعات کے سوا بعض ان مضامین کا بھی تذکرہ ہے، جنھیں اصولاً علمی، ادبی یا مذہبی تقسیم میں آنا چاہئے تھا، لیکن ترتیب میں رہ جانے کی وجہ سے انھیں اس موضوع میں شامل کر دیا گیا ہے،" "مرتب"

آزاد ابو الکلام دہلوی۔

"ندوۃ العلماء میں ایک کتب خانہ کی ضرورت ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۳ھ

ص ۱ - ۲

حوالہ $\frac{269}{2}$

کتب خانہ ندوۃ العلماء کی خصوصیات اور اس کے نوادر کا تعارف کرایا گیا ہے، نیز اس کی توسیع کے لئے اپیل کی گئی ہے،

ا۔ ابو الحسن علی ندوی (سید)

اسلام کے لال قلعے ، مئی ۱۹۴۰ء

ص ۱۴ - ۲۱

حوالہ ۲۸۶

"مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے، اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی میں کونسا خانہ خالی رہتا ہے، آج کی صحبت میں ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے"

۲ - علمائے ربانی اور ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت جولائی ۱۹۴۲ء

ص ۸ - ۳۵

حوالہ ۲۸۰/۳

"مضمون ایک سلسلۂ مضامین کا مقدمہ ہے، جس میں علمائے حق اور مجاہدین کے کارنامے ان کے تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کی روداد اور اُن کی سیرت و حالات پیش کئے گئے ہیں"

۳ - "مشاہدات و تاثرات" مارچ ۱۹۴۰ء

ص ۱۴ - ۲۲

حوالہ ۲۸۶

"۳۹ء و ۴۰ء کے ابتدائی دن جو سہارنپور اور دہلی کے بعض علمی مرکزوں میں گذرے اس سفر کے بعض مشاہدات و تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں"

اعزاز علی ..... شیخ الفقہ والادب ستمبر ۱۹۴۱ء

"میری محسن کتابیں" ص - ۱۴ - ۱۵

حوالہ ۲۸۰

"الندوہ" نے "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابوں" کے عنوان سے ایک سلسلہ مقالات شروع کیا تھا جس میں مختلف مشاہیر نے اپنے مشاہدات و تاثرات اور اپنی محسن کتابوں کا تذکرہ قلمبند کیا تھا، جو طلبہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے"

اکبرآبادی۔ سعید احمد

میری محسن کتابیں		جولائی ۱۹۴۱ء

ص ۴ - ۱۰

حوالہ نمبر ۲/۲

۱۔ اکرام اللہ خان ندوی

"ایام عرب کا ایک صفحہ"		ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ

حوالہ ۲۸۴/۳

"اہل عرب اگرچہ مہتم بالشان واقعات اور آثار سلف کے محفوظ رکھنے میں نہایت ممتاز تھے، اس لئے وہ ضرورت کے وقت گذشتہ واقعات کو نہایت تفصیل سے بیان کرسکتے تھے، لیکن یہ نہیں بتا سکتے تھے، کہ ان واقعات پر کس قدر زمانہ گذرا"

عرب کے واقعات وسنین کی تدوین پر روشنی ڈالی گئی ہے،

۲۔ ایام گذشتہ		جولائی ۱۹۱۴ء

ص ۱ - تا ۸

الندوہ کا اداریہ جس میں ندوہ" اور "الندوہ" دونوں کے ایام گذشتہ پر بھی لطف ڈالی ڈالی گئی ہے،

۳۔ باب کمر یعنی جدہ کے حالات		جنوری ۱۹۱۵ء ص ۱۳ - ۲

حوالہ ۲۸۵

جدہ کی آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے، جن میں قریباً وطنی عرب اجنبی مسلمان ہیں جن میں زیادہ تر ایرانی، حضرمی اور ہندوستانی ہیں، اہلِ فرنگ بھی ایک سو سے زیادہ وہاں موجود ہیں،

۴۔ الجنون فنون　　　فروری ۱۹۱۵ء

ص ۲۲ - ۲۷

حوالہ ۲۸۵

"حال میں جنون کی ایک دلچسپ بحث مجلہ "الہلال" میں شائع ہوئی ہے، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جنون جیسا کہ عام خیال ہے، انہی افراد انسان تک محدود ہیں، جن کو ظاہر میں دنیا مخبوط الحواس اور پاگل سمجھتی ہے، بلکہ تمام افراد بشر اس میں مبتلا ہیں، اور جنون کا ایک حصہ ہر شخص میں موجود ہے۔" (نقد و تبصرہ)

۵۔ "فلسفہ"　　　جون ۱۹۱۶ء

ص ۲ - ۱۴

۱۔ "فلسفہ ایک یونانی لفظ ہے جو فیلوس اور سوفیا دو کلموں سے مرکب ہے، فیلسوف اس شخص کو کہتے ہیں جو فنِ حکمت کو عزیز رکھے، فیلسوف کے معنی ہیں حکمت پسند، سب سے پہلے جس کو یہ لقب دیا گیا، وہ فیثا غورث مشہور حکیم ہے جس کا ظہور ۵۶۳ قبل مسیح میں ہوا۔"

۶۔ "قوتِ حافظہ اور ہمارے اسلاف"　　　جولائی ۱۹۱۵ء

ص ۱ - ۲

حوالہ ۲۸۵

"اگرچہ زمانہ گذشتہ میں تمام اقوام و ملل میں علوم کا دار و مدار محض حافظہ پر تھا، لیکن ان سب میں اہلِ عرب خصوصیت سے ممتاز نظر آتے ہیں، یہ امر خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ ان کی

یہ خصوصیت زمانہ اسلام میں بھی باقی رہی؟"

۷۔ مدینۃ الرسول　　جولائی ۱۹۱۳ء

ص ۹ - ۲۷

حوالہ ۲۸۴

مدینہ منورہ یا مدینۃ الرسول جس کو طیبہ بھی کہتے ہیں، اور جو ہجرت سے پہلے یثرب کہلاتا تھا، سطح بحر سے تقریباً ۶۱۹ میٹر بلند ہے، اور وہ مشرق کی جانب ۳۹ درجہ اور ۵۵ دقیقہ کے طول پر اور خط استوائے شمال کو ۲۴ درجہ اور ۵ دقیقہ کے عرض پر واقع ہے۔

۸۔ "موجودہ اضطراب اور یہودی"　　جنوری ۱۹۱۶ء

ص ۱۹ - ۲۶

حوالہ ۲۸۶

" فرانس میں یہودیوں کی تعداد ایک لاکھ ہے، بلجیم میں یہودیوں کی تعداد ۱۵ ہزار ہے، اطالیہ میں یہودیوں کی تعداد ۰۰۰ ۴۵ ہزار ہے، جرمنی میں یہودیوں کی تعداد ۶ لاکھ ہے"

انصاری محمد یوسف ندوی　　نومبر ۱۹۱۴ء

قانون حرب　　ص ۱۶ - ۲۳

حوالہ ۲۸۴

آج کل یورپ میں جو معرکہ کارزار گرم ہے، اس نے قدرۃً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، اور جنگ کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا نہایت شوق و رغبت سے مطالعہ کیا جاتا ہے، اس بنا پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک خلاصہ پیش کیا جائے جس سے معلوم ہوگا کہ یورپ کا موجودہ قانون حرب کیا ہے"

بدرالدین علوی (پروفیسر)

"میری محسن کتابیں" مئی ۱۹۴۱ء

ص ۱۷-۲

حوالہ ۲/۲۰۰

بشیر احمد صاحب بی اے آکسن

"میری محسن کتابیں" اپریل ۱۹۴۱ء

ص ۴-۶

حوالہ ۲/۲۰۰

ترجمان

"ایجاد و اختراع" جنوری ۱۹۱۵

ص ۲۰-۲۶

حوالہ ۲۸۵

"جدید ایجادات پر ایک نظر"

سلامت اللہ مولوی

عرب کے قدرتی حصے مئی ۱۹۰۹ء

ص ۲۰-۳۱

حوالہ ۲/۲۷۹

عرب کی ملکی تقسیم کے بیان کرنے میں زمانوں کا لحاظ ضروری ہے، کیونکہ امتداد زمانہ سے ملکوں میں تغیر و تبدل پیدا ہوگیا ہے، جو نام اور مقام سابق میں تھے۔ ان میں سے بعض کا نام

نشان بھی باقی نہیں ہے"

۱۔ سلیمان ندوی (سید)

"علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق" دسمبر ۱۹۰۹ء

ص ۲۲-۲۳

حوالہ ۹ ۲۷۹/۹

" موضوع پر بحث کی گئی ہے، اور تاریخی کتب سے مستند واقعات نقل کئے گئے ہیں جن سے کتب بینی کا شوق پیدا ہوتا ہے،

۲۔ مکاتیب شبلی، اکتوبر ۱۹۰۹ء

ص ۱۵-۲۴

حوالہ ۲۷۹/۹

"مکاتیب شبلی کی تدوین کے سلسلہ میں اپیل کی گئی ہے"

۱۔ شبلی نعمانی (علامہ)

انجمن وقف علی الاولاد مئی ۱۹۰۹ء

ص ۱-۴

حوالہ ۲۷۹/۹

" کاروائی انجمن وقف علی الاولا د زیر حمایت ندوۃ العلماء"

۲۔ تصوف اگست ۱۹۰۹ء

ص ۱۵-۱۲۴

حوالہ ۲۷۹/۹

ایرانی شاعری کا عنصر اعظم تصوف ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ایرانی شاعری میں جس قدر حقیقت طرازی یا گرمی تاثیر ہے صرف تصوف کا اثر ہے۔

(شعر العجم جلد چہارم سے اقتباس")

۳۔ تمدنِ اسلام — اکتوبر ۱۹۱۱ء

ص ۱ - ۳۵

حوالہ ۹ ۲۷ / ۸

"جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف نے یہ کتاب چار حصوں میں لکھی ہے، جس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کتاب میں مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں"

جرجی زیدان کی کتاب پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

۴۔ نمائش گاہ علمی — اپریل ۱۹۰۶ء

ص ۵ - ۲۱

حوالہ ۹ ۲۷ / ۳

"ندوۃ العلماء کے اجلاس کے موقع پر ایک علمی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے جس میں ملک کے مختلف اداروں نے حصہ لیا تھا، اس کی روداد بیان کی گئی ہے"

۵۔ مثنوی مولانا روم اور فلسفہ و سائنس" — جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ

ص - ۲۷ - ۳۲

حوالہ ۹ ۲۷ / ۱

"مولانا کو اگرچہ مثنوی میں فلسفہ کے مسائل کا بیان کرنا پیش نظر نہ تھا

لیکن ان کا دماغ فطرۃً اس قدر فلسفیانہ واقع ہوا تھا کہ بلا قصد فلسفیانہ مسائل اُن کی زبان سے ادا ہوئے جاتے ہیں"

۶ - وصیت نامۂ عالمگیر مئی ۱۹۱۰ء

ص ۱۰ - ۱۲

حوالہ ۷۷۹/۵

"اس وصیت نامہ سے عالمگیر کے اخلاقی و خیالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے"

طفیل احمد (سید علیگ) اکتوبر ۱۹۴۱ء

میرا طریق مطالعہ و تحریر ص ۹ - ۱۲

حوالہ ۲۵۰/۴

یہ ہے کہ میں جو کتاب پڑھتا ہوں اس کا خلاصہ ایک کاپی پر لکھ لیتا ہوں اور یہ عادت اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ کوئی کتاب بغیر خلاصہ کئے پڑھ نہیں سکتا"

۷ - طلحہ حسنی (سید) جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ

"میری محسن کتابیں حوالہ ۲۵۰/۴

ضیاء الحسن علوی جنوری تا اکتوبر ۱۹۴۱ء

"یاد ایام" حوالہ ۲۵۰/۴

ذاتی ڈائری کے اوراق جس میں لکھنؤ اور ندوہ میں گذرے ہوئے ایام کا تذکرہ ہے:

عبد الباری ندوی جنوری ۱۹۴۱ء

میری محسن کتابیں ص ۱۶ - ۲۰ حوالہ ۲۵۰/۴

ا - عبد الرحمٰن ندوی دسمبر ۱۹۱۲ء

"افلاس اور ہندوستان" ص ۱۱ - ۲۰ حوالہ ۲۸۴

"اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو تمام حیثیات کا جامع ہے اور تمام دنیوی اور انسانی ضروریات کے کفیل ہونے کا مدعی ہے اس لحاظ سے ہم اپنے زیر بحث عنوان کے متعلق اسلام ہی کے نقطۂ نظر سے بحث کریں گے"

۲۔ "دعوت الی الخیر"

علوم جدیدہ کی ضرورت اگست ۱۹۱۶ء ص ۸ - ۱۵، حوالہ ۲۸۷

"جن اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ندوہ جیسی علمی و دینی تحریک کی تعمیر و تاسیس عمل میں لائی گئی ان کا اعادہ ایک سے زیادہ مرتبہ قومی اسٹیجوں پر کیا جا چکا ہے آج ہم پھر اسی ساز کو چھیڑتے ہیں۔"

۱۔ عبدالسلام ندوی اپریل ۱۹۴۲ء

"خطبۂ صدارت" ص ۱۸ - ۲۸ حوالہ $\frac{۲۵۰}{۳}$

"انجمن طلباء قدیم ندوہ میں پڑھا گیا۔"

۲۔ عبدالسلام ندوی دسمبر ۱۹۴۱ء

میری محسن کتابیں ص ۴ - ۱۱ حوالہ $\frac{۲۵۰}{۳}$

۳۔ یادگار سلف جنوری ۱۹۱۱ء

ص ۶ - ۱۲ حوالہ $\frac{۲۶۹}{۸}$

احمد زکی بک مصری نے عالم اسلام کی مشہور قلمی اور نادر کتابوں کا تعارف جمع کرنا چاہا تھا اسکی تعریف کی گئی۔

عبدالسلام قدوائی ندوی جون ۱۹۴۰ء

"اسلامی ممالک کے تعلیمی حالات" ص ۲۵ - ۲۸ حوالہ ۲۸۷

عبدالکریم میر علوی نومبر ۱۹۱۲ء

انتخاب الاخبار ص - ۱۸ - ۲۲ حوالہ $\frac{۷۹}{۹}$

ماہ ذوالقعدہ شوال تا ختم ذی الحجہ باطل کی محاذ مرکز اسلام کو چار ریاستوں نے ملا کر اعلان جنگ دیا ہے
سب سے پہلے یہ اعلان انگلستان والوں نے دیا ہے،

اس وقت کے حالات حاضرہ کی خبروں پر تبصرہ"

عبدالماجد دریابادی

"ایک نام کے ندوی کا دوسرا پیام" جنوری ۱۹۳۱ء

ص ۲۶ - ۳۷ - حوالہ ۲/۲۵۰

"یہ خطبہ مولانا نے بحیثیت صدر طلبہ قدیم ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ارشاد فرمایا تھا"

عبیداللہ سندھی (مولانا) فروری ۱۹۳۱ء

میری محسن کتابیں ص - ۴ - ۸ - حوالہ ۲/۲۵۰

عطا، شاہ حلیم اکتوبر ۱۹۳۱ء

"میری محسن کتابیں" ص - ۴ - ۹ حوالہ ۲/۲۵۰

علوی، ضیاء الحسن اپریل ۱۹۰۷ء

"فلسفہ تاریخ کا موجد کون تھا" ص ۲۶ - ۳۱ حوالہ ۲/۲۷۹

عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فلسفہ تاریخ کی ضرورت کی صدا یورپ ہی سے بلند ہوئی اور وہیں اس فن کی داغ بیل پڑی، اور نشو و نما پاکر یہ فن یورپ ہی کے علوم و فنون میں شمار کیا گیا غالباً یہ خیال اس وجہ سے پھیل گیا کہ یورپ نے اس زمانہ میں جو کچھ اس فن کو ترقی دی ہے اس کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا گیا

مضمون میں مندرجۂ بالا مسئلہ پر ایک محققانہ و مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے،

گیلانی - مناظر احسن مارچ ۱۹۳۱ء

"میری محسن کتابیں" ص ۷ - ۱۸ حوالہ ۲/۲۵۰

عمادی - عبداللہ، جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

"جبر و مقابلہ کی تاریخ" ص ۱۱-۱۹ حوالہ ۲۷۹/۱

مصر کے ایک صاحب قلم قارن لحوری آفندی نے بڑے طمطراق سے دعویٰ کیا ہے اکہ مسلمانوں کی طرف جبر و مقابلہ کی نسبت صحیح نہیں مسلمانوں نے یونانیوں کی کچھ کتابیں ترجمہ کیں جو وہ اس فن میں صاحب تصنیف ہونے کی حیثیت پیدا کی مندرجہ بالا دعویٰ کی تردید میں جبر و مقابلہ کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

غلام السیدین (خواجہ) جنوری ۴۲ء

میری محسن کتابیں ص ۴-۱۷ حوالہ ۱۰۴/۲

معین الدین بہاری فروری ۱۹۱۲ء

حرم نبوی ص ۱۵-۲۳ حوالہ ۲۷۹/۹

"سرزمین حجاز کا وہ مقدس شہر جو مدینہ یا مدینۃ الرسول کے نام سے موسوم ہے، اسلام کا ایک زندہ معجزہ ہے دنیا میں سینکڑوں مذہب ہیں لیکن کوئی مذہب اپنے صاحب مذہب کی وہ یادگار نہیں پیش کرسکتا جو اسلام پیش کرسکتا ہے

م۔ن۔ ندوی "دولائی لامہ" شوال ۱۳۳۳ھ حوالہ ۲۸۵

"دولائی لامہ علاوہ مذہبی پیشوا ہونے کے ملک کا بادشاہ بھی ہے اور اندرونی معاملات میں ایک حد تک مطلق العنان ہے۔

میمن۔ عبدالعزیز "میری محسن کتابیں" نومبر ۱۹۴۱ء ص ۴-۹ حوالہ ۱۰۴/۲

ندوۃ العلماء "عربی ایڈریس" دسمبر ۱۹۰۸ء ص ۴-۸ حوالہ ۹/۲

ندوۃ العلماء کی طرف سے سرجان برسکاٹ ہیوٹ کے سی، ایس، آئی اے نائب حاکم عام کو پیش کیا گیا تھا۔

نواب علی "میری محسن کتابیں" اگست ۱۹۴۱ء ص ۲۷-۳۱ حوالہ ۰

یوسف الدین محمد "سنہ شمسی ہجری" مارچ ۱۹۱۳ء ص ۱۵-۲۲ حوالہ

" ایک تقابلی تقویم کا جزو جس میں ۱۰ھ کے واقعہ صوم کا ذکر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

مسلمان اور سیکولر ہندوستان - مرتبہ ڈاکٹر مشیر الحق صاحب تقطیع متوسط،
کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۸۰ مجلد قیمت پچیس روپیے پتہ :- مکتبہ جامعہ
لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

زیر نظر کتاب میں سیکولرزم کی مختلف تعبیریں بیان کرکے اس کے اور سیکولر ریاست کے بارہ میں
مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے، یہ مندرجہ ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے،
(۱) مذہب، سیکولرزم اور سیکولر ریاست (۲)، دینی تعلیم (۳) دینی رہنمائی: ماضی کا ورثہ (۴) قانون
اور شریعت (۵) مبہم سیکولرزم۔

پہلے باب میں مذہب و سیکولرزم کا مفہوم، سیکولرزم کے متعلق مسلمانوں کے مختلف تصورات،
ان کے دلائل، ایک گروہ کے دوسرے گروہ کے نقطۂ نظر کے بارہ میں ردعمل، مختلف نظریات میں
قدر مشترک اور آخر میں اس نتیجہ کا ذکر ہے کہ "سیکولرزم اور سیکولر ریاست پر مسلم سماج ابھی ایک
دبدھے کی حالت میں ہے، کیونکہ وہ اپنی مذہبی رہنمائی کی خاطر علماء پر انحصار کرتا ہے"، اسی مناسبت
سے دوسرے اور تیسرے باب میں علماء کے زیر نگرانی چلنے والے عربی مدارس کے متعلق نہایت مفید
معلومات بیان کیے گئے ہیں، چنانچہ دوسرے باب میں مدارس کے نظام تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے، اور
ان کے نظم ونسق، اخراجات، اصلاح نصاب، آزادی سے پہلے اور بعد کے مدارس کا تقابل اور
ان کے متعلق اور دوسری باتیں قلمبند کی گئی ہیں، اور تیسرے باب میں مدارس کے شعبۂ افتاء کا مفصل
تعارف کرایا گیا ہے، اس میں اس کی مختصر تاریخ، ہندوستان میں فتویٰ نویسی کی نوعیت اور نظام افتاء

مسلمانوں کے استفادہ اور رہنمائی وغیرہ کا ذکر ہے، چوتھے باب میں شرعی قوانین یعنی مسلم پرسنل لا میں اصلاح و تبدیلی کے مطالبہ کے بارہ میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے رجحانات اور حکومت کے عزائم اور منشا کی وضاحت کی گئی ہے، آخری باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سیکولرزم کی مختلف تعبیروں کی وجہ سے ابتک مسلمانوں کے سامنے اس کی واضح تصویر سامنے نہیں آسکی ہے اسلیے وہ عموماً اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، کتاب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں، ان میں بالترتیب مسلم پرسنل لا قانون اطلاق شریعت (۱۹۳۷ء)، قانون تنسیخ نکاح (۱۹۳۹ء)، خصوصی قانون نکاح (۱۹۵۴ء) کے خلاصے دیے گئے ہیں، فاضل مصنف نے مسائل کا تجزیہ غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے، اور ہر طبقۂ خیال کے نقطۂ نظر کی بے کم و کاست ترجمانی کی ہے، ممکن ہے ان کے بعض رجحانات و نتائج ہر شخص کے لیے پوری طرح قابل قبول نہ ہوں لیکن انھوں نے بڑے غور و فکر اور گہرے مطالعہ کے بعد یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے یہ پرمغز اور حشو و زوائد سے خالی ہے، ان کے خیالات معتدل و متوازن، تحریر شائستہ و متین اور انداز بیان علمی ہے۔

سرسید احمد خاں منتخب کتابیات، مرتبہ جناب محمد حسین رضوی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۶۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

یہ سرسید احمد خاں مرحوم کے متعلق مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی انگریزی اور اردو کتابوں اور رسالوں کی فہرست ہے، اس میں سرسید کے تمام کتب و رسائل اور مکتوبات و مضامین اور ان پر لکھی گئی دوسرے ارباب قلم و مصنفین کی تصنیفات .... اور ان کتابوں کا ذکر ہے جن میں ایک مضمون بھی سرسید یا علی گڑھ تحریک کے بارے میں ہے، کتابوں کے سائز، صفحات کی تعداد، مطبع، سنہ اشاعت اور رسالوں کی جلد و نمبر اور ماہ و سنہ کی تصریح بھی کی گئی ہے، سرسید اور علی گڑھ پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس فہرست سے بڑی مدد ملے گی،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں :-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سرا سر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ؔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ نبی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- للعہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے

قیمت :- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ :- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدر دانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمداللہ چھپ کر شائع ہوگئی،
یہ محض جانشین شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ
اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے
جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی
و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات تحریک
جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی
کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور
سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دارالمصنفین سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور
پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف
وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل
روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز
انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثنی ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپیے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

جلد نمبر ۸۵ فروری [illegible]

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہز
کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرا، وفضلار کی علمی وادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اب
بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے
ادب وزبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر
ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، وفضلاء وشعراء کا تذکرہ، اور اُن
کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ
مواد ومعلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں ز
اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت:- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

113

جلد ۱۱۳ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۴ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ملک میں ہر چیز کی قیمت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، ابھی اور بڑھ جائے گی، جو قیمت بڑھ جاتی ہو وہ پھر کم نہیں ہوتی ہے، کاغذ کی قیمت بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، اور ابھی اور بڑھے گی، اسے چند مہینے پہلے جو کاغذ ۳۵ روپئے فی ریم خریدا گیا تھا، وہ اب ۶۵ روپئے میں بھی مشکل سے مل رہا ہے، اس طرح دار المصنفین کتابوں کی طباعت میں مالی بحران میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے، کاغذ وقت پر دستیاب بھی نہیں ہوتا ہے جس سے کتابوں کی طباعت میں تاخیر ہوتی ہے اور اسکی بکری اور اشاعت پر اثر پڑتا ہے،

کاغذ کی گرانی کے ساتھ کتابوں کی قیمت میں اضافہ ہونا بھی ضروری ہے، دار المصنفین کی مطبوعات کی قیمت اور کتابوں کے مقابلہ میں ہمیشہ سے نسبتاً کم رہی ہے، جب یہ ادارہ قائم ہوا تھا، تو سو صفحے کی کتاب پر ایک روپیہ قیمت رکھی جاتی تھی، پھر ڈیڑھ روپئے رکھی گئی، اور جب ہر چیز کی قیمت کئی گنی ہوگئی تو یہاں کی مطبوعات کی قیمت میں تھوڑا سا اور اضافہ کیا گیا یعنی سو صفحے کی کتاب پر دو روپئے قیمت رکھی گئی، اب اس میں مزید اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے، جس حساب سے کاغذ مل رہا ہے اور پھر کتابت و طباعت میں جو اخراجات ہوتے ہیں، اس لحاظ سے سو صفحے کی کتاب کی قیمت چار روپئے سے کم نہیں ہونی چاہئے، لیکن ہماری مطبوعات کی خریداری ایسے علمی حلقہ میں ہوتی ہے جس کی قوت خرید زیادہ نہیں بلکہ بہت کم ہے، جو ہماری مطبوعات خریدنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، ان کے پاس اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے بعد اتنی رقم نہیں بچتی کہ وہ ہماری کتابیں خرید سکیں، اور جو صاحب ثروت آسانی سے کتابیں خرید سکتے ہیں انکو

علمی کتابیں خریدنے کا مطلق ذوق نہیں، اسی لیے ابتک ہم اپنی مطبوعات کی قیمت کے اضافہ کرنے میں پس وپیش کرتے رہے ہیں، حالانکہ اور جگہوں کی کتابوں کی قیمت میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔

ہم برابر اس کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ اس ادارہ میں چالیس آدمی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اس ادارہ کو مرکز یا ریاست کی حکومت سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، اس کے اخراجات اس کی مطبوعات کی آمدنی سے پورے کیے جاتے ہیں، اخراجات کے مطابق اسکی مطبوعات کی قیمت مقرر ہونی چاہئے مگر ایسا ابتک نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے ہمیشہ یہ ادارہ خسارہ سے چلتا رہا ہے، ۱۹۶۵ء سے اس کا خسارہ چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہو رہا ہے۔ مگر محض تائید ایزدی سے اسکا کام کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے، اس کے خدمت گذار ابتک ایثار سے کام لے رہے ہیں، مگر بڑھتی ہوئی گرانی میں ایثار کا جذبہ برقرار رہنا مشکل ہے، اور یہ وصف ملک میں بے معنی ہوکر رہ گیا ہے، پھر بھی ہمارے اسٹاف کے لوگوں میں اس کی خدمت کا حوصلہ باقی ہے، ان کو جتنی کم ماہانہ تنخواہیں مل رہی ہیں، اتنی ملک کے کسی ادارہ میں نہ ہونگی، اسی لیے یہ خطرہ لاحق ہوتا جارہا ہے کہ کہیں اپنی تنخواہوں کو اپنی قوت لایموت کے لیے ناکافی سمجھ کر اس کی خدمت سے کنارہ کشی اختیار نہ کرلیں، اس لیے ان خدمت گذاروں کی ضروریات زندگی بھر کے اخراجات فراہم کرنا تو انتہائی ضروری ہے، تاکہ ان میں بددلی پیدا نہ ہو، مگر کیسے؟ کتابوں کی قیمت میں تو اضافہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ اضافہ ہمارے خریداروں کی قوت خرید کے لیے گراں نہ ثابت ہو،

ہم بارہا اپیل کر چکے ہیں کہ اگر ہماری مطبوعات کی خریداری خاطر خواہ طریقہ پر ہوتی رہے تو ہم اپنے اخراجات پورے کر سکتے ہیں، ہم ملک سے کبھی نہ چندے اور نہ مالی امداد کے خواہاں ہوئے ہیں، صرف اپنی

مطبوعات کی خریداری کی اپیل برابر کرتے رہے ہیں لیکن ہماری اپیل ہمیشہ صدا بصحرا ثابت ہوئی، ہماری مالی پریشانیوں پر ہمدردی کا اظہار کسی نے دس پیسے کا کارڈ لکھ کر بھی نہیں کیا، البتہ اگر ہماری مطبوعات کی قیمت پر کچھ اضافہ ہوا تو احتجاج میں کچھ خطوط ضرور موصول ہونگے، مگر سوال یہ ہے کہ اب اس ادارہ کے خدمتگذار پیٹ پر پتھر باندھ کر خدمت کر سکیں گے کہ نہیں،

حکومت ہند ہمارے ادارہ کی طرف مائل ہوئی ہے، اسکو ایک قومی اہمیت کا ادارہ قرار دیکر سالانہ امداد دینے پر غور کرنے کے لیے تیار ہے، گذشتہ سال حکومت ہند کے کچھ نمائندے اسکی ضروریات کا اندازہ لگانے کے لیے بھی آئے تھے، وہ اس کے علمی کارناموں سے متاثر ہوئے، ان کا مشورہ تھا کہ آیندہ اب ایسے نوجوان نہیں ملیں گے جو خدمت وایثار کے جذبے سے کام لیکر یہاں اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کو تیار ہوں، ان کو مالی منفعت حاصل ہوگئی تو یہاں رہکر علمی خدمت میں بھی لگے رہیں گے، یہ مالی وسائل کتابوں کی فروخت سے پیدا کرنا ممکن نہیں، اس میں وسعت صرف حکومت کی امداد سے پیدا ہو سکتی ہے، انھوں نے زبانی طور پر کہا کہ اگر یہ ادارہ حکومت کی امداد لینا پسند کریگا تو اس کو دو سے تین لاکھ روپئے تک امداد دیجا سکتی ہے، جب حکومت ادارہ کی طرف مائل ہے تو امداد حاصل کرنا آسان ہے، لیکن ہم پر یہ الزام آسانی سے رکھ دیا جائے گا کہ علامہ شبلیؒ کی وراثت کو ان کے نااہل جانشینوں نے حکومت کے ہاتھوں فروخت کر دیا، اور یہ اب علمی خدمت کرنے کے بجائے حکومت کا خدمت گذار بنکر رہیگا، ہم خود حکومت کا ضمیمہ بننا نہیں چاہتے، بشرطیکہ ہماری قوم ہماری سرپرستی کرتی رہے، اور ہم یہ سرپرستی صرف اپنی مطبوعات کی زیادہ سے زیادہ خریداری کی صورت میں چاہتے ہیں، یا اہل ثروت ایک ہزار کے لائف ممبر بنکر ادارہ کی خدمت کر سکتے ہیں، جسکے بدلے میں انکو اتنی ہی قیمت کی کتابیں فراہم ہوتی رہیگی، مگر یقین ہے کہ یہ اپیل پہلے کی طرح رائگاں جائیگی، پھر ادارہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر حکومت کیطرف مائل ہو جائے تو ہماری قوم کو علامہ شبلیؒ کے جانشینوں کو قابل الزام ٹھہرانے کا حق نہ ہوگا، اس وقت اپنی اپنی مجبوریوں کی بنا پر سارے علمی ادارے حکومت سے سالانہ امداد قبول کر رہے ہیں، صرف دارالمصنفین ہی اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

امام نوویؒ کی شرح مسلم پر ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

مصالح و حکم کا ذکر احادیث کی مصلحتوں اور ان میں بیان کیے گئے احکام کی حکمتیں بھی بیان کرتے ہیں، اس نوعیت کی بعض مثالیں درج ہیں:۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سباطہ (کھور) پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، علامہ نووی نے اس کے وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام خطابی و بیہقی وغیرہ کا بیان ہے کہ صلب کے درد سے شفایابی کے لیے اہل عرب کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے، اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسلی میں درد رہا ہوگا، امام شافعیؒ نے بھی یہی وجہ بیان کی ہے،

(۲) امام بیہقیؒ وغیرہ نے ایک ضعیف روایت یہ کی ہے کہ آپ کے گھٹنے میں کوئی تکلیف بیماری تھی، اس لیے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا،

(۳) ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہاں آپ کو بیٹھنے کی جگہ نہیں مل سکی تھی اسلیے مجبوراً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑا،

(۴) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے محض بیان جواز کے لیے کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا ورنہ آپ کی مستقل عادت بیٹھکر ہی پیشاب کرنے کی تھی جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

من حدثکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	جو شخص یہ کہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کان یبول قائما فلا تصدقوا ،	کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے ، اس کی بات
ما کان یبول الا قاعدا	نہ مانو ، آپ تو محض بیٹھکر ہی پیشاب کرتے تھے ،

اس حدیث کی سندیں قوی ہیں ، امام احمد ، ترمذی ، نسائی اور دوسرے محدثین نے اس کی تخریج کی ہے ، اس کے علاوہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی ممانعت میں جو حدیثیں مروی ہیں ، وہ ثابت نہیں ہیں ، مگر یہ حدیث صحیح ہے ، اسی لیے علماء نے بلا عذر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ بتایا ہے ،

(ج ۳ ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

بعض حدیثوں میں اذان کے برخلاف اقامت کے الفاظ صرف ایک ہی دفعہ کہنے کا ذکر ہے ، شوافع اور محدثین کے نزدیک یہی مسلک قوی ہے ، امام نووی نے اس کی یہ مصلحت تحریر کی ہے ،

" اذان غائب اور غیر موجود لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے کہی جاتی ہے ۔ اس لیے اس کے الفاظ مکرر ادا کیے جاتے ہیں ، تاکہ پوری طرح سب کو اطلاع ہو جائے ، مگر اقامت کا مقصد محض موجود لوگوں کو مطلع کرنا ہے ، اس لیے اس میں تکرار و اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ایک ہی دفعہ کہنا کافی ہے ، اقامت کے برخلاف اذان کے الفاظ زیادہ زور سے کہے جانیکی بھی یہی وجہ ہے ، البتہ قد قامت الصلاۃ کو دو بار اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہی اقامت کا اصل مقصد ہے ۔ واللہ اعلم (ج ۴ ص ۷۹

نماز میں ہاتھ باندھکر کھڑے ہونے کی حکمت و مصلحت ملاحظہ ہو : ۔

" خضوع و خشوع کا یہ نہایت موزوں اور مناسب طریقہ ہے ، کیونکہ اسکی وجہ سے ہاتھ بیکار اور فضول کاموں میں مشغول نہیں ہو سکتے ۔"	(ج ۴ ۔ ص ۱۱۵)

بعض حدیثوں کے اصل دین اور مہتم بالشان ہونے کا ذکر بعض حدیثیں اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے بڑی اہم اور مہتم بالشان ہوتی ہیں، امام نووی ان کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوتے ہیں اور ان کے اصل دین ہونے کی وضاحت کرتے ہیں، مثلاً وہ حدیث جس میں حضرت جبرئیلؑ کے آپ کے پاس آنے اور ایمان و اسلام اور احسان کے بارہ میں سوال کرنے اور آنحضور صلعم کے جواب دینے کا ذکر ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان کو دین بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ سمجھ لو کہ یہ حدیث گوناگوں حقائق و معارف اور آداب و لطائف کی جامع بلکہ اسلام کی اصل الاصول ہے۔" (ج ۱ ص ۱۶۰)

بنی الاسلام علی خمس الخ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"دین کی معرفت میں اس حدیث کی حیثیت ایک اصل عظیم کی ہے، اور اس پر اس کا دارومدار ہے کیونکہ یہ ارکان دین کی جامع ہے۔" (ج ۱ ص ۱۷۹)

ایک حدیث میں حضرت عثمانؓ کے اس طور پر وضو کرنے کا ذکر ہے جس طور پر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تھا، امام نووی اس کے بارہ میں تحریر کرتے ہیں :۔

"وضو کے سلسلہ میں اس حدیث کی حیثیت ایک اصل عظیم کی ہے،" (ج ۳ ص ۱۰۶)

ایک حدیث میں اس امر کا ذکر ہے کہ اگر کسی شخص کو نماز میں کوئی شک و شبہ ہو جائے تو محض اس کی وجہ سے نماز خراب نہیں ہوسکتی بلکہ جب اس کی خرابی کے متعلق قطعی طور پر یقین ہو جائے تب ہی نماز میں فتور اور نقصان لاحق ہوگا، چنانچہ لکھتے ہیں

"یہ حدیث اسلام کے اہم اصول اور فقہ کے بنیادی قاعدہ پر مشتمل ہے، اس کی تفصیل یوں ہے کہ اشیاء کو ان کی اصلوں پر برقرار رکھنا چاہیے، تاآنکہ اس کے برعکس یقین ہو جائے،

محض شک طاری ہونے سے ان کی اصل میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ اصل طہارت کا تیقن ہے، اس لیے اگر حدث کے متعلق کوئی شبہ بھی ہو جائے تب بھی طہارت کا حکم باقی اور برقرار رہے گا۔" (ج ۴ ص ۴۹)

امام مسلم پر نقد | علامہ نووی نے محض متقدمین کے اقوال جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے دقتِ نظر سے ان اقوال کا جائزہ بھی لیا ہے اور جانچنے اور پرکھنے کے بعد ان کو جن بیانات میں ضعف وسقم نظر آیا ہے ان کی تردید کی ہے، اور جو اقوال قوی اور مرجح معلوم ہوئے ہیں ان کے وجوہ ترجیح تحریر کیے ہیں، وہ ابن صلاح اور قاضی عیاض جیسے اکابر فن پر بھی جن کی کتابوں سے انھوں نے بڑا استفادہ کیا ہے، نقد وجرح کرتے ہیں، اور محدثین وشارحین حدیث کے علاوہ فقہاء اور دوسرے طبقہ وفن کے علماء پر بھی انھوں نے نقد و تعاقب کیا ہے، ذیل میں ان کے نقد وجرح کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے محض ان ہی تنقیدوں کا ذکر کیا جائے گا جو امام مسلم پر کی گئی ہیں،

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی ابتدا میں "وصلی اللہ علی محمد خاتم النبیین الخ لکھا ہے، اس سلسلہ میں ان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض صلوٰۃ ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ اس کے ساتھ ان کو تسلیم کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا حکم دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:-

یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (احزاب)	ایمان والو! پیغمبر پر درود وسلام بھیجتے رہو۔

اس بنا پر امام مسلمؒ کو صلی اللہ وسلم علی محمد خاتم النبیین الخ لکھنا چاہیے تھا،

علامہ نووی نے اس اعتراض کو درست قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ خیال کرنا مناسب نہیں ہے کہ نماز کے اندر بھی صلوٰۃ کا ذکر بلا تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ صلوٰۃ سے پہلے

تشہد میں اس کا ذکر آچکا ہے، اسی بنا پر بعض صحابۂ کرام نے تشہد سیکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ نے ہم کو تشہد تو سکھا دیا ہے مگر ہم آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟ علما نے تصریح کی ہے کہ آپ پر بلا سلام محض صلوٰۃ بھیجنے پر اکتفا کرنا مکروہ ہے، واللہ اعلم (ج ۱ ص ۴۴)

معنعن روایتوں کے متعلق امام مسلمؒ نے اپنے مقدمہ میں مبسوط و معرکۃ الآرا بحث کی ہے، اس میں انھوں نے امام بخاریؒ کے مسلک پر سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے، مگر نووی نے امام بخاری اور دوسرے علما ئے محققین کے نقطۂ نظر کی تصویب اور امام مسلم کے نقطۂ نظر پر نقد کیا ہے، طوالت کی وجہ سے یہ دلچسپ بحث قلم انداز کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو (ج ۱ ص ۱۲۷ و ۱۲۸)

بعض جگہ امام مسلم کے لغوی مسامحات اور ان کے اولیٰ و فصیح کے بجائے غیر اولیٰ اور غیر فصیح الفاظ استعمال کرنے کا ذکر ہے، مثلاً ایک جگہ انھوں نے [لو ضربنا عن حکایتہ] لکھا ہے، نووی اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"صحیح مسلم کے نسخوں میں اسی طرح ہے، یہ اگرچہ صحیح ہے جیسا کہ ازہری نے لکھا ہے کہ ضربت عن الامر، اضربت عنہ کی طرح اعرضت وکففت عنہ کے معنی میں بولا جاتا ہے، مگر یہ قلیل الاستعمال ہے، مشہور اضربت ہی ہے جو جمہور کا خیال ہے۔" (ج ۱ ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

امام مسلم کے اس فقرہ [وہی فی زعم من حکینا قولہ واہیۃ] واہیۃ کے متعلق رقمطراز ہیں :-

"اگر وہ اس کے بجائے ضعیفۃ لکھتے تو زیادہ بہتر اور عمدہ تھا، کیونکہ اس کے قائل کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ واہی اور انتہا درجہ کی ضعیف روایت ہے، جو واہیۃ کے اصل معنی ہیں، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ضعیف روایت ہے، اور اس سے کوئی حجت قائم نہیں ہوسکتی۔"

(ج ۱ ص ۱۳۸)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"اوقفت الحجر ہی اصل نسخے میں ہے مگر یہ شاذ اور غریب لغت ہے، مشہور اور صحیح وقفت الحجر بغیر الف کے ہے۔" (ج ۱ ص ۱۳۲، ۱۳۳)

امام مسلم کی عظمت و احتیاط کا اعتراف | ان تنقیدوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ امام مسلم کی عظمت و جلالت کے معترف نہ تھے، بلکہ ان کے نزدیک امام مسلم کی مہارت و حذاقت فن مسلّم ہے، اور وہ جا بجا انکی حدیث میں تبحر و معرفت، دقت نظر اور احتیاط و تیقظ کا ذکر و اعتراف کرتے ہیں، اپنے مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"امام مسلم نے اپنی صحیح میں غیر معمولی احتیاط و اتقان سے کام لیا ہے، اور یہ ان کے ورع و تقوی میں کمال، کثرت علم، وسعت نظر، شدت ضبط و حفظ، حدیث میں غیر معمولی تحقیق و کاوش اور اس کے انواع میں مکمل مہارت و واقفیت کا نتیجہ ہے، اس درجہ احتیاط و تحقیق کی مثالیں بہت کم لوگوں کے یہاں ملیں گی ہم چند مثالیں اس لیے نقل کرتے ہیں کہ ان حقائق سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جن کی اس کتاب پر عمدہ نظر ہو، اور وہ فن حدیث سے متعلق تمام علوم فقہ، اصول فقہ، عربیت، اسماء الرجال، تاریخ و علم اسناد کے دقیق مسائل سے مکمل واقف کار ہوں، اور ان فنون کے ماہرین اور فضلاء کی صحبتوں میں رہ کر انکے بارہ میں بحث و مباحثہ کرتے رہے ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہن رسا اور حسن فکر عطا کیا ہو اور ان کا علم حدیث اور اس سے متعلقہ علوم میں ہمیشہ اشتغال بھی رہا ہو۔"

امام مسلم کی غیر معمولی تحقیق و تحری کی مثال یہ ہے کہ وہ حدثنا و اخبرنا کے درمیان فرق و امتیاز پر خاص توجہ مبذول کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ حدثنا کا اطلاق اسی وقت جائز ہو سکتا ہے کہ جب راوی نے روایت کو خاص طور سے اپنے شیخ سے سنا ہو اور اخبرنا کا اطلاق اس روایت پر ہوتا ہے جو اس کے شیخ کے سامنے پڑھی گئی ہو، یہی فرق و امتیاز

امام شافعی اور ان کے تلامذہ نیز مشرق کے جمہور اہل علم نے کیا ہے، محمد بن حسن جوہری نے اسی کو بیشتر محدثین کا مسلک بتایا ہے، ابن جریج، اوزاعی، ابن وہب اور امام نسائی سے بھی اس کی روایت کی گئی ہے، اور یہی اہل حدیث کا مشہور و معروف مذہب ہے، مگر دوسری جماعت کا خیال ہے کہ شیخ کے سامنے پڑھی جانے والی حدیث کے لیے حدثنا اور اخبرنا دونوں کہنا جائز ہے، یہ امام مالک، زہری، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان اور دیگر متقدمین کا مذہب ہے، امام بخاری اور محدثین کی ایک جماعت اور کوفہ وحجاز کے اکثر علما بھی اسی کے قائل ہیں، ایک جماعت کے نزدیک حدثنا اور اخبرنا کا اطلاق قرأت پر کرنا جائز نہیں ہے، یہ ابن مبارک، یحییٰ بن یحییٰ اور احمد بن حنبل کا مسلک ہے، اور امام نسائی سے بھی مشہور روایت یہی ہے،

اسی طرح امام مسلم رواۃ کے الفاظ کے اختلاف کو ضبط کرنے کی جانب بھی خاص اعتناء کرتے ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں [حدثنا فلان وفلاں واللفظ لفلان قال او قالا حدثنا فلان] ایسے ہی جب دو راویوں کے درمیان حدیث کے متن کے حرف میں اختلاف یا راوی کے وصف ونسب یا ان کے علاوہ اور باتوں میں فرق ہوتا ہے تو وہ اس کو بیان کرتے ہیں، حالانکہ بعض دفعہ ایسا فرق ہوتا ہے جس سے معنی ومفہوم میں کوئی تغیر نہیں ہوتا اور کبھی معنی میں فرق ضرور ہوتا ہے، لیکن وہ اس قدر خفی اور دقیق ہوتا ہے کہ اسکو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا علوم میں ماہر ہونا ضروری ہے، (ج ۱ ص ۲۱ و ۲۲)

شرح میں بھی ان کے ضبط واتقان اور حزم واحتیاط کا ذکر کرتے ہیں، مندرجہ ذیل سند کے بارہ میں رقمطراز ہیں:-

"عن ابی معبد عن ابن عباس عن معاذ بن جبل قال ابو بکر ربما قال وکیع عن ابن عباس

ان معاذا ...."

یہ امام صاحب کی غیر معمولی تحقیق و احتیاط اور خاص دقت نظر کا ثبوت ہے، کیونکہ پہلی روایت میں عن معاذ اور دوسری میں ان معاذا ہے، اور "ان" و "عن" میں فرق ہو گو جمہور کے خیال میں "ان" بھی "عن" ہی کی طرح ہے، اس لیے وہ اس کو بھی اتصال پر محمول کرتے ہیں، مگر ایک جماعت کے نزدیک دونوں میں فرق ہے، اس لیے اس کے نزدیک "ان" کو انقطاع پر محمول کیا جائے گا اور وہ روایت مرسل سمجھی جائے گی، البتہ یہاں یہ صحابی کے مرسل ہونے کی وجہ سے متصل کے حکم میں ہوگی، یہی علماء کا مشہور مذہب ہے، پس امام مسلم نے احتیاط کی وجہ سے دونوں حرفوں کو الگ الگ بیان کیا ہے"۔ (ایضاً ج ا ص ۱۹۶)

شرح میں اس قسم کی احتیاط و دقت نظر کی مثالیں بے شمار ہیں،

امام مسلم کی مدافعت | جس طرح وہ امام مسلم کی بعض غلطیوں کی نشاندھی کرتے ہیں، اسی طرح جہاں ان کو امام مسلم پر کیے جانے والے اعتراضات غلط اور بے وزن معلوم ہوتے ہیں، وہاں انکی پرزور تردید کرکے امام مسلم کے نقطۂ نظر کی تائید و حمایت بھی کرتے ہیں، اس سے بھی ان کے زور استدلال اور نقد و نظر کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں:

"صحیح مسلم کے ابتدا کی جس عبارت پر اعتراض کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اسی میں [وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین] بھی ہے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ انبیاء کے ذکر کے بعد مرسلین کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ مرسلین بھی انبیاء میں داخل ہیں، اور رسول نبی بھی ہوتا ہے، بلکہ اس کو نبی کے مقابلہ میں بعض مزید خصوصیت بھی حاصل ہے۔

امام نوویؒ نے اس کے دو جواب دیے ہیں، پہلا یہ کہ ایسا کرنا بالکل جائز اور روا ہے کیونکہ مزید اہتمام کے لیے عام کے بعد خاص کو ذکر کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں اس کی متعدد

مثالیں ہیں، چنانچہ ایک جگہ ہے:۔

من کان عدو اللہ وملائکتہ	جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں کا
ورسلہ وجبریل ومیکال (بقرہ)	اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا

دوسری جگہ فرمایا:۔

واذ اخذنا من النبیین میثاقھم	اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے
ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ	ان کا میثاق لیا اور تم سے اور نوح
	ابراہیمؑ اور موسیٰ سے لیا،

اس کے برخلاف بعض جگہ خاص کے بعد عام کا استعمال کیا گیا ہے، مثلاً حضرت نوحؑ کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ

رب اغفرلی ولوالدی ولمن	اے میرے خداوند! مجھکو اور میرے ماں باپ کو
دخل بیتی مومنا وللمومنین	اور جو شخص ایمان لاکر میرے گھر میں پناہ لینے آیا ہے
والمومنات (نوح)	اسکو اور عام مومن مردوں اور عورتوں کو بخش دے،

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ مرسلین کے لفظ میں جو عموم ہے وہ انبیاء میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے ان تمام رسولوں کو شامل ہے، جو آدمیوں اور ملائکہ میں سے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا	اللہ فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام
ومن الناس (حج)	پہنچانے کے لیے انتخاب فرمالیتا ہے اور اسی طرح
	بعض کو) آدمیوں میں سے (بھی)

ظاہر ہے کہ ملک کو نبی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے مرسلین کے لفظ لانے سے جو فائدہ ہوا وہ نبیین کے لفظ لانے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ (ج اص ۴۴)

ایک سند کے متعلق امام مسلم پر دو اعتراض کیے گئے ہیں، پہلا اعتراض یہ ہے کہ ایک طریق میں انھوں نے [حدثنی] اور دوسرے میں [حدثنا] کہا ہے، امام نووی نے اس کا مندرجۂ ذیل جواب دیا ہے :-

"اہل فن کا عام اور معروف قاعدہ یہ ہے کہ جس حدیث کو وہ تنہا اپنے شیخ سے سنتے ہیں، اس کے لیے وہ [حدثنی] کا لفظ لاتے ہیں، اور جس کے سماع میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں اسکو وہ [حدثنا] کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں، اسی طرح جس حدیث کو وہ تنہا اپنے شیخ کے سامنے پڑھتے ہیں اس کے لیے [اخبرنی] اور کئی آدمیوں کی موجودگی میں پڑھی جانے والی حدیث کے لیے [اخبرنا] لاتے ہیں، یہ محدثین کی مشہور اصطلاح اور مالوف طریقہ ہے، اس کو ترک کر دینے سے سماع کی صحت میں کوئی فرق نہیں آتا، مگر یہ اولیٰ واحوط طریقہ کے منافی ہے۔" (ج ا ص ۱۵۱)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے طریق میں [حدثنا وکیع عن کہمس عن عبداللہ بن بریدہ عن یحیی ابن یعمر] اور دوسرے میں بھی [حدثنا عبیداللہ بن معاذ العنبری، حدثنا ابی حدثنا کہمس عن ابن بریدہ عن یحییٰ] کہا گیا ہے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری طوالت امام مسلم کے اختصار و اتقان کے منافی ہے، امام نووی اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "یہ اعتراض غلط اور فن سے ناواقفیت اور بے خبری کا نتیجہ ہے، امام مسلم اختصار پسند ضرور ہیں مگر جہاں اختصار سے مقصد میں کوئی خلل ہو یا اس کے سرے سے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، وہاں وہ اختصار سے کام نہیں لیتے، پس اگر وہ یہاں اختصار سے کام لیتے تو مقصد ہی حاصل نہ ہوتا، اس کی توضیح یوں ہے کہ وکیع کی روایت میں [عن کہمس] ہے، مگر معاذ نے [حدثنا کہمس] کہا ہے، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ معنعن روایتوں سے استدلال و احتجاج میں علمائے فن کا اختلاف ہے لیکن ان روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو [حدثنا] کی وجہ سے متصل ہوتی ہیں، اسی بنا پر امام مسلم نے

دونوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے جس طرح سے ان کا سماع کیا گیا ہے، تاکہ متفق علیہ و مختلف فیہ میں امتیاز کیا جا سکے، اور یہ ان کی غیر معمولی احتیاط کا ثبوت ہے۔ صحیح مسلم میں اس کی اور متعدد مثالیں ہیں جنکو ان کے مواقع پر بیان کیا جائے گا۔

اس تکرار و طوالت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وکیع کی روایت میں [عن عبد اللہ بن بریدہؓ] ہے جب کہ معاذ کی روایت میں [عن ابن بریدہ] ہے پس اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے تو خلل واقع ہو جاتا۔ کیونکہ اگر وہ ابن بریدہ کہتے تو ہم کو انکا اصل نام نہ معلوم ہوتا اور نہ ہم متعین طور پر یہ جان سکتے تھے کہ یہ عبد اللہ ابن بریدہ ہیں یا ان کے بھائی سلیمان بن بریدہ، اور اگر وہ عبد اللہ بن بریدہ کہتے تو یہ معاذ پر کذب و افترا ہوتا کیونکہ ان کی روایت میں عبد اللہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ دوسرے طریق میں یحیی بن یعمر کو ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ دونوں طریقے ابن بریدہ کی روایت میں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ان دونوں کے الفاظ بھی یحیی کے واسطے سے یکساں اور ایک ہی صیغہ کے ساتھ وارد ہیں مگر میں نے بعض نسخوں میں پہلے طریق میں صرف [عن یحییٰ] دیکھا ہے اور اس میں [ابن یعمر] کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسکا بھی وہی فائدہ اور مقصد ہوگا جو [ابن بریدہ] کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے۔ (ج ۱، ص ۱۵۲)

علم الاسناد کے بعض لطائف امام نووی رجال و اسناد کے ماہر تھے اس لئے انھوں نے اس شرح میں ان سے متعلق بھی بڑا مفید مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ گذشتہ مباحث میں اس کے متعدد نمونے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کے اسناد سے متعلق بعض لطائف اور دلچسپ امور کا ذکر مقصود ہے، امام نووی نے اکثر سندین نقل کرنے کے بعد ان کے لطائف بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں سند کے تمام روات ایک ہی شہر کے ہیں یا

ان کے تین تین یا چار چار راوی تابعی یا صحابی ہیں، یا اس میں اصغر سے اکبر نے روایت کی ہے، بعض بعض سندوں میں اس طرح کے دو دو لطیفے جمع ہو گئے ہیں۔ جیسے ان کے تمام راوی ایک ہی شہر کے ہیں اور ان میں اصاغر نے اکابر سے روایت کی ہے، امام نووی نے شرح بخاری کے شروع میں ان رباعیات کو مع سندوں کے جمع کر دیا ہے، جن میں چار چار صحابہ نے باہم گر یا چار چار تابعین نے ایک دوسرے سے روایت کی ہے۔ بعض بعض جگہ امام مسلم مسلسل کئی کئی سندیں اس طرح کی نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ جن کے اسناد کے تمام رجال ایک ہی مقام کے ہیں، نووی نے ان مواقع کی نشاندہی کر کے لطائف کی وضاحت کر دی ہے۔

لغت وعربیت کے مباحث | لغت و عربیت میں بھی امام نووی کی وسیع النظری اور عالمانہ تبحر مسلم ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے بھی نہایت اہم ہے اور اس میں لغت و عربیت سے متعلق مختلف نوعیت کے مسائل و مباحث شامل ہیں، مثلاً الفاظ کی ضبط و تحقیق، حرکات و اعراب کا ذکر، مفرد، تثنیہ و جمع اور تذکیر و تانیث وغیرہ کی تصریح، مترادف الفاظ اور مختلف قبائل کی زبانوں کا دقیق فرق، لغات میں ائمہ لغت کے اقوال و اختلافات کا ذکر، قرآن مجید و کلام عرب سے ان کے بارہ میں شواہد و امثال کا ذکر، مصطلحات فن اور شرعی اصطلاحات کی شرح و تبیین الکلام کے اسالیب اور بلاغتوں، مشکل جملوں اور محاوروں کی وضاحت اور بعض بعض فقروں کے مختلف معنوں کی تشریح کی گئی ہے، ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

ایک جگہ خبر و شہادت کے اصطلاحی الفاظ کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بعض اوصاف میں یہ دونوں مشترک ہیں لیکن بعض میں مختلف ہیں۔ جیسے اسلام، عقل، بلوغ، عدالت، مروت اور جس واقعہ کی خبر یا شہادت دی جائے اس کے ضبط کے بارہ میں

یہ دونوں مشترک ہیں، مگر حریت، ذکوریت، تعداد، تہمت اور اصل کی موجودگی میں فرع کے اعتبار میں ان کے درمیان فرق ہے چنانچہ عبد، عورت اور فرد واحد کی خبر مقبول سمجھی جاتی ہے۔ اور اصل کی موجودگی میں بھی فرع کی خبر تسلیم کر لی جاتی ہے، جیسے شیخ واستاد کی موجودگی میں شاگرد کی خبر مان لی جائے گی مگر ان لوگوں کی شہادت نہیں مانی جاتی سوائے عورت کے جس کی شہادت اس وقت معتبر مانی جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ کوئی اور عورت بھی شہادت دے، اسی طرح متہم ہونے کی صورت میں بھی شہادت رد کر دی جاتی ہے، جیسے کسی شخص کی اپنے دشمن کے بارہ میں گواہی قبول نہیں کیجائے گی، اسی طرح کسی شخص کی اپنی ذات یا اپنے لڑکے اور اپنے والد کے بارہ میں بھی شہادت معتبر نہیں سمجھی جائے گی، البتہ اعمی کی شہادت میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ اور بعض لوگوں نے اسے منع کیا ہے، مگر امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک اس کی شہادت جائز ہے۔ لیکن اس کی خبر کے مقبول ہونے میں سب کا اتفاق ہے، شریعت نے شہادت اور خبر کے درمیان ان اوصاف میں اس لئے تفریق کی ہے کہ شہادت کی نوعیت ایک خاص آدمی سے متعلق ہوتی ہے اس لئے اس میں تہمت ظاہر ہے مگر خبر عام ہے اور اس کا تنہا اسی شخص سے تعلق نہیں ہوتا۔ جس کو خبر دیجاتی ہے۔ بلکہ اور لوگوں سے بھی وہ متعلق ہوتی ہے اس لئے اس میں تہمت کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ (ج ۱ صفحہ ۹)

بعض جملوں میں بظاہر یکسانیت کی بنا پر ظاہر بیں لوگوں کو ان میں کوئی فرق نہیں نظر آتا اور وہ ان کو تکرار یا تاکید پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن غور وفکر کرنے سے انکا فرق ظاہر ہو جاتا ہے، اس طرح کے ایک جملہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ان الواجب علی کل احد — ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے

عرف التمییز بین صحیح الروایات	جو صحیح و سقیم روایات اور انکے ثقہ
و سقیمها و ثقات الناقلین	و متہم راویوں میں تمیز کرتا
لہا من المتہمین ان الخ	ہو کہ الخ

اس کی نوعیت تکرار کی نہیں ہے جس کی غرض تاکید ہوتی ہے بلکہ اس میں دراصل روایت کے متن اور سند دونوں کا ذکر ہے کیونکہ بعض روایتیں نفس متن کے لحاظ سے درست ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی بعض سندوں کے ناقلین متہم ہوتے ہیں (ص۲)

حدیث جبرئیل کے مندرجۂ ذیل جملہ :۔

ان تعبد اللہ ولا تشرک بہ	یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کا
	کسی کو ساجھی نہ بناؤ،

کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں [ولا تشرک بہ] نہ تو زائد ہے اور نہ اس کا مقصد تکرار ہے بلکہ اس کی بجائے خود ایک مستقل حیثیت ہے، اس کو عبادت کے بعد اس لئے لایا گیا ہو کہ کفار نے اللہ کی عبادت کرنے کے باوجود اس کے شرکا بھی ٹھہرا لئے تھے، اس لئے وہ بتوں کو خدا کا ساجھی مان کر ان کی عبادت کرتے تھے، پس یہ کہکر گویا اس کی نفی کی گئی ہو واللہ اعلم (ج ۱ ص۱۶۲)

وہ حدیث کے لفظوں کے موزوں و مناسب ترین ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں مثلاً اسی حدیث میں جو اوپر گذری ہے، یہ الفاظ بھی آئے ہیں [وتقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ وتؤدی الزکاۃ المفروضۃ] ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

یہاں نماز کو مکتوبہ اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔

ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین	کیونکہ مسلمانوں پر نماز بقید وقت

کتابا موقوتا (انساء)　　　فرض ہے،

متعدد حدیثوں میں بھی اس کا یہ وصف مذکور ہے مثلاً [اذا اقیمت الصلوٰۃ فلاصلوٰۃ الا المکتوبۃ] دوسری روایت میں ہے [افضل الصلوٰۃ بعد المکتوبۃ صلوٰۃ اللیل] ایک اور حدیث میں ہے۔ [خمس صلوات کتبھن اللہ] زکوٰۃ کو مفروضہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے وہ معجل زکوٰۃ مراد نہیں ہے جو حولان حول سے پہلے ہی ادا کردی جائے کیونکہ اس کو مفروضہ نہیں کہا جاتا۔ یہ بھی کہا گیا کہ تکرار سے بچنے کے لیے دونوں (صلوٰۃ و زکوٰۃ) کے لئے دو الگ الگ صفتیں لائی گئی ہیں، اس کا بھی احتمال ہے، کہ صدقہ تطوع کو پیش نظر رکھکر یہاں زکوٰۃ کو مفروضہ کہا گیا ہے کیونکہ از روئے لغت صدقہ تطوع پر بھی زکوٰۃ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ (ج ۱ ص ۱۹۳)

اسالیب کلام: | وہ کلام کی بلاغتوں کے نکتے اور اس کے اسالیب بھی بیان کرتے ہیں منددرجہ ذیل سند [اما الاوزاعی و ابن جریج فی حدیثھا] میں حذف و تقدیر کے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بعض نسخوں میں "فی حدیثھا" ایک ہی فا کے ساتھ ہے مگر اکثر میں [ففی حدیثھما] دو فا کے ساتھ ہے اور یہی درحقیقت بہتر ہے مگر وہ بھی جائز ہے کیونکہ اما کے جواب میں "ف" کا اثبات گو لازمی ہے مگر جب جواب قول میں قول محذوف ہو تو اسکو حذف کردینا بھی روا ہے، یہ اسی قسم کی مثال ہے کیونکہ کلام کی اصل تقدیر اس طرح ہے، [اما الاوزاعی و ابن جریج فقالا فی حدیثھما] قرآن مجید اور عربی زبان میں اس اسلوب کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ایک جگہ ہے۔

فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم　(آل عمران)　تو جو لوگ روسیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائیگا) کہ کیا تم نے

یہ دراصل [فیقال لھم أکفرتم] تھا۔

دوسری جگہ فرمایا :۔

واما الذین کفروا افلم تکن آیاتی تتلی علیکم (جاثیہ)	اور جو لوگ کفر کرتے رہے (ہم ان سے کہیں گے) کیا تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔

یہ واما الذین کفروا فیقال لھم آفلم تکن آیاتی تتلی علیکم تھا۔ واللہ اعلم

ایک اور سند ہے [ان المقداد بن عمرو ابن الاسود الکندی وکان حلیفا لبنی زھرۃ وکان ممن شھد بدرا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال یا رسول اللہ الخ] اس کے متعلق فرماتے ہیں :۔

(انہ) طول کلام کی وجہ سے لایا گیا ہے اگر اس کا ذکر نہ ہوتا تب بھی یہ کلام صحیح ہوتا لیکن چونکہ کلام میں طویل فصل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کا ذکر دوبارہ جائز اور بہتر ہو گیا، کلام عرب اور قرآن و حدیث میں اس کے بکثرت نظائر موجود ہیں

قرآن مجید میں ایک جگہ کفار کی زبانی کہا گیا ہے کہ :۔

أیعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون۔ (مومنون)	کیا (یہ شخص) تم سے کہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور (مرکر) تمہاری مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گی تو تم (دوبارہ زندہ کرکے زمین سے) نکالے جاؤ گے۔

اس میں طول بیان کی وجہ سے بعد میں (انکم) کا اعادہ کیا گیا ہے، ایک اور جگہ ہے :۔

ولما جاءھم کتاب من عند اللہ — اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس قرآن

مصدق لما معھم وکانوا من — اترا جو اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے

قبل یستفتحون علی الذین کفروا — ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے پہلے

فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ — کافروں کے مقابلے میں وہ اپنی فتح کی دعائیں مانگا

کرتے تھے تو جب وہ چیز جس کو جانتے پہچانتے تھے

(بقرہ) — آموجود ہوئی تو لگے اس سے انکار کرنے۔

یہاں (فلما جاءھم) بھی اسی لیے دوبارہ لایا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے:۔

فقال یا اباھریرۃ واعطانی نعلیہ — آپنے فرمایا کہ اے ابوہریرہؓ! اور آپنے

وقال اذھب بنعلی ھاتین — مجھکو اپنے دونوں جوتے عطا کیے اور کہا

میرے ان دونوں جوتوں کو لیجاؤ۔

اس میں قال کا اعادہ فصل وطول کلام کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ غرض یہ ایک عمدہ اور معروف اسلوب ہے۔ (ج ۱ ص ۱۰۳)

لغت وعربیت کی طرح بعض نحوی بحثیں بھی دلچسپ اور لائق ذکر ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے، آپنے اس کا جواب دیا کہ فلاں، تو سائل نے پھر پوچھا، آپنے پھر جواب دیا کہ فلاں، اس روایت میں "ثم" کئی جگہ آیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگر یہ کہا جائے کہ حرف ثم ترتیب کے لیے آتا ہے تو یہ جواب دیا جائے گا کہ وہ یہاں صرف ذکر وبیان میں ترتیب کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما ادراک ما العقبۃ فک رقبۃ — اور تو کیا سمجھا کہ گھاٹی کیا ہے، گردن کا

او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ	(غلامی یا قرض کے پھندے سے) چھڑا دینا
یتیما ذا مقربۃ او مسکینا ذا	یا بھوک کے دن یتیم رشتہ دار یا محتاج خاک نشین
متربۃ ثم کان من الذین آمنوا الخ	کو کھانا کھلانا، اسکے علاوہ ان لوگوں کے
(بلد)	زمرے میں ہونا جو ایمان لائے۔

یہاں واقعہ اور فعل میں ترتیب مقصود نہیں ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیات میں بھی ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم	کہو (اے پیغمبر) کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں
ان لا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین	پڑھکر سناؤں جو تمھارے پروردگار نے تم پر
احسانا...... ثم آتینا موسی	حرام کی ہیں، یہ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک مت
الکتاب الخ (انعام)	ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ سلوک کرتے رہو
	...... ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی۔

نیز فرمایا:-

ولقد خلقناکم ثم صورناکم	اور ہم نے تم کو (یعنی تمھارے باپ آدم کو)
ثم قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم	پیدا کیا اور پھر تمھاری شکل بنائی، پھر ہم نے
(اعراف)	فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھکو۔

ایک شاعر کہتا ہے:-

قل لمن ساد ثم ساد ابوہ ثم قد ساد قبل ذلک جدہ (ج ۲ ص ۴۸)

حرف کلا کے متعلق لکھتے ہیں:-

"یہ نفی و ابعاد کا کلمہ ہے، کبھی وہ اَلا کے معنی میں ابتداء کلام میں تنبیہ کیلئے بھی آتا ہے قرآن عزیز میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، امام ابوبکر ابن الانباری نے اس کی تمام قسموں

اور ان کے مواقع استعمال کو کتاب الوقف والابتداء کے ایک باب میں جمع کر دیا ہے،

ایک حدیث [من کذب علی متعمدا لیضل به فلیتبوا مقعده من النار]

کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"ابو جعفر طحاوی کا بیان ہے کہ اس حدیث میں لیضل به زائد معلوم ہوتا ہے لیکن اگر یہ زائد نہ ہو بلکہ روایت کا جزء ہو تو اس کی وہی نوعیت ہوگی جو قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

فمن أظلم ممن افترى على	تو اس شخص سے بڑھکر ظالم اور کون ہوگا جو
الله كذبا ليضل الناس	لوگوں کے گمراہ کرنے کے لیے بے سمجھے بوجھے
(انعام)	خدا پر بہتان باندھے۔

یہاں لام تعلیل کے بجائے صیرورت اور عاقبت کا ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ اس کے کذب کا نتیجہ اور انجام گمراہی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ ہے

فالتقطه آل فرعون ليكون	تو فرعون کے لوگوں نے انھیں اٹھا لیا کہ
لهم عدوا وحزنا (قصص)	(آخر کار یہی موسیٰ) ان کے دشمن اور پریشانی
	(کے باعث) ہوں۔

قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کے بے شمار نظائر موجود ہیں۔

لغت اور نحو کی طرح صرف و اشتقاق اور الفاظ کی تذکیر و تانیث، مفرد و جمع اور تثنیہ کے متعلق بھی مفید معلومات بیان کیے گئے ہیں۔

بعض اعتراضات | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا، اس لیے وہ مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں، اور اسی کو قوی اور مرجح بھی قرار دیتے ہیں، مگر نووی کے حامیوں نے اس الزام کو سراسر غلط قرار دیا ہے، چنانچہ

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں :-

ومنزہ بود از تعصب شافعیت و متصف	شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور
بانصاف نقل میکرد در کتبِ خود از	انصاف پسند تھے، اور اپنی کتابوں میں
اقوال ابو حنیفہ	امام ابو حنیفہ کے اقوال و مسالک بھی
(اتحاف النبلاء)	بیان کرتے ہیں،

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فقہی مذہب کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتے ہیں، اور عموماً اسی کو مرجح بھی ثابت کرتے ہیں، ممکن ہے زمانہ کے عام اثر کی وجہ سے ان میں یک گونہ عصبیت بھی رہی ہو، تاہم ان میں رواداری اور حق پسندی بھی تھی، اس لیے وہ اپنے مرجح مسلک کے دلائل و شواہد بھی بیان کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی کسی مسلک کے قوی اور ضعیف ہونے کے قائل رہے ہوں گے۔ وہ دوسرے ارباب مذاہب اور ائمۂ فقہ کے مسالک نقل کرنے سے اغماض بھی نہیں برتتے، مشہور فقہائے صحابہ و تابعین اور ائمۂ ثلاثہ کے علاوہ انھوں نے فقہائے امصار کے مذاہب بھی نقل کیے ہیں، بلکہ انکی وسیع النظری اور رواداری نے فرق ضالہ، خوارج معتزلہ اور روافض کے مذاہب و اقوال نقل کرنے سے انکو باز نہیں رکھا ہے اس لیے وہ ان کے اقوال ذکر کرکے انکی تردید کرتے ہیں۔

ممکن ہو یہ اعتراض بھی کیا جائے کہ وہ اکابر اور ائمہ کی عظمت و احترام کے زیادہ قائل نہ تھے، اسی لیے وہ انکے خیالات سے بے اطمینانی ظاہر کرتے اور ان پر تنقیدیں کرتے ہیں، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہو کیونکہ کسی پر تنقید نہ تو اس کی عظمت و احترام کے منافی ہے اور نہ ہی اسکا تنقیص سے کوئی واسطہ ہے، علامہ نووی کی تنقیدیں عموماً اعتدال پر مبنی ہوتی ہیں، انھوں نے جن لوگوں کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہو انکی عظمت و جلالت کے بھی وہ پوری طرح قائل تھے، امام مسلم کے بارہ میں انکے طرزِ عمل سے اسکا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ

وہ ان پر نقد کرنے کے باوجود ان کا احترام بھی پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں، اور کبھی کوئی بات ادب و احترام کے منافی نہیں تحریر فرماتے، عام اکابر کی عظمت و احترام کا ان کو جس قدر لحاظ تھا، اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے:۔

"حدیث کے لکھنے والے کو اللہ کے نام کے ساتھ عز وجل، تعالیٰ، سبحانہ وتبارک وتعالیٰ، جل ذکرہ، تبارک اسمہ، جلت عظمتہ وغیرہ لکھنا چاہیئے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ مکمل صلے اللہ علیہ وسلم لکھنا چاہیے، اس میں نہ تو کسی طرح کی کمی کرنی چاہیے اور نہ ہی محض اشارہ پر اکتفا کرنا چاہیے، ایسے ہی صحابی کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنا چاہیے، نیز تمام علماء و صلحاء کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ عنہ یا رحمہ اللہ لکھنا چاہیے، خواہ یہ اس اصل کے اندر ہوں یا نہ ہوں جس سے وہ نقل کر رہا ہے، کیونکہ ان کا نفس روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان کی نوعیت تو دعا کی ہے، کاتب ہی کی طرح پڑھنے والے کو بھی ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ ترضیہ و ترحیم کا لحاظ رکھنا چاہیئے، چاہے وہ اصل کے اندر ہو یا نہ ہو، ان کی تکرار سے اکتانے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، جو شخص اس معاملہ میں غفلت سے کام لے گا وہ بڑے خیر و برکت سے محروم رہے گا۔"

ایک جگہ ایک بزرگ راوی ابوبکر بن عیاش کے کئی ہزار بار قرآن ختم کرنے کے واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ان بزرگوں کے جن کے ذکر سے رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے، اس طرح کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات پر رد و انکار نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ اگر کوئی شخص اس طرح کے خیال پر قائم رہا تو یہ اس کے عدم فلاح کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و احسان سے اپنی اطاعت کی توفیق دے۔"

لبید بن ربیعہ

(ایک جاہلی شاعر)

از جناب مولوی عبدالحلیم صاحب ندوی، ایم، اے، علیگ استاذ عربی ادب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ابو عقیل لبید بن ربیعہ وہ نامور جاہلی شاعر ہے جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ گزارا۔ لبید نے اپنی قوم کے وفد کے ساتھ اسلام قبول کیا، اور مسلمان ہوتے ہی اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ باقی عمر قرآن اور اسلام ہی کا ہو کر رہ گیا، شعر و شاعری ترک کر دی اور بڑی پاک باز، صاف ستھری اور باوقار زندگی گزاری۔ اس کی عظمت و عزت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ اس کا چرچا جاہلیت کے بزمہائے طرب اور خوش باش اور زندہ دل نوجوانوں کی محفلوں ہی میں نہیں رہتا تھا بلکہ بڑے بوڑھوں کی پر وقار انجمنوں اور مجلسوں میں بھی اس کا نام عزت و وقار سے لیا جاتا تھا، اور جب وہ اسلام لایا تو شاید حضرت حسانؓ کے بعد وہ پہلا شاعر ہے جس کا ذکر کوفہ کی مسجدوں کے منبروں پر ہوا۔ اور خود گورنر نے اس کی مدد کرنے اور اس کی قسم کو نبھانے میں پہل کی، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی، اس کی قسم یہ تھی، کہ جب بھی بادصبا چلے گی میں لوگوں کو کھانا کھلاؤں گا۔[۱]

لبید بنو عامر کا شاعر، ان کا مشہور شہسوار، ان کے ناموس کا نگہبان اور ان کی شہرت

---

[۱] اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

وعزت کا نشان تھا، اس کا سلسلۂ نسب قبیلۂ مضر سے ملتا ہے[1]، لبید کا باپ ربیعہ بڑا فیاض اور سخی داتا تھا، اس کی غربا پروری، دادرسی، دریادلی اور داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے "ربیعۃ المقترین" یعنی "دکھیاروں کا ربیعہ" کے نام سے پکارتے تھے[2]، اس کی ماں خاندان عبس کی لڑکی تھی اور اس کا نام تاموۃ بنت زنباع تھا، لبید نے زمانۂ جاہلیت میں آنکھیں کھولیں لیکن اتنی لمبی عمر پائی کہ انتقال حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت یعنی ۴۱ھ مطابق ۶۶۲ء میں ہوا،[3]

جاہلی زمانے کے شعراء میں لبید کو کئی چیزوں میں امتیازی شان حاصل ہے، ایک طرف اسے شریف النفس، سلیم الطبع، پاکیزہ فکر و نظر، حق بیں و حق گو، کہنہ مشق، قابل تقلید بدوی شاعر سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف اسے بہادری اور شجاعت میں یکتائے زمانہ مانا جاتا تھا، یہاں تک کہ لوگ اسے فتی العرب یعنی "شیر عرب" کے نام سے یاد کرتے تھے، ان صفات کے ساتھ ساتھ سخاوت، دریادلی اپنے چچا سے ورثہ میں ملی تھی اور معرکۂ کارزار میں اس کو تلوار کے جوہر دکھانے کا فن اور شہسواری کا گر "ملاعب الاسنۃ" سے ملا تھا، جو زمانۂ جاہلیت کا مشہور بہادر اور دلیر شاعر تھا، اور رشتہ میں اس کا چچا[4]، یہ عجیب اتفاق ہے کہ "ملاعب الاسنۃ" کا ایک موقع پر سکوت اور اپنے حریف کے مقابلہ میں اس کی شکست لبید کی شاعری کا پیش خیمہ اور اس کی شہرت کا سبب بن گئی،

---

[1] پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: لبید بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ [2] ربیعہ بنو اسد کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا، ربیعہ کے بھائی عامر بن مالک نے اس کے قاتل کو قتل کر کے بدلہ لیا (الشعر والشعراء: ابن قتیبہ ص ۱۵۱) [3] تاریخ انتقال کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے۔ [4] "ملاعب الاسنۃ" (یعنی نیزوں سے کھیلنے والا) کا نام عامر بن مالک ہے "ملاعب الاسنۃ" اس کا نام اوس بن حجر کے اس شعر کی وجہ سے پڑا ـــ

اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے اپنے قبیلہ بنو عامر اور اس کے ننھال کے قبیلہ عبس میں سخت دشمنی تھی، ایک دفعہ نعمان بن المنذر کے دربار میں دونوں قبیلوں کی مڈبھیڑ ہو گئی، اس موقع پر عبس قبیلہ کا سردار الربیع بن زیاد اور عامریوں کے وفد کا لیڈر لبید کا چچا "ملاعب الاسنۃ" ربیع، نعمان بن منذر کے بہت منھ چڑھا تھا، ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، اسی کے ساتھ کھاتا پیتا اٹھتا بیٹھتا تھا، اس نے عامریوں کی ..... طرف سے نعمان بن المنذر کے کان بھر رکھے تھے، چنانچہ جب قبیلہ بنو عامر کا وفد اس کے دربار میں آیا تو اس نے منھ پھیر لیا، اور بہت ذلت آمیز سلوک کیا "ملاعب الاسنۃ" اس کی کچھ کاٹ نہ کر سکا، یہ بات عامریوں کو بہت بری لگی، اور وہ غصے میں بھرے ہوئے اس کے دربار سے اٹھ کر چلے آئے، اور اگلے قدم کے بارے میں آپس میں مشورہ کرنے لگے، لبید اس وقت بہت چھوٹا تھا، اور اس کے ذمہ وفد کے اونٹوں کو چرانے کا کام تھا، جب اس نے دیکھا کہ سارے لیڈر اور بوڑھے بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے ہیں، تو اس نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے، لوگوں نے اس کی کم عمری کی وجہ سے اس کی بات پر دھیان نہ دیا، مگر جب اس نے بہت اصرار کیا اور قسم کھائی، کہ اگر آپ لوگ مجھے نہ بتائیں گے تو نہ میں آپ کے اونٹوں کو چراؤں گا اور نہ ان کی دیکھ بھال اور رکھوالی کروں گا، تب لوگوں نے بادشاہ نعمان کے حقارت آمیز سلوک کا ذکر کیا اور کہا کہ تمھارے ماموں الربیع کا یہ سب کیا دھرا ہے، اس پر لبید نے کہا کہ آپ لوگ اجازت دیں تو میں اس کو ایسا جواب دوں کہ وہ بھی یاد کرے، اور نعمان ہمیشہ کے لئے اس کی صورت سے متنفر ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ ہم تمھیں اس طرح اجازت نہ دیں گے، پہلے تم اپنی صلاحیت کا ثبوت دو، تب اجازت ملے گی، لبید نے کہا کہ آپ لوگ امتحان لے لیجئے، اتفاق سے سامنے زمین پر ایک سوکھا ننھا سا پودا لگا تھا، اس میں گنتی کے چند

پتے باقی رہ گئے تھے، جسے عربی میں "الترِبۃ" کہتے ہیں، ان بزرگوں نے کہا، اس پودے کی ہجو کر دو تو جانیں، لبید نے اس کی ایسی ہجو کی، جو مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زباں دانی کا بھی بہت اچھا ثبوت تھا، اس نے کہا "ہذہ التربۃ لا تذکی نارا ولا تؤہل دارا ولا تسر جارا عودہا ضئیل و خیرہا قلیل و فرعہا کلیل، اقبح البقول مرعی و اقصرہا فرعا، واشدہا قلعا فخزیا لجارہا و جدعا۔ القونی اخا عبس ارجعہ عنکم بتعس ونکس واترکہ من امرہ فی لبس یعنی یہ تربہ کا پودا اتنا حقیر اور پولا ہے، کہ اس سے نہ تو آگ ہی روشن ہو سکتی ہے، اور نہ یہ کسی گھر کی زینت ہی بن سکتا ہے اور نہ اسے دیکھ کر کسی پڑوسی کو خوشی ہو سکتی ہے، اس کا تنا بہت ہی پتلا اور اس کا فائدہ بہت ہی کم، اور اس کی شاخ بالکل ہی کمزور ہے، چرے جانے والوں (پودوں) میں سب سے بدتر، شاخوں کے لحاظ سے سب سے چھوٹا، اور اکھاڑنے میں سب سے سخت ہے، جو اس کے پڑوس میں رہے، اس کا ستیاناس جائے، مجھے اس عبسی سے ملا دو میں اسے اتنا ذلیل و خوار کر دوں گا، کہ وہ پھر تمھارے مقابلہ میں کبھی نہ آسکے گا، اور اپنے معاملہ کے گورکھ دھندے ہی میں پڑا اسے رہے گا،

جب بزرگوں نے اس کی یہ طلاقت لسانی دیکھی تو کہا کہ بیشک تم اس مہم کے لائق ہو پھر انھوں نے اس کے بال منڈوائے، اور دو چوتیاں چھوڑ دیں، اور ایک خاص قسم کا لباس پہنا کر اس کو لے کر النعمان بن المنذر کے دربار میں پہونچے، نعمان اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، اور دسترخوان پر اس کے ساتھ صرف الربیع بن زیاد تھا، مختلف وفدوں سے دربار بھرا ہوا تھا، جب نعمان کھانا کھا چکا، تو لبید کے قبیلہ کے لوگوں کو حاضری کی اجازت دی جب یہ لوگ اس کے سامنے اپنی ضرورتیں بیان کرنے لگے، تو اس کے پہلو میں الربیع بھی کھڑا تھا، اس نے

---

[۱] بعض کتابوں میں "الترِبۃ" بھی آیا ہے، [۲] اسکے یہ جملے کمی زیادتی کے ساتھ مختلف طریقوں سے مروی ہیں،

ان کی بات کاٹ دی، اس وقت لبید اپنی اس ہیئت کذائی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، سب کی نگاہیں اس کمسن لڑکے اور پھر اس کی مضحکہ خیز ہیئت کذائی کی طرف اٹھ گئیں، اس نے سب کے سامنے ربیع بن زیاد کی ایسی سخت اور فحش ہجو کی کہ نعمان کو کہنا پڑا کہ "اس لونڈے کا ستیاناس جائے، اس نے اس گندی باتوں سے میرے کھانے کا سارا مزہ بے لطف کر دیا" اس کی ہجو کا پہلا شعر یہ تھا:۔

یا رب ہیجا ہی خیر من دعہ　　　اذ لا تزال ھامتی تقزعہ

آگے چل کر کہتا ہے:

فلا ابیت اللعن لا تاکل معہ یعنی "چشم بد دور" ایسے آدمی کے ساتھ ہرگز کھانا نہ کھایا کیجیے، اور اس کی وجہ بہت گندی بتائی ہے[۱]۔

نعمان نے اس کے بعد عامریوں یعنی لبید کے قبیلہ کے وفد کی ضرورتیں پوری کر دیں اور الربیع سے پوچھا، کیا تم ایسے ہی ہو جیسا کہ اس لڑکے نے بیان کیا ہے، وہ بولا، یہ لڑکا جھوٹا اور احمق ہے۔ اور کھسیا کر اپنے گھر چلا گیا، اور النعمان کو لکھ بھیجا کہ آپ کسی آدمی کو میرے پاس بھیج دیجئے کہ اس نے میرے متعلق جو باتیں کہی ہیں، وہ کہاں تک صحیح ہیں مگر نعمان نے کہلا بھیجا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، تد قیل

ما قیل ان صدقا وان کذبا　　　فما اعتذارک من قول اذا قیلا

اس واقعہ کے بعد لبید کی زبان چل پڑی، اور اس کے جذبات شاعری ابل پڑے، اور اس کا شہرہ سارے علاقے میں پھیل گیا اور اس نے اس کے بعد چھوٹے بڑے کئی قصیدے کہے جن سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

لبید بن ربیعہ کی دلیری، بیجگری اور شہسواری میں یکتائی کے سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ الحارث الاعرج الغسانی نے ایک سو بہادر نوجوانوں کا ایک جتھا لبید کی سرکردگی میں جیرہ کے

---

[۱] ہجو کے ان اشعار کے لیے دیکھئے الاغانی ج ۱۴ ۔ المعلقات الشعر و الاخبار فی تلیھا اللامین الشنقیطی اور تذکرہ کی دوسری کتابیں۔

کے بادشاہ المنذر بن ماء السماء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا، ان لوگوں نے اس کے پاس جاکر ظاہر کیا، کہ وہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری قبول کرنے کے لئے آئے ہیں، چنانچہ اس نے انھیں اپنے پاس رکھ لیا، یہ لوگ موقعے کی تلاش میں رہے، اور ایک دن موقع پاکر اسے قتل کر دیا، اور بھاگ کھڑے ہوئے منذر کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا، اور بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن لبید نے اپنے گھوڑے کو ایسی ایڑ لگائی کہ لاکھ کوشش کی اس کو پکڑ نہ سکے، اور وہ صاف بچ کر نکل گیا، اور غسان کے بادشاہ کے پاس جاکر سارا قصہ سنایا، اور غسانیوں نے منذر کے لشکر پر چڑھائی کر دی، اور انھیں سخت شکست دی، اس جنگ کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں[۱]۔

اغانی نے اصمعی اور ابن الکلبی کی سند سے روایت کی ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا، اور عرب کے وفود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنے لگے، تو بنو جعفر بن کلاب کا وفد بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس میں لبید بن ربیعہ بھی تھا، وہ وفد کے ساتھ آپ کے ہاتھوں اسلام لایا اور وطن جاکر قرآن شریف حفظ کیا، اس کے بعد بڑی پاک اور صاف ستھری اسلامی زندگی گزارنے لگا، شعروشاعری بالکل ترک کر دی، روایت ہے کہ لبید بن ربیعہ نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ تھا:

ما عاتب الحرَّ الکریمَ کنفسہ   والمرءُ یصلحہ الجلیس الصالح

ابن قتیبہ نے ابوالیقظان سے روایت کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد پہلا اور آخری شعر یہ تھا

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی   حتی اکتسبت من الاسلام سربالا

---

[۱] اس جنگ میں غسانی بادشاہ کی لڑکی بھی شریک تھی، چنانچہ اس کے نام پر اس کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں روایت کی ہے کہ حلیمہ نے بہادروں کو اپنے ہاتھ سے زرہیں اور خود پہنائے تھے، اور دلداری و دلجوئی کی تھی، ص۱۷۵۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں لبید کوفہ میں منتقل ہو کر وہیں رہ بس گئے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کو لکھا کہ تمہارے علاقے کے شعرا نے اسلام لانے کے بعد جو شعر کہے ہیں، انھیں لکھ بھیجو، انھوں نے سب سے پہلے اس علاقے کے مشہور شاعر الاغلب الراجز العجلی کو بلوا کر کہا کہ مجھے اپنے اشعار سناؤ، اس نے کہا:

ارجزاً تزید ام قصیداً لقد طلبت ھینا موجوداً

یعنی آپ رجز سننا پسند فرمائیں گے، یا قصیدہ۔ آپ نے تو انتہائی آسان چیز کی فرمائش کی ہے۔

اسکے بعد لبید بن ربیعہ کو بلوا بھیجا، اور حضرت عمرؓ کا حکم سنا کر شعر پڑھنے کی فرمائش کی، لبید نے کہا کہ "ان شئت ما عفی عنہ" یعنی اگر آپ چاہیں تو میں وہ شعر سناؤں جو اب مٹ چکے ہیں، مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت کا کلام سناؤں؟ مغیرہ نے کہا، نہیں، اسلام لانے کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ سناؤ، لبید نے کہا، تھوڑی سی مہلت دیجئے، یہ کہہ کر اٹھے اور ایک کاغذ پر سورۂ بقرہ لکھ کر لے آئے اور اس کو پیش کرکے بولے کہ اللہ نے شعر کے بدلے میں مجھے یہ عنایت فرما دیا ہے، جو حاضر ہے، مغیرہ نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی۔ آپ نے اغلب کے وظیفے میں سے پانچ سو درہم کم کرکے لبید کے وظیفہ میں بڑھا دیئے، اور ان کا وظیفہ دو ہزار پانچ سو درہم ہو گیا، اغلب کو جب اس کی خبر ہوئی، تو اس نے حضرت عمرؓ کو درخواست دی کہ آپ نے میرا وظیفہ صرف اس لئے کم کر دیا کہ میں نے آپ کی اطاعت کی تھی؟ اس درخواست پر حضرت عمرؓ نے اس کے پانچ سو پھر بحال کر دیئے اور لبید کو بڑھی ہوئی رقم کے ساتھ وظیفہ ملتا رہا، حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں لبید کے پانچ سو درہم کم کرنا چاہے، انھوں نے کہا کہ میں تو چراغ سحری ہو رہا ہوں، آج مرا کل دوسرا دن، حضرت معاویہؓ نے یہ سُن کر وظیفہ برقرار رکھا، لیکن کہتے ہیں کہ لبید اس واقعہ کے بعد مر گئے، اور وظیفہ لینے کی نوبت نہ آئی[لے]

لے ابن سلام الجمحی نے نقل کیا ہے کہ لبید نے حضرت معاویہؓ سے کہا "اونما ھی قلیلا ثم نضم عطائی الی عطائک فما فقدہ" (ابجع صے ۱۳۱)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، سخاوت اور غربا پروری لبید کو اپنے باپ "ربیعۃ المقترین" سے ورثہ میں ملی تھی، انھوں نے زمانہ جاہلیت میں قسم کھا رکھی تھی، کہ جب جب بادصبا چلے گی، وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، انھوں نے اس نیک کام کو انجام دینے کے لئے دو دیگیں بنوا رکھی تھیں، اور جب بادصبا چلتی اس میں کھانا پکوا کر صبح اور شام اپنے قبیلہ کی مسجد میں لے جاتے، اور سب کو کھانا کھلاتے، لبید نے اس منت کا ذکر اپنے معلقہ میں بھی کیا ہے،

راویوں کا بیان ہے کہ جب بادصبا چلتی تھی، تو حضرت عمرؓ کی طرف سے متعین کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ لوگوں سے کہتے تھے، کہ ابو عقیل کی مروت اور شجاعت و شرافت کی وجہ سے ان کی اس موقع پر مدد کریں، تاکہ وہ اپنی منت پوری کر سکیں،

ایک دفعہ جب کہ الولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر تھے، بادصبا چلی، یہ زمانہ لبید کے بڑھاپے اور انتہائی تنگ دستی کا تھا۔ ولید کو اس کی خبر تھی، چنانچہ وہ منبر پر چڑھے، اور لوگوں سے کہا، کہ تمھارے بھائی لبید نے زمانۂ جاہلیت میں قسم کھائی تھی، کہ جب بھی بادصبا چلے گی، وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، آج بادصبا چلی ہے، اس لئے آج کا دن ان کے اس نیک کام کا دن ہے، آپ لوگ اس نیک روایت کو برقرار رکھنے میں ان کی مدد کیجئے، اور اس کام میں میں پہل کرتا ہوں، اور منبر سے اتر کر لبید کے پاس ایک سو اونٹوں کی بچھڑیاں بھیجیں اور اس کے ساتھ اشعار لکھ بھیجے

اری الجزار یشحذ شفرتیہ	اذا ھبت ریاح ابی عقیل
اشم الانف اصید عامری	طویل الباع کالسیف الصقیل
وفی ابن الجعفری بحلفتیہ	علی العلات والمال القلیل
بنحر الکرم اذ سحبت علیہ	ذیول صبا تجاوب بالاصیل

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابو عقیل کی ہوائیں (بادصبا) چلتی ہیں، تو میں دیکھتا ہوں کہ قصاب

اپنے چھریوں کو تیز کر رہا ہے تاکہ یہ معزز اور محترم سخی داتا قبیلۂ عامر کا فرد اپنی قسم پوری کر سکے، اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے باوجود تنگ دستی اور تھوڑے سے مال کے اپنی قسم کو موٹی تازی اونٹنیوں کو ذبح کرکے پوری کی، جب کہ باد صبا سر شام چل پڑی،

لبید نے یہ اشعار پڑھکر اپنی لڑکی سے کہا، بیٹی تم تو جانتی ہو کہ میں نے اب شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا ہے، اس لئے تم ہی ان کا جواب دیدو

لڑکی نے جواب میں یہ شعر کہے :۔

اذا ھبت ریاح ابی عقیل	ذکرنا عند ھبتھا الولیدا
اشم الانف اُصید عبشمیا	اُعان علی مروتہ لبیدا
باشال الھضاب کان رکبًا	علیھا من بنی حام قعودا
اَبا وھب جزاک اللہ خیرا	نحرناہا فاطعمنا الثریدا
فعد ان الکریم لہ معاد	وظنی یا بن اُروی ان یعودا

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوعقیل کی ہوا (باد صبا) چلی تو ہم نے مدد کے لئے ولید کو یاد کیا، جو عالی خاندان کا فرد اور معزز و مکرم شخص ہے، اس نے لبید کی مدد بھاری بھرکم، موٹی تازی اونٹنیاں بھیج کر کی، اے ابو وھب! خدا تمھیں جزائے خیر دے، ہم نے ان کو ذبح کرکے تیار بنا کر سب کو کھلا دیا، اور ہمیں امید ہے کہ تم آیندہ بھی ایسا ہی کرتے رہوگے،

لبید نے سنکر کہا، تم نے بہت اچھا کیا ہے، صرف یہ خرابی ہے، کہ تم نے اس سے مزید کی خواہش کی ہے، بیٹی بولی، کہ خدا کی قسم میں نے تو صرف اس لئے مانگا ہے کہ وہ حکمراں ہیں، اگر وہ کوئی بازاری آدمی ہوتے، تو ہرگز نہ مانگتی،

لبید نے بڑی لمبی عمر پائی، جب ۷۷ سال کا ہوا، تو اس نے کہا :۔

باتت تشتکی الی النفس مجہشتہ | وقد جعلت سبعاً بعد سبعینا
فان تزادی ثلاثا تبلغی املاً | وفی الثلاث وفاء للثمانینا

اور جب نوے سال کا ہوا تو اس کی یادگار میں یہ شعر کہا:۔

کأنی وقد جاوزت تسعین حجۃ | خلعت بہا عن منکبی ردائی

نوے کو پار کر کے جب ایک سو دس سال کی عمر ہوئی تو کہا کہ ع

الیس فی مائۃ قد عاشہا رجل | وفی تکامل عشر بعدہا عمر

اور جب ایک سو بیس[۱۲۰] سال پورے کر لئے تو زندگی سے اکتا کر کہا:۔

ولقد سئمت من الحیاۃ وطولہا | وسوال ہذا الناس کیف لبید

حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ لبید نے ایک سو چالیس[۱۴۰] سال کی عمر میں وفات پائی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک سو ناون[۱۵۷] سال کی عمر پائی، اس پر تقریباً سب کا اتفاق ہے، کہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں سنکمہ میاسکہ[۱] میں لبید کا انتقال ہوا، اور اپنے خاندان کے صحرا میں دفن ہوا،

اغانی اور ابو زید القرشی کی روایت ہے کہ جب لبید کا آخری وقت آیا، تو اس نے اپنے لڑکے[۱] کو بلایا، اور کہا کہ جب تمھارا باپ مرجائے، تو اس کی آنکھیں بند کر کے اس کا منہ قبلہ کی طرف کر دینا، اور ایک کپڑے سے اُسے ڈھانپ دینا، اور کسی رونے والی اور بین کرنے والی کو نالہ و شیون کی اجازت نہ دینا، دونوں دیگوں میں اچھا کھانا پکا کر اپنی مسجد میں ان لوگوں کو کھلانا، جو میری زندگی میں... جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں، تو کہنا کہ اپنے بھائی لبید کے جنازہ کی نماز

[۱] مراد بھتیجہ ہے، کیونکہ لبید کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، مگر ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے، کہ لبید کے لڑکے تھے، جو لبید کے مرنے کے بعد کوفہ سے بادیہ میں واپس آگئے تھے،

پڑھتے جائیے، اس کے بعد چند شعر پڑھے[1] جن کا ذکر اہم کتابوں میں ہے،

کلام کی خصوصیات | لبید نے چونکہ جاہلی اور اسلامی دونوں کا زمانہ پایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام لائے، اس لئے قاعدے کے مطابق ان کو "مخضرمین" میں شامل کرنا چاہیئے تھا، لیکن تذکرہ نگاروں نے جاہلی دور کے ممتاز شعراء میں شمار کیا ہے، کیونکہ اسلام لانے کے بعد صحیح روایتوں کے مطابق انھوں نے صرف ایک شعر کہا تھا، جو پہلے گذر چکا ہے، اگرچہ مسلمان ہونے کے بعد وہ تقریباً چالیس سال زندہ رہے، مگر شعر و شاعری بالکل نہ کی، برخلاف حضرت حسان بن ثابت رضؓ کے، جنھوں نے جاہلیت کے زمانہ میں بھی شاعری کی، اور اسلامی دور میں بھی یہ شغل جاری رکھا، اس لئے انھیں مخضر میں شمار کیا جاتا ہے،

لبید نے شعر و شاعری کی ابتدا بہت ہی کم سنی میں کر دی تھی، اور اس زمانے میں خاصی شہرت بھی حاصل کر لی تھی، شاعری کے میدان میں وہ اپنے پیش رو آزاد منش عالی نسب اور اولو العزم شاعروں جیسے عنترہ بن شداد العبسی اور عمرو بن کلثوم کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے کبھی شاعری کو اپنی روزی کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ انعام واکرام کے لیئے مدحیہ قصیدے کہے، اس لئے ان کا کلام بہت بلند ہے، اور بلند پایہ فخر کے علاوہ بہادری، دوسروں کی امداد، فیاضی، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری وغیرہ اخلاق حمیدہ کی تلقین سے معمور ہے، اس قسم کی تعلیم ان کے معلقہ میں خاص طور سے ملتی ہے، لبید کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بہت ہی پرشکوہ مگر خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرتے تھے، اور ان کو نظم کے قالب میں اس طرح ڈھالتے تھے، کہ عبارت کا حسن، دقیق معانی، بلند اور پاکیزہ خیالات ہم آہنگ ہو کر شاہکار بن جاتے تھے، دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے، کہ ان کے کلام میں شاعرانہ مبالغہ آرائی زیادہ نہیں ہے

---

[1] جمہرۃ "اشعار العرب" لابی زید القرشی اور الاغانی ابو الفرج الاصفہانی جلد ۱۴۔

وہ عام طور سے ایمان، عقیدہ، حکمت و فلسفہ اور پند و نصیحت کے مضامین پر مشتمل ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حق گوئی کی شہادت دی ہے، بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے، وہ لبید کا یہ قول ہے" الا کل شئی ما خلا اللہ باطل"[1]

ان خصوصیات کے علاوہ لبید کو مرثیہ گوئی میں بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے، مرثیہ میں وہ حکمت اور دانائی کی ایسی باتیں کہتا ہے، جن سے رنج و غم ہلکا ہو جاتا ہے، اور صبر و سکون ملنے لگتا ہے،

ابن سلام الجمحی نے اپنی کتاب "طبقات فحول الشعراء" میں لبید کو جاہلی شعراء کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے، اور اسے النابغۃ الجعدی، ابو ذویب الہذلی اور الشماخ بن ضرار کا ہم پلہ قرار دیا ہے[53]، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ لبید کا کلام شماخ کے کلام کے مقابلہ میں زیادہ عام فہم اور آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی نے لبید سے پوچھا، کہ عربوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ لبید نے جواب دیا کہ "الملک الضلیل" یعنی امرأ القیس، پھر سوال کیا، کہ اس کے بعد کون؟ جواب دیا "الغلام القتیل" " مقتول لڑکا" یعنی طرفۃ العبد پھر پوچھا، اس کے بعد؟ لبید نے کہا، "الشیخ ابو عقیل" یعنی خود میں،

ایک دفعہ نابغہ الذبیانی نے النعمان بن المنذر کے دربار میں لبید سے شعر سنانے کی فرمائش کی، انھوں نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے ع

الم تلمم علی الدمن الخوالے   لسلمی بالمذانب فالقفال

نابغہ نے سنکر کہا، کہ قبیلہ بنو عامر میں تم سب سے بڑے شاعر ہو، کچھ اور سناؤ، لبید نے وہ قصیدہ پڑھا جس

---

[1] اس شعر کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ عثمان بن مظعونؓ ایک دفعہ قریش کی ایک مجلس کے پاس سے گذرے، انھوں نے دیکھا کہ لبید اشعار سنا رہا ہے، چنانچہ جب اس نے یہ مصرع پڑھا کہ "الا کل شئی ما خلا اللہ باطل" تو عثمان نے کہا کہ بالکل سچی بات کہی، اور جب دوسرا مصرع پڑھا "وکل نعیم لا محالۃ زائل" تو بولا کہ بالکل جھوٹ، لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پہلی بات صحیح اور دوسری جھوٹی کیوں ہے؟ اس لئے پھر سے شعر پڑھوایا گیا، اب کی مرتبہ بھی عثمان نے پہلے مصرع کو صحیح

[illegible]

کا مطلع ہے :-

طلل لخولۃ بالرسیس قدیم　　　　بمعاقل فالانعمین وشوم

تو نابغہ بولا کہ تم قبیلہ ہوازن میں سب سے بڑے شاعر ہو، کچھ اور سناؤ، اور جب لبید نے اپنا معلقہ سنایا،

جس کا پہلا شعر ہے

عفت الدیار محلہا فمقامہا　　　　بمنی تابد غولہا فرجامہا

معلقہ سنکر نابغہ جھوم جھوم اٹھا اور فرط مسرت میں کہا کہ جاؤ تم عربوں میں سب سے بڑے شاعر ہو، فرزدق کے متعلق کہتے ہیں، کہ وہ کوفہ میں بنو اقیصر کی مسجد کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اس کے کان میں لبید کے اس شعر کی آواز پڑی :-

وجلا السیول عن الطلول کانہا　　　　زبر تجد متونہا اقلامہا

تو سجدہ میں گر پڑا، لوگوں نے کہا، کہ ابو فراس یہ کیا بدعت ہے ؟ تو بولا کہ تم لوگ صرف قرآن کے سجدے کو جانتے ہو، اور میں شعر کے سجدے کو بھی سمجھتا ہوں،

یوں تو لبید نے بہت سے شگفتہ اور پُر مغز قصیدے کہے ہیں، لیکن اس کی شاعری کا بہترین نمونہ اس کا معلقہ ہے، جس کا مطلع ہے :-

عفت الدیار محلہا فمقامہا　　　　بمنی تأبد غولہا فرجامہا

یعنی منیٰ میں (جو طائف کے قریب ہے) میرے محبوب کے ٹھہرنے کی جگہیں مٹ گئی ہیں، اور اس کے دونوں پہاڑ یعنی غول اور رجام ویران و سنسان پڑے ہیں، اس قصیدہ میں بالاتفاق ۸۸ شعر ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۳) اور دوسرے کو جھوٹ کہا، لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ؟ جواب دیا کہ جنت کی نعمتوں کو کبھی زوال نہیں، اس لئے دوسرا مصرع جھوٹ ہے، یہ بات ولید کو بہت بُری لگی، اس نے کہا کہ معززین قریش تمہاری مجلسوں میں ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں، یہ واقعہ اسلام سے پہلے کا ہے۔ ۵۲ ص۱۰۲۔

لبید بدوی شاعر ہے، اس لئے اس کے معلقہ میں بدوی زندگی کی پوری تصویر ملتی ہے، اس کا موضوع شاعر کی اپنی زندگی، اس کی میش کوشی اور سخاوت اور اس کی بہادری اور شجاعت ہے، اور آخر میں اپنی قوم اور قبیلہ کی تعریف اور اس پر فخر،

دستور کے مطابق اس نے اپنا قصیدہ تشبیب سے شروع کیا ہے جس میں اپنی محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کا ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ اس کے نشانات مٹ گئے تھے، لیکن بارش نے اوپر کی گرد وغبار دھوکر اسے پھر سے ظاہر کر دیا ہے، اور ایسا لگتا ہے، کہ پتھر پر کوئی تحریر کندہ کر دی گئی ہو اور باوجود امتدادِ زمانہ کے ابھی تک باقی ہے، لیکن یہ بات اسی کو معلوم ہو سکتی ہے، جو قریب سے بہت دیر تک غور سے اسے دیکھتا رہے، پھر دیارِ محبوب کی ویرانی اور وہاں پر جانوروں کے آزاد نہ رہنے کا ذکر کرتا ہے، کیونکہ اب یہاں کوئی انسان نہیں رہتا، جس سے ڈر کر وہ دوسری جگہ بھاگ جائیں، اور یہ سلسلہ نویں شعر تک چلتا ہے، دسویں شعر سے غزل کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور ان نشانوں کے پاس کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کے متعلق ان سے سوالات کرتا ہے، لیکن پھر خود ہی جواب بھی دیتا ہے، کہ بھلا یہ گونگے سخت جان پتھر میری بات کا جواب دے سکتے ہیں، نہیں یہ محض واہمہ ہے، یہاں کوئی نہیں، محبوبہ کا قبیلہ یہاں سے کب کا جا چکا، اور ان جگہوں پر چرندوں اور پرندوں نے اپنے بسیرے بنا لئے ہیں، اور اب تو اس کی نشانی نالیاں اور ثمام کے درخت رہ گئے ہیں،

فوقفت أسألها وكيف سؤالنا　　　　صماً خوالد ما يبين كلامها

عريت وكان بها الجميع فأبكروا　　　　منها وغودر نؤيها وثمامها

اس کے بعد محبوبہ کے کوچ کرنے کا ذکر کرتا ہے، اور اس کا منظر پیش کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے، کہ وہ کن کن جگہوں پر اتری، اور آخر میں اس کے وصال سے مایوس ہو کر اپنے دل کو اس سے قطع تعلق کرنے کے لئے سمجھاتا ہے، اور اس ضمن میں محبت سے متعلق جاہلی شاعر کا نقطۂ نظر بتاتا ہے، اگر محبوب دلدار نہیں اس کا

وصل ممکن نہیں، تو اس سے قطع تعلق کر لینا ہی بہتر ہے،

فاقطع لبانۃ من تعرض وصلہ و لخیر واصل خلۃ صرامھا

غالب نے بھی شاید ان ہی حالات میں کہا تھا۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غالب تو سر پھوڑنے کے لئے دوسرے کے سنگ آستاں کے متلاشی تھے لیکن جاہلی شاعر ایسے موقعوں پر اپنی اونٹنی کا سہارا لیتا ہے، وہ سر پھوڑنے کا قائل نہیں، صحرا کی پہنائیوں میں اپنی کشتی بے بادبان کے ذریعہ محبت کی تلاش کا قائل ہے، جہاں نیل گائیں، خورگر، شتر مرغ آزادی کی فضا میں بے روک ٹوک محبت کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر صحرا نوردی کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے، یہ اونٹنی مدتوں تک پیہم سفر کرتے رہنے کی وجہ سے بہت لاغر و نحیف ہو گئی ہے، اس کی پیٹھ اور کوہان سوکھ کر کھنکھڑ ہو گئے ہیں، اس کا سارا پانی ہو گئی ہے، اس کے کجاوے کے تسمے کثرت استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر گر گئے ہیں، لیکن جاہلی اتنی ہے کہ جب چلتی ہے تو ایسی تیز رفتاری دکھاتی ہے، کہ سرخ تیز رو بادلوں کو بھی مات کر دیتی ہے۔

بطلیح اسفار ترکن بقیۃ منھا فاحنق صلبھا و سنامھا
واذا تغالی لحمھا و تحسرت وتقطعت بعد الکلال خدامھا
فلھا ھباب فی الزمام کانھا صھباء خف مع الجنوب جھامھا

اور یہاں سے اپنی اس اونٹنی کا وصف اور امتیازی خصوصیات گنانا شروع کر دیتا ہے چنانچہ اس کی تیز رفتاری کی تشبیہ کبھی اس بادل سے دیتا ہے، جسے جنوب کی ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے، اور کبھی اس مادہ گورخر اور نیل گائے کی تیزی سے جس کا بچہ کھو گیا ہو، اور وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں بھاگتی پھرتی ہو، اور تشبیہ دیتے وقت ان جانوروں کی نقل و حرکت، ان کے اعضا و انداز، ان کا شکاریوں سے

ڈرکر بھاگنا، شکاری کتوں سے مقابلہ کرنا، اور دونامی کتوں یعنی سخام اور کساب کو سینگ سے مارڈالنا، غرضکہ ان سب اوصاف واطوار کی ایسی تصویر کھینچتا ہے، کہ گمان ہونے لگتا ہے، کہ ان ہی کا وصف پیش نظر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ جملہ معترضہ کے طور پر آیا ہے، اصل بات تو اسے اپنی اونٹنی کی برق رفتاری بتانی ہے، لبید نے اپنی اونٹنی اور اس کی چال ڈھال کا اتنا تفصیل اور دقت نظری سے نقشہ کھینچا ہے، کہ اس میں طرفہ کو بھی مات کردیتا ہے،

اونٹنی اور اس سے متعلق خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد جس کا سلسلہ دراز ۵۴ ویں شعر تک چلتا ہے، پھر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ اگر تجھے اس بات کی غلط فہمی ہے، کہ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرو، میں تمھارا ہی رہوں گا، تو اس غلط فہمی کو دور کرلو، مجھے محبت اور قطع محبت دونوں فن آتے ہیں؛ جو مجھ سے محبت کرے گا، میں اس سے محبت کروں گا، جو کٹے گا، میں بھی اس سے کٹ جاؤں گا، یہی نہیں بلکہ جس جگہ محبت نہیں ملتی، اس جگہ کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں، اسے بھی چھوڑ دیتا ہوں،

أولم تکن تدری نوار بأننی　　وصال عقد حبائل جذامہا

تراک أمکنۃ اذا لم أرضہا　　أو یرتبط بعض النفوس حمامہا

اس کے بعد اپنی لذت کوشیوں، شراب وکباب اور محفل یاران خوش باش کا ذکر کرتا ہے، اور پھر یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کی حفاظت وحمایت کرتا ہے، اس کام میں اس کا ساتھ اس کا تیز رفتار گھوڑا دیتا ہے، اس کے بعد الربیع بن زیاد اور اس کے درمیان النعمان بن المنذر کے دربار میں جو مناظرہ ہوا تھا اس کا ذکر کرکے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ میں اتنا شریف اور کارہائے نمایاں کرنے والا انسان ہوں، کہ حریف اپنے بزرگوں کے کارنامے گنا کر بھی مجھ سے جیت نہ سکا۔

أنکرت باطلہا وبؤت بحقہا　　عندی فلم یفخر علی کرامہا

(بقیہ آئندہ)

شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

شاہ عالم بادشاہ کی قدردانی شیخ غلام نقشبند نے تین سلاطین مغلیہ کا دور پایا ہے، ان کی پیدائش شاہجہان کے دور (۱۰۳۶ھ تا ۱۰۹۸ھ) میں ہوئی، اسی دور میں تحصیل و تکمیل سے فراغت کے بعد لکھنؤ میں شیخ پیر محمد کے سجادہ نشین اور انکے مدرسہ کے مدرس ہوئے، اورنگ زیب عالمگیر کے دور (۱۰۹۸ھ تا ۱۱۱۸ھ) میں ان کے درس و افادہ کا شباب تھا، ان کی وفات سے دو سال پہلے تک شاہ عالم بن عالمگیر کا دور (۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ) تھا، اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا، شاہجہاں اور عالمگیر دونوں خصوصاً عالمگیر علماء و فضلاء کا بڑا قدرداں تھا، مگر ان دونوں سے شیخ غلام نقشبند کے تعلق کا پتہ نہیں چلتا، البتہ شاہ عالم کے بارے میں تصریح ہے کہ اس نے شیخ صاحب کے علمی کمالات کا شہرہ سنکر ملاقات اور بڑی قدردانی کی، مآثر الکرام میں ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ ایشان را تکلیف ملاقات کرد، اعزاز و اکرام بیش از حد بہ تقدیم رسانید[1]

شاہ عالم بہادر شاہ نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کا مظاہرہ کیا،

---

[1] مآثر الکرام۔ ذکر عبدالجلیل بلگرامی۔ ص ۲۱۴،

سبحۃ المرجان میں ہے

وکلفہ شاہ عالم بن السلطان عالمگیر الملاقاۃ واقبل علیہ فی نہایۃ التعظیم والمداراۃ [1]	شاہ عالم بن عالمگیر نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور ان کے ساتھ نہایت خاطر مدارات سے پیش آیا۔

مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ملاقات دہلی میں ہوئی یا لکھنؤ میں، نزہتہ الخواطر میں ہے کہ لکھنؤ میں ہوئی،

ان شاہ عالم بن عالمگیر الدھلوی لقیہ بمدینۃ لکھنؤ واکرم مغایۃ الاکرام [2]	شاہ عالم بن عالمگیر دہلوی نے ان سے شہر لکھنؤ میں ملاقات کر کے نہایت تعظیم وتکریم کی،

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات وقتی اکرام و احترام تک محدود رہی اور شیخ صاحب نے کوئی جاگیر یا منصب قبول نہیں فرمایا،

شرعی امور و معاملات میں شدت | شیخ غلام نقشبندؒ خالص دینی اور علمی ماحول کے پروردہ تھے، ان کے دادا گھوسی کے قاضی اور میر علی عاشقان سرائمیری کے مرید تھے، انکی ذات شریعت و طریقت کی جامع تھی، ان کے والد علوم نقلیہ و عقلیہ میں کمال کیساتھ تقوی میں نمایاں مقام رکھتے تھے، شیخ عبدالقدوس نظام آبادی اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے روحانی واحسانی نسبت رکھتے تھے، غرض شیخ صاحب کا گھرانا علم و معرفت کا مجمع البحرین تھا، اور شریعت کے اوامر و نواہی پر شدت سے عمل کرتا تھا، خود شیخ صاحب علوم شرعیہ کے نامور عالم و مدرس ہونے کے ساتھ علوم باطنیہ میں بھی کامل تھے، شریعت

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۷، [2] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳،

کے معاملات میں مطلق رورعایت نہیں کرتے تھے، البتہ ان کے علم دین کے جلال میں احسان و تصوف کا جمال بھی تھا، شرعی تقصیر پر سخت نکیر کرتے مگر توبہ کے بعد دلداری و دلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، مآثر الکرام میں ہے

مزاج اقدس ہمہ مصروف حفظ شریعت بود، و بر وفق "الحب اللہ و البغض للہ" چون از کسے امرے نالائم شرع سر می زد، غبار سخت بر دامن خاطر والا می نشست، و اگر آن کس توفیق توبہ می یافت زیادہ تر از سابق مورد الطاف می گردید، [۱]	آپ کا ذہن و مزاج ہمہ تن شریعت کی حفاظت میں مصروف رہتا تھا اور "الحب للہ و البغض للہ" کے مطابق اگر کسی آدمی سے کوئی بات خلاف شرع سرزد ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے اور اگر وہ آدمی توبہ کی توفیق پا جاتا تو پہلے سے زیادہ ان کی شفقت و محبت کا مستحق ہو جاتا۔

سبحۃ المرجان میں ہے

وکان الشیخ حامیا لحمی الشریعۃ الغراء و حارسا لبیضۃ الملۃ البیضاء [۲]	شیخ صاحب شریعت غرا اور ملت بیضاء کے محافظ و نگران تھے۔

مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں اس کا ایک واقعہ درج ہے، ایک دن ایک قلندر جو قید شریعت سے آزاد تھا شیخ صاحب کی مجلس میں آیا آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

---

[۱] مآثر الکرام ص ۲۱۴، [۲] سبحۃ المرجان ص ۸۷،

این طائفہ را نہ دیدار خدا میسر می شود	اس طبقہ کو نہ خدا کا دیدار نصیب ہوگا
و نہ شفاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میسر ہوگی ،

یہ سن کر قلندر نے برجستہ جواب دیا کہ شیخ! ہم قلندروں کو دیدار خداوندی اور شفاعت نبوی میسر ہوگی، البتہ آپ لوگوں کو کچھ نہیں ملے گا، شیخ صاحب نے اسکی وجہ دریافت کی، قلندر نے کہا کہ آپ حضرات نے زندگی بھر گناہ نہیں کیا ہے اس لئے کل قیامت میں بلا مواخذہ بہشت میں داخل ہو جائیں گے، اور ہم قلندر غرق عصیان ہیں، اس لئے ہم کو رب العزت تعالیٰ شانہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا، اور ہم مٹھی بھر گنہ گاروں کی شفاعت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم رنجہ فرمائیں گے، یہ سنتے ہی شیخ صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور جلال کی کیفیت جمال سے بدل گئی[1]، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شیخ صاحب اس کے قائل ہوگئے، واقعہ یہ ہے کہ رحمت خداوندی اور شفاعت نبوی پر بھروسہ کرکے غضب خداوندی کا کام جائز نہیں ہے ،

شعر و شاعری | شیخ غلام نقشبند زندہ دل شاعر و ادیب بھی تھے ، وہ لسانی و ادبی علوم کے مشہور عالم اور اشعار عرب و ایام عرب کے ماہر تھے ، "الشعر العربی فی الهند" میں ان کو نمایاں مقام حاصل تھا، وہ عربی زبان کے اچھے شاعر تھے، ان کی شاعری میں قدیم رنگ پایا جاتا ہے اور وہ بڑی حد تک عجمی رنگ و اثر سے مبرا ہے اس سلسلہ میں تیس اشعار کا ایک قصیدہ ان کے استاد میر محمد شفیع کے مناقب و فضائل میں ہے اور عرب کے مشہور جاہلی شاعر امرء القیس کے معلقہ کے ہم وزن و ہم قافیہ ہے، اس قصیدہ

---

[1] مآثر الکرام ص ۱۵۲، و سبحۃ المرجان ص ۷۹ ،

سے شیخ صاحب کے شاعرانہ ذوق ومعیار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،

خلیلی هل هاتان دارة جلجل ودارة سلمى فی قفاف عقنقل

علیها سواری المزن سحت مطیرة فسحت مبانیها محوح المهاهل

أربع الحبیبة صار للوحش موطنا فیا عجبا من صنع دهر محول

امنزل سلمى هل تفرج غمتی وتکشف عما تلعن ذات التدلل

علی ای ارض خیمت ذات هولة تحول بوجه کالنخا متهلل

فمنذ غداة البین قد بت فی الهوی بصد رجوی او بقلب مقتل

أعینی مهلا علبرة الوجد والجوى أأنکما ان دمعتما الیوم مقتلی

وهل ینفع المبکی عیونا ذوا رفا اذا وجهت سلمى رکاب التبتل

حبیب اذا ما جود الغنج عینها فما الحی فیه واحد مؤمل

لها عارض تبدیه غیر عارض اسیل صقیل حسنه کالسجنجل

علام تمنینی وفیك قلوب وحتام تلهینی بوعد مخیل

مواعید عرقوب تقرمط بینها کقرمطة الخذلان نخل المنول

له همة علیا تنوف على السما ومجد مجید نیله لم یسهل

بجیل جلیل من شفیع کاسمه ومن جده خیر الورى خیر مرسل

لزهرة زهراء وورده حیدر ویهن رخلقا عطر دار التجمل

لنور به الافلاك والارض نورت وتشویب تسوید وشرق مکلل

اذا ما هداة الناس عدت فراسهم وهاد بهم بالمقدام من کل امثل

وبینا سبیل الحی یمشون ظلمة اذا انبلجت شمس هداه فتنجل

معارفہ جلت معالیہ قد علت　　اشم جبال بالفخم مفصل
لدیہ علوم لا یرام فناء ھا　　واسرار لوح فی الاساریر تجتلی
ولم یوثر الدنیا الدنی نعیمھا　　وینعم عند اللہ احسن مفصل
لقد دام بالرحمن حظ شھودہ　　تجنی جنا العرفان غیر معلل
تجلی لہ فی کل ان تجلیا　　لدیہ تجلی الطور لم یتجھل
ومن سرح قد ذاق یعلول طاہر السرائر منہ فھو بالنور ممتلی
شفیعی لیوم الحشر حرزی وموئلی　　وجھۃ قلبی غوث کل مومل
لکل عصام واعتصامی بفضلہ　　کفانی قواماذات یوم التجلجل
ما ثرہ لا یھدین بعدھا؟　　ویحصی الحصا محصی الرمال وجندل
یطوف حوالیہ المکارم والعلی　　طواف حجیج حول بیت مھجل

تلامذہ | شیخ غلام نقشبند کی مختلف الجہات شخصیت تعلیم و تدریس میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ انکا حلقۂ درس مشہور تھا بہت سے افاضل نے ان کے دامن میں تعلیم و تربیت حاصل کی، ہندوستان کے اکثر علماء کا تعلیمی سلسلہ ان کی ذات پر ختم ہوتا ہے، وہ فقہ، اصول فقہ، عربی ادب اور حکمت و فلسفہ کے زبردست عالم تھے، اور ان کی درسگاہ سے بقول آزاد بلگرامی ایک جہاں اور خلق کثیر نے فیض اٹھایا[1] ۱۰۸۰ھ سے ۱۱۲۶ھ تک تقریباً چالیس سال علوم اسلامیہ کا درس دیا، اور ہزاروں طلبہ نے ان سے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند مشہور تلامذہ کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں،

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳، ۲۱۴،

ملا نظام الدین لکھنوئی | حضرت ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین شہید سہالوی لکھنوی

شیخ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں جن کی ذات سے شیخ صاحب کا سلسلۂ درس پورے ہندوستان میں جاری ہوا، اس اعتبار سے ملا نظام الدین اپنے استاد کے صحیح جانشین اور وارث ہیں، والد ماجد کی شہادت کے بعد سہالی سے لکھنؤ چلے آئے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی وغیرہ سے پڑھ کر شیخ غلام نقشبند سے لکھنؤ میں پڑھا اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، طریقت کی تلقین و تربیت شیخ عبدالرزاق بانسوی اور میر اسمٰعیل بلگرامی سے پائی، فراغت کے بعد فرنگی محل لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور پورے ہندوستان کو علمی فیض پہونچایا، وہ واقعی بقول آزاد "استاد جہاں اور نحریر زمان" تھے، مآثر الکرام میں ہے،

وتمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید، و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ با وی رساند بین الفضلاء علم امتیازی افروزد و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردند، و برائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند۔[1]

شیخ صاحب نے تمام عمر تدریس و تصنیف کا مشغلہ جاری رکھا اور اس میں اعتماد و شہرت پائی، ان دنوں ہندوستان کے اکثر علماء ملا صاحب سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں، جو شخص اپنا سلسلہ ان سے ملاتا ہے علماء و فضلاء میں ممتاز شمار کیا جاتا ہے بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ دوسری جگہ پڑھکر سند فراغت ملا صاحب سے لی تاکہ معتمد و

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۲۰، ذکر ملا نظام الدین،

ملا صاحب کی وفات چہار شنبہ ۹ رجمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو لکھنؤ میں ہوئی، انکے تلامذہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے استاد شیخ غلام نقشبند کے وطن کے اطراف میں بھی ان کے کئی شاگرد تھے، جن میں مولانا محمد حسن چریا کوٹی اور مولانا غلام فرید محمد آبادی زیادہ مشہور ہیں، مولانا محمد حسن بن محمد اکرام بن سلطان احمد عباسی چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ملا نظام الدین کی خدمت میں لکھنؤ گئے اور ان سے علوم مروجہ پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، بڑے ذہین و طباع عالم تھے، علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد دہلی گئے جہاں ان کی علمی شہرت عام ہوئی اور بہت سے امراء ان کے معتقد ہوگئے، اس سے بعض معاصرین کو حسد ہوا اور ان کو زہر دے دیا گیا[1]

مولانا غلام فرید محمد آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ جا کر ملا نظام الدین سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے طریقت و روحانیت کا فیض پایا، اسکے بعد وطن آکر زہد و قناعت کی زندگی بسر کی، ایک دن کے ناغہ سے روزہ رکھتے تھے، اپنی روزی خود کماتے تھے، نہایت باوقار، اور صالح انسان تھے، زندگی بھر شادی نہیں کی، اپنی والدہ کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھاتے تھے، ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جو بات منھ سے نکلتی تھی وہ پوری ہوتی تھی، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے جب کلا اعظم گڈھ کا ایک حصہ فتح کر کے مولانا غلام فرید کو اس کی حکومت پیش کی مگر آپ نے انکار کر دیا، فرید آباد ان کے نام پر مشہور محلہ ہے[2]، ملا صاحب کے استاد زادے شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند بھی ان کے شاگرد

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۶، ۱۷۷، [2] تجلی نور

تھے جن کا وطن اصلی گھوسی تھا، ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے،

میر عبدالجلیل بلگرامی میر عبدالجلیل بن سید احمد حسینی بلگرامی بھی شیخ صاحب کے خاص تلامذہ میں بڑے پایہ کے عالم تھے، ابتدائی کتابیں میر طفیل محمد اترولوی بلگرامی کی معیت میں میر سعد اللہ بلگرامی سے پڑھیں، اور قصبات پورب میں متوسطات کی تعلیم حاصل کرکے شیخ غلام نقشبند کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور یہیں سے فراغت پائی، حدیث، تفسیر، لغت، عربیت، تاریخ اور موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، حافظہ اس قدر قوی تھا کہ عربی لغت کی مشہور اور ضخیم کتاب القاموس زبانی یاد کر لی تھی، استاد شاگرد کی تعریف و توصیف میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے، دونوں بزرگوں میں خط و کتابت رہا کرتی تھی،

میر عبدالجلیل ابتداء میں تحصیل علم کے لئے میر طفیل محمد کے ساتھ آگرہ گئے جہاں نواب فضائل خان سابق میر منشی سے ملاقات ہوئی جو شاہی ملازمت ترک کرکے گوشہ نشین ہوگئے تھے، کچھ دنوں کے بعد شاہ حسین خان سرکار لکھنؤ کے دیوان مقرر ہوئے، اور اس سلسلہ میں دکن سے آگرہ آئے تو میر عبدالجلیل اور میر طفیل محمد ان کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے، شاہ حسین خان نے ان دونوں حضرات کے ساتھ بڑی مراعات کیں، اسی زمانہ میں میر عبدالجلیل نے شیخ غلام نقشبند سے شرف تلمذ حاصل کیا، اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے فرخ سیر کے دور تک فوج میں وقائع نگاری کے منصب پر فائز رہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی زبانوں کے ماہر تھے اور ان تمام زبانوں میں ان کی تصانیف ہیں، ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، اور بلگرام میں دفن کئے گئے،[۵]

---

[۵] مآثر الکرام ص ۲۵۸ تا ۲۶۰، و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۸،

سید فرید الدین بلگرامی | سید فرید الدین بلگرامی سید بدنی کے نام سے مشہور تھے، ۱۱۱۳ھ
میں میر قادری بلگرامی کے ساتھ ملاجیون امیٹھوی کے حلقۂ درس میں پہونچے اور ان سے تعلیم
حاصل کر کے شیخ غلام نقشبند کی درسگاہ میں حاضر ہوئے، سید فرید الدین نے یہیں بقیہ کتب
درسیہ پڑھ کر فراغت پائی، ۱۱۲۰ھ میں فوت ہوئے[1]،

سید قادری بلگرامی | سید قادری بلگرامی نے ابتداءً اپنے والد سید ضیاء اللہ بلگرامی۔
حفظ قرآن اور تجوید کی تعلیم حاصل کی اور ان سے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد سید فرید
بلگرامی کے ساتھ ملاجیون امیٹھوی سے پڑھا اور بقیہ کتابیں شیخ غلام نقشبند سے پڑھیں،
سے پہلے حرمین شریفین گئے، اور دو بار حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر کربلا،
بغداد کے مشائخ سے قادریہ، رفاعیہ اور شاذلیہ سلاسل میں بیعت ہوئے، شب جمعہ
۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ میں بلگرام میں فوت ہوئے[2]،

شیخ نور الہدیٰ امیٹھوی | شیخ نور الہدیٰ بن مودود بن عبد الواسع عثمانی امیٹھی میں
پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد شیخ غلام نقشبند اور دیگر علماء سے پڑھ کر پندرہ سال کی
عمر میں جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے، نہایت ذہین و طباع اور دین و دیانت میں
پختہ تھے، علمی بحث و مباحثہ سے دلچسپی رکھتے تھے، پوری زندگی اپنے استاد کی طرح درس
و تدریس میں بسر کی، اور ۱۳ رجب ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے[3]،

مفتی شرف الدین لکھنوی | مفتی شرف الدین بن محی الدین بن صدر الدین اعظمی
لکھنوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی، اور شیخ غلام نقشبند سے تفسیر بیضاوی کے
چند اسباق پڑھ کر ان ہی سے طریقت کی تعلیم حاصل کی، بڑے عالم و فقیہ تھے، شاہ

---

[1] مآثر الکرام ص ۱۴۲، و نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۶۳، [2] مآثر الکرام ص ۱۴۴، ۱۴۵، و سبحۃ المرجان

خدمات کے صلہ میں عالمگیر نے چار صدی ذات کے منصب سے نوازا جو محمد شاہ کے دور تک قائم رہا، بعد میں اس میں سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، فدائی خاں حاکم بہار کے نائب بھی رہے، حاشیہ شرح مواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی ان کی تصانیف میں مشہور ہیں، ذوالحجہ ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے[۱]

تصانیف | شیخ غلام نقشبند تعلیم و تدریس کے ساتھ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے، متعدد علوم و فنون میں ان کی تصانیف ہیں، تذکرہ نگاروں نے حسب ذیل کتابوں کے نام لکھے ہیں،

(۱) انوار القرآن، اس میں ربع قرآن کی تفسیر مع حاشیہ کے ہے (۲) فرقان الانوار (۳) تفسیر سورۂ اعراف مع حواشی (۴) تفسیر سورۂ مریم، (۵) تفسیر سورۂ طٰہٰ (۶) تفسیر سورۂ محمد (۷) تفسیر سورہ یوسفؑ (۸) تفسیر سورۂ الرحمٰن (۹) تفسیر سورۂ عم مع حواشی، (۱۰) تفسیر سورۂ کوثر (۱۱) تفسیر سورۂ اخلاص (۱۲) تفسیر آیت اللّٰہ نور السموات والارض (۱۳) تفسیر آیت انا عرضنا الامانۃ (۱۴) تفسیر آیت افحسبتم (۱۵) تفسیر آیت لاتقولن لشیٔ انی فاعل ذٰلک غداً (۱۶) تفسیر آیت الرحمٰن علی العرش استوی (۱۷) تفسیر آیت کلوا واشربوا (۱۸) لامعۂ عرشیہ مسئلہ وحدۃ الوجود میں (۱۹) شرح قصیدہ خزرجیہ علم العروض میں، آزاد بلگرامی نے ان کتابوں کے نام لکھکر "وغیرذٰلک" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ شیخ صاحب کی اور تصانیف بھی ہیں،[۲]

وفات | شیخ غلام نقشبند کے سوانح نگار متفق ہیں کہ ان کی وفات آخری رجب ۱۱۲۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی، اور اپنے استاد و مرشد حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی کے مزار کے قریب

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۱۰۵، [۲] مآثر الکرام ص ۲۱۶، و سبحۃ المرجان ص ۸۷، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸، نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۴،

ٹیلہ پیر محمد شاہ میں دفن کئے گئے، ان کی پیدائش ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے وفات کے وقت تقریباً ۷۵ سال کی عمر تھی،

اولاد:- اولاد امجاد میں صرف ایک صاحبزادے شیخ احمد کا حال معلوم ہے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے مدرسہ اور خانقاہ میں ان کے جانشین ہوئے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، پہلے اپنے والد شیخ غلام نقشبند سے پڑھا، پھر ملا نظام الدین سے تکمیل کر کے شیخ پیر محمد کے مدرسہ اور خانقاہ میں تدریس و مشیخت کی مسند پر بیٹھے اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، اپنے والد کی طرح شیخ احمد بھی فقہ، اصول فقہ، عربیت وغیرہ میں ماہر تھے، بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا، ۱۱۵۹ھ میں فوت ہوئے اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب الہدیٰ بن شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند نے تدریس و ارشاد کی جگہ سنبھالی[1]،

اس عثمانی خانوادہ کے گھوسی سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد اس دیار میں اسکے کسی فرد کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس کے باوجود اس علاقہ کے عام لوگ اپنے کو عثمانی کی نسبت سے مشہور کرتے ہیں، جس کے لئے کوئی علمی اور تاریخی دلیل نہیں ہے،

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۲،

حیات شبلی

مولانا شبلی کے شایان شان انکی بہت مفصل سوانحعمری جانشین شبلی علامہ سید سلیمان ندوی کے حقیقت نگار قلم سے جس میں انکے خاندان اور ولادت سے وفات تک انکی زندگی کے ہر پہلو پر تفصیل کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اسکے مقدمہ میں دیار شرق خصوصاً جونپور اور اسکے مضافات کے ضمن میں اعظم گڈھ بھی شامل ہو تمام مشاہیر علم و ادب اور ارباب درس و تدریس کا بھی ذکر آگیا ہے،

قیمت ۷۰ روپئے　　(منیجر)

اخوان المسلمین کی تنظیمی و نظریاتی بنیادیں

از جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی، ریڈر شعبہ عربی فارسی
کلیکٹوریٹ یونیورسٹی، آندھرا پردیش

اخوان المسلمین عالم اسلامی کی سب سے بڑی منظم اسلامی تحریک ہے، جو بیسویں صدی میں وجود میں آئی، ۱۹۲۸ء میں شیخ حسن البنا نے اس تحریک کا آغاز کیا۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت اور تنظیمی صلاحیت سے نوازا تھا، وہ ایک جانب جدید علوم سے باخبر تھے، اور دوسری جانب علوم اسلامیہ پر مفکرانہ نظر رکھتے تھے، ان کی اس عظیم فکر کا مظہر اخوان المسلمین کی تحریک ہے، دراصل مصر میں سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا کے اثرات نے اس عظیم اسلامی تحریک کو جنم دیا، خود شیخ حسن البنا رسالہ المنار کے کچھ عرصہ کیلئے اڈیٹر رہے، اور سید رشید رضا کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ سید جمال الدین افغانی نے اسلام کی جو سیاسی تعبیر پیش کی تھی اس کا ثمر تحریک اخوان المسلمین ہے، سید جمال الدین افغانی کے شاگرد محمد عبدہٗ نے سیاسی جدوجہد ترک کرکے انگریزوں سے تعاون کی راہ اختیار کی، شروع میں سید رشید رضا کا بھی یہی مسلک رہا مگر ترکی میں مصطفےٰ کمال کے سیاسی و تہذیبی انقلاب نے انھیں یقین دلا دیا کہ سیاست سے علٰحدگی صحیح نہیں۔ چنانچہ انھوں نے سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی لینی شروع کردی۔ ان کی تربیت و صحبت کے اثرات شیخ حسن البنا پر پڑے جنھوں نے اسلام کو ایک انقلابی زندہ تحریک کی حیثیت سے پیش کرنے کا عزم کیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس سے قبل سنوسی تحریک نے عربوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا، نیم فوجی اسلامی تحریک تھی جس کا میدان عمل در اصل لیبیا تھا۱، اخوان المسلمین کی تحریک عصر جدید کے تقاضوں سے وجود میں آئی، اس میں اور دوسری اسلامی تحریکوں میں فرق یہ ہے کہ اس کی بنیاد اور تنظیم جدید جمہوری تحریکوں کے انداز پر ہے، اس نے لٹریچر اور صحافت سے جس قدر کام لیا ہے اس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو ہندوستان ہی کی ایک اسلامی تحریک میں، عصر جدید میں مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دین کو کھوئے بغیر کس طرح وہ جدید تہذیبی و مادی ترقیوں کو حاصل کریں، اخوان نے اس سلسلہ میں تین باتوں کو پیش نظر رکھا ہے:

۱- جدید تہذیب کا گہرا اور معروضی مطالعہ کیا جائے، تاکہ اس کے مفید و مضر اثرات کا اندازہ کرکے اسکے لحاظ سے رد و قبول کا فیصلہ کیا جا سکے،

۲- دین کو اسلامی روح کی روشنی میں دیکھا جائے اور اس کے مطابق معاشرے کی تشکیل کی جائے،

۳- آزادی فکر اور اجتہاد کی راہ ہموار کی جائے اور دین کی شمع اس طرح جلائی جائے جس سے زندگی کا ہر گوشہ روشن ہو سکے۔

اخوان کی دعوت دین سے شروع ہوئی، مگر دین کا مفہوم ان کے نزدیک بہت وسیع ہے، شیخ حسن البنا کا خود اعتراف ہے کہ ان کی دعوت میں بڑی لچک ہے، در اصل اخوان کے اصول انقلاب انگیز ہیں، شیخ حسن البنا کی تقسیم کے مطابق پہلا مرحلہ اخوان کی دعوت کو عام کرنے کا ہے تاکہ مسلمانوں میں ایک عام فکری بیداری پیدا کرکے معاشرہ کے تمام طبقات کو اس تحریک کی دعوت سے آگاہ کیا جائے، دوسرا مرحلہ تیاری کا ہے جس میں رفقاء کی ذہنی اور

---

۱ مزید تفصیل کے لیے [illegible]

جسمانی تربیت ضروری ہے، ان کو فوجوں کی طرح منظم کیا جائے گا اور ان کے اندر تنظیم کی قوت پیدا کیجائیگی، تیسرا مرحلہ عمل، نفاذ اور نتائج کا ہے، شیخ حسن البنا کہتے ہیں کہ آخری مقصد اور مکمل کوششیں اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ دعوت عام نہ ہو، رفقار کی کثرت نہ ہو، اور تنظیم میں استحکام نہ پیدا ہو[1]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کا مقصد یہ تھا کہ عوامی سطح پر کام کرکے معاشرہ کو اسلامی اصولوں کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے کہ بغیر زمین تیار کیے تخم ریزی فعل عبث ہے، عوام کی تیاری وتائید، رفقار کی کثرت اور تنظیم میں استحکام بلاشبہہ کسی تحریک کو کامیاب بنانے کی ضامن ہے،

شیخ حسن البنا کے ذہن میں دعوت اسلامیہ کے مختلف مراحل تھے، اور وہ اپنی تحریک کو ان مراحل سے وابستہ سمجھتے تھے، ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ اعلائے دین کے لیے جد و جہد کرنا اور لوگوں کو وسیع پیمانہ پر اس دعوت میں شریک اور گمراہی سے بچانا بنیادی ذمہ داری ہے، ان کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول خذ ما صفا ودع ما کدر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مشرق و مغرب میں جتنے عمدہ اصول ہیں ان کو اپنانا چاہیے۔ ایک بار شیخ نے اخوان کے ایک مجمع میں فرمایا کہ اگر اشتراکی تم سے کہیں کہ ہمارے اصول انسانوں میں مساوات، سماجی اور معاشی انصاف کے ضامن ہیں تو اخوان کو ان سے صاف کہنا چاہیے کہ ہمارے اصولوں میں نہ صرف تمہاری یہ تمام خوبیاں ہیں بلکہ تم سے زیادہ مکمل منظم اور انسانیت کے درد کو دور کرنے والا اسلامی نظام حیات ہے، جن نظریات پر تم فخر کرتے ہو وہ نظریات ہمارے یہاں مزید خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں، شیخ نے جب عرب کے بادشاہوں اور امیروں کو دعوتی خطوط لکھے

---

[1] قانون النظام الاساسی للہیئۃ ص ۱۲۵

اور ان کو اسلامی نظام حکومت کے قیام کی طرف بلایا تو مصر کے حکمرانوں کو بھی اسلامی نظام حیات کی دعوت دی اور شاہ فاروق اور نحاس پاشا کو مخاطب کیا جس کا عنوان تھا "نحو النور" (نور کی طرف)، شیخ اس خط میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں اسلام کے سوا کوئی ایسا نظام نہیں جو امت کو زندگی کی پیچیدگیوں میں ترقی کے منازل طے کرا سکے اور اس کو آگے بڑھا سکے۔

وہ تمام اصول و مبادی جو فرد، جماعت یا حکومت اور قوم سے متعلق ہیں یا ان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہیں، وہ سب پوری باریکیوں اور مصلحتوں کے ساتھ اسلامی نظام میں یکجا ہیں، اور وہ ایک ایسا نظام ہے جو جدید و قدیم سارے نظاموں پر فوقیت اور زندگی کے سارے شعبوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے"۔ شیخ کو یقین کامل تھا کہ اسلام ہی کے سائے میں دور جدید میں انسانوں کو پرسکون زندگی میسر آسکتی ہے، انکے نزدیک زندگی کے سارے جدید نظام انسانیت کے لیے سم قاتل اور زہر ہلاہل سے کم نہیں، انھوں نے اعلان کیا کہ قومیت پرستی سرمایہ داری اور اشتراکیت سب مرض ہیں دوا اس کا علاج نہیں ہیں، شیخ فرماتے ہیں کہ اخوان کوئی نیا پیغام لے کر نہیں آئے، یہ وہی پیغام ہے جو ہر دور میں انبیاء علیہم السلام لیکر آئے، اور آخر میں یہی پیغام انسانیت اور پیغام رحمت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔ اخوان صرف ایک بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے ہیں، انکی دعوت کسی ایک گوشہ تک محدود نہیں بلکہ مذہب معیشت، معاشرت اور سیاست زندگی کے سارے ہی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اخوان کی دعوت سیاسی، فکری، اجتماعی اور معاشی دعوت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ سنت نبوی پر عمل کرنے کی دعوت ہے۔[1]

اخوان نظریاتی طور پر چند اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، انکے یہاں پہلا اصول علمیت ہے، وہ علوم پر گہری نظر کو ضروری تصور کرتے، قرآن مجید کو وہ علم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔

[1] الاخوان المسلمون کبری الحرکات الاسلامیۃ الحدیثۃ تالیف ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی مطبوعہ دار بیروت طبع ثانی ص ۸۸ - ۹۱

اور اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ عصر جدید کے پیدا کردہ شبہات کا ازالہ ہو جائے، اور قرآن مجید زمانہ کے تقاضوں کے مطابق معلوم ہو، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ علم کچھ اور ہے اور دین کچھ اور، وہ علم اور دین میں تضاد کے قائل نہیں۔

دوسرا اصول عملیت ہے۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک قرآنی امت بنا دیں اور اس کی بنیاد پر تمام اسلامی فرقوں کو نظریاتی طور سے قریب لے آئیں، اس طرح ایک ایسی اسلامی معاشرہ کی تعمیر کریں جس میں اختلافات کم سے کم تر ہوں اور جس کی بنیاد صرف اسلام ہو، وہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک آرام حرام سمجھتے ہیں، جب تک کہ قرآن مجید بحیثیت دستور زندگی کے رائج نہ ہو جائے، ہم اسی مقصد کی راہ میں زندگی اور اسی کے حصول کے لیے موت کے متمنی ہیں۔

تیسرا اصول معاشی ہے، وہ ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا چاہتے ہیں جس میں سماجی عدل (Social Justice) پایا جائے، اور جہاں افراد و طبقات میں توازن ہو، اور ہر شہری کی معاشی زندگی کی کفالت کی ذمہ دار حکومت ہو، جو ہر فرد بشر کے لیے معاشی زندگی کے مواقع فراہم کرتی ہو اور ایسا معاشی متوازن نظام ہو جو سماجی انصاف کے ساتھ معاشی طور پر آگے بڑھنے کی امنگ بھی رکھتا ہو۔

اخوان کا چوتھا اصول معاشرتی بھلائی (Social Welfare) کا ہے، لوگوں سے جہالت دور کرنا، ان کے اندر بلندی پیدا کرنا اور انھیں فقر و ذلت سے محفوظ رکھنا، ایسے کام ہیں جنھیں اخوان اپنے فرائض میں شمار کرتے ہیں، اس لیے کہ ایک ترقی یافتہ سماج ان بنیادی عیوب اور کمزوریوں کو دور کیے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

ان کا پانچواں اصول یہ ہے کہ تمام عالم اسلامی کو استعماری طاقتوں سے نجات دلائی جائے،

اور دنیا میں جہاں بھی مسلم اقلیتیں ہیں ان کی مدد کیجائے اور اعلیٰ پیمانے پر دنیا میں آزادی اور حقوق انسانی کے تحفظ کی کوشش کی جائے۔

وہ ایک ایسا نظام حکومت عمل میں لانا چاہتے ہیں جو صالح ہو اور جو اسلام کی تعلیمات کو عمل میں پیش کرے تاکہ وہ دنیا کے سامنے ایک نمونہ بن سکے، اور اس نظام میں انسانی حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے گا،

اخوان کا چھٹا اصول انسانی تہذیب کی از سر نو تنظیم ہے جس میں مادیت اور روحانیت کا حسین امتزاج ہو، اور ایک ایسی فضا پیدا ہو سکے جس میں انسانیت اطمینان کا سانس لے سکے، اخوانیوں کا نظریہ ہے کہ اسلامی اصول اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ایک ایسا تمدن وجود میں آسکتا ہے جو اعلیٰ انسانی و اخلاقی صفات کا حامل ہو، اس طرح ان کے خیال میں دور جدید میں روحانیت کی پیاسی دنیا کو سکون کی دولت مل سکے گی۔

اخوان کے نظریات میں سے یہ نظریہ بڑا اہم ہے کہ فقہی اختلافات نظر انداز کر کے فروعات دین میں ان کا خیال زیادہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ اصل مقصد دین پر عمل ہے،

اخوان امراء سے الگ رہنے پر بھی زور دیتے ہیں، وہ ان تمام گروہوں سے بھی کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں جو سیاسی، ذاتی مفاد اور غیر دینی مقاصد کی خاطر صرف حصول منفعت کے لیے وجود میں آئے ہیں،

وہ اسلامی حکومت کے قیام پر زور دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام کے دائرہ میں حکومت شامل ہے، قوانین، تعلیم، معیشت، معاشرت اور سارے شعبہ ہائے زندگی پر حکومت کی دست درازیاں جاری ہیں، اس سلسلہ میں ان کا یہ خیال قابل غور ہے کہ وہ حکومت ذاتی منفعتوں کے لیے قائم نہیں کرنا چاہتے بلکہ امت اسلامیہ میں جہاں بھی ایسے لوگ مل جائیں جو

اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار ہوں، تو وہ ان کے مددگاروں میں شامل ہونے کو تیار ہیں، وہ ان کی فوج میں داخل ہو سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم پہلے حکومت قائم نہیں کرنا چاہتے بلکہ پہلے ہم اپنے اصولوں اور نظریات کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں،

اگرچہ ان نظریات میں جدیدیت ہے، مگر یہ خالص اسلامی تعلیمات کے دائرہ کے اندر ہیں، اخوان کے تصور کے مطابق مذہب، حکومت اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو قرآن وحدیث کے احکام کے مطابق ہونا ضروری ہے، شیخ حسن البنا کی تعلیمات کا منبع قرآن وحدیث ہی کو قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام کو ہمیں اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ وہ انسانیت کے درد کا درماں ثابت ہو سکے، ہم کو اپنے زمانہ پر کوئی ایسی چیز مسلط نہ کرنی چاہیے جو زمانہ کا ساتھ نہ دے، وہ اسلامی روح کے ساتھ ساتھ اسلام کو ان قیود سے پابند نہیں کرنا چاہتے جو مختلف ادوار میں اس پر عائد کر دی گئی ہیں، وہ زمانہ کی رسومات سے آزاد ہو کر تمام بنی نوع انسان کے لیے اسلام کا پیغام پیش کرتے ہیں، شیخ حسن البنا کے نزدیک اخوان المسلمین اس اسلام کی دعوت ہے جس میں سماجی اثرات اور زمانے کا عکس ساتھ ساتھ ہو، وہ اسی کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو صحابۂ کرام کے دور میں تھا جبکہ اسلام زندگی کے سارے پہلوؤں پر حاوی تھا جن میں عقیدہ، عبادت، وطن، روحانیت اور حکومت وغیرہ سب کچھ شامل تھا، اور اسی بنیاد پر سیاست سے اسلام کو جدا نہیں کیا جا سکتا[۱]،

اخوان سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لیتے ہیں، اگر وہ دیندار ہیں تو ان کو سیاست میں دخل دینا مناسب نہیں، اخوان اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں سیاست، معیشت، قانون، علم اجتماع اور ثقافت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ کیا اسلام صرف چند رکعتیں نماز ادا کرنے کا نام ہے، وہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت کے داعی کتنے منظم ومحکم انداز

[۱] اخوان المسلمین ص ۱۱۳

سے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں اور اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے ہیں، وہ نظام زندگی کی تبدیلی کی دعوت دیتے ہیں، تو کیا اسلام اس لائق نہیں کہ اس کے طرز زندگی کی جانب لوگوں کو بلایا جائے اور اسلامی نظام زندگی قائم کیا جائے، اخوان کا خیال ہے کہ اگر ہم اسلام کو ایک شریعت سمجھتے ہیں تو ہم کو اس کے نفاذ کی کوشش کرنی چاہیے، اگر وہ دستور حیات ہے تو اس کے بغیر زندہ رہنا عبث ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہماری سیاست یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو رائج کریں[1]۔

اخوانیوں کے بنیادی نظریات میں اسلامی حکومت کا قیام نہایت اہم ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر سب کچھ حاصل ہو جائے لیکن اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اسلام پر عمل ناقص رہ جائیگا، شیخ فرماتے ہیں کہ قیام حکومت مسلمانوں کے فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے، جس طرح لوگوں کو ہدایت دینا اور خود ہدایت حاصل کرنا فرض ہے اسی طرح اسلامی نظام حکومت کا قیام بھی فرض ہے، حکومت وہ نہیں ہے جو فقہ کی کتابوں میں محدود ہے، بلکہ اسلام کی حکومت کا مطلب تمام شعبہائے زندگی میں احکام شریعت کا نفاذ، اسلامی احکام کی پابندی اور اسلامی سماج کی تعمیر ہے، اس میں اقتصادیات، تعلیمات، قوانین اور معاشرت کی اصلاحات شامل ہیں، اگر ایک فقیہ شرعی احکام کے اصول و فروع پر نظر رکھتا ہے لیکن وہ ایسے اہل حکومت سے تعرض نہیں کرتا جو خلاف اسلام قوانین وضع کرتے ہیں تو ایسے مصلح کی آواز اس شخص کی طرح ہوگی جو بیکار چیخ رہا ہو،

اخوان کا خیال ہے کہ شریعت میں تاویل و تفسیر کی بڑی گنجایش ہے، اسی بنا پر وہ اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی قوانین از سرنو اس انداز سے مرتب کیے جائیں کہ ان میں نئے زمانہ کے نئے مسائل کا حل موجود ہو، اور وہ زمانہ کا ساتھ دے سکیں، تمدنی معاملات میں اخوان کے خیال کے مطابق کسی بھی صالح نظام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے،

تحریک اخوان المسلمین نے عملی طور پر مصر کی اسلامی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا،

---

[1] اخوان المسلمین ص ۱۴۹۰۱

انھوں نے ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا کردیا تھا جو اس زمانہ میں رہ کر اپنی پوری زندگی کو اسلام کی راہ پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مطابق گذارنے لگا تھا، انھوں نے نوجوانوں اور دانشوروں میں محنت سے کام کیا، نوخیز مسلم نسل کو مغربیت سے بچانے کی بھی کامیاب کوشش کی، بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا، رسائل اور کتابوں سے مصر کے بازار بھر دیے، اخوانیوں کی صحافت پورے ملک پر چھا گئی تھی، ان کی کتابوں اور رسائل کو پڑھ کر لوگ ایمان کی حرارت محسوس کرنے لگے تھے، اس طرح اخوان کے حوصلے نہایت بلند ہوئے، وہ مسلمانوں کو روحانی بلندی کے ساتھ ساتھ مادی بلندی کی اعلیٰ سطح تک لیجانا چاہتے تھے۔

اخوان المسلمین کے تنظیمی پہلو | اخوان المسلمین نے عالم اسلامی میں پہلی بار ایک ایسی تنظیم اختیار کی جو اس سے قبل کسی اسلامی تحریک کو نصیب نہ ہو سکی تھی، ان کی جماعت میں تعاون و اشتراک کا غیر معمولی مظاہرہ کیا گیا، شیخ حسن البنا تحریک کی تنظیم کے ہر ہر جزء پر گہری نظر رکھتے تھے اور تحریک کے مختلف شعبوں کو پوری طرح سے دیکھتے تھے، وہ اپنی تحریک میں کسی شخص کو اسوقت تک شامل نہیں کرتے تھے جب تک اس کے بارے میں کافی جانچ پڑتال نہ کر لیتے تھے، اخوان نے دور جدید کی نئی تحریکوں اور تنظیموں سے پورا فائدہ اٹھایا، ان کے یہاں اشتراکیت اور فاشسٹ نظاموں کے عملی طور پر طرز جدید کے مفید اصول اپنائے گئے، مگر ان کے فاسد اور انسانیت سوز اصولوں اور برائیوں سے پرہیز کیا گیا۔

ان کے ارکان کی حسب ذیل قسمیں ہیں:۔

(۱) عضو عامل (رکن) (۲) عضو مؤید (ہمدرد)، جب تک کوئی شخص عضو عامل میں شامل نہ ہو جائے۔ اخوان کے خاص جلسوں میں شرکت کا مجاز نہ سمجھا جاتا تھا، عاملین کی

جماعت چار خانوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی، ان چاروں طرز کے عاملین پر ایک نگراں مقرر کیا جاتا تھا، اس طرز کی بہت سی شاخوں کو ایک "مجلس عمومی" کے تحت کر دیا جاتا، یہ مجلس عمومی دو طریقے سے اصل مرکز یعنی "مرکز عام" سے متعلق ہو جاتی تھی، مجلس عمومی کی کارروائی کی رپورٹ مرکز عام کو بھیجی جاتی تھی، جو تجاویز مجلس عام منظور کرتی تھی اس کی توثیق مرکز عام سے کرانی پڑتی تھی،

مرکز عام (یا مکتب عام) کا کام یہ تھا کہ وہ اخوان کی عام دلچسپیوں کا جائزہ لیتا تھا، اور وہ بہت سے ایسے ادارے قائم کرتا تھا جو اخوان کی خدمت کر سکیں، اس مرکز عام میں مختلف طرز کے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے: (۱) مکتب ارشاد عام: یہ وہ ادارہ تھا جس میں اخوان کے سیاسی نظام کی ذمہ داریوں کو بانٹا جاتا تھا، (۲) الجوالہ: یہ اخوان کی فوجی تنظیم کا نام تھا، اس کے تحت ممبروں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی، اس میں وہی لوگ شریک ہوتے تھے جو اس خدمت کے لائق تھے، خصوصاً نوجوان طبقہ، (۳) "النظام الخاص: یہ اخوان کی خفیہ تنظیم تھی، اس میں وہی لوگ شریک کیے جاتے تھے جن پر پورا اعتماد ہوتا تھا، ایسے ممبروں کو صبح تلاوت کے بعد روحانیت کی تعلیم دی جاتی تھی، پھر ہتھیار استعمال کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا تھا، اور قوانین پڑھائے جاتے تھے، آخر میں ایک اندھیرے کمرہ میں لے جا کر ایک "مرشد" ان سے اطاعت کی بیعت لیتا تھا کہ وہ اسلام کی راہ میں جد و جہد کریں گے، اس موقع پر ان سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان سے جو راز کی باتیں بتائی جائیں ان کا اظہار سزائے موت ہے، اس قسم کے ہر رکن کو ایک رقم خفیہ طور پر تحریک کی ترقی کے لیے دینی پڑتی تھی،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ اخوان کے بارے میں اپنی کتاب "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھتے ہیں: "مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک اگر اپنی صحیح اور طبعی

رفتار سے آگے بڑھتی رہتی اور اس کے جھنڈے کے نیچے عالم اسلام کے ممتاز مفکرین، ممتاز اہل قلم اور ماہرین فن جمع ہو جاتے تو اس تحریک سے بڑی امید تھی کہ وہ اس کام کی تکمیل کر سکے گی جس کا بیڑا سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ نے اٹھایا تھا یعنی مشرق کے فکر اسلامی کو مغرب کی سطحی اور اندھی تقلید اور جمود دونوں سے آزاد کرنا، مشرق کے فکری خلا کو پر کرنا اور ایک طاقت ور فکر اور سیاسی طور پر آزاد اسلامی معاشرہ کی تشکیل[1]۔"

مشہور مستشرق پروفیسر کینٹ ول اسمتھ اخوان کے بارے میں بڑی مفکرانہ رائے پیش کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک عرب سوسائٹی کسی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ کسی متفقہ اخلاقی قوت اور ابھارنے والی طاقت اور کسی اندرونی موثر تحریک کے ذریعہ ٹھوس مواقع نہ پہنچاتی رہے، بہتر سے بہتر معاشرتی یا قومی پروگرام محض کاغذ کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں، اسی لیے عرب سوسائٹی کی روحانی پسپائی جاری رہے گی۔ اخوان کی اپیل میں معاشرہ کے اکثر مسائل کا برمحل جواب پوشیدہ ہے جب تک کوئی دوسرا گروہ ان مسائل سے نمٹنے کی نسبتاً زیادہ طاقتور خواہش اور جذبہ کے ساتھ نہ سامنے آئے، یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اخوان کی تحریک باوجود ظلم و استبداد کے زندہ رہے گی، اب تک کمیونسٹوں کو چھوڑ کر اخوان وہ واحد جماعت ہیں جس نے ایک ایسا نصب العین پیش کیا ہے جو زبانی عقیدت مندی سے آگے بڑھ کر بڑے پیمانہ پر تعاون حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے[2]۔"

تحریک اخوان المسلمین پر اکثر رجعت پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے، اس الزام کی تردید پروفیسر اسمتھ نے بڑے عمدہ انداز سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "اخوان المسلمین کو شروع سے

---

[1] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش طبع اول ۱۹۶۳ء، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ص ۱۱۱ - ۱۱۲

[2] Islam in modern history. P. 161, 162.

آخر تک رجعت پسند سمجھ لینا ہمارے نزدیک غلط ہوگا کیونکہ اس میں عدل اور انسان دوستی کی بنیادوں پر ایک جدید سوسائٹی قائم کرنے کی قابل تعریف تعمیری کوشش بھی شامل ہے جو قدیم روایات کی بہترین اقدار سے ماخوذ ہے، وہ جزوی طور پر ایک ایسی قوت فیصلہ کی حامل ہے جو اس زوال و پستی کا خاتمہ کر سکتی ہے جہاں عرب سوسائٹی پہنچ چکی ہے،........ وہ اسلام کو خالص بے حس اور مردہ عقیدت مندوں اور پرستاروں کی جذباتی گرم جوشی یا پیشہ ور روایت پرستوں کے فرسودہ دائرۂ عمل سے جو اپنے خیال و عمل میں عہد ماضی سے وابستہ ہیں، ایک ایسی ابھرتی ہوئی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو جدید مسائل کا مقابلہ کر سکے"[1]

جو تحریک مذہب کے نام پر اٹھے اس کو خواہ مخواہ رجعت پسند شمار کرنا صحیح نہیں، اگر اس کے اصول و نظریات انسانیت کے لیے افادی قدریں پیش کرتے ہیں تو ان سے اس کی عظمت کا اندازہ لگانا چاہیے، حق یہ ہے کہ اخوان کی تحریک میں وہ تمام بنیادی قدریں موجود تھیں جو ایک ترقی یافتہ جماعت کو درکار ہوتی ہیں۔ نظری اور عملی طور پر اخوان کے تصورات بلند تھے، ان کی دعوت کا خاص مرکز عوام الناس تھے، شیخ حسن البنا نے ایک بار خود کہا تھا کہ اخوان کے اکثر لوگ مزدور پیشہ اور غریب طبقہ ہیں جو ہمیشہ ایمان میں پختہ رہے ہیں" زبوں حالی کے خاتمہ کے لیے بھی اخوان نے عملی اقدام کیے، اور انھوں نے تجارت و زراعت سے بھی گہری دلچسپی لی، محض اس بنا پر کہ وہ اسلام کے مطابق حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، انھیں رجعت پسند کہنا صحیح نہیں، اگر کسی نئے نظام کی دعوت دینا رجعت پسندی ہے تو اشتراکیت شمار رجعت پسندوں میں بدرجۂ اولیٰ ہوگا[2]۔

اخوان اسلام کی نئی تعبیر پیش کرتے ہیں، وہ اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایک

---

[1] بحوالہ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش [2] الاخوان المسلمین ص ۱۶۹-۱۷۰ IBID

ماڈرن اور ترقی یافتہ عظمت سے مزین سوسائٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ قدیم سماجی ورسمی قدروں کے قائل نہیں، اس لیے وہ نہ قدامت پرست ہیں اور نہ قدیم قدروں کو واپس لانا چاہتے ہیں، وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشرہ قائم کرنے کے علمبردار ہیں، اس لیے وہ رجعت پسند نہیں۔

اخوان نے مساجد، مدارس اور رفاہ عام کے مراکز کا ایک جال پورے مصر میں بچھا دیا تھا، انھوں نے مسلمانوں کی جس طرح خدمت کی علمی اور عملی دونوں لحاظ سے، اس سے علمائے ازہر تک ناصر رہے، قاہرہ ایک ایسا جدید مغربی انداز کا شہر بن گیا تھا کہ لوگ پبلک جگہوں پر نماز ادا کرنے میں شرم محسوس کرتے تھے، شیخ حسن البنا نے اخوان کی تحریک کے ذریعہ سوسائٹی کا رخ بدل دیا، انھوں نے ہزاروں جدید مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، اور بے شمار نوجوان ان کی تحریک میں داخل ہو گئے، اخوان ایک ایسی منظم تحریک تھی کہ جس پر اس کے امیر کو اختیار کلی حاصل تھا کسی مطلق العنان حکمراں کو بھی ایسی اطاعت نصیب نہ ہوئی ہوگی جیسی کہ اخوان نے اپنے امیر کے واسطے پیش کی، اخوان کا بہت تھوڑے عرصہ میں مصر پر چھا جانا دراصل ان کی اپنے امیر کی اطاعت کاملہ کا نتیجہ تھا،

۱۹۳۶ء میں اخوان کی طرف حکومت کی توجہ ہوئی اور شیخ حسن البنا نے شاہ مصر اور مصر کے اعلیٰ وزیروں کے نام خطوط لکھے، جن میں انھوں نے مغربی تہذیب پر سخت تنقید کر کے ان کو اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی، شیخ حسن البنا نے جوئے کی گرم بازاری، شراب نوشی اور سرکاری دعوتوں میں اس کا اذن عام، نائٹ کلب، سینما، اخباروں میں عورتوں کی تصویریں اور عورتوں و مردوں کے اختلاط پر سخت انداز میں تنقیدیں کیں، اخوان نے سماجی برائیوں کی روک تھام کے لیے موثر کوششیں کیں جن کے اثرات اس دور میں مرتب ہوئے،

شیخ حسن البنا نے حکومت کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائی کہ مسلمان بچوں کو مشنری اسکولوں یا مغربی استادوں کے ذریعہ سے تعلیم دلوانا نہایت مضر ہے، شیخ نے یہ تجویز پیش کی کہ نئے طرز کے اسلامی مدارس کھولے جائیں، وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی جسمانی نشو ونما پر بھی خاص طور سے زور دیتے تھے،

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک اخوان نے اس زور و شور سے کام کیا کہ گویا ایک حکومت کے اندر ایک دوسری حکومت قائم ہو گئی تھی، ہر ہر شہر اور قریہ میں اخوان کے مراکز کھل گئے اخوان نے اپنے تعلیمی ادارے کھول دیے، اس طرح انھوں نے سماجی اداروں، مسجدوں، مدرسوں اور تجارتی فرموں کے ذریعہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اخوانیوں کے اخبارات، پمفلٹ، اور ماہناموں کے اثرات ہمسایہ ملکوں پر بھی پڑنے لگے، پورے عرب شام، لبنان، اردن، فلسطین، ٹیونس، مراکش اور سوڈان میں اخوان کی شاخیں قائم ہو گئیں،

سید جمال الدین افغانی کی طرح اخوان نے سمجھ لیا تھا کہ اسلامی نظام کا ارتقاء مغربی حکومتوں کے اندر رہ کر ممکن نہیں، لہذا انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، انھوں نے انگریزوں کو سوئز سے نکالنے کی مہم بھی چلائی[۱]، یہ حقیقت ہے کہ اخوان بہت طاقتور ہو گئے تھے، حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں عرب اسرائیل کی جنگ میں اخوانیوں نے فوج کے ساتھ باقاعدہ جنگ کی اور بڑی بہادری سے جہاد کیا، بقول ڈاکٹر سعید رمضان اسرائیل فوج سے زیادہ اخوان سے خائف تھے،

۱۹۴۸ء میں حکومت نے اخوان کو غیر قانونی تحریک قرار دیدیا، اور ہزاروں اخوان گرفتار کر لیے گئے، ۱۹۴۹ء میں شیخ حسن البنا کو شہید کر دیا گیا، شیخ کے بعد بھی

---

[۱] ملاحظہ ہو ہفت روزہ ریڈینس (Radiance) دہلی، ۲۳ دسمبر ۱۹۶۳ء، امریکہ کی فاضلہ مریم جمیلہ کا مقالہ "شیخ حسن البنا" ص ۷ تا ۱۲

تحریک پورے زور و شور سے جاری رہی، حتیٰ کہ ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر نے اخوان کو بڑی بے دردی اور وحشت ناک سزاؤں کے ذریعہ ختم کر دیا، اس طرح عالم اسلام کا یہ المیہ خود اسی کے ہاتھوں پیش آیا جس کے دور حکومت میں غازہ، صحرائے سینا اور بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا، اگر مصر میں جمہوریت و آزادی کی فضا قائم ہو جائے تو شاید وہ چنگاریاں جو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہیں، دوبارہ گلشن مصر کو بہاراں کر سکیں، اور دلوں کو اسلام کی عظمت سے روشنی و حرارت عطا کر سکیں۔

یہاں ایک سوال قابل غور ضرور ہے کہ یہ طاقتور تحریک کیوں ناکام رہی؟ اور اس کو کچلنے والے کیوں کامیاب ہو گئے؟ اس کا جواب مختصراً یہی دیا جا سکتا ہے کہ عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے فوجی حکمرانوں کے برسر اقتدار آ جانے سے تحریک کو نقصان پہنچا، مصر میں جمال عبدالناصر کے دور میں جمہوریت کے فقدان اور ڈکٹیٹرشپ نے عوام کے جذبات و خیالات کو کچل ڈالا، علاوہ ان خارجی اسباب کے اخوان کی خود عجلت پسندی نے بھی ان کو نقصان پہنچایا، شیخ حسن البنا کا خیال تھا کہ ہمارا پہلا کام قریہ قریہ اور شہر شہر دعوت کو عام کرنا ہے، جب تک عوامی سطح پر ذہنی تربیت نہ ہو جائے اس وقت تک سیاست میں دخل اکثر ناکامی کا باعث بنتا ہے، اخوان نے اپنی عجلت پسندی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس سے انکو سخت آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

اردو ادب کا سیدین نمبر:۔ مرتبہ۔ جناب آل احمد سرور صاحب لمبی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۸، قیمت۔ ۶ روپے، پتہ۔ دفتر مرکزی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم مشہور ماہر تعلیم اور اردو و انگریزی کے لائق و فاضل اہل قلم تھے، انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان کے سوانح، فضل و کمال اور تصنیفی خدمات کے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کئے گئے ہیں، اور ان کی سیرت و شخصیت، قومی، ملی اور تعلیمی نظریات اور دوسرے افکار و تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے، جناب شمسی طہرانی کے مبسوط مقالہ "خواجہ غلام السیدین۔ حالات، زندگی و افکار کے آئینے میں" ان کے خاندانی حالات، تعلیم، ملازمت، علمی، ادبی، اور تصنیفی کمالات، قومی، سیاسی اور تعلیمی خیالات، طرز تحریر، اخلاقی عظمت، مروت رواداری امن پسندی اور انسانیت دوستی وغیرہ کا بڑا اچھا خاکہ ان کی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر غلام رسول عبد اللہ نے ان کے "فلسفۂ انسانیت" کا تجزیہ کیا ہے، پروفیسر قیصر حسین زیدی نے ان کو "مثالی معلم" قرار دیا ہے، ڈاکٹر عبد الغفار

شکیل نے ان کی زبان کی اہمیت دکھائی ہے، اور قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے ان کے ادبی ذوق اور اسلوب نگارش پر روشنی ڈالی ہے، دوسرے مضامین میں ان کی زندگی کے خط و خال عظمت و شرافت اور گوناگوں کمالات کی مصوری کی گئی ہے، اس سلسلہ میں پروفیسر سید بشیر الدین، صالحہ عابد حسین اور ڈاکٹر باقر مہدی کے مضامین دلچسپ اور موثر ہیں، لائق مرتب نے اپنے افتتاحیہ میں خواجہ صاحب کے حالات و کمالات کا مختصر و دلکش مرقع پیش کیا ہے، ایک مضمون میں ان کے خود نوشت حالات بھی درج ہیں، آخر میں ان کے اکیس ۲۱ خطوط اور بعض کتابوں کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، یہ نمبر خواجہ صاحب کے فضل و کمال اور ان کی شرافت و کردار کا عمدہ خاکہ ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ مفید اور سبق آموز ہوگا۔

علی گڑھ میگزین کا انتخاب نمبر۔ مرتبہ جناب خلیل احمد بیگ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا عمدہ ٹائپ صفحات ... ۵۰ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ :۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کا ادبی مجلہ "علی گڑھ میگزین" پہلے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج اور علی گڈھ منتھلی کے ناموں سے شائع ہوتا تھا، یہ گذشتہ پون صدی سے علم و ادب کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، علی گڑھ سے وابستہ اور بعض غیر وابستہ مشاہیر علم و فن کی نگارشات پر مشتمل ہوتا ہے، ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی کی طلائی جوبلی کے موقع پر میگزین کے خاص نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جوبلی کا پروگرام تو ملتوی ہوگیا مگر خاص نمبر اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں محمڈن اینگلو کالج اور علی گڈھ منتھلی کے بیالیس ۴۲ منتخب مضامین شامل ہیں ضخامت کی وجہ سے علی گڑھ میگزین کے مضامین کا انتخاب نہیں دیا جاسکا، پہلے محمڈن اینگلو کالج میگزین کے سولہ ۱۶ مضامین درج ہیں، اس میں سر سید احمد خان، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، سید محمود، وحید الدین سلیم، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، میر ولایت حسین،

اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نامور فضلا کے مضامین شامل ہیں، دوسرا حصہ علی گڑھ منتھلی کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مولانا ظفر علی خان، شیخ عبدالقادر، مولانا ابوالکلام، عزیز مرزا، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحق، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا سید سلیمان ندوی، حامد حسن قادری، عبدالستار صدیقی، اقبال سہیل، ثاقب لکھنوی، اور رشید احمد صدیقی وغیرہ جیسے اکابر علم و ادب کے مضامین اور نظموں پر مشتمل ہے، جن اکابر کے مضامین اس نمبر میں ہیں ان میں سے اکثر کے آخر میں مختصر حالات بھی قلمبند کر دیے گئے ہیں، شروع میں ایک مبسوط اداریہ ہے، اس میں علی گڑھ میگزین کی عہد بعہد مختصر تاریخ خصوصیات، زبان و ادب کی خدمات، اہم مضامین اور ممتاز مضمون نگاروں وغیرہ کا ذکر ہے، یہ نمبر محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے، اور علمی و ادبی دستاویز ہونے کی بنا پر اہم اور مفید ہے۔

آجکل کا اردو نمبر۔ مرتبہ جناب مہدی عباس حسینی صاحب بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۷۶ قیمت - عہ پتہ پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اردو کے مشہور و مقبول ادبی ماہنامہ "آجکل" نے اگست و ستمبر ۱۹۸۳ء میں "اردو نمبر" کے نام سے اپنا خاص شمارہ شائع کیا تھا، اس میں دراصل ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو کی موجودہ حالت اور رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ تیرہ مفید مضامین پر مشتمل ہے، ان میں بالترتیب اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اندھرا پردیش، میسور، مغربی بنگال، تمل ناڈو، راجستھان، گجرات، پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر اور دہلی میں اردو کی صورت حال، ادبی، تعلیمی سرگرمیوں اور ترقی و اشاعت کی سرکاری و غیر سرکاری کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ہر ریاست کے اردو بولنے والوں کی تعداد، مکاتب، مدارس، اسکولوں

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کے نظم و بندوبست، اردو اخبار و رسائل کی تعداد، اہم اور قابل ذکر اخبار و رسائل اور اشاعتی اداروں اور مطبعوں کے نام، مشہور شاعروں اور ادیبوں کی فہرست، ادبی انجمنوں، لائبریریوں اور اکیڈمیوں کی سرگرمیوں، سرکاری دفتروں میں اردو کے استعمال اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے اردو ادیبوں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی وغیرہ کے متعلق اعداد و شمار کی روشنی میں معلومات تحریر کئے گئے ہیں، ہر مضمون کے آخر میں اردو کی ترقی اور بقا کے لئے بعض مفید مشورے اور تجویزیں بھی پیش کی گئی ہیں، اکتوبر میں اسی نمبر کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے، اس میں اردو مصنفین و قارئین، اخبار و رسائل کے مدیروں اور کتابوں کے ناشروں کے مسائل پر لوگوں کے خیالات اور اردو میں اصطلاحات سازی، ترجمے اور درسی کتابوں کے معاملات پر کچھ مفید باتیں ہیں، نومبر کے شمارہ میں ان ادیبوں اور شاعروں کی فہرست دی گئی ہے، جن کا ذکر سہواً اردو نمبر میں نہیں آسکا تھا، اور اردو مضامین میں اڑیسہ اور آسام میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے، لیکن اس میں مذہبی مصنفین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے متعدد معروف اہل قلم کا اس میں نام تک نہیں آسکا ہے، جو ایک بہت بڑی کمی ہے، اس سے قطع نظر اس نمبر سے ہندوستانی ریاستوں میں اردو کی موجودہ حالت اور سرگرمیوں کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے،

تحریک کا جوش ملسیانی نمبر، مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۔۔ ۲، قیمت صرف ۱۔ دفتر علمی مجلس ۲۹ ۷۲ چھتہ نواب صاحب فراشخانہ دہلی ۶

جناب جوش ملسیانی اردو کے کہنہ مشق ادیب و شاعر اور حضرت داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، اب ان کے پایہ کے اصحاب کمال اور ماہرین فن کم ہی ہوں گے، ان کے بعض عزیزوں اور شاگردوں نے ان کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں

ان کو ایک کتاب نذر کی تھی۔ اب ان کی ۹۹ ۔ ویں سالگرہ کے موقع پر اردو کے مشہور فاضل اور نامور اہلِ قلم جناب مالک رام صاحب نے اپنے سہ ماہی مجلہ تحریر کا یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔
اس میں جناب جوش پر چار بلند پایہ مضامین شامل ہیں، جناب منور سہائے انور کا مضمون بڑا جامع اور محققانہ ہے۔ اس میں جوش صاحب کی شخصیت اور فن کا مبسوط جائزہ لیکر ان کی قادر الکلامی، مختلف اصنافِ سخن میں استادانہ مہارت، زبان کی اصلاحات اور تغزل کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اس سے نہ صرف جوش صاحب کے عظمت و کمال بلکہ خود مضمون نگار کے، ذہن رسا اور فنی دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، لائق مرتب کا فاضلانہ مضمون بھی ان کے قلم کے معیار کے مطابق ہے، اس میں جوش کی عروض دانی شاعری میں دقت نظر اور غزل میں جودت طبع وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، ایک مضمون جوش کے لائق فرزند عرش ملسیانی کے قلم سے ہے، انھوں نے اپنے والد محترم کے حالات اور شاعرانہ کمالات قلمبند کئے ہیں، جناب اسلوب احمد انصاری کے مضمون میں جوش صاحب کی شاعری اور تغزل پر بڑی خوبی کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے نمبر کے آخر میں جوش کے کلام کا مختصر انتخاب ہے۔ جو غزلوں، نظموں اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے، جناب ساحر ہوشیار پوری کے نام جوش صاحب کے چند خطوط بھی درج کئے گئے ہیں، ان سے انکے فنی بصیرت، زبان و بیان پر قدرت اور طبیعت کے انکسار کا اندازہ ہوتا ہے، جوش ملسیانی صاحب کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا مرقع شائع کرکے مالک رام صاحب نے ایک صاحبِ فن کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ اور ایک بڑی مفید ادبی خدمت بھی انجام دی ہے، اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحریک کا بیس سالہ انتخاب نمبر :- مرتبین جناب گوپال متل، محمود سعیدی،

پریم گوپال متل صاحبان تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۰۲ قیمت معشر
پتہ ماہنامہ تحریک، ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی،

مشہور ادبی ماہنامہ تحریک نے اپنی بیسویں سالگرہ کے موقع پر یہ خصوصی شمارہ شایع کیا ہے۔ اس میں تحریک کے اجراء (۱۹۵۳ء) سے ابتک (۱۹۷۳ء) کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اس کے مندرجات حسب ذیل اٹھ عنوانات میں منقسم ہیں۔ (۱) ہمارا موقف، (۲) مضامین (۳) تبصرے (۴) منظومات (۵) افسانے (۶) اسلام اور کمیونزم (۷) ویٹ نام جھوٹ اور سچ، (۸) قصہ ایک مدعی دانش کا پہلے عنوان کے تحت تحریک کے بیس سالہ اداریتی شذرات کا انتخاب درج ہے، اس میں بعض ادبی تصورات، اردو کے مسائل اور قومی و سیاسی مباحث پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ شذرے تحریک کے لائق مدیر کے قلم سے ہیں، جو اپنی بے لاگ تنقیدوں کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں، دوسرے حصہ میں اثر لکھنوی مرحوم، رشید حسن خان، قاضی عبدالودود، مالک رام اور امتیاز علی عرشی کے ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین ہیں، جو قابل مطالعہ ہیں، تیسرے حصہ میں نئی مطبوعات پر تحریک میں شائع شدہ پر مغز تبصروں کا انتخاب ہے، چوتھا اور پانچواں حصہ موجودہ دور کی مشہور نظموں، غزلوں اور افسانوں کے انتخاب پر مشتمل ہے، جناب گوپال متل کا قلم کمیونزم پر تنقید کرنے میں بڑا بیباک ہے اور وہ اس کے رد میں متعدد مضامین اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اس لئے چھٹے اور ساتویں حصے میں اشتراکیت کے دعووں اور پروپگنڈوں کا تار و پود بکھیر کر اس کے اصلی خط و خال اور اسلام دشمنی کو دکھایا گیا ہے آخر میں جناب فراق گورکھپوری سے متل صاحب اور بعض دوسرے ادیبوں کے رد و کد کا ذکر ہے۔ اس ضخیم نمبر سے گذشتہ بیس سال کی ادبی رفتار و ارتقار کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اشاعت

ایک مفید ادبی خدمت ہے۔

نیا دور کا احتشام نمبر۔ مرتبہ۔ جناب خورشید احمد صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت عہ پتہ محکمہ اطلاعات، اترپردیش، لکھنؤ۔

محکمہ اطلاعات اتر پردیش کے ادبی ماہنامہ "نیا دور" نے اردو کے .... مشہور ادیب اور جدید طرز کے نقاد پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی یادگار میں اپنا خاص نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان کے خدمات و کمالات کا اعتراف کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، یہ نمبر متنوع معیاری مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے، اور احتشام صاحب کی سیرت و شخصیت اور ادبی و تنقیدی کارناموں کا مرقع ہے، اس میں مضامین مختلف عنوانات کے تحت خوش سلیقگی سے درج کئے گئے ہیں، شروع میں اتر پردیش کے موجودہ گورنر عالی جناب اکبر علی خاں صاحب اور بعض مرکزی و صوبائی وزرا کے پیغامات اور متعدد مشاہیر علم و فن کے تاثرات ہیں، پہلے حصہ میں احتشام صاحب کی بلند شخصیت اور ان کے دل نواز اوصاف کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں ان کے ادبی و تنقیدی کارنامے اور کمالات پر تبصرے ہیں، تیسرے حصہ میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اور پہلوؤں پر مفید مضامین ہیں، نظم کے حصوں میں جمیل مظہری، فرقت کاکوروی، فضا ابن فیضی، واحد پریمی، اور دوسرے شعرا نے ان کو اپنے اپنے نذرانۂ عقیدت پیش کئے ہیں، نثری حصے میں آل احمد سرور اور علی جواد زیدی کے مضامین خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں کیونکہ یہ دونوں حضرات ان سے بہت ہی قریب تر رہے۔ ابتدا میں مرحوم کے چھوٹے بھائی انصار حسین نے ایک مقالہ میں اور ان کے عزیز شمیم کرہانی نے اپنی نظم میں دل کھول کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، آخر میں احتشام مرحوم کی چند نظمیں، غزلیں،

بعض غیر مطبوعہ تحریریں اور خطوط بھی دے گئے ہیں، ان کی تحریروں کے عکس اور ان کی متعدد دلکش تصویروں سے بھی یہ نمبر دلچسپ بنایا گیا ہے، مضامین کی رنگا رنگی، ترتیب کی خوش سلیقگی اور مواد و معلومات کے لحاظ سے یہ نمبر عمدہ احتشام مرحوم کے قدردانوں کے مطالعہ کے لایق ہے،

نقش کوکن کا احتشام نمبر: مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ایم اے وغیرہ تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت طباعت اچھی صفحات ۲۳۰ قیمت ۵، پیسے پتہ: منیجر ماہنامہ نقش کوکن ۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی نمبر ۹

یہ بمبئی کے ماہنامہ نقش کوکن کا احتشام نمبر ہے، اس میں بھی احتشام صاحب کو منظوم و منثور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس سے ان کی شخصیت اور حالات و کمالات پر مفید معلومات حاصل ہونگے، پروفیسر عبدالمغنی اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے مضامین گو ماخوذ ہیں، تاہم ادبی حیثیت سے پر مغز ہیں، ان میں احتشام کے فن کے دونوں رخوں کا ذکر یعنی خوبیوں کے ساتھ بعض خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، ڈاکٹر محمد حسن اور اسد حیدر کے مضامین بھی سیر حاصل اور قابل ذکر ہیں، ایک مضمون میں ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے، علی جواد زیدی کی ماتمی نظم موثر اور درد انگیز ہے، شروع میں احتشام صاحب کے خود نوشت حالات اور آخر میں ان کے کئی تنقیدی مضامین کے اقتباسات اور بعض نظمیں نقل کی گئی ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی اچھا اور احتشام صاحب کے قدردانوں کی دلچسپی کے لایق ہے،

ندائے ملت: مرتبہ جناب عبدالقدوس و نور عظیم ندوی و نذر الحفیظ ندوی صاحبان لمبا اخباری سائز کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۲ قیمت ۵ روپیے، پتہ دفتر ندائے ملت ۹۹ - گوئن روڈ لکھنؤ

ہفت روزہ ندائے ملت قومی و ملی مسائل کی بیباک ترجمانی اور ملک کی داخلی وخارجی سیاست پر بے لاگ تبصروں اور جرأتمندانہ مضامین کے لئے شہرت رکھتا ہے، اس نے معمول کے مطابق اگست ۱۹۷۳ء میں اپنا خاص نمبر شائع کیا تھا، اس میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کے ہندوستان کے حالات و مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے، گذشتہ ڈھائی تین سال کے درمیان رونما ہونے والے سیاسی مسائل، ابتر معاشی و سماجی حالات، اقلیتوں اور پس ماندہ قوموں کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ اور ہند و روس معاہدہ کے اثرات وغیرہ کے متعلق پُراز معلومات مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں شروع میں ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات کے کانگریسی منشور، اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد وزیر اعظم کی تقریروں کے بعض اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں، اس کے بعض مضامین میں گذشتہ تین سال کے درمیان ملک کو درپیش مشکلات، بنگلہ دیش کے قیام سے وابستہ توقعات کی ناکامیوں معاشی و غذائی بحران، اشیاء ضروری کی قلت، افراط زر اور ہند و روس معاہدہ کے نتائج پر اظہار خیال کیا گیا ہے، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مسز نین تارا سہگل اور دھرم پرکاش شرما کے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں، "صبح نو کی کرن" میں ملک کے گذشتہ حالات و واقعات سے سبق لیکر مسلمانوں کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور بہتر مستقبل کی تشکیل کی تلقین کی گئی ہے، منظومات کا حصہ بھی اچھا ہے، پروفیسر جے، جی تیواری نے سوویت خارجہ پالیسی کے مطمح نظر کو جس طرح واضح کیا ہے، اس سے مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، بعض مضامین کا لہجہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہے، اور اس نمبر میں حکومت کی دشواریوں اور مشکلات پر قابو پانے کی مخلصانہ کوششوں اور اس کی واقعی مجبوریوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، ممکن ہے اس کا سبب موجودہ تشویش انگیز حالات و مسائل اور ان کے

دور رس اثرات کی جانب ملک کے جمہوریت پسند طبقہ اور خود حکومت کے ذمہ داروں کو متوجہ کرنا ہو۔ اس حیثیت سے یہ نمبر قابل قدر ہے،

نیا دور کا آزادی نمبر:۔ مرتبہ۔ جناب خورشید احمد صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۸۰ قیمت ۵۰ پیسے، پتہ:۔ محکمہ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ،

اس نمبر میں عام شماروں کی طرح ادبی مقالوں، افسانوں اور غزلوں کے علاوہ آزادی کے متعلق بھی کچھ مضامین اور نظمیں شامل ہیں، ممتاز صحافی جے۔ این ساہنی کے مضمون میں ۱۹۳۰ء کے جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس کے اجلاس لاہور کی مکمل آزادی کے رزولیشن پر اچھا تبصرہ ہے، ایک مضمون میں آزادی کے بعد کی ترقیوں اور منصوبوں کے ساتھ ان دشواریوں کا ذکر ہے، جن سے اس وقت ملک دوچار ہے اور آخر میں آزادی کی بقا اور ملک کی خاطر خواہ ترقی کے لیے قوم کو غیر معمولی جد و جہد اور مشکلات کا عزم و حوصلہ سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے، الطاف حسین کے مضمون "مواد و ہیئت" اور جناب ظفر ادیب کے مقالہ "اردو شاعری میں جدیدیت کی تحریک" سے ان کی محنت و کاوش کا اظہار ہوتا ہے، افسانوں اور نظموں کا حصہ بھی قابل قدر ہے، یہ نمبر مختلف تصویروں کے ساتھ خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے،

تعمیر فکر کا تعلیمی نمبر:۔ مرتبہ مولوی محمد شہاب الدین ندوی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۹۶، قیمت۔ عہ پتہ۔ ماہنامہ تعمیر فکر ۱۲۴ پولیس روڈ بنگلور ۲

اس ماہنامہ اور اس کے ایک خاص نمبر کا ذکر معارف میں پہلے کیا جا چکا ہے، اب اس نے گذشتہ سال کے آخر میں پٹنہ میں ہونے والی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سائٹی کی چوتھی کانفرنس کے موقع پر یہ خاص نمبر شائع کیا تھا۔ اس کا مقصد مغربی تعلیم کے ہولناک نتائج اور

موجودہ نظام تعلیم کی دینی و دنیاوی تقسیم کو غلط ثابت کر کے اسلامی اور عصری دونوں علوم کی تحصیل کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس میں علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا محمد عمران خان ندوی کی بعض پرانی تحریریں شایع کی گئی ہیں، شروع میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے نائب صدر ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا ایک انٹرویو بھی ہے، اس نمبر کے اکثر مضامین مختصر اور ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود مفید ہیں،

چند نئے اخبار

احتساب:- از مولانا محمد تقی امینی، متوسط اخباری سائز، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحے ۸ قیمت سالانہ ۶ فی پرچہ ۳۰ پیسے، پتہ ادارۂ احتساب امینی منزل دودھ پور، بدرو، علی گڑھ،

یہ پندرہ روزہ اخبار مسلمانوں کی ذہنی و فکری اصلاح اور رہنمائی کے علاوہ موجودہ دور کے مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل فراہم کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے، اس میں فقہی سوالات کے جوابات بھی شائع کیے جاتے ہیں، اس کے لایق مدیر مولانا تقی امینی اپنے مذہبی اور فقہی مضامین کی وجہ سے ملک میں امتیازی حیثیت حاصل کرتے جارہے ہیں، اس میں ان ہی کے زیادہ تر مضامین ہوتے ہیں جو اس کے مفید ہونے کی پوری ضمانت ہیں۔

کانفرنس گزٹ:- مرتبہ مولوی عبید الرحمٰن خان صاحب شروانی، اخباری سائز، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸ قیمت سالانہ صہ، فی پرچہ ۳۰ پیسے، پتہ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اخبار گذشتہ سال سے دوبارہ حاجی عبید الرحمٰن خان شروانی کی سرپرستی اور ادارت میں شائع ہو رہا ہے، کانفرنس کی خبروں اور مفید مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کے اداریے باوزن اور سنجیدہ ہوتے ہیں، خدا اس کو دوام نصیب کرے۔

مطبوعات جدیدہ

کتاب الایمان ۔ مرتبہ مولانا احمد خاں صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۴۰، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے، پتہ: مکتبہ امینیہ نمبر ۲۲ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ ۱۔

اس میں ایمان مفصل کی تشریح اور بنیادی اسلامی عقائد توحید، نبوت، آسمانی کتب، ملائکہ، آخرت اور تقدیر پر گفتگو کی گئی ہے، شروع میں دین ومذہب کی ضرورت واہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔ اسلامی عقائد پر اردو میں بہت لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عام فہم اور سہل انداز میں اختصار کے ساتھ عقائد کے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

پربت اور پنگھٹ ۔ مرتبہ جناب محمد یوسف ٹینگ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، وطباعت اچھی، صفحات ۲۴۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ: جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، کشمیر۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے کشمیر کی دو بڑی علاقائی زبانوں ڈوگری اور کشمیری کے افسانوں کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں آٹھ ڈوگری اور سات کشمیری کہانیوں کے اردو ترجمے شامل ہیں، ہر حصے کے شروع میں افسانہ نگاروں کا مختصر سوانحی خاکہ بھی دیا گیا ہے، ترجمہ اچھا اور افسانے ہیئت وتکنیک کے اعتبار سے بہتر ہیں، اکیڈمی ڈوگری اور کشمیری کہانیوں کے اس انتخاب وترجمہ کی اشاعت پر اردو خواں طبقے کے شکریہ کی مستحق ہے، یہ مجموعہ افسانے اور کہانیاں کے شائقین کی دلچسپی کے لائق ہے۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

دین رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سر بسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ؎ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح سراپا خیر و برکت کا دور ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں ان کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- للعہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بیان میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے

قیمت :- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مرتبہ: قاضی تلمذ حسین مرحوم

منیجر

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین کو مدت سے انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی

یہ جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی صرف سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک پھیلا تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی، علمی و ادبی و لسانی تحریکیں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملکیتِ حجاز، انہدامِ مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیامِ دار المصنفین، سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں ان کی مختصر روداد، کسی وفد کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش و دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۶ روپے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ ماہ [illegible] سنہ ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

بزم تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علمار و فضلار و شعرار کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۴ء عدد ۳

مضامین

شذرات

راقم الحروف وسط جنوری میں حج بیت اللہ سے واپس آگیا تھا، مگر راستہ ہی میں طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی، وطن پہنچکر بیمار پڑ گیا جس کا سلسلہ ایک مہینہ کے قریب تک رہا، اسلیے وسط فروری میں اعظم گڈھ آسکا، یہ سفر سعودی حکومت کی دعوت پر ہوا تھا، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی رفیق سفر تھے، اس قسم کے وفود مختلف اسلامی ملکوں سے آئے تھے، حکومت کیجانب سے ان سب کی آرام و آسایش کا پورا انتظام تھا، اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا تھا، سواری کیلیے ایک مستقل کار رہتی تھی، مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے مرافق مقرر تھے، ہمارے مرافق وزارت اعلام کے ایک معزز عہدہ دار رشاد عبداللہ ذہبی تھے، جو طبعاً بھی بڑے شریف اور معقول انسان ہیں، انھوں نے پوری مستعدی سے اپنے فرائض انجام اور ہمارے آرام و آسایش کا ہر طرح سے لحاظ رکھا، دن کا بڑا حصہ ہمارے ساتھ گذرتا تھا، تھوڑی دیر کیلیے دوپہر کے وقت اور رات کو اپنے گھر جاتے تھے،

ہمارا قیام فندق مکہ میں تھا جو حرم شریف سے بالکل متصل اور اس کے سامنے ہے، درمیان میں صرف ایک سڑک ہے، اس سے حرم کی حاضری میں بڑی سہولت تھی، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں بھی قیام اور راحت کا معقول انتظام تھا، منیٰ میں سرکاری عمارت میں ٹھہرے تھے، عرفات میں آرام دہ خیمہ تھا، مزدلفہ میں بھی جہاں صرف ایک رات رہنا پڑتا ہے، آسایش کا پورا انتظام تھا، رشاد عبداللہ ہر جگہ ساتھ رہتے تھے جس سے مناسک حج کی ادائگی میں بھی بڑی مدد ملی، مدینہ طیبہ میں مسجد نبویؐ سے متصل مدینہ ہوٹل میں قیام تھا، مگر زائرین کا اتنا ہجوم تھا کہ مسجد نبوی کے اندر بڑی مشکل سے جگہ ملتی تھی، باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں نماز ہوتی تھی، مدینہ طیبہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی زیارت کی سعادت بھی حاصل ہوئی جنکا قیام مسجد نبوی سے متصل مدرسہ شرعیہ میں تھا۔

ارادہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں جبتک قیام کا موقع ملے گا اور جدہ میں اعزہ و احباب سے ملنے کیلیے دو تین دن

قیام رہے گا مگر ہمارے سفر کا پروگرام وزارت اعلام کے ہاتھوں میں تھا، اس وقت حجاج کی واپسی شروع ہو چکی تھی، اسلیے انتظامی دشواریوں کی وجہ سے واپسی کا پروگرام قبل از وقت بن گیا۔ ابھی مدینہ طیبہ میں قیام کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن دوپہر کو اطلاع ملی کہ کل صبح کو جو ہوائی جہاز جائیگا اس میں ہماری سیٹیں بک ہوگئی ہیں، اور ہم کو رات تک جدہ پہنچ جانا چاہیے، ورنہ آیندہ پھر معلوم نہیں کب تک انتظام ہو سکے، گو مدینہ طیبہ میں قیام سے طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی، لیکن ضروری کام سب انجام پا چکے تھے، اس لیے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی اور ہم لوگ سہ پہر کو روانہ ہوکر رات کو جدہ پہنچ گئے، رات بھر ہوٹل میں قیام رہا اور صبح کو نماز فجر کے بعد ہوائی اڈہ روانہ ہوگئے، اسلیے جدہ میں کسی سے ملاقات نہ ہو سکی، یہ اس سفر کی مختصر روداد ہے، اسکی تفصیل آیندہ کسی نمبر میں پیش کیجائیگی، راقم سعودی حکومت کی وزارت اعلام اور رشاد علیہ اللہ کا شکرگذار ہے جنکے طفیل میں دوبارہ حج و زیارت کی سعادت ملی اور ہر طرح کی راحت و آسایش حاصل رہی۔

لاہور کی اسلامی کانفرنس ایک تاریخ ساز واقعہ ہے جسکی نظیر ماضی قریب میں نہیں ملتی، اسلامی ملکوں کے اتنے سربراہوں اور نمایندوں کا اتنا بڑا اجتماع تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ہوا جسمیں ملیشیا و انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک کے نمایندے شریک تھے، اس میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں اور بیت المقدس کی واپسی یہاں آزاد حکومت کے قیام، اسلامی ملکوں میں اتحاد، ان میں اقتصادی تعاون، نوآزاد و ترقی پذیر ملکوں کی اخلاقی و مادی امداد وغیرہ کے متعلق جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ نہ صرف اسلامی ملکوں بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کے لیے مفید ہیں، اس کانفرنس کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مصالحت ہے جو پورے برصغیر کے امن و ترقی کیلیے ضروری ہے، اگر ان تجویزوں پر پورا عمل ہوجائے تو ایشیا کیلیے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

قومیت اور سیکولرزم کے اس دور میں ایک طبقہ اس قسم کے اجتماع کو پسند نہیں کرتا جو مذہب کے نام سے ہو لیکن اس کانفرنس نے اس پہلو کو اس طرح بچایا ہے کہ اس طبقہ کے لیے بھی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہی اور اسکو بھی اسکی کامیابی اور افادیت کا اعتراف کرنا پڑا، چنانچہ کانفرنس میں کسی ملک کے اختلافی اور اندرونی مسائل کو بالکل نہیں چھیڑا گیا جس سے شکایت کا موقع مل سکے، صرف افغانستان کے نمایندے نے پختونستان کا مسئلہ اٹھایا تھا،

گرا سکو رد کر دیا گیا، اس کانفرنس کا نام اگرچہ اسلامی ہے، مگر اس میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پورے ایشیا اور افریقہ کے مفادات سے ہے،

اگر اس کانفرنس کو اسکے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے تو اسکا انعقاد پورے ایشیا کیلئے نئی زندگی کی نوید ہے، فلسطین کا مسئلہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ حق و انصاف اور اس حیثیت سے پورے ایشیا اور افریقہ کا ہے کہ مغربی طاقتوں نے فلسطین کو اپنا فوجی اڈہ اور اسرائیل کو مشرقی وسطیٰ پر تسلط اور اسکے استحصال کا ذریعہ بنایا ہے جو نہ صرف عربوں بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کیلئے خطرہ اور انکی آزادی کے خلاف ہے، اسلیے یہ سب ملک اس مسئلہ میں عربوں کے ساتھ ہیں،

اس سلسلہ میں اسکو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ عرب قومیت کی تحریک آجتک عربوں کو متحد نہ کر سکی، اور مغربی طاقتیں انکے اختلافات سے فائدہ اٹھاتی رہیں، یہ حسن اتفاق ہے کہ اسرائیل کی جارحیت اور زیادتیوں نے انکو متحد کر دیا، فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کیلیے صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی بھی ہے، اسلیے اگر مذہب کے ذریعہ ان میں اتحاد پیدا ہوتا ہے تو اسمیں کیا قباحت ہے، پھر یہ اتحاد نہ کسی نئے بلاک کی تشکیل ہے اور نہ کسی ملک کے خلاف ہے بلکہ ایشیا و افریقہ کے سارے ملکوں کیلیے مفید ہے، اسلامی ملکوں کا جو سلسلہ لاہور سے شروع ہوتا ہے وہ ایک طرف یورپ کی سرحد مراکش تک چلا گیا ہے اور دوسری طرف ٹرکی تک، اگر یہ سارے ملک متحد ہو جائیں تو وہ یورپ اور ایشیا کے درمیان حد فاصل اور اسکی پاسبانی کا فرض انجام دے سکتے ہیں، اور بہت سے بین الاقوامی مسائل میں توازن ان کے ہاتھ آسکتا ہے۔

عربوں کے پاس دولت کا خزانہ پٹرول ہے جسکی ساری دنیا محتاج ہے، اسکے ذریعہ انکے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی ہے کہ اگر اسکو ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف کیا جائے جس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو عرب دنیا کو کسی چیز میں مغربی ملکوں کی احتیاج باقی نہ رہے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اس دولت سے ترقی پذیر ملکوں کی مدد ہو سکتی ہے جس کی تجویز کانفرنس میں منظور ہو چکی ہے، اسلیے یہ کانفرنس درحقیقت پورے ایشیا کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہے، اور ایک خالص سیکولر اخبار کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا، اس نے اس کو

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

سے تعبیر کیا ہے جو اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

جلد ۱۱۴ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۴ء عدد ۳

مضامین

شذرات

راقم الحروف وسط جنوری میں حج بیت اللہ سے واپس آگیا تھا، مگر راستہ ہی میں طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی، وطن پہنچکر بیمار پڑ گیا جس کا سلسلہ ایک مہینہ کے قریب تک رہا، اسلیے وسط فروری میں اعظم گڈھ آسکا، یہ سفر سعودی حکومت کی دعوت پر ہوا تھا مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی رفیق سفر تھے، اس قسم کے وفود مختلف اسلامی ملکوں سے آئے تھے، حکومت کیجانب سے ان سب کی آرام و آسایش کا پورا انتظام تھا، اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھرایا گیا تھا سواری کیلیے ایک مستقل کار رہتی تھی، مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے مرافق مقرر تھے، ہمارے مرافق وزارت اعلام کے ایک معزز عہدہ دار رشاد عبداللہ دیلے تھے، جو طبعاً بھی بڑے شریف اور معقول انسان ہیں، انھوں نے پوری مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیے اور ہمارے آرام و آسایش کا ہر طرح سے لحاظ رکھا، دن کا بڑا حصہ ہمارے ساتھ گذرتا تھا، تھوڑی دیر کیلیے دوپہر کے وقت اور رات کو اپنے گھر جاتے تھے۔

ہمارا قیام فندق مکہ میں تھا جو حرم شریف سے بالکل متصل اور اُس کے سامنے ہے، درمیان میں صرف ایک سڑک ہے، اس سے حرم کی حاضری میں بڑی سہولت تھی منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں بھی قیام اور راحت کا معقول انتظام تھا منیٰ میں سرکاری عمارت میں ٹھہرے تھے، عرفات میں آرام دہ خیمہ تھا، مزدلفہ میں بھی جہاں صرف ایک رات رہنا پڑتا ہے، آسایش کا پورا انتظام تھا، رشاد عبداللہ ہر جگہ ساتھ رہتے تھے جس سے مناسک حج کی ادائگی میں بھی بڑی مدد ملی، مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی سے متصل مدینہ ہوٹل میں قیام تھا، مگر زائرین کا اتنا ہجوم تھا کہ مسجد نبوی کے اندر بڑی مشکل سے جگہ ملتی تھی، باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں نماز ہوتی تھی، مدینہ طیبہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی زیارت کی سعادت بھی حاصل ہوئی جنکا قیام مسجد نبوی سے متصل مدرسہ شرعیہ میں تھا۔

ارادہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں جبتک قیام کا موقع ملے گا اور جدہ میں اعزہ و احباب سے ملنے کیلیے دو تین دن

قیام رہے گا مگر ہمارے سفر کا پروگرام وزارت اعلام کے ہاتھوں میں تھا، اس وقت حجاج کی واپسی شروع ہو چکی تھی، اسلیے انتظامی دشواریوں کی وجہ سے واپسی کا پروگرام قبل از وقت بن گیا، ابھی مدینہ طیبہ میں قیام کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن دوپہر کو اطلاع ملی کہ کل صبح کو جو ہوائی جہاز جائیگا اس میں ہماری سیٹیں بک ہو گئی ہیں، اور ہم کو رات تک جدہ پہنچ جانا چاہیے، ورنہ آیندہ پھر معلوم نہیں کب تک انتظام ہو سکے، گو مدینہ طیبہ میں قیام سے طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی لیکن ضروری کام سب انجام پا چکے تھے، اس لیے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی اور ہم لوگ سہ پہر کو روانہ ہو کر رات کو جدہ پہنچ گئے، رات بھر ہوٹل میں قیام رہا اور صبح کو نماز فجر کے بعد ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے، اسلیے جدہ میں کسی سے ملاقات نہ ہو سکی، یہ اس سفر کی مختصر روداد ہے، اسکی تفصیل آیندہ کسی نمبر میں پیش کیجائیگی، راقم سعودی حکومت کی وزارت اعلام اور رشاد عبدﷲ کا شکر گذار ہے جنکے طفیل میں دوبارہ حج و زیارت کی سعادت ملی اور ہر طرح کی راحت و آسایش حاصل رہی۔

لاہور کی اسلامی کانفرنس ایک تاریخ ساز واقعہ ہے جسکی نظیر ماضی قریب میں نہیں ملتی، اسلامی ملکوں کے اتنے سربراہوں اور نمایندوں کا اتنا بڑا اجتماع تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ہوا جسمیں ملیشیا اور انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک کے نمایندے شریک تھے، اس میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں اور بیت المقدس کی واپسی یہاں آزاد حکومت کے قیام، اسلامی ملکوں میں اتحاد، ان میں اقتصادی تعاون، نوآزاد و ترقی پذیر ملکوں کی اخلاقی و مادی امداد وغیرہ کے متعلق جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ نہ صرف اسلامی ملکوں بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کے لیے مفید ہیں، اس کانفرنس کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مصالحت ہے جو پورے برصغیر کے امن و ترقی کیلیے ضروری ہے، اگر ان تجویزوں پر پورا عمل ہو جائے تو ایشیا کیلیے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

قومیت اور سیکولرزم کے اس دور میں ایک طبقہ اس قسم کے اجتماع کو پسند نہیں کرتا جو مذہب کے نام سے کیا جائے اس کانفرنس نے اس پہلو کو اس طرح بچایا ہے کہ اس طبقہ کے لیے بھی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہی اور اسکو بھی اس کی کامیابی اور افادیت کا اعتراف کرنا پڑا، چنانچہ کانفرنس میں کسی ملک کے اختلافی اور اندرونی مسائل کو بالکل نہیں چھیڑا گیا جس سے شکایت کا موقع مل سکے، صرف افغانستان کے نمایندے نے پختونستان کا مسئلہ اٹھایا تھا،

مگر اسکو روک دیا گیا، اس کانفرنس کا نام اگرچہ اسلامی ہے، مگر اس میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پورے ایشیا اور افریقہ کے مفاد سے ہے،

اگر اس کانفرنس کو اسکے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے تو اسکا انعقاد پورے ایشیا کیلئے نئی زندگی کی نوید ہو، فلسطین کا مسئلہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ حق و انصاف اور اس حیثیت سے پورے ایشیا اور افریقہ کا ہو کہ مغربی طاقتوں نے فلسطین کو اپنا فوجی اڈہ اور اسرائیل کو مشرقی وسطیٰ پر تسلط اور اسکے استحصال کا ذریعہ بنایا ہو جو نہ صرف عربوں بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کیلئے خطرہ اور انکی آزادی کے خلاف ہو، اسلیے یہ سب ملک اس مسئلہ میں عربوں کے ساتھ ہیں،

اس سلسلہ میں اسکو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ عرب قومیت کی تحریک آجتک عربوں کو متحد نہ کرسکی، اور مغربی طاقتیں انکے اختلافات سے فائدہ اٹھاتی رہیں، یہ حسن اتفاق ہو کہ اسرائیل کی جارحیت اور زیادتیوں نے انکو متحد کر دیا، فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کیلیے صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی بھی ہو، اسلیے اگر مذہب کے ذریعہ ان میں اتحاد پیدا ہوتا ہو تو اسمیں کیا قباحت ہو، پھر یہ اتحاد نہ کسی نئے بلاک کی تشکیل ہو اور نہ کسی ملک کے خلاف ہو بلکہ ایشیا و افریقہ کے سارے ملکوں کیلیے مفید ہے، اسلامی ملکوں کا جو سلسلہ لاہور سے شروع ہوتا ہو وہ ایک طرف یورپ کی سرحد مراکش تک چلا گیا ہو اور دوسری طرف ٹرکی تک، اگر یہ سارے ملک متحد ہو جائیں تو وہ یورپ اور ایشیا کے درمیان حد فاصل اور اسکی پاسبانی کا فرض انجام دے سکتے ہیں، اور بہت سے بین الاقوامی مسائل میں توازن ان کے ہاتھ آسکتا ہے۔

عربوں کے پاس دولت کا خزانہ پٹرول ہو جسکی ساری دنیا محتاج ہو، اسکے ذریعہ انکے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی ہو کہ اگر اسکو ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف کیا جائے جس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو تو عرب دنیا کو کسی چیز میں مغربی ملکوں کی احتیاج باقی نہ رہے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اس دولت سے ترقی پذیر ملکوں کی مدد ہو سکتی ہو جس کی تجویز کانفرنس میں منظور ہو چکی ہو، اسلیے یہ کانفرنس درحقیقت پورے ایشیا کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہے، اور ایک خالص سیکولر اخبار کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا، اس نے اس کو

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

سے تعبیر کیا ہے جو اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

مقالات

ملا محمود جونپوری کا رسالہ جبر و اختیار

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب استاد شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی

۱۹۷۲ء کے معارف کی چند اشاعتوں میں ملک کے دو نامور اہل قلم جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اور جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری کے دو مبسوط اور پر مغز مقالے ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات اور علمی تصنیفات سے متعلق شائع ہوئے۔ اس تفصیلی بحث کے بعد بظاہر اس موضوع پر مزید قیل و قال کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن بمصداق کم ترک الاول للاخر اس احقر کی رائے میں اب بھی ملا محمود کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور مجھے غوری صاحب کی مندرجۂ ذیل رائے سے پورا اتفاق ہے،

قاضی صاحب کی کاوش کو حرف آخر قرار دینا خود ان کے رئیس التذکرہ کی تنقیص کے مترادف ہوگا ملا محمود جونپوری کا فضل و کمال اتنا محدود نہیں ہے کہ ایک ہی محقق کا دامن قلم اسے سمیٹ سکے۔ (معارف بابت اکتوبر ۷۲ء ص ۲۴۹)

بہرکیف چونکہ راقم السطور کے پیش نظر ملا صاحب کا رسالہ جبر و اختیار ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ سطور ذیل میں اس کا اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے۔

اس رسالہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب موصوف نے لکھا ہے۔

یہ رسالہ قضا و قدر کی تحقیق میں فارسی زبان میں ہے جیسا کہ مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے

لکھا ہے، اس کا اردو ترجمہ سر شاہ سلیمان نے الہ آباد میں ایک عالم سے کرایا تھا جس پر مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی صاحب الافاضۃ القدسیہ نے تعاقب لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع کیا تھا۔ مولانا اس زمانے میں مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں صدر مدرس تھے، (معارف بابت جولائی ۱۹۳۰ء صفحہ ۶۶)

افسوس یہ اردو ترجمہ اور اس پر صاحب الافاضۃ القدسیہ کے تعقبات باوجود تلاش بسیار کے مجھے دستیاب نہیں ہوئے، البتہ اصل رسالہ بزبان فارسی مل گیا جسے الہ آباد یونیورسٹی کے سابق لکچرار شعبہ فلسفہ جناب علی مہدی خاں صاحب مرحوم نے ۱۹۳۴ء میں ایڈٹ کر کے ادارہ جامع العلوم کے زیر اہتمام برکات اکبر پریس الہ آباد سے شائع کیا تھا۔ متن کے ساتھ خاں صاحب موصوف نے اس کا انگریزی ترجمہ اور ایک مفصل مقدمہ بھی انگریزی میں شائع کیا تھا، مقدمہ میں شہر جونپور کی سیاسی، معاشرتی اور علمی و ادبی تاریخ نیز ملا محمود کی سوانح حیات اور ان کی تصنیفات سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے اور شروع میں سر شاہ محمد سلیمان مرحوم سابق چیف جسٹس، الہ آباد ہائی کورٹ کا انگریزی میں ایک پیش لفظ ہے، رسالہ جبر و اختیار کا واحد نسخہ سر شاہ سلیمان ہی کی ملکیت میں تھا، جن سے علی مہدی خان صاحب نے مستعار لے کر شائع کیا تھا،

اصل رسالہ کی ابتدا میں حافظ عابد حسین کا عربی میں لکھا ہوا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، حافظ صاحب ملا محمود ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، علی مہدی خانصاحب نے اپنے مقدمہ میں ملا محمود کا جو شجرۂ نسب دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ حافظ صاحب ایک طرف ملا محمود کے بھانجے ملا عبد الستار کے پوتے ملا سراج الدین محمد کے پرپوتے تھے تو دوسری طرف سر شاہ سلیمان کے نانا تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو ملا محمود کے علمی کارناموں سے کس درجہ شغف رہا ہوگا۔ اور ان کی علمی یادگاروں کی تلاش میں کس قدر زحمت برداشت کی ہوگی،

علی مہدی خان صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ فطری طور پر ہمیں یہ توقع رکھنی چاہئے کہ اس کے نسخے ملا صاحب کے تلامذہ اور پسماندگان کے پاس رہے ہونگے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علمائے فلسفہ وحکمت نے اس رسالہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ ملا صاحب کے بعد کے علماء میں بیشتر کے پاس اس کے نسخے مفقود تھے، یہی نہیں بلکہ ملا صاحب کے سوانح نگاروں نے ان کی تصنیفات کی جو فہرستیں دی ہیں ان میں بھی اس رسالہ کا ذکر نہیں ہے، یہاں تک کہ مولانا آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام، سبحۃ المرجان یا تذکرۃ العلماء میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا، سب سے پہلے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے صرف اطلاع کی بنا پر اس کا تذکرہ کر دیا، خود اس کی زیارت سے محروم رہے کیونکہ مولانا نے بجائے اصل نام رسالہ جبرو اختیار کے اس کو رسالہ فی تحقیق القضاء والقدر سے موسوم کیا ہے،

مقدمہ حافظ عابد حسین، | حافظ عابد حسین جو ملا محمود کے خاندان کے چشم وچراغ تھے، ان کو حسن اتفاق سے ملا صاحب کے دو رسالے الہ آباد میں مل گئے ان میں سے ایک رسالہ عربی زبان میں عقائد سے متعلق اور دوسرا فارسی میں مسئلۂ جبرو اختیار کے بارے میں تھا، جیسا کہ خود لکھتے ہیں:-

فلما ساعد فی الزمان، غب اوقات وزمان، وخلت الالٰہ آباد حرسہا اللہ عن الفساد والکساد، افادنی اللہ تعالیٰ بالرسالتین له بشق الانفس، احدہما فی العقائد، متن متین فی لسان عربی مبین، وثانیہما فی الجبر والاختیار بالفارسیۃ، نافعۃ للقلوب الخاشعۃ والقاسیۃ، فاغتنمتہا وحمدت اللہ علیٰ ذالک حمدا

کبیرا وحکمت ان یعم نفعھما کثیرا۔ (رسالہ جبر و اختیار ص۵)

مقدمہ کی عبارت نہایت شستہ عربی میں ہے، اس کی مسجع و مقفیٰ عبارت سے عربی میں حافظ صاحب کی اعلیٰ درجہ کی مہارت کا پتہ چلتا ہے، ملا محمود کے علمی کمالات کو جی کھول کر سراہا گیا ہے، اور ان کو امام المحققین، قدوۃ المدققین، خاتم الحکماء، رئیس العلماء، امام البلغاء، اور خطیب الفصحا جیسے بلند القاب سے یاد کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود نہ تو مصنف کی زندگی کے متعلق کوئی تذکرہ ہے، اور نہ رسالہ کی تصنیف کے اسباب وعوامل سے بحث کی گئی ہے، حالانکہ حافظ صاحب اگر چاہتے تو بڑی آسانی سے مصنف اور تصنیف سے متعلق مفید معلومات فراہم کر سکتے تھے، پھر بھی مقدمہ کی اہمیت اس لحاظ سے ضروری ہے کہ اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ رسالہ کا اصل مخطوطہ کہاں اور کس طرح مقدمہ نگار کو دستیاب ہوا۔ مذکورۂ بالا اقتباس کے آخری جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب ان دونوں رسالوں کو شائع کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا فائدہ عامۃ الناس کو پہونچ سکے لیکن ان کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

تمہید رسالہ | خود مصنف نے رسالہ کی تمہید میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا کہ انھوں نے یہ رسالہ کس کے لیے لکھا ہے، ان کی سوانح حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہاں کے علاوہ امیر الامراء آصف خاں اور شایستہ خاں وغیرہ ان کے عقیدت مندوں میں تھے، اور حسب تصریح مولانا آزاد بلگرامی ملا صاحب نے العزائد لکھ کر شایستہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا[۱] غالباً رسالہ جبر و اختیار بھی انھوں نے شایستہ خاں یا آصف خاں کے لئے لکھا تھا، اور یہ اس زمانے کی

---

[۱] مآثر الکرام ص ۲۰۳

تصنیف ہے جب ملا صاحب پر امراض کا ہجوم تھا۔ اور ضعف و بیماری کی بنا پر دربار کی حاضری اور خدمت گذاری سے معذور ہو چکے تھے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

کمترین بندہ خیر اندیش اخلاص کیش ملا محمود جونپوری اگرچہ از جہت ناتوانی و بیماری در بجا آوردن لوازم خدمت گذاری بکالبد جسمانی و پیکر ہیولانی گرد تقصیر و غبار تشویر از چہرۂ حال پا اختلال و ناصیۂ روزگار بے ہنجار خود نشستہ لکن از روئے راستکاری و استواری در و لاکیشی و وفا داری بجان نیاز مند و بدوان مستمند و ظائف دعا گوئی و رسم ہواخواہی را تقدیم نمودہ بعرض بار یافتگان محفل سعادت مسکن و مجالس دولت مامن می رساند (رسالہ جبر و اختیار صہ)

جہاں تک موضوع رسالہ کا تعلق ہے وہ فکر اسلامی کی تاریخ میں مشکل ترین مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بقول ملا محمود۔ "از زرا ہ تعسا رف دلائل غامض ترین مسائل است" اسکو مسئلہ قضا و قدر، مسئلہ حریت ارادہ مسئلہ جبر و اختیار سے تعبیر کیا جاتا ہے فلاسفۂ متقدمین و متاخرین دونوں نے اسے حل کرنے کی کوشش کی لیکن کما حقہ اس سے عہدہ برآنہ ہو سکے (بعثت اسلام سے قبل فلاسفۂ یونان نے بھی اسکو موضوع بحث بنایا تھا، چنانچہ ایک طبقہ جو ابیقوریین کہلاتا تھا، اسکے نزدیک ارادۂ انسانی خود مختار اور آزاد ہے، اسکے برخلاف بعض دوسرے فلاسفہ مثلاً رواقیین کا عقیدہ تھا کہ ارادۂ انسانی ایک خاص نہج پر چلنے پر مجبور ہے اس سے تجاوز کرنا اس کے لئے ناممکن ہے،

معتزلہ اور انکے اصول

اسلامی دور میں جب فتوحات کا سلسلہ ختم ہوا، اور اسلامی خلافت کی بنیادیں استوار ہو گئیں تو مسلمانوں نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی اور منجملہ دیگر علوم کے فلسفۂ یونان کے طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کا بھی مطالعہ کیا اور جب ملاحدہ، دہریہ اور دیگر غیر اسلامی فرقوں کی طرف سے اسلامی عقائد پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اعتراضات

شروع ہوئے، تو علمائے اسلام نے اسی انداز میں ان کے جوابات دیے، اسی کے نتیجہ میں علم کلام کا ظہور ہوا جس میں عقائد اسلام کی تائید اور مخالفین کی تردید عقلی دلائل کی روشنی میں کی جاتی تھی، اور علم کلام سے دلچسپی رکھنے والے علما متکلمین کہلاتے تھے، ان متکلمین کے مختلف فرقے تھے، مثلاً معتزلہ، مرجئہ، شیعہ اور خوارج وغیرہ لیکن ان سب میں معتزلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ انھوں نے بہت سے مسائل پیدا کیے اور ان کو شرح و بسط سے بیان کیا، اور اپنے خاص اصول وضع کیے جن میں سے پانچ اصول ایسے ہیں جو معتزلہ کی جملہ شاخوں میں مشترک ہیں جیسا کہ تیسری صدی ہجری کا مشہور معتزلی عالم الخیاط لکھتا ہے :-

ولیس یستحق احد منھم اسم	اور ان میں سے کوئی شخص معتزلی
الاعتزال حتی یجمع القول	کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک
بالاصول الخمسة التوحید	کہ ان پانچ اصول کا قائل نہ ہو، اول
والعدل والوعد والوعید	توحید، دوم عدل، سوم وعد و وعید،
والمنزلة بین المنزلتین و	چہارم المنزلة بین المنزلتین، پنجم
الامر بالمعروف والنھی عن	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر،
المنکر (کتاب الانتصار ص ۱۲۶)	

معتزلہ کا مسلک :- ان اصول پنجگانہ میں اصل دوم عدل کا مسئلہ زیر بحث موضوع سے خصوصی تعلق ہے، اور اگرچہ عامۃ المسلمین عدل الہی کے قائل ہیں، لیکن معتزلہ نے حسب معمول عدل کے مفہوم و حدود کی تفسیر و توضیح میں غلو سے کام لے کر اس سلسلے میں بہت سے مسائل پیدا کر دیے اور بنیادی غلطی یہ کی کہ خالق کو مخلوق پر قیاس کیا جسے علم کلام کی اصطلاح میں قیاس الغائب علی الشاہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، مثلاً ان کا قول تھا کہ ہمارا روزمرہ کا

مشاہدہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص جور کا مرتکب ہوتا ہے وہ جائر کہلاتا ہے، اور جو ظلم کرتا ہے وہ ظالم کہلاتا ہے، اسی طرح جو شخص دوسرے کو کسی فعل میں مدد کرے اور پھر اس پر سزا دے وہ بھی جائر کہلاتا ہے، اور چونکہ عدل اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، اس لئے ظلم و جور سے وہ مبرا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔ وما ربك بظلام للعبيد۔ یعنی تیرا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اسیطرح دوسری جگہ فرمایا۔ وما ظلمناهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون (اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے)

اس بحث کو جب اور زیادہ تفصیل میں لے گیے تو اس سے مختلف مسائل پیدا ہوئے جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو ایک خاص غرض کی جانب چلاتا ہے، اور وہ اسی بات کا ارادہ کرتا ہے۔ جس میں مخلوق کا خیر مضمر ہو۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نہ تو شر کا ارادہ کرتا ہے اور نہ شر کا حکم دیتا ہے،

۳۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو بندوں کے افعال حسنہ کو خلق کیا اور نہ افعال سیئہ کو بلکہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے۔ اسی بنا پر افعال حسنہ پر ثواب اور افعال سیئہ پر عقاب پاتا ہے۔

مذکورۂ بالا اصول کے نتیجہ میں معتزلہ نے دو مشہور نظریے اختیار کیۓ جن میں سے ایک نظریہ حسن و قبح عقلی ہے، اور دوسرا نظریہ صلاح و اصلح ہے، موخرالذکر نظریہ کے سلسلے میں امام ابوالحسن اشعری نے اپنے معتزلی استاد ابو علی الجبائی سے مناظرہ و مباحثہ کیا اور اپنے حسن استدلال سے استاد کو لاجواب کر دیا۔[۵] بعض مستشرقین مثلاً

---

[۵] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۴۵

میکڈونالڈ کا خیال ہے کہ یہی مناظرہ امام اشعری کے معتزلی عقائد سے توبہ کرنے کا سبب ہوا۔ معتزلہ نے ان دونوں نظریوں کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کیے۔ اور ان کے مخالفین نے کیا اعتراضات کئے اس کی تمام تفصیلات علم کلام کی کتابوں میں موجود ہیں اس سلسلے مین مزید بحث ہم کو اصل موضوع سے بہت دور لے جائے گی۔

غرض جب اسلامی دور میں فلسفیانہ مباحث کا آغاز ہوا تو مسئلۂ جبر و اختیار کو بھی موضوع بحث بنایا گیا۔ عقیدۂ جبر کے علمبردار جہم بن صفوان اور اس کے اشیاع و اتباع کا قول تھا کہ انسان مجبور محض ہے نہ اس کے لیے آزاد ارادہ ہے اور نہ ہی اس کو اپنے افعال کے خلق پر قدرت حاصل ہے۔ بلکہ خود اللہ تعالےٰ اس کے ہاتھوں اعمال و افعال کا خالق ہے۔ اس کے برعکس معتزلہ کا قول تھا کہ انسان کا ارادہ آزاد ہے، اور خود انسان کی قدرت اس کے اعمال کی خالق ہے۔ اور کوئی فعل کرنا یا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے، چنانچہ انسان جو چاہتا ہے کرتا ہے جیسا کہ ملا محمود نے لکھا ہے:۔

اہل اعتزال نظر را بر اں مقصور داشتہ گمان بردہ اند کہ انسان و سائر حیوانات در افعال اختیاریہ و حرکات ارادیہ مختار محض و قادر بحت اند اگر خواہند کنند و اگر نخواہند نہ کنند۔ نہ کردن بحد وجوب رسیدہ و نہ ناکردن بمرتبۂ ضرورت انجامید۔ و خالق بحق و قادر مطلق آدمی را مثلاً اقتدار دادہ، و زمام قدرت در قبضۂ اختیارش نہادہ [۱]

اس اختلاف بین المسلمین کی وجہ یہ تھی کہ دلائل عقلیہ نیز نصوص شرعیہ باہمی النظر میں باہم متضاد و متعارض ہیں مثلاً ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ بندوں سے عمل کا مطالبہ

---

[۱] رسالہ جبر و اختیار ص ۱۰ و مابعد

کرتا ہے، اور بعض امور کا حکم اور بعض سے نہی فرماتا ہے، اور تعمیل احکام پر ثواب اور ارتکاب منہیات پر عقاب فرماتا ہے، چنانچہ جابجا جنت کا وعدہ اور جہنم کی وعید کی گئی ہے اور پھر روز قیامت اللہ تعالے گنہگاروں سے سوال کرے گا کہ تم نے کیوں نافرمانی کی اور کیوں کفر کیا حالانکہ میں نے تمھارے لئے پیغمبروں کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ اس کے بعد عقیدہ کس طرح معقول سمجھا جائے کہ انسان کی قدرت کا کوئی اثر ہی نہیں، اور اگر بالفرض انسان کو کوئی قدرت حاصل نہیں تو اس سے عمل کے مطالبہ کا کوئی موقع نہیں اور نہ ثواب و عقاب کے کوئی معنی رہ جاتے ہیں۔ اور جملہ تکالیف شرعیہ تکلیف بالمحال کی مصداق ہو جاتی ہیں۔

لیکن دوسری طرف جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے اعمال کا خالق ہے تو اس سے یہ حکم مترتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالے کی قدرت محدود ہے، اور ہر شے پر حاوی نہیں، نیز یہ کہ عالم کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں بندہ اللہ تعالیٰ کا شریک ہے حالانکہ یہ ممکن نہیں کہ شے واحد دو قدرتوں کا مورد وجود ہو کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس شے کو خلق کیا تو اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں اور اگر انسان کی قدرت نے اس کو خلق کیا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت بے دخل ہو جاتی ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی شے کا بعض تو اللہ تعالے کی قدرت سے معرض وجود میں آوے اور بعض بندہ کی قدرت سے، اس لئے کہ شے واحد میں بعض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں بہت سی آیات قرآنیہ صاف طور سے اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی قدرت اور اس کا ارادہ جملہ اشیاء کو شامل ہے، غرض معتزلہ نے عدل کے مفہوم کی مخصوص توضیح و تشریح کی بنا پر پہلا موقف اختیار کیا اور انسان کی قدرت اور آزاد ارادہ کے

قائل ہوگئے، اور ان تمام نصوص کی تاویل پیش کی جن کا ظاہر ان کے موقف کے خلاف نظر آیا۔ اور فرقہ جبریہ نے دوسرا موقف اپنایا اس لئے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ کو محدود کر دینا نازیبا تھا، لہذا اس نے انسان کی قدرت پر دلالت کرنیوالی ساری آیات قرآنی کی تاویل اپنے طریقہ پر کی۔

امام اشعری اور نظریہ کسب | لیکن بعض دوسرے متکلمین دونوں فرقوں کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے منجملہ انکے امام ابوالحسن اشعری ہیں، انھوں نے ایک درمیانی مسلک اختیار کیا ہے جس کا انھوں نے کسب نام رکھا اسکی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عادت مقرر کرلی ہے کہ بندہ کی عارضی (محدثہ) قدرت اور ارادہ کے وقت فعل کا خلق کرتا ہے نہ کہ بندہ کی قدرت اور ارادہ کے ذریعہ چنانچہ قدرت انسانی اور فعل کے مابین اقتران عادی کا نام "کسب" ہے، اس صورت میں فعل کا مکتسب بندہ ہے، اگرچہ اس کا فاعل اور خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے چنانچہ خود امام اشعری فرماتے ہیں:۔

اذ کان المکتسب مکتسبا للشئی	جب کسی شے کا مکتسب بندہ اس لئے
لانہ وقع بقدرۃ لہ علیہ	مکتسب ہے، کہ وہ اس کی عارضی
محدثۃ ولم یجز ان یکون	(محدثہ) قدرت کی وجہ سے واقع
رب العالمین قادرا علی	ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا اس شے
الشئی بقدرۃ محدثۃ	پر ایسی قدرت کے ساتھ قادر
فلم یجز ان یکون مکتسبا	ہونا جائز نہیں تو پھر یہ بھی جائز نہ ہوگا
للکسب وان کان فاعلا لہ	کہ اللہ تعالیٰ اس کے کسب کا مکتسب ہو
فی الحقیقۃ [1]	اگرچہ اسکا فاعل حقیقی وہی ہے،

---

[1] اشعری، کتاب اللمع صہ ۴۲، قاہرہ ایڈیشن ۱۹۵۵ء

حالانکہ اس توجیہ و تعلیل سے بھی اصل مسئلہ حل نہیں ہوا کیونکہ اس میں صرف تعبیر کا فرق ہے ورنہ دراصل یہ بھی جبر ہی کی ایک نئی شکل ہوئی، زیادہ سے زیادہ اسے جبر اختیاری کہا جا سکتا ہے۔

بعض مسلم فلاسفہ کا مسلک

بعض مسلم فلاسفہ نے دونوں نظریے جبر و اختیار کے مابین تطبیق کے لیے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ان کا قول ہے کہ جملہ عالم اسباب و مسببات پر مبنی ہے اور ارادۂ انسانی ان اسباب کا تابع ہے پس جب انسان کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بعض اسباب کی وجہ سے کرتا ہے، اور جب اس کا ارادہ نہیں کرتا تو وہ بھی بعض اسباب کی بنا پر ایسا کرتا ہے، مثلاً جب کوئی بھوکا انسان لذیذ غذا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی خواہش کرتا ہے، اور جب کسی تکلیف دہ اور اذیت رساں شے کو دیکھتا ہے تو اس سے احتراز اور فرار اختیار کرتا ہے، اس طرح ہمارے جملہ اعمال دو امر کا نتیجہ ہیں۔ اول اسباب خارجی دوم ارادہ انسانی اور چونکہ اسباب خارجی ایک مخصوص نظام کے تحت قائم ہیں، ان میں کبھی خلل واقع نہیں ہوتا، اور چونکہ ہمارا ارادہ داخلی ان ہی اسباب کا تابع ہے اس لیے یہ ارادہ بھی ایک مخصوص نظام کے مطابق ہے، اور اسباب خارجی اور داخلی کا یہی مخصوص نظام شریعت میں قضا و قدر سے تعبیر کیا گیا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کر دیا ہے، اس لیے جب ہماری نظر اسباب خارجی کی طرف اٹھتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مجبور ہے، اور جب صرف ارادہ انسانی پر نظر ڈالتے ہیں تو انسان صاحبِ اختیار نظر آتا ہے، مشہور اسلامی فیلسوف ابن رشد نے یہی مسلک اختیار کیا ہے[۵]۔

---

[۵] مزید تفصیل کے لیے دیکھئے مناہج الادلہ ص۱۰۴ و ما بعد۔

ملا محمود کا مسلک، | ملا محمود جونپوری نے بھی اپنے رسالہ کے آغاز میں معتزلہ کا موقف واضح کرنے کے بعد اسی مسلک کو بیان کیا ہے کہ انسان ایک لحاظ سے مجبور ہے لیکن دوسرے اعتبار سے مختار ہے کیونکہ اس کے جملہ افعال و اعمال کسی علت کے محتاج ہیں اور وہ علت اس کی قدرت و ارادہ کا فعل سے تعلق ہے اور چونکہ ارادہ جانب وجود اور جانب عدم دونوں کا احتمال رکھتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی ایک جانب کے لیے کوئی علت مرجحہ ہو جو انسان کے قدرت و ارادہ سے خارج ہو لہذا لازمی طور پر اس علت کا تعلق قدرت و ارادہ الٰہی سے ہونا چاہئے، چنانچہ لکھتے ہیں،

وارباب تحقیق فراتر ازین بے پردہ بہ باصرۂ بصیرت مشاہدہ نمودہ اند کہ انسان مختارے است مجبور، وقادرے است مضطر، کہ افعالش اختیاری واختیارش اضطراری، چہ ہمچنان کہ افعالش بواسطۂ امکان محتاج بعلت است کہ آن قدرت و ارادۂ او بلکہ تعلق آن ارادہ و قدرت تو اند بُود ہمچنانکہ تعلق قدرت و اختیار ممکن نہ واجب جائز است نہ ضروری پس بنابرین ناچار محتاج بود بہ مرجحے کہ جانب وجودش را بر عدم ترجیح دہد، و از جہت قطع دور و تسلسل باید کہ آن مرجح منتہی گردد بامرے خارج از قدرت و ارادۂ او کہ بقدرت و ارادہ حق تعالےٰ منوط و مربوط بود[1]

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اگر نظام عالم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو قطعی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سارے اجزاء خلقت باہم علت و معلول کے سلسلہ سے وابستہ ہیں اور ہر معلول آخر علت اولیٰ سے اور اسکے ذریعہ علۃ العلل اور مسبب الاسباب سے

[1] رسالہ جبر و اختیار ص۱۳ و مابعد

قریبی تعلق رکھتا ہے، اس لیے جس وقت قدرت و ارادۂ انسانی کا تعلق فعل کے ساتھ بشرط وجود جملہ اسباب خارجیہ پیدا ہوتا ہے لازمی طور پر فعل معروف وجود میں آجاتا ہے، اور جب یہ تعلق معدوم ہوتا ہے تو وجود فعل محال ہو جاتا ہے۔ اس کی توضیح خود ملا صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

واگر کسے نگاہے ژرف از نظام عالم بکار برد و از سوافل بعوالی، و از ثوانی بہ اوائل، سیر نماید، بہ یقین دریابد کہ آخر ایں سلسلہ بہ اولش در پیوستہ است و منتہائے ایں رشتہ بمبدأ نش باز بستہ۔ وچوں چنیں باشد پس ہنگام تعلق قدرت و ارادہ و اختیار بفعل، باوجود سائر شرائط و اسباب، وجود فعل ضروری بود، والّا تخلّفِ معلول از علت لازم آید، و در وقت عدم ایں تعلق وجود فعل محال باشد والّا ممکن از علت مستغنی گردد[1]

اور یہی حال خود تعلق قدرت و ارادہ کا بھی ہے، کہ اگر اس کی علت موجود ہوگی تو وہ تعلق بھی موجود ہوگا، اور اگر علت معدوم ہوگی تو وہ بھی معدوم ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"و ہمچنیں است سخن در تعلق قدرت و ارادہ، کہ ہنگام وجود علتش واجب التحقق است و وقت فقدان ضروری العدم"[2]

معتزلۂ متقدمین کا قول، | بعض معتزلۂ متقدمین کے نزدیک ارادہ ایک صفت ہے جس کا فعل سے تعلق نام ہے دو متساوین میں سے کسی ایک کی ترجیح کا بغیر مرجح کے، لہذا دو متساوین مثلاً نشستن اور برخاستن میں سے ہر ایک دوسرے پر بغیر کسی مرجح کے ترجیح پا سکتا ہے۔[3]

ملا محمود اس قول کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ارادہ کا تعلق دو متساوین میں

---

[1] رسالہ جبر و اختیار، صـ۱۱ [2] مابعد [3] ایضاً صـ۱۱

ہر ایک کے ساتھ جائز ہو سکتا ہے تو جس وقت اس کا تعلق بجائے ایک کے دوسرے کے ساتھ ہوگا اس وقت دو متساویین میں سے ایک کی ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ بالفاظ دیگر اگر کسی امر کے ساتھ ارادہ کا تعلق اور عدم تعلق دونوں برابر ہوگا تو حصول تعلق ترجیح بلا مرجح ہوگا اور اس تعلق کا مرجح ارادہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ارادہ کی ترجیح اس امر میں ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اور یہاں گفتگو عین تعلق کے بارے میں ہے۔

اور جو شخص امور اختیاری میں ترجیح بلا مرجح کو جائز رکھتے ہوئے اس کو امتناع ترجیح بلا مرجح کے قضیہ کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس سے گفتگو کی جائے۔ کیونکہ اس قسم کی تخصیصات قواعد وضعیہ اور مصطلحات للغویہ میں تو جاری ہو سکتی ہیں لیکن قوانین عقلیہ قطعیہ میں یہ ناممکن ہے۔

مسئلہ تکالیف شرعیہ: یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان حالات میں تکالیف شرعیہ عبث ہیں اور ارسال رسل، انزال کتب مواعظ علماء اور نصائح حکماء خلاف حکمت و مصلحت ہیں اس لئے کہ اگر تعلق ارادہ بفعل کی علت تامہ جو بندہ کے اختیار سے خارج ہے، موجود ہوگی تو بندہ کا ارادہ لازمی طور پر فعل سے متعلق ہو جائے گا جس کو نہی و زجر کے ذریعہ روکا نہیں جا سکتا لیکن جب اس کی علت تامہ موجود نہ ہوگی تو تعلق ارادہ کا حصول اور فعل کا وجود محال ہوگا، اور امر و حکم کے ذریعہ بندہ کو اس فعل پر نہیں لایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اگرچہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے لیکن اس کا اختیار اضطرار سے وابستہ ہے اور تکلیف مضطر جائز نہیں۔

اس اعتراض کا جواب خود ملا محمود کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"تکلیف از علل ناقصۂ تعلق ارادہ است بفعل، کہ چوں با دیگر شرائط و اسباب

انضمام یابد، تعلق ارادہ بفعل از اں مترتب گردد، و اگر در بعض محل مثل تکلیف ابوجہل بایماں کہ بواسطۂ عدم انضمام دیگر اسباب، یا وجود موانع اثر براں ترتب نپذیرد، لازم نیاید کہ اصل تکلیف عبث باشد۔ (رسالہ جبر و اختیار ص۲۵)

ایجاب ثواب و عقاب | معترضین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقررات کی روشنی میں عذاب و عقاب جور محض ہو جاتا ہے،

اس کا جواب ملا صاحب نے یہ دیا ہے کہ عذاب کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عاصی سے عصیان و طغیان کی وجہ سے انتقام لیتا ہے جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ عاصی بمنزلہ مریض ہے اور معاصی کی مثال اغذیۂ فاسدہ کی سی ہے، معصیت کی وجہ سے جو ہیئت دل میں مرتسم ہو جاتی ہے وہ بمنزلہ اخلاط ردیہ ہے اور حکیم مطلق بمنزلۂ طبیب۔ لہٰذا جس طرح طبیب کی مخالفت اور غلط تدبیر سے درد و الم پیدا ہوتا ہے (حالانکہ طبیب مریض سے کوئی انتقام نہیں لیتا) اسی طرح احکام الٰہی کے عدم امتثال سے آلام اخروی متفرع ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کوئی انتقام لینا ہو یا نعوذ باللہ ظلم کرنا چاہتا ہو، جیسا کہ ارشاد باری ہے وما ظلمنا ہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون۔

ایجاب ثواب و عقاب جسمانی | اس کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ یہ توجیہ عقاب روحانی کے بارے میں تو سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن جہاں تک عقاب جسمانی کا تعلق ہے جس کے متعلق شریعت حقہ نے خبر دی ہے اس کے بارے میں یہ توجیہ حد درجہ مشکل ہے کیونکہ مارگزیدم کا لزوم اوامر کے ترک اور نواہی کے ارتکاب کی بنا پر کسی طرح تصور میں نہیں آتا۔

اس کی تردید میں ملا صاحب فرماتے ہیں کہ علمائے شریعت اور ائمۂ ملت ثواب و عقاب جسمانی پر دلالت کرنے والی آیات کو تمثیل معانی بصور پر محمول کرتے ہیں، لیکن اگر ہم

ایسا نہ بھی کریں بلکہ ان کے ظاہری مفہوم ہی کو مراد لیں تو بھی ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کے اعمال سیئہ اور آخرت کے مار وکثردم کے درمیان ایک خاص قسم کا لزوم ہو جس کے ادراک و احاطہ سے ہماری عقول ناقصہ قاصر ہوں اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ نفس الامر میں جو کچھ واقع ہو اس کی علم بھی ہم پر منکشف ہو جائے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ہو سکتا ہے کہ جس طرح مقناطیس کی خاصیت جذب آہن ہے اسی طرح اعمال سیئہ کی خاصیت مار وکثردم ہو اور مومن خبر نبوت کی تصدیق کی وجہ سے اس کا اعتقاد رکھتا ہے، اور محقق کشف وشہود کی بنا پر اس پر یقین کرتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:-

وہر کہ بقراط و جالینوس را در خواص ادویہ و عقاقیر بے ادراک لم آن تصدیق نماید، و محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم را در خواص اعمال، بے دریافت وجہ لزوم، تصدیق نہ کند، ہمانا کہ از ایمان بمراحل دور خواہد بود، (رسالہ جبر و اختیار صـ۳۲)

مسئلہ عفو عذاب | لیکن اس تقریر کے بعد بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر درد و الم لازم معصیت ہے، اور لازم کا انفکاک ملزوم سے محال ہے تو پھر عفو خداوندی کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ شفاعت سے کوئی فائدہ ہوگا،

اس کا جواب ملا صاحب نے یوں دیا ہے کہ درحقیقت موجب الم اور باعث عقاب وہ ہیئت ردیہ ہے جو نفس کے اندر معصیت کی وجہ سے راسخ ہو جاتی ہے۔ اور اس ہیئت کے رسوخ کے لئے چند شرائط اور موانع ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالت میں معصیت کے باوجود بعض شرائط کے فقدان یا بعض موانع کے موجود ہونے

کی وجہ سے وہ ہیئت ردیہ متحقق نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متحقق ہونے کے بعد اس کے صفد کے پائے جانے سے منتفی اور معدوم ہو جائے، اور چونکہ فقدان شرائط یا وجود موانع اپنی ندرت و خفا کی وجہ سے ہماری ناقص اور جزی عقل کے ادراک و احاطہ سے خارج ہے، اس لئے اس کو عفو الہٰی سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ جملہ امور کا مرجع و منتہا ذات باری تعالیٰ ہے جیسا کہ بعض اسباب خفیہ و نادرہ کو بخت اور اتفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور چونکہ نبوت پر اعتقاد کامل اور روحانیت نبی سے استمداد، ہیئت ردیہ کے رسوخ سے مانع ہے اس لئے شفاعت سے عام طور پر اسی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے، یا اسی کا نام شفاعت ہے،

اشارہ بہ مسلک صوفیہ:۔ رسالہ جبر و اختیار کے خاتمے پر ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اسباب و علل کا سلسلہ اور مشیئت ایزدی تک اس کی انتہا در اصل اس بلندی کے لیے ہے، جس کی محدود نگاہیں معلولات و علل کی جزئیات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتیں، لیکن جو منتہی سارے عالم وجود کو بصیرت کی روشنی میں دیکھتا ہے اس کے نزدیک از اول تا آخر بجز ایک معلول کے کوئی دوسری علت اور بجز مسبب الاسباب کے کوئی دوسرا سبب نظر نہیں آتا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وپوشیدہ مباد کہ آنچہ از ترتب اسباب و انتہاے آں بمشیئت رب الارباب مذکور شد، درنظر کسے است کہ حدقۂ بصیرتش از ملاحظۂ نظام جملی بیک دفعہ تنگی نمودہ، نظرش از جزئیات معلولات و علل عبور نہ نماید، اما ہر کہ دیدۂ او را گنجائش احاطۂ کل عالم وجود بود، درنظر شہودش از ازل تا ابد جز یک معلول کہ بافاضۂ عین مقدسہ از شوائب امکان بخشش وجود بل وجوب یافتہ

مسببے و معلولے ملحوظ نہ بود وجز مسبب الاسباب علتے و سببے نہ۔

دیدہ باید از سبب سوراخ کن　　تا سببہا بر کند از بیخ و بن

(رسالہ جبر و اختیار ص ۳۴-۳۵)

رسالہ جبر و اختیار کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا اس سے ملا صاحب کی عظیم المرتبت شخصیت اور فلسفیانہ اور کلامی مباحث میں ان کی عبقریت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ جبر و اختیار دقیق ترین اور نازک ترین مسئلہ ہے، اسی لئے شارع علیہ السلام نے اس میں غور و خوض سے منع فرمایا ہے۔ لیکن ملا صاحب نے مسئلہ کے غوامض و دقائق کو ایسی وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اور اس سے متعلق اعتراضات و اشکالات کو ایسے دلائل سے دفع کیا ہے کہ یہ مسئلہ منقح و مجلی شکل میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، اس لئے ملا صاحب حسب ذیل دعویٰ کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

وہمانا کہ تا این ہنگام کسے از علماء اعلام در توضیح و تنقیح این مطلب شریف و مقصد شگرف بدین تدقیق و تحقیق سخن نگفتہ و خار و خاشاک وہم و شک از نہج برہان و طریق ایقان نرفتہ۔

(رسالہ جبر و اختیار ص ۳)

حیات شبلی

جسکے عالمانہ و محققانہ مقدمہ میں دیار مشرق خصوصاً شاہان شرقیہ کے دار السلطنت شہر جونپور کے علماء و اصحاب درس و تدریس کے سلسلہ میں پورب کے سب سے زیادہ نامور صاحب معقولات ملا محمود جونپوری کا نام خاص طور سے آیا ہے۔ قیمت :- ۷۰ روپیے۔

خواجہ عزیز الدین عزیز
حیات اور شاعری

از جناب سید ضیاء الحسن صاحب لیکچرار اردو فارسی مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

عہد مغلیہ میں ملک کی فارغ البالی، سکون و اطمینان اور کشش نے ایران، افغانستان و ترکستان تک سے بڑے بڑے اہل علم و فضل کو اپنی طرف کھینچ بلایا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں تو ارباب فضل و کمال کی سرپرستی ان بادشاہوں کا شیوہ بن گئی تھی لیکن سیاسی انتشار کے دور میں بھی اس قدر دانی کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ دربار بنتے اور بگڑتے رہے، امراء و رؤسا عروج و زوال کی منزلوں سے گزرتے رہے لیکن کسی دربار نے شعراء، ادباء، علماء، اطباء یا دوسرے فنکاروں کی حوصلہ افزائی میں حتی المقدور کمی نہیں کی، تاہم زمانے کے تقاضوں اگر کسی دربار سے کوئی فنکار مجبور یا بد دل ہو کر نکلتا تو دوسرا دربار اسے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود رہتا، لیکن جب خانہ جنگی، اخلاقی پستی، خود غرضی، آرام طلبی، حسد اور سازش نے حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا، دلی اجڑنے لگی، اہل کمال پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ تو وقت مجبوراً اہل فن کی نگاہیں نئی ابھرتی ہوئی حکومتوں کی طرف اٹھنے لگیں، ان ہی میں سے مشہور زمانہ حکومت "سلطنت اودھ" تھی،

شجاع الدولہ کے زمانے تک اودھ کے حکمرانوں کا مستقر فیض آباد تھا لیکن شجاع الدولہ کے فرزند ارجمند آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو ۱۷۷۵ء میں دار الحکومت بنایا

اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر جنت نشان بن گیا، لکھنؤ کی رنگین و پرکشش کہانی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے، اس دور کے لکھنؤ کے بارہ میں سیاحوں اور ادیبوں نے یہ تاثرات ظاہر کیے ہیں،
نجات حسین خاں اپنے روزنامچے "سوانح لکھنؤ" میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-[1]

"سبحان اللہ چہ شہرے ست دلپذیر و چہ مقامے ست بے نظیر، جائے ست دلفریب و مکانے ست مطبوع، منزہ از نقص و عیب، بلندے ست بس دلچسپ و خوش سواد، دکانہا مملو و رد آباد۔ و معمورے ست از اقسام و انواع چیزہا۔"

غالب میاں داد خاں سیاح کے نام اپنے ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:-[2]

"وہ لکھنؤ کا کیا کہنا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، وہ ہندوستان کا بغداد تھی، جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔"

رجب علی بیگ سرور ان الفاظ میں لکھنؤ کا نقشہ کھینچتے ہیں:-[3]

"اگر دیدۂ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے، آنکھ بند کرلے ع

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے ۔۔۔ وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ و بحمدہ عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے...... علی الخصوص مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خراد ہے، یہاں ہر فن کا استاد ہے، سینکڑوں گھامڑ، بدعقل، کندۂ ناتراش اطراف و جوانب سے آ ہفتہ عشرہ میں چھل چھلا وضعدار ہو گئے۔"

---

[1] نجات حسین خاں عظیم آبادی کا روزنامچہ "سوانح لکھنؤ" بحوالہ مضمون "لکھنؤ سوا سو برس پہلے" از پروفیسر سید حسن۔ ماہنامہ "نیا دور" مئی ۱۹۶۰ء [2] میاں داد خاں سیاح اور انکا کلام ص۳۵ از ڈاکٹر سید ظہیر الدین
[3] فسانۂ عجائب، مطبوعہ انوار احمدی پریس الہ آباد ص ۶ و ۹

واجد علی شاہ کے عہد میں داد و دہش کا ایک منظر تاریخ اودھ میں ملاحظہ ہو[1]:-

"بادشاہ دریائے گنگا کو کشتی سے عبور کر کے ہاتھی پر سوار ہوئے، فقراء و مساکین اور حاجتمندوں نے ہاتھی کو گھیر لیا، روپیہ تقسیم ہونا شروع ہوا، تین ہزار چار سو ۹۵ روپے تقسیم ہوئے، یہ بخشش دیکھ کر اہل شہر نے ہجوم کیا، اور خوف جان سے نڈر ہو کر ہاتھیوں کے حلقے میں آ گئے، ایک شخص کچل بھی گیا، جب سواری گوروں کی بارک کے پاس پہنچی تو گورے اپنی بارک سے نکل کر روپیہ لینے میں مشغول ہوئے۔"

یہی وہ لکھنؤ تھا جس کی تہذیب و تمدن کے چرچے چار دانگ عالم میں مشہور ہیں، یہ سب کچھ آصف الدولہ کی شخصیت، فیاضی، علم دوستی اور اہل ہنر کی قدر دانی کا نتیجہ تھا، کہ بہت جلد لکھنؤ سارے ہندوستان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

جب دہلی کی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو بہت سے باکمالوں نے لکھنؤ کا رخ کیا، اس زمانے میں دہلی کی بزم شاعری کے میر مجلس سراج الدین علی خاں آرزو نواب سالار جنگ کی خواہش پر لکھنؤ آئے، ان کے بعد فغاں، سودا، میر تقی میر، میر سوز، میر ضاحک، میر حسن، پھر جرأت، انشاء، مصحفی وغیرہ ترک وطن چھوڑ کر کے لکھنؤ پہنچے اور اپنے فن سے فارسی و اردو ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کرنے لگے، ان کے علاوہ ہندوستان بھر سے ہر فن کے ماہرین اور معاش کے طلب گار کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنا شروع ہو گئے، اور چند سال کے اندر اندر یہ نئی تہذیب عروج کی آخری منزل تک پہنچ گئی، یہ ارتقائی منزلیں آصف الدولہ بہادر اور سعادت علی خاں کے دور نیابت میں طے ہوئیں۔

غازی الدین حیدر (۲۷ - ۱۸۱۴ء) اور نصیر الدین حیدر (۳۷ - ۱۸۲۷ء) کے عہد

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم مصنفہ مولوی نجم الغنی مرحوم۔ ص ۱۴۲ مطبع نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء

حکومت تک لکھنؤ کی تہذیب اپنی آخری بلندیوں کو چھونے لگی تھی، اس وقت کے کاملین فن کا تذکرہ رجب علی بیگ سرور نے ان الفاظ میں کیا ہے؛[1]

"یہ خطہ رشک زمین یونان ہے........ شاعر زبان داں ایسے ہوئے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی، فردوسی و انوری کی یاد بھلائی، شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرہ کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا. فصحائے شیراز و اصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے، اپنے قبح پر منفعل ہوئے. اس زبان کا حسن جان گئے، زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا، سینکڑوں کو استاد بنایا، خواجہ حیدر علی آتش کی آتش فشانی شعر و افشانی سے دل جلوں کے سینہ میں سوز و گداز ہے، مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔"

ایک مشہور انگریز مورخ ولیم نائٹن (جس نے اپنی سیاحت کے دور میں لکھنؤ میں کافی عرصہ قیام کیا) اپنی کتاب Private life of an Eastern king (جس کا ترجمہ "شباب لکھنؤ" کے نام سے ہو چکا ہے) میں لکھتا ہے:[2]

جب سے دہلی کا عروج و اقبال مٹا ہے، اور دہلی میں اگلے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہ گیا ہے، اس وقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جو لکھنؤ سے تموّل اور شان و شوکت کے لحاظ سے دعوائے ہمسری کر سکے۔"

غرض لکھنؤ میں ہر چہار طرف سکون و اطمینان اور دولت کی فراوانی تھی، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، نرالے شوق اور نرالے انداز تھے، عمارتیں بنوانا، بادشاہوں کا دلپسند مشغلہ اور وحشی جانوروں اور درندوں کو لڑتا ہوا دیکھنا ان کا دلچسپ کھیل تھا، بانک

---

[1] فسانۂ عجائب. انوار احمدی پریس الہ آباد ص ۱۴ و ۱۵ [2] ولیم نائٹن "شباب لکھنؤ" مترجمہ پرائیویٹ لائف آف این اسٹرن کنگ. مرزا محمد ادریس، الناظر پریس لکھنؤ، ۱۹۱۲ء ص ۵

بنوٹ، پٹے بازی، تیغ زنی، پتنگ بازی، مرغ بازی، بٹیربازی اور نہ معلوم کتنی ہی بازیاں تھیں جن سے سلاطین، اور امرا اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ان کی دلچسپی کا ایک بڑا ذریعہ شعر و شاعری بھی تھا، جو خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے اور قدر دان علم و ادب بھی تھے۔ اس لیے اس عہد کی سب مروجہ زبانوں کے ماہرین، شعراء و ادباء اور فضلا و ان فن مختلف درباروں سے وابستہ رہتے تھے، علمی مباحثوں، ادبی نشستوں اور مشاعروں کا عام رواج تھا، بادشاہ بنفسِ نفیس ان مباحثوں اور مشاعروں میں شریک ہو کر حصہ لیتے تھے، اسی قدر دانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس بے نظیر شعرا کے دواوین اور بے مثال ادبی کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود ہے، جس پر ہمارا سر فخر سے بلند ہے،

آصف الدولہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک پچاس فیصدی ایسے شعرا ہیں جو بیک وقت فارسی و اردو دونوں ہی زبانوں میں شاعری کرتے تھے، ان میں حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں،

رائے سرب سکھ دیوانہ، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، شیخ غلام ہمدانی مصحفی منت، نواب محبت خاں محبت وغیرہ وغیرہ،

اسی عہد کے دور آخر کے مایہ ناز شعرا و فصحا میں ایک خواجہ عزیز الدین عزیز بھی ہیں جن پر ہندوستان کو اور اہل ادب کو ناز ہے، انھوں نے فارسی ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے اہل علم و ادب بھی ان کے نام سے ناآشنا ہیں، جو حضرات واقف بھی ہیں، انھوں نے بھی معلوم نہیں کیوں ان کی طرف توجہ نہیں کی، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ خواجہ صاحب فارسی کے شاعر تھے، اور جب فارسی زبان ہی ہمارے لیے اجنبی ہوتی جا رہی ہے تو فارسی شاعر کی ہمارے دل میں کیا قدر ہو سکتی ہے

ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

مولوی عبدالحلیم شرر اپنی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" میں فارسی زبان وادب کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں[۱] :-

"پرانے بزرگوں میں اور خصوصاً مسلمانوں میں بہت کچھ فارسی کا مذاق موجود ہے اس لیے کہ ان کی اردو دانی ہی ایک حد تک ان کے لیے فارسی دانی کا ذریعہ بنجاتی ہے۔ مسلمانوں میں ابتک خواجہ عزیز الدین صاحب کا ایسا محقق بزم فارسی اگلی بزم سخن کی یاد دلانے کو پڑا ہوا ہے جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں یکتا ہیں۔"

علامہ اقبال مرحوم اپنے ایک تقریظی خط میں خواجہ صاحب کا تعارف اس طرح کراتے ہیں[۲] :

"خواجہ مرحوم فارسی ادبیات کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے عہد سے ہوئی، افسوس کہ وہ دور ہندوستان میں انکی ذات پر ختم ہوا ــــ ایرانی تخیل نظم کی شاہراہوں کو چھوڑ کر اب زیادہ تر نثر میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے، شعرائے متاخرین میں قاآنی کا آوازہ بہت بلند ہوا، اور ابتک بلند ہے۔ لیکن خواجہ عزیز مرحوم کے قصائد اور مخمسات جو انھوں نے قاآنی کی زمینوں میں لکھے ہیں، وہ فارسی زبان کی موسیقیت اور خواجہ مرحوم کی اس زبان پر قدرت کا بین ثبوت ہیں۔"

مولوی عبدالحلیم شرر اور علامہ اقبال نے خواجہ عزیز کا مختصر تعارف کرایا ہے، اب ہم ان کی حیات اور شاعری کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

مورث اعلیٰ | مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں[۳] :

---

[۱] گذشتہ لکھنؤ ص ۱۳۲ مرتبہ شمیم انھونوی، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۵ء [۲] مکتوب اقبال منسلک بہ دیوان خواجہ عزیز [۳] مقدمہ دیوان عزیز ص ۳

"خواجہ عزیز کے مورث خواجہ محمد مقیم الدین آٹھویں صدی ہجری میں ترکستان سے حضرت سید شرف الدین بلبل شاہ کے ہمراہ کشمیر میں آکر مقیم ہوئے۔ یہی حضرت بلبل شاہ ہیں جنھوں نے کشمیر میں اسلام پھیلاکر اسے جنت نظیر بنایا۔"

"جغرافیۂ کشمیر" میں تحریر ہے،[1]

"باید دانست کہ اول شخصے کہ در کشمیر اشاعتِ اسلام کرد حضرت بلبل شاہ قدس سرہٗ العزیز بود، اسم مبارکش بعضے سید عبد الرحمٰن و بعضے سید شرف الدین میگویند۔ وطن شریفش ترکستان است۔ در سال ہفتصد و بست و پنج (۷۲۵ھ) کہ زمانۂ سلطنت رتن جو شاہ بود از ترکستان بکشمیر تشریف آورد۔"

مندرجۂ بالا اقتباسات سے حضرت بلبل شاہ کے کشمیر میں ورود مسعود کے صحیح سنہ کا پتہ چل جاتا ہے،

خواجہ محمد مقیم تجارت پیشہ تھے، اور ان کی تجارت کا انحصار اونی کپڑوں اور پشمینہ پر ہی تھا،

قبیلہ داراب کشمیری | خواجہ محمد مقیم کے خاندان نے بڑھکر ایک قبیلہ کی شکل اختیار کرلی اور قبیلہ داراب یا داراتبو[2] کے نام سے مشہور ہو گیا، یہ ایک باعزت اور مشہور کشمیری قبیلہ تصور کیا جاتا ہے اسی خاندان کی ایک مشہور شخصیت خواجہ امیر الدین کی تھی،

والدین | خواجہ امیر الدین فارسی ادب کے اس درخشندہ ستارے، خواجہ عزیز الدین کے والد محترم تھے،[3] خواجہ امیر الدین اپنے قبیلہ کے مروجہ پیشہ تجارت میں تن من دھن سے لگ گئے

---

[1] جغرافیۂ کشمیر مصنفہ خواجہ محمد اعظم دِدہ مرد منسلک بہ دیوان خواجہ عزیز ص ۲　[2] باوجود تحقیق و جستجو کے یہ پتہ نہ چل سکا کہ "قبیلۂ داراب" کا سلسلہ کیا ہے اور داراب کی وجہ تسمیہ کیا ہے، خواجہ عزیز نے (باقی حاشیہ ص　)

وہ ایک باعزم، ہوشیار اور انتھک محنت کرنے والے اچھے تاجر تھے۔ انھوں نے اپنے کارخانے میں اونی کپڑوں اور کشمیری شال، دوشالوں میں وہ وہ گلکاریاں کیں اور ان میں ایسا نفیس کام بنوایا کہ یورپ اور فرانس کے لوگ بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے، اور یہاں کے بڑے بڑے تاجروں نے پیشگی رقمیں بھیجکر ان سے مال لینا شروع کر دیا۔ جب سے خواجہ امیرالدین کی تجارت چمک گئی، ایسا بھی ہوتا تھا کہ بڑے بڑے تاجر خود فرانس اور یورپ سے ہندوستان تک کا دور دراز سفر کرکے آتے تھے اور خواجہ صاحب کے یہاں قیام کرتے اور اپنی اپنی فرمائشیں تیار کروا کے اپنے ہمراہ لے جاتے۔

کسی مصلحت کی بنا پر (غالباً بادشاہ وقت کے مظالم سے تنگ آکر) خواجہ امیرالدین نے کشمیر کی اقامت پر لکھنؤ کی اقامت کو ترجیح دی اور ترک سکونت کرکے لکھنؤ پہنچے، سبزمنڈی چوک، کے قریب ایک خوبصورت بارہ دری بنوائی اور اسی میں رہنے لگے۔ یہاں بھی انھوں نے ایک شال کا کارخانہ قائم کیا لیکن یہ کارخانہ تھوڑے دن عوام کی خدمت کرکے زمانے کی گردش، تجارت کی کساد بازاری اور یورپ کی خود غرضی کا شکار ہو گیا۔

پیدائش | خواجہ عزیز کی ولادت کس شہر میں ہوئی اس میں اختلاف ہے۔ مصنف تذکرہ شمع انجمن کی رائے ہے کہ خواجہ صاحب لکھنؤ میں پیدا ہوئے ... "لکھنؤ مولد و موطن"... لیکن مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں کہ ..... "خواجہ عزیز کشمیر میں پیدا ہوئے"، ہم کو اس سلسلے میں جو بھی معلومات فراہم ہو سکی ہیں، ان کی روشنی میں اپنی ترجیحی رائے آخر میں پیش کریں گے۔

(بقیہ حاشیہ ص) کئی جگہ اپنے اعزہ کے نام کے ساتھ "دار ابو" لکھا ہے۔ یہ تذکرہ کہیں تو خط کے القاب و آداب میں ہے اور کہیں تاریخی قطعات کی شکل میں۔ انکے دیوان میں موجود ہے۔ [۳] خواجہ عزیز کی والدہ بھی کشمیری کی تھیں لیکن ان کا سلسلۂ نسب نہ معلوم ہو سکا۔

تذکرہ شمع انجمن کے مصنف رقمطراز ہیں :-

"خواجہ عزیز الدین ابن خواجہ امیر الدین والدش کشمیری مولد و منشاء ۔ لکھنؤی مسکن و مدفن ۔ ایں عزیز را لکھنؤ مولد و موطن ۔ طبعش موزوں فکرش تازہ معنموں ۔ ذہنش با وجود آشنا کلامش چوں نامش عزیز دلہا ۔"

اقتباس بالا سے خواجہ عزیز کی جائے ولادت لکھنؤ ثابت ہوتی ہے لیکن مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں کہ[1] :-

"خواجہ عزیز ۱۸۲۱ء میں ملک کشمیر میں پیدا ہوئے، آٹھ نو برس کی عمر تھی، کہ باپ کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور یہیں تحصیل علم کی ۔"

اس اقتباس سے خواجہ صاحب کی پیدائش کشمیر میں ثابت ہوتی ہے، حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم اور خواجہ عزیز مرحوم کے پوتے اور پوتیاں آخر الذکر قول کی تائید کرتے ہیں، خود راقم کے نزدیک اس باب میں قابل اعتماد قول ان کے افراد خاندان کا ہے جس کی نواب شروانی نے تائید کی ہے، بظاہر مصنف تذکرہ شمع انجمن کو یا تو سہو ہوا یا ذہن میں لکھنؤ اور کشمیر کے ناموں میں کچھ اشتباہ ہو گیا،

تعلیم | خواجہ صاحب جب اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے تو یہاں کی زبان اور ماحول سے قدرتاً متاثر ہوئے، اس زمانے میں یہاں کے عوام کا ذوق نہایت ستھرا اور بلند تھا، بقول مولوی عبد الحلیم شرر[2] :-

"یہ زمانہ در اصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا، شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں، ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شد بد ہو جاتا، طبع آزمائی شروع

---

[1] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز، ص ۳ [2] گذشتہ لکھنؤ، ص ۱۱۸

کر دیا، جہلا و عوام، ادنیٰ طبقہ کے لوگوں اور گھر بیٹھنے والی عورتوں تک میں شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں، اَن پڑھ کر طیبے شاعر تھے، اور جہلا کی زبان اس قدر شستہ و رفتہ، اخلاقی حفظ مراتب سے مملو اور تمدنی آداب سے لبریز تھی، کہ اکثر صاحب علم ان کی گفتگو سنکر ششدر رہ جاتے اور کسی کو بھی ان پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا، سودا بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ نکات، اور فصاحت و بلاغت کے خواص سے استقدر آراستہ و پیراستہ تھیں کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا"

غرض ایک طرف لکھنؤ میں باکمالوں کے مجمع سے ہر سمت علمی مباحثے، درس و تدریس کے چرچے موجود تھے، دوسری طرف خواجہ صاحب کے گھر کا مخصوص ماحول خالص علمی و ادبی تھا جو خواجہ صاحب کی اچھی تعلیم و تربیت کا ضامن بنا، افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کی تعلیم اور اساتذہ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا پڑھا، کس سے پڑھا، اور کب تک پڑھا، اتنا ضرور ہے کہ فارسی میں کمال حاصل کیا، ایک روایت[۱] ہے کہ حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں ایک افغانی بزرگ شیخ عبد اللہ رہا کرتے تھے، خواجہ عزیز کو ان کی صحبت کا شرف حاصل ہو گیا، شیخ عبد اللہ بھی خواجہ صاحب پر بڑی شفقت فرماتے۔ انھیں کی وجہ سے خواجہ صاحب نے فارسی میں ترقی کی اور کلام میں پختگی آئی، اور ان ہی کی توجہ سے خواجہ صاحب کو نعت گوئی کا بھی شوق پیدا ہوا،

ابتدا ہی سے خواجہ صاحب کے پیشِ نظر اساتذہ کا کلام رہتا تھا، ان میں نظامی گنجویؒ، حافظ شیرازیؒ، نظیری اور ظہوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، دیوان میں کئی جگہ ان اساتذہ کا نام آیا ہے،

---

[۱] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز الدین ص ۴

کے از ظہوری و نظیری رسد عزیز فیضے کہ از کلام الٰہی بما رسید
شہد و شکر عزیز بشعرم نمی رسد تا بر طریق حافظ شیریں زباں شدم

جس طرح شطرنج میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ بتایا جاتا ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے سے بہتر کھیلنے والے کے مقابلہ میں کھیلنا شروع کر دے، تو وہ بہت جلد اس کا ماہر ہو جائیگا، اسی طرح ادبیات کا یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جو شخص اپنا ذوق ستھرا اور بلند بنانا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ ہمیشہ مشہور استادوں کے کلام کا مطالعہ اور ان کی مزاولت کرتا رہے، خواجہ عزیز کے ذوق کے نکھرنے اور بلند ہونے کا راز اسی نکتہ میں مضمر ہے،

خواجہ صاحب کو نظامی گنجوی کے کلام سے بڑی مناسبت تھی، اس کو برابر پڑھتے اور دل سے ان کی قدر کرتے تھے، ایک بار مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے خواجہ صاحب سے نظامی کے کلام کی خصوصیات دریافت کیں، تو فرمایا[1]:

"الفاظ کا انتخاب، ترتیب اور بندش ان تینوں مراتب میں نظامی ممتاز ہیں"

خواجہ صاحب کو مذکورہ بشری کلاموں کے ساتھ کلام اللہ سے بڑا شغف تھا، جس کا اعتراف مندرجۂ ذیل شعر میں ہے: ع

کے از ظہوریؔ و نظیریؔ رسد عزیز فیضے کہ از کلام الٰہی بما رسید

اور درحقیقت اسی کلام الٰہی کے فیض سے ان کے ذوق میں نکھار پیدا ہوا،

خواجہ صاحب کو علوم عربیہ پر پوری دسترس حاصل تھی، خصوصاً ادب میں، چنانچہ وہ حماسہ، متنبی، اور سبعہ معلقہ کا بارہ دوری (یعنی اپنے گھر عزیز منزل) میں طلبہ کو درس[2] دیا کرتے تھے، حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم کے بیان کے مطابق مقامات حریری اور مقامات بدیع الزماں

---

[1] مقدمہ دیوان عزیز ص ۸ [2] ایضاً ص ۳۲

پر خواجہ صاحب کی بڑی گہری نظر تھی، خود حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم نے موصوف سے بہت سی کتابیں پڑھیں، خواجہ عزیز کا شاگرد ہونے کا انھوں نے خود مجھ سے اعتراف کیا اور اکثر وہ اس پر فخر کرتے تھے۔

موجودہ دور کے ایک مشہور عالم، ادیب اور صحافی جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی[1] نے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم کے حالات زندگی سے متعلق لکھا ہے، تحریر کرتے ہیں[2]:-

"خاقانیٔ ہند خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی، حکیم (خواجہ شمس الدین) صاحب کے قریبی رشتہ دار (ان کی والدہ کے حقیقی خالو) تھے، جن کی فارسی دانی اور فارسی شاعری اپنے زمانے ہی میں مسلّم نہیں تھی بلکہ نوجوانی ہی میں وہ اپنی فارسی شاعری کو مرزا غالب کے ایسے فارسی شناس سے تسلیم کرا چکے تھے......"

جس طرح سے خواجہ عزیز کے اساتذہ اور تعلیم کا حال نہیں معلوم ہو سکا، اسی طرح اس کا بھی پتہ نہیں چل سکا کہ شاعری میں انھوں نے کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ جن اساتذۂ فارسی کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، انھیں کا کلام ان کے لیے رہبر ثابت ہوا ہوگا۔

جب خواجہ عزیز اپنے والد کے ہمراہ ۱۸۳۰ء میں لکھنؤ آئے تو یہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا، لکھنؤ، لکھنؤ بن چکا تھا، یہاں کی تہذیب اور علمی ماحول بام عروج پر تھا، اگرچہ نصیر الدین حیدر کی طفلانہ مزاجیوں اور بے اعتدالیوں نے کسی حد تک دربار میں کچھ معمولی سی تبدیلیاں ضرور کر دی تھیں، لیکن اس عہد میں ٹھوس علمی اور ادبی کام بھی تیزی سے ہو رہا تھا، اس زمانے میں عربی،

---

[1] لکچرر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ [2] مضمون "مولانا حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم" دوسری قسط، از روزنامہ قومی آواز لکھنؤ، اتوار ۳ مئی ۱۹۷۱ء جلد ۲۶ نمبر ۱۰۳

فارسی اور اردو کی کئی اہم کتابیں لکھی گئیں، جن میں آٹھ جلدوں پر مشتمل تاج اللغات[1]، ہفت قلزم[2]، اور قصہ زادیک اہم، مشہور اور قابل ذکر ہیں،

خود بادشاہ کو علم نجوم اور علم ہیئت سے دلچسپی اور لگاؤ تھا، اس لیے اس فن کی بہت سی عمدہ کتابوں کے فرانسیسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے ہوئے،

خواجہ عزیز کو نصیر الدین حیدر کے عہد کا آخری زمانہ ممکن ہے یاد ہو، لیکن ابتدائی زمانہ یاد نہ ہوگا، اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی، البتہ ۱۸۳۷ء کے بعد سے پانچ سالہ عہد محمد علی شاہ، پانچ سالہ عہد امجد علی شاہ اور آخر میں ۹ سالہ عہد واجدی انھوں نے سن شعور میں دیکھا ہے، یعنی خواجہ صاحب نے لکھنؤ کے آخری چار بادشاہوں کا عہد پایا، اس کے باوجود دیوان میں محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے بارے میں کچھ نہیں ملتا، البتہ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کی شان میں ایک قصیدہ دیوان میں موجود ہے، اس کی تفصیلات انشاء اللہ آگے پیش کی جائیں گی،

اخلاق و عادات | خواجہ صاحب نہایت غیور اور مستغنی شخص تھے، کسی کا بار احسان نہیں اٹھاتے تھے، ہمدردی اور خلوص کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، جب کسی سے ملتے تو اسے یقین ہو جاتا کہ

---

[1] اس عربی لغت کا کام غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوا تھا لیکن مکمل نہ ہو سکا، پھر نصیر الدین حیدر نے بہت ہی توجہ سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، یہ لغت قاموس کو بنیاد بنا کر مرتب کیا گیا تھا، اس کا ایک نسخہ کشمیر یونیورسٹی میں ہے جس پر باقاعدہ شاہی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ [2] ہفت قلزم بھی اسی عہد کا مشہور لغت ہے، جو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے، [3] یہ ایک دلچسپ فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے، جسے ایک فرانسیسی مصنف نے ہی بڑے اچھے انداز میں اپنی زبان سے اردو میں منتقل کیا، یہ مصنف نصیر الدین حیدر کے دربار سے وابستہ تھا،

خواجہ صاحب مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں جس محفل میں ہوتے تو ہر فرد یہ محسوس کرتا کہ میری طرف خصوصی توجہ ہے، تحائف کا خوش اسلوبی سے عوض کرتے۔ اگر بآسانی یہ ممکن نہ ہوتا تو بذریعہ ڈاک روانہ کرتے، اکثر احباب کی فرمائش پر انھیں ان کی فرمائشیں بھیجتے۔ چونکہ مزاج میں نفاست تھی اسلیے ہمیشہ نفیس چیزیں ہی خریدتے اور استعمال کرتے۔

ایک بار علامہ شبلی نعمانی نے جب وہ قسطنطنیہ کے دورے پر گئے ہوئے تھے، شیخ حبیب اللہ کے نام ایک خط بھیجا، اس میں لکھا:[1]

"...... لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان مگر نہایت عمدہ فردی بوٹیاں ہوں نہایت باریک اور نازک کام ہو اور ۳۰ روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، خواجہ عزیزالدین صاحب کی معرفت اگر خریدا جائے تو غالباً اچھا ہوگا، میں یہاں آخر اگست تک رہوں گا"

باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنا کے نہایت خلیق، ملنسار، اور متواضع تھے، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا ان کے خیالات کی پاکیزگی سے مسحور رہتا۔

حسن اخلاق، مذہب اور فرقے کی قید سے بالاتر تھا، ہندو مسلم، شیعہ سنی، سکھ عیسائی سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے محض ظاہری اخلاق نہیں بلکہ ان میں وہ اخلاق تھا جس سے دل متاثر ہوتا تھا عارف جامی کا یہ شعر گویا ان کی زندگی کا اصول تھا۔

بس چناں زی کہ بعد مردنِ تو ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

مذہب | خواجہ صاحب راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے چار یاری ہونے کا ذکر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت کے قصیدہ میں بڑی نکتہ آفرینی کے ساتھ کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

چار چیز است آنکہ از وی چار سوی دہر را ستوان بازیب و زین و عزت و فر داشتن

---

[1] مکاتیب شبلی۔ ص ۱۴ و ۱۵

یہ تو صدق است و عدل و علم و آزرم و رزم		آدمی را لازم است ایں چار گوہر داشتن
ہست ہر چار دیوار سلامت ناگزیر		آب و خاک و باد و آتش را برابر داشتن
پست ہمت در صعود ایں رواق چار طاق		در فرد دیں پایہ ماند از لنگ و لنگر داشتن
سویش از ہر سو کہ می بینی بچشم کم مبیں		کعبہ را از چار سو باید موقر داشتن

لیکن کچھ تو لکھنؤ کی عام فضا کے اثر سے اور کچھ اپنے طبعی متصوفانہ رجحانات کے باعث سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ذات کی طرف میلان زیادہ تھا، چنانچہ ایک مستقل قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ان کے دیوان میں موجود ہے، جس کا مطلع ہے :

کار ہر کس نیست بار عالمے بر داشتن		درد سر بسیار دارد بر سر افسر داشتن

خواجہ صاحب بڑے عابد و زاہد، پابند شرع اور صاحب دل تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت ان کے کلام تک سے نمایاں تھی۔

سراپا | بدن چھریرا، قد لمبا، رنگ گورا سرخ و سفید تھا، آنکھیں بڑی، داڑھی بھری ہوئی تھی، عام طور پر گھر میں قمیص اور پاجامہ پہنے رہتے تھے، لیکن جب باہر نکلتے تو عموماً ان کا لباس چوڑی دار یا تنگ مہری کا پاجامہ، شیروانی اور اس کے اوپر سے عمدہ اونی چغہ ضرور ہوتا جس پر کشمیری کام بنا ہوتا تھا، کشمیری گول ٹوپی ہمیشہ سر پر رہتی، آخر عمر میں ترکی ٹوپی پہننی شروع کر دیا تھی، جو ان کے گورے چٹے چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ نفاست پسندی مزاج میں حد درجہ تھی، کھانے پینے اور پہننے سب میں نفاست نمایاں رہتی تھی۔

شادی | خواجہ عزیز کی شادی ۱۸ سال کی عمر میں داروغہ عاشق علی خاں کی صاحبزادی سے ۱۸۳۹ء میں ہوئی، جو محمد علی شاہ کی سرکار میں توشہ خانہ کے داروغہ اور "چھوٹے امام باڑے" حسین آباد، لکھنؤ کی تعمیر کے منتظم اور خصوصی نگراں تھے۔

ملازمت | ۱۸۸۴ء میں خواجہ صاحب نے اپنے ایک دوست شیخ واجد حسین تعلقدار کے اصرار پر کیننگ کالج[1] لکھنؤ میں فارسی کی پروفیسری قبول فرمائی اور نو سال تک تشنگان ادب فارسی کو اپنے علم سے سیراب کرتے رہے، ۱۸۹۳ء میں بہتّر سال کی عمر میں جب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے، اس سے علٰحدگی اختیار کر لی،

قطعۂ تاریخ بنائے کیننگ کالج | اس جگہ اس تاریخی قطعہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو خواجہ صاحب نے جناب شاہد حسین صاحب بیرسٹر و تعلقدار گدیہ ضلع بارہ بنکی کی درخواست پر کیننگ کالج کی تعمیر جدید[2] کے موقع پر لکھا تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مرکز علم سے ہٹنے کے بعد بھی وہ ذہنی طور پر اس سے وابستہ اور اس درسگاہ کو ترقی کے اعلیٰ منازل پر دیکھنے کے متمنی رہے۔

مژدہ اے اہل علوم اینکہ بنام کیننگ　　قصر دیگر شدہ تعمیر بعہد قیصر

آں برفعت بود از شکل سپہر چارم　　ایں بعظمت بود از طارم چارم برتر

ہست ہر سنگے ازیں لوح طلسم دانش　　ہست ہر خشتے ازیں آئینۂ علم و ہنر

آفتاب فلک فضل و کمال آخر کار　　کرد تحویل ز برجے سوئے برج دیگر

شکر صد شکر کہ از فضل الٰہی فی الحال　　افتتاح در ایں مدرسہ کرد آں داور

خواست تاریخ ز من چشم و چراغ بینش　　شمع ہر انجمن و شاہد نوری پیکر

مصرع عیسوی از گفتہ او گفت عزیزؔ

نقش ثانی بود القصہ از اول بہتر

۱۹۱۱ء

احباب | خواجہ صاحب کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا، مخصوص احباب پر دل سے فدا تھے، علامہ شبلی، منشی غلام غوث بیخبر الہ آبادی، مولوی محمد سعید حسرت پٹنوی، مولانا عبد الغنی،

---

[1] سفید بارہ دری قیصر باغ سے متصل جس عمارت میں آجکل میوڈیکل کالج ہے، کیننگ کالج اس زمانہ میں اسی عمارت میں تھا،

[2] یعنی کیننگ کالج کی موجودہ عمارت جو اب یونیورسٹی ہے۔

راجہ درگا پرشاد تعلقدار سندیلہ اور منشی دلاور علی میں سے کوئی بھی آ جاتا تو خواجہ صاحب[1] کی خوشی قابل دید ہوتی، ان حضرات کی آمد سے ان کی محفل گل و گلزار بن جاتی، موصوف کی بارہ دری بقول[2] حبیب الرحمٰن خاں شروانی "اس زمانے میں ایسا لگتا تھا جیسے خیابان شیراز ہے، انسان وہاں پہنچتا تو حافظ و سعدی کے کمال کی جھلک پاتا، دوستوں کی یہ محفلیں گھنٹوں جمی رہتیں" علامہ شبلی کے خواجہ صاحب سے بڑے گہرے تعلقات تھے، علامہ شبلی جب لکھنؤ میں ہوتے تو ان کا زیادہ وقت خواجہ صاحب کے یہاں ہی گذرتا، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں[3]:-

"ندوے کے قیام سے پہلے مولانا جب لکھنؤ جاتے تھے، تو اکثر ان ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، قیام لکھنؤ کے زمانے میں بھی بعض اوقات ان کے یہاں جاکر دن دن بھر رہتے"

علامہ شبلی خواجہ عزیز کی فارسی دانی، علمیت اور اہلیت کے معترف تھے، اور دل سے انکی قدر کرتے تھے، کبھی کبھی جب کوئی فارسی مضمون تحریر فرماتے تو خواجہ صاحب کو دکھاتے۔ حیات شبلی میں ہے کہ[4]:-

"مولانا ان کی فارسی دانی اور قدرۃ الکلامی کے قائل ...... بلند ہمتی اور خودداری کے دل سے معترف تھے...... مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے"

ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں[5]:-

"اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام مخلص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین اور میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے"

---

[1] مقدمہ دیوان عزیز ص ۴ [2] ایضاً ص ۲ [3] حیات شبلی ص ۱۸۰ [4] ایضاً ص ۱۸۰
[5] مکاتیب شبلی ص ۱۲۱

چائے کا ذوق اور محفل احباب | خواجہ صاحب کے احباب کا جب اجتماع ہوتا تو چائے کا دور ضرور چلتا، اور وہ بھی اس شان سے کہ خواجہ صاحب چائے کے سارے انتظامات اپنی نگرانی میں کروا کے محلسرا سے جب باہر نکلتے تو اس طرح کہ ہاتھوں میں چائے کا سامان، لبوں پر تبسم، دل میں خلوص اور نگاہوں میں مسرت کی چمک ہوتی، سب سے بڑھ کر قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا خلوص مجسم بنے ہوئے مجلس میں جا بیٹھتے۔ ایک طرف مخصوص تبسم کے ساتھ گفتگو تو دوسری طرف چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ کوئی مہمان ہاتھ بٹائے، چائے میں زعفران ضرور پڑتی، شام کو سادہ اور صبح کو دودھ والی چائے مع ناشتہ ہوتی، بازار کا دودھ جب کبھی چائے کے رنگ کو خراب کر دیتا تو خواجہ صاحب کے چہرے کا رنگ بھی بدل جاتا، یہ چائے زیادہ تر "سبز چائے" ہوتی۔[۱] (مضمون شروانی)

حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم نے بتلایا کہ "خواجہ عزیز ہمیشہ نمکین چائے پیتے تھے، لیکن دستر خوان پر شکر موجود رہتی اور عام اجازت تھی کہ ہر شخص حسب مرضی شکر استعمال کرے"

غرض چائے کا بڑا اہتمام رہتا۔ چائے کے دوران علمی مباحثے بھی جاری رہتے، بلکہ اکثر اہم مسائل صبح یا شام کی چائے کی محفل کیلئے اٹھا رکھے جاتے تھے، جو دستر خوان پر چھڑ جانے پر کیفیت کے ساتھ حل کیے جاتے...... خواجہ صاحب کم سخن اور سادہ بیان تھے، لیکن خود نمائی سے نفور اور اس سے کوسوں دور، سیدھی سادی مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا۔

دوران کلام میں خواجہ صاحب دوسرے اساتذہ کے اشعار پڑھتے یا حوالے دیتے، لیکن اپنا کلام بہت ہی کم سناتے تھے۔ مولانا شروانی لکھتے ہیں:[۱]

"بارہا حاضر ہوا مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہ ہوا،

---

[۱] مقدمہ دیوان عزیز، ص ۲

دوسروں کا کلام سناتے، ادبی نکتے بیان فرماتے اور علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا۔"

یہ سب باتیں ایک خاص لطف رکھتی تھیں، جو زمانہ گزر جانے کے بعد بھی آج تک دل پر نقش ہیں۔

انتقال | چائے اور حقہ کی کثرت نے خشکی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے نیند یکسر اڑ گئی، بواسیر نے اور بھی کمزور کر دیا تھا، اخیر عمر میں اس مرض نے شدت اختیار کر لی، ضعف بڑھ گیا بخار رہنے لگا، اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے، کہاں تو چہرہ سرخ و سفید تھا اور کہاں شدت مرض سے سیاہ داغ پڑ گئے تھے،

اس زمانے میں چھوائی ٹولہ لکھنؤ کے مشہور حکیم عبدالحفیظ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے خواجہ صاحب کا علاج کیا، مگر وقت پورا ہو چکا تھا، چنانچہ پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ رحلت فرمائی اور اپنے خاندانی قبرستان محلہ کٹرہ ابوتراب میں دفن ہوئے۔ ذبیح فرخ آبادی نے تاریخ کہی ع

"عزیز مصر جناں خواجہ عزیز الدین"

۱۳۳۲ + ۱ = ۱۳۳۳ھ۔ تاریخ میں ایک عدد کا تعمیہ ہے۔

تلامذہ | شاگردوں کے ساتھ پدرانہ برتاؤ تھا، خواجہ صاحب کے ایک شاگرد مولوی شکراللہ سہیل (میر دبیر بھوپال) لکھتے ہیں:[1]

"حضرت خواجہ صاحب کا طلبہ کے ساتھ خلق پدرانہ شفقت و وقار و حلم اور تشفی بخش طرز افہام و تفہیم تھی، حضرت کا طریق اصلاح خصوصیت کے ساتھ یہ تھا کہ آپ شاگردوں کی نظم کے الفاظ ہی کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ کچھ اس خوبی سے تبدیل فرما دیا کرتے تھے کہ شعر میں ادب و زبان اور خیال و بندش کی بیشمار خوبیاں پیدا ہو جاتیں، احتیاط

---

[1] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز ص ۶

کا یہ حال تھا کہ کبھی ایسے محاورے کو جائز قرار نہیں دیتے تھے جس کی سند موجود نہ ہو، درس میں جب شاگردوں کو مضامین سمجھنے میں مشکلات آتی تھیں تو نہایت آسانی سے حل فرما دیا کرتے تھے۔"

خواجہ صاحب کے جن تلامذہ کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔[۱]

(۱) مولوی عبدالعلی آسی مدراسی (۲) مرزا محمد ہادی رسوا بی۔اے لکھنوی، (۳) ریاض حسن خاں دانش رسولپوری (۴) قاضی محمد خلیل، خلیل بریلوی، (۵) مولوی شکر اللہ، میر دبیر بھوپال (۶) منشی اودھ بہاری لال ثمر لکھنوی، (۷) منشی میکو لال، عشرت لکھنوی (۸) سید محمد علی، عارف لکھنوی، (۹) شیخ اصغر علی اصغر تعلقدار گنڈارہ (۱۰) مولوی احسن اللہ خاں ثاقب (۱۱) خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت۔ (۱۲) مرزا کاظم حسین صاحب محشر (۱۳) مولانا نجیب اللہ نجیب فرنگی محلی لکھنوی (۱۴) حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم[۲]،

اولاد: خواجہ صاحب کی اولاد میں ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے تھے۔ ان میں سب سے بڑے خواجہ خلیل الدین پھر خواجہ رشید الدین[۳] پھر خواجہ وصی الدین پھر حافظ خواجہ امین الدین، سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں، خواجہ وصی الدین صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے، بعد میں آنریری ریلوے مجسٹریٹ ہو گئے تھے،

خواجہ وصی الدین کا خاص کارنامہ اور اہل ادب پر احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے کلیات کو مرتب کر کے شائع کیا، اگر وہ توجہ نہ کرتے تو اس عظیم شاعر کے کلام سے شائقین علم و ادب محروم رہتے،

---

[۱] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز الدین۔ نوشتہ مولانا شروانی ص، [۲] یہ تفصیلات حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم سے جو خواجہ صاحب کے عزیز تھے، حاصل ہوئیں [۳] خواجہ رشید الدین داراب لکھنؤ کے مشہور دانتوں کے ڈاکٹر تھے، جنکا مطب قیصر باغ کے چوراہے پر تھا۔

"قرآن مجید کے عجمی الفاظ"

از جناب مولوی ابرار احمد صاحب اصلاحی

قرآن مجید کی ان آیات (انا جعلناہ قرآناً عربیا لعلکم تعقلون) (وھ
کتاب مصدق لساناً عربیا لینذر الذین ظلموا) (ولو
جعلناہ قرآناً أعجمیا لقالوا لولا فصلت آیاتہ
أ اعجمی و عربی) کے مطالعہ کے بعد چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ (
کیا قرآن کے تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں؟ (۲) کیا قرآن غیر عربی اور عجمی الفا
سے خالی ہے، یہ سوالات نئے نہیں ہیں بلکہ متقدمین علماء اور اہل لغت کے در
یہ مسائل اٹھتے رہے ہیں، اور ان کے بارہ میں اختلافات رہے ہیں، ایک نقطہ
نظر کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ قرآن عجمی الفاظ کی موجودگی سے انکار کرتا ہے ا
صراحت کے ساتھ اپنے عربی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، دوسرے اگر قرآن میں
عجمی الفاظ کی موجودگی کا اقرار کر لیا جائے تو ان مشرکین کو جنھیں قرآن نے چیلنج
دیا تھا۔ ایک عذر مل جائے گا کہ قرآن میں تو عجمی الفاظ ہیں جسے وہ جانتے نہ
ایسی حالت میں کیسے اس چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب (الصاحبی فی

مولف ابن الفارس لکھتے ہیں، کہ اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ کو مانا جائے تو کسی کے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ عربوں کے یہاں اس کا مترادف لفظ موجود نہیں ہے، اس لیے قرآن مجید میں وہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس سے واقف نہیں ہیں،

اس طرز فکر کے لوگوں میں بعض کا انکار اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ قرآن میں عجمی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ ایک خطرناک دعویٰ کرتے ہیں، اور ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ قرآن تو عربی مبین میں اترا ہے اس لئے جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربیت کا دخل ہے، وہ درحقیقت مبالغہ آمیز دعویٰ رکھتا ہے،

ابن جریر طبری کا یہ خیال ہے کہ اگر بعض قرآنی الفاظ عربی اور عجمی زبانوں میں ما ثلت رکھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ الفاظ غیر عربی زبانوں سے ماخوذ ہیں، ایسا اتفاقی توارد کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر مفسرین سے بعض قرآنی الفاظ کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ یہ فارسی یا حبشی یا نبطی یا کسی اور زبان کا لفظ ہے تو دراصل ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ عربی، حبشی اور ایرانی ایک لفظ کو مشترکہ طور پر بولنے لگتے ہیں، اور وہ لفظ ہر زبان میں مستعمل ہونے لگتا ہے،

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کا استعمال ہوا ہے ۔ چنانچہ جلیل القدر تابعی ابو میسرہ سے منقول ہے، (فی قرآن من کل لسان) یعنی قرآن میں ہر زبان کے الفاظ ہیں، اس نقطۂ نظر کے لوگ اس پر پختہ یقین رکھتے ہیں، اور قرآن عربیاً کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اگر قرآن مجید میں کچھ غیر عربی الفاظ آگئے ہیں تو اس سے یہ مفہوم کیسے پیدا ہوتا ہے کہ قرآن عربی نہیں ہے مثلاً اگر کسی فارسی قصیدے میں کچھ عربی

الفاظ ہوں تو کیا یہ قصیدہ فارسی کے بجائے عربی قصیدہ ہو جائے گا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم کی طرف نہیں بھیجے گئے تھے، بلکہ آپ کی بعثت ساری قوموں کے لیے تھی، اس لیے جو قرآن آپؐ نازل ہوا، اس میں کسی غیر عربی زبان کے الفاظ کے استعمال کے لئے کوئی مانع نہیں ہے، اور قرآن تو ایک جامع کتاب ہے جو گزشتہ اور آیندہ قوموں کے علوم پر مشتمل ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اس میں مختلف زبانوں کی طرف اشارہ ہو تاکہ ہر چیز کا احاطہ ہو سکے۔

یہ ہے متقدمین علماء اور اہل لغت کے اختلافات کا خلاصہ، موجودہ دور میں جب کہ لسانیاتی علوم کی تحقیقات سائنٹفک طرز پر ہو رہی ہیں، یہ انکشاف ہوا ہے کہ زبانوں میں بھی اسی طرح یکسانیت پائی جاتی ہے، جس طرح انسانوں میں ہم آہنگی موجود ہے، یہ ایک اصولی قانون ہے، ان کی تحقیقات نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ عربی زبان سامی زبان کی ایک شاخ ہے، ان کے درمیان لفظ و معنیٰ، اسلوب اور قواعد کے لحاظ سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ زبانوں میں تاثیر و تاثر کا عمل انسانی اجتماعیت کا بنیادی تقاضا ہے اور زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا فطری ہے، اور یہ چیز جس طرح دوسری زبانوں پر چسپاں ہوتی ہے، اسی طرح عربی زبان پر بھی چسپاں ہوتی ہے، اس کے باوجود کہ جاہلیت کے عرب باقی دنیا سے الگ جزیرۂ عرب میں محصور تھے پھر بھی پڑوسی زبانوں کے الفاظ عربی زبان میں داخل ہو گئے خصوصاً وہ عرب جن سے ایران، روم اور حبش دیمود سے مختلف نوعیت کے تعلقات تھے، ان کے یہاں بھی ان زبانوں کے الفاظ مستعمل تھے۔ اس لئے کہ یہ غیر عربی الفاظ جن چیزوں کے لیے مستعمل تھے وہ اس عربی ماحول میں موجود ہی نہ تھیں یا کمیاب تھیں، پھر بھی عربوں نے جب

ہمسایہ زبانوں سے یہ الفاظ لئے تو انھیں ان کی اصلی ہیئت وصورت پر باقی نہ رکھا، بلکہ اس کے حروف اور اوزان میں تبدیلی پیدا کر دی کہ وہ الفاظ عربی زبان سے ہم آہنگ اور اس زبان کے اصول و قواعد ان الفاظ پر نافذ ہو سکیں، اسی کو اصطلاح میں "تعریب" کہا جاتا ہے، چنانچہ جب کسی غیر عربی لفظ کی تعریب کر دی جاتی ہے تو وہ عربی الفاظ کی سی شکل وصورت اور اس کی خصوصیتوں کو اختیار کر لیتا ہے،

قرآن مجید میں جو غیر عربی الفاظ مستعمل ہیں، اور جو ماضی میں اختلاف کا سبب بنے ہیں وہ درحقیقت اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن زمانۂ جاہلیت میں انھیں عربی بنا لیا گیا تھا۔ اور جاہلی عرب انھیں استعمال کرتے لگے تھے، اور بعد میں قرآن میں بھی ان کا استعمال ہوا، اس بنیاد پر دونوں فریقوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا، اور دونوں نظریئے صحیح ہیں، چنانچہ جو لوگ قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے استعمال کے قائل تھے، ان کا نقطۂ نظر اس لیے صحیح تھا۔ کہ یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں، اور جو لوگ قرآن میں غیر عربی الفاظ کے استعمال کے خیال سے متفق نہ تھے ان کا نقطۂ نظر بھی غلط نہیں ہے، اس لیے کہ یہ الفاظ اُن کے نزدیک معرب اور قرآن مجید میں مستعمل ہونے کی وجہ سے عربی الفاظ بن گئے تھے،

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مسئلے میں بعض متقدمین نے اسی خیال کا اظہار کیا تھا، لیکن ان کی آواز اختلاف کے شور و غل میں دب کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ جدید تحقیقات نے اس خیال کی صداقت کو ثابت کر دیا۔

قرآن مجید کے معرب الفاظ، | قرآن مجید کے جن الفاظ کے بارہ میں متقدمین کا اختلاف تھا، ان میں سے اکثر کا انھوں نے ذکر کیا ہے، اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ وہ الفاظ کن کن زبانوں سے ماخوذ ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں ترتیب حروف کے

کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اسوقت جو علمار قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے استعمال کے قائل تھے، اور ان کی جو تعداد بیان کی تھی، وہ اس دور کی علمی انداز کی نہیں تھی اور انھوں نے اِن اصولوں کو جن کا بعد میں انکشاف ہوا پیش نظر نہیں رکھا تھا، کہ زبانوں میں بھی باہم رشتہ ہوتا ہے، اور تمام سامی زبانیں ایک ہی اصل سے نکلی ہوئی ہیں، اس جدید بنیادی اصول کو پیش نظر رکھ کر بعض محققین نے اس طرف توجہ کی ان میں رفائیل نخلہ کی کتاب غرائب اللغۃ العربیہ بڑی اہمیت رکھتی ہے، انھوں نے ان الفاظ کی پوری فہرست دی ہے جو غیر زبانوں سے عربی میں آگئے ہیں۔ ساتھ ہی اُن الفاظ کی اصل اور ان کے اصلی معانی کی وضاحت بھی کی ہے، کچھ الفاظ میں وہ قدیم علمار کی موافقت کرتے ہیں کہ وہ فلاں زبان سے ماخوذ ہیں، اور کچھ الفاظ کے بارہ میں متقدمین سے اختلاف کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ متقدمین کے منقولات کی بہ نسبت اُن کی تحقیق زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے کہ ان کی تحقیق سائنٹفک ہے اور متقدمین کی تحقیق کی بنیاد یا تو محدود علم پر ہے یا قیاس و تخمین پر۔

ذیل میں چند ایسے الفاظ لکھے جاتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے عجمی ہیں، اور قرآن شریف میں آئے ہیں،

فارسی الفاظ، (استبرق) معنی ریشمی کپڑے کے ہیں، [سجّیل] یہ لفظ دو لفظوں سنگ اور رگل سے مرکب ہے۔ سنگ کے معنی پتھر اور گل کے معنی مٹی کے ہیں، اس لفظ کا مفہوم مٹی کا پتھر ہوگا (ابریق) اس کی اصل آب ریز ہے، یعنی پانی بہانا، اسی سے "لوٹے" کے معنی پیدا ہوئے (زنجبیل) صاحب غرائب اللغۃ نے اس لفظ کو فارسی الاصل سمجھنے پر متقدمین سے اختلاف کیا ہے، وہ اس کو یونانی لفظ کہتے ہیں [سرادق] اس کی اصل سردار ہے دہلیز کے معنی ہیں، [کافور] اسے بھی صاحب غرائب اللغۃ نے یونانی لفظ کہا ہے [المسک] کے

معنی خوشبودار مادہ کے ہیں، [مقالید] کنجیوں کے معنی میں [سجل] طومار [دینار] سکہ

رومی الفاظ | دنیا کی زبانوں کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان میں اس نام کی کسی زبان کا ذکر نہیں ملتا جیسا کہ متقدمین نے ذکر کیا ہے، لیکن اس سے وہ یونانی یا لطینی مراد لیتے ہیں اور انھوں نے ان دونوں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں کیا ہے، اور ان الفاظ کو رومی زبان سے ماخوذ شمار کیا ہے، (صراط) راستہ کے معنیٰ ہیں، صاحب غرائب اللغۃ کے نزدیک صراط اصل کے اعتبار سے لاطینی ہے، اس کی اصل اسٹریٹ (Street) کشادہ راستہ کے معنی میں ہے، (فردوس) زائیل تخلہ نے اس لفظ کو یونانی بتایا ہے، جس کے معنیٰ جنت، نیک لوگوں کے ابدی ٹھکانہ کے آتے ہیں، متقدمین کا خیال ہے کہ رومی زبان میں یہ لفظ چمن کے معنی میں مستعمل ہے، (قسط) عدل، صاحب غرائب اللغۃ نے اس لفظ کو آرامی زبان کی طرف منسوب کیا ہے (قسطاس) میزان، لیکن صاحب غرائب نے اس لفظ کو لاطینی یا یونانی سے ماخوذ الفاظ کی فہرست میں ذکر نہیں کیا ہے (سندس) باریک ریشم، صاحب غرائب نے اس کو یونانی لفظ شمار کیا ہے (ابلیس) کو بھی انھوں نے یونانی لفظ بتایا ہے، جس کے معنیٰ جھوٹے اور چغلی کھانے والے کے ہیں۔

حبشی زبان کے الفاظ | متقدمین عرب نے بعض الفاظ کو حبشی زبان کا لفظ شمار کیا ہے، ان میں سے کچھ الفاظ قرآن میں بھی آئے ہیں، (ارائک) تخت (اواب) تسبیح پڑھنے والا (سینین) والتین والزیتون وطور سینین (مشکاۃ) فانوس [یٰسین] یا انسان کا مترادف [طٰہٰ] اے آدمی کے معنیٰ ہیں۔

صاحب الغرائب نے ان الفاظ کو معرب الفاظ کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے،

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان الفاظ کو عربی زبان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے (حوار بین) کو حبشی زبان کا لفظ قرار دیا ہے۔

عبرانی زبان کے الفاظ: | متقدمین علما نے قرآن کے بہت سے الفاظ کو عبرانی زبان کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اس باب میں ان کا خیال پورے طور پر قابل اعتماد نہیں ہے، اس لیے کہ عربی اور عبرانی دونوں سامی زبان کی شاخیں ہیں، اور چند الفاظ دونوں زبانوں میں مشترک طور پر مستعمل ہو سکتے ہیں، اس لیے مشابہت عبرانی اور عربی دونوں زبانوں سے ہوسکتی ہے۔ اس لیے اگر عربی زبان میں کچھ ایسے الفاظ مستعمل ہیں جو عبرانی زبان سے مشابہت رکھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ عبرانی زبان سے ماخوذ ہیں اس کے باوجود چند الفاظ ایسے ہیں جو عبرانی زبان سے متعلق ہیں، اور قرآن مجید میں مستعمل ہیں، اسرائیل، ابراہیم، توراۃ، اور اسباط وغیرہ۔ لفظ (جہنم) کے بارے میں متقدمین کے درمیان اختلاف رہا ہے، کسی نے اس کو فارسی زبان کا لفظ قرار دیا ہے، اور کسی نے عبرانی۔ صاحب غرائب اللغۃ نے آخر الذکر خیال کو ترجیح دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جہنم "وادی حنم" کے مترادف ہے، جو درحقیقت یروشلیم کے جنوب کی ایک وادی ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ان بچوں کو نذر آتش کیا جاتا تھا، جنھیں مومنین اپنے دیوتا پر قربان کرتے تھے، رفائیل نخلہ صاحب غرائب اللغۃ نے لفظ شیطان کو بھی، عبرانی الاصل قرار دیا ہے، جس کے معنی دشمن اور شکایت کرنے والے کے ہیں۔

آرامی زبان کے الفاظ: | قدیم اہل لغت نے آرامی زبان کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ بعض الفاظ کو سریانی اور بعض کو نبطی زبان سے منسوب کیا ہے، جب کہ یہ دونوں زبانیں آرامی

زبان کی شاخ ہیں، صاحب اعرائب اللغۃ نے ایسے بہت سے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اصلاً آرامی زبان کے ہیں، ان میں چند قرآنی الفاظ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

ومقر، آگ سے جلانا (عدن) فردوس ارضی، (طاغوت) آرامی زبان میں اس لفظ کو بت، شیطان وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، متقدمین کا خیال ہے کہ یہ لفظ حبشی زبان کا ہے، جس کے معنیٰ کاہن ہیں، (ملکوت) ملک۔ اقتدار (طوبیٰ) سعادت (طور) پہاڑ۔ قدماء کے خیال میں یہ لفظ سریانی زبان میں پہاڑ کے لیے مستعمل ہے، (یم) سمندر، متقدمین کے خیال میں یہ لفظ بھی سریانی زبان میں سمندر کے لیے مستعمل ہے۔

متقدمین نے بھی مختلف زبانوں کے قرآنی الفاظ کا ذکر۔۔۔۔ اور یہاں تک اہتمام کیا تھا کہ ان کو سہولت حفظ کے لئے نظم کر دیا، علامہ سیوطی نے اپنی تصنیف "الاتقان فی علوم القرآن" میں ان اشعار کا ذکر کیا ہے جن میں ان الفاظ کو جمع کر دیا گیا ہے، ذیل میں قاضی تاج الدین بن السبکی کے چند اشعار کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

السلسبیل و طٰہٰ، کورت بیع	روم وطوبیٰ وسجیل وکافور
والزنجبیل ومشکاۃ سرادق مع	استبرق وصلوات، سندس طور
کذا قراطیس، ربانیہم وکذا	غساق دینار، والقسطاس مشہور
کذاک، قسورۃ والیم ناشئۃ	ویؤت کفلین مذکور ومسطور
لہ مقالید فردوس یعد کذا	فیما حکی ابن درید منہ تنور

عربی زبان پر ان عجمی الفاظ کے اثرات، | یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربی زبان کا دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنایا گیا، عربی زبان کے لیے مضر ہے، اور قرآن مجید میں جو غیر عربی الفاظ مستعمل ہیں تو کیا اس سے قرآن کے اعجاز اور بلاغت میں کمی

پیدا ہوتی ہے،

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے زبان کی اثر اندازی اور اثر پذیری ایک طبعی قاعدہ اور اصول ہے، ایسی حالت میں پھر عربی زبان اس قاعدہ سے کیونکر مستثنیٰ ہوسکتی ہے، اس لئے اس نے بھی دیگر زبانوں کا اثر قبول کیا ہے، اور دوسری زبانوں پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے، موجودہ دور میں کسی زبان کے لیے یہ چیز امتیازی خصوصیت شمار کی جاتی ہے، کہ وہ زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ صلاحیت اس زبان کی زندگی اور وسعت کا ثبوت ہوتی ہے، پھر بھی جب عربی زبان کے عجمی الفاظ کا ان عربی الفاظ سے موازنہ کیا جاتا ہے جو دوسری زبانوں میں داخل ہوگئے ہیں تو ان کے مقابلہ میں عربی زبان کے عجمی الفاظ کی تعداد بہت کم نظر آتی ہے، چنانچہ دوسری زبانوں پر عربی زبان کی اثر اندازی یونانی اور لاطینی زبانوں کی اثر اندازی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے، حالانکہ یہ دونوں زبانیں عربی زبان سے زیادہ قدیم ہیں رفائیل نخلہ الیسوعی صاحب غرائب اللغۃ العربیہ کے خیال میں عربی زبان نے دنیا کی الگ بھگ سو زبانوں پر اپنا اثر ڈالا ہے، انھوں نے ایسے ایک سو پانچ عربی الفاظ کی فہرست دی ہے، جن میں سے بیشتر الفاظ نے یورپی زبانوں میں جگہ حاصل کی ہے،

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے اس کی بلاغت اور اعجاز میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس سے اس کے اعجاز اور بلاغت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اور اضافہ ہوتا ہے، اس لئے کہ ان الفاظ سے ایسے معنوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جن سے عربوں کو عام واقفیت نہیں تھی، جس کی وجہ سے ایک ابہام اور معنویت پیدا ہوجاتی تھی، جو پرکشش ہوتی تھی، اور مخاطب کو اس کے متعلق مزید طلب

جستجو پر آمادہ کرتی تھی، اس سے قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے ایک لطیف ایجاز پیدا ہو جاتا ہے۔

متقدمین کے ہاں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے، چنانچہ علامہ سیوطی نے لفظ "استبرق" کے بارے میں جوینی کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ اگر پوری دنیا کے فصحاء متحدہ طور پر اس لفظ کو ترک کر کے کوئی ایسا لفظ لانا چاہیں جو فصاحت میں اس لفظ کے متبادل ہو تو وہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ ریشم کے کپڑوں کے بارے میں عربوں کو ایرانیوں سے علم حاصل ہوا تھا، اور عربوں کے یہاں یہ کپڑے کم مستعمل تھے اس لیے اس لفظ کا استعمال بھی کم ہوتا تھا، لیکن یہ لفظ ایک خاص معنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس سے عربوں میں وہ اثر پیدا ہوا جو کسی دوسرے لفظ کے استعمال سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے قرآن کے یہ عجمی الفاظ اس کی لسانی عظمت کا مظہر اور قرآنی بلاغت کے اچھوتے پن کا ثبوت ہیں۔

استدراک

بسلسلۂ مضمون "آیۂ واورثناہا بنی اسرائیل" پر ایک نظر

از مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی

رسالۂ معارف جلد ۱۲۳ عدد ۴، ۵ و ۶ میں میرا جو مضمون عنوان بالا سے تین قسطوں میں شائع ہوا ہے، اس کی اشاعت کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کے سلسلہ میں سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کے وقت ایک جدید بات ذہن میں آئی جس کو بطور "استدراک" پیش کیا جاتا ہے، اس کو پڑھتے وقت ناظرین معارف دسمبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۶۴ کو پیش نظر رکھیں۔

"سامری" والے واقعہ میں اگر "الرسول" سے حضرت موسیٰؑ مراد ہوں جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے (غالباً ابومسلم اصفہانی کی ہمنوائی میں) تحریر فرمایا ہے، تو اس صورت میں "سامری" والے واقعہ میں "اوزارا من زینۃ القوم" اور "قبضۃ" اور "اثر" اور "نبذ" کے متعلق مولانا آزاد مرحوم کی تاویل سے یہ تاویل بہتر معلوم ہوتی ہے کہ قوم موسیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے جو یہ کہا تھا کہ "حملنا اوزارا من زینۃ القوم" میں "حملنا اوزارا من زینۃ القوم" سے مراد "زیورات وغیرہ کا جو بوجھ ہم پر تھا" نہ ہو، جو یہودی روایتوں کے لحاظ سے غصب اور بدمعاملگی کے سلسلہ میں قوم موسیٰ کے پاس تھے، اور بقول مولانا آزاد مرحوم مصریوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل جن بھاری بھاری زیورات کے استعمال کے عادی ہو چکے تھے، ان کا بوجھ، بلکہ زیب و زینت والے لباس کے گٹھر مراد ہوں جو بنی اسرائیل اپنے روزمرہ کے استعمال کے علاوہ پہنا کرتے تھے۔

دان ہی کپڑوں کے ساتھ بستر، عورتوں کے استعمال کے کپڑے وغیرہ اور غالباً چھوٹی سفری جھولداریاں بھی ہونگی) جن کا گٹھر چلتے وقت ان کے سروں پر تھا، منزل مقصود پر پہنچکر ان گٹھڑوں کو اپنے سروں سے اتار کر زمین پر ڈال دیا تھا، جس کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے۔

حملنا اوزارا من زینۃ القوم فقذفنٰھا

"سامری" جو گٹھر اٹھائے ہوئے تھا، اس نے بھی اس کو اپنے سر سے اتار کر زمین پر ڈالدیا تھا،

فکذٰلک القی السامری"

مگر اس نے اپنے گٹھر سے ایک بولتے ہوئے بچھڑے کی مورت بھی نکالی (جو غالباً وہ اپنے ساتھ مصر سے لایا ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "فاخرج لھم عجلا جسدا لہ خوار"۔

اس کو دیکھکر بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے کہ یہی تمہارا اور موسٰی کا "الٰہ" ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "فقالوا ھٰذا الٰھکم والٰہ موسٰی"

اور حضرت موسٰیؑ نے اپنی واپسی پر جب "سامری" سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے (گویا خود ان ہی پر الزام عائد کرتے ہوئے) کہا کہ "الرسول" (یہ تشریح مولانا آزاد مرحوم "خود حضرت موسٰیؑ") کا جو سامان پیچھے رہ گیا تھا اور اٹھایا نہیں گیا تھا، لوگوں کی نظر اس پر نہیں پڑتی تھی، مگر میری نظر پڑ گئی تھی، اس لیے اس کو اپنے سامان کے ساتھ رکھ لیا تھا، اور اسی کے ساتھ زمین ڈال دیا تھا،" (یعنی "الرسول" کے سامان میں جب میں نے اس بچھڑے کی مورتی کو پایا جو بولتی ہوئی تھی، تو میں یہی سمجھا کہ یہی "موسٰی" کا الٰہ ہے، اور یہی لوگوں نے کہہ دیا،

قرآن مجید میں اس پورے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے "سامری" کا یہ قول غالباً نقل کیا گیا ہے:

"وکذٰلک سولت لی نفسی"

اور حضرت موسٰیؑ کی غیبت میں ان کے واپس آنے کے پہلے ہی اس نے حضرت ہارونؑ

سے کیا ہوگا جس سے وہ حیرت میں پڑ گئے ہوں گے اور (انما فتنتم بہ (تم لوگ اس کے ذریعہ ایک فتنہ اور آزمائش میں مبتلا ہوگئے) کہہ کر محض "الہٰ" ہونے کی تردید پر انھوں نے اکتفا فرمائی ہو، اور ارشاد فرمایا ہو کہ اسے بکنے دو، میری پیروی کرو تمھارا پروردگار "الرحمٰن" ہے۔ (حضرت ہارونؑ نے اصل واقعہ کی تردید نہیں کی، کیونکہ ان کے سامنے تصدیق یا تکذیب کی کوئی دلیل نہ تھی، غالباً اسی لیے یہودی روایتوں میں حضرت ہارونؑ کو بھی اس واقعہ میں ملوث کیا گیا ہے، جو واقعہ کے بالکل خلاف تھا) قوم موسیٰ نے حضرت ہارونؑ کے ارشاد کا کوئی لحاظ نہیں کیا اور کہنے لگے کہ موسیٰ کے لوٹ آنے تک ہم اسی پر جمے اور اسی کی نمستکاری میں معروف رہیں گے،

سورۂ طٰہٰ میں حضرت ہارونؑ والا واقعہ یوں بیان ہوا ہے:

ولقد قال لهم هارون من	اور حضرت موسیٰ کے واپس آنے کے پہلے
قبل يقوم انما فتنتم به وان	بھی ہارون نے کہا تھا کہ اے لوگو! تم لوگ
ربكم الرحمن فاتبعوني واطيعوا	ایک فتنہ میں مبتلا کیے گئے ہو، یقیناً تمھارا
امري قالوا لن نبرح عليه عاكفين	پروردگار تو الرحمٰن ہے، میری پیروی کرو
حتى يرجع الينا موسى	اور میرا کہا مانو، بنی اسرائیل نے جواب دیا
	کہ ہم لوگ تو اسی پر بھروسہ کرکے رہیں گے،
(طٰہٰ)	یہاں تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس آجائیں

حضرت موسیٰؑ نے اپنی واپسی پر حضرت ہارونؑ کو ڈانٹا اور فرمایا ہارون جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں تو ان کو کیوں نہیں روکا، کیا میرا طریقہ چھوڑ دیا اور میرے احکام نظر انداز کر دیے، حضرت ہارونؑ نے جواب دیا کہ اے میرے ماں جائی بھائی میرا عذر تو سن لیجیے: مجھے خوف دامنگیر ہوا کہ آپ کہیں الٹا مجھ پر الزام عائد نہ کریں کہ تم نے بنی اسرائیل

کے درمیان پھوٹ ڈلوادی، اور میرے قول کا (فیصلہ کا) انتظار نہ کیا، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے:

"قال یا ھٰرون ما منعک اذ رأیتھم ضلوا الا تتبعن افعصیت

امری قال یا بنؤم لا تاخذ بلحیتی ولا براسی انی خشیت ان تقول

فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی۔"

اس کے بعد جب "سامری" سے حضرت موسیٰؑ نے پوچھ گچھ کی تو غالباً اس نے خود حضرت موسیٰؑ پر الزام عائد کرنا چاہا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ میرا کیا قصور، میری نظر "الرسول" کے پیچھے رہ جانے والے سامان پر پڑی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی، تو میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا تھا، میرا اپنے بوجھ کو زمین پر ڈالتے وقت اسے بھی زمین پر ڈال دیا تھا (اسی سے بچھڑے کی یہ بولتی ہوئی مورت نکلی) اس کے علاوہ کوئی صورت میری سمجھ میں نہیں آئی کہ بنی اسرائیل اور موسیٰؑ کا "الٰہ" یہی ہے (لوگوں نے بھی اس مورتی کو (اس طرح سامان سے نکلتا دیکھ کر) کہنا شروع کیا کہ تم سب کا اور موسیٰ کا "الٰہ" یہی ہے)

"قال بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول

فنبذتھا وکذالک سولت لی نفسی"

حضرت موسیٰؑ اس کا یہ فریب اور جھوٹ سن کر غضبناک ہوگئے اور فرمایا میرے سامنے سے دور ہو جا اور چھوت کی زندگی بسر کر، دیکھ میں تیرے اس "الٰہ" کی کیا گت بناتا ہوں، اسے جلا ڈالوں گا اور پھر اس کی خاک پانی میں بہا دوں گا۔

"قال فاذھب فان لک فی الحیٰوۃ ان تقول لا مساس الخ"

اس تاویل کی بنیاد اس پر ہے کہ (۱) قوم موسیٰ کے قول "فکذالک القی السامری" میں جس "القاء" کا ذکر ہے، یہی "القاء" سامری کے قول "فنبذتھا" سے مراد ہے، یعنی اس نے بھی

"القاء" کا اقرار کیا، (مگر بچھڑے والی مورتی کے متعلق گویا یہ کہہ دیا کہ یہ "الرسول" کے سامان میں تھی، (۲) "اثر الرسول" سے خاکپائے رسول (جیسا کہ یہودی روایتوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے) یا احکام رسول (جیسا کہ مولانا آزاد مرحوم کے کلام میں ہے) مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد "الرسول" کا وہ سامان تھا جو پیچھے رہ گیا تھا، اور جس پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی، ("اثر" کا یہ مفہوم اس کی لغوی تشریح سے نکل سکتا ہے)۔ (۳) "زینۃ" سے مراد وہ لباس ہے جو زیب و زینت کے لیے استعمال ہوتا ہے (مثلاً جبہ، چغہ، لبادہ اور گون وغیرہ) یا مطلقاً لباس، قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال ان معنیٰ میں ہوا ہے، سورۂ اعراف میں لباس کی نعمت کا ذکر ان الفاظ میں ہے

یٰبنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا	اے اولاد آدم ہم نے تمھارے لیے ایسا لباس
یواری سوءٰتکم وریشاو	مہیا کر دیا جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور جو
لباس التقویٰ ذالک خیر	زیب و زینت کا ذریعہ ہے، اور پرہیزگاری کا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لباس کے دو فائدے ہیں، ایک فائدہ ستر پوشی، دوسرا زیب و زینت، اسی سورۃ میں آگے ارشاد ہوتا ہے:-

یٰبنی آدم خذوا زینتکم عند	اے اولاد آدم تم ہر عبادت پر اپنے جسم
کل مسجد (اعراف)	کو آراستہ کیا کرو،

اس آیت میں "زینۃ" کی تشریح "لباس" سے بھی کی گئی ہے، اور غالباً اسی آیت کے ماتحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برہنہ ہو کر طواف کعبہ کو منع فرمایا ہوگا۔

پھر اسی سورہ میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

قل من حرم زینۃ اللہ التی	اے پیغمبر فرما دیجئے کہ خدا کی (پیدا کی ہوئی)

اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق (اعراف) — زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کیلئے مہیا کی ہیں اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟

اس آیت میں برہنہ رہنے کے تقدس اور لباس اور زیب و زینت کے اور حلال و لذیذ کھانوں کے استعمال کے خدا پرستی اور اظہار بندگی اور تقدس کے منافی سمجھے جانے کے عقیدہ کی تردید فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ان چیزوں کو بعض طبقوں میں تقدس کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ اور آج بھی سادھوؤں کے ایک طبقہ میں برہنگی کو خاص قسم کی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا مظاہرہ ایک الکشن کے دوران میں "ننگے رہنے والے سادھوؤں کے ایک جلوس کی شکل میں" ہوا تھا، اور رومن کیتھلک فرقہ کے پادری اچھے اور لذیذ کھانوں اور زیب و زینت والے لباس سے پرہیز کو تقدس کا شعار سمجھتے اور اس سے پرہیز کرتے تھے، اور اب بھی کسی حد تک اس کا اثر باقی ہے،

بہرحال مذکورۂ بالا آیات پر نظر ڈالتے ہوئے "سامری" والے واقعہ میں اگر "زینۃ" کے لفظ کو مطلق لباس کے مفہوم میں یا زیب و زینت والے لباس کے مفہوم میں لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا،

اسی نہج پر (اگرچہ بے محل گفتگو ہے) سورۂ نور کی حجاب والی آیت "ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا الخ" میں "زینۃ" سے مطلق لباس یا زیب و زینت والا لباس مراد لیا جا سکتا ہے، یعنی مستثنیٰ کیے ہوئے اشخاص (باپ، بھائی، شوہر وغیرہ) کے سوا کسی شخص کے سامنے عورتوں کو اپنے لباس کا جس سے ان کی ستر پوشی اور زیب و زینت ہوتی ہے (یا ری سوز ٹکم ورئیشا) "ابداء" نہ کرنا چاہئے، بجز اس لباس کے کہ جو اوپر رہتا ہے، مثلاً اوڑھنی جو سر چھپانے کے لیے ہوتی ہے، اور جس کے بارے میں قرآنی حکم ہے کہ اپنے گریبانوں پر بھی ڈال لیا کریں (ولیضربن بخمرھن علی

چھوبھن) اور وہ چادر جو زینت والے کپڑوں کے اوپر کبھی سر سے اور کبھی کندھوں سے گھوپا مارکر اوڑھی جاتی ہے، جس سے زیب و زینت والے کپڑے اور بدن کے خطوط اتار چڑھاؤ چھپ جاتے ہیں، یا لمبا کورٹ یا گون یا کندھوں سے اوڑھنے والے برقعے وغیرہ کہ ان کا "ابداء" تو ہوا ہی کرتا ہے اور ہوگا،

اور جب عورتوں کا اصل لباس جس سے ستر پوشی اور زیب و زینت ہوتی ہے، اجنبی لوگوں کے سامنے نہ ہوگا تو "محلِ زینت" بدرجۂ اولیٰ نظروں کے سامنے نہ ہوگا، غالباً اسی نکتہ کے پیش نظر بعض علماء نے "زینۃ" کو "محلِ زینۃ" پر محمول کیا ہے، ورنہ اگر واقعۃً "زینۃ" سے "محل زینۃ" ہی مراد ہو تو لازم آتا ہے کہ ہر "محل زینۃ" کا "ابداء" مستثنیٰ اشخاص کے روبرو ہو سکتا ہے جس کا امت میں کوئی بھی قائل نہیں، مستثنیٰ اشخاص میں صرف شوہر ہی ایسا ہے کہ جس کے روبرو ہر "محل زینۃ" کا "ابداء" ہو سکتا ہے،

رہا ہاتھ اور منھ کا کھلا رہنا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ عام عادت کے لحاظ سے چہرہ اور کفِ دست پر لباس ہوتا ہی نہیں، اور ضرورت بھی ان کے "ابداء" کی ہوتی ہے، اسی لیے احادیث میں ان کے "ابداء" کا جواز ملتا ہے، اور فقہاء نے اس سے بطور قیاس قدموں کے بھی کھلے رہنے کا جواز کا حکم نکال دیا،

اور آخر آیۃ "ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن" جس میں زمین پر پیروں کے دھمکنے کی ممانعت کی گئی ہے، اس سے اجنبی لوگوں کے سامنے ناچنے اور رقص کی ممانعت نکالی گئی ہے کہ ناچ اور رقص میں چھپائی جانے والی چیزوں کا لوگوں کے سامنے "ابداء" ہی مقصود ہوتا ہے،

مولانا آزاد مرحوم اور ابو مسلم اصفہانی کا "سامری" والے قصہ میں "الرسول" سے جبرئیل

حضرت موسیٰؑ کو مراد لینا بظاہر بلاغت قرآنی کے خلاف نظر آتا ہے کہ بلا ضرورت مخاطب کو غائبانہ الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔ صنعت التفات کا کوئی موقع نہیں، اس سے تو بہتر ہے کہ "الرسول" سے حضرت موسیٰؑ کا خاص قاصد مراد لیا جائے، جو لوگوں اور ان کا [illegible] اسباب سمیٹنے اور سفر پر آمادہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو، اور اسی قاصد کے اس اسباب کو جو اٹھانے سے رہ گیا تھا جس پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی، "سامری" کی نظر پڑ گئی تھی، اس لیے اس کو اٹھا لیا ہو، اور اپنے گٹھر کو زمین پر ڈالتے وقت قاصد کے اسباب کو بھی زمین پر ڈالا ہو اور اسی میں سے بچھڑے کی بولتی ہوئی مورتی (جسے وہ مصر سے چھپا کر لایا تھا) نکال کر بنی اسرائیل کو دکھائی ہو، اور اسکی اہمیت اس لیے ہو گئی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے قاصد ہی کے اسباب میں سے نکلی تھی، بقیہ وہی واقعہ جس کا ذکر اوپر "الرسول" سے حضرت موسیٰؑ کو مراد لیے جانے کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

کچھ پرانی یادیں

از جناب مدن مراری لال صاحب سکسینہ بی اے۔ ایل ایل بی

اب ایسے ہندو اصحاب بہت کم رہ گئے ہیں جن سے پرانی مشترک تہذیب کی یاد تازہ ہو، کایستھوں اور کشمیری پنڈتوں میں اسکی کچھ یادگاریں باقی ہیں، مضمون نگار دہلی میں ہیں، انکا یہ مضمون گو کایستھوں کے رسم و رواج پر ہے، لیکن اس میں پرانے نقوش کی جھلک ہے اسلیے اس کو ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جاتا ہے، اس مضمون کے ساتھ انھوں نے جو خط بھیجا ہے اس کو بھی شائع کیا جاتا ہے، اس سے ان کے خاندان کی علم دوستی کا اندازہ ہوگا۔

"م"

---

۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء

مکرمی! تسلیم

اس خط کے ساتھ کئی چیزیں بھیج رہا ہوں،

(۱) رباعیات عمر خیام کے ایک قدیم ترین نسخے کے پہلے صفحے کا فوٹو۔ یہ نسخہ میرے والد کے پاس تھا اور اب نیشنل میوزیم نئی دلی میں ہے، اس نسخے کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کتاب خیام مطبوعہ ۱۹۳۳ء مطبع معارف اعظم گڈھ میں صفحہ ۲۲۷ پر کیا ہے، مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں مولانا ایک بار ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں غریب خانہ پر بھی تشریف لائے تھے، اس نسخے کی تمام رباعیات کی نقل میرے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے، اگر کوئی صاحب عمر خیام پر کچھ کام کر رہے ہوں تو مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

(۲) جہاں آرا بیگم کی بیاض پر میرے والد کا ایک مطبوعہ مضمون جو انھوں نے ہندی میں ترجمہ کر کے

(باقی ص ۲۳۴ پر)

پرانی یادوں کے دماغ میں کچھ خانے ہیں، اس مضمون میں صرف اس خانے کو کھول رہا ہوں جن میں چالیس پچاس برس پہلے کی وہ یادیں محفوظ ہیں جو لکھنؤ کے کایستھ گھرانوں میں اردو اور فارسی زبان کے ذوق کا خاکہ پیش کرتی ہیں۔

(بقیہ ص ۲۲۱) کلاندھی میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا، یہ نسخہ بھی میرے والد کے پاس تھا، اور اب بھارت کلا بھون یونیورسٹی بنارس میں ہے، اس کے اندر کے ایک صفحے کا فوٹو بھی میں نے مضمون کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے، اس نسخے کی نقل میرے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے، اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کام کر رہے ہوں تو مجھ سے رابطہ قائم کریں۔

(۳) رسالہ در علم ساعات کے ایک بہت ہی قدیم نسخے کے دو صفحوں کا فوٹو۔ یہ نسخہ میرے والد کے پاس تھا، اور اب نیشنل میوزیم نئی دلی میں ہے، یہ مختصر رسالہ جرمنی زبان میں شائع ہو چکا ہے، اور میں نے اس کو ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کے پاس الہ آباد میں دیکھا تھا، انگریزی اور اردو میں غالباً اس کا کہیں ذکر بھی آیا ہے، آپ نیشنل میوزیم سے خط و کتابت کر کے یہ رسالہ معارف میں چھاپ سکتے ہیں۔

(۴) ایک مضمون "کچھ پرانی یادیں" معارف میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں، اگر یہ آپ کے مذاق کا نہ ہو تو مہربانی کر کے اس کو واپس کر دیجیے۔

(۵) کتاب المجسطی کے سرورق کا فوٹو۔ یہ نایاب نسخہ جس کے سرورق پر شاہجہانی عہد کے ایک باکمال مصور نے محقق طوسی کی ایک رنگین تصویر بنائی ہے، میرے والد کے پاس تھا، اور اب بھارت کلا بھون بنارس میں ہے۔

اگر شبلی اکیڈمی کے اغراض و مقاصد اور گذشتہ سرگرمیوں کی رپورٹ شائع ہوئی ہو تو اسکی ایک کاپی مجھے آپ بھجوا دیں، ممنون ہوگا۔ معارف کی تازہ ترین اشاعت کی ایک کاپی بھی آپ عنایت کریں۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں۔

نیازمند

مدن مراری لال

میری پیدائش ایک ایسے ہی کایستھوں کے خاندان میں ہوئی جہاں لڑکے شروع سے ہی اردو اور فارسی پڑھتے تھے اور لڑکیاں ہندی، لیکن جو زبان گھر میں سبھی بولتے تھے وہ اردو نہیں تو اردو سے قریب تر ضرور تھی، اردو رسم الخط سے بہت کم عورتیں واقف تھیں، چنانچہ میرے خاندان بھر میں میری صرف دادی تھیں جو اردو لکھ سکتی تھیں، اور تختی پر نقطے رکھ کر ابجد لکھنا مجھے انہی نے سکھایا تھا،

میری ماں اردو لکھ پڑھ نہ سکتی تھیں، مگر ان کو شیخ سعدی کی وہ مشہور مناجات پوری یاد تھی، جو کریما بہ بخشائے بر حال ما، کہ ہستم اسیر کمند ہوا سے شروع ہوتی ہے، کیونکہ میں ان کی پہلی اولاد تھا، اور جب گھر پر میرے دادا صاحب منشی کاشی پرشاد مجھے فارسی پڑھانے بیٹھتے تھے تو وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہتی تھیں۔

بعض گھرانوں میں جس دن سے بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا، ایک رسم منائی جاتی تھی جسکو مکتب یا بسم اللہ کہتے تھے، آج بھی یہ رسم منائی جاتی ہے، مگر اب اس کو ودیا آرمبھ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لڑکوں کو پانچ چھ برس کے سن ہی سے اردو اور کچھ عرصہ کے بعد فارسی پڑھانا شروع کر دیتے تھے، فارسی پڑھنا تو بہت ہی آسان تھا، چند اوراق کی ایک کتاب آتی تھی جس کا نام تھا آمد نامہ، اس کو تھوڑا سمجھا اور زیادہ رٹا، بس آگئی فارسی، اسکے بعد کریما، گلستاں اور بوستاں پڑھنے لگے،

لڑکے جوان ہوتے اور ان کی شادی کی بات چیت شروع ہوتی تو ایک نئی ضرورت یہ پیدا ہوتی کہ وہ کچھ کام چلاؤ قسم کی ہندی لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیں، ورنہ بیوی سے خط و کتابت ناممکن ہو جاتی، ہندی لکھنا پڑھنا فارسی سے بھی آسان تھا، کیونکہ اس میں تو بس کا کھا، گا، گھا وغیرہ لکھنا سیکھ لیا اور بن گئے ہندی داں، زبان اپنی وہی اردو۔ بس خط کی جگہ تبر،

خوشی کی جگہ پرسنتا، غم اور افسوس کی جگہ دکھ اور کھید، جواب کی جگہ اتر، جلدی کی جگہ شیگھر، اور جان من کی جگہ پر پران پیاری لکھ دیا ہوگئی ہندی، اردو کو ہندی بنانے کا یہ سہل نسخہ بہت سے کایستھ نوجوان جانتے تھے ۔

سرکاری زبان انگریزی تھی، اس لیے سب ہی کایستھ انگریزی بھی پڑھ رہے تھے، اس طرح تین زبانیں نہ سہی تین رسم الخطوں سے ہر پڑھا لکھا کایستھ واقف ہوتا تھا، اسی سلسلے میں ایک رسم یاد آ رہی ہے، اس کا نام تھا دیکھا بھالی ۔ شادی سے چند روز قبل ایک رسم ہوتی تھی تلک کی، جواب بھی ہوتی ہے مگر تلک سے بھی قبل ایک رسم ہوتی تھی جس میں لڑکی کے گھر سے چند لڑکے ہونے والے دولھا کو دیکھنے آتے تھے، اس رسم کا نام تھا دیکھا بھالی، جس روز تلک ہوتا، یعنی لڑکے کی پیشانی پر ٹیکا یا قشقہ لگایا جاتا اسی دن دوپہر کو لڑکی کے گھر والے کچھ بچوں کو ایک پنڈت کے ساتھ بھیجتے، لڑکا نہایت تہذیب کے ساتھ ان بچوں کے پاس آکر بیٹھتا، اور ایک وصلی پر کچھ تحریر کرکے ان کو دیدیتا، جس کو وہ بڑی خوشی اور احتیاط سے اپنے گھر لیجا کر سب کو دکھاتا، اس رسم کے لیے سادی اور کامدار وصلیاں بازار میں بکتی تھیں، یہ رسم ہمارے خاندان سے چالیس برس ہوئے اٹھ گئی لیکن اس کی ایک بڑی خوبصورت یادگار ہمارے پاس محفوظ ہے، وہ ہے وہ وصلی جو ہمارے والد مرحوم بابو گورن پرشاد سلیبؔ نے اپنی دیکھا بھالی کے موقع پر ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء کو لکھی تھی، والد صاحب کا سن اس وقت اٹھارہ برس کا تھا، چونکہ خوشنویسی اور مصوری کا ان کو بڑا شوق تھا، اس لیے جس وصلی پر انھوں نے اپنی تحریر لکھی اس کے حاشیے پر طلائی نقش و نگار بنے ہیں، تحریر اس طرح ہے:

سری گنیش آیہ　　(ہندی رسم الخط میں)

پھر جلی نستعلیق میں فارسی کی یہ رباعی ہے :-

اے مہر سپہر سرفرازی وے مایۂ بحر بے نیازی

دارم زعنایت تو امید کز فضل و کرم ولم نوازی

آخر میں نیچے اپنا نام گوری پرشاد اور تاریخ ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء انگریزی رسم الخط میں لکھا ہے۔ اس خوبصورت قطعہ کو میرے نانا صاحب نے فریم کرا کے اپنے کمرے میں لگا رکھا تھا، ساٹھ برس ان کے کمرے کی زینت رہا، ان کے انتقال کے بعد میں لے آیا اور اب میرے کمرے میں خاموش دیوار پر آویزاں ہے۔ خاموش اس لیے کہا کہ اب میرے خاندان میں اس کو پڑھنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

دولہا میاں کی قابلیت کا امتحان دیکھا بھالی پر ختم نہ ہو جاتا تھا۔ ایک رسم اور ہوتی تھی۔ شادی ہو جانے کے بعد دوسرے دن۔ اس کو کلیوا کہتے تھے۔ کلیوا میں شام کے وقت دولہا اپنے سے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ سسرال پہنچتا تھا۔ اور گھر کے اندر اس کو بلا لیا جاتا تھا۔ اس سے پردہ کوئی نہ کرتا تھا۔ تمام عورتیں اس کو گھیر کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور وہ بڑے اصرار کے بعد دو ایک شعر سناتا تھا۔ جس کے لیے اس کو لڑکی کے والدین یا دوسرے افراد نذرانہ دیتے تھے۔ اس کے ساتھ جو لڑکے آتے تھے وہ بھی غزلیں سناتے تھے۔ اس کے جواب میں لڑکی کے گھر والے لڑکے بھی خوب خوب غزلیں پڑھتے تھے۔ ایک ایسی ہی غزل بازی کے موقع پر ایک لڑکے نے محض اپنی یادداشت سے پوری ایک فارسی کی غزل سنائی تھی جس کا ایک شعر مجھے ابتک یاد ہے۔ شعر تھا :

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس موقع پر غزلیں ایک مخصوص لحن کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں اور تلفظ کی صحت کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، اس زمانے لوگ کھاتے پیتے کا یستھوں میں ایک فقرہ اکثر سننے میں آتا تھا کہ "شراب نہیں پیوگے اور قلیہ نہیں کھاؤگے" تو زبان کا شین قاف کیسے درست ہوگا، ایک وہ زمانہ تھا اور ایک یہ زمانہ آیا ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ جو لکھتے وقت تو قاف اور کاف میں فرق کرتے ہیں مگر بولتے وقت قاف کی آواز کو کاف سے ادا کرتے ہیں، معلوم نہیں یہ ہندی کے سیلاب کا اثر ہے یا پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کا کرم ہے[1]،

شادی کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ شادی کے لیے آجکل کے جیسے دعوت نامے نہیں جاتے تھے، بلکہ ایک لمبی فہرست عزیزوں کی تیار کی جاتی تھی جس کو بند کہتے تھے، خاندان کے نائی باری اس بند کو گھر گھر لیجاتے تھے، اور ناموں پر صاد کروا لیتے تھے، کوئی دستخط کے بجائے صرف ۴ بنا دیتا تھا، اس بند کے اوپر کی عبارت اردو آمیز فارسی میں ہوتی تھی، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں میری ایک بہن کی شادی میں جو بند لکھا گیا تھا، اس کی عبارت تھی

"بروز مبارک ۲۴ جون ۱۹۳۵ء یوم سوموار مطابق اساڑھ بدی اشٹمی شادی دختر نیک اختر این خاکسار قرار یافتہ۔ بارات از خانہ .... ساکن ....
بوقت ۹ بجے شب خواہد آمد۔ دعوت بھات بتاریخ ۲۵ جون ۳۵ء و دعوت پڑھار بتاریخ ۲۶ جون ۱۹۳۵ء بوقت ۹ بجے شب قرار یافتہ۔ متوقع کہ جمیع اصحاب مع برادران و برخورداران شریک دعوت شدہ بندہ را ممنون منت سازند"

یہ عبارت تو بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھی گئی تھی، مجھے یاد ہے کہ بعض حضرات بند کی عبارت میں بڑی انشا پردازی دکھاتے تھے، افسوس ہے کہ اس عبارت کا میرے پاس

---

[1] معارف تنہا قاف پر موقوف نہیں بلکہ ش، ن اور ز وغیرہ کا بھی یہی حال ہے، اور اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہمارا ہندی کا تلفظ یہی ہے، اس لیے یہ پنجابیوں کا کرم نہیں بلکہ ہندی کے سیلاب کا اثر ہے۔

کوئی نمونہ محفوظ نہیں ہے۔

بند کا کام ختم ہوتا تو پھر ایک فہرست اس سامان کی بنتی جو لڑکی کے گھر سے تلک کے لیے لڑکے کے گھر جاتا تھا۔ ایک ایسی فہرست بھی میرے پاس ہے جس میں فارسی کے الفاظ کثرت سے آئے ہیں، مثلاً نقد در تھال۔ نقد بنا بر اسپ۔ پوشاک نوشہ۔ پائے شوی۔ باغبان وغیرہ

شادی کے بعد بچے کی ولادت پر زچہ، زچہ خانہ، اور جنم کنڈلی کے لیے زائچہ وغیرہ بہت سے فارسی کے الفاظ سننے میں آتے تھے، زچہ اور زائچہ تو اب بھی مستعمل ہیں، البتہ جب سے زچہ خانہ گھر سے اٹھ کر اسپتال میں پہنچ گیا اس لفظ کے استعمال کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔

تیوہاروں میں ایک تیوہار یعنی تقریب جم دوج کی امتیازی شان کے ساتھ ہمارے خاندان میں منائی جاتی تھی، اس تیوہار کا ذکر جن لفظوں میں منشی رام پرشاد نے اپنی کتاب ہند و تیوہاروں کی اہمیت، مطبوعہ ۱۹۲۴ء مفید عام پریس لاہور میں کیا ہے، وہ پہلے نقل کرتا ہوں۔

"گوبردھن کے دوسرے روز جم دوج کا تیوہار ہوتا ہے، اور تمام مکان کو صاف اور آراستہ کرکے دلدر یعنی افلاس و مصیبت سے نجات ہوتی ہے، اور جمراج سے پناہ ملتی ہے، اس روز بہن اور بھائی کسی پاک دریا میں اشنان کرکے دعا کے واسطے تیار رہتے ہیں، اور ہندو اپنے قلم دوات بہی کھاتہ، ہل یا تلوار وغیرہ کو پوجتے ہیں، اور بعض ان سے کام لینے کا بھی شگون کرتے ہیں، اس روز لین دین اور حساب کے بہی کھاتے تبدیل کرکے نیا حساب شروع ہوتا ہے، اور بہن اپنے بھائی کی پیشانی پر ٹیکہ یعنی قشقہ کھینچ کر آئندہ آٹھ مہینے کی مہم میں اسکی کامیابی کی دعا کرتی ہے، اور ساتھ سفر رفتنت مبارک باد کہتی ہے۔"

یہ "سفر رفتنت مبارکباد" والا فقرہ تو ہم نے اپنے گھر کبھی نہیں سنا کیونکہ ہمارے خاندان میں جم دوج کے موقع پر بہن بھائی کے ٹیکا نہیں لگاتی، صرف قلم کی پوجا اور اس سے کام لینے کا شگون

ہوتا تھا، یہ پوجا صبح کے وقت شری چترگپت جی کی مورتی کے سامنے کی جاتی تھی، ہندو دیومالا
کے مطابق چترگپت جی عالم بالا کے مہومنشی اور انسانوں کی زندگی کا کھاتا رکھنے والے شمار
کیے جاتے ہیں، کالیستھ اپنے کو ان ہی کی اولاد مانتے ہیں، چنانچہ منشی کشوری لال صاحب نے
اپنی کتاب اقوام الہند مطبوعہ ۱۸۹۲ء نول کشور پریس لکھنؤ میں بارہ کالیستھوں کی تواریخ
کے بارے میں ایک نظم فارسی زبان میں لکھی ہے جس کے دو اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں،

چترگپت است والد اینہا ادب آموز رسم و آئین ہا
از دو مادر دو از دہ پسر اند از علوم ریاضی باخبر اند

چونکہ چترگپت جی کا نہ کوئی مندر ہے اور نہ ان کی مورتیاں بازار میں ملتی ہیں، اسلیے
ضروری ہوتا تھا کہ جم دوج کی پوجا کے لیے ایک مورتی بنائی جائے، چنانچہ خاندان کی وہ
عورت جس میں بت سازی کی خداداد قابلیت ہوتی تھی، یہ کام اپنے ذمہ لیتی تھی، اور
ایک دن بیشتر سے تالاب کی چکنی مٹی میں روئی ملا کر ایک چھوٹا سا مجسمہ بنانا شروع کر دیتی
تھی، اس مجسمہ کو ایک لکڑی کی پٹری پر بٹھا کر پوجا کے مقام پر رکھ دیا جاتا تھا، گھر کے
چھوٹے بڑے سب وہاں جمع ہوتے تھے، وہ ایک ایک قلم اور کاغذ کا ٹکڑا اپنے ساتھ لاتے تھے،
پوجا کے بعد اس کاغذ کے ٹکڑے پر ایک عرضی لکھتے تھے جس میں بھگوان سے پرارتھنا ہوتی تھی
کہ تو اپنی کائنات میں سے مجھے چھ چیزیں عطا کر دے، علم، عمل، فراخ دستی، ایمان، امان
اور تندرستی، پھر اس عرضی پر اپنا نام لکھ کر چترگپت جی کی مورتی کے چرنوں میں رکھ دیتے
تھے، اور ہاتھ جوڑ کر اٹھ جاتے تھے، یہ عرضی بھی فارسی کی ایک رباعی کی صورت میں ہوتی تھی،

اے خالق ہر بلند و پستی شش چیز عطا بکن ز ہستی
علم و عمل و فراغ دستی ایمان و امان و تندرستی

بعض کم فہم حضرات جو فراغ دستی کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتے تھے، اس خیال سے کہ اس رباعی میں کہیں دولت کا تو ذکر نہیں ہے، کئی لاکھ روپیہ کی رقم بھی اس رباعی کے نیچے لکھ دیتے تھے، یہ رسم بھی ہمارے خاندان سے اب اٹھ گئی ہے، کتنے عرضی لکھنے والے چلے گئے جو بچے ہیں اور اپنی عرضیوں میں لاکھوں روپیہ کی رقم لکھا کرتے تھے، آج بھی اسی طرح تنگدست ہیں جیسے پہلے تھے۔

چند ادبی کتابیں

مقدمہ رقعات عالمگیر - اورنگ زیب عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وحالات پر خود اس کے خطوط ورقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث۔ قیمت ۹ روپئے۔

بزم مملوکیہ - ہندوستان کے غلام سلاطین شہزادوں اور ان کے دربار کے امرا کے ادبی ذوق اور ان کی علم نوازی علم پروری کی تفصیل اور اس دور کے علماء، فضلاء اور شعراء کے علمی وادبی کارناموں پر نقد اور ان کے کلام کا انتخاب۔ قیمت ۷ روپئے۔

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں - امیر خسرو کی مثنویوں اور دواوین سے ان کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری کے متعلق ان کے تاثرات، اور ان سے متعلق ان کے کلام کے اقتباسات، جن کو پڑھکر امیر خسرو کے عہد کا پورا ہندوستان نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

قیمت :- ۲ روپئے ۵۰ پیسے

منیجر دار المصنفین

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری لکھنؤ

نغموں میں کسک پاتے ہیں ماتم کی طرح ہم — گھبراتے ہیں شادی سے بھی اب غم کی طرح ہم

چاہا تھا کہ انساں کو ملے زندگیٔ نو — مصلوب ہوئے عیسیٔ مریم کی طرح ہم

اب سودۂ الماس کو بھی زخمِ جگر پہ — انگیز کیا کرتے ہیں مرہم کی طرح ہم

سمجھا نہ ہمیں کوئی بھی اوراقِ جہاں پر — ہیں آج بھی اک جملۂ مبہم کی طرح ہم

ہوں گے گلِ خنداں کبھی یہ یاد نہیں ہے — اب تو ہمہ تن اشک ہیں شبنم کی طرح ہم

بھولے نہ کبھی گمشدہ فردوسِ طرب کو — تا عمر تڑپتے رہے آدم کی طرح ہم

اے دوست ہر اک برگِ گلِ گلشنِ دل پہ — شعلوں کو جگہ دیتے ہیں شبنم کی طرح ہم

دستِ فلکِ پیر سے رہتے ہیں پریشاں — اے شوخ تیرے گیسوئے برہم کی طرح ہم

مت پوچھ کہ کیا حال طبیعت کا ہے اے دوست — رو دیتے ہیں خوشیوں میں بھی اب غم کی طرح ہم

اے وائے کہیں کس سے کہ کیوں کاٹ رہے ہیں — دن عیش و مسرت کے شبِ غم کی طرح ہم

مت پوچھ کہ کیا حال ہے اب سوزِ دروں سے — جلتے ہیں شب و روز جہنم کی طرح ہم

ہے ایک ہی حالت پہ طبیعت کی اداسی — ہر روز بدلتے نہیں موسم کی طرح ہم

تذلیلِ وطن سے جو ہوں فنکار نگوں سر ہیں اہلِ وطن قوم کے پرچم کی طرح ہم

وہ درد گزیدہ ہیں کہ تریاق کو بھی اب

چھوتے ہوئے ڈرتے ہیں دنی سم کی طرح ہم

غزل

از جناب عروج زیدی

اشکوں سے ان کے قربِ کامل کو ڈھونڈتا ہوں تاروں کی روشنی میں منزل کو ڈھونڈتا ہوں

اوروں کی ہیں نگاہیں رنگینیٔ جہاں پر میں اعتبارِ رنگِ محفل کو ڈھونڈتا ہوں

ہر رنگ میں حقیقت نظروں کے سامنے ہو میں اُس مقامِ حق و باطل کو ڈھونڈتا ہوں

اس دورِ ارتقا کا الٹا اثر ہے مجھ پر طوفاں سرشت ہو کر ساحل کو ڈھونڈتا ہوں

یہ کیفِ عاشقی میں گم ہو کے رہ گیا ہے اے درد! رہبری کر میں دل کو ڈھونڈتا ہوں

وارفتۂ طلب ہوں جو کچھ نہ ہو وہ کم ہے منزل نصیب ہو کر منزل کو ڈھونڈتا ہوں

دستِ طلب بڑھانا توہین ہے طلب کی خودداریٔ نگاہ ساحل کو ڈھونڈتا ہوں

میں طور پر کھڑا ہوں جلووں کی زد میں تنہا جس نے مجھے ابھارا اُس دل کو ڈھونڈتا ہوں

دل اور بے تمنا، آنکھ اور بے تماشا دنیائے آرزو میں حاصل کو ڈھونڈتا ہوں

الزامِ نفت دکیوں ہے اندازِ جستجو پر انسانیت کے حسنِ کامل کو ڈھونڈتا ہوں

میں ہوں ابھی سے تیری چشمِ کرم کا طالب آغازِ عشق ہی میں حاصل کو ڈھونڈتا ہوں

یادش بخیر جس میں دل کا سکوں لٹا تھا

میں پھر عروج ایسی محفل کو ڈھونڈتا ہوں

غزل

از جناب اسلم سندیلوی

تری اک اک ادا او فتنہ گر کچھ اور کہتی ہے — زباں کچھ اور کہتی ہے نظر کچھ اور کہتی ہے

محبت کی نگاہِ معتبر کچھ اور کہتی ہے — مگر شوخی بھری نیچی نظر کچھ اور کہتی ہے

نمودِ صبح دیتی ہے نویدِ زندگی سب کو — مری اندوہگیں شب کی سحر کچھ اور کہتی ہے

نگاہِ شوق اٹھتی ہے تو بجلی کوند جاتی ہے — زبانِ شوق کھلتی ہے اگر کچھ اور کہتی ہے

اِدھر شوقِ نشیمن رات دن بے چین رکھتا ہے — اُدھر بجلی سی للچائی نظر کچھ اور کہتی ہے

مری نظروں میں ہر گو وعدۂ روزِ ازل لیکن — یہ دو دن کی حیاتِ مختصر کچھ اور کہتی ہے

بجت جاں آفریں ہے ان کی گو تحریر اے قاصد — ترے چہرے کی گھبراہٹ مگر کچھ اور کہتی ہے

مریضِ غم کی حالت یوں تو کچھ امید افزا ہے — مگر اسلمؔ نگاہِ چارہ گر کچھ اور کہتی ہے

غزل :-

از جناب کبیرالدین فوزان

ذات کا بن گیا ہوں میں قیدی — "اب توقع نہیں رہائی کی"

ہے رگوں میں رواں لہو بنکر — یاد ان کی کفِ حنائی کی

مجھکو اکثر گماں صدیوں کا — ساعتوں پر ہوا جدائی کی

جب تجھے سامنے نہیں پاتا — تیری راہوں پہ جبہ سائی کی

فاصلے مٹ گئے ہیں منزل کے — حوصلوں نے جو رہنمائی کی

لوٹ آیا جو بادہ و انجم سے — لے سکا ہے خبر نہ بھائی کی

کون ظلمت میں ساتھ دے ہمدم — چھاؤں نے بھی ہے بے وفائی کی

ہو گئے ہیں خموش جب سے ہم — کھل گئی ہے زبان خدائی کی

کون ہے دار پر سوا تیرے — جس نے فوزاںؔ غزل سرائی کی

مطبوعات جدیدہ

اللہ نورُ السّمٰوات وَالارضْ مرتبہ جناب علی الحق صاحب ایم۔ اے، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت، وطباعت اچھی صفحات ۲۳۲، مجلد مع گرد پوش قیمت ... پتہ۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ ضخیم کتاب قرآن مجید کی سورۂ نور کی آیت (اللہ نور السمٰوات والارض الخ) کی مبسوط ومفصل تفسیر، اور مندرجہ ذیل نو ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) انسان اور مذہب (۲) اللہ (۳) نور (۴) تخلیق کائنات (۵) سماوات (۶) ارض (۷) دینی علوم وفنون کا نور (۸) ایجادات وانکشافات کے میدان میں اللہ کا نور (۹) حرف آخر۔

لائق مصنف نے اس میں اللہ کے نور کی حقیقت وماہیت کی مفصل تشریح کے علاوہ اس سے متعلق مباحث پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن وحدیث، ائمہ وصوفیا اور حکمائے اسلام کے افکار کے علاوہ جدید علوم کے ماہرین کے خیالات سے بھی اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے موجودہ مسلمانوں کی دینی وایمانی کمزوری اور علمی وتہذیبی پسماندگی پر خیر الارض سے دکھ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور اس کی اصلاح کے لیے دینی علوم کی طرح عصری علوم خصوصاً سائنس وغیرہ کی تحصیل کو بھی مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے، کہ اس کے بغیر وہ موجودہ ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں کی برابری نہیں کرسکتے لیکن

کتاب میں رطب کے ساتھ یابس بھی ہے اور اسکی ضخامت، اصطلاحات کی کثرت اور موضوع کی خشکی پڑھنے والوں کو گھبرا دیتی ہے، کہیں کہیں انداز بیان میں الجھاؤ اور بعض جگہ علمی کے بجائے خطیبانہ اور واعظانہ رنگ آگیا ہے، اس سے قطع نظر یہ محنت وکاوش اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ اور دینی جذبہ سے لکھی گئی ہے، اور مجموعی حیثیت سے مفید اور اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

انشائے اردو　　مرتبہ جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی۔ متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۱۱۲ قیمت صہ پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی نے زیر نظر رسالہ کا مخطوطہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ سے حاصل کرکے شائع کیا ہے جو ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ میں علم انشا کی ماہیت، موضوع، غایت، بلاغت و فصاحت، حقیقت ومجاز، تشبیہ واستعارہ، کنایہ وتعریض اور رمز واشارہ کی مختصر وضاحت کی گئی ہے اور پہلے باب میں اردو زبان کی ماہیت، کلام کی قسموں، مفردات و مترادفات اور تذکیر و تانیث کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، اور دوسرے باب میں عدالتی تحریروں، دعویٰ، جواب دعویٰ، فیصلہ جات اور اپیلوں وغیرہ کے مختلف نمونے قلمبند کئے گئے ہیں، مخطوطہ کے ناقص الاول ہونے کی وجہ سے مصنف کا نام نہیں معلوم ہو سکا لیکن یہ تاجدار اودھ محمد علی شاہ (۳۷ ــــ ۱۸۴۲) کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کی زبان اس عہد کی عام تحریروں کی طرح رنگین و پر تکلف اور فارسی نثر کے زیر اثر ہے۔ یہ رسالہ اردو انشاء کے متعلق بعض اہم اور مفید نکات پر مشتمل ہے، اس لئے خواجہ صاحب نے اس کو شائع کرکے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

شروع میں ان کے شگفتہ نگار قلم سے ایک مختصر مگر دلچسپ مقدمہ بھی ہے۔

ہندوستانی مفسرین اور انکی عربی تفسیریں، مرتبہ ڈاکٹر محمد سالم صاحب قدوائی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۰ مجلد قیمت ۱۲ روپے۔ پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

زیر نظر کتاب در اصل ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے، اس میں تفسیر اور قرآنیات سے متعلق ہندوستانی علماء کی ان کتابوں کا جائزہ کیا گیا ہے۔ جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، لائق مصنف نے مفسرین و مصنفین کے مختصر حالات و کمالات اور ان کی تفسیری و قرآنی تالیفات کی اہم اور قابل ذکر خصوصیات بھی بیان کی ہیں، اور کتابوں کے مخطوط یا مطبوعہ ہونے کی تصریح بھی کی ہے، یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں پورے قرآن مجید اور دوسرے میں اس کے اجزاء و سور کی تفسیروں کا، تیسرے باب میں متداول تفسیروں مدارک، بیضاوی اور جلالین وغیرہ کے ان شروح و حواشی کا ذکر ہے، جو علماء ہند نے عربی زبان میں لکھے ہیں، چوتھے باب میں قرآن کے متعلقات و فنون میں لکھی جانے والی عربی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، پانچواں باب ان مفسرین کے تذکرہ پر مشتمل ہے، جن کی تفسیریں اب معدوم اور ناپید ہیں۔ آخر میں، تفسیری کتب و مفسرین اور مراجع و مآخذ کی تین فہرستیں اور شروع میں ایک مقدمہ ہے۔ اس میں فن تفسیر اور کتاب کے مندرجات و مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، لیکن بعض مصنفین کے سنین پیدائش و وفات تحریر نہیں کئے گئے ہیں، اور بعض کتابوں کا ذکر بھی رہ گیا ہے۔ مثلاً علوم قرآن کے متعلق کتابوں میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کی امعان فی اقسام القرآن کا ذکر

نہیں آسکا ہے، کتاب محنت اور سلیقہ سے لکھی گئی ہے، اور اس سے ہندوستان میں قرآنیات پر عربی میں کام کا مختصر خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ مگر قیمت زیادہ ہے۔

سفینۂ زرگل، از جناب فضا ابن فیضی صاحب، متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۱ مجلد قیمت عہ/۲ روپے، دانش کدہ پبلیکشنز، مئو ناتھ بھنجن یو۔پی۔ (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی، (۳) دانش محل امین آباد لکھنؤ

جناب فضا ابن فیضی ایک ممتاز خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں، ان کو نظم و غزل دونوں پر یکساں اور غیر معمولی قدرت ہے۔ یہ انکا پہلا مجموعہ کلام ہے، اس کا زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، آخر میں کچھ رباعیات بھی ہیں۔ مصنف اردو کی کلاسیکل شاعری پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز تغزل فرسودہ نہیں ہے، اور جدت وطرفگی کے باوجود وہ ترقی پسند شاعری کی ناہمواریوں سے خالی ہے، دور حاضر کی اخلاقی و تہذیبی پستی، وحشت و بربریت ظلم و سفاکی، خود غرضی، و مفاد پسندی اور حق و صداقت سے چشم پوشی وغیرہ کو فضا صاحب نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے، ان مسائل کو انھوں نے اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ تغزل کی لطافت و دلکشی، اس کے رنگ و آہنگ اور سوز و اثر میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے اگرچہ ان کا درد مند دل موجودہ ماحول کی پستیوں اور اس دور کی سفاکیوں کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتا ہے۔ مگر وہ ترقی پسندوں کی طرح نعرہ بازی اور غوغا آرائی نہیں کرتے اور حزن و ملال کے باوجود پست ہمت اور کم حوصلہ نہیں ہوتے، بلکہ عزم و یقین اور شوق و ولولہ سے سرشار رہتے ہیں، اس لئے ان کا تغزل تشنگی، اثر و

اور بہت و تازگی سے معمور ہے۔ ان کی رباعیاں بھی اس دور کے کرب کی غماز ہیں، اور ان میں روانی و تازگی اور فنکاری کے دلکش نمونے موجود ہیں۔ فضا صاحب کو زبان و بیان پر پوری قدرت ہے، نئی اور دلکش ترکیبوں تاہم اور ردآویز استعارات اور موثر اور انوکھی تشبیہوں نے بھی ان کے کلام میں بڑی کیفیت اور غنائی پیدا کر دی ہے، زیر نظر مجموعہ باطنی پاکیزگی و لطافت کی طرح ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے۔ اور اردو کے ادبی و شعری ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

آپ تقریر کیسے کریں۔ مرتبہ۔ مولوی نجم الدین صاحب احیائی۔ تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت قدرے اچھی، صفحات ۹۰ مجلد مع گردپوش۔

قیمت :- عہ پیسے۔ پتہ۔ ہلال بکڈپو۔ مبارکپور۔ یو۔ پی

یہ کتابچہ نوآموز مقررین کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس میں چند مذہبی و اخلاقی موضوعات پر مختصر تقریریں قلمبند کی گئی ہیں، تاکہ نوآموزوں کو تقریر کے بنیادی طریقے اور ابتدا اور انتہا کا ڈھنگ معلوم ہو جائے۔ شروع میں تقریر کی اہمیت و ضرورت بھی تحریر کی گئی ہے۔ عربی مدرسوں کے طلبہ کو تقریروں کی مشق کے سلسلہ میں اس کتابچہ سے مدد ملے گی۔

سحر نغمہ :- از۔ جناب ساحر ہوشیارپوری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۱۵ مجلد مع گردپوش، قیمت عللہ پتہ :- مکتبہ شان ہند نئی دہلی ملا

جناب ساحر ہوشیارپوری، حضرت جوش ملسیانی کے تلمیذ خاص، اور ایک پختہ فن اور قادر الکلام شاعر ہیں، ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے انکی

غزلوں کا ایک مجموعہ "سحر غزل" کے نام سے پہلے چھپا تھا۔ اس نئے مجموعہ میں غزلیات کے علاوہ نظمیں، قطعات و رباعیات اور گیتیں بھی شامل ہیں۔ ساحر صاحب کی غزلوں میں بڑی رنگینی و مستی ہے۔ اور وہ کیف و نشاط سے معمور ہیں، انھوں نے حسن و عشق کے نازک معاملات کی مصوری بھی کی ہے۔ اور زندگی کے حقائق و مسائل کی ترجمانی بھی۔ قطعات و رباعیات بھی ان کی فنی پختگی اور دلکشی کا نمونہ ہیں، نظموں کا حصہ بھی دلآویز ہے۔ ان میں رومانی اور قومی و سیاسی ہر طرح کی نظمیں ہیں۔ جو فنی محاسن سے آراستہ ہیں، اور گیتوں میں بڑی شیرینی و حلاوت ہے، اور پورا کلام اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اس مجموعہ میں ان کی متعدد تصویریں بھی ہیں۔

قرآن مجید اور انجیل مقدس ۔ از مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت اچھی صفحات ۸۴ قیمت ۹۰ پیسے۔ پتہ:- الجمعیۃ بکڈپو۔ گلی قاسم جان، دہلی ۶

یہ رسالہ نامور اور بزرگ صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط سابق مدیر اعلی الجمعیۃ دہلی نے رد عیسائیت میں لکھا ہے، اس کے پہلے حصہ میں قرآن مجید کے انجیل مقدس کی تصدیق کا مفہوم بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ دراصل حضرت مسیحؑ پر اتاری گئی انجیل کا مصدق ہے جو ایک تھی، نہ کہ مروجہ چار انجیلوں کا، دوسرے حصہ میں متعدد اناجیل اور بائبل کے عہد نامہ قدیم و جدید کا خود عیسائیوں کی تصنیف سے محرف اور جعلی ہونا ثابت کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اناجیل اربعہ نہ تو اصلی ہیں اور نہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جانب ان کی نسبت صحیح ہے۔ اس ضمن میں مسیحی علماء اور پادریوں کے مختلف الزامات اور مغالطوں کا بھی تشفی بخش جواب دیا گیا ہے، یہ رسالہ افہام و تفہیم کے لیے مکالمہ کی صورت

میں علمی و منطقی انداز میں دلائل و شواہد کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور مناظرانہ رنگ نہیں آنے پایا ہے، اس لیے یہ نہایت مفید اور معلومات افزا ہے۔ مولانا نے یہ رسالہ لکھ کر پوری امت کی جانب سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، اللہ تعالیٰ دینی و ملی خدمت کے لئے ان کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔

تجلیات :- مرتبہ جناب ذکی کاکوروی صاحب۔ تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت غنیمت صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ
پتہ مرکز ادب اردو۔ ۱۳۱، شاہ گنج، لکھنؤ ۳

جناب ذکی کاکوروی خوش مذاق ادیب و شاعر ہیں، انھوں نے اردو غزل و نظم کے انتخابات شائع کرنے کے بعد اب اردو کے نعتیہ کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، جو میر تقی میر سے لیکر اس دور تک کے شعرا کے منتخب نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ متعدد ہندو شعرا کا نعتیہ کلام بھی درج ہے، شروع میں لائق مرتب نے کسی مولانا سید عبد المجید کی سیرت نبوی پر ایک کتاب کی تلخیص کر کے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر حالات زندگی اور آپ کے کارناموں کا مرقع بھی دیدیا ہے، اگر مرتب نعت گوئی پر کوئی مضمون اور شعراء کا مختصر تعارف بھی کرا دیتے تو انتخاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی۔ ناموں میں زمانی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، فہرست میں اسماعیل میرٹھی کا نام درج ہے، مگر ان کی کوئی نعت اس میں شامل نہیں ان خفیف خامیوں سے قطع نظر یہ مجموعہ مرتب کی خوش سلیقگی اور حسن ذوق کا ثبوت ہے اسکی اشاعت مفید ادبی و دینی خدمت ہے۔

الدین الحنیف ۔ مترجمہ و مرتبہ مولوی حماد احمد صدیقی، نانوتوی، تقطیع متوسط، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۴۰۰، مجلد قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ سنگم کتاب گھر اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔

اردو میں احادیث نبویؐ کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس نئے مجموعہ میں بارہ سو سے زیادہ حدیثوں کا متن مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے، صحاح سے ماخوذ ہونے کی بنا پر اس کی حدیثیں مستند ہیں، اور یہ عقائد، عبادات، احکام، اخلاق، آداب اور ادعیہ وغیرہ سے متعلق ہیں، احکام و مسائل کی حدیثوں کے اخذ و انتخاب میں حنفی مسلک کو مدنظر رکھا گیا ہے، ترجمہ بڑی حد تک سلیس ہے، لائق مرتب نے بعض مشکل لفظوں اور کہیں کہیں روایتوں کے دقیق حصوں کی مختصر وضاحت بھی کی ہے، اگر وہ تشریح کی جانب مزید توجہ کرتے تو یہ مجموعہ اور مفید ہوتا، زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق روایات و احادیث کے اس مستند ذخیرہ کی ترتیب و اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے، امید ہے کہ مترجم کی یہ خدمت ہر طرح مفید ثابت ہوگی۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ۔

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :-	ماہانہ
نام پرنٹر :-	سید اقبال احمد
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر :-	" " "
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر :-	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشین شبلی مولٰنا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ داستانِ عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی وادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا ثمنی ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپیے۔

مؤلفہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — اپریل سنہ ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جلد ۱۱۴ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۴ء جلد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کانفرنس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں، ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر اسکی کامیابی کے دل سے متمنی اور بےچینی سے اس کے نتیجے کے منتظر تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس کامیاب رہی اور پاکستان و بنگلہ دیش کے درمیان جو فوری تصفیہ طلب مسائل تھے، اور جن پر آیندہ مستقل اور پائیدار امن و صلح کا دار و مدار تھا، خوش اسلوبی سے طے ہوگئے، اور اس راہ کا سب سے بڑا پتھر ہٹ گیا، اگرچہ ابھی بہت سے مسائل کا تصفیہ باقی ہے، اگر اسی جذبۂ مصالحت سے کام لیا گیا تو وہ بھی طے ہو جائیں گے،

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جنگ و صلح کے سیاسی پہلو بھی ہیں اور انسانی پہلو بھی، سیاسی پہلو یہ ہے کہ یہ تینوں ملک ایک ہی ملک کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہیں، اس لیے جغرافی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ اتنے وابستہ ہیں کہ وہ مل ہی کر ترقی کر سکتے ہیں، اختلاف میں ان کو امن و سکون حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے، اس لیے اگر وہ امن و سکون چاہتے ہیں تو ان کے لیے مصالحت کے سوا کوئی راہ نہیں ہے،

انسانی پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہزاروں خاندان ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہیں، باپ ہندوستان میں ہے تو بیٹا پاکستان میں، بیٹی پاکستان میں ہے تو ماں ہندوستان میں،

کوئی خاندان مشکل ہی سے ایسا نکل سکتا ہے جس کا کوئی نہ کوئی فرد پاکستان میں نہ ہو، یہ کتنی بڑی بے دردی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے، خط و کتابت نہیں کر سکتے بلکہ موت میں بھی شریک نہیں ہو سکتے، بوڑھے ماں باپ اولاد کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں، اگر پاکستان کے کچھ باشندے ہندوستان میں اور ہندوستان کے پاکستان میں ہوتے تو انکو اس درد کا احساس ہوتا، یہ کتنی افسوسناک بات ہو کہ ہندوستان و پاکستان کے باشندے امریکہ اور یورپ تو آسانی سے آجا سکتے ہیں لیکن اتنے قریب ہو کر ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے، اس مصالحت سے امید بندھی ہے کہ شاید دونوں ملکوں میں آمد و رفت کی سہولتیں بھی جلد پیدا ہو جائیں، خدا کرے باقی امور بھی جلد طے پا جائیں اور تینوں ملکوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے۔

حکومت ہند مرزا غالب کی طرح امیر خسرو اور ڈاکٹر اقبال کی یادگار بھی منا رہی ہے اور اس کے انتظامات شروع ہو گئے ہیں، یہ دونوں اپنے عہد کے عبقری اور ہندوستان کے لیے باعث فخر ہیں، ایسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، امیر خسرو میں اتنے گوناگوں کمالات جمع تھے کہ مشکل ہی سے ایک انسان میں جمع ہوتے ہیں، اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نے خسرو کی شاعری کی اہمیت واضح کی، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے خسرو کی شاعری کے ہندوستانی عناصر پر ایک مستقل کتاب "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" لکھی اور گذشتہ مہینہ جواہر لال یونیورسٹی دہلی میں ان کی عبقریت پر مقالہ پڑھا۔

اقبال کے جیسا فلسفی اور مفکر مسلمانوں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوا جس نے اپنی شاعری سے بانگ درا کا بھی کام لیا اور ضرب کلیم کا بھی، ان کی شاعری پورے مشرق کے لیے پیام بیداری ہے، مگر انھوں نے مسلمانوں کو زیادہ مخاطب کیا، اور ان کی تجدید و اصلاح کے لیے ان میں

مذہبی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ایک طبقہ جس کی نظر ان کے پورے کلام پر نہیں ہے، ان کو فرقہ پرور اور صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھتا ہے، جو خود اس کا قصورِ نظر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان اور پورے ایشیا کے لیے زندگی کا پیام ہے، وہ عالم انسانیت کے ہوا خواہ تھے، ان کے کلام میں ان سب سے متعلق بڑی موثر نظمیں ہیں، ایشیا کو مخاطب کرکے تو انھوں نے ایک مستقل مثنوی لکھی ہے، مسلمانوں کو اس لیے زیادہ مخاطب کیا ہے کہ وہ اپنی پستی اور زبوں حالی کی بنا پر زیادہ توجہ کے مستحق تھے، ان کے کلام میں افکار و حقایق کا ایک عالم ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ان کے پورے کلام پر نظر ضروری ہے، ورنہ اندھوں اور ہاتھی کا معاملہ ہوگا، راقم نے عرصہ ہوا ان کی فرقہ پروری کی تردید میں معارف میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اور ان کی اسلامی شاعری پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک مقالہ پڑھا تھا جو معارف میں چھپ گیا ہے، دار المصنفین نے ان پر ایک جامع کتاب "اقبال کامل" شائع کی ہے۔

ان کی فرقہ پروری کے الزام کو سب سے زیادہ ان کے معنوی شاگرد اور ان کے کلام کے ممتاز شارح و مبصر جگن ناتھ آزاد نے دور کیا، اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بڑے قابل قدر مضامین لکھے، اقبال کے جیسے آفاقی شاعر کسی ملک اور قوم کی ملک نہیں ہوتے، ان پر سب کا مساوی حق ہوتا ہے، اور اقبال تو متحدہ ہندوستان کی پیداوار ہیں، اور ان کا کلام اس کی محبت سے معمور ہے، اس لیے ہندوستان کا ان کی یادگار منانا اس کی فرض شناسی کا ثبوت ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مقالات

سفر حج کی مختصر روداد

راقم سطور نے ۱۹۶۶ء میں فریضہ حج ادا کیا تھا، پہلے حج میں فریضہ تو ادا ہو جاتا ہے لیکن اس سے سیری نہیں ہوتی اور دوسرے حج کی تمنا باقی رہتی ہے اور ایک حج کا تجربہ ہو چکا ہوتا ہے اس لئے دوسرے حج میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اس لئے راقم کے دل میں بھی دوسرے حج کی تمنا تھی، اس کا سامان اللہ تعالےٰ نے اس طرح فرما دیا کہ سعودی حکومت ہر سال مختلف ملکوں سے کچھ لوگوں کو بطور شاہد اپنے خرچ پر حج کیلئے مدعو کرتی ہے، گذشتہ حج کیلئے ہندوستان سے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے میرا، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اور مولانا عبد السلام قدوائی کا نام پیش کر دیا، اور ہم لوگوں کے پاس آخر اکتوبر میں دعوت نامہ آگیا، مولانا عبد الماجد صاحب بہت ضعیف ہو گئے ہیں، بینائی میں بھی فرق آگیا ہے، اس لئے کسی مددگار کے بغیر اتنا لمبا سفر تنہا نہیں کر سکتے، ہم لوگ خود پیری کی منزل میں ہیں، مولانا کو ایک جوان اور "قوی" مددگار کی ضرورت تھی، اس کی کوشش کی گئی، مگر حج کا زمانہ قریب آگیا، اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس لئے مولانا سفر نہ کر سکے اور صرف راقم اور مولانا عبد السلام صاحب باقی رہ گئے، اور حج کے شرف سے مشرف ہوئے۔

حج کے سفرنامے آئے دن لکھے جاتے ہیں، ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ راقم نے بھی پہلے حج کا مختصر سفرنامہ لکھا تھا، جو معارف میں شائع ہوا تھا، اس لئے اس مرتبہ

مطلق اس کا ارادہ نہ تھا، اور اسی لیے اس کی کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی، مگر معارف کے بعض ناظرین کا تقاضا ہوا کہ انکو بھی اس سفر کی بھی کچھ نہ کچھ سوغات ملنی چاہیے، ہمارے رفیق سفر مولانا عبدالسلام صاحب کا بھی اصرار ہوا، اس لئے ان سب کی فرمایش پوری کرنی پڑی، مگر اصطلاحی معنوں میں یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے، بلکہ اس سفر کے جو قابل ذکر واقعات دماغ میں محفوظ رہ گئے ہیں اور مختلف چیزوں کے متعلق جو تاثرات دل میں پیدا ہوئے ان کو مختصراً پیش کیا جائے گا، ناظرین بھی اسی نقطۂ نظر سے اس کو ملاحظہ فرمائیں،

ہم لوگ سعودی حکومت کی دعوت پر جا رہے تھے، عام حاجیوں کے سفر سے ہمارا تعلق نہ تھا، اس لئے حجاج کے پاسپورٹ کے بجائے انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوانا پڑا اور انڈین ایرلائن کے بجائے سعودی ایرلائن سے ہمارا سفر ہوا، لکھنؤ میں پاسپورٹ وغیرہ کے جو کام تھے، عزیزان ندوہ نے انجام دیئے، اور دلی کے کام مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی نے جن کا قیام دلی میں تھا، ۲۲ دسمبر کے ہوائی جہاز سے ہمارے ٹکٹ تھے، اس سے تین چار دن پہلے ہم کو بمبئی پہنچنا تھا، مولانا عبدالسلام صاحب نے ۱۶ دسمبر کی ٹرین سے بمبئی کے لیے سیٹیں بک کرا لی تھیں، اس لئے راقم ۱۳ کو لکھنؤ سے چل کر ۱۴ کو دلی پہنچا، اتفاق سے ۱۶ دسمبر کو جس دن بمبئی کا سفر تھا ریلوے اسٹرائیک ہو گئی، جس ٹرین سے ہم کو جانا تھا وہ بند نہیں ہوئی تھی، لیکن اندیشہ تھا کہ آگے چل کر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے، اور ۲۲ سے دو تین دن پہلے ہمارا بمبئی پہنچنا ضروری تھا، اس لیے احباب جامعہ کی رائے ہوئی کہ ٹرین سے جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے، ہوائی جہاز سے جانا چاہیئے، اتنی جلد ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملنا مشکل تھا، لیکن اتفاق سے دوسرے ہی دن کے لیے ٹکٹ مل گیا، ٹرین کا رزرویشن بھی آسانی سے منسوخ ہو گیا۔ ہمارا جہاز ۲۲ دسمبر ۹ بجے دن کو جانے والا تھا، ہم لوگ دو تین گھنٹے پہلے

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی کار پر ہوائی اڈے پہنچ گئے، جس جہاز سے ہم کو جانا تھا وہ کئی گھنٹے لیٹ تھا ۹ بجے دن کے بجائے ۴ بجے سہ پہر کو روانہ ہوا، اور ۶ بجے شام کو بمبئی پہنچا، اپنے میزبان منشی عبدالعزیز صاحب انصاری کو دلی سے تار دیدیا تھا، وہ ٹرین سے ہماری آمد کے منتظر تھے، اور ہم کو لینے کے لیے اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہم لوگ پہنچ گئے، ان کے دولت کدہ پر قیام ہوا، انصاری صاحب کا گھر مستقل مہمان خانہ ہے کوئی دن بھی مہمانوں سے خالی نہیں رہتا، ان میں سے بعض بعض مہینوں اور بعض مستقل رہتے ہیں، اور وہ بڑی فیاضی اور سیر چشمی سے سب کی میزبانی کرتے ہیں، اور کھلا کر خوش ہوتے ہیں، اس زمانہ میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں، بمبئی میں تین چار دن سفر کی ضروری کارروائیوں اور احباب سے ملنے ملانے میں گذرے، ایک دن ہمارے کرم فرما عبدالرزاق صاحب قریشی نے انجمن اسلام کے دفتر میں چائے پر بلایا، یہاں ضیاءالحسن صاحب پرنسپل، مولانا شہاب مالیر کوٹلوی اور انجمن کے دوسرے اصحاب سے ملاقات ہوئی شہاب صاحب دیسنوی کئی مرتبہ قیام گاہ پر ملنے کے لیے آئے۔ حکیم مختار احمد صاحب اصلاحی نے بہت سی دوائیں ساتھ کر دیں۔

۲۴ کو ہوائی اڈے پہنچے، منشی عبدالعزیز صاحب ان کے صاحبزادے ابو صالح اور خورشید سلمہٗ اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے، اتفاق سے اس دن بھی جہاز کئی گھنٹے لیٹ تھا، اور مقررہ وقت سے کئی گھنٹے بعد بمبئی سے روانہ ہوا، اور کراچی، ظہران اور ریاض ہوتا ہوا، ایک بجے رات کے بجائے ۶ بجے صبح جدہ پہنچا، ظہران میں پاسپورٹ اور سامان وغیرہ کی جانچ میں کئی گھنٹے رکنا پڑا، جدہ میں جو سرکاری آدمی اور احباب ہم لوگوں کو لینے کے لیے آئے تھے وہ کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ہوائی اسٹیشن کے عملہ کو ہم لوگوں کی

امداد اور رہنمائی کی ہدایت کر کے لوٹ گئے اس لئے جب ہم لوگ جدہ پہنچے تو کوئی شناسا اور سرکاری آدمی نظر نہ آیا، ہوائی اسٹیشن کا عملہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہماری کوئی مدد نہ کرسکا اور ہم لوگ کئی گھنٹے سرگرداں رہنے کے بعد ہندوستانی سفارت خانے پہنچے، اتفاق سے اس کے فرسٹ سکریٹری اور افسر حج خالد صاحب مولانا عبدالحلیم صدیقی ملیح آبادی مرحوم کے لڑکے اور مولانا عبدالسلام صاحب کے شاگرد تھے، انھوں نے ہر طرح کی مدد کی، ہندوستانی سفیر ظہیر صاحب سے ملایا، اور سعودی وزارت خارجہ سے ربط پیدا کرکے ہم لوگوں کے آنے کی اطلاع دی، اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد وزارت اعلام کے عہدہ دار رشاد عبداللہ جو ہماری رہنمائی اور دیکھ بھال کے لئے متعین کئے گئے تھے۔ آگئے اور بڑی معذرت کی انھوں نے بتایا کہ وہ رات کو ہمارے استقبال کے لئے گئے تھے، مگر ہوائی جہاز لیٹ زیادہ تھا، اس لئے ہوائی اسٹیشن کے متعلقہ عملہ کو ہماری پذیرائی اور ہوٹل تک ہم کو پہنچانے کی ہدایت کرکے لوٹ آئے تھے، مگر عملہ کی نااہلی، یا وزارت خارجہ کی دفتری غفلت کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا، اور شام کے وقت ہم دونوں کو جدہ کے شاندار ہوٹل فندق قصر الکندرہ میں لے گئے، عبداللہ عباس صاحب ندوی کو بھی فون کے ذریعہ مکہ معظمہ ہماری آمد کی اطلاع دیدی گئی تھی، اس لئے رات ہی کو وہ جدہ پہنچ گئے، انھوں نے بتایا کہ وہ بھی ہوائی اسٹیشن گئے تھے، مگر ہوائی جہاز لیٹ زیادہ تھا، اس لئے وہ بھی رشاد عبداللہ کے ساتھ لوٹ آئے تھے، رات ہوٹل میں بسر کی صبح ناشتہ کے بعد رشاد عبداللہ صاحب کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے، فندق مکہ میں جہاں ہمارے قیام کا پہلے سے انتظام تھا ٹھہرایا، یہ ہوٹل حرم شریف کے بالکل متصل ہے، درمیان میں صرف سڑک ہے،

ہم لوگ ۲۴ دسمبر کو مکہ معظمہ پہنچے تھے، حج کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا، اور حجاج کا اتنا ہجوم تھا کہ حرم شریف میں غیر معمولی وسعت کے باوجود نماز کے اوقات میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہ جاتی تھی، نماز باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں ہوتی تھی، اگر بہت پہلے سے نہ جایا جائے تو حرم کے اندر جگہ نہیں مل سکتی تھی، اس ازدحام میں کمزور آدمیوں کے لیے طواف کرنا اور بھی مشکل تھا، اگرچہ خانہ کعبہ کے دروازے کی سمت میں مقام ابراہیم کا گنبد ہٹ جانے کی وجہ سے پہلے کے مقابلہ میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، اسکے باوجود اس سمت میں اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کا بوسہ لینا ہم جیسے کمزوروں کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے، مگر کسی نہ کسی طرح عمرہ کے مناسک ادا کئے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

البتہ اب سعی میں بڑی سہولت ہو گئی ہے، پہلے صفا اور مروہ کے درمیان سڑک اور اس کے دونوں جانب دکانیں تھیں، حاجیوں کو اور سڑک پر لاریوں اور سواریوں کے ہجوم میں سعی کرنا پڑتی تھی، اب حکومت نے دکانیں ہٹوا کر صفا اور مروہ کے درمیان ایک عظیم الشان وسیع اور خوبصورت ہال تعمیر کرا دیا ہے۔ آمد و رفت کی سہولت کے لیے اس کے طول میں ریلنگ دیدی ہے، ایک طرف سے حاجی جاتے ہیں اور دوسری طرف سے آتے ہیں، اس ہال کا طول ایک فرلانگ سے کم نہ ہوگا، غرض اتنا ہے کہ بیک وقت سیکڑوں آدمی آسانی سے آجا سکتے ہیں اور حجاج برقی پنکھوں کی ہوا میں سہولت سے سعی کرتے ہیں، صفا کے اوپر ایک عظیم الشان خوشنما گنبد ہے جس سے اس کی شان اور عظمت اور بڑھ گئی ہے،

ہم لوگوں نے تمتع کی نیت کی تھی، اس لئے عمرہ کر کے احرام کھول دیا تھا، پھر آٹھویں ذی الحجہ کو احرام باندھکر منیٰ روانہ ہوئے، یہاں ایک وسیع سرکاری عمارت میں

قیام کا انتظام تھا، جس میں دوسرے ملکوں کے وفود بھی ٹھہرائے گئے تھے، نویں کی صبح کو عرفات روانہ ہوئے، یہاں آرام دہ خیموں کا انتظام تھا، عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز کے بعد کا وقت تسبیح و تہلیل اور ادعیہ یا تورہ کے ورد میں گذرا، ملتزم شریف سے لپٹنے کی لذت کے بعد کا یہ دوسرا موقع تھا کہ دل کو کیفیت محسوس ہوئی، غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ روانہ ہوئے، یہاں پہنچکر مغرب و عشا کی نمازیں با جماعت ادا کیں اور حسب توفیق دعا کا بھی ورد رہا، اگرچہ مزدلفہ میں صرف ایک رات رہنا تھا، لیکن یہاں بھی آرام و آسائش کا پورا انتظام تھا، صبح کو پھر منیٰ روانہ ہوئے، اور ۱۰ ذی الحجہ کو سب سے پہلے رمی سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد قربانی کا مرحلہ تھا، مذبح کے ہولناک حالات سنکر جا کر قربانی کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اور یہ کام مولانا عبد الماجد صاحب ندوی سابق ا دار العلوم ندوۃ العلماء (جو اب جدہ ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے ہیں) اور بستی مدینہ یونیورسٹی کے دو نوجوان طالب علموں کے سپرد کیا، انھوں نے ۱۰ ہی کو قربانی تھی، اور اس کی اطلاع بھی دینے کے لیے آئے تھے، لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور نے اس شبہہ میں کہ ممکن ہے ۱۰ کو قربانی نہ ہو سکی ہو احرام نہیں کھولا، ۱۱ ذی الحجہ کی سہ پہر قربانی کی اطلاع ہو سکی، اس وقت احرام کھولا اس دن دوسری رمی سے فارغ اس کے بعد آدھی رات کو طواف زیارت کے لیے مکہ گئے، اس سے فراغت کے بعد منیٰ آئے، اور رات گذار کر ۱۲ اکتو کو تیسری مرتبہ رمی جمار کر کے مکہ گئے (رمی جمار کا سب سے مشکل کام ہے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مکہ معظمہ کے قیام کے قابل ذکر واقعات

مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں دو مرتبہ مولانا محمد سلیم صاحب ناظم صولتیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، موصوف حسب معمول بڑ

اور تپاک سے ملے، بیڑے پان کھلائے، اور دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے، مولانا کی شخصیت بڑی پرکشش اور باغ و بہار ہے، ان کے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، وہ تنہا ایک انجمن ہیں، علم کے ساتھ مولانا میں اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت بھی ہے، ان کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کو بڑی ترقی ہوئی، مدرسہ صولتیہ ہندوستانی اور پاکستانی حاجیوں کے لیے جائے پناہ ہے، اور ان کی مشکلات میں ہر قسم کی مدد کرتا ہے، مولانا کے صاحبزادے میاں شمیم صاحب بھی اپنے والد بزرگوار کے خلف الرشید ہیں، اللہ تعالے مولانا کا سایہ عرصۂ دراز تک قائم رکھے، اور میاں شمیم کی عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے،

طائف کا سفر طائف قدیم تاریخی شہر اور حجاز کا شملہ اور نینی تال اور حکومت کا گرمائی مستقر ہے، زمانہ قدیم سے امرا و اعیان کا مسکن رہا ہے، عہد رسالت میں بھی یہاں عرب امرا و عمائد کے بہت سے خاندان آباد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تبلیغ اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے تھے مگر وہ لوگ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آپ کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آئے، اور طائف کے عوام کو بھڑکا دیا، انھوں نے ذات اقدس پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ لہولہان ہو گئے، اس لئے طائف کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، عام حاجی خاص اجازت کے بغیر مکہ مدینہ اور جدہ کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نہیں جا سکتے، لیکن ہم لوگ حکومت کے مہمان تھے، اس لئے شروع ہی میں ہم ایک پروانہ رہداری مل گیا تھا، جس میں ہماری تصویریں تھیں اور متعلقہ عہدہ داروں کے نام ایک تحریر تھی کہ ہم لوگ وزارت اعلام کے مہمان ہیں، ہمارے آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ کیجائے، اور جہاں جانا چاہیں ہمارے لئے سفر کی سہولت مہیا کیجائے، ایک کار ہمارے لئے مخصوص تھی، اس لئے ایک دن صبح ناشتہ کے بعد رشاد عبداللہ کی

رفاقت میں طائف گئے، اور چند گھنٹے گھوم پھر کر شام کو واپس آگئے، طائف کئی ہزار فٹ کی بلندی پر ہے، گو پیچ دار سڑکیں بڑی اعلیٰ درجہ کی ہیں، شملہ اور نینی تال کی طرح اس کی آبادی تلے اوپر نہیں ہے، بلکہ اوپر جاکر کئی میل کا مسطح میدان ہے، جس پر شہر آباد ہے، طائف کے دو حصے ہیں، ایک پرانا جس کا نام یاد نہیں رہ گیا، یہ زیادہ ٹھنڈا ہے، اس کی آبادی کم ہے، اس سے چند میل آگے بڑھکر دوسرا حصہ ہے، جو بہت آباد ہے، اور حجاز کے دوسرے شہروں کی طرح بڑی ترقی کر رہا ہے، بکثرت نئے طرز کی عمارتیں بن گئی ہیں، طائف کے قدیم آثار میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مزار ہے اور آپ سے منسوب ایک مسجد ہے، طائف کے میوے خصوصاً انار مشہور ہے،

شاہی دعوت مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں کئی تقریبوں میں شرکت کا موقع ملا، ہر سال کی طرح اس سال بھی ملک فیصل کی جانب سے ممتاز حاجیوں اور مشہور شخصیتوں کی دعوت تھی راقم اور مولانا عبدالسلام صاحب بھی مدعو تھے، یہ تقریب ایک وسیع اور خوبصورت ہال میں ہوئی تھی، مہمانوں کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ملک فیصل مسلح گارڈ کی جلو میں تشریف لائے اور سیدھے اسٹیج پر جاکر بیٹھ گئے، ان کے ساتھ اسلامی ملکوں کے بعض سربرآوردہ شخصیتیں بھی اسٹیج پر تھیں، شاہ کے آنے کے بعد شعراء نے ان کی شان میں قصیدے پڑھے، پھر جلسہ کا آغاز کلام مجید کی تلاوت سے ہوا، اس کے بعد شاہ نے اسلامی اتحاد کی ضرورت اور اسرائیل کے خلاف بڑی فصیح و بلیغ اور پُرجوش تقریر کی، بعض اور تقریریں بھی ہوئیں، اس کے بعد حاضرین کھانے کے لیے اٹھے، ہال کے باہر ایک وسیع لان پر کھانے کی میزیں آراستہ تھیں، جن میں انواع و اقسام کے عربی اور انگریزی کھانے اور مختلف قسم کے ٹھنڈے مشروبات تھے، ہندوستان کی بھی بعض بڑی سرکاری

دعوتوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے مگر ان کو اس شاہی دعوت کے تکلفات سے کوئی نسبت ہی نہیں تھی، اس دعوت میں رابطۂ عالم اسلامی کے پاکستانی رکن ظفر احمد صاحب انصاری اور محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند اور بعض دوسرے ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی دعوت کے بعد ملک فیصل نے مدعوئین کو سلام اور مصافحہ کا موقع دیا مجمع بہت تھا، رات زیادہ آچکی تھی ملاقات کے انتظار میں دیر تک ٹھہرنا پڑتا اسلئے بہت سے لوگ واپس چلے گئے تھے، راقم بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔

وفود کا اجتماع، حج کے بعد ایک شب کو منیٰ کی سرکاری عمارت میں، اسلامی ملکوں کے وفود کا جلسہ ہوا، اس میں اسلامی اور عرب ملکوں کے نمائندے شریک تھے، ہم لوگ تو اسی عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس میں مدعو بھی تھے، پہلے چائے اور قہوے سے حاضرین کی تواضع کی گئی، اس کے بعد کھانا ہوا یہ کھانا خالص عربی مذاق کا اور دسترخوان پر تھا، کھانے کے بعد تلاوت قرآن مجید سے جلسہ کا آغاز ہوا مصر کے ایک مشہور قاری نے جو قرأت کے سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں، قرأت کی اس کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، یہ تقریریں بہت مختصر اور برائے نام تھیں جلسہ کے کنڈکٹر بڑے ظریف تھے ان کے لطائف سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے، فلسطین کے نمائندے کی تقریر سنجیدہ اور پُرجوش تھی،

ہم لوگوں کو طوافِ زیارت کرنا تھا، اسوقت طواف زیارت کرنے والوں کا ہجوم تھا، اس لئے دن میں طواف کرنے کی ہمت نہیں پڑی رات کو نسبتہً ہجوم کم ہوجاتا ہے اس لئے بھی تقریروں کا سلسلہ جاری تھا کہ ہم لوگ اٹھ کر چلے آئے اور رات ہی رات کو مکہ جاکر طواف زیارت کیا، اس اجتماع میں تمام حاضرین کو حج منیٰ کے کی تھم [illegible]

نہایت خوبصورت کلام مجید کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً دیا گیا۔

ندوۃ الشباب کا جلسہ | اسی زمانہ میں ندوۃ الشباب یعنی دنیاے اسلام کے نوجوان مسلمان طلبہ کا جلسہ ریاض میں ہوا تھا، پھر اس کا ایک اجتماع مکہ معظمہ میں ہوا، جہاں تک یاد آتا ہے شاہی دعوت ہی کی تقریب میں ہوا تھا، اس میں مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اور ہندوستان کی بعض دوسرے مسلم تعلیمی اداروں کے نمایندے بھی شریک تھے، متعدد طلبہ نے تقریریں کیں، غالباً مدراس کے ایک طالب علم نے انگریزی میں تقریر کی تھی، آج کل طلبہ ہر میدان میں پیش پیش رہتے ہیں، اگر ان کے اندر مذہبی احساس پیدا ہو جائے تو ان سے دینی اصلاح کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے،

رابطۂ اسلامی کی ایک نشست میں شرکت | اس زمانہ میں رابطۂ اسلامی کے بھی جلسے ہوئے تھے، ہم لوگوں نے بھی ایک جلسہ میں جس میں مولانا سید ابوالحسن علی کا مقالہ پڑھا گیا تھا، شرکت کی، یہ مقالہ ان کی دوسری تقریروں اور تحریروں کی طرح بڑا فاضلانہ اور دینی روح سے معمور تھا، اور اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہے، مقالہ ختم ہونے کے بعد دنیاے اسلام کے متعدد فضلاء نے مقالہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے، ان میں غالباً عراق کے ایک فاضل کی تقریر بڑی پُرجوش تھی،

ان اجتماعات میں اسلامی ملکوں کے سربرآوردہ لوگوں سے ملاقاتیں اور اور بعض سے تبادلۂ خیالات بھی ہوا، مگر ان کے نام نوٹ نہیں کئے تھے، اس لئے یاد نہیں رہ گئے، ایک دن جامعہ ازہر مصر کے شیخ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

مکہ معظمہ میں تین چار دن قیام کے بعد ۱۶ ار یا ۱۷ ذی الحجہ کو مدینہ طیبہ روانہ ہوئے یہاں مسجد نبوی سے متصل مدینہ ہوٹل میں ٹھہرے، اس وقت مدینہ طیبہ میں زائرین کا اتنا ہجوم تھا کہ

مسجد نبوی میں جگہ ملنا مشکل تھی، باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں نماز ہوتی تھی، پہلے دا
کسی نہ کسی طرح اندر نماز پڑھی اور بارگاہ نبوی میں صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی سعاد
حاصل کی اس کے بعد بہت کم اندر نماز پڑھنے کا موقع مل سکا، ہزاروں آدمیوں کی طرح ہما
کندھے پر بھی مصلیٰ رہتا تھا، جہاں جگہ مل جاتی تھی نماز پڑھ لیتے تھے، لیکن آستان نبو
حاضری کے لئے دل تڑپتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ایسا انتظام فرما دیا جو کم خوش نصیب
کے حصہ میں آیا ہوگا، عشاء کی نماز کے تھوڑی دیر بعد مسجد نبوی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں
رات کو کسی کو اندر رہنے کی اجازت نہیں، پھر تہجد کے وقت کھلتے ہیں، اور اسی وقت
نمازیوں اور زائرین کا ہجوم شروع ہو جاتا ہے، اس لئے سکون و اطمینان سے مسجد نبوی کے
نفلیں پڑھنے اور صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کا موقع کسی کو بھی نہیں ملتا، حکومت نے
انتظام کر دیا تھا کہ خود اور حکومت کے دوسرے معزز مہمانوں کے لئے مسجد کے درو
بند ہونے کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے کھول دیے جایا کریں، چنانچہ جب مسجد بالکل
ہو جاتی تھی تو ہم لوگوں کے لئے مسجد کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا تھا اور ہم سب مسجد میں
پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش کرتے تھے اور روضۂ جنت، محرا
نبوی اور دوسرے مقدس آثار میں نفلیں پڑھتے تھے، اس وقت عجیب کیف وسرو
کا عالم ہوتا تھا، مسجد نبوی میں یوں ہی بڑی موہنی اور سکینت ہے، رات کے سناٹے میں
اور سکینت برستی ہے اس کا اندازہ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، راقم
صلوٰۃ وسلام پیش کرنے اور نفلیں پڑھنے کے بعد مولانا جامی کی نعتیں اور دوسرے نعتیہ اشعا
پڑھا کرتا تھا، اس وقت عجیب کیفیت محسوس ہوتی تھی، "سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور
دل کی کہانی ہے"، کا منظر نظر آجاتا تھا،

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے، ایک رات کو کسی عرب ریاست کے شیخ آئے تھے، ان کے ساتھ مسلح باڈی گارڈ تھا، شیخ اور ان کے رفقاء محرابِ نبویؐ پر دیر تک نفلیں پڑھتے رہے، ایک ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا تھا، دوسرے لوگوں کو موقع ہی نہ ملتا تھا، راقم تاک میں لگا رہا، ایک مرتبہ جیسے ہی ایک شخص ہٹا مصلیٰ پر لپک کر پہنچ گیا، اور پورے اطمینان سے نفلیں پڑھیں، مولانا عبدالسلام قریب ہی کھڑے تھے، نفلین ختم کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ تم نے بڑا خطرہ مول لیا تھا، میں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا شیخ کے ساتھ مسلح باڈی گارڈ تھا، مین نے ان کو اطمینان دلایا کہ وہ رسمی طور پر ساتھ تھا، مسجد نبویؐ مین کوئی شخص کسی کو نہیں ہٹا سکتا،

مدینہ طیبہ مین ایک بڑی دولت حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی زیارت کی حاصل ہوئی، حضرت کا قیام مسجد نبویؐ سے متصل مدرسۂ شرعیہ مین تھا، ان کے حکم سے میں اور مولانا عبدالسلام صاحب رات کا کھانا حضرت ہی کے دسترخوان پر کھاتے تھے، جو سہارنپور کی طرح مدینہ طیبہ میں بھی وسیع تھا، اس حیثیت سے ہمارے لئے یہ کھانا بڑی نعمت تھا کہ ہوٹل کا انگریزی اور عربی مذاق کا کھانا کھاتے کھاتے طبیعت اُب گئی تھی، حضرت کے دسترخوان پر ہندوستانی کھانا ملتا تھا، حضرت غایتِ شفقت میں کسی کسی دن پان بھی ساتھ کر دیتے تھے، جو مدینہ طیبہ میں بڑی نعمت ہے،

راقم کا ارادہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں جتنے دن بھی قیام کا موقع مل سکے گا اور جدہ میں مقیم اعزہ واحباب سے ملاقات کے لیے دو تین دن قیام رہے گا، اور اپنے مرافق رشاد عبداللہ سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ واپسی کے پروگرام میں اس کا لحاظ رکھیں گے، انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا، مگر پروگرام بنانا ان کے اختیار میں نہ تھا، ابھی مدینہ طیبہ میں ایک ہفتہ

ں پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دن دوپہر کو رشاد عبداللہ نے اطلاع دی کہ جدہ سے
فون آیا ہے کہ کل صبح سعودی ایرلائن کے جہاز سے ہم لوگوں کو جانا ہے، اور رات تک ہمکو
دہ پہنچ جانا چاہیئے، اگرچہ ابھی دل واپسی کے لیے تیار نہ تھا، مگر حج ختم ہو چکا تھا، مدینہ
یبہ مین بھی حاضری ہو چکی تھی، کوئی ضروری کام باقی بھی نہ رہ گیا تھا، اگر اس وقت واپسی
کے لیے آمادہ نہ ہوتا تو پھر معلوم نہیں کب تک اس کا انتظام ہو سکتا، ہماری طرح دوسرے
جو دفود آئے تھے، وہ بھی واپس ہو رہے تھے، اس لئے واپسی ہی مناسب معلوم
ہوئی، اتفاق سے اُس دن مدینہ طیبہ بلکہ پورے حجاز میں ہندوستان جیسی تیز بارش
ہو رہی تھی، اسی میں سہ پہر کے قریب باحسرت و یاس مدینہ سے روانہ ہوئے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اور رات کو جدہ پہنچے، رات بھر فندق ریاض مین قیام رہا، فجر کے بعد ہی ہوائی اڈہ کی راہ لی، اس لیے
جدہ میں بھی کسی سے ملاقات نہو سکی البتہ مکہ میں جمال میاں فرنگی محلی سے جو پاکستان کیجانب سے
رابطہ کے جلسہ مین شرکت کیلئے آئے تھے، کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی، جس سے بڑی مسرت ہوئی،
ان سارے مراحل میں ہمارے شفیق مرافق رشاد عبداللہ ساتھ ساتھ تھے، اور ہم کو رخصت کر کے واپس
ہوئے، ۹ بجے دن کو ہمارا ہوائی جہاز جدہ سے روانہ ہوا اور ریاض، ظہران اور کراچی ہوتا ہوا مغرب کے بعد بمبئی پہنچا،
واپسی مین بھی منشی عبدالعزیز صاحب انصاری کے یہاں قیام رہا، اتفاق سے اسوقت منشی جی شادی کی تقریب مین شرکت
کیلئے وطن گئے ہوئے تھے، مگر انکے صاحبزادے ابو صالح سلمہ موجود تھے وہ میزبانی مین اپنے والد کے صحیح جانشین رہے،
انھوں نے اسطرح میزبانی کے فرائض انجام دے کہ منشی عبدالعزیز صاحب کی کمی محسوس نہ ہونے دی، انہی کی کوشش سے
تین چار دن مین واپسی کا ٹکٹ مل گیا اور ہم لوگ وسط جنوری مین وطن واپس ہو گئے، مولانا عبدالسلام صاحب نے
بمبئی سے ندوہ تار دیدیا تھا اسلئے لکھنؤ اسٹیشن پر عزیزان ندوہ آگئے تھے، مگر راقم نے وطن کسی کو اطلاع نہیں دی تھی اور ندوہ پہنچکر
(باقی)

صاحب الأغانی أبو الفرج الأصبهانی

(حیات اور ادبی خدمات)

از جناب مولوی شفیق احمد خانصاحب ندوی، ایم۔ اے شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مشہور حکایت نگار ادیب ابوالفرج الاصبہانی کا نام دنیائے ادب میں زندۂ جاوید ہے۔ وہ ایک مایۂ ناز انشاء پرداز و روایت نگار، ماہر لسان و لغت ادیب ہی نہیں شاعر، نقّاد، مؤرخ، مرقع نگار اور مصور عصر بھی تھا، علم انساب اور دوسرے علوم متداولہ کے ساتھ ساتھ موسیقی، اور ساز و سرود کا ماہر بھی تھا۔

اجمالی تعارف اور تاریخی پس منظر ابوالفرج الاصبہانی تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا ایک نامور صاحبِ قلم ہے، کتاب الأغانی اس کی سب سے مشہور تصنیف ہے جو اکیس[21] جلدوں میں ہے اور پچاس[50] برس کی محنت شاقّہ کے بعد مکمل ہوئی تھی، یہ ایک طرح کی ادبی انسائیکلو پیڈیا ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوکر ادبیات عالم میں جگہ پاچکے ہیں۔ اہل مغرب خصوصیت سے اس کتاب کے شیدائی رہے ہیں۔

ابوالفرج نے بچپن کے سولہ[16] سال تیسری صدی ہجری میں گزارے، اس کے بعد کی زندگی چوتھی صدی ہجری میں گزری بغداد اس کا مولد و مسکن تھا۔ جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس زمانہ میں اُم البلاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصبہانی کا زمانہ عیش و عشرت، طوائف الملوکی، اور علوم و فنون کی ترقی کے لیے مشہور ہے۔ یہ علم و ادب کا عہد زریں تھا

باسی عہد کا یہ تیسرا دور علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر رنگ رلیوں، فضول خرچیوں اور عیش پرستیوں کے لیے مشہور رہے، ابوالفرج اصبہانی اسی دور کا نمایندہ ہے۔

جاحظ کی وفات جس سال ہوئی اسی سال ابوالفرج کی ولادت ہوئی، ابوالفرج نے جاحظ کے علمی و ادبی ترکہ سے پورا فائدہ اٹھایا، ابوتمام بحتری اور ابن الرومی کا دور عروج ابوالفرج کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، اس نے ان تینوں شعراء کی نازک خیالی، پرگوئی اور حسن ادا سے استفادہ کیا، باقی زندگی ابوالفرج نے متنبی جیسے بلند پایہ شاعر کے عہد میں بسر کی جس کی شاعری کی پوری دنیائے عرب میں دھوم تھی، اور اس کا یہ دعویٰ تھا

وما الدهر الا من رواة قصائدي اذا قلت شعراً اصبح الدهر منشدا

غرض ابوالفرج کا زمانہ مادی اور فکری دونوں حیثیتوں سے ترقی کا دور تھا، عربی زبان پختہ ہو کر زندگی کے نازک تر مسائل کی ترجمان بن چکی تھی، اور اس کی شاعری سماج میں اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ کوئی طبقہ بھی اس کے ذوق سے خالی نہ تھا، اور اس کے نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے تھے، اور تنقید ادب کے نئے پہلو فکر و فن کو جلا بخش رہے تھے، ابوالفرج نے اس سے پورا اثر قبول کیا، دنیاوی حیثیت سے بھی اس کو وجاہت حاصل تھی، عرصہ تک وہ مشہور بویہی حکمراں ابومحمد الوزیر المہلبی کا ہم نشین اور رکن الدولہ کا سکریٹری رہا، سیف الدولہ کے دربار سے بھی منسلک رہا۔ بنو امیۂ اندلس سے بھی اس کے تعلقات استوار و خوشگوار تھے۔ اس طرح اس کو بغداد، حلب اور اندلس وغیرہ کے مختلف و متضاد علمی و تمدنی

سرچشموں سے استفادہ کا پورا موقع میسر ہوا، بغداد میں فارسی الاصل شیعی اور شعوبی اثرات، حلب میں عربی صدانی قوم پرستی کے رجحانات اور مغرب کے اموی تاثرات اور ان سب کی باہمی کشمکش نے ابوالفرج کے مزاج میں ، وسعت اور آزاد مشربی پیدا کر دی تھی، اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر موقع شناس اور عیش پسند فنکار شاعر اور آزاد مشرب ادیب کی حیثیت سے ابھرا اور دیکھتے دیکھتے دنیائے عرب میں مشہور ہو گیا[1]

حالات زندگی۔ ابوالفرج اصبہانی نسلاً اموی اور آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے اجداد میں تھا، اس کی ولادت ۲۸۴ھ میں معتضد باللہ کے عہد میں اصبہان میں ہوئی بچپن بغداد میں گزارا، اور اس کی یہیں نشوونما ہوئی، یہاں چوٹی کے ادبار میں شمار کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال سے استفادہ کیا۔ افراد و قبائل کے حسب و نسب پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ اموی ہونے کے باوجود شیعی تھا جس پر ابن الاثیر نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ تنوخی کا قول ہے کہ جن شیعہ ارباب فضل و کمال سے میں ملا، اُن میں ابوالفرج اصبہانی بے شمار اشعار کا حافظ اور راگ راگنیوں کا بہت بڑا واقف کار تھا۔ حدیث اور تاریخ پر بھی اچھی نظر رکھتا تھا۔ آثار صحابہ و تابعین کا بھی عالم تھا خصوصاً احادیث مسندہ اور انساب پر غیر معمولی نظر تھی، اس کی جیسی قوت حافظہ میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ مذکورہ بالا علوم و فنون کے علاوہ لغت، نحو، داستان گوئی، سوانح و سیر اور مغازی وغیرہ میں آپ اپنی نظیر تھا۔ علم مجلسی کا بھی بڑا واقف کار تھا، بیطاری شکاری پرندوں کے علم طب اور نجوم میں بھی اسکو دسترس

---

[1] صاحب الأغانی:۔ للدکتور محمد احمد خلف اللہ سے ملخصاً

تھی۔ اس کے اشعار میں علماء کے کلام جیسی پختگی اور ظریف الطبع شعراء جیسی
یاں تھیں، کتابیں اچھوتی اور بے مثل لکھیں، جن میں آغانی شہرۂ . . .
تی ہے۔[1]

ل ابوالفرج نے تیسری اور چوتھی صدی کے جن باکمال اہل علم سے استفادہ
ان میں ابن درید، ابن الانباری، الجحی، اخفش، نفطویہ، طبری، ابن المرزبان
بن قدامہ اور یزیدی جیسے لغت، نحو، ادب، شعر، انساب، حدیث، تفسیر
ر تاریخ کے فضلا و ائمہ ہیں۔ ابوالفرج کی شخصیت کی تعمیر میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔

اغانی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فکر و فن کی تعمیر میں اس کے
ماندان کے شعری و ادبی ماحول کا اہم حصّہ ہے۔ اس کا پورا گھرانہ شعر و سخن کے
رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی چچی ساز و غنا کی دلدادہ تھیں، اس کے والد کو موسیقی
سے بڑی دلچسپی تھی۔[2] آل مرزبان اس زمانہ میں گانوں اور موسیقی کے راگوں میں
باکمال سمجھے جاتے تھے۔ ذوق کے اس اشتراک کی بنا پر آل مرزبان اور ابوالفرج
کے خاندان میں گہری دوستی تھی، علم و ادب بھی اس کو وراثتہً ملا تھا۔ تعلیم و تعلم اور
ادبی افادہ و استفادہ کے اس ماحول نے ابوالفرج کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں
اہم رول ادا کیا۔

اخلاق و کردار ابوالفرج بڑا ملنسار، شیریں گفتار، آداب مجلس کا ماہر اور
عیش و طرب کی مجلسوں کا دلدادہ تھا، مغنیوں اور طوائفوں کے یہاں رہتا اور
شراب پیتا تھا، بطرس البستانی لکھتا ہے،

---

[1] مقدمۃ الأغانی الأب انطون صالحانی الیسوعی، ص ۱۰ [2] الاغانی ج، ص ۱۳۳

"کان ابو الفرج الاصبهانی لطیف المنادمة حسن المعاشرة

حلو الحدیث، یحب اللذة و مجالس اللهو و یشرب

الخمر و یصحب المقیات و المغنیین"[1]

یاقوت حموی (صاحب معجم الادباء) کا بیان ہے کہ ابو الفرج بڑا لاابالی تھا، صفائی ستھرائی اور لباس کی طرف اس کی کوئی توجہ نہ تھی، جب تک کپڑے پھٹ نہ جاتے نہ بدلتا تھا۔ وزیر مہلبی کو اس کی یہ عادت بڑی ناگوار تھی، اس کے علم و فضل اور شعر و ادب کی بنا پر گوارا کرتا تھا۔ اس کو جانوروں سے بڑی دلچسپی تھی، اس کے یہاں بہت سے جانور پلے تھے۔ ان میں ایک بلی بھی تھی جس کو یقق رکھا تھا، اس کا تذکرہ اس کے کلام میں بھی ہے۔ اس کے مرنے پر اس نے اس کا مرثیہ بھی لکھا تھا، مرغوں کے پالنے کا بھی شائق تھا "رثاء دیک" اس کا مشہور مرثیہ ہے، جس میں اس نے اپنے مرغ کا سراپا نہایت دلکش انداز میں لکھا ہے، لوگ اس کی ہجو سے ڈرتے تھے، مگر منہ پھٹ ہونے کے باوجود نہایت خوش مزاج، دلچسپ اور بذلہ سنج تھا، اپنی خوش گفتاری، لطیفہ گوئی اور ظرافت سے مہلبی جیسے وزیر کا نہایت مقرب مصاحب اور ندیم رہا۔

تشیع پطرس بستانی کی تحقیق ہے کہ ابو الفرج شیعہ تھا، چونکہ شیعوں کے درمیان اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھیں سے میل جول رہا، اس پر شیعوں کے احسانات بھی رہے تھے، اس لئے اموی الاصل ہونے کے باوجود شیعیت پر قائم رہا۔ وکان

علی امویتہ یتشیع للعلویین لتربیتہ بینھم و مخالطتہ لھم

---

[1] ادباء العرب فی الأعصر العباسیة (بطرس البستانی) ص ۱۲، ج ۲

واشتمالہ بأنغامھم"[1]

پوری اغانی ایک طرح سے بالواسطہ یا بلا واسطہ اکثر وبیشتر دور بنی امیہ کے برے پہلوؤں کی تصویر ہے۔ اس کے باوجود کسی صحابی کی توہین یا براہ راست کسی شخص کی تحقیر کبھی نہیں کی۔ وہ زندگی بھر مختلف ومتضاد مذاق کے امراء وملوک کی دربار میں رہا، اس وجہ سے مال وزر اور عیش وعشرت کا شیدائی تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف اس نے مقاتل الطالبین میں اپنے کو شیعان علیؑ میں شمار کیا ہے۔ دوسری طرف اپنی اموبیت پر بھی فخر کرتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات کی ترجمانی اور ہم رنگی کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے ارباب اقتدار کے عظمت وجلال کو ختم کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ارباب حکومت کی سرمستیوں کے ذکر سے اس کا مقصد آزادی اور آزاد خیالی کے رجحانات کی ہمت افزائی بھی تھی، اور خوبصورت انداز میں ارباب حکومت پر بالواسطہ تنقید بھی[2]!

ابو الفرج اصبہانی کے ادبی کارنامے یوں تو ابو الفرج کے علمی ادبی کارنامے بے شمار ہیں لیکن اس کا ادبی پایہ تنہا "اغانی" کی بنا پر مانا جاتا ہے۔ کتاب الاغانی اس کی شاہکار تصنیف ہے۔ مقاتل الطالبین بھی اس کی تاریخی کتاب ہے۔ جس میں بنو طالب کے مقتولین کے سوانح اور ان کے قتل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں،

انطون صالحانی الیسوعی نے اغانی کے مقدمہ میں ایک اور کتاب نزھۃ الملوک والاعیان فی اخبار القیان والمغنیات "الاوائل الحسان" کا تذکرہ کیا ہے اس کے

---

[1] الاستاذ بطرس البستانی: آدباء العرب فی الاعصار العباسیۃ ص ۳۱۲

[2] شفیق جبری: ابوالفرج الاصبہانی، ص ۱۰

بیان کے مطابق اس کتاب میں ابوالفرج نے مشہور گانے والیوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے گانے کے طرز پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ بڑے دلچسپ لطائف وظرائف اور پُرلطف حالات قلمبند کئے ہیں۔

یاقوت حموی کے بیان کے مطابق اس کی جملہ تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے،

(۱) کتاب الأغانی الکبیر (۲) کتاب الأغانی (مجرد و مخض) (۳) کتاب مقاتل الطالبین۔ (۴) أدب الغرباء (۵) التعدیل والإنصاف فی اخبار القبائل وانسابھا۔ (۶) اخبار القیان۔ (۷) الاماء والشواعر (۸) کتاب الممالیک الشعراء (۹) کتاب الدیارات۔ (۱۰) کتاب تفضیل ذی الحجۃ۔ (۱۱) کتاب الاخبار والنوادر (۱۲) کتاب أدب السماع۔ (۱۳) کتاب اخبار الطفیلیین۔ (۱۴) کتاب مجموع الاخبار والآثار۔ (۱۵) کتاب الخمارین والخمارات۔ (۱۶) کتاب الفرق والمعیار فی الأوغاد والأحرار۔ (۱۷) کتاب دعوۃ التجار (۱۸) کتاب اخبار جحظۃ البرمکی۔ (۱۹) کتاب جمھرۃ النسب۔ (۲۰) کتاب نسب بنی عبد شمس۔ (۲۱) کتاب نسب بنی شیبان۔ (۲۲) کتاب نسب المھالبۃ۔ (۲۳) کتاب نسب بنی تغلب۔ (۲۴) کتاب الغلمان المغنین۔ (۲۵) کتاب الخصیان[۱]

مگر اب صرف شروع کی چار کتابیں ہی ملتی ہیں، باقی ناپید ہو چکی ہیں۔

وفات: ۱۴ ذی الحجہ ۳۵۶ھ میں مدینۃ السلام بغداد میں ابوالفرج اصبہانی

---

[۱] معجم الادباء، ج ۱۳

کی وفات ہوئی، اسی سال ابو علی قالی جیسے عالم اور سیف الدولہ، معز الدولہ بن بویہ
اور کافور اخشیدی جیسے ادب نواز بادشاہوں کا بھی انتقال ہوا اس پر اغانی کے مقدمہ
میں انطون صالحانی نے بڑے موثر انداز میں اظہار تاسف کیا ہے

"...... هذا ولما قبض ابو الفرج جفت حدائق الأدب،

وذوت أشجار النسب، وأصبح الادباء أيتاما، وهانوا بعد

أن كانوا كراما، على أن من ترك مؤلفا مثل هذا،

لا يموت له ذكر، ولا ينقطع له نشر"

یعنی ابو الفرج کے انتقال سے ادب کے بستان وچمن ویران ہو گئے،
انساب کے شگوفے مرجھا گئے، ادبائے دہر بے سہارا ہو گئے۔ لیکن ___ جس
شخص نے ایسی زندۂ جاوید کتاب (کتاب الاغانی) یادگار چھوڑی ہو، اسکا ذکر
نہیں مٹ سکتا وہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

وما مات من أبقى لنا ذخر علمه

وأحيا له ذكرا على غابر الدهر،

جب تک کسی کے علمی ذخائر باقی ہیں وہ نہیں مرسکتا اور ذکر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ابو الفرج: بحیثیت شاعر نثرنگاری نے ابو الفرج کو باقاعدہ طور پر شاعری اور قصیدہ
نگاری کا موقع تو نہیں دیا، پھر بھی اس کا پورا ماحول شاعرانہ تھا، ...
خود ابو الطیب متنبی اس کا ہمعصر تھا، جس کی شاعری کی دھوم تھی، اس لئے ابو الفرج
نے بھی کبھی تفریحاً اور کبھی ضرورۃً شعر وسخن کی طرف بھی توجہ کی اور اس کا ادب ..

لہ مقدمۃ الاغانی (ترجمہ اردو)

اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے، ابوالفرج نے بھی اپنے ادبی دور اور موقع ومحل کی مناسبت سے ہجو گوئی، مدح سرائی، توصیفی شاعری اور کبھی کبھی وجدانی اور داخلی شاعری کے پھول کھلائے۔

وصفیہ شاعری | وصفیہ شاعری میں ابوالفرج کو کمال حاصل تھا، رثاء دیک' اسکا مشہور مرثیہ ہے جو تاریخ وسیر کی کتابوں میں موجود ہے، یہ مرثیہ اس نے اپنے پالتو مرغ کی موت پر لکھا تھا، اس کا ایک ایک شعر اس کی دقیقہ رسی، تخیل کی بلندی اور جدّتِ ادا کا پتہ دیتا ہے، اس نے ایسے انداز میں مرغ کی مرقع نگاری کی ہے جس سے اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں'

لہفی علیک ابا النذیر لو انہ دفع المنایا عنک لہف شفیق

اے وہ کہ جو ہمیں ہوشیار رکھنے والا تھا، تیری موت پر ایک مہربان و شفیق کیجانب سے حسرت وافسوس ہو کاش تجھ سے موت ٹالی جاسکتی۔"

اس کے سفید، چمکدار اور رنگ برنگے طاؤسی پروں کی مصوری ان الفاظ میں کرتا ہے،

وکسیت کالطاؤس ریشا لامعا متلألہا ذا رونق وبریق

من حمرۃ فی صفرۃ فی خضرۃ تخییلہا یغنی عن التحقیق

اس کی گردن کے اوپری حصّہ کو موج زرّین سے تشبیہہ دیتا ہے، اور اس کے کیس کو لعل عقیق کے تاج سے تعبیر کرتا ہے، سے

وکان سالفتیک تبر سائل وعلی المفارق منک تاج عقیق

پھر اس کی سریلی آواز کو یاد کرتا ہے جس میں اسکو موسیقی کے نغمے محسوس ہوتے ہیں،

نائی دقیق ناعم قرنت بہ   نغم مؤلفۃ من الموسیقی

تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس مرثیہ کے ۳۰ اشعار منقول ہیں، جو سب بلند پایہ ہیں
وصف الہر والفار یعنی چوہے، بلی کی توصیف پر بھی ابوالفرج کی وصفیہ شاعری کا
شاہکار ہے۔

یہ ابوالفرج کی جدتِ طبع تھی کہ اس نے روایتی درباری شاعری سے ہٹ کر
ترقی پسندانہ روش اختیار کی اور معمولی چیزوں پر طبع آزمائی کرکے ان کو بڑے
دلکش انداز میں پیش کیا۔

مدح سرائی

مدحیہ شاعری میں بھی ابوالفرج نے تشبیہات استعارات سے بڑی
ندرت پیدا کی۔ سیف الدولہ اور وزیر مہلبی کی شان میں اس نے کئی قصائد لکھے جو
تاریخ ادب کی زینت ہیں اگرچہ قصیدہ نگاری میں متنبی کے سامنے اس کا چراغ نہ جل سکا
مگر اس میں بھی اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ادیبوں کو کرنا پڑا، وزیر مہلبی
کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو ابوالفرج نے اس کی تہنیت میں ایک طویل قصیدہ لکھا، اس
قصیدہ کا عنوان، میلاد المشتری، ہے، مہلبی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہتا ہے۔

اسعد بمولود اتاک مبارکا   کالبدر اشرق جنح لیل مقمر
شمس الضحی قرنت الی بدر الدجی   حتی اذا اجتمعا انت بالمشتری

آپ کو نوزائیدہ بچہ کی آمد مبارک و مسعود ہو! گویا کہ چودھویں کے چاند نے رات کے گوشے گوشے کو
اپنی چاندنی سے روشن کر دیا، اور دن چڑھے کے سورج اور اندھیری رات کے روشن چاند کے
میل سے مشتری ستارہ نمودار ہو گیا۔

ایک دوسرا قصیدہ تہنیۃ عید الفطر، کا ہے جس کا مطلع ہے ؎

اذا ما علا فی الصدر والنہی والامر و بسہما فی النفع منہ و فی الضر

یہ سب قصائد شعر و ادب کی جان ہیں،

ہجوگوئی۔ بہت سے اہل ادب نے ابوالفرج کی ہجویہ شاعری کی بڑی تعریف کی ہو جیسا کہ انطون صالحانی نے اغانی کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے، لیکن مجھے تو اس کی ہجویات گنوار کی لٹھ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتیں، اس کی ہجوگوئی طنز و تمسخر کی روح سے جو ہجو کی جان ہے بالکل خالی ہے، راضی باللہ کے عہد میں جب ابوعبداللہ بریدی منصب وزارت سرفراز ہوا تو ابوالفرج نے ایک طویل ہجویہ قصیدہ لکھا جس کے دو اشعار یہ ہیں ؎

یا سماء اسقطی و یا ارض میدی قد تولی وزارۃ ابن البریدی

ھدم رکن الاسلام وانہتک الملک ومحیت آثارہ فہو مودی

ابن البریدی وزارت پر آگیا ہے، اے زمین تو دھنس کیوں نہیں جاتی، اے آسمان تو ٹوٹ کر گر کیوں نہیں پڑتا۔ اسلام کا ستون گرا دیا گیا، اقتدار رسوا ہو گیا، اس کے آثار مٹا دیئے گئے کیونکہ وہ شخص بربادی کرنے والا ہے،

ایک بار وہ کسی وجہ سے اپنے سرپرست ابومحمد وزیر مہلبی سے شکوہ سنج ہوا، کہنے لگا، کیا آپ نے کسی گداگر کی طرح مجھکو سمجھا ہے اگر ایسا ہے تو آپ نے گویا غنی بنانے کے بعد مجھکو بلندیوں سے نیچے ڈھکیل دیا ہے ؎

ابعین مفتقر الیک رأیتنی بعد الغنی فرمیت بی من حالق

آخر میں کہتا ہے کہ آپ مورد ملامت نہیں ہیں، قصور وار تو میں ہی ہوں، کہ میں نے خالق کائنات کو چھوڑ کر اس کے غیر سے حسن سلوک کا آسرا لگایا۔ ؎

لست الملوم، انا الملوم لاننی املت للاحسان غیر الخالق

داخلی اور وجدانی شاعری | ایک مرتبہ ابوالفرج بصرہ گیا، وہاں وہ بالکل اجنبی تھا،
کسی سے بھی واقف نہ تھا، صرف بعض لوگوں کے نام جانتا تھا، اس کس مپرسی کے عالم
میں ایک سرائے کی طرف چل پڑا۔ اور ایک کمرہ اسے کرایہ پر ملا۔ اسی کمرہ میں
حکایت حال کے طور پر ایک قصیدہ لکھا، یہ قصیدہ داخلی شاعری اور وجدانی کیفیات
کی تصویر ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان میں شاعر خدا کا شکر ادا
کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ آخر میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا اب دنیا سے میزبانی دیہاتی کی
رسم اٹھ چکی ہے؟ بازار کا کھانا اور کرایہ کا گھر تو مجھے اپنا اچھا گھر یاد دلاتا ہے، ایسی
حالت میں میں کیونکر خوش خرم رہ کر چین کی نیند سو سکتا ہوں وہی پاک ذات غیب کی بات جانے!
اس مفہوم کو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

الحمد اللہ علی ما أری　　من صنعتی من بین ھذا الوری
أصار فی الدھر الی حالۃ　　بعدم فیہ الضیف عند القری
أصبح اذا السوق لی مأکلا　　وصار خبز البیت خبز الشرا
وبعد ملکی منزلا مبھجا　　سکنت ما من بیوت الکری
فکیف الفی لاھیا ضاحکا　　وکیف أحظی بلذیذ الکری
سبحان من یعلم خلفنا　　وبین أیدینا وتحت الثری[1]

ان نمونوں سے ابوالفرج کی شاعری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، گو
متنبی کی موجودگی میں اس کی شہرت کا چراغ روشن نہ ہو سکا، اگرچہ نثر در الشاری کی
مشغولیت نے اسکو شاعری کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ
نثر وانشاء کا امام ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گو شاعر بھی تھا، اسکی شاعرانہ حیثیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] شفیق جبری: ابوالفرج الاصبہانی ص ۳۰،

ابوالفرج اصبہانی بحیثیت نثار | بنیادی طور پر ابوالفرج اصبہانی ایک نثار، انشاء پرداز اور صاحب طرز ادیب تھا۔ اس کا جوہر نثر و انشاء ہی کے میدان میں نمایاں ہوا نثری ادب میں اس کا حصّہ نہایت اہم بالشان ہے۔ اور اس کی بیشتر ادبی خدمات کا تعلق چار دائروں سے ہے۔

(۱) حکایت نگاری۔ (۲) تاریخ نویسی۔ (۳) تنقید نگاری۔ (۴) مرقع نگاری اور تصویر کشی،

حکایت نگاری۔ | حکایت نگاری ابوالفرج کا خاص موضوع ہے۔ اغانی کی حکایات میں اس نے ادبی رنگ و آہنگ میں عرب اور ایام عرب (بشمولیت خلفاء اسلام و مسلمان امراء) کے واقعات، ادباء و شعراء کے قصوں، سازندوں اور موسیقی کاروں کے لطیفوں کو اس دلچسپ اسلوب نگارش میں پیش کیا ہے، جس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اغانی کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب میں اغانی (راگ راگنی) اور مغنّیوں کے حالات بیان کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر حکایت سے حکایت نکلتی چلی گئی، اور ضمناً اخبار و آثار، سیر، اشعار، ادبی قصص اور لطائف و ظرائف بھی شامل ہوتے گئے، اور فن کاروں کے ذکر میں ان کے اخلاق و عادات اور فکر و فن پر تبصرہ بھی شامل ہوگیا، اس طرح حکایت نگاری کے پردہ میں ایک عہد کی پوری زندگی اس کتاب میں جلوہ آرا ہوگئی، ابوالفرج خلفاء و امراء کے درباروں اور خلوت خانوں میں گھس گھس کر حالات و واقعات معلوم کرتا، پھر عوام کے سامنے ان کی پردہ دری کرتا تھا، اگرچہ ان واقعات کی تاریخی حیثیت پر بحث و نظر کی گنجائش ہے، لیکن اس دور کی عام اجتماعی حالت کی تصویر کشی کی صداقت میں کسی کو کلام نہیں جس طرح فسانۂ آزاد کی

کوئی تاریخی حیثیت نہیں، لیکن اس میں اس دور کے تمدن کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ بڑی حد تک صحیح ہے،

تاریخ نویسی | خالص تاریخ میں ابوالفرج کی کوئی کتاب موجود نہیں، کتاب الاغانی کی حکایات و مرویات کی حیثیت نیم تاریخی قصوں سے زیادہ نہیں، جو بعد میں رومان (Romance) میں تبدیل ہوتے گئے۔[۱]

اغانی کی اہمیت و شہرت کی وجہ اس کی تاریخی حیثیت نہیں بلکہ ادبی ہے، اس سے ایک ادیب اور انشاء پرداز کے ذوق کی آسودگی ہوتی ہے، اور متفرق واقعات کی روشنی میں چند ادوار کی عمومی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے، لیکن ایک مورخ و محقق کی تسکین کا سامان اس میں نہیں ہے،

البتہ ابوالفرج کی ایک دوسری تصنیف، مقاتل الطالبین ہے، جو تاریخی سیر و سوانح کی کتاب ہے جس میں اسکا تاریخی ذوق نمایاں ہے، یہ کتاب ۲۹ سال کی عمر میں اس نے مکمل کرلی تھی، اس میں عہد رسالت سے لیکر ۳۱۳ھ تک بنی طالب کے جتنے لوگ قتل کئے گئے، اُن سب کی سیر و سوانح اور اسباب قتل روایت حدیث کے طرز پر رواۃ کے سلسلہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

ہیلبی کی قادر الکلامی کی تعریف میں کہتا ہے،

ویقتضب المعنی الکثیر بلفظہ	وہ برجستہ و بے ساختہ بہت سا مفہوم
ویاتی بما تحوی الطوامیر فی	اپنے لفظ میں ادا کر دیتا ہے اور ایک
فی سطرہ	سطر میں ذخیرے بھر دیتا ہے،

---

[۱] ابوالفضل، تاریخ ادبیات عربی ص ۴۵۰،

ٹھیک یہی بات اس پر بھی صادق آتی ہے۔ مقاتل الطالبین میں تاریخ نویسی کا پورا انداز ہے، سلسلۂ رواۃ مکمل موجود ہے، خواہ رواۃ کسی پایہ کے ہوں اس میں ابوالفرج نے در دروغ برگردن راوی کے اصول پر عمل کیا ہے۔

تاریخ نویسی کا لفظ یہاں پر عام معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، ورنہ تاریخ نویس اور سوانح نگار کا فرق اس میں بھی قائم ہے۔ مورخ کا مطالعہ معروضی (Objective) ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کی سی ہے، اس کے مقابلہ میں سوانح نگار کا مطالعہ تمام تر موضوعی (Subjective) ہوتا ہے، اور اسکی حیثیت ایک دردمند عزیز کی ہوتی ہے۔

اس کتاب میں اغانی سے زیادہ تاریخ نویسی کے آداب ملحوظ رکھے گئے ہیں، اس لئے اس کو مصنف کی تاریخی خدمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً آل جفنہ کے مشہور حکمراں جبلہ بن ایہم کا اسلام لانا، اور پھر حضرت عمرؓ کے عادلانہ و مساویانہ فیصلہ پر اس کا ارتداد ایک تاریخی واقعہ ہے۔ یہ واقعہ بہت سی تاریخوں میں ہے۔ اس کے آخری چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔ جس سے فکر و نظر کے دو بنیادی اختلافات پر روشنی پڑتی ہے، اس زمانہ میں بادشاہ عام لوگوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا، اور حضرت عمرؓ فاروق تمام انسانوں کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درمیان عدل و مساوات کے قائل تھے۔

قال عمرؓ: آمر بهشم انفك	حضرت عمرؓ نے فرمایا جبلہ جیسا تم نے
یا جبلہ کما فعلت، قال	کیا ہے میں بھی مضروب کو تمھاری
جبلہ وکیف ذالك یا	ناک توڑنے کا حکم دوں گا جبلہ نے کہا

۱

امیر المومنین وھو سوقۃ　　　امیر المومنین یہ کیوں وہ ادنیٰ درجہ کا
وانا ملک قال ان الاسلام　　　آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں، حضرت عمرؓ
جمعک وایاہ فلست تفضلہ　　　نے فرمایا کہ اسلام نے دونوں کو برابر کر دیا
بشیئ الا بالتقوی ؎　　　ہے تم کو تقوی کے علاوہ اور کسی ذریعہ
　　　سے اس پر فضیلت نہیں ہو سکتی،

حالات وزمانہ کی تصویر کشی، حالات وزمانہ کی تصویر کشی اور اشخاص کی مرقع نگاری اصبہانی کا خاص موضوع ہے، آغانی اس کا نمونہ ہے، اس کی تاریخی حیثیت جیسی بھی ہو مگر بحیثیت مجموعی اس دور کے حالات کی جیسی تصویر اس میں نظر آتی ہے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی،

یوں تو پوری کتاب الاغانی اس حقیقت پر شاہد ہے. لیکن اگر عوام کی ذہنیت

؎ مقاتل الطالبیین لابی الفرج الاصبہانی. ص ۴۰ معارف جبلہ بن ایہم شام کا مشہور رئیس وحکمران تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا کعبہ کے طواف میں اس کی چادر کا کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس نے بھی ایک تھپڑ رسید کیا، جبلہ بے تاب ہو گیا، اور حضرت عمرؓ کے پاس جا کے اس کی شکایت کی، انھوں نے شکایت سنکر فرمایا، اس میں شکایت کا موقع نہیں ہے تم نے اپنے کئے کی سزا پالی، اس کو سخت حیرت ہوئی، اس نے کہا ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ جو شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے اسکی سزا قتل ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا بیشک جاہلیت میں ایسا ہی تھا، لیکن اسلام نے بلند و پست کو ایک کر دیا، اس نے کہا اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف اور رذیل کی تمیز نہیں، تو میں اسلام سے باز آیا اور چھپ کر قسطنطنیہ بھاگ گیا؛

حضرت عمرؓ کا جواب مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں منقول ہے، مگر مفہوم و منشا سب کا ایک ہے،

و نفسیات کی تصویر دیکھنی ہو تو عقلیۃ العامۃ[1]۔ بنی امیہ کے راگوں اور نغموں کا علم مطلوب ہو تو غناء دمشق، اور ملوک غسان کے درباروں کا جاہ و جلال دیکھنا ہو تو۔ مجالس ملوک غسان[2] کے حالات دیکھے جائیں تو اس سے ابوالفرج کی مرقع نگاری اور ادیبانہ تصویر کشی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا،

تنقید نگاری، | ابوالفرج نے ادبی تنقید میں بھی اپنی عبقریت اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ ابوتمام کی شاعری اور اس کی خصوصیات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے۔

ابوتمام شاعر مطبوع، لطیف الفطنۃ، دقیق المعانی غواص علی ما یستصعب منھا ویعسر متناولہ علی غیرہ

بحتری کے متعلق لکھتا ہے

البحتری شاعر فاضل حسن المذھب، نقی الکلام مطبوع ولہ تصرف حسن فاضل نقی فی ضروب الشعر سوی الھجاء"

ابن المعتز کی تحسین و مدافعت میں البتہ وہ نقاد سے زیادہ سوانح نگار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے علم و فضل پر بحث کرتے ہوئے اس کے مخالفین کے جواب میں لکھتا ہے

ممن صنع من اولاد الخلفاء فأجاد و أحسن وبرع وتقدم جمیع اھل عصرہ فضلا وشرفا و أدبا وشعرا و ظرفا وتصرفا فی سائر الآداب ابو العباس ابن المعتز باللہ[3]

ابن المعتز کے بارہ میں یہ رائے عادلانہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ دوسرے

---

[1] الاغانی ج ۲، ص ۱۴، [2] الاغانی ج ۱۲، ص ۱۳، [3] ایضاً ج ۹ ص ۱۳۳

نقادوں نے بھی لکھا ہے، بحیثیت مجموعی ابوالفرج کی تنقید میں بڑا اعتدال و توازن ہوتا ہے، تنقید ادب ہو یا تنقید سماج اُس کی تنقیدیں افراط و تفریط اور انتہا پسندی سے پاک ہوتی ہیں،

اصبہانی کا اسلوبِ نگارش | واقعات کی روایت میں ابوالفرج اصبہانی نے محدثین کا طرز اختیار کیا ہے، جو اس دور میں مقبول عام تھا، چنانچہ ان ہی کی طرح روایت میں معنعن سلسلے (عن فلان بن فلان) کا اہتمام، اغانی اور مقاتل الطالبین دونوں کتابوں رکھا ہے۔ البتہ اسناد کی صحت اور رواۃ کی جرح و تعدیل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں رکھی ہے۔

مقاتل الطالبین میں کبھی کبھی بعض رواۃ کی خامیوں کی طرف اشارہ کرجاتا ہے، مثلاً ایک جگہ علی بن محمد النوفلی کی روایات کو بیکار محض اور افواہ (اراجیف و اباطیل) قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کی تمام روایات اس کے والد سے موقوفاً مروی ہیں، جو اس سے بہت دور کوفہ سے بہت پہلے جاچکے تھے۔

"واکثر حکایاتہ فی ذالک بل سائرھا من ابیہ موقوفا علیہ لا یتجاوزہ وأبوہ حینئذ مقیم بالبصرۃ لا یعلم بشئی من أخبار القوم إلا ما یسمعہ من السنۃ العامۃ علی سبیل الاراجیف والاباطیل"[1]

مفرد الفاظ اور فقرے نہایت چست، برمحل، موزوں اور رچے تلے استعمال کرتا ہے، زبان سلیس اور ترکیبیں شگفتہ ہوتی ہیں، جو ہر دور میں مقبول رہیں حتی کہ

---

[1] مقاتل الطالبین للاصبہانی ص ۴۱۵،

آج بھی ان کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔ اور اہل قلم اپنی تحریروں میں اس کو استعمال کرتے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اغانی اپنے موضوع اور زبان وبیان کے اعتبار سے ہر دور میں بے مثال اور سدا بہار رہی ہے، اور آج بھی ہے،

الفاظ اور زبان پر اس کو اتنی قدرت ہے کہ چند الفاظ اور فقروں میں مطلوب چیز کا پورا نقشہ کھینچ دیتا ہے، مثلاً غیظ وغضب کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے،

"فترب دجهه وجحظت عيناه وهم بالوثوب"

"فخفق كما يخفق الطائر، فاضطرب اضطراب العصفور

فخيل إلى أن الشجرة تنطق"[1]

کتاب الاغانی کی قدر وقیمت، "الاغانی" عربی ادب کا شاہکار ہے، اور ادب انشا کا سرچشمہ ہے۔ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو الفرج نے کتاب مکمل کرنے کے بعد سیف الدولہ کے حضور میں پیش کی وہ اس وقت رومیوں سے جنگ کی تیاری میں مشغول تھا، اس نے ایک ہزار دینار دیئے اور معذرت کی کہ عجلت کے باعث اس کی پوری قدر نہ کرسکا۔

یہ خبر جب نامور انشا پرداز صاحب بن عباد کو پہنچی تو اس نے کہا سیف الدولہ نے ناقدری کی، ابو الفرج تو اس سے کہیں زیادہ کا مستحق تھا، اغانی کے قابل رشک محاسن اور نپے تلے فقروں کا حریف کون ہو سکتا ہے، یہ الفاظ اور فقرے زاہد کے لیے مایہ تفریح، عالم کے لیے معلومات کا خزانہ، انشا پرداز اور جویائے ادب کے لیے سرمایۂ تجارت، بہادر کے لیے ہمت وشجاعت کی ڈھال، ظریف کے لیے ریاضت

[1] الاغانی ج ۱ ص ۱۰۲

وصناعت، بادشاہ کشور کشا کے لئے سامان سرور ولذت ہیں، میرے کتب خانہ میں ایک لاکھ سترہ ہزار کتابیں ہیں، مگر اغانی سے بڑھ کر میری انیس کوئی کتاب نہیں[۱]،

صاحب بن عباد نے یہ بھی کہا کہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی مجھے جستجو رہی ہو اور اغانی میں نہ مل گئی ہو۔ جو واقعات علماء نے بہت سی کتابوں میں لکھے ہیں وہ سب اس میں حسن تالیف اور لطف بیان کے ساتھ موجود ہیں، سیف الدولہ سفر وحضر میں اس کتاب کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں، اس کا ایک مسودہ بغداد میں چار ہزار درہم میں فروخت ہوا تھا۔

صاحب نفخ الطیب کے حوالہ سے بطرس بستانی نے لکھا ہے کہ اندلس کے اموی خلیفہ حاکم مستنصر نے آغانی کو محض دیکھنے کے لیے ایک ہزار دینار بھیجے تھے۔ حکومت مروانیہ کے فرمانروا الحکم بن ناصر کے بارے میں بھی اسی طرح کی روایت بیان کی جاتی ہے، اس نے بھی ایک ہزار دینار صاحب اغانی کو محض اس کتاب کے دیکھنے کے لیے عنایت کئے تھے تاکہ وہ عباسی خلفاء سے پہلے اس کو دیکھ لے[۲]۔

اغانی کی حیثیت ــــ ادبی یا تاریخی؟ | جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس دور میں جہاں ایک طرف ارباب اقتدار عیش وعشرت کی سرمستیوں میں مبتلا تھے، دوسری طرف اس کی قدردانی اور علم نوازی سے علماء اور ادباء، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال اور ادبیات کی تدوین وتالیف میں ہمہ تن مصروف تھے، یہ دونوں رخ مستند تاریخی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں، اس لیے یہ دور اگر عیش پرستی کا گہوارہ تھا تو علوم وفنون کا بھی عہد زریں تھا۔

---

[۱] بطرس البستانی: ادباء العرب فی الاعصر العباسیہ، ص ۲۱۰ [۲] ابوالفضل: تاریخ ادبیات عربی ص ۱۵۰

فن حدیث، تاریخ اور اسماء الرجال کی وجہ سے نقل روایت کا ایک خصوصی نہج قائم ہوگیا تھا۔ اور ہر واقعہ سلسلہ اسناد و رواۃ کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا، اس کے بغیر کوئی کتاب مشکل ہی سے قابلِ توجہ بنتی تھی اس لئے اغانی بھی اسی اسلوب میں لکھی گئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معنعن سلسلہ سے (عن فلان ابن فلان انہ قال کے انداز پر) جو حکایت بھی نقل کر دیجائے وہ لازمی طور پر مستند و معتبر ہی ہو، مستشرقین کو اس اسلوبِ نگارش سے غلط فہمی ہوئی، اور انھوں نے اغانی کی تمام روایات کو مستند مان لیا، جوزیف ہیل کی کتاب عربوں کا تمدن، اسی غلطی کا ایک نمونہ ہے۔ انھوں نے اغانی کی حکایات و روایات کی بنیاد پر تاریخ عرب سے متعلق مستقل نظریے قائم کر لیے جوزیف ہیل کی یہ کتاب جب شائع ہوئی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں اس کی تردید کی اور لکھا کہ "مولانا عبدالحلیم شرر کے اکثر دلچسپ تاریخی مضامین اسی کتاب الاغانی ہی سے ماخوذ ہیں، جنھیں اہل علم نے کبھی بھی مستند تاریخ تسلیم نہیں کیا۔"[1]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، صاحب الاغانی ابوالفرج اصبہانی بڑا زندہ دل اور رنگین مزاج تھا اسکی ساری زندگی رنگین مشاغل میں گذری ہر وقت لہو ولعب مین مبتلا رہتا تھا، اس کی تصانیف کا مرکزی موضوع علم انساب، شعر و سخن میخوار عاشقوں، گویوں ... اور گانے والیوں، راگ راگنیوں اور ان میں مست رہنے والوں کے حالات و واقعات ہیں۔ اس سلسلہ میں اسکو خلفا، وزرا، اور عمال، اور ان کے تفریحی مشغلوں سے زیادہ دلچسپی تھی، جو اغانی کے ہر صفحہ سے نمایاں ہے، اس نے اس کتاب میں شعراء، امراء اور دیگر مشاہیر کے صرف وہی واقعات و حالات

---

[1] معارف اعظم گڈھ سنہ ۱۹۳۰ء (ملخصاً و مختصراً)

نقل کئے ہیں، جو اس کے ذوق سے ہم آہنگ اور دل بہلانے کا سامان فراہم کرتے ہیں اخلاقی پستی کے اظہار میں اسے کوئی جھجھک نہیں ہوتی۔ حالانکہ انھیں شخصیات کے اخلاقی محاسن بھی بیان کئے جا سکتے تھے اسی بنا پر جرجی زیدان اور طہٰ حسین نے یہ سمجھ لیا کہ پورا عباسی دور فسق و فجور کا عہد تھا، اور اس زمانہ میں عوام، خواص، علماء اور امراء سب اخلاقی پستی کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، جو سراسر غلط ہے اس دور میں اگر ایک طرف عیش و نشاط کی سرمستیاں تھیں تو دوسری طرف علمی و تمدنی ترقی کا دور شباب تھا، اس پر بحث کرتے ہوئے کہ اغانی کس قسم کی کتاب ہے، ؟ ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں[1] کہ اغانی کے مقدمہ پر نظر ڈالنے سے اس کی اہم خصوصیات خود بخود واضح ہو جاتی ہیں، آغانی خود لکھتا ہے،

> کتاب کے ہر فصل میں کچھ نہ کچھ ایسا مواد مہیا کیا گیا ہے جو اہلِ ذوق کی تفریح کا سامان بن سکے۔ اس میں سنجیدہ واقعات بھی ہیں، اور خرافات بھی ایام عرب کے قصص بھی ہیں اور مستند تاریخی واقعات بھی، شاہان عرب اور خلفاء اسلام کے افسانے بھی ہیں، اور شعراء و ادباء کے ظریفانہ قصے بھی موسیقی جسقدر راگ لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر کے متعلق کوئی نہ کوئی ایسا افسانہ ضرور ہے، جو لوگوں کے ہنسنے ہنسانے کا کام دے،

لیکن ہر فن کے ساتھ اس کا التزام نہیں ہے۔ اور جو واقعات نقل کئے گئے ہیں ضروری نہیں ہے کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہوں اور اگر نتیجہ خیز ہوں تو ضروری نہیں کہ سامعین کے لئے دلچسپ بھی ہوں جس سے اہل ذوق محظوظ ہو سکیں۔

---

[1] مجلۃ "المقتطف" (مصر) جولائی [illegible] (بحوالہ معارف ج ۲۶ شمارہ ۳)

اصبہانی کے یہ الفاظ اس کا ثبوت ہیں کہ واقعات کے انتخاب میں صرف اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ دلچسپ ہوں اور گرمیٔ محفل کا سامان بن سکیں، اس لئے ان تفریحی ظرافت آمیز مرویات کو تاریخی واقعات کی طرح مستند سمجھنا خود اپنی غلطی ہے اگرچہ اغانی کے مندرجات مسلسل سند سے مروی ہیں، لیکن یہی سلسلہ اسناد سب سے زیادہ فریب دہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسناد کے خوبصورت سلسلہ کے باوجود رواۃ اور استناد دونوں نہایت کمزور ہیں، اور ان میں بڑا تضاد وتناقض ہے۔ اشخاص کے سوانح نہیں بلکہ حالات وزمانہ کی تصویر کشی اور ادبی لطائف کو پیش کرتا ہے، اس کے لئے واقعات کی صحت ضروری نہیں اصبہانی خود بھی ان حکایات کے تاریخی پایہ کی طرف اشارہ کرجایا کرتا ہے، مثلاً کہیں حدیث غریب کہیں حدیث حلو، اور کہیں "واقعہ جیسا کہ مجھ تک پہنچا ہے، لکھتا ہے،

مشہور عیسائی ادیب بطرس بستانی کی رائے بھی یہی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"کہ ابوالفرج طالب لذت تھا، اس کی کتاب کی بنیاد موسیقی پر ہے، اور موسیقی کا مقصد حصول لذت ہے، اس لئے اس کی کتاب میں لغویات اور فسق وفجور کی باتوں کا غلبہ ہے، اور وہ رکیک نوادر سے بھری ہوئی ہے، وہ شعراء، ان کے حالات اور اس کی فحش اشعار اور اخلاقی پستی کو نمایاں کرتا ہے، اور خلفاء، ان کی اولاد، ان کی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتا، ان کے عشق، ان کی حزاہاتی زندگی اور لہو ولعب شراب وکباب اور رنگ رلیوں کا ذکر کرتا ہے، اس لئے ہم تاریخی حیثیت سے آغانی پر اعتماد نہیں کر سکتے، خصوصاً اسلامی اور مو ـ لدین کے بارہ میں کیونکہ

ان کا ذکر وہ عموماً تفریح اور لہو ولعب کے لیے کرتا ہے، اس لئے اس کی تمام روایات کو قبول نہیں کیا جا سکتا، البتہ بعض روایتیں احتیاط کے ساتھ قبول کیجا سکتی ہیں"

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ آغانی ادبی لطائف کا مجموعہ ہے، جس سے ذوق ادب کو تو تسکین ہوتی ہے، لیکن وہ کوئی مستند تاریخ نہیں، اس کے باوجود وہ اس دور کی سوسائٹی کے ایک رخ کی تصویر ہے، جس کو افسوسناک تو کہا جا سکتا ہے، لیکن نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ موسیقی، اور شعر و ادب اور نوادر و لطائف کا بیش بہا سرمایہ ہے،

چند ادبی کتابیں

خواجہ عزیز کی شاعری

از۔ جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

(۲)

خواجہ صاحب کا دیوان اگرچہ بہت زیادہ ضخیم نہیں ہے تاہم وہ تقریباً دو سو غزلوں، بیس سے زیادہ قصائد، چار مختصر مثنویوں اور دیگر اصنافِ سخن مثلاً تاریخی قطعات، مرثیے، ترکیب بند، رباعیات اور ہفت بند وغیرہ پر مشتمل ہے،

یہ دیوان پہلی اور آخری بار شاہی پریس لکھنؤ میں ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوا جو عام طور پر دستیاب ہوتا ہے۔ اور ۲۰ × ۲۶ سائز کے ۲۴۴ صفحات پر حاوی ہے، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں اس کے مرتب خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے خواجہ وصی الدین صاحب (ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ) ہیں دیوان کے آخر میں خواجہ صاحب کے کچھ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے عہد کے ... کو لکھے تھے جن سے فارسی نثر پر ان کی قدرت اور برجستگی کا اندازہ ہوتا ہے ——

اگلے صفحات میں ہم انشاء اللہ تمام اصنافِ سخن کا الگ الگ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے، سب سے پہلے غزل پر تبصرہ کیا جاتا ہے،

خواجہ صاحب کی شاعری حشو و زوائد سے پاک ہے، مضامین میں لطافت اور

دلکشی کے ساتھ ساتھ پاکیزگی ہے۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں شاعری کا جو رنگ تھا، اور اس میں جو سطحیت پیدا ہو گئی تھی، اُن کا کلام اس سے پاک ہے۔ ان کے یہاں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ زبان صاف، سادہ اور رواں، طرز ادا دلکش، متین اور شیریں ہے۔ کہیں کہیں آورد بھی ہے، لیکن جہاں اشعار کا ورود کثرت سے ہوا ہے، وہاں آمد کا لطف قابل دید ہے۔ روانی ایسے اشعار کی جان ہے۔

صوفیانہ شاعری | خواجہ عزیز صوفی منش انسان تھے اس لئے ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے جذبات صوفیانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

ما عاشقیم عشق بود کار ما عزیزؔ عاشق پسند ہست ہمانا کلام ما

عشق کا جذبہ ان کے نزدیک بہت بلند ہے جو بڑی ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ وہ عشق "موئے میان" سے زیادہ باریک اور بے انتہا پرخطر ہے ؎

منزل عشق کہ از دیدہ نہانست اینجا راہ باریک تر از موئے میانست اینجا

جہاں عشق میں اس جذبے کی کارفرمائی ہوگی وہ ہوا و ہوس سے پاک اور مجاز سے الگ عشق حقیقی ہی ہو سکتا ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو عاشق کو اندر ہی اندر جلاتی رہتی ہے اور اسے محسوس نہیں ہوتا ؎

تمام سوختم و ایں قدر ندانستم کہ دل برائے چہ ہمچو کباب می سوزد

حقیقی عشق کی قدر و منزلت ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

یک جرعہ کند زندہ بسے مردہ دلاں را در ساغر ما چیست اگر آب بقا نیست

اسکا ایک گھونٹ مردہ دلوں میں جان ڈال دیتا ہے، اس لئے اگر میرے ساغر میں آب حیات

نہیں، تو وہ کیا چیز ہے

اپنے عشق میں مصائب بھی پیش آئیں ان کو برداشت کرنا چاہیئے۔

بدشت عشق مکن تعطش عزیز خوش　　　　چہ ذکر آب کہ ایں جا سراب نماند

عشق کا یہ مقام یا معرفت الٰہی نقش ہستی کو مٹانے سے ملتا ہے۔

چاک کن جامۂ ہستی کہ شود داو پیدا　　　　تا گریباں ندرد گل نہ کند بو پیدا

جامۂ ہستی کو چاک کردو تب وہ ملے گا پھول جب تک گریباں نہیں پھاڑتا بو نہیں پیدا ہوتی،

چاک درون سینۂ من کے شود درست　　　　صد سال اگر ز سوزنِ عیسیٰ رفو کنم

یہ چاک وہ ہے جس کو سوزنِ عیسیٰ بھی رفو نہیں کر سکتا

ز داغ سینہ رسد فیض جملہ اعضا را　　　　یک آفتاب بود بس تمام دنیا را

سالک کے "سینہ کا داغ" کا فیض سارے اعضا کو پہنچتا ہے، جس طرح ایک آفتاب ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے،

یہ عشق آسانی سے پیدا نہیں ہوتا اس کے لئے جاں گدازی اور خون جگر پینے کی ضرورت ہے، سہ

عشق بازی درحقیقت جانگدازی بودہ است　　　　عمرہا خوں خوردہ ام ایں مئے نہ آساں خوردہ ام

عشق بازی درحقیقت جانگدازی کا نام ہے، اس شراب کو آسانی سے نہیں پیا ہے بلکہ برسوں خون جگر پینا پڑا ہے،

شرح دل من جز تو حکیمی نتواں کرد　　　　مجموعۂ عشق است اشارات و شفا نیست

میرے دل کی شرح تیرے سوا کوئی حکیم نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عشق کا مجموعہ اشارات و شفا نہیں ہے، شفا، بوعلی سینا کی کتاب ہے، اور اس کی شرح اشارات محقق طوسی کی تصنیف ہے

وہ محبوب حقیقی کا ظہور کائناتِ عالم کی ہر شے میں دیکھتے ہیں مگر اس کے اوصاف

بیان کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں، ؎

بچہ اسباب کند وصف تو ہیہات عزیزؔ نہ دہانے نہ زبانے نہ بیانے دارد

افسوس عزیزؔ کن وسائل سے تیرے اوصاف بیان کرے اس کے بیان کرنے کے لیے نہ منہ ہے، نہ زبان ہے، نہ قوت بیان ہے،

دنیا کی ہر شے اس کا ایک بیان ہے، مگر گوش ہوش نہیں جو اسے سن سکے ؎

گوش گل طاقتِ افسانہ ندارد بلبل ورنہ ہر خار زبانے و بیانے دارد

ان کی غزلوں میں بے ثباتی دنیا، دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیازی، زندگی کی بے اعتباری وغیرہ کے مضامین بکثرت ملتے ہیں، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

اعتبارے نبود بر سر و سامان جہان بیش من بے سر و ساماں سر و ساماں ہونا

کجا این ساغر و مینا بفرداد سترس باشد غنیمت داں عزیزؔ امروز دور گرم محفلہا

قصر شاہی نرسد کلبۂ درویشی را کہ گدائے در او ناز بخاقاں دارد

مست بلبل شیدا در ین چمن دل را جہان پر خس و خاشاک آشیانہ کیست؟

کلام عزیزؔ کی اس حقیقت کا اعتراف علامہ اقبال نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں،

"غزل میں ان کی نظر بیشتر روحانی حقایق پر رہتی ہے اور ان حقایق کو وہ نہایت آسانی سے اور لطافت کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

دو غنچہ ہست دو عالم ز گلشن صنعش یکے شگفتہ یکے ناشگفتہ است ہنوز

مسائل تصوف کے ساتھ ساتھ اخلاقی مضامین خواجہ صاحب کی شاعری کا اہم

عنصر ہیں، اور شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی اخلاقیات کی جزئیات پر ۔ ۔ ۔ ، گہری نظر ہے،

ہرگز بزیر سایۂ احسان نمی روم جاں می دہم بچشمۂ حیواں نمی روم

میں کسی کا زیر بار احسان ہونا پسند نہیں کرتا جان دیدیتا ہوں مگر چشمۂ حیوان تک نہیں جاتا۔

ہمیں بس است ز ہمت کہ در تہید ستی دراز پیش کسے نیست دست حاجتِ ما

ہرگز بسوئے محتشمان ، من نمی روم لب تشنہ جاں دہم و بدریا نمی روم

ہمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ تہیدستی میں بھی میرا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلتا اور میں کسی صاحب دولت و وجاہت کے پاس مدد کے لیے نہیں جاتا تشنہ لب جان دیدیتا ہوں مگر دریا کے پاس نہیں جاتا۔

گزشت قافلہ و ما ہنوز در خوابیم تباہ در دو جہاں خانماں غفلت ما

بری صحبت سے گریز کرنا چاہئے کہ سوسائٹی کا اثر انسان بہت جلد قبول کر لیتا ہے،

ہم نشینے نیک خصلت شو ز بد خوباں گریز آشنا با آشنا بیگانہ با بیگانہ باش

"با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا"، کا تصور خواجہ عزیز کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

در طریق ما بدشمن مہربانی خوش بود جائے در پہلوئے سیلاب را دیوار ما

ہمارے مسلک میں دشمن کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہیے چنانچہ ہماری دیوار اپنے پہلو میں سیلاب کو جگہ دیتی ہے

والکاظمین الغیظ کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں،

مئے نشاط کشیدن ہمیشہ عادت ما شراب غصہ حرام است در شریعت ما

انسان اس دنیا میں کیا مقصد لیکر آیا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر کن چیزوں میں گرفتار ہو گیا۔

از عدم آمدہ بودم پئے گلگشتِ جہان دام گیسوئے کسے کرد گرفتار مرا

ہم عدم سے دنیا کی سیر کیلئے آئے تھے، لیکن یہاں کسی کے گیسو نے گرفتار کر لیا،

از عدم آمدہ بودم پئے تفریح بہ دھر
چہ بلا آب و ہوا بود کہ بیمار شدم

ہم دنیا میں سیر و تفریح کے لیے آئے تھے، لیکن یہاں کی آب و ہوا ایسی خراب تھی کہ بیمار ہو گئے،

جو سالک ہمت سے کام لے تو بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی بہ آسانی پار لگ سکتی ہے۔

رہروانے کہ براہت کمر دل بستند
کشتیٔ خویش از بحر بساحل بُردند

تیری راہ کے جو راہرو دل سے کمر بستہ ہوتے ہیں، وہ اپنی کشتی ساحل تک پہنچا دیتے ہیں۔

وہ اقبال کی طرح مرغ ہمت کو بلند پروازی کی تعلیم دیتے ہیں۔

ز شاہباز جفائے فلک چہ می ترسی
تلاش قوت کن اے مرغ زآشیانہ بر خیز

تو شاہباز فلک کی جفا سے کیوں ڈرتا ہے، اپنا آشیانہ چھوڑ کر اپنی روزی تلاش کر،

فقر خاک راہ و دولت افسر اقبال بود
آں بفرق خویشتن ایں بر سر دارا نہ دم

اس کی ہمت یہ ہے کہ فقر کو خود اختیار کیا، اور دولت و اقبال کو دارا کیلئے چھوڑ دیا،

اس رنگ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

طوفاں اگرچہ خیزد از بحر غم چہ پروا
کشتی بہ مے روان کن ساقی چو ناخدا ایست

ہمت از دوست طلب کن کہ تو گلشن شبنم
بہ مددگاریٔ خورشید درخشاں برخاست

عشقیہ شاعری | خواجہ عزیز کی عشقیہ شاعری پاکیزہ تغزل کا اعلیٰ نمونہ، اور زبان و بیاں کی فصاحت و سلاست کے ساتھ تخیل کی بلندی و پاکیزگی سے معمور ہے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

چشمان تو بے شراب مستند
حاشا من و از تو بدگمانی

تیری آنکھیں بے پئے مست رہتی ہیں، مگر تجھ سے بدگمانی نہیں کرتا۔

اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر نے کہا تھا ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ مذہبِ عشق اختیار کیا

خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

نیست خالی از خیالِ زلفِ رعنایاں سرے
ایں بلا از عالمِ بالا کجا نازل نہ شد

یعنی ہر شخص گرفتارِ محبت ہے، گویا محبت بھی اک "بلائے ناگزیر" ہے، جو عالمِ بالا سے نازل ہوئی ہے، اس لیے اس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

نہ تبسم نہ تکلم نہ ادائے نہ صنم حیرتم ہست کہ چوں بردہ دل از برہمنان

بت نہ ہنستے ہیں نہ بولتے ہیں، نہ ان میں کوئی ادا ہے حیرت ہے کہ انھوں نے برہمنوں کے دل پر کس طرح قبضہ کر لیا۔

در حیرتم ز غمزہ و ناز و کرشمہ اش ہر شیوہ دلفریب بود دل کرا دہم

محبوب کی ہر ادا دل ربا ہوتی ہے، کس کس کو دل دیا جائے،

فنا ما وصل تو محروم دارم از وصل کہ در کنار چو آئی ز خود کنارہ کنم

محبوب کے وصال سے بھی لذت وصال سے اس لئے محرومی رہتی ہے کہ جب وہ آغوش میں آتا ہے تو عاشق ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے،

بوئے گل نیست کہ آید ز چمن در کویت ناتوانان تو بر دوش صبا می آیند

تیرا عاشق پھول کی بو نہیں ہے، جو چمن سے تیری گلی میں آجائے بلکہ اس کی ناتوانی اس کو دوش صبا کے سہارے لاتی ہے،

وصف گلہا بر خوباں بہ نزاکت مکنید کہ بود باعثِ آزردن نازک بدناں

حسینوں کے سامنے پھولوں کی تعریف نزاکت سے نہ کرو کہ اس سے نازک بدنوں سے آزردگی ہوتی ہے،

نہ غمزۂ نہ پری نے کرشمۂ از حور چگونہ بے تو تسلی کند کسے مارا

نہ پری میں کوئی غمزہ ہے نہ حور میں کوئی کرشمہ ہے، اس لئے کوئی شخص تیرے بغیر میری تسلی کس طرح کر سکتا ہے،

ببیں آں روئے و موئے و خط و خال و چشم و ابرو را
بدل دادن چہ می پرسی ز اسبابے کہ من دارم

محبوب کے چہرہ، بالوں، خط و خال اور چشم و آبرو کو دیکھو دلربائی کے اتنے سامانوں کے ہوتے ہوئے دل دینے کے سامان کو کیا پوچھتے ہو،

خوشم کاے بیوفا ناخواندہ کردی چاک مکتوبم
بعنوانے کہ حرفِ مدعا فہمیدۂ گویا

مجھے اس سے خوشی ہے کہ تجھ بے وفا نے اس طرح میرا خط بے پڑھے ہوئے چاک کر دیا ہے گویا میرے مدعا کو سمجھ گیا ہے،

شب آخر است و نیامد ہنوز یار عزیز
مگر بخواب درآید بنای خواب انداز

عزیز رات آخر ہو گئی، اور محبوب ابھی تک نہیں آیا شاید خواب میں آئے اس لیے سو جانا چاہئے۔

مثنویات : شاعری کی دوسری اصناف کے مقابلہ میں مثنوی کا میدان بہت وسیع ہے، کیونکہ اس صنف میں اتنی شرطیں اور قیدیں نہیں ہیں جتنی دوسری اصناف غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ میں ہیں۔ پھر بقول حالی "کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔"[1] آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ "یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔"[2]

اس صنف میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ علمائے بلاغت نے مثنوی میں مبالغہ کو صنائع معنوی اور محسنات کلام میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح مثنوی میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ ان شرائط اور خصوصیات کی روشنی میں خواجہ عزیز کی مثنویات کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

مثنوی ید بیضاء : مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی لکھتے ہیں: "یہ مثنوی امین شیرازی کی مشہور مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔"[3] یا تو شروانی صاحب مصنف سحر حلال کا نام سہواً امین شیرازی لکھ گئے ہیں۔ یا ممکن ہے "سحر حلال" کے مصنف کا تخلص "اہلی" اور نام امین شیرازی رہا ہو۔ جس کا علم مجھ کو اب تک نہ ہو سکا۔

"سحر حلال"[4] کے مصنف کا تخلص "اہلی" ہے۔ انکا سنہ پیدائش تو معلوم نہیں۔

---

[1] و [2] مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۰۰ شائع کردہ ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ (مطابق نصاب بی۔ اے)

[3] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز ص ۱۲ [4] سحر حلال ۔ و ۔ ورود الاسحار" نامی ایک دوسری مثنوی ۱۸۹۱ء میں مطبع اثناعشری میں سید عابد علی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ یہ مختصر مثنوی صنعت مہملہ کی بہترین مثال ہے، جو تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے عنوانات یہ ہیں۔ حمد کردگار۔ در مدح داماد رسول۔ در مدح آل رسول۔ در مدح حاکم ممدوح۔ در مدح حاکم کامگار۔ در مدح حاکم عصر۔ در مدح حاکم عصر و ملک دھر

انتقال ۹۴۲ھ ۱۵۳۵ء میں ہوا۔ یہ مشہور فارسی گو شاعر تھے۔ خراسان کے دارالحکومت شیراز میں عرصہ تک قیام رہا۔ مثنوی سحر حلال کے علاوہ اہلی شیرازی کی کئی اور تصنیفات مثلاً "شمع و پروانہ" "ساقی نامہ"۔ رباعیات اور ایک کلیات جس میں قصائد، غزلیات،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹) ممسک کردگار۔ در احوال یوم طول اَمَل۔ اور احوال دردِ دلدار۔ در حمد دگار کردگار۔ در محل دعا۔ وغیرہ اور اسی سبق پر مثنوی کا خاتمہ ہے۔ حمد کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

حمد مر کردگار عالم را　　　که دهد راح و روح آدم را
حاکم و عادل و سلام حمد　　　واحد و واسع و ودود واحد

"در محل دعا" یعنی آخری سبق کی ابتدا کا شعر یہ ہے۔ ؎

کردگارا راه را گم کرده ام
در هوا و حرص رُو آورده ام

اس سبق کا اختتام یوں ہوتا ہے۔ ؎

طلوع لوامع درا طوار اد　　　لموعِ طوائع در اسرار اد
حدودِ بُدا را مُؤَثّر که کرد　　　اساسِ حکم را ممهد که کرد

بالکل آخر میں کتاب کے بارے میں لکھا ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد حمد و صلوٰۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "نسخۂ غریب تصنیف عالم محقق در جبر الدقق مولوی قبول محمد مرحوم و مغفور مصنف کتاب ہفت قلزم" "در شہر لکھنؤ بہ محلہ فراش خانہ، وزیر گنج در مطبع مظہر العجائب باہتمام نحیف و حقیر سید عابد علی بخیر طبع رسید"

مندرجہ بالا مثنوی کا سائز ۔ ۸ انچ لمبی اور ۵ انچ چوڑی ہے، تقریباً ہر صفحہ پر ۱۰ اشعار ہیں،

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی پر کام کے دوران یہ کتاب مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج الہ آباد کی لائبریری میں نظر سے گذری اس کا نمبر ف نظم ۱۵۱ ہے،

تاریخین قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ قابل ذکر ہیں۔ خود خواجہ عزیز نے مثنوی "ید بیضا" میں اہلی شیرازی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور تصنیف کی وجہ یہ لکھی ہے:۔

اہلی من منبع فرد بیاں	بانیِ فن مرجعِ گردِ بیان
جادوئے او جائز و سحر حلال	در کفِ او معجز و سحر حلال
معجزہ خواں گر ہمہ جادو ست آں	طالبِ آں ہر ہمہ جادو ستاں
شعر تر آورد خوش اندر دو بحر	منبعِ صد مخزنِ گوہر دو بحر
از یمِ او تازہ برآمد دو ر دو	وز دمِ او نغمہ درآمد دو ر دو
قافیہ شد در سر تجنیس تنگ	ہم رہ قید و در تاسیس تنگ
اہلی ار او اہل درایں کار بود	مشکل یا سہل در انکار بود

اگرچہ مثنوی ید بیضا اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن سحر حلال سے اپنی لطافت، خوبی اور کشش میں اس سے بہت بڑھ گئی ہے۔ درحقیقت جو خواجہ صاحب کی قوت فکر و سخن آفرینی کی روشن دلیل ہے۔

ید بیضا بھی سحر حلال کی طرح ذو بحرین و ذو قافیتین مع التجنیس ہے[1]، بلکہ یہ مثنوی بقول مصنف:۔

"اکثر ابیاتش سہ سہ چار چار قافیہ دارد و بعضی سراپا مقفیٰ و مسجع ست و منقوطہ وغیر منقوطہ و فوق النقاط و تحت النقاط و قلب مستوی و حسن تعلیل واستتباع وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"[2]

---

[1] ایک بحر۔ بحر رمل محذوف یا مقصور ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات۔ اور دوسری بحر، بحر سریع مطوی مکسوف یا موقوف ہے۔ مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلات۔ [2] دیوان عزیز الدین صفحہ ۱۵۰

اب مثنوی کے مختلف حصوں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں، ع

اشعار فوق النقاط :۔

در رہ احمد قدم از سر دہش توشۂ ملک قدم از سر دہش

طاقت رفتن نہ و منزل دراز ہمرہ من ہمدم من دل درآز

غرّۂ او غرّۂ شہر آمدہ رونق ہر ذرّۂ شہر آمدہ

کز در اخلاص ہر آں کو شکست منزل او خاص دراں کو شکست

اشعار غیر منقوطہ :۔

در دل آورد دل آرام را داد رہ آورد دل آرام را

وعدہ او محکم و ہم عہد او محرم او ہمدم و ہمعہد او

در سر ہر کس سر سودائی او ہر ہمہ سودا اگر سودائے او

خواجہ صاحب کی یہ مثنوی ان کی قادر الکلامی، نکتہ آفرینی اور فن شاعری میں کامل مہارت کی دلیل ہے۔ پوری غزل تو درکنار ایک آدھ شعر میں کئی کئی شعری خوبیاں پیدا کرنا اچھے اچھے شعرا کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے مگر خواجہ صاحب نے پوری مثنوی میں بیک وقت دو دو بحریں، کئی کئی قافیے، حسن تعلیل اور دوسرے محاسن شعری کا استعمال کرکے نقادون سخن ہیں "استاد" کا لقب حاصل کر لیا ہے۔ تجنیس تام مماثل کی یہ مثال ملاحظہ ہو۔ ع

اے ز تو اندر سر من شور ہا نام تو ہست افسر منشور ہا

مندرجۂ ذیل شعر میں بیک وقت پانچ پانچ قافیہ ہیں اور صنعت عکس بھی موجود ہے۔ ع

اے نبیِ اُمّی ابی اُمّی فداک وی ابی اُمّی نبیِ اُمّی فداک

اسی طرح پوری مثنوی شعری خوبیوں سے معمور ہے۔ اب ہم مثنوی "ید بیضا" اور مثنوی "سحر حلال" کے کچھ اشعار ایک دوسرے کے مقابل پیش کرتے ہیں، جس سے دونوں کا موازنہ ہو سکے گا،

	مثنوی ید بیضا	مثنوی سحر حلال	
ابتدا	اے ز تو اندر سرِ من شور ہا	اے ہمہ عالم بر تو بے شکوہ	ابتدا
"	نام تو ہست افسرِ منشور ہا	شوکتِ خاک در تو بے شکوہ	"
"	اے قلم از حالِ تو معنا نگار	نام تو زان بر سرِ دیوان بود	"
"	وی رقم از خالِ تو رعنا نگار	کانش بال و پر دیوان بود	"
"	گر تحمید تو دارد کتاب	شد بتو سر دفترِ جاں نامزد	"
"	بر در توحید تو آرد کتاب	نام تو خود سکہ بر آں نامزد	"
خطاب	اے رخِ زیبائی تو در دلبری	اے کہ بر اسرارِ تو دانا کمند	در توحید
"	ذاتت از اندیشۂ باطل بری	کے رسد از عقل کس انجا کمند	"
"	جائی تو اندر دلِ ماہست و بس	کیست دریں مرحلہ تا آخرت	"
"	کلبۂ ما منزلِ ماہ است و بس	رہرو ادل شدہ تا آخرت	"
"	عکسِ تو در دیدۂ تر دیدہ است	چوں ہمہ ز اندیشۂ خود وا پسند	"
"	مردم جنباں مژہ بر دیدہ است	کے برد اندیشہ ات از ما پسند	"
در نعت	مشعلی از شور دل آرم بدست	احمد مرسل گل ایں کشت زار	در نعت
"	رہرو اندر شبِ تارم بدست	دشمن او در رہ دیں کشت زار	"

درنعت	طاقت رفتن نہ و منزل دراز	گلبن درین بلبل معنی سرائے	درنعت
"	ہمرہ من ہمدم من دل دراز	ساختہ در گلشن اعلیٰ سرائے	"
"	بادی ما حادی راہ ہدیٰ	گیسوئے او کامدہ در پا کشاں	"
"	حادی ما ہادی راہ ھدیٰ	مستی او در دل دریا کشاں	"

عنوان { ذکر اہل شیرازی و سبب تالیف این قیل و قال }

عنوان { دربیان الہام و وحی و سبب نظم این کتاب گوید }

"	ساقی از آن ساغر چینی نثراد	ساقی از اغیار درامشب بہ بند	"
"	گرچہ دو رنگی و دو بینی نزاد	رخنۂ آزاد درامشب بہ بند	"
"	صیقل آں می بر داز زنگ ما	امشب ازاں ساغرے مایہ بخش	"
"	نقش دو رنگ آورد از زنگ ما	کش برد از تو دل بے مایہ بخش	"
"	اہل من منبع فن و بیاں	سرحق از محفل مستاں طلب	"
"	بانئ فن مرجع کتر و بیاں	نہ از دل شیخ از دل مستاں طلب	"
"	جادو او جائز و سحر حلال	در محلے کاتش امین فروخت	"
"	درکف او معجز و سحر و حلال	جان دل و تن از پے دیدن فروخت	"
"	دیدہ ما نامہ ہم آں آمہ دید	صد محلش پردہ دراں صد محال	"
"	دید ہم آں نام ہم آں نامہ دید	جز منی آنجا رہ کس خود محال	"
"	معجزہ خواں گرہمہ جادو ستاں	حق پے آں پردہ دراں رخنہ کرد	"
"	طالب آں ہر ہمہ جادو ستاں	دیدہ الہام دراں رخنہ کرد	"
"	شعر تر آورد خوش اندر دو بحر	دیدہ پیغمبر ازیں دیدہ است	"

منبع صد مخزن گوہر دو بحر	نہ آئینہ آں آئینہ بین پیداست
از یم او تازہ بر آمد دو رود	گر ز تو الہام بداں جا بنی
و ز دم او نغمہ در آمد دو رود	محرم راز است در انجا بنیؐ

مثنوی ہدیۃ الثقلین | اس مثنوی مین خواجہ صاحب نے ایک خواب کا ذکر کیا ہے۔
جس میں وہ ... حضرت رسالت پناہؐ کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں۔

جوانی کے زمانے مین ایک بار خواجہ صاحب کے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا تھا، اس مبارک خواب کے بعد انھیں فوری صحت ہو گئی۔ تذکرہ شمع انجمن میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [1]

---

[1] تذکرہ شمع انجمن۔ ص ۳۳۲۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

مرتبہ:۔ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم۔ اے

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے دربار، محلات، حرم، لباس، پارچہ بافی، زیورات، جواہرات، سنگار، خوشبویات، خورد و نوش، سامان، تہوار، تقریبات، فنون لطیفہ، مثلاً موسیقی اور مصوری وغیرہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ضخامت:۔ ۶۵۰ صفحے

قیمت:۔ ۰ــــ۱۴

ریاض الانشاء
کے قلمی نسخے استانبول میں

از جناب غلام محمد نظام الدین مغربی لکچرار و صدر شعبۂ تاریخ ارد و آرٹس کالج (سابق فیلو استانبول یونیورسٹی ترکی) حیدر آباد

دکن کی مشہور و معروف سلطنت، دولت بہمنیہ کے وزیر محمود بن محمد گیلانی المعروف بہ خواجہ جہاں محمود گاواں (۸۱۳ھ تا ۸۸۶ھ)[1] نے جو یادگار تصانیف چھوڑی ہیں ان میں، ریاض الانشاء سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ یہ کتاب دراصل محمود کے خانگی خطوط اور سرکاری مراسلہ جات کے مسودوں کا مجموعہ ہے۔ جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔

ان خطوط سے محمود کی خانگی زندگی کے علاوہ بہمنی امراء اور بادشاہوں کے ساتھ اسکے روابط اور پندرہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے سیاسی مسائل پر مستند تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں[2]۔

فاتح قسطنطنیہ محمد فاتح عثمانی (سلطان ترکی[3]) اوزون حسن (سلطان عراق[4]) حسین بایقرا (بادشاہ خراسان)، اور شہنشاہ بابر کے دادا سلطان ابو سعید گورگانی (والی سمرقند) وغیرہ کے نام جو خطوط لکھے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی سلطنت پندرہویں صدی کے ہندوستان کی وہ واحد سلطنت تھی جس نے عالم اسلام کے تمام درباروں سے سفارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ ایران کے مشہور شاعر اور عالم مولانا عبدالرحمٰن جامی[5] اور ترکی کے عالم مولانا کمال الدین رومی[6] کے ساتھ محمود کے برادرانہ روابط کا پتہ ان ہی خطوط سے

خطوط سے چلتا ہے۔

اس میں ذاتی خطوط کے علاوہ محمود نے سلطان نظام شاہ بہمنی اور سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی کی طرف سے بھیجے جانے والے بین الملکتی مکاتیب کے جو مسودے لکھے گئے تھے۔ وہ بھی ریاض الانشاء" میں موجود ہیں۔

ہندوستان میں اس کتاب کے یہ مشکل چند ہی نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ جو بمبئی یونیورسٹی لائبریری۔ بھنڈارکر انسٹیٹیوٹ پونہ اور حبیب گنج لائبریری علی گڈھ میں ہیں۔ ان ہی سے استفادہ کر کے پروفیسر شیخ چاند بن حسین صاحب جو آزادی سے قبل وزارت تعلیم حکومت ہند کے مشیر تھے) نے تصحیح شدہ نسخہ مرتب کیا۔ اور جناب غلام یزدانی صاحب مرحوم ڈائرکٹر ارکیالوجی گورنمنٹ آف حیدرآباد نے اپنی نگرانی میں مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب پر غلام یزدانی صاحب نے ایک معلومات افزا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"محمود گاواں کے مکتوبات پر جب مجموعی طور پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس کے اسلوب بیان میں ادبی محاس کی بجائے علمیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہیں۔ اس کی ذہنی قوت سیاسی استعداد۔ اور وسیع علم و دانش ایسے اوصاف تھے جن کی وجہ سے بڑے بڑے بادشاہ اپنے دربار میں محمود کو رکھنا چاہتے تھے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "پروفیسر براؤن مرحوم نے منشآت فریدون بے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مکتوبات سے ہم عصر واقعات پر روشنی پڑنے کے علاوہ خود بادشاہوں کے باہمی تعلقات کا حال اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ ریاض الانشاء کی اہمیت بھی کچھ

سلاطین کے زمانے کے تاریخی واقعات کے لیے ویسی ہی سمجھی جانی چاہئے۔ جیسی کہ فریدون بے کی منشآت کی ترکمانی اور عثمانی خاندان کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ اور آپس کے تعلقات کے لیے یورپ کے بعض مورخین اور مستشرقین نے تسلیم کی ہے۔[۹]

اسی اہمیت کے پیش نظر یزدانی صاحب نے اس کتاب کو شائع کیا تھا۔ لیکن اس کی تصحیح میں ہندوستان میں پائے جانے والے نسخوں کے علاوہ استانبول یا کسی بیرونی کتب خانے کے نسخے سے مدد نہیں لی گئی، اس مطبوعہ نسخے کے مصحح جناب شیخ چاند صاحب نے جن نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "سب سے قدیم نسخہ وہ ہے جس کے بارے میں اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ سترہویں صدی عیسوی میں نقل کیا گیا ہے[۱۰] حالانکہ استانبول میں سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء اور سنہ ۹۱۱ھ ۱۵۰۴ء کے نقل کردہ نسخے موجود ہیں۔ جو ایڈریانوپل اور قسطنطنیہ میں نقل کیے گئے تھے۔

استانبول کے ترک انشا پردازوں عاکف زندی[۱۱] آلی آفندی[۱۲]، نسی آفندی[۱۳] اور محمود لامعی[۱۴] وغیرہ کے مجموعات منشآت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی میں محمود گاواں کا طرز انشا بہت مقبول ہو گیا تھا۔ اور وہاں ریاض کے بکثرت قلمی نسخوں کا پایا جانا اسکا ثبوت ہے کہ یہ کتاب سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کے مدارس کے نصاب میں داخل ہو گئی تھی۔

محمود گاواں کی مقبولیت اور احترام کا جو جذبہ دولت عثمانیہ میں تھا اس کا اندازہ ان القاب سے لگایا جا سکتا ہے جو اس دور کے عظیم فاتح اور عثمانی خاندان کے آٹھویں بادشاہ سلطان محمد فاتح نے محمود کو خط لکھتے وقت استعمال کیے ہیں۔ مثلاً :

"باسط بساط جود والاحسان۔ امین الملۃ المحمدیۃ بیمین

السلطنۃ البھمنیہ :۔ مدرس العلماء الاعلام۔
نظام الاسلام والملک والدولۃ والدین محمود اعلیٰ
شانہ ....وغیرہ[۵]۔

محمد فاتح یورپ کا وہ مسلمان بادشاہ تھا جس کی سلطنت کی سرحدیں یوکرین سے لے کر یوگوسلاویہ تک پھیلی ہوئی تھیں[۶]۔ اس کا ان القاب کے ساتھ محمود کو مخاطب کرنا اس بات کی شہادت ہے کہ محمود کی علمیت اور قابلیت کا سکہ اس عظیم سلطان پر بیٹھا تھا۔

محمود کے انتقال کے ایک صدی بعد جب ایک ترک عالم علی چلپی نے روضۃ الانشاء نامی کتاب فن انشاء کے اصول و قواعد پر لکھی تو اس کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ

"کتاب ہذا کا مولف اس قدر اعلیٰ معیار کا ادیب اور انشاء پرداز نہیں جیسے کہ بدیع الزمان ہمدانی اور خواجہ جہاں محمود گیلانی تھے۔ البتہ ان ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر ترکی زبان و ادب کے طلبہ کے لیے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے"[۷]۔

محمود کے قدر دان کاتبوں نے ریاض الانشاء کے جو نسخے استانبول میں نقل کیے۔ اور جن اعلیٰ القاب کے ساتھ محمود گاواں کا ذکر کیا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

ہندوستان میں پائے جانے والے تمام نسخوں اور حیدر آباد کے مطبوعہ نسخے میں سلطان ترکی کا نام محمد مراد بک لکھا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ استانبول کے نسخوں میں صحیح نام محمد بن مراد ہے، ہندوستانی کاتبوں نے "بن" حذف کر دیا تھا۔ ترکی میں محمد مراد بک کوئی بادشاہ ہی نہیں گزرا۔ رہا سلطان مراد خان تو اس بادشاہ کے دور میں محمود گاواں دکن پہنچا ہی نہ تھا۔ اسی لیے سلطان ترکی کو بہ حیثیت بہمنی وزیر خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا[۸]۔

اسی طرح عثمانی وزیر کے موسومہ خط میں محمود شاہ لکھا گیا ہے، یہ بھی حیدرآباد کے مطبوعہ

نسخہ کی غلطی ہے۔ عثمانی وزیر کا نام صحیح محمود پاشا ہے جو استانبول کے نسخوں میں درج ہے محمود پاشا سلطان محمد فاتح کے دور میں وزیر تھا۔ اور صربستان یعنی موجودہ یوگوسلاویہ کا رہنے والا تھا اور اسکو بھی اسکے بادشاہ نے اسیطرح قتل کرایا تھا جس طرح محمود گاوان کو محمد شاہ لشکری نے قتل کرایا تھا۔[۱]

ذیل میں شہر استانبول میں پائے جانے والے مشہور کتب خانوں کے نسخوں کی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

(۱) نسخۂ عاشر آفندی کتب خانے سی۔ نومرد - ۸۱۱

۲۶ × ۱۷ سمر سائز کا یہ نسخہ جلی۔ خوشخط۔ نستعلیق میں بمقام قسطنطنیہ (استانبول) ۹۱۱ھ بعہد سلطان بایزید خان عثمانی دوم نقل ہوا ہے۔ اس طرح مصنف کی وفات کے صرف پچیس سال بعد کا نسخہ ہے۔ کاتب محمد بن بصیری کو خواجہ جہاں محمود گاواں سے خاص تعلق تھا۔ اس نے محمود کی تصانیف ریاض الانشاء اور مناظر الانشاء کے کئی نسخے نقل کئے ہیں۔ نسخۂ ہذ مین یہ ترجمہ درج ہے۔

"تمت بعون اللہ وحسن توفیقہ فی نصف شہر رمضان

المبارک علی ید اضعف عباد اللہ واحوجھم محمد بن احمد

بصیری جعل اللہ الی عین العیان مطلعا وبصیرا ا سنہ

معینا ونصیرا فی تاریخ سنہ احدی عشر وتسعمایہ ببلدۂ

قسطنطنیہ"

ابتدائی صفحے پر کتاب کا نام "منشات خواجہ جہاں" لکھا گیا ہے۔

(۲) نسخۂ ایا صوفیہ کتب خانے سی۔ نومرد ۴۳۱۳

اس نسخہ پر بھی کاتب نے "منشآت خواجہ جہاں" کی سرخی درج کی ہے۔ کتت بہت

صاف خوش خط نستعلیق ہے۔ اور خط کی مماثلت بتلاتی ہے کہ اس کی کتابت بھی کاتب بصیری نے کی ہوگی۔ لیکن نسخہ کے کسی حصّہ میں کاتب کا نام سنہ کتابت اور مقام کتابت درج نہیں ہے۔ چونکہ یہ نسخہ سلطان محمود خاں عثمانی (۱۴۳۰ء تا ۱۴۵۲ء) کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ اسی لیے شاہی مہر کے علاوہ ایک اور مہر بھی ابتدائی صفحہ پر ثبت ہے۔ اس نسخہ کے خطوط کی تعداد بھی اوپر کے نسخہ سے زیادہ ہے۔ کتاب کا اختتام محمود کے اُس قصیدہ میں کیا گیا ہے۔ جو ہمایوں شاہ بہمنی (۱۴۵۵ء تا ۱۴۶۱ء) کی تعریف میں ہے۔ اس کا سائز ۱۰ × ۷" انچ اور اوراق ۲۱۴ ہیں۔ کتاب کے متن میں جہاں دوسرے نسخوں میں ریاض الانشاء لکھا ہے۔ اس نسخہ میں ریاضیہ الانشاء ہے۔

(۳) نسخہ دیگر ایا صوفیہ۔ نومرد ۴۳۱۵

۶ × ۵ انچ سائز کا یہ چھوٹا سا نسخہ ۲۵۸ اوراق پر مشتمل خط نستعلیق میں ہے۔ لیکن اس کا خط اور کاغذ دونوں ٹھیک نہیں۔ اس میں بھی اختتامی صفحہ پر ہمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ اور متن میں کتاب کا نام "ریاضیہ الانشاء" تحریر ہے۔ البتہ ابتدائی صفحے پر "منشآت خواجہ جہاں" کی سرخی ہے۔ کتاب کا نام مقام کتابت اور سنہ کتابت درج نہیں۔

(۴) نسخہ بغدادلی وہبی آفندی کتب خانے سی۔ نومرد ۱۲۴۷

یہ نسخہ کسی قدر خستہ حالت میں ہے۔ کاغذ اور کتابت بھی بہتر نہیں۔ خط نستعلیق ہے مقام کتابت نامعلوم۔ سنہ کتابت ۹۵۱ھ۔ سائز ۸ × ۶" انچ۔ تعداد اوراق ایک سو چالیس۔ کتاب کے آخر میں کاتب نے خاتمہ عبارت یوں درج کی ہے:"

تمت الرسالہ الشریفہ المسماۃ بریاض الانشاء من مصنفات

الحضرت المولا المحقق والحبر المدقق المنتشر آثار فضلہ
فی الآفاق المستجمع الاصناف فنون الانشاء والابداع علی
الاطلاق الذی یستفیض من رجق زلال افضالہ علی قدر
حالہ کل من لہ قابلیتہ واستحقاق المولانا کمال الدین محمود
الکیلانی المشتھر بخواجہ جہان نور اللہ مرقدہ وعطر
مشہدہ علی ید افقر الفقراء واحقر العباد العبد الضعیف
المتحرق الفواد الکثیر النسیان القلیل السداد درویش
محمد البدلیسی الروشکی عفر اللہ ولوالدیہ فی یوم یفر المرا
اخیہ وامہ وابیہ فی شھر رجب المرجب من مشھور سنہ
احدی وخمسین وتسعمایہ الھجریہ النبویہ ۔

اس عبارت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتابت کس شہر میں کی گئی ، البتہ کاتب کے نام کے ساتھ البدلیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشرقی اناطولیہ کے شہر بدلیس کے رہنے والے تھے ممکن ہے کہ کتابت بھی علاقۂ اناطولیہ کے کسی شہر میں کی گئی ہو ۔ اس نسخہ کے ابتدائی صفحات پر ریاض الانشا یا منشآت خواجہ جہاں کی قسم سے کوئی سرخی درج نہیں ہے ۔ البتہ اختتام ہمایوں شاہ بہمنی کے مدحیہ قصیدہ پر ہے ۔ یہ نسخہ کسی قدر آب زدہ ہے ، جس سے بعض مقامات پر الفاظ مٹ گئے ہیں پھر بھی کتاب خانہ کے انتظامیہ نے جدید جلد بندی کر کے اس کو محفوظ کر دیا ہے ۔ یہ نسخہ کسی طالب علم کے استعمال میں رہا ہے ۔ کیونکہ جگہ جگہ سرخ روشنائی سے الفاظ کے معنی ۔ ہدایات اور اشارات درج ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ ہے "منشآت جامی جواب نامۂ ملک التجار" معلوم نہیں کاتب محمود بدلیسی کو محمود گاواں

کا نام کمال الدین کیسے معلوم ہوا حالانکہ وہ دکن مین عماد الدین کے لقب سے موسوم ہے۔

(۵) نسخۂ فاتح جامع کتب خانے سی۔ نومرد۔ ۴۱۲۲

ریاض الانشاء اور مناظر الانشا کا یہ نسخہ تقریباً ساڑھے تین سو اوراق پر مشتمل ہے کتب خانہ کی طرف سے اس پر جو نشان اندازی کی گئی ہے وہ غلط ہے، ریاض کا متن ۳۰۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ اعلیٰ درجہ کے چمک دار کاغذ پر خط نستعلیق مین انتہائی دیدہ زیب کتابت ہے۔ ریاض کے متن کے اختتام پر ہمایوں شاہ کا مدحیہ قصیدہ ہے۔ اس کے بعد بہمنی سلطان کا ایک خط سلطان بایزید دوم عثمانی کے نام درج ہے۔ جس کا مسودہ محمود گاواں کے بجائے کسی اور منشی نے لکھا ہے۔ مکتوب کی سرخی یہ ہے۔ "صورت مکتوب ارسل لعبدہ السلطان الہندالی سلطان الروم بایزید خان خلد ملکہ" خط کے متن کے اختتام پر تاریخ ذیقعدہ سنہ ۸۸۶ھ درج ہے۔ جب کہ محمود گاوان کے کسی خط پر تاریخ کا سرے سے درج نہیں۔

تاریخ بالا کے لحاظ سے یہ خط محمد شاہ لشکری بہمنی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خط میں حسب ذیل الفاظ میں محمود گاواں کے قتل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

"دریں وقت بسبب آنکہ از صاحب خبران وثیق و معتمدان صاحب سرصد نقش سخنے چند کہ مبنی از فساد و تغیر خلوص فواد او بود بسمع این صفا فواد رسید و از افعال و اعمالش صورتی چند مشاہدہ نمود مناسب رتبت او نبود و مستلزم خلاف و عناد می نمود بنا و بریں برحسب مقتضی الناس مجزیون باعمالہم بعالم جزاد اصل شدہ"[ملکہ]

یہ چار سطریں ہندوستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں کیونکہ کسی تاریخ میں بھی محمود گاوان کے قتل کے اسباب

خود بادشاہ بہمنی کی زبان سے منقول نہیں۔ اس خط کو استانبول لے جانے کے لئے شاہ نعمۃ اللہ کو سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جو اس سے قبل محمود گاواں کی طرف سے بادشاہ گیلانی کے دربار میں سفیر کی خدمت پر فائز تھے۔

مناظرات الانشاء کے متن کے خاتمہ پر کاتب نے سنہ کتابت یوں درج کیا ہے:۔

"فرغ من سویدہ فی یوم الاثنین من اوائل شہر رجب ۹۱۵ھ"

اسطرح یہ نسخہ محمود کی وفات کے صرف انتیس سال بعد سلطان بایزید دوم کے دور حکومت میں دولت عثمانیہ میں نقل ہوا ہے۔ ممکن ہے۔ خود سلطان کے حکم سے نقل ہوا ہو کیونکہ وہ اعلیٰ کاغذ اور نفیس کتابت کے لحاظ سے ان کتابوں کا ہم پلہ ہے جو خاص شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ کاتب نے اپنا نام۔ اور مقام کتابت درج نہیں کیا۔ نسخہ کا سائز ۲۴ × ۱۵ سمر ہے۔ متن کی اندرونی سرخیاں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں۔ کتاب قدیم چرمی جلد اور زرین نقوش سے آراستہ ہے۔

(۶) نسخہ دیگر فاتح جامع۔ نومرو ۴۱۲۳

۲۲ ½ × ۱۳ ½ سمر کا یہ نسخہ ۱۸۰ اوراق پر مشتمل اور بہایت خوشخط اور بہت باریک قلم سے خط نستعلیق میں ... تحریر ہے۔ کتاب کا عنوان "منشآت خواجہ جہاں" صفحہ اول پر درج ہے۔ اور متن کے اختتام پر ہمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ خطوط کے عنوانات وغیرہ سرخ روشنائی سے تحریر ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نسخہ کے کاتب نے بھی اپنا نام۔ سنہ کتابت اور مقام کتابت درج نہیں کیا ہے۔ اندازاً ۹۱۰ھ تا ۹۲۰ھ کی درمیانی مدت میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کے نسخہ سے مماثلت پائی جاتی ہے۔

(۷) نسخۂ دیگر فاتح جامع ۳۹۱۱

۶ × ۵" سائز کا یہ چھوٹا سا نسخہ عثمانی خط دیوانی میں تحریر ہے۔ ابتدائی صفحہ پر آب زر سے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور صفحہ ۲ پر کتاب کا نام سرخ رشنائی سے ریاضیۃ الانشاء" لکھا گیا ہے۔ متن کے آخر میں ہمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ بھی درج ہے۔

کاتب مصطفٰے بن یعقوب المنخالجی نے اسکی کتابت ۹۱۰ھ میں محمود گاواں کی وفات سے چوبیس سال بعد کی ہے۔ افسوس ہے کہ مقام کتابت کا کہیں ذکر نہیں۔ کتابت کے لئے بہت باریک قلم استعمال کیا گیا ہے۔ جملہ اوراق ۸۴ ہیں۔ اختتامی عبارت یوں تحریر ہے۔

"کتبہ عبد ضعیف نحیف مذنب محتاج الی رحمۃ ربہ مصطفٰی بن یعقوب بن زکریا المنخالجی احسن اللہ الیہم فی اوسط جمادی الاول تاریخ النبویۃ الہجریۃ الھلالیہ سنۃ عشر وتسعمائۃ تمت"

(۸) نسخہ حامد آفندی کتب خانہ سی۔ نومرو ۲۹۲

۹۲۲ھ اسلامی تاریخ کا وہ اہم سال ہے۔ جب عثمانی سلطان سلیم اول نے حجاز، شام اور مصر فتح کئے تھے۔ اسی سال یہ نسخہ مشہور کاتب محمد بن احمد بصیری نے قسطنطنیہ میں مکمل کیا۔ ریاض کے متن کے ساتھ کاتب نے اپنا مختصر سا مجموعۂ کلام بھی منسلک کیا ہے ۱/۲ ۲۶ × ۱۷ سمر کے اس نسخے میں جملہ ۲۹۰ اوراق ہیں۔ اور ریاض کا متن ۲۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ باقی پر بصیری کا کلام درج ہے۔ جس میں بیشتر وہ فارسی اور ترکی قصائد ہیں۔ جو سلطان بایزید دوم

۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۲ء اور سلطان سلیم ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ریاض کے متن کے اختتام پر دیگر نسخوں کی طرح اس میں بھی ہمایوں شاہ بہمنی کا قصیدہ ہے۔ جس کے نیچے حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

تمت الرسالة الموسومة بریاض الانشاء علی ید العبد الفقیر الی اللہ محمد بن احمد الشہیر بصیری نور اللہ بصیرتہ بنور الایقان بمحمد بن عدنان فی ثامن عشر لرجب سنہ ثلثة وعشرین وتسعمایہ ببلدۂ قسطنطنیة حمیت عن البلیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً "

ابتدائی صفحے پر ایک طرف باریک قلم سے کتاب کا عنوان یوں درج ہے۔"

" منشآت محمد گیلانی در دیوان بصیری بخط" اور صفحے ۳ پر جلی خط میں ریاض الانشا بخواجہ جہاں" تحریر ہے۔ عموئی حیثیت سے یہ نسخہ واضح اور خوشخط ہے۔ البتہ کاغذ اچھا نہیں۔

نسخۂ ہذا کسی زمانے میں مکہ معظمہ کے مفتی مولانا قطب الدین کی ملکیت رہا ہے۔ انھوں نے صفحہ ۳ پر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل عبارت لکھی ہے۔

" مولانا محمود بن شیخ محمد گاوان المخاطب بخواجہ جہاں صاحب الانشاء، توفی شہیداً سعیداً فی ۸۸۶ھ و تاریخ شہادت مرحوم خرابئ دکن است۔ فی الواقع بعد از مرحوم دکن خرابست۔ نقلتہ من خط المولی المفتی بمکة المشرفة "

افسوس ہے، کہ مفتی صاحب نے اس عبارت میں "تاریخ" درج نہیں کی جس سے

اندازہ ہو سکتا کہ یہ نسخہ کس سنہ میں مکہ معظمہ میں تھا۔ انھوں نے محمود گاواں کی تاریخ و سنہ شہادت دونوں غلط درج کئے ہیں۔ محمود کی شہادت ۵ صفر ۸۸۶ھ کو واقع ہوئی۔ اور یکم صفر ۸۸۷ھ کو محمد شاہ لشکری بہمنی کا انتقال ہوا۔ دکنی مورخین کے بیان اور خرابئی دکن کے اعداد دونوں لحاظ سے یہ محمد شاہ لشکری بہمنی کی تاریخ وفات ہے، نہ کہ محمود گاواں کی۔

ریاض الانشاء کے نسخے استانبول میں جس نفاست اور خوبصورتی سے نقل ہوئے اور محفوظ کئے گئے ہیں۔ ان سے دولت عثمانیہ میں محمود گاواں کی غیر معمولی مقبولیت اور اس کے طرز انشاء کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱؎ شیخ چاند بن حسین۔ ریاض الانشاء۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ء ص ۲

۲؎ ریاض کے مطبوعہ نسخہ میں سلاطین گجرات کے نام (۹) خط۔ سلاطین جونپور کے نام (۱) اور سلاطین مالوہ کے نام (۲) خط درج ہیں۔

۳؎ ریاض کے مطبوعہ نسخہ میں عثمانی سلطان کے نام چار خط ہیں۔ جن میں ایک محمد شاہ لشکری بہمنی کی طرف سے اور تین خود خواجہ جہاں محمود گاواں کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ استانبول کے قلمی نسخوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ کا خط ۵۶ غلط طور پر سلطان روم (ترکی) کے نام چھپ گیا ہے اور تصحیح کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حقیقت میں وہ سلطان عراق اوزون حسن کا موسومہ ہے۔

۴؎ سلطان عراق کا نام حیدرآباد کے مطبوعہ نسخہ میں کہیں حسینی بیگ اور کہیں حسین بیگ

لکھا گیا ہے۔ صحیح نام حسن بیگ ہے۔ یہ بات بھی استانبول کے قلمی نسخوں سے واضح ہوتی ہے۔
نیز مصحح نے جن نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے بھی ایک نسخہ میں صحیح نام موجود ہے۔
اس وقت کے سلطان عراق کا نام حسن بیگ بن علی بیگ بن قرا عثمان تھا۔ جو
آق قویونلو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ اس بادشاہ کا قد بہت اونچا تھا۔ اسی لئے
"اوزون حسن" یعنی "لانبے حسن" کی عرفیت سے مشہور ہوگئے۔ فارسی اور ترکی تواریخ
کے علاوہ انگریزی تواریخ میں بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ (دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا
آف اسلام مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء جلد ۴ صفحہ ۱۰۶۵)

۵۵ ریاض الانشاء (مطبوعہ نسخہ حیدرآباد) صفحات ۹۱، ۱۵۲، ۱۶۰، ۲۰۷ وغیرہ۔

۵۶ ایضاً ایضاً صفحات ۱۶۳ تا ۱۶۵

۵۷ اس مجلس کے صدر موجودہ ریاست مہاراشٹر کے گورنر نواب علی یاور جنگ
بہادر اور ارکان میں پروفیسر ہارون خان شیروانی شامل تھے۔

۵۸ ریاض الانشاء مطبوعہ نسخہ حیدرآباد صفحات ی ا ی ب

۵۹ ایضاً ایضاً صفحہ ف ۲

۶۰ ایضاً ایضاً صفحہ ف ز

۶۱ عاکف آفندی۔ منشآتِ عاکف۔ قلمی نسخہ کتب خانۂ اسعد آفندی استانبول

۶۲ آلی آفندی۔ منشآتِ آلی۔ ایضاً ایضاً

۶۳ انسی آفندی۔ منشآتِ انسی۔ ایضاً ایضاً

۶۴ محمود لامعی۔ منشآت لامعی ایضاً ایضاً

۶۵ عبداللہ آفندی۔ منشآت فارسی قلمی نسخہ کتب خانۂ اسعد آفندی استانبول

(سلطان محمد عثمانی کا یہ خط رجب ۸۸۳ھ میں لکھا گیا تھا جس کا فوٹو راقم کے پاس محفوظ ہے)

۱۶ھ کلثوم ارغون   زنک لی تاریخ (بزبان ترکی جدید) مطبوعہ استانبول جلد ۵ ص ۳۶

۱۷ھ علی چلپی۔ روضۃ الانشاء (بزبان ترکی قدیم) قلمی نسخہ کتب خانہ اسعد آفندی استانبول

۱۸ھ سلطان مراد کی وفات ۱۴۵۱ء {دیکھئے۔ دلاخرون کیئر۔ مترجم ہاشمی فرید آبادی تاریخ دولت عثمانیہ۔ مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۳ء جلد ۱ ص ۱۴۳} محمود گاواں کا وزارت بہمنیہ پر فائز ہونا ۱۴۶۹ء {دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ صفحہ ۱۳۵}

۱۹ھ ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحہ ۱۲۵۔ محمود پاشاہ صربستانی کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ صفحہ ۱۳۶

۲۰ھ دلاژون کیئر (اردو ترجمہ) جلد ۱ صفحہ ۹۶

۲۱ھ بصیری۔ ہرات کے رہنے والے تھے۔ ابتداً اولی خراسان سلطان حسین بایقرا کے ملازم ہوئے سلطان کی وفات کے بعد مولانا جامی کے سفارشی خط کے ساتھ سلطان بایزید دوم عثمانی کے دربار میں قسطنطنیہ آئے۔ سلاطینِ عثمانی نے کافی قدر و منزلت کی۔ قانونی سلطان سلیمان ذی شان کے ساتھ جزیرہ رہوڈس کی مہم میں شریک تھے۔ ۹۴۱ھ میں بمقام استانبول انتقال کیا۔ ان کے تفصیلی حالات اور کلام کے لیے دیکھئے۔ عاشق چلپی۔ مشاعر الشعراء (بزبان ترکی قدیم) مطبوعہ گب میموریل سیریز۔ لندن ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۵۸

۲۱/۱ھ بدلیس اور روس چکی یا روشکی کے لیے دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲ صفحہ ۱۱۴۴

۲۲ء اس خط کا فوٹو بھی راقم کے پاس محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں فریدون بے نے منشآت السلاطین جلد ۱، صفحہ ۲۹۲ پر نقل کیا ہے۔ دیکھئے مطبوعہ نسخہ قسطنطنیہ ۱۲۷۴ھ

۲۳ء ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحات ۳۲۰، ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۱

۲۴ء قطب الدین ملی النہروالی۔ البرق الیمانی فی الفتح العثمانی۔ ریاض (سعودی عربیہ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۴۔

۲۵ء فرشتہ۔ اردو ترجمہ۔ فدا علی طالب۔ مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ جلد ۳ صفحہ ۲۰۳

۲۶ء ایضاً ایضاً ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲۰۰

۲۷ء فرشتہ اردو ترجمہ نولکشور لکھنؤ جلد ۱ صفحہ ۴۶۵

ادبیات

سرود ہاتف

از۔ جناب رئیس نعمانی

شکست شوق فسانہ ہے قُم باسم اللہ
یہ خود فریب زمانہ ہے قُم باسم اللہ

نہ وہ نگاہ دلوں میں جو بجلیاں بھر دے
نہ وہ شراب شبانہ ہے قم باسم اللہ

امید یاس کے دامن میں ڈھونڈتی ہے پناہ
اداس، اداس زمانہ ہے قم باسم اللہ

لٹا نہ دولت ایماں کہ رند و زاہد کی
سرشت مشترِ یانہ ہے قم باسم اللہ

نہ دیر و گلشن و ویرانہ ہے تری منزل
حرم نہ تیرا ٹھکانہ ہے قم باسم اللہ

نزاع سبحہ، و زنار، وعشق و بے بصری
یہ قضیہ کتنا پرانا ہے قم باسم اللہ

نوائے شعلہ فشاں اسروے حریم حیات
خموشیوں کا زمانہ ہے قسم باسم اللہ

نہ چل سکے گا فسوں اس پہ دیر و کعبہ کا
کہ دل خدا کا ٹھکانہ ہے قم باسم اللہ

رہے گا تا بقیامت "ظہور جاء الحق"
ہو منقلب جو زمانہ ہے قم باسم اللہ

زباں سے کہدیا "سُبحانہ" تو کیا حاصل
دلوں میں اس کو بسانا ہے قم باسم اللہ

تہی ہے دامن اسباب تو نہ ہو مایوس
میری نظر میں زمانہ ہے قم باسم اللہ

مطیع عزم و عمل ہے نظام کون و مکاں
یہاں نہ جائے بہانہ ہے قم باسم اللہ

بیاض صبح بھی ہے ہر شب سیاہ کے بعد
یہی نظام زمانہ ہے قم باسم اللہ

رئیس مرگ جسد سے کہاں عبارت موت
یہ دل سے سوز کا جانا ہے قم باسم اللہ

نعت

از۔ جناب قمر سنبھلی

فیض اُن کے آستانِ پاک سے پانے چلے ہر قدم کہتے ہوئے لبیک دیوانے چلے
سوئے طیبہ آنسوؤں کے لے کے نذرانے چلے کاروان در کاروان آج انکے دیوانے چلے
سوزِ دل کا اقتضا و شمعِ نبوت کی کشش جانبِ ارضِ حرم کھنچ کھنچ کے پروانے چلے
اُن کی خوش بختی پہ کیوں کونین کو آئے نہ رشک جو شہِ بطحیٰ کے دامن میں سکون پانے چلے
جوت لیکر آستاں کی خاک سے اہلِ نظر دل کے زنگ آلود آئینوں کو چمکانے چلے
ان سے پہلے کسقدر بیرنگ تھے اوراقِ زیست ان کے آنے سے جہاں میں حق کے افسانے چلے
اے قمر بن کر نقیبِ عظمتِ شانِ حضورؐ جلوہ گاہِ قدس کے پردوں کو سرکانے چلے

نعت

از۔ جناب مولوی عثمان احمد صاحب

الٰہی کاش مدینے کا پھر سفر ہوتا دیارِ رحمتِ عالم میں پھر گذر ہوتا
وہی مدینے کے لیل و نہار پھر ہوتے وہ شام ہوتی وہی جلوۂ سحر ہوتا
اُدھر سے ہوتی عنایت کی بارشِ پیہم جو دامن اشکِ ندامت سے تربتر ہوتا
بہاتے اشکِ ندامت پکڑ کے جالی کو ہر ایک قطرہ مرے اشک کا گہر ہوتا
وہ کوچے ملتے جہاں پر چلے ہیں شاہِ اممؐ انہی کا نقشِ قدم اپنا راہبر ہوتا
سمجھتا میں کہ مجھے مل گئی حیاتِ ابد فدا حضورؐ پہ جسم و دل و جگر ہوتا
جو دیکھتے کہیں اُڑتا غبار طیبہ میں ہمارے واسطے وہ سرمۂ نظر ہوتا
پہنچ کے کاش مدینے میں بینوا عثمان نگاہِ لطف و عنایت سے بہرہ ور ہوتا

قطعہ تبریک حج

قطعہ تبریک بہ شرف زیارت حرمین شریفین خدمت شفیق مکرم جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی، مدیر معارف

از۔ ارادت کیش پروفیسر نکہت شاہجہانپوری،

راقم کے دیرینہ کرم فرما جناب نکہت شاہجہانپوری نے از راہ لطف یہ قطعات مرحمت فرمائے ہیں، اپنی نسبت سے کچھ شایع کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا محض ان کے اخلاص کی یادگار میں شائع کیا جاتا ہے:" "م"

چاہیے مجھکو نہ تسبیح نہ مصلّیٰ نہ کھجور
یاد ہی آپ کی ہے میرے لیے جان سرور!

حسرتِ بوسہ یہ پیغام میں بھی لذت ہے
یہی کیا کم ہے نہیں آپ کے دل سے میں دور!

جب کہ ایماں ہی "بالغیب" ہو مقصود شہود
میرا سینہ بھی نہ ہو کیوں ہمہ تن جلوۂ طور!

حرم قدس" کے نظارۂ دلکش ہے ہے!
چشم پر جلوہ تھے کیوں طرف حور و قصور!

دل نکہت کو بھی ارمانِ قدمبوسی ہے،
کاش پوری ہو کسی طرح تمنائے حضور!

وحسّن اللہ! نظر لطفِ نبیؐ اکرم
بارک اللہ! شرفِ کعبہ و حج مبرور

مطبوعات جدیدہ

انتخاب الترغیب و الترہیب ، مترجمہ مولوی محمد عبداللہ صاحب دہلوی، لمبی تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۳۲ غیر مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ/ مجلد عہ/ مرتبہ :- ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

ترغیب و ترہیب کی حدیثوں کے جو مجموعے مرتب کئے گئے ہیں، ان میں امام زکی الدین ابن عبدالعظیم منذری کی کتاب الترغیب والترہیب بڑی جامع اور بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، اس میں اعمال صالحہ کے اجر و ثواب اور اعمال سیئہ پر زجر و عقاب کے متعلق مختلف کتب حدیث کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، گو فضائل کی روایات میں محدثین نے احکام وغیرہ کی طرح زیادہ شدت سے کام نہیں لیا ہے، اس لئے فضائل کے مجموعے صحیح وضعیف ہر طرح کی روایتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، مگر امام منذری نے ان میں امتیاز کے لئے بعض اشارات اور علامتیں مقرر کر دی ہیں، جن سے حدیث کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے مجموعہ کی اہمیت اور خصوصیات کی بنا پر ہر زمانہ کے اہل فن نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے۔ اب مولوی محمد عبداللہ صاحب دہلوی نے بھی اس مفید اور اہم کتاب کا انتخاب شائع کیا ہے، اس میں حدیثوں کا اصل متن، ترجمہ اور ان کی تشریحات شامل ہیں، شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے تقریباً ڈھائی سو صفحے کا ایک بسوط مقدمہ ہے، جس میں ترغیب و ترہیب کی کتابوں کی فہرست، امام منذری

کا تذکرہ، زیر نظر مجموعہ کی خصوصیات، اس کی تخلیصوں، ضمیموں، شرحوں، حاشیوں اور اردو اور بعض دوسری زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فن حدیث کی بعض اصطلاحات اس کی حجیت اہمیت اور دینی حیثیت جمع و تدوین حدیث کی مختصر تاریخ اور کبار محدثین کے حالات زندگی تحریر کئے ہیں، اس ضمن میں منکرین حدیث کے شبہات کا جواب اور ترغیب و ترہیب کی حدیثوں میں محدثین کی نرمی کے اسباب بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں اس حیثیت سے یہ مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترجمہ و تشریح کی زبان آسان ہے اس لئے طلبۂ حدیث کے علاوہ عام مسلمانوں کیلئے بھی یہ مجموعہ مفید ہے۔

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب مترجمہ۔ مولوی صفی الرحمن صاحب اعظمی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۰۳ قیمت للعہ پیسے پتہ ۱۔ مدرسہ عربیہ دارالتعلیم محلہ پورہ صوفی۔ پوسٹ مبارکپور، اعظم گڈھ۔ یو۔ پی (۲) ادارۂ اشاعت دینیات ...

مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق اردو میں غالباً سب سے پہلے مولانا اسلم جیراجپوری اور دارالعلوم ندوہ کے لائق فرزند مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے مستقل کتاب لکھی اور ان کے اصلاحی و دعوتی کارناموں کو دکھایا۔ اور ان پر بے سروپا الزامات کا جواب دیا، زیر نظر کتاب بھی جو قاضی قطر احمد بن حجر کی عربی تصنیف ہے اسی مقصد سے لکھی گئی ہے، اور مولوی صفی الرحمن اعظمی نے اس کا سلیس اور رواں اردو ترجمہ کیا ہے شروع میں مترجم کے قلم سے ایک مبسوط مفید مقدمہ بھی ہے، اس میں آل سعود کی مختصر تاریخ اور مختلف سعودی حکمرانوں کے دور کے علمی، مذہبی اور سیاسی حالات اور ان پر شیخ کی دعوت کے اثرات وغیرہ دکھائے ہیں، جو امیر محمد بن سعود کے دور سے شروع ہو کر

موجودہ حکمراں شاہ فیصل کے عہد پر ختم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقدمہ گویا آل سعود کی گذشتہ ڈھائی سو سالہ دورِ حکومت کی مختصر سرگذشت ہے، اصل کتاب میں شیخ کے حالات وسوانح، عقائد وخیالات، اصلاحی و دعوتی کارنامے اُن کی دعوت کے اصول اور نجد و بیرونِ نجد میں اس کے اثرات بیان کئے گئے ہیں، ایک باب میں ان پر لگائے جانے والے الزامات کی مفصل تردید کی گئی ہے، اور آخر میں عالم اسلام کے متعدد مشاہیر اور بعض مستشرقین کے اقوال اور شہادتوں سے ان کی علمی و دینی عظمت ثابت کی گئی ہے۔ مترجم نے بعض مختصر توضیحی حاشیے بھی لکھے ہیں، لیکن متن اور حواشی دونوں میں کہیں کہیں شدت آگئی ہے، اسی چیز نے شیخ جیسے مصلح کی شخصیت کو متنازع بنا دیا ہے اس لئے ان کے سوانح نگاروں اور معتقدین کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

تاثرات۔ مرتبہ الحاج حکیم ابوالحسنات ابوحسن صاحب بیدل فاروقی
متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۴ قیمت مغر۔ پتہ حکیم ابوالحسنات ابوحسن بیدل صدر شعبہ عربی فارسی، اردو گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور،

اس میں اردو اور ہندی ادب و تمدن پر عربی و فارسی کے کلچرل اور ادبی اثرات دکھائے گئے ہیں، اس سلسلہ میں عربی و فارسی کے متعدد ایسے الفاظ نقل کئے گئے ہیں جن کے اردو میں تغیر و تبدل کے بعد معنی و مفہوم مختلف ہوگئے ہیں، مصنف نے اس کی خاص طور پر تردید کی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوؤں کے اردو زبان و ادب کے خدمات تفصیل سے تحریر کئے ہیں، اور شعر و ادب، تاریخ و سیاست، صحافت و خطابت اور دوسرے فنون جغرافیہ، سائنس، ریاضی، منطق و فلسفہ اور ہیئت وغیرہ میں ان کے مساعی بیان کئے ہیں، مصنف نے ہندو ادیبوں

شاعروں مقرروں مصنفوں اور محسنین اردو کی، اتنی طویل فہرست دی ہے، کہ مشکل ہی سے کسی ممتاز ہند و اہل قلم کا نام رہ گیا ہوگا۔ اور سب کے کلام، تحریر اور تقریر کے نمونے اور تصنیفات کے نام بھی دئے ہیں۔ ابتداء میں جنوبی ہند میں اردو کے درجہ و مقام کا ذکر ہے۔ مگر کتاب میں ترتیب اور تصنیفی شان کی کمی، تحریر میں الجھاؤ اور جا بجا تکرار پایا جاتا ہے ان خامیوں کے باوجود مصنف کی محنت قابل داد ہے اور کتاب مفید ہے۔

گلدستۂ آل انڈیا مشاعرہ بیادگار مرزا احسان احمد مرحوم - مرتبہ جناب شفقت علاء الدین صاحب، متوسط تقطیع عمدہ آرٹ پیپر صفحات ۱۰۰، قیمت ۸ روپے پتہ احسان پبلشنگ ہاؤس کرمی ٹولہ اعظم گڑھ،

ہمارے ضلع کے مشہور اور کامیاب وکیل مرزا احسان احمد مرحوم کو شعر و سخن کا بڑا ستھرا اور عمدہ ذوق تھا، ان کے کلام اور ادبی و تنقیدی مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مئی ۷۳ء میں شبلی کالج میں ان کی یادگار میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا، جو مرزا صاحب کے بھتیجے شفقت علاء الدین صاحب کی محنت اور کوشش سے بڑا کامیاب رہا، اب انھوں نے اپنے عم محترم کی یادگار میں یہ سوینیر شائع کیا ہے، اس میں ان سب شاعروں کا کلام محفوظ کر دیا ہے، جو مشاعرہ میں شریک تھے، مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کا بھی کچھ حصہ اور دار المصنفین کے اکابر اور شبلی کالج کے ذمہ داروں کا خراج عقیدت بھی اس میں آگیا ہے۔ دو مضامین انکی سیرت و شخصیت اور شعری و ادبی کمالات پر ہیں، ابتداء میں صدر و نائب صدر جمہوریہ، بعض مرکزی وزیروں اور مشاہیر کے علاوہ اتر پردیش کے موجودہ گورنر عالی جناب اکبر علی خان صاحب کے تہنیتی پیغامات اور خطوط درج ہیں، اور مشاعرہ کے کنوینر شفقت علاء الدین صاحب نے اسکی دلچسپ روداد تحریر کی ہے، سوینیر کی

ظاہری نفاست و آرائش اور کاغذ کتابت و طباعت ہر ہر چیز سے مرتب کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اشتہارات کی زیادتی ارباب ذوق کی طبیعت پر گران گذرتی ہے، جو مرزا صاحب مرحوم جیسے سنجیدگی اور سادگی پسند شخص کی روح کے لئے بھی کہیں باعث ملال نہ ہو۔ اُمید ہے کہ مرزا صاحب کے کلام کا زیر طبع مجموعہ جو یہ ترتیب دے رہے ہیں اس سے خالی ہوگا،

چند مشاہیر - مرتبہ - جناب عبدالاحد معظم آبادی تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۷۶ - قیمت - ۸/ پتہ:- اعجاز ہوٹل، جامع مسجد اردو بازار گورکھپور،

یہ ہند و بیرون ہند کے انیس ۱۹ مشاہیر کا مختصر تذکرہ ہے۔ اس میں علم و ادب، سیاست و قانون اور سائنس وغیرہ مختلف فنون کے نامور فضلاء کے مختصر حالات و کمالات تحریر کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مسلم مشاہیر میں مولانا محمد علی، راشد الخیری، ڈاکٹر انصاری، عارف ہنسوی، آغا حشر، سر فضل حسین، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، اور سر سید علی امام اور غیر مسلموں میں ڈاکٹر جیسوال، منشی پریم چند اور سر جگدیش چندر بوس کے واقعات اور ان حضرات کے اپنے اپنے امتیازی دائروں کے علاوہ علم و فن اور زندگی کے دوسرے مختلف شعبوں میں خدمات اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ کے کچھ فضلا کا مختصر تذکرہ بھی ہے، اکابر کے حالات و واقعات زندگی دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں اس لئے اس کتابچہ کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہیں ہے،

گورونانک کا جی مہاراج مشہور بابا نانک شاہ، مرتبہ - قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت، تقطیع خورد کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر

صفحات ۸۰... قیمت تحریر نہیں ۔ پتے۔ (۱) سنٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام

۹۸ ناظر باغ کانپور، (۲) فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد،

یہ سکھوں کے مشہور مذہبی رہنما گورو نانک جی کے حالات و تعلیمات کا مختصر خاکہ ہے، پہلے ان کی تعلیم و تربیت سیر و سیاحت اور ان پر مسلمان صوفیوں کے اثرات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور آخر میں ان کی ہدایات و تعلیمات نام (حقوق اللہ) دان (حقوق العباد) اشنان (جان و تن کے حقوق) اور دوسرے خیالات کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ گورو جی ہندوستان کے تمام فرقوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی تعلیمات اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، اور گرو گرنتھ صاحب کے شلوکوں (شعروں) میں توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کتاب میں گورو جی مہاراج کی اصل تعلیمات پیش کر کے ان کے پیروؤں اور سکھ حضرات کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

شعاعوں کی صلیب مرتبہ جناب کرامت علی کرامت صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۴۴ مجلد قیمت ۳ روپے پتہ شاخسار پبلیشر بخشی بازار، کٹک ۱

جناب کرامت علی کرامت کا وطن اڑیسہ ہے وہ وہاں کے ایک کالج میں ریاضی کے استاد ہیں لیکن اسکے باوجود انکو اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، اڑیسہ سے شائع ہونے والا دو ماہی شاخسار انہی کی ادارت میں چھپتا ہے، اسمیں اور دوسرے ادبی رسائل میں انکا کلام اور ادبی و تنقیدی مضامین چھپتے رہتے ہیں "شعاعوں کی صلیب" انکا پہلا مجموعہ کلام اور نظموں و غزلوں پر مشتمل ہے، کرامت صاحب کا کلام غور و تامل کا نتیجہ اور سطحیت و رکاکت سے خالی ہے امید ہے جدید شاعری کے قدرداں میں یہ مجموعہ کلام مقبول ہوگا، شروع میں انھوں نے اپنے حالات اور شاعری کے متعلق معلومات بھی تحریر کی ہیں۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ء؍ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکت خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمرِ ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ؍

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمداللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ داغِ عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدام مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی، روداد کے ساتھ ترکِ قیامِ دارالمصنفین، سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش اور دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۷ روپے

مؤلفہ:- **شاہ معین الدین احمد ندوی**

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

مئی ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرار، شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علمار و فضلار و شعرار کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۴ء نمبر ۵

مضامین

مقالات

شذرات

ہندوستان و پاکستان کے درمیان تجارت کی بندش سے یوں ہی دارالمصنفین کئی سال سے سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھا، اب سامان طباعت خصوصاً کاغذ کے قحط اور ہوشربا گرانی نے مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، اور معارف پریس کو قائم رکھنے کی کوئی شکل نظر نہیں آرہی ہے، اگر بند کر دیا جائے تو پریس کا پورا عملہ بیکار ہو جائے گا، اور دارالمصنفین کا ایک اہم شعبہ جس سے بڑی سہولت حاصل تھی ختم ہو جائے گا، اور اگر قائم رکھا جاتا ہے تو مفت تنخواہوں کا بار اٹھانا پڑے گا، اس وقت متعدد اہم اور چالو کتابیں ختم ہو گئی ہیں کئی نئی کتابیں تیار ہیں، مگر ان کے چھاپنے کا سامان نہیں، اولاً کاغذ بڑی مشکل سے ملتا ہے، اور اگر مل بھی جاتا ہے تو اتنا گراں کہ خریدنے کی ہمت نہیں پڑتی، دارالمصنفین کی کتابوں کے خریداروں کا حلقہ یوں بھی محدود تھا، ملک کے اقتصادی حالات نے، اور بھی محدود کر دیا ہے، اب اگر سامان طباعت کی گرانی کے تناسب سے ان کی قیمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے تو ان کے خریدار اور بھی کم ہو جائیں گے، فی الحال ان مشکلات کے حل کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی ہے، لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

آزادی سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ ہندوستان کی ساری مصیبت انگریزوں کی لائی ہوئی ہے، ان کے جاتے ہی ہندوستان جنت نشان بن جائے گا، یہاں شہد اور دودھ کی گنگا جمنا بہیگی، ہر شخص آسودہ حال ہوگا، لیکن آزادی کے بعد اس خواب کی تعبیر الٹی نکلی اور ملک اتنے گوناگوں مصائب میں گھر گیا ہے، کہ لوگ بے اختیار انگریزی عہد کی آسائشوں کو یاد کرنے لگے ہیں، یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے تعمیری اور صنعتی حیثیت سے

بڑی ترقی کی ہے، بڑے بڑے منصوبے چل رہے ہیں، عظیم الشان کارخانے قائم ہو گئے ہیں، جہاں سوئی نہیں بنتی تھی وہاں ٹینک اور ہوائی جہاز بننے لگے ہیں بہت سے جھونپڑیوں کے رہنے والے بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے لگے ہیں، پیدل چلنے والے ہوائی جہاز پر اڑے پھرتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ترقیوں کے باوجود زندگی کا امن و سکون ختم ہو گیا ہے ملک میں بدامنی عام ہے، ضروریات زندگی کی ہوش ربا گرانی نے ایک بڑے طبقہ کی زندگی وبال کر دی ہے، کوئی شخص بھی جائز آمدنی سے ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتا، صرف رشوت خوروں اور چور بازاری کرنے والوں کا معیار زندگی اونچا ہوا ہے، جو لوگ اس سے محروم ہیں، ان کے لئے زندگی بسر کرنا مشکل ہو رہا ہے، ایسی ترقی کس کام کی کہ ملک کے ایک طبقہ کا گھر دولت سے بھر جائے اور ایک طبقہ کو پیٹ بھر کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا بھی میسر نہ ہو،

اخلاقی معیار اتنا گر گیا ہے کہ کسی کو بھی ملک کے مفاد کی فکر نہیں، ہر شخص دولت سمیٹنے کی دھن میں مبتلا ہے، اسی لئے اگر حکومت حالات کی اصلاح بھی کرنا چاہتی ہے تو کامیاب نہیں ہو پاتی اور عوام کی اس بے اطمینانی سے حکومت کے مخالفین فائدہ اٹھاتے ہیں ایک عام آدمی کو سوشلزم کا فلسفہ سمجھانے سے تسکین نہیں ہوتی، وہ تو اسکے نتائج دیکھنا چاہتا ہے، اسکی نگاہ میں ترقی کا معیار بڑے بڑے کارخانے نہیں، بلکہ ضروریات زندگی کا حصول ہے، اگر ستائیس سال کی طویل مدت میں سوشلزم کے کچھ بھی نتائج نکلتے تو حسن ظن سے کام لیا جا سکتا تھا، لیکن جسقدر سوشلزم کا شور بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر ضروریات زندگی گران اور عنقا ہوتی جاتی ہیں ہر چیز کی قیمت آسمان تک پہنچ گئی ہے، اسی قسم کے حالات انقلاب کو دعوت دیتے ہیں جس کے آثار شروع ہو گئے ہیں، ان کو سختی یا طفل تسلی سے نہیں دبایا جا سکتا، اسکا علاج صرف یہی ہے کہ عوام کو مطمئن کیا جائے،

اس سلسلہ میں ایک تقریب سے سوشلزم کے برادر اکبر کمیونزم کی یاد آگئی، ابھی حال میں روسی سفارت خانے سے عربی میں ایک بڑی دیدہ زیب کتاب "المسلمون فی الاتحاد السوفیتی" ہمارے پاس آئی ہے جس میں تصویروں کی زبان سے سوویت یونین کی مسلمان ریاستوں کی مذہبی آزادی اور مادی ترقی دکھائی گئی ہے

اور اس سے متعلق مضامین اور مختلف اسلامی ملکوں کے ان سربرآوردہ مسلمانوں کے بیانات بھی نقل کئے گئے ہیں جنھوں نے انکا مشاہدہ کیا ہے تصویروں میں مساجد، نماز، مدارس اور دوسرے اسلامی آثار اور صنعتی ترقی کی تصویریں ہیں، مگر اب اس قسم کے تماشے اتنے ہوتے رہتے ہیں کہ انکا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا ہے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ روس میں مذہبی شعائر ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، گو ایک زمانہ میں یہ بھی جرم تھا مگر اب پالیسی بدل گئی ہے مسلمان اپنے مذہبی شعائر ادا کر سکتے ہیں بعض مسجدوں میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی ہوتی ہیں جن میں کچھ پرانی نسل کے بوڑھے اور روس میں مقیم اسلامی ملکوں کے مسلمان شریک ہوتے ہیں بہت سے اسلامی آثار بھی محفوظ ہیں اور مسلمان ریاستوں نے مادی حیثیت سے ترقی بھی کی ہے، بلکہ اس سال روس میں امام بخاری کا یادگاری جشن بھی منایا جارہا ہے لیکن ان میں سے ایک چیز بھی مذہبی آزادی کا ثبوت نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ سوویٹ یونین سے پہلے یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت کیا تھی اور اب کیا ہے اگر چند مسجدیں آباد ہیں تو ہزاروں ویران ہیں اگر چند جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہوگئی ہیں تو سیکڑوں دینی مدارس ختم کر دئے گئے ہیں۔

اصل میں اس زمانہ میں کسی قوم و ملت کے مذہب اور کلچر کو زور و قوت سے مٹانا آسان نہیں ہے، اس لیے اب جبر کی پالیسی بدل گئی ہے اور تعلیم و تربیت اور الحاد و بے دینی کی ترویج و اشاعت کا ایسا نظام قائم کیا گیا ہے کہ نئی نسل مذہب پر قائم ہی نہیں رہ سکتی اور کمیونزم کے رنگ میں رنگ جاتی ہے، جو ملک بھی کسی قوم و ملت کے کلچر کو بدلنا چاہتے ہیں وہ اسی قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ روس کے مسلمانوں کی نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہے ممکن ہے کچھ مستثنیٰ مثالیں بھی نکل آئیں اور حقیقت کیمونزم کی بنیاد ہی الحاد و دہریت پر قائم ہے، اور اس پر آج بھی مذہبی اثرات کو مٹانے کے لیے روس کے ممتاز کمیونسٹوں کے بیانات شاہد ہیں، اگر کسی قوم و ملت کے مذہب اور کلچر کو مٹا کر اس کو مادی ترقی کے بام عروج پر بھی پہنچا دیا جائے تو یہ ترقی نہیں، بلکہ نسل کشی ہوئی، صحیح ترقی اور آزادی کا تصور یہ ہے کہ ہر ملت اور ہر فرقہ کو اس کی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے۔

مقالات

سفر حج کی مختصر روداد

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

حج کے انتظامات اور اس کی آسانیاں جو لوگ حج کے سفر میں تن آسانی اور راحت ڈھونڈتے ہیں یا جو ترقی یافتہ ملکوں کے انتظامات سے حج کے انتظامات کا موازنہ کرتے ہیں انکی نظر اس کی خامیوں اور حج کی مشقتوں پر پڑتی ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سعودی حکومت سے پہلے حج میں کتنی مشکلات تھیں اور اب کتنی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جو خامیاں باقی ہیں وہ بھی حکومت کی توجہ سے رفتہ رفتہ دور ہوتی جاتی ہیں،

جو لوگ حج کو عبادت سمجھتے ہیں ان کو راحت ہی راحت معلوم ہوتی ہے، تکلیفوں اور مشکلات کی طرف ان کی نظر ہی نہیں جاتی، حج ایک عاشقانہ عبادت ہے، اس کے سارے مناسک عاشقانہ ہیں جن میں تکلیف اور مشقت اٹھانا ضروری ہے ؎

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

اس کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوتی

ناز پرور دہ تنعم نبرد راہ بدوست　　عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

اس پہلو سے قطع نظر خالص مادی حیثیت سے پہلے کے مقابلہ میں اب اتنی سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں کہ حج حج نہیں رہ گیا ہے بلکہ تفریحی سفر بن گیا ہے،

پہلے سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جدہ میں جدید طرز کی کوئی بندرگاہ نہ تھی، جہاز ساحل سے کئی میل دور سمندر ہی میں کھڑے ہوتے تھے اور مسافر اور اُن کا سامان کشتیوں کے ذریعہ آتا تھا جس سے ان کو بڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی کبھی کبھی سامان کشتیوں پر اتارنے میں سمندر میں گر پڑتا تھا، اب جدید طرز کی بڑی وسیع بندرگاہ بن گئی ہے جس میں بیک وقت کئی بڑے بڑے جہاز ٹھہر سکتے ہیں، اور حجاج براہ راست بندرگاہ پر اترتے ہیں، پہلے جدہ میں حکومت کی طرف سے حاجیوں کے قیام کا کوئی انتظام نہ تھا، معلم جہاں چاہتے تھے ٹھہراتے تھے، جس سے حاجیوں کو بڑی زحمت ہوتی تھی، اب حکومت نے مدینۃ الحجاج کے نام سے کئی منزل کی ایک وسیع عمارت بنوا دی ہے جس میں کئی ہزار حاجی بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں، اس میں قیام کی ہر طرح کی سہولتیں ہیں، پہلے سڑکیں، بسیں اور کاریں نہ تھیں، اونٹوں سے سفر کرنا پڑتا تھا، جدہ سے مکہ معظمہ کل چالیس پینتالیس میل ہے، یہ مسافت اونٹوں کے ذریعہ کم سے کم دو دن میں طے ہوتی تھی، اور مکہ سے مدینہ کے سفر میں دس بارہ دن لگتے تھے، اب پورے حجاز میں اعلیٰ درجہ کی ڈامر کی سڑکیں بن گئی ہیں، صبا رفتار موٹریں ہیں جن کے ذریعہ دنوں اور ہفتوں کی مسافت چند گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے،

پہلے بدوؤں سے حاجیوں کی جان و مال محفوظ نہ تھا، قافلوں کی حفاظت کا بڑا انتظام کرنا پڑتا تھا، اس کے باوجود کبھی کبھی قافلے لٹ جاتے تھے، اور ان کی جانیں ضائع ہو جاتی تھیں، اب اس قدر امن و امان ہے کہ کوئی شخص کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا، اگر کسی کا سامان گم ہو جائے تو کوئی شخص اس کو نہیں اٹھا سکتا، پولیس خود سرکاری مال خانے میں جمع کر

کرتی ہے۔ اور وہ تلاش کے بعد مالک کو مل جاتا ہے۔

پانی اس قدر کمیاب تھا کہ سونے کے بھاؤ بکتا تھا منیٰ اور عرفات میں لوگ ایک ایک گلاس پانی کے لیے ترستے تھے۔ اب ہر جگہ نل لگے ہیں، جتنا چاہے پانی صرف کیجئے، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ تک میں پانی کی افراط ہے۔ آئس کریم اور ٹھنڈے مشروبات کی بکثرت دوکانیں ہیں، برف کے ڈھیر لگے رہتے ہیں خوب سیر ہو کر پیجئے۔

پہلے منیٰ عرفات اور مزدلفہ کے راستے اس قدر تنگ تھے کہ راستہ چلنا دشوار ہوتا تھا اب ان تمام مقامات میں کئی کئی کشادہ ڈامر کی سڑکیں بن گئی ہیں، پیدل چلنے والوں کے لئے علیحدہ سڑک ہے جس سے آمد و رفت میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے، لیکن پندرہ سولہ لاکھ انسانوں کے ہجوم کے نقل و حرکت میں کچھ نہ کچھ دشواری تو ضرور ہوگی یہ بھی واضح رہے کہ ہجوم کسی ایک جگہ نہیں رہتا بلکہ چار پانچ دن تک محدود وقت میں کئی مقامات پر منتقل ہونا رہتا ہے، اتنے بڑے مجمع کو چند گھنٹوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا بہت دشوار ہے، یہ حکومت کا حسن انتظام ہے کہ یہ کام آسانی سے انجام پا جاتا ہے، اس کے لیے حکومت بڑے وسیع انتظامات کرتی ہے خود شاہ فیصل، شاہی خاندان کے ارکان اور حکومت کے وزراء و عمال منیٰ اور عرفات میں موجود رہتے ہیں جس سے پورا انتظامی عملہ مستعد اور چوکنا رہتا ہے۔

اس سال ٹرافک کو کنٹرول کرنے کے لئے سات ہزار پولیس کے سپاہی مقرر تھے حجاج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے دو لاکھ بسیں اور کاریں تھیں، ہر پچاس ساٹھ قدم پر پولیس کے سپاہی متعین تھے، اور خاص بات یہ تھی کہ وہ حجاج پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے تھے، بلکہ بڑی نرمی اور سہولت کے ساتھ مجمع اور سواریوں کو کنٹرول کرتے تھے، اگر ہندوستان کے بڑے میلوں سے ان کا موازنہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے، اور یہ فضا میں

کئی کئی میل کو اپنے جن کا رابطہ پولیس اسٹیشن سے قائم رہتا تھا مجمع کو دیکھتے رہتے تھے، جہاں کوئی دشواری نظر آتی فوراً پولیس اسٹیشن کو خبر دیتے ایک ایک فرد دو فرلانگ کے فاصلہ پر کرین نصب تھے کہ اگر کوئی بس یا کار خراب ہو جائے اور مجمع کی کثرت کی وجہ سے اسکو ہٹایا جاسکے تو کرین کے ذریعہ اسکو اٹھا لیا جائے اور اس کی جگہ دوسری بس یا کار رکھ دیجائے، اتفاقی حوادث کے لیے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایمبولنس کار گذرتی تھی جس میں فرسٹ ایڈ کا پورا سامان رہتا تھا۔ اس کے ہارن کی خاص قسم کی آواز تھی جس سے پتہ چل جاتا تھا کہ ایمبولنس کار ہے، رات کو اس میں سرخ رنگ کی تیز روشنی ہوتی تھی،

اتنا وسیع طبی انتظام بڑے بڑے ملکوں میں بھی مشکل سے ہوگا جتنا حجاج کے لیے ہوتا ہے مکہ اور مدینہ میں حکومت کے متعدد بڑے اسپتال ہیں، پھر ہر اسلامی ملک اپنا مستقل اسپتال بھیجتا ہے جس میں علاج کا مکمل سامان موجود ہوتا ہے، ہندوستان کا اسپتال بھی ہوتا ہے، اس سال اس میں آٹھ دس ڈاکٹر تھے، اس سے اسلامی ملکوں کے اسپتالوں کا قیاس کیا جا سکتا ہے، پھر ان کی ڈسپنسریاں حاجیوں کے ساتھ منیٰ و عرفات میں منتقل ہوتی رہتی ہیں،

حکومت کی جانب سے حجاج کی راحت رسانی کے لیے بڑے سخت احکام ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر حاجی ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

بعض اصلاح طلب امور | اس حسن انتظام کے باوجود اب بھی بعض چیزیں اصلاح طلب اور حکومت کی توجہ کی محتاج ہیں، ان میں سب بڑا مسئلہ مکہ معظمہ میں مکانوں کا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے مکان بہت کم ہیں، اس لئے حج کے زمانہ میں انکا کرایہ ناقابل برداشت حد تک بڑھ جاتا ہے، ایک معمولی کمرہ جس میں مشکل سے تین چار آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے، ہزار بارہ سو ریال سے کم میں نہیں ملتا، اور مکانوں کی قلت اور کرایہ کی گرانی کی وجہ سے

ایک ہی کمرہ میں سات آٹھ آدمی رہنے پر مجبور رہتے ہیں، یہ بھی واضح رہے کہ مسلمان حکومتیں بھی زرِ تبادلہ بچانے کے لیے اپنے یہاں کے حاجیوں کو محدود رقم دیتی ہیں جو اس گرانی کے زمانہ میں کھانے پینے وغیرہ کے ضروری مصارف کے لیے بھی مشکل کافی ہوتی ہے، اس میں اتنے گراں کرایہ کی گنجائش مطلقاً نہیں ہوتی، جس سے اکثر حجاج کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وہ قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کا ملنا مکہ میں آسان نہیں ہے، اس مشکل کو دور کرنے کی شکل یہ ہے کہ حکومت جدہ کے مدینۃ الحجاج کی طرح مکہ معظمہ میں بھی عمارتیں بنوادے اور حاجیوں سے اس کا مناسب کرایہ لیا کرے، اس سے کچھ دنوں میں اس کے مصارف بھی وصول ہو جائیں گے اور حاجیوں کو بھی سہولت ہوگی، حکومت کے پاس روپیہ کی کمی نہیں، وہ اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی ہے، جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا حکومت کو خود مکانوں کا کرایہ مقرر کرنا چاہئے، مکانات کے مالک تو ان حاجیوں کو لوٹتے ہیں۔

اگرچہ حکومت کی طرف سے حفظانِ صحت کا انتظام ہے، جراثیم کش دوائیں چھڑکی جاتی ہیں، سڑکیں صاف رہتی ہیں مگر گلیاں گندی رہتی ہیں، اس لئے صفائی میں مزید اہتمام کی ضرورت ہے، خصوصاً منیٰ میں جہاں حاجیوں کو خیموں میں کئی دن ٹھہرنا پڑتا ہے، اس کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ ان حاجیوں پر ہے جو صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور خیموں کے سامنے کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔

منیٰ اور عرفات میں توسیع اور کشادہ سڑکوں کی وجہ سے آمد و رفت میں بڑی سہولت ہو گئی ہے لیکن رمی جمار کے میدان اور مذبح میں توسیع کی ضرورت ہے۔

مجھے تو مذبح جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن سنا ہے کہ وہاں جانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، جانوروں کی لاشوں اور ان کی آلائش کو روندتے ہوئے جانا پڑتا ہے، کوئی شخص اسکی

غلاظت سے بچکر نہیں آسکتا۔ ذبح کرنے والے اس بے احتیاطی سے چھری چلاتے ہیں کہ اگر آنے جانے والے خود احتیاط نہ کریں تو ان کے ذبح ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اسلئے مذبح کو وسیع، پختہ اور جانوروں کے ذبح کرنے کا مرتب نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے، پولیس کی نگرانی سے بھی کچھ سہولت ہو سکتی ہے، معلوم ہوا ہے کہ مذبح کی ترمیم کیلئے حکومت نے کئی کرور کی رقم منظور کی ہے، خدا کرے جلد یہ منصوبہ پورا ہو جائے،

اس سے بھی بڑا مسئلہ رمی جمار کا ہے، اگرچہ پہلے کے مقابلہ میں اس کا میدان وسیع ہو گیا ہے، لیکن حاجیوں کی کثرت کے مقابلہ میں اب بھی تنگ ہے، اس سلسلہ میں ایک فقہی مسئلہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، پہلے دن کی رمی جس کا وقت صبح سے دوپہر تک تبقۃً آسان ہے، لیکن ۱۱-۱۲ کی تینوں جمرون کی رمی جس کا وقت زوال کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے بہت دشوار ہے، اتنے وقت میں ۱۵ / ۱۶ لاکھ آدمی رمی نہیں کر سکتے خصوصاً مسنون آداب کے ساتھ تو ناممکن ہے، ۱۱ / اور ۱۲ / کی رمی میں آدمیون کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ جمرہ تک کمزور آدمیون کا پہنچنا بہت دشوار ہوتا ہے، اگر اس ہجوم میں کوئی شخص گر پڑے تو پھر اٹھنا بہت دشوار ہے ایسی حالت مین مسنون طریقہ سے رمی کا کیا امکان ہے، اس کی پابندی مین اس مرتبہ مولانا ابوالحسن علی کی جان جاتے جاتے بچی اسی لئے، اس مشکل کا حل نکالنے کی ضرورت ہے۔

کبھی کبھی اس قسم کی دشواری طواف میں بھی مقام ابراہیم کی سمت پیش آتی ہے، اس میں حاجیوں کی ناواقفیت اور ان کی بدنظمی کو زیادہ دخل ہے، یہ دشواری طواف کے بعد کی نفلین مقام ابراہیم کے پاس مطاف کے اندر پڑھنے سے پیش آتی ہے، اگر مطاف کے باہر نفلین پڑھی جائین تو جگہ کی اتنی تنگی نہو، مقام ابراہیم کے پاس

نفلین پڑھنا مسنون ہے لیکن مطاف کے اندر ضروری نہیں ہے اگر جگہ تنگ ہو تو پورے حرم مین کسی جگہ بھی پڑھی جا سکتی ہیں، مطاف کے اندر پڑھنے سے صرف طواف کرنے والون کو دشواری نہیں ہوتی، بلکہ پڑھنے والون کی کثرت کی وجہ سے نماز کے ارکان بھی صحیح طریقہ سے ادا نہیں کئے جا سکتے،

اس سلسلہ مین دوسرا مسئلہ عورتوں کے طواف کا ہے، عورت اور مرد ساتھ ساتھ طواف کرتے ہیں، اس لئے اس ہجوم میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے احتیاط نہیں ہو سکتی، خود عورتین پلی پڑتی ہیں خصوصاً مصر و افریقہ کی عورتین تو اتنی مردانہ ہیں کہ مردوں کو دھکے دیکر ہٹا دیتی ہیں، اسی قسم کا ہجوم مسجد نبویؐ خصوصاً مواجہہ شریف میں بھی ہوتا ہے، مسجد نبویؐ میں اگرچہ عورتوں کے لئے ایک جگہ مخصوص ہے اسکے باوجود بعض عورتین مردوں کی صف میں گھس آتی ہیں، ایک دن ایک عورت کو جو مردوں کی صف مین گھسنا چاہتی تھی، مسجد نبویؐ کے ایک خادم (اغوات) نے ہٹانا چاہا تو اس نے اس زور سے خادم کو دھکا دیا کہ اس کا عمامہ گر گیا، اور بڑی مشکل سے اس عورت کو ہٹایا جا سکا، اگرچہ ان چیزوں کی اصلاح مشکل ہے لیکن کسی نہ کسی حد تک تو ہو سکتی ہے۔

ملک فیصل بڑے مدبر بیدار مغز اور زمانہ کے حالات سے باخبر حکمران ہیں، بین الاقوامی سیاست پر بھی ان کی پوری نظر ہے، انھوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر کر کے ان کی ترقیون کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر آج کی دنیا میں کوئی ملک زندہ نہیں رہ سکتا، وہ اگرچہ بادشاہ ہیں، لیکن ان کا مزاج جمہوری ہے، اور وہ ملک کی دولت اس کی فلاح اور تعمیر و ترقی پر صرف کرتے ہیں، چنانچہ

اس وقت سعودی عرب میں بہت سے ایسے منصوبے چل رہے ہیں جو ملک کی تعمیر ترقی کے لئے ضروری ہیں اور آیندہ اس کا نہایت وسیع پروگرام ہے، راقم کو ان کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن سعودی حکومت نے اس پر جو کتابیں شائع کی ہیں، ان کے مطالعہ اور ان کی تصویرین دیکھنے کا موقع ملا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعودی حکومت تعمیر و ترقی کی ہر راہ مین گامزن ہے، اسکا ایک مظہر عمارتیں ہیں جن کو ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے، مکہ مدینہ، جدہ اور طائف وغیرہ میں معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے ڈیزائن کی عمارتیں سبزہ کی طرح زمین سے اُگ رہی ہیں، جدہ تو یورپ کا ماڈرن شہر معلوم ہوتا ہے، سنا ہے کہ ریاض اس سے کہین آگے ہے۔

یورپ کی صنعتی تہذیب ترقی کا ایسا معیار اور قومون کی موت و حیات کا ایسا مدار بن گئی ہے کہ کوئی قوم بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور ہر قوم اپنی بقا کے لیے اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہے اور وہ ہوا کی طرح ساری دنیا میں سرایت کر گئی ہے، اس سے انکار نہیں کہ انسانیت کو اس سے بڑے مادی فوائد پہنچے لیکن اسکی سب سے بڑی خرابی جس نے اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے اسکا مادی تصور حیات اور اس کے نتائج ہیں، اور یہ دونوں ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ ایک کو اختیار کرنے کے بعد دوسرے سے بچنا بہت مشکل ہے، یہ تہذیب مادی ترقیون اور انسانی آسائشون کے باوجود اپنے ساتھ ناخدا شناسی اور الحاد و دہریت بھی لاتی ہے۔ جو انسانیت کے لیے پیام ہلاکت ہے، مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر خالص دنیاوی حیثیت سے بھی اس کے بہت بُرے نتائج نکلتے ہیں، اخلاق و روحانیت کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی، اخلاقی حدین ٹوٹنے کے بعد پھر انسانی آزادی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی اور

وہ ہر پہلو سے حیوانیت بن جاتی ہے، جس پر دنیا خصوصاً یورپ کے حالات شاہد ہیں اسلئے
مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ ہے اگر وہ اس تہذیب کو اختیار
نہیں کرتے تو انکا زندہ رہنا مشکل ہے اور اگر اختیار کرتے ہیں تو اس کے برے نتائج
سے بچنا دشوار ہے، چنانچہ آج کوئی ملک و قوم بھی اس سے محفوظ نہیں اور

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ — باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کا معاملہ ہے اسوقت پوری اسلامی دنیا اس دوراہے پر ہے۔

چنانچہ دونوں قسم کے خیالات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ترقی پسند طبقہ مغربی
تہذیب کے طلسم میں گرفتار بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کمیونزم کا شکار ہے، لیکن اکثریت
عملاً نہ سہی عقیدۃً اسلام پسند ہے، سعودی عرب کی حالت ان ملکوں سے کسی قدر
مختلف ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کا سرچشمہ ہے، اسکے مرکز مکہ مدینہ دونوں
سعودی عرب میں ہیں، جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں، حرم، کعبہ اور روضہ نبویؐ
کے سامنے پہنچکر تھوڑی دیر کے لئے بڑے بڑے ترقی پسند ترقی پسندی کو بھول جاتے ہیں،
اور ان کی گردنیں بے اختیار ان کے سامنے خم ہو جاتی ہیں، جس کا مشاہدہ
ہر شخص کر سکتا ہے، دوسرے سعودی عرب کا علاقہ اب سے چند سال پہلے تک مغربی
تہذیب کے دو اہم عناصر یعنی دولت اور جدید تعلیم سے محروم تھا، اس لئے اس کا سایہ سعودی
عرب پر بہت کم پڑا مگر اب پٹرول اور صنعتی منصوبوں کی وجہ سے امریکہ اور یورپ
سے سعودی حکومت کے روابط پیدا ہو گئے ہیں، ان کی آمد و رفت اور جدید تعلیم
کی اشاعت سے مغربی تہذیب کے اثرات پڑنے لگے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے کہ ابھی یہ اثرات معاشرت
تک محدود ہیں، عقائد و افکار اس سے محفوظ ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ چیز کب تک

قائم رہے گی۔

ان حالات میں جو کچھ امید ہے وہ ملک فیصل کی دینداری سے ہے۔ روشن خیالی کے باوجود مذہبی حکمران ہیں اور اس زمانہ میں صرف سعودی عرب اور لیبیا ایسے ملک ہیں، جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کی تعمیر اسلامی بنیادوں پر چاہتے ہیں بلکہ اتحاد اسلامی اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے بہت بڑے داعی بھی ہیں، اس کے لیے انھوں نے اپنے سارے وسائل وقف کر دیے ہیں۔ مکہ میں الرابطۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، ہر سال پابندی کے ساتھ اس کے جلسے ہوتے ہیں جن میں پوری دنیائے اسلام کے علماء و مفکرین جمع ہوتے ہیں اور اس کے سارے مصارف سعودی حکومت برداشت کرتی ہے، اسلامی سکریٹریٹ میں اگرچہ سارے اسلامی ملک شریک ہیں لیکن اس کے روح رواں بھی ملک فیصل ہیں اور اس کا مرکز جدہ ہے، انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف اسلامی ملکوں کا دورہ کرکے ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف عرب بلکہ اسلامی ملکوں کو بڑی حد تک اتحاد اسلامی کے رشتہ میں منسلک کر دیا اور ان ملکوں کو بھی جن کو عربوں سے اختلاف بلکہ ایک گونہ مخالفت تھی ہم نوا بنا لیا عجب نہیں کہ اسلامی مفکرین اور مصلحین نے اتحاد اسلامی اور مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ ملک فیصل کے ذریعہ پورا ہو،

آخیر میں ایک چیز کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، جو ہر شخص کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔ سعودی عرب کے تعمیری اور صنعتی منصوبوں کے باوجود ابھی وہ جملہ ضروریات زندگی میں یورپ کا محتاج ہے مکہ مدینہ اور جدہ وغیرہ کے بازار بیرونی ملکوں کے

سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں، ان میں ملکی کوئی چیز مشکل ہی سے نظر آتی ہے، دولت کی فراوانی نے اور بھی سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے، معیار زندگی اتنا بلند ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، معمولی مزدور کی ماہوار تنخواہ پانچ چھ سو ریال سے کم نہیں، یعنی ہندوستانی سکہ کے حساب سے ہزار بارہ سو ماہوار، معمولی معمولی لوگوں کے پاس اتنی شاندار موٹریں ہیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کو نصیب نہیں، مکانات غیر ملکی سامان آرائش سے آراستہ ہیں، جانماز، ین، رومال اور تسبیحیں تک جن کو حاجی تبرکاً لاتے ہیں دوسرے ملکوں سے آتی ہیں، تسبیح بمبئی سے جاتی ہے، خالص عرب کا تحفہ صرف کھجور رہ گیا ہے،

ضرورت اس کی ہے کہ غیر ملکی مال پر پابندی لگائی جائے۔ اور جہاں تک ہو سکے ضروریات زندگی سعودی عرب یا اسلامی ملکوں سے حاصل کیجائیں ورنہ امریکہ اور یورپ پیٹرول کے معاوضہ میں ایک ہاتھ سے جو کچھ دیتے ہیں وہ دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیتے ہیں۔

حدیث کا درایتی معیار

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دین و شریعت سے متعلق جو کچھ منسوب ہو اسکو "حدیث" کہتے ہیں۔ اس نسبت کی صحت کو جانچنے کے لیے اہل علم نے ایک معیار مقرر کیا ہے، جس کا نام "درایتی معیار" ہے۔

درایت کے لغوی معنی لغت میں درایت کے معنی "معرفت" ہیں۔[1]

حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ راوی (حدیث نقل کرنے والا) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا؟ اس کا حافظہ قوی تھا، یا کمزور، نظر سطحی تھی یا گہری، فقیہ تھا یا غیر فقیہ، جاہل تھا یا عالم، اخلاق و کردار کیسے تھے؟ ذرائع معاش اور مشاغل کیا تھے۔؟ روایت کرنے میں مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے یا نہیں؟ اسی طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ وجملوں میں کسی قسم کی خامی وکمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، معانی ومفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضہ، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے جن سے کسی طرح بھی شان نبوتؐ پر حرف آئے یا فرمودات نبویؐ میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

درایت کی اصطلاحی تعریف دو طرح منقول ہے۔

---

[1] راغب اصفہانی المفردات فی غرائب القرآن محمد بن مکرم انصاری لسان العرب،

(۱) عام اور (۲) خاص "عام" وہ ہے جس کا تعلق راوی اور مروی دونوں کی معرفت سے ہو، اور "خاص" وہ ہے جس کا تعلق صرف "مروی" کی معرفت سے ہو۔

درایت کی عام اصطلاحی تعریف | عام کے تحت تین قسم کی تعریفیں آتی ہیں۔ مثلاً

طاہر بن صالح الجزائری الدمشقی کہتے ہیں۔

علم درایۃ الحدیث علم	درایت حدیث وہ علم ہے جس سے راوی
یتصرف منہ انواع الروایۃ	کی شرطیں، روایت کی قسمیں اور اس کے
واحکامھا وشروط الرواۃ	احکام کی معرفت ہوتی ہو نیز مرویات
واصناف المرویات واستخراج	کی قسمیں اور ان کے معانی کے استخراج
معانیھا[1]	کا علم ہوتا ہے،

ابن الاکفانی اور جلال الدین السیوطی نے بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں[2]

عزالدین بن جماعۃ کہتے ہیں۔

علم الحدیث درایۃ علم	درایتی علم حدیث ان قوانین کے جاننے
بقوانین یعرف بھا احوال	کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ سند اور متن کے احوال
السند والمتن[3]	کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

زین الدین بن علیؒ کہتے ہیں۔

---

[1] طاہر بن صالح، احمد الجزائری الدمشقی توجیہ النظر الی اصول الاثر الفائدۃ الثالثۃ۔ [2] ارشاد المقاصد از مقدمہ تحفۃ الاحوذی (عبدالرحمٰن مبارکپوری) الباب الاول الفصل الاول۔ جلال الدین السیوطی تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی مقدمۃ المؤلف [3] نورالدین عشر المدخل۔ مقدمہ علوم الحدیث لابن الصلاح

درایۃ الحدیث وھو علم	درایتِ حدیث وہ علم ہے جس میں حدیث
یبحث فیہ عن متن الحدیث	کے متن اور اس کی سند سے بحث ہوتی
وطرقہ من صحیحھا وسقیمھا	اور حدیث کی صحت وسقم کا پتہ چلتا ہے،
وعللھا وما یحتاج الیہ[۱]	جن چیزوں کی معلومات ضروری ہیں
	ان کے متعلق علم ہوتا ہے۔

درایت کی خاص اصطلاحی تعریف | "خاص" کے تحت یہ تعریفیں ہیں مثلاً طاش کبری زادہ کہتے ہیں۔

ھو علم باحث عن المعنی	درایت حدیث وہ علم ہے جس میں
المفھوم من الفاظ الحدیث	الفاظ حدیث سے سمجھے گئے مفہوم
وعن المراد منھا مبنیا علی	ومراد سے بحث ہوتی ہے جب کہ
قواعد العربیۃ وضوابط	وہ عربی قواعد وشرعی ضوابط پر
الشریعۃ ومطابقا لاحوال	مبنی اور رسول اللہ کے احوال کے
النبی صلعم[۲]	مطابق ہوں۔

حاجی خلیفہ (صاحب کشف الظنون) اور نواب صدیق حسن خان سے بعینہ یہی تعریف منقول ہے۔[۳]

اس کی تائید درایت کے "موضوع" سے بھی ہوتی ہے۔

---

[۱] زین الدین بن علی بن محمد شرح البدایہ فی علم الدرایہ (مخطوطہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، [۲] طاش کبری زادہ مفتاح السعادہ اور مفتاح السیادہ درایۃ الحدیث۔ [۳] حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون ج ۱۔ علم الحدیث نواب صدیق حسن خان ابجد العلوم ج ۲ علم الحدیث الشریف

وموضوعها احادیث الرسول صلعم من حیث دلالتها علی المفهوم او المراد[1]

رسول اللہ کی حدیثیں مفہوم یا مراد پر ان کی دلالت کی حیثیت سے درایت کا موضوع ہیں۔

علم درایت کے اصلاً دو جزء ہیں۔ مذکورہ مختلف تعریفوں سے ظاہر ہے کہ علم درایت کے اصلاً دو جزء ہیں۔

(۱) نقد حدیث اور (۲) فہم حدیث

نقد حدیث کے دو پہلو ہیں پھر نقد حدیث کے دو پہلو ہیں۔ (الف) خارجی نقد اور (ب) داخلی نقد۔

خارجی نقد میں راوی کے احوال کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور داخلی نقد میں الفاظ، معانی اور مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و محل کی تعیین ہوتی ہے۔

فہم حدیث کے دو پہلو ہیں۔ اسی طرح فہم حدیث کے بھی دو پہلو ہیں۔

(الف) خارجی فہم اور (ب) داخلی فہم اور

خارجی فہم میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث کے مفہوم میں وقتی حالات، مقامی اثرات اور زمانی خصوصیات کو کس حد تک دخل ہے؟ داخلی فہم میں دیکھا جاتا ہے کہ حدیث کے مفہوم اور موقع و محل کی تعیین میں کن مقاصد کا لحاظ ضروری اور کس وقت کن کو مقدم یا مؤخر کرنے کی گنجائش ہے؟

وہ پہلو جن پر کام کی شدید ضرورت ہے۔ نقد حدیث کے خارجی پہلو (خارجی نقد) پر تو کام ہو چکا ہے

[1] کشف الظنون ج ۱۔ علم الحدیث

لیکن اس کے داخلی پہلو اور فہم حدیث کے دونوں پہلوؤں پر کام کا تسلسل نہیں جاری رہ سکا جس کی وجہ سے حدیث کی شناخت اور اس کے محل کی تعیین میں دشواری پیش آتی رہی اور حدیث کی افادیت گویا ایک ساتھ محدود ہوگئی۔ حالانکہ ان پہلوؤں پر کام سے بڑے قیمتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) داخلی "نقد" سے حدیث الفاظ و معانی کی مختلف کمزوریوں سے پاک ہوکر اپنی اصل ہیئت و عظمت برقرار رہتی ہے۔ (۲) "خارجی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس حدیث سے روح اور قالب دونوں مقصود ہیں، اور کس کی صرف روح مقصود ہے، اور "قالب" حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۳) داخلی فہم سے حکمتوں اور مصلحتوں کی یافت ہوتی ہے۔ جن سے احکام و مسائل کے استخراج و استنباط کی راہیں کھلتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ خارجی نقد کی طرح اگر ان "فوائد" کو بھی حاصل کرنے کی کوشش مسلسل جاری رہتی تو نہ حدیث کی افادیت مجروح ہوتی اور نہ اس کو ایک دور کے ساتھ محدود کرنے کی کسی کو جرأت ہوتی۔

نقد حدیث پر مستشرقین کا کام | "نقد حدیث" پر مستشرقین نے بھی کام کیا ہے جن میں گولڈ سیہر (Golt Siher) اور جوزف شاخت (Joseph Schacht) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے گولڈ سیہر کو تو مغرب میں "نقد حدیث کا بانی سمجھا جاتا ہے اور جوزف شاخت اس کا لائق شاگرد ہے جس نے استاد کے کاز کو تقویت پہنچا کر اس کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ان دونوں نے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو (جس کی بنیادیں مضبوط نہیں ہیں) زیادہ متاثر کیا ہے اس بنا پر جدید دور میں

درایت حدیث کی بحث اس وقت تک ناتمام سمجھی جاتی ہے، جب تک نقد حدیث پر مستشرقین کے کام کا جائزہ نہ لیا جائے۔

پھر درایت کا گہرا تعلق "ماخذ حدیث" سے ہے جس کی معرفت کے بغیر درایت کی ہر بحث نامکمل رہتی ہے۔ ایسی صورت میں پہلے حدیث کے ماخذ کا ذکر ضروری ہے۔

درایتی معیار کے پانچ اہم مباحث | اس طرح "درایتی معیار" پر گفتگو کے لئے پانچ اہم عنوان قرار پاتے ہیں۔

(۱) حدیث کا ماخذ۔ (۲) داخلی نقد حدیث۔ (۳) خارجی فہم حدیث۔ (۴) داخلی فہم حدیث اور (۵) نقد حدیث کا جائزہ

آئندہ سطور میں ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حدیث کا ماخذ | حدیث کا ماخذ" SOURCE" (سرچشمہ) شعور نبوت ہے۔ اس سے مراد علم و حکمت کا "نور" اور فہم و ادراک کا وہ "کمال" ہے جو انبیاء علیہم السّلام کو اللہ کی جانب سے عطا ہوتا ہے۔ یہ شعور نبوت کے خلقی وجدان کا نتیجہ اور اس کے لیے لازم ہے۔ جن کے بغیر نبوت کے فرائض انجام دینے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

شعور نبوت کا ثبوت | قرآن حکیم کی اس آیت سے "شعور نبوت" کا ثبوت ملتا ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ[۱]	اے نبیؐ۔ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا۔

---

[۱] النساء، رکوع ۱۵۔

بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ کی تفسیر مفسرین سے یہ منقول ہے۔

بِمَا عرفك واوحى به اليك[1] — اس کے مطابق جس کی اللہ نے آپ کو معرفت دی اور آپ کی طرف وحی بھیجی۔

بِمَا اعلمك الله[2] — اس کے مطابق جسکا اللہ نے آپکو علم دیا۔

امام فخرالدین رازی نے مذکورہ آیت میں "علم" کو "رویۃ" سے تعبیر کرنے کی وجہ بیان کی ہے۔

لان العلم المبرأ عن جهات الريب يكون جاريا مجرى الرواية فى القوة و الظهور[3] — وہ علم یقینی جو شک کو دور کرنے والا ہے، قوت اور ظہور میں رویت (دیکھنے) کے قائم مقام ہوتا ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لايقولن احد قضيت بما ارانى الله تعالى فان الله تعالى لم يجعل ذالك الا للنبى واما احد نا فرايه يكون ظنا لا علما[4] — کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا جو اللہ نے مجھے دکھایا کیونکہ یہ مقام صرف نبیؐ کے لیے خاص ہے۔ ہم لوگوں کی رائے ظن کے درجہ میں ہوتی ہے، نہ کہ علم کے درجہ میں

ظاہر ہے کہ رویت سے مراد یہاں بصری روایت نہیں ہے بلکہ قلبی روایت ہے[5]

---

[1] قاضی بیضاوی تفسیر بیضاوی سید محمود آلوسی۔ روح المعانی نساء ع ۱۵ [2] فخرالدین رازی تفسیر کبیر جز ثالث نساء ع ۱۵ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] محمد عبدہ المنار جز خامس۔

جس کی اللہ کی طرف نسبت ہے اور یہ خصوصیت صرف "شعور نبوت" کو حاصل ہوتی ہے۔

حکمت کا مفہوم | شعور نبوت کو سمجھنے کے لیے حکمت اور اس کے مقام کی نشاندہی ضروری ہے۔

قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں "حکمت" کا ذکر ہے لغت میں اس کے یہ معنی ہیں۔

الحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم والعقل[1] الحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم[2]	علم وعقل کے ذریعہ حق کو پہنچنے کا نام حکمت ہے۔ افضل اور بہتر چیز کو بہترین علم کے ذریعہ جاننا حکمت ہے۔

مفسرین سے یہ معنی منقول ہے۔

(۱) ہر شئے کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت "وضع کل شئی موضعہ"

(۲) حقایق اشیا کی معرفت "معرفۃ الاشیاء بحقائقھا"

(۳) حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت "الفصل بین الحق والباطل"

(۴) قول اور عمل میں صحیح رائے تک پہنچنا "الاصابۃ فی القول والعمل"[3]

(۵) وہ معارف و احکام جن سے نفوس انسانی کمال کو پہونچیں ما یکمل نفوسھم من المعارف والاحکام

ان کے علاوہ بھی بہت سے معنی مفسرین سے منقول ہیں۔ مثلاً

(۶) انوار قلوب کی معرفت اور اسرار غیوب سے واقفیت۔

(۷) نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی۔

---

[1] راغب اصفہانی۔ مفردات القرآن۔ [2] محمد بن مکرم انصاری لسان العرب [3] علاء الدین علی تفسیر خازن ص ۲۰۰ و قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری ص ۳۰۰

(۸) شیطانی اور انسانی تقاضوں میں امتیاز کی قوت۔

(۹) عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت۔

(۱۰) برائیوں کی صحیح نشاندہی کے بعد علاج کی صحیح تدبیریں۔

(۱۱) مخلوق کے احوال کا علم

(۱۲) خاص قسم کی فراست (قیافہ شناسی)[1]

ابن مسکویہ (فلسفی) نے حکمت کے تحت یہ چیزیں بیان کی ہیں۔

"ذکاوت و ذہانت، سرعت فہم، قوت فہم، ذہن کی صفائی، عقل کی رسائی اور سہولت تعلیم"

پھر اس کے بعد کہا ہے۔

وبھذہ الاشیاء یکون حسن	ان ہی چیزوں کے ذریعہ حکمت کی حسن
الاستعداد الحکمۃ[2]	استعداد پیدا ہوتی ہے

مجاہد تابعی اور امام مالک سے یہ معنی منقول ہیں۔

انھا معرفۃ الحق والعمل بہ و	حکمت نام ہے حق کی معرفت اس پر
الاصابۃ فی القول والعمل[3]	عمل اور قول وعمل میں درستی کو پہنچنے کا۔

ابن قیم نے اس "معنی" کو احسن قرار دیا ہے۔

واحسن ما قیل فی الحکمۃ[3]	حکمت کے باب میں جو کچھ کہا گیا ان میں یہ احسن ہے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ "حکمت" دراصل اسی "استعداد" کا نام ہے جس کے ذریعہ

---

[1] عرائس البیان فی حقائق القرآن ص ۲۰۶ [2] ابن مسکویہ۔ تہذیب الاخلاق ص ۳۹ ، ۴۳ [3] ابن القیم مدارج السالکین وتفسیر قیم و انزل اللہ الخ ص ۲۲۶ (مرتب محمد ادریس ندوی)

حق کی معرفت، فیصلہ کی قوت کسی اور شے کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

حکمت "علم و فہم کا نہایت اونچا درجہ ہے"

قرآن حکیم کی جن آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ان میں حکمت کو علم و فہم کا نہایت اونچا درجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) تلاوت آیات وہ درجہ جو ذکر و نصیحت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۲) تعلیم کتاب۔ وہ درجہ جس میں موقع و محل کے لحاظ سے مفہوم متعین کرنے اور اصول و کلیات کو برمحل منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تعلیم حکمت۔ وہ درجہ جس میں بات کی تہ تک پہنچنے اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنے کی "حسن استعداد" پیدا ہوتی ہے۔ "تزکیہ" کا تعلق عمل سے ہے، جو ہر درجہ میں یکساں ضروری ہے۔

کمال حکمت ساتھ نورانی شعاع کی آمیزش

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نبوت درجۂ کمال کی حکمت پر فائز ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم میں لفظ "حکمت" کی تفسیر اکثر و بیشتر نبوت و سنت سے کی جاتی ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں۔

الحکمۃ فی کتاب اللہ نوعان	اللہ کی کتاب میں حکمت دو طرح مستعمل ہے
مفردۃ ومقترنۃ بالکتاب	(۱) مفرد اور (۲) کتاب کے ساتھ۔
فالمفردۃ فسرت بالنبوۃ و	(۱) مفرد کی تفسیر نبوۃ اور علم قرآن کے
فسرت بعلم القرآن قال	ساتھ کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ

ابن عباس هی علم القرآن
ناسخه ومنسوخه ومحکمه
ومتشابهه ومقدمه
ومؤخره وحلاله وحرامه
وامثاله وقال الضحاک
هی القرآن والعلم والفقه
وفی روایة اخری عنه هی
الاصابة فی القول والفعل
وقال النخعی هی معانی الا
الاشیاء فهمها وقال الحسن
الورع فی دین الله کانه
فسرها بثمرتها ومقتضاها
واما الحکمة المقرونة
بالکتاب فهی السنة کذلک
قال الشافعی وغیره من
الائمة وقیل فی القضاء
بالوحی وتفسیرها بالسنة
اعم واشهر ؎

وہ علم قرآن ہے یعنی ناسخ و منسوخ،
محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر اور حلال
و حرام وغیرہ ضحاک نے کہا وہ قرآن
علم اور فقہ ہے ضحاک کی دوسری روایت
میں اس سے مراد قول اور فعل میں درستی
کو پہنچنا ہے، نخعی نے کہا کہ چیزوں کے
معانی اور ان کا فہم ہے حسنؒ نے کہا کہ
اللہ کے دین میں پرہیزگاری مراد ہے
گویا یہ تفسیر اس کے ثمرہ اور مقتضاء کے
لحاظ سے ہے، (۲) جو حکمت کتاب کے
ساتھ ہے اس سے سنت مراد ہے، امام
شافعیؒ اور دوسرے ائمہ نے یہی کہا ہے،
بعضوں نے "وحی" کے مطابق فیصلہ مراد
لیا ہے لیکن سنت کے ساتھ اس کی
تفسیر زیادہ عام اور مشہور ہے۔

۱؎ ابن قیم مدارج السالکین وتفسیر قیم وانزل اللہ ص ۲۲۶،

نبوت میں کمالِ حکمت کے ساتھ نورانی شعاع کی آمیزش ہوتی ہے جو شاہدہ حق سے باطن پر پڑتی اور اس کو روشنی بخشتی ہے۔

شعورِ نبوت کے تکوینی اجزاء	اس طرح شعورِ نبوت کے دو اہم جزء ہیں۔ جن سے اس کی تکوین ہوتی ہے۔

(۱) کمالِ حکمت اور (۲) نورانی شعاع۔

چند آیتوں سے بطور اشارۃ النص ثبوت	ذیل میں چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں جن سے بطور اشارۃ النص شعورِ نبوت کے اجزاء کا ثبوت ملتا ہے۔

اللہ یصطفی من الملٰئکۃ رسلا ومن الناس[۱]	اللہ فرشتوں اور انسانوں میں رسول خود منتخب کرتا ہے۔

یعنی یہ انتخاب وہبی خصوصیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ نہ کہ کسبی خصوصیات کی بنا پر۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ[۲]	اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کس کے سپرد کرے۔

جس کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے رجحانات و قلبی میلانات کی بھی نگرانی ہوتی ہے

ولولا ان ثبتنٰک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا[۳]	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔

اس کا علم خالص اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

وکذٰلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت	اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے قرآن کی وحی کی ورنہ

---

[۱] الحج رکوع ۱۰۔ [۲] الانعام رکوع ۱۵۔ [۳] بنی اسرائیل رکوع ۸۔

تدری ما الکتب ولا	نہ آپ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے
الایمان ولکن جعلنٰہ	اور نہ ایمان کی تفصیل سے واقف
نوراً نھدی بہ من	تھے، لیکن ہم نے اس کو "روشنی" بنایا
نشاء من عبادنا۔[1]	کہ اس کے ذریعہ ہم جس کو چاہتے
	ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس قدر چاہتا ہے غیبی امور کا بھی علم ان کو عطا کرتا ہے۔

وما کان اللہ لیطلعکم	اللہ غیب کی اطلاع نہیں دیتا ہے
علی الغیب ولکن اللہ	لیکن اپنے رسولوں میں سے جسکو
یجتبی من رسلہ من	چاہتا ہے۔ اس کے لیے منتخب
یشاء[2]	کرتا ہے۔

شعور نبوت اور عقل مادی میں ٹکراؤ نہیں ہے۔

جس ذات گرامی کو یہ خصوصیات حاصل ہوں گی وہ لازمی طور سے کمال حکمت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوگی اور نورانی شعاعیں اس کے جلو میں ہوں گی اور اس کے شعور اور عقل مادی میں کوئی ٹکراؤ نہ ہوگا کیونکہ ٹکراؤ کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داخلی اور خارجی دباؤ (طبعی حجابات اور وضعی حالات) سے حفاظت نہ ہو۔ اور حفاظت صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے قویٰ میں کمال اعتدال پایا جاتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے اور جس کی بناء پر من جانب اللہ ان کی حفاظت کا انتظام ہوتا ہے

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں۔

---

[1] الشوریٰ رکوع ۵، [2] آل عمران رکوع ۱۱۔

ھم متفقون علی انھم	سب اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء
لا یقرون علی خطاء فی	علیہم السلام دین میں کبھی بھی خطا پر
الدین اصلا ولا علی فسق	برقرار نہیں رہ سکتے اور نہ فسق اور
ولا کذب ففی الجملۃ کل	کذب پر خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نبوت
ما یقدح فی نبوتھم و	اور تبلیغ میں خرابی پیدا کرے انبیاء
تبلیغھم عن اللہ تعالیٰ	کے اس سے منزہ اور پاک ہونے
فھم متفقون علی تنزیھھم[1]	پر سب کا اتفاق ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں۔

واجتہادہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ کا اجتہاد بمنزلہ وحی ہے
وسلم بمنزلۃ الوحی لان	کیونکہ اللہ نے آپ کو غلط
اللہ تعالیٰ عصمہ من	رائے پر قائم رہنے سے محفوظ
ان یتقرر رایہ علی	رکھا ہے۔
الخطاء[2]	

"عبقات" میں ہے۔

لکن ھذہ الناصیۃ مختصۃ	لیکن حفاظت کی یہ قسم انبیاء علیہم السلام
بالنبی المعصوم الذی	کے ساتھ خاص ہے جن کی مہد سے لیکر
یعصمہ من المھد الی اللحد[3]	لحد تک حفاظت ہوتی ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ منہاج السنۃ ج ۱ فصل الرد علی ما زعمہ ان مقالۃ اہل السنۃ فی عصمۃ الانبیاء [2] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب بیان اقسام علوم النبی [3] شاہ اسمٰعیل شہید :- عبقات عبقہ ۱۲

شعور نبوت دین و شریعت سے متعلق حدیثوں کا سرچشمہ ہے۔	شعور نبوت ان سب حدیثوں کا سرچشمہ ہے۔ جو دین و شریعت سے متعلق رسول اللہ کی طرف

منسوب ہیں۔ شافعی نے ان کی تین قسمیں کی ہیں۔

(۱) ما انزل اللہ عزو جل فیہ نص کتاب فسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل نص الکتب	(۱) قرآن میں جس طرح کوئی حکیم صراحتہً نازل کیا گیا رسول اللہ نے اسی طرح اس کی تفسیر فرمائی۔
(۲) ما انزل اللہ فیہ جملۃ کتاب فبین عن اللہ معنی ما اراد۔	(۲) قرآن میں جو بات مجمل ہے رسول اللہ صلعم کی طرف سے اس کی مراد و تفصیل کو بیان کیا۔
(۳) ما سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما لیس فیہ نص کتاب[1]	(۳) رسول اللہ صلعم نے وہ سنتیں قائم کیں جن کا صراحتہً ذکر قرآن میں نہیں ہے۔

شاطبیؒ کہتے ہیں۔

السنۃ راجعۃ فی معناھا الی الکتاب فھی تفصیل مجملہ وبیان مشکلہ وبسط مختصرہ[2]	"سنت" اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے۔ وہ (سنت) قرآن کے مجمل کی تفسیر مشکل کا بیان اور مختصر کی

بقیہ

[1] شافعی۔ کتاب الرسالہ باب ما ابان اللہ الخ [2] شاطبیؒ الموافقات جزء رابع المسألۃ الثا

ابن قیم کہتے ہیں۔

والسنۃ مع القرآن ثلثۃ اوجہ احدھا ان تکون موافقۃ لہٗ من کل وجہ فیکون توارد القرآن والسنۃ علی الحکم الواحد من باب توارد الادلۃ وتظافرھا الثانی ان تکون بیانا لما ارید بالقرآن و تفسیرا لہ الثالث ان تکون موجبۃ لحکم سکت عن تحریمہ ولا تخرج عن ھذہ الاقسام فلا تعارض للقرآن[۱]

قرآن کے ساتھ سنت کا تعلق تین طرح سے (۱) سنت قرآن کے پوری طرح موافق ہے یعنی جو حکم اس میں ہو وہی اس میں ہے۔ یہ توارد ادلیا ہی ہے جیسے ایک حکم پر مختلف دلیلوں کا جمع ہو جانا (۲) سنت قرآن کے حکم کی تشریح و توضیح کرتی ہو (۳) سنت کسی واجب یا حرمت کو ثابت کرتی ہے جس سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے۔ سنت کی کوئی قسم ان تینوں سے خارج نہیں ہے اور ان میں سے کوئی بھی کسی حیثیت سے قرآن کے معارض نہیں ہے۔

دین و شریعت سے متعلق حدیثیں قرآن کی علمی و عملی تشریح ہیں،	دین و شریعت سے متعلق حدیثیں دراصل قرآن ہی کی علمی و عملی تشریح ہیں جس کا ثبوت ان آیتوں سے ملتا ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون[۲]

اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ جو چیز لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے آپ انکے سامنے بیان کر دیں اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

---

[۱] ابن قیم اعلام الموقعین ج ۱ بحث الزیادۃ علی القرآن نسخ المثال الثامن عشر [۲] نحل ع

یاایھا الرسول بلغ ما انزل — اے رسولؐ جو کچھ آپ پر آپکے رب کی طرف
الیک من ربک[1] — سے نازل کیا گیا ہے آپ اسکی تبلیغ کیجئے۔
انک لعلیٰ خلق عظیم[2] — بے شک آپ خلق عظیم پر ہیں۔

پہلی آیت میں رسول اللہ کو مبین (شارح) اور دوسری میں مبلغ بتایا گیا ہے۔ بیان و تبلیغ کی صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و فعل سے اور کبھی مروجہ طریقوں کو برقرار رکھکر قرآن کے مطالب و مقاصد کی وضاحت فرماتے تھے۔ تیسری آیت میں آپکو "خلق عظیم" پر فائز بتایا گیا ہے۔ جن میں قول و فعل اور اقرار سبھی داخل ہیں، جن کو حدیث کی تعریف شامل ہے۔

لقد منّ اللہ علی المؤمنین — بلاشبہ مومنوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے
اذ بعث فیھم رسولا منھم — ایک رسولؐ بھیجا جو ان ہی میں سے ہے
یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکیھم — وہ اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے برائیوں
ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ[3] — سے پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت

(حاشیہ: تعلیم قرآن و حکمت و اصلاح)

یعنی تلاوت آیات میں قرآن اور تعلیم کتاب و حکمت اور "اصلاح" سے متعلق جسقدر حدیثیں ہیں وہ سب رسول اللہؐ کے کام کی تفصیلات اور قرآن کی علمی و عملی تشریحات ہیں۔

علمی و عملی تشریح کی چند مثالیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے تشریحات نبویؐ کی نوعیت ظاہر ہوگی۔ اور یہ ثابت ہوگا کہ اس نوعیت کا کام شعور نبوت کے بغیر نہیں انجام پا سکتا۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے اصطلاحی الفاظ۔ ایمان، اسلام، صلوٰۃ،

---

[1] المائدہ ع ۱۰ [2] القلم رکوع ۱ [3] آل عمران رکوع ۱۷

زکوٰۃ، صوم، حج، قربانی، اور جہاد وغیرہ کا مفہوم متعین کیا اور ان کی صحیح عملی کیفیت بیان کی،

(۲) غیر اصطلاحی الفاظ کے معنی بیان کئے مثلاً الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم[1] جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں ظلم کو نہیں ملایا، میں ظلم کے معنی شرک بیان کئے ہیں۔

(۳) جملوں کی تشریح کی جیسے "کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود"[2] میں خیط ابیض اور خیط اسود سے رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد لی پھر بعد میں "من الفجر" کا نزول ہوا،

(۴) آیتوں کی وضاحت کی مثلاً "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"[3] (انھوں نے اللہ کے سوا اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا) کے متعلق فرمایا کہ حقیقۃً رب بنانا نہیں مراد ہے بلکہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کرنے میں احبار و رہبان کا حق تسلیم کرنا مراد ہے۔

(۵) آیتوں کے شان نزول بیان کئے مثلاً وعلی الثلثۃ الذین خلفوا[4] (ان تین آدمیوں کی توبہ قبول کی گئی جو پیچھے رہ گئے تھے۔) میں تین آدمی کعبؓ بن مالک، ہلال بنؓ امیہ اور مرارہ بنؓ ربیع کی تعیین فرمائی۔

(۶) اشکال کے جواب دیئے۔ مثلاً یا اخت ھرون[5] (اے ہارون کی بہن) فرمایا کہ ہارون سے مراد نبی نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے، اسی طرح مرنے کے بعد دوسری زندگی کے بارے میں طرح طرح اشکالات کے جواب دیئے۔

(۷) مجمل آیتوں کی تشریح کی جس کے بغیر صحیح مفہوم سے واقفیت دشوار تھی مثلاً معروف، منکر، طیبات اور خبائث وغیرہ کی تفصیل

---

[1] انعام - ۸۲ [2] بقرہ - ۱۸۷ [3] توبہ - ۳۱ [4] ایضاً - ۱۱۸ [5] مریم - ۲۸

(۸) مطلق آیتوں کو موقع و محل کے لحاظ سے مقید کیا، مثلاً جرائم کی سزاؤں سے متعلق آیتوں پر عمل درآمد کی تفصیل بیان کی۔

(۹) احکام کی شرطیں، رکاوٹیں، اور قیدیں وغیرہ بیان کیں جن کے بغیر ان پر عمل دشوار تھا۔ مثلاً نکاح، طلاق، خرید و فروخت وغیرہ معاملات کی تفصیل

(۱۰) نئے احکام بیان کئے جن کا صریح ذکر اگرچہ قرآن میں نہیں ہے لیکن وہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں۔ مثلاً پھوپھی کی موجودگی میں بھتیجی سے نکاح یا خالہ کی موجودگی میں بھانجی سے نکاح وغیرہ۔

(۱۱) جزئی احکام کے موقع و محل متعین کئے جیسے تیمم و نماز قصر کے مواقع اور شرعی رخصتوں کے فعل وغیرہ

(۱۲) اصول و کلیات کو مثال کے ذریعہ واضح کیا جس سے قیاس و استنباط کی راہیں کھلیں مثلاً پالتو گدھے، دانتوں سے شکار کرنے والے درندے اور پنجہ سے شکار کرنے والے پرندوں کو خبائث میں شامل کر کے حرام قرار دیا۔

(۱۳) "اصل" کو "فرع" پر منطبق کر کے دکھایا اور اس کے حدود و قیود بتائے جس سے دوسری فرع کا حکم نکالنے میں سہولت ہوئی جیسے مردہ جانور کی حرمت اور ذبیحہ کی حلت کا حکم تو موجود ہے۔ لیکن ذبیحہ کے پیٹ سے جو بچہ نکلے اس کا حکم نہیں معلوم ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس کا حکم بیان کیا۔

(۱۴) جزئیات پر مستقل عام قاعدہ کی تشکیل کی جس سے مصالح مرسلہ ستحسان (فقہ کے دو اہم اصول) میں کام لیا گیا۔ مثلاً

لا ضرر ولا ضرار فی اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے۔

الاسلام[۱] اور نہ نقصان پہنچاتا ہے۔

(۱۵) قرآن حکیم میں جن مصالح و مقاصد کو ملحوظ رکھکر احکام و اصول مقرر کیے رسول اللہؐ نے ان کو پیش نظر رکھ کر بہت سے جزئی احکام بیان کیے جن سے اجتہاد کا دروازہ وسیع ہوا، اور شرعی احکام کو برمحل منطبق کرنے میں سہولت ہوئی۔

شاطبی نے الموافقات جزء ثانی میں نہایت تفصیل کے ساتھ مصالح و مقاصد کی بحث کی ہے، اور راقم کی کتاب مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر میں بھی مل جائے گی۔

عقل بشری دنیوی حالات سے متعلق حدیثوں کا سرچشمہ ہے

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے شعور نبوت ان حدیثوں کا سرچشمہ ہے، جن کا تعلق دین و شریعت سے ہے، لیکن جو حدیثیں دنیوی حالات و تجربات سے متعلق ہیں ان کا سرچشمہ "عقل بشری" ہے، جن کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا ہے

انما انا بشر اذا امرتکم بشیئ من دینکم فخذوا به و اذا امرتکم بشیئ من رائی فانما انا بشر[۲] (مسلم باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم)	میں ایک انسان ہی ہوں جب میں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس کو پکڑو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں انسان ہوں۔

دوسری روایت میں ہے۔

انتم اعلم بامور دنیاکم[۳] ایضاً	تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت میں ہے۔

---

[۱] مسلم ابواب البیوع [۲] ایضاً [۳] ایضاً

انی ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا بہ فانی لا اکذب علی اللہ[۵] (مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا)

میں نے گمان سے ایک بات کہی تھی تم ان باتوں کو (شرعی حیثیت سے) نہ لو لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کچھ کہوں تو اس کو لے لو میں اللہ پر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد باغبانوں کو کھجور کی پیداوار کے بارے میں ایک مشورہ دیا تھا۔ (تابیر نخل سے منع فرمایا تھا) لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ لیکن وہ مفید نہ ثابت ہوا۔ اس پر رسول اللہؐ نے مذکورۂ بالا الفاظ فرمائے، درایتی معیار کا اصل تعلق شعور نبوت سے ہے، اس بنا پر عمل بشری سے متعلق حدیثوں پر گفتگو کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔ (باقی)

تذکرۃ المحدثین

اس میں مولفین صحاح ستہ کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً عبدالرزاق بن ہمام، احمد بن حنبل، دارمی، ابن جارود، ابو یعلی موصلی، ابن خزیمہ، طحاوی وغیرہ ائمہ حدیث کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے مقدمہ پھر اصل کتاب ہے جو صاحب موطا امام مالک کے حالات سے شروع ہوئی ہے۔

مولفہ۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ قیمت آٹھ روپیے

انشورنس

(اسلامی نقطۂ نظر سے)

تحریر:۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن تاج

ترجمہ:۔ از۔ مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔

(یہ مقالہ قاہرہ میں مجمع البحوث الاسلامیہ کی ساتویں کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا)

بیمہ کمپنیوں کے دو کام ہیں (۱) زندگی کا بیمہ کرنا۔ (۲) مال کا بیمہ کرنا اور ان دونوں قسموں کے بیموں کا مقصد جان و مال کے تحفظ و سلامتی کی ضمانت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جان و مال کی ہلاکت کے خطروں کو روک دے گا۔ اور ان کی تباہی کے اسباب کو بند کر دے گا۔ کیونکہ یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کہ فرشتۂ اجل کو کوئی روک دے۔ یا جو آفات سماوی نازل ہوں۔ ان کو دور کر دے۔ یہ ایک نہایت ہی لغو بات ہو اور بہت بڑی حماقت ہے۔ ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی سلامتی و تحفظ کی ضمانت دیکھائے یا کسی مدعی کی اس طرح کی احمقانہ ضمانت قبول کی جائے۔

بیمہ کمپنیاں جان یا مال کے تحفظ و سلامتی کی جو ضمانت دیتی ہیں۔ وہ درحقیقت ایک طرح کی مراہنت ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بیمہ کمپنی بیمہ کرتے وقت اپنے ممبروں سے یہ عہد کرتی ہے۔ کہ اگر بیمہ شدہ جان یا مال کو کسی قسم کا ضیاع یا نقصان،

پہونچا تو کمپنی اس نقصان کے معاوضہ میں وہ رقم ادا کرے گی جسے ادا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

زندگی کے بیمہ کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کسی مدت معینہ تک کے لئے ایک مقررہ رقم پر کمپنی سے معاہدہ کرتا ہے۔ مثلاً اگر بیس سال کے لئے پانچ ہزار پونڈ طے پایا ہے تو یہ شخص اس معاہدہ کی رو سے کمپنی کو مقررہ شرائط کے مطابق ماہانہ قسطوں میں یہ رقم ادا کرتا رہے گا۔ اگر یہ شخص مقررہ مدت تک اپنی جان سلامتی کے ساتھ بچا لے گیا تو کمپنی اس کی ساری رقم جو اس نے کمپنی کو دی ہے منافع کے ساتھ یا بغیر منافع کے جیسا کہ طے شدہ شرائط میں ہوگا، اسے واپس کر دے گی۔ اگر وہ شخص متعینہ مدت کے درمیان ہی میں مر گیا تو کمپنی پوری مقررہ رقم اس کے ورثہ کو یا اس کے مقرر کئے ہوئے جانشین کو ادا کر دے گی۔ چاہے مرنے والے نے اپنی زندگی میں بیمہ کی مقررہ رقم میں سے ایک ہی قسط کیوں نہ ادا کی ہو۔

جسم کے مختلف اعضا کا الگ الگ بیمہ بھی پوری زندگی کے بیمہ جیسا ہے۔

مال کے بیمہ کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص بیمہ کمپنی سے ایک معاہدہ کرتا ہے جس کی رو سے کمپنی اس کے مکان یا موٹر یا اثاثہ یا تجارتی مال جو دوکان میں ہو یا وہ اسے خشکی یا تری میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا ہو۔ ان کے علاوہ بھی مختلف چیزوں کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے۔ اور مال کا مالک کمپنی کو مقررہ شرائط کے مطابق ماہانہ یا سالانہ ایک متعین رقم ادا کرتا رہتا ہے۔ اس متعین رقم کی مقدار فریقین کے درمیان بیمہ شدہ مال کی طے شدہ قیمت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔

یہ مقررہ رقم، زندگی کے بیمہ کے برخلاف خالصۃً بیمہ کمپنی کی ہوتی ہے۔ مال مالک

کسی حالت میں بھی اسے واپس نہیں لے سکتا البتہ اگر بیمہ شدہ مال پر کوئی آفت آگئی اور وہ تباہ و برباد ہوگیا تو اس تباہ شدہ مال کی پوری قیمت ادا کرنے کی ذمہ دار کمپنی ہوگی، اگرچہ مال کے مالک نے بیمہ کی مقررہ رقم کی ادائیگی صرف ایک ہی بار کیوں نہ کی ہو۔

انشورنس کی دونوں قسموں کے بارے میں شرعی حکم

زندگی یا مال کے بیمہ کے موضوع پر علمائے متقدمین کا کوئی خیال کہیں منقول نہیں ہے۔ اس لئے اس معاملہ کی حرمت وحلت کے بارے میں ان کے کسی قول سے استناد ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کے عہد میں معاملت کی یہ قسم نہ تو اسلامی حدود مملکت میں کہیں رائج تھی۔ اور نہ اس پاس کے غیر اسلامی ملکوں ہی میں اس طریقہ کا رواج تھا۔ لیکن اسلامی شریعت کے بنیادی اصول وقواعد، اور علماء مجتہدین کے استنباط کئے ہوئے شرائط وضوابط کی روشنی میں بیمہ کی دونوں قسموں کے متعلق شریعت کا نقطۂ نظر معلوم کیا جاسکتا ہے اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ بیمہ کی موجودہ شکلیں، اس کے قانونی اثرات اور اس کے وہ معروف ومشہور قیود وشرائط جن کے مطابق بیمہ کمپنیاں چل رہی ہیں کیا ہیں؟ اور پھر اس کے بعد شریعت اسلامی کے تفصیلی نصوص، عمومی کلیات اور فقہ اسلامی کے مصادر سے ائمۂ مجتہدین کے استنباط کئے ہوئے قوانین وضوابط کی روشنی میں پوری تدقیق وتحقیق کے ساتھ ان سب کا جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ بیمہ کے متعلق شریعت اسلامی کا صحیح حکم معلوم ہوسکے بیمہ کے علاوہ ان تمام معاملات ومسائل کا بھی یہی حال ہے جن سے گزشتہ زمانہ کے فقہاء کو کوئی سابقہ پیش نہیں آیا۔

شریعت اسلامی کے بنیادی اصول اور بیمہ کمپنیوں کے مروجہ آئین وضوابط کی بنیاد پر

ہمارا خیال ہے کہ مذکورۃ الصدر شکل میں بیمہ کے تمام معاملات اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے قطعاً ناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کے بیمہ میں اس شکل کے جواز کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، جس میں مدت معینہ کے خاتمہ تک زندہ رہنے کی حالت میں صرف اصل رقم جو حسب قرارداد فریقین طے پا چکی تھی۔ واجب الادا ہو۔ اور اس پر کوئی سود بھی نہ لیا جائے کیونکہ یہ معاملت بذات خود فاسد اور فاسد شرطوں پر مشتمل ہے۔ اور اس سے اکل مال بالباطل کی اباحت لازم آتی ہے۔ جو شرعاً ممنوع ہے۔ اور یہی حکم مال کے بیمہ کا بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

علامہ ابن عابدین نے درمختار کے حاشیہ پر سوکرہ کے متعلق جس کا ان کے زمانے میں رواج تھا۔ اور جس کے بارے میں ان سے بہت زیادہ سوالات بھی کئے گئے تھے۔ ایک عمدہ بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے مال کے بیمہ کے متعلق شرعی حکم کا استخراج کیا ہے، علامہ نے اس معاملت کی صورت یہ بیان کی ہے کہ "تاجروں کا معمول ہے کہ جب کسی حربی سے کوئی کشتی اجرت پر لیتے ہیں تو اسے اس کی اجرت بھی دیتے ہیں۔ اور مزید ایک مقررہ رقم ایسے دوسرے حربی کو بھی دیتے ہیں۔ جو کشتی بان کے شہر کا رہنے والا ہوتا ہے، اس رقم کو (سوکرہ) کہتے ہیں۔ یہ رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ کشتی کا مال جل کر یا ڈوب کر تباہ ہو جائے یا راستہ میں لوٹ لیا جائے۔ یا اور کسی طرح برباد ہو جائے تو وہ شخص اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کام کے لیے اس کا ایک ایجنٹ اسلامی ملک کے کسی ساحلی شہر میں سلطان کی اجازت سے مقیم رہتا ہے اور وہ تاجروں کے ایسے تمام مال جو سوکرہ کے ذریعہ آتے ہیں وصول کرتا ہے۔ اور پھر صاحب مال کے حوالہ کرتا ہے اور اگر سمندر میں تاجروں کا کوئی مال ضائع ہوگیا تو وہ ایجنٹ ان تاجروں کو

ضائع شدہ مال کا پورا پورا معاوضہ دیتا ہے"۔

اس کے بعد ابن عابدین لکھتے ہیں کہ: "میرے خیال میں اس تاجر کے لیے اپنے ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا حلال نہیں، کیونکہ یہ "التزام مالا یلزم" ہے یعنی جو چیز شرعاً لازم نہیں ہے۔ اس کا التزام صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس کا پابند کرنا صحیح ہے۔ پس کسی مسلمان کے لئے اس کا لینا حلال نہیں۔ اور نہ اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے کیونکہ معاملت کی یہ شکل فاسد ہے"۔

جب یہ اس بیمہ کا حکم ہے۔ جو ایک مسلم اور مستامن کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مستامن دارالاسلام کے قیام کے دوران اپنے تمام معاملات میں اسلامی احکام کی رعایت کا التزام رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مال کی حیثیت ذمی کے مال کی حیثیت کی طرح ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا کوئی مال دھوکے یا عقود فاسدہ کے ذریعہ لینا جائز نہیں ہے۔ پس جب اس طرح کا معاملہ ایک مسلم اور مستامن کے درمیان صحیح نہیں ہے تو پھر بیمہ کا وہ معاملہ جو ایک مسلمان اور ذمی کے درمیان ہو یا ایک مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو، کیونکر جائز ہوگا؟ یہ تو بدرجۂ اولیٰ فاسد ہوگا۔ اور اس طرح جو رقم لی جائے گی وہ بہرحال حرام ہوگی۔

مختصر یہ کہ ایک مسلمان کے لئے دھوکا دینا، ناحق کسی کے مال پر قبضہ کر لینا قطعاً ممنوع ہے۔ خواہ فریق ثانی مسلمان ہو یا ذمی ہو یا مستامن ہو۔ ایک مسلمان کے لیے دارالاسلام میں ذمی اور مستامن سے بھی معاملت کی وہی صورت حلال اور جائز ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

ابن عابدین نے اپنے عہد میں مال کے بیمے کی جو شکل بیان کی ہے۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس معاہدہ میں ایک طرف مسلمان تاجر ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف حربی اور ان دونوں کے بیچ میں ایک مستامن کی درمیانی عنصر کی حیثیت ہوتی تھی۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دارالاسلام میں کسی مستامن سے کوئی فاسد معاملت جائز نہیں ہے۔ اور نہ کسی فاسد معاملت کے ذریعہ کسی حربی یا مستامن کا مال لینا حلال ہے۔ اور اگر کسی معاملت میں یہ درمیانی عنصر مستامن کا نہ ہو اور دارالاسلام میں ایک مسلمان اور حربی کے درمیان مراسلت کے ذریعہ بیمہ کی معاملت کی جائے یا دارالحرب میں ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہوا ہو جب کہ وہ مسلمان دارالحرب میں مستامن ہوکر داخل ہوا ہو۔ یا ایک حربی اور دوسرے ایسے حربی کے درمیان یہ معاہدہ ہوا ہو جو کسی مسلمان تاجر کا شریک ہو تو خود اس معاملہ کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ کیا اس رقم میں سے ایک مسلمان تاجر کے لیے اپنے حربی شریک سے کچھ لینا صحیح ہوگا۔؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ دارالاسلام میں کسی مسلمان کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی فاسد معاملت کرے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس بنا پر اسلامی ملک میں رہتے ہوئے کوئی مسلمان اگر کسی حربی سے مراسلت کے ذریعہ بیمہ کا معاملہ کرے اور بیمے کی رقم بھی دارالحرب میں وصول کرے تو ایسے بیمہ کی رقم بھی حلال نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دارالاسلام میں کئے گئے ایک فاسد معاملت کی بنا پر یہ رقم لے رہا ہے۔ البتہ اگر یہ معاملت دارالحرب میں ایک حربی ایک ایسے مسلمان تاجر کے درمیان ہو جو مستامن ہوکر وہاں داخل ہوا ہو تو اس صورت میں یہ اسلامی احکام لاگو نہیں ہوں گے کیونکہ دارالحرب اسلامی احکام کا محل نہیں ہے۔ پس اگر دارالحرب میں یہ معاملت ہو اور وہیں لین دین بھی ہو جائے۔ تو اس مسلمان تاجر کے لیے اس رقم کا

لینا جائز ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ایک حربی کا مال خود حربی کی رضامندی سے لیا جائے گا۔ جو بہرصورت جائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر غدر و فریب کا شائبہ نہ پایا جائے کہ دھوکا اور فریب ہر حال میں ممنوع ہے تو سود اور جوئے کے ذریعہ بھی ایک حربی کا مال حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر یہ معاملت دار الحرب میں ہوئی ہو اور طے پایا ہو کہ مال کا لین دین دار الاسلام میں ہوگا تو اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی نزاع کے بغیر باہمی رضامندی کے ساتھ لین دین ہو گیا تو مسلمان کے لیے اس مال کا لینا اسی طرح جائز ہے جس طرح وہ دار الحرب میں جائز تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر باہم نزاع پیدا ہو جائے۔ اور معاملہ عدالت تک پہونچ جائے تو ایک مسلمان قاضی کے بس سے یہ بات باہر ہوگی کہ وہ ایک ایسے مال کے متعلق کوئی فیصلہ دے جو ایک فاسد معاملت کے ذریعہ کسی کے ذمہ عائد ہوتا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی حربی جو کسی مسلمان تاجر کا شریک تجارت ہو اور اس نے بیمہ کا معاہدہ کسی دوسرے حربی کے ساتھ کیا ہو اور بیمے کی رقم صاحب معاملہ حربی سے وصول کر کے اپنے مسلمان شریک کے یہاں بھیجدی ہو تو اس مسلمان کے لئے اس کا بھی لینا حلال ہے کیونکہ وہ ایک حربی کا مال ہے جو اس کی رضامندی سے لیا گیا ہے۔ اور یہ معاملت دار الحرب میں ہوئی ہے اور اس پر قبضہ بھی دار الحرب میں ہوا ہے۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ بیمہ کے متعلق شریعت کا یہ حکم کہ یہ معاملت فاسد ہے۔ اور تلف ہونے والے اور ہلاک ہونے والے مال کے بدلے کوئی معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ اس اصل پر ہے کہ وہ کمپنی جس سے یہ معاوضہ لیا جاتا ہے

حقیقت میں اس نقصان اور اس کی ہلاکت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ اور معاملت کرنے والے کی جان و مال کے ساتھ نہ تو کوئی فریب کرتا ہے اور نہ کسی قسم کا دھوکا دیتا ہے ایسی صورت میں کمپنی کو معاوضہ کی ادائگی کا ذمہ دار ٹھرانا دراصل کسی کا ناحق مال کھانا ہے۔ جو یقطعی ممنوع ہے۔

اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیمہ کے معاملات جن کمپنیوں کے ساتھ کئے جاتے ہیں نہ اصل ان کی حیثیت مختلف حصص رکھنے والی کمپنیوں کی ہوتی ہے تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ ان بیمہ کمپنیون کو کواپریٹیو کمپنیوں کی حیثیت دیدیجائے جن مین اس کے حصہ دار اپنے رفقاد کے جانی و مالی نقصانات کی تلافی کے لئے بطور اعانت علی الخیر ماہانہ یا سالانہ قسطوں کی شکل میں اپنی اپنی رقمین جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ رقم کسی منافع بخش کام میں لگادی جاتی ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت وہ اس طرح کی ضروریات میں کام آسکے۔ اس طرح بیمے کی یہ کمپنیاں گویا امداد باہمی کی انجمنوں کے مشابہ ہونگی جن کا فنڈ ماہانہ چندوں کے ذریعہ اکٹھا ہوتا ہے۔ اور انجمن کے ممبران میں جو لوگ محتاج ہوتے ہیں یا کمانے سے معذور ہوجاتے ہیں یا بیمار ہوتے ہیں۔ یا اس قسم کا کوئی اور معاملہ پیش آجاتا ہے جس میں وہ امداد کے محتاج ہوجاتے ہیں۔ تو ان کی مدد کی جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انشورنس کمپنیوں کو امداد باہمی کی انجمنوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ امداد اس قیاس کے صحیح ہونے کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ دونوں کمپنیوں میں شرکت کرنے والے ایک متعینہ رقم جمع کرتے ہیں اور تعاون علی الخیر کے مواقع پہ اس جمع شدہ رقم میں سے خرچ کرتے ہیں۔ امداد باہمی کی انجمنیں دراصل اپنے چندہ

دہندگان سے اعزازی طور پر رقم حاصل کرتی ہیں۔ اور ان جمع شدہ رقوم میں سے مخصوص ضروریات میں وہ جو رقم خرچ کرتی ہیں وہ بھی ممبران انجمن کی طرف سے اعزازی ہوتی ہیں۔ یہ کوئی واجب الادا رقم نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں کوئی ایسی پابندی ہوتی ہے کہ اس رقم کا تقاضا کیا جا سکے یا اس پر کوئی نزاع قائم کیجا سکے اور اس کا فیصلہ کسی شرعی عدالت سے حاصل کیا جا سکے۔ بیمہ کمپنیاں کسی کے جان یا مال کا جو معاوضہ ادا کرتی ہیں۔ ان کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ بیمہ کے معاہدہ کی بنا پر کمپنی قانوناً اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ اس سے تقاضا بھی کیا جائے۔ اس پر مقدمہ بھی قائم کیا جائے۔ اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر خسارے کی ساری رقم اس سے وصول کر لی جائے۔ اور اس معاہدہ کے تقاضوں کا یہی وہ مکروہ پہلو ہے۔ جس کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو دراصل کسی شخص پر ایک ایسی چیز کو لادنا ہے۔ جو اس پر کسی حال میں بھی شرعاً ضروری نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بیمہ میں اس بنیاد پر کہ جو چیز شریعت کی رو سے لازم نہیں ہے، اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور کرائی جاتی ہے۔ نیز اس میں دوسروں کا مال ناحق کھانا روا رکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ناجائز ہے تو پھر مرحوم شیخ محمد عبدہ کے اس مشہور فتوی سے اس خیال کی تطبیق کیونکر دی جا سکتی ہے۔ جس میں انھوں نے مذکورہ بالا وجوہ کو جانتے ہوئے زندگی کے بیمہ کی اجازت دیدی تھی۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ دیار مصر کے مفتی تھے۔ لیکن اس وقت کے کسی عالم یا دینی امور کے کسی ذمہ دار شخص نے نہ تو اس پر کوئی گرفت کی اور نہ اس کا کوئی نوٹس لیا۔

اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے وہ

سوال مع جواب کے درج کر دیا جائے جسے مستفتی نے دارالافتاء میں بھیجا تھا۔ اور جس کا جواب شیخ محمد عبدہٗ نے دیا تھا۔ اس کے بعد ان کے جواب کی نوعیت پر غور کیا جائے۔ سوالنامہ یہ تھا:

"موسیو ہور روسل نے پوچھا کہ ایک شخص کسی کمپنی سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایک خاص مدت تک اپنے مال میں سے مقررہ قسطوں میں ایک متعین رقم ادا کرے گا۔ اور جب اس معاہدہ کے مطابق مقررہ وقت پورا ہو جائے گا۔ اور کمپنی نے بھی اس سرمایہ کو اپنے کسی تجارتی کاروبار میں لگا کے فائدہ اٹھا لیا ہوگا تو وہ اپنا اصل مال منافع سمیت خود لے لے گا یا اگر وہ فوت کر جائے گا تو اس کے ورثہ یا سرپرست اس کے حقدار ہوں گے تو کیا یہ معاملہ جو اصحاب معاملت کے لیے نہایت سود مند ہے شرعاً جائز ہے؟ براہ کرم اپنی مفید رائے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔"

شیخ محمد عبدہٗ نے اس سوال کا درج ذیل جواب مرحمت فرمایا۔

"اگر اس طرح کا کوئی معاملہ جس طرح آپ نے لکھا ہے کسی آدمی اور کمپنی کے درمیان ہو تو یہ معاملت شرعاً جائز ہے، اور اس آدمی کے لئے اقساط مقررہ کی مدت ادائیگی کے خاتمہ کے بعد اور سرمایہ کو کسی تجارت میں لگانے اور اس سے نفع حاصل کرنے کے بعد جائز ہے کہ اگر وہ زندہ رہے تو مال اس کے منافع کے ساتھ خود لے لے اور اگر فوت ہو گیا ہو تو اس کے جو ورثہ موجود ہوں، یا جنھیں اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہو وہ اصل مع منافع کے لے لیں۔ واللہ اعلم۔"

شیخ محمد عبدہ کا یہی وہ فتویٰ ہے۔ جس سے انشورنس کے ایجنٹ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے بیمہ کے فاسد ہونے اور انشورنس سے فائدہ اٹھانے کو "اکل اموال بالباطل" نہیں سمجھتے ہیں۔ وہی لوگ زبردستی سے اس فتویٰ کی پناہ لیتے ہیں۔ حالانکہ مذکورۂ بالا سوال وجواب پر اگر غور کیا جائے تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ فتویٰ دراصل بیمہ کمپنی کے لائف انشورنس یا پراپرٹی انشورنس سے متعلق ہی نہیں۔ اور اس سوال وجواب میں انشورنس کے وہ بنیادی ارکان ہی نہیں پائے جاتے جو اس معاملہ کے لئے ضروری ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ان کے فاسد ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ سوال درحقیقت اس مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے، جس میں ایک طرف کسی کا سرمایہ ہو۔ اور دوسری طرف کسی تجارت یا صنعت میں کسی کی محنت ہو۔ فقہاء کی اصطلاح میں اسے مضاربت کہتے ہیں۔ اور جس کا دوسرا نام (قراض) ہے۔ یہ سوال انشورنس کے جوہری عناصر سے بحث ہی نہیں کرتا مثلاً انشورنس کرانے والے کو اگر کوئی حادثہ پیش آگیا۔ اور اس نے کئی برسوں میں ادا کی جانے والی مقررہ قسطوں میں سے صرف ایک ہی قسط ادا کی ہو۔ جب بھی بیمہ کمپنی پورے انشورڈ مال کو خواہ وہ دسوں ہزار کا ہو یا لاکھوں پونڈ کا ہو۔ ادا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اور یہی وہ شرط ہے جو دراصل جوئے کی اصل واساس ہے۔ اور اس لئے کہ اس معاملت میں التزام مالا یلزم پایا جاتا ہے۔ اور مال ناحق کو مباح ٹھہرانا اور غلط طریقوں سے لوگوں کا مال کھانا ہے۔

مسٹر ہوروسل کے مذکورۂ بالا سوال میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے جو اس معاملت کے فساد کی اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہو اور نہ یہ سوال کسی ایسی منفعت سے تعرض کرتا ہے۔ اور نہ اس کے حصول کے طریقوں سے بحث کرتا ہے، جو صرف مال کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور مفتی کے لیے بھی اس کی گنجائش نہیں کہ وہ ایسے سوال کا جواب دے جو اس سے پوچھا ہی نہ گیا ہو۔ اور نہ مفتی کا کوئی جرم اور قصور ہے، اگر اس کے فتوی کا غلط استعمال کیا جائے اور اس کو اس کے موقع و محل میں نہ رکھا جائے۔ البتہ اگر مفتی ایسی صورت میں خاموش رہے۔ یا اس کو معلوم ہو کہ مثلاً اس کا ایسا فتوی جو صراحۃً مضاربت و قراض جیسی معاملت کے جواز کے لیے ہے۔ وہ انشورنس کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ پھر بھی وہ فتوی دیدے تو وہ یقیناً مجرم ہے۔ ایسی حالت میں مفتی کا فرض ہے کہ وہ اپنے فتوی کی جوابی تحریر میں ایسے الفاظ رکھے جن سے فساد کی راہ مسدود ہو سکے، اور وہ اس مسئلہ کے بارے میں بھی حکم شرعی بیان کرے جو اگرچہ اس سے پوچھا نہیں گیا ہے۔ لیکن اس کے سلسلے میں اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو جیسے یہی انشورنس کا مسئلہ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فقہ اسلامی میں ودیعت' اجارہ' کفالۃ وغیرہ جیسے بہت سے ابواب ایسے ہیں جن میں معاملات کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو انشورنس سے ملتی جلتی ہیں۔ اور فقہاء نے ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مثلاً دو معاملت کرنے والوں میں سے کسی کا مال اگر دوسرے سے ضائع یا ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کی روشنی میں بیمہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک

معاملت کرنے والے کے مال کے تلف یا ہلاک ہو جانے کی صورت میں بیمہ کمپنی در اصل معاہدہ کی بنا پر اس نقصان کا تاوان ادا کرتی ہے۔ جس کی حفاظت کا اس نے اس سے عہد کیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ۹ـــــ باب الودیعة میں فقہا نے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھے اور اس کی حفاظت کے بدلے اجرت بھی طے کر دے تو ایسی صورت میں اگر امانت ضائع ہو جائے تو امین اس امانت کا ذمہ دار ہو گا۔ پس مال کے بیمہ میں بھی یہی صورت ہونی چاہئے کیونکہ صاحب مال جو مال بیمہ کمپنی کے حوالہ کرتا ہے۔ وہ در اصل انشورڈ مال کے تحفظ کی اجرت ہوتی ہے۔ اور جب تھوڑا یا سارا مال ضائع ہوتا ہے تو بیمہ کمپنی تاوان میں اس کا معاوضہ ادا کرتی ہے

باب الاجارة میں بھی فقہا نے (اجیر مشترک) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مستاجر کے مال کے تحفظ کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس سے تلف ہو جائے گا تو وہ اس کا ضامن ہو گا۔ اسی طرح باب الکفالة میں بھی فقہاء کا قول ہے کہ کسی کے پاس کوئی مال ہے اور وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن راہ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ ہے اور اسے یہ نہیں معلوم کہ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کون سا غیر محفوظ۔ ایک آدمی اسے مشورہ دیتا ہے کہ فلاں راستے سے چلو، یہ محفوظ راستہ ہے۔ اگر تمہارا مال ضائع ہو گا تو میں اس کا ضامن ہونگا۔ ایسی صورت میں اگر اسکا مال ضائع ہو جائے گا تو اس آدمی پر اس کی ضمان واجب ہو گی۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل کا سہارا مال کے بیمہ کے جواز میں لیا جاتا ہے

لیکن یہ استدلال محض سطحی قسم کا ہے۔ اس سے وہی لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو معاملات کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کرتے۔ بیمہ کی اباحت کے لیے ان مسائل کو کسی درجے میں بھی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر ان مسائل کی اساس پر غور کیا جائے اور ان کے بارے میں علماء کے اقوال کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ ان مسائل سے کس ڈھٹائی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجاتی ہے۔

مثلاً امانت ہی والا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں صاف تصریح ہے کہ حفاظت کی اجرت کے ساتھ جو امانت کسی کو سونپی جائے۔ اس کے ضیاع کی ضمانت ہر حالت میں امین پر واجب نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ایسے حالات میں واجب ہوگی جن میں ضیاع وتلف کے اسباب سے بچنے کا امکان ہوگا۔ اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی ہوگی۔ لیکن جن حالات میں ان سے بچنے کا امکان نہ ہوگا۔ مثلاً موت اور غرقابی وغیرہ۔ ایسی حالت میں امین پر اس کا ضمان نہ ہوگا۔ غور کیجئے امانت کے اس مسئلہ کو بیمہ کے معاملہ پر کیونکر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بیمہ تو ہر حالت میں مال کی ضمانت دیتا ہے۔ خواہ ضیاع وتلف کا کوئی سبب ہو یا نہ ہو۔ وہ حالات واسباب کے درمیان ممکن اور ناممکن میں کوئی فرق نہیں کرتا کہ ان اسباب ہلاکت سے بچنا ممکن ہے اور ان اسباب سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ معلوم ہے۔ انشورنس بیشتر ایسے ہی حالات واسباب سے کرایا جاتا ہے۔ جن میں ضیاع کے اسباب سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

بیمہ کرائے ہوئے مال کی حیثیت بیمہ کمپنی کے نزدیک نہ تو امانت جیسی ہوتی ہے۔

اور نہ اس کی حفاظت میں بیمہ کمپنی کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے۔ پھر امانت کے مسئلہ پر انشورنس کے مسئلہ کو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بیمہ کیا ہوا مال کمپنی کے قبضے میں نہیں ہوتا اور نہ کمپنی کا اس سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ اور نہ وہ منڈیاں گودام اور کارخانے جن میں بیمہ کرایا ہوا مال ہوتا ہے۔ بیمہ کمپنی کے ہوتے ہیں۔ اور نہ سمندر میں لیجائے جانے والا سامان ان کمپنیوں کی کشتیوں اور جہازوں میں لدا ہوتا ہے۔ غرض ان کمپنیوں کا اس مال سے کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسی حالت ان اموال کے ضیاع کی صورت میں ان کمپنیوں پر ضمان واجب کرنے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے۔ وجوب ضمان کی جو شرائط تھیں وہ یہاں یکسر مفقود ہیں۔ بالفرض اگر بیمہ کمپنیاں سمندر میں مال تجارت لیجانے والی کشتیوں کی مالک بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ مال کے لیجانے اور ان کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی حیثیت اس اجیر مشترک کی طرح ہوگی۔ جس کا حکم فقہ اسلامی کی رو سے اوپر گذر چکا ہے۔ یعنی جب ضیاع کا سبب ایسا ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو ضیاع و تلف کی حالت میں اس پر کوئی ضمان واجب نہ ہوگا اور بیمہ کے معاملات میں صورت حال یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔

اب ہم آخری مسئلہ پر جس کے بارے میں ہم نے کہا تھا۔ کہ انشورنس کو مباح ٹھرانے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں۔ وہ ہے کفالت یعنی راستہ کے محفوظ ہونے کی ضمانت کا مسئلہ۔ اس بارے میں فقہا نے جو یہ حکم لگایا ہے کہ اگر کسی نے صاحب مال کو ایک خاص راستہ پر چلنے کا مشورہ دیا اور اس راہ میں اس کے مال کے ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کے تاوان کی ذمہ داری بھی

ے لی تو اگر اس راستے میں اس کا مال ضائع ہو گیا تو ضمانت لینے والے پر کوئی ۃ
واجب نہیں ہوگا۔ البتہ جب صاحب مال راستہ کے خطرات سے بالکل ناواقف
ہو اور اس راستہ پر چلنے کا مشورہ دینے والے نے راہ کے خطرات اور اندیشوں
سے پوری واقفیت کے باوجود یہ مشورہ دیا کہ وہ ضائع شدہ مال کے تاوان
کا ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ اس نے صاحب مال کو فریب دیا اور اس کے ساتھ
لیکن اگر رہنما راستے کے خطرات سے واقف نہ ہو بلکہ اس کو ہر طرح سے مام
سمجھتا ہو تو پھر اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔ ایسے ہی اگر رہنما بھی راستے کے خطرے
آگاہ ہو۔ اور صاحب مال بھی واقف ہو جب بھی رہنما پر کوئی ذمہ داری نہیں ہو
کیونکہ ایسی صورت میں صاحب مال نے خود اپنا مال ضائع کیا۔ رہنما کی رہ
نے کوئی نئی بات نہیں پیدا کی جو ضمانت کی موجب ہو۔ یہ تمام تفصیلات فقہ کی ؟
کتابوں میں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شریعت کے اصول و قواعد اور اس کے احکام کے استقصا
یہی ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص پر دوسرے شخص کے مال کی ضمانت نہیں ہے نہ
وہ مال اور نہ اس کی قیمت اس وقت البتہ ضمان واجب ہوگا جب کہ کوئی
کے مال پر ناحق قبضہ کرے یا اسے ضائع یا بالواسطہ اسے اس مال سے فا
اٹھانے سے محروم کر دے' ان میں سے کوئی بات بھی بیمہ کمپنیوں میں نہیں پائی
یہ کمپنیاں تو صاحب مال کے اس مال کی ضامن ہو گئی ہیں جو خود جل کر
ہو گیا یا چوروں کی چوری اور ڈاکوؤں کی لوٹ یا اسی قسم کے کسی اور حاد
ضائع ہو گیا ہو۔ خواہ ان سے بچنا کمپنی کے لئے ممکن ہو یا نہ ہو۔ مال کی ضمانت

یہ صورت ایسی ہے جس کی اسلام کی عادلانہ شریعت میں کوئی گنجائش نہیں یہ شریعت تو ایسی شریعت ہے جو کسی حالت میں بھی ظلم اور غبن کو جائز نہیں سمجھتی اور نہ ناحق لوگوں کا مال کھانے کو پسند کرتی ہے۔

بیمہ کمپنیوں کو دراصل بیمہ شدہ مال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بیمہ کی ان قسطوں سے جنھیں معاملہ کرنے والے اصحاب مال سے حاصل کرتی ہیں پہلے ایک عظیم سرمایہ اکٹھا کرتی ہیں۔ اور پھر اسے قرضوں اور دوسری شکلوں میں پھیلا کر اس سے نفع کماتی ہیں۔ پھر اسی کے بھاری منافع میں سے بیمہ شدہ مالوں کے نقصانات کا قانونی معاوضہ ادا کرتی ہیں، حالانکہ اس نقصان میں ان کمپنیوں کا کسی طرح سے بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ اس لیے ان کمپنیوں سے ایسے نقصانات کی تلافی اور ان کے معاوضہ کا مطالبہ کرنا قطعاً غیر شرعی ہے۔ اسی طرح کمپنیوں کو بھی بیمہ کے شرائط کے مطابق مال والوں سے مقررہ مالی قسطوں کے لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سارے لوازم و شرائط فاسد ہیں۔ اور جب معاہدہ فاسد شرط پہ مشتمل ہوگا تو وہ خود بھی فاسد ہوگا۔

بیمہ کمپنیاں دراصل روپیہ کمانے اور نفع حاصل کرنے کا نفع بخش کاروبار ہیں ان کا راس المال (سرمایہ) عموماً وہی قسطیں ہوتی ہیں جنھیں انشورنس کمپنیاں اپنے ممبران سے حاصل کرتی ہیں۔ پھر انھیں نفع بخش کاروبار میں لگاکر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور وہ منافع جنھیں، اس مال سے حاصل کیا جاتا ہے قطعی طور پر اور ہر حال میں اس گھاٹے سے زیادہ ہوتا ہے جو نقصانات کے معاوضہ کی ادائگی کی صورت میں یہ اپنے ممبروں کو ادا کرتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے

سارے کام بہت ہی دقیق مطالعہ اور تفصیلی اعداد و شمار کی روشنی میں عمل میں لائے جاتے ہیں جو بری، بحری وسائل نقل و حمل کی نگہداشت اور عام حالات میں معمول کے مطابق نفع و نقصان کے تحفظ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ مطالعہ اور اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ اس کاروبار میں نقصان اور ضیاع کی مقدار بہت کم بلکہ شاذ و نادر ہی ہوتی ہے عموماً مال محفوظ رہتا ہے۔ اور بیمہ کمپنیاں بغیر کسی تکلف کے کبھی کبھی اور اتفاقیہ ہو جانے والے نقصانات کی تلافی اپنی وسیع کمائی سے کر دیتی ہیں۔ اور باقی تمام سرمایہ کمپنی کا ہو جاتا ہے جو سرتاسر نفع ہی نفع ہوتا ہے۔

مال کے بیمہ کے متعلق ان کمپنیوں کی یہ نہایت ہی واضح اور متعین پالیسی ہے۔ تھوڑے سے اختلاف اور شرائط و طرق کے تنوع کے ساتھ ایسی ہی صورت حال زندگی کے بیمے کی بھی ہے۔

ان مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ زندگی کا ہو یا مال کا شریعت اسلامی کے نزدیک معاملات کی کسی بھی صحیح شکل کے تحت نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو اس سلسلہ کی تیسری قسم میں داخل کیا جا سکتا ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یعنی زندگی یا مال کے لئے راہ کے امن و سلامتی کی ضمانت ہم نے اس تیسری قسم کی وضاحت میں بیان کیا ہے کہ

"اس طرح کی معاملت میں بھی شرعاً ضمان اسی وقت واجب ہوگا جب کہ رہنمائے راہ کے تمام خطرات کو جانتے ہوئے فریب سے مشورہ دیا ہو اور صاحب مال بھی جو اس غلط مشورہ کی بنا پر چل پڑا ہے۔ راہ کے خطرات سے بالکل ناواقف ہو۔ اس کے وجوب کی وجہ صرف یہ ہے کہ رہنمانے اس مسافر کو کھلا ہوا

دھوکا دیا اور فریب سے کام لیا لیکن انشورنس میں اس طرح کے دھوکے یا فریب کا کوئی احتمال نہیں۔ اس لئے بیمہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

بیمہ کمپنیوں کی یہ وہ شکلیں ہیں جن پر ان کا کاروبار چل رہا ہے۔ ان کمپنیوں نے خود ساختہ قوانین کے تحت روپیہ پیدا کرنے کے ان تمام ذرائع کو مباح قرار دیدیا ہے جو انکے بنائے ہوئے قوانین کے تحت آتے ہوں، اس کی صحت کی شرط صرف اس معاہدہ کے دونوں فریقوں کا باہمی اتفاق ہے۔ گویا باہمی اتفاق ہی ان قوانین کی نظر میں فریقین کی اصلی شریعت ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کی اپنی مخصوص شکلیں اور خصوصی احکام ہیں۔ اس نے لوگوں کے درمیان معاملات کی جملہ اقسام کو ایسی شرطوں کا پابند کر دیا ہے جن میں خلل انداز ہونے کی اجازت نہیں اور نہ ان کے خلاف اتفاق کرنے سے وہ جائز ہو سکتی ہیں۔

جب دنیاوی قوانین دو آدمیوں کے درمیان ایسے اتفاق اور معاہدہ کو جو عام نظام کے خلاف ہو تسلیم نہیں کرتے تو اسلامی شریعت کے احکام میں جو سارے انسانوں کے درمیان تعامل کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ایسے اتفاق و معاہدہ کو کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں نظریہ، تخلیق مجلس تشریعی طریقہ، قانون سازی حقوق رعایا بیت المال احتساب، حرب و دفاع اور خارجی معاملات وغیرہ اسلامی دستور کے تمام اصولی اور سیاسی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، آخری باب میں موجودہ سیاسی نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا، دوان پر جامع بحث کیگئی ہے

صفحات ۳۰۰ قیمت ۶ روپیہ ۵۰ پیسے

خواجہ عزیز الدین عزیز کی شاعری

از جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی، مجیدیہ اسلامیہ کالج، الہ آباد

(۳)

خواجہ صاحب کے دماغ پر جنون کا اثر ہو گیا تھا۔ اوس کے متعلق تذکرۂ شمع انجمن میں ہے،

در آغاز شباب بسودائے آبکار افکار جنو نے عسیر البرو بسرش پیچید و بعد زمانے بشرف زیارت طلب القلوب صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ در عالم رویا مرضش بصحت انجامید۔[1]

مثنوی، شروع کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

برخیز عزیز و راہ سرکن | گر مرد رہی قدم ز سرکن
بسم اللہ کن برہ گرائی | کین بس انگشت رہ نمائی

پھر صفت بسملہ اور صفت قرآن میں چند اشعار ہیں۔

ہر مرغ بیان کہ کرد پر باز | از بسملہ یافت بال پرواز
از بسملہ کردہ ام چو چوگان | اینک من و خصم و گوئی و میدان
ہست از ید قدر نقش نمایان | انگشت اشارہ سوی قرآن

---

[1] تذکرۂ شمع انجمن ص ۳۳۲

،گنج بیگ خزانہ اندر	ہر گنج ہزار عقد گوہر
ش رنگ بجلوہ ہر گل او	خوش زمزمہ ہفت بلبل او
،مدنی بگفتگو یش	ہندی عجمی بآرزو یش

ر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں ع

،پردہ نشین حجلۂ راز	میخواست کہ پردہ را کند باز
سی پئی انجمن ہمی خواست	پروانۂ او شدن ہمی خواست
جائے کہ او ناز می کرد	آں جائے بخویش ناز می کرد
،پرتو آں سہیل اعظم	شد رنگ پذیر ادیم آدم
،روز او را خلیفہ کردند	کاں گوہر بے سپہر دند
م نار خلیل گلشن از وے	ہم چشم کلیم روشن از وے
،وشتۂ دعوی شانہ کردہ	در کتم ازل ختانہ کردہ
یز دبخفا خطش بہ پرداخت	از ہفت ستارہ ہیکلش ساخت
عالم کہ بہ پا رسائی افروخت	دفتر کدہ ہائے پارسی سوخت
جبریل امیں بدرس پرداخت	پنج آیہ اقرا و ابجدش ساخت
در احمدؐ میم درمیاں نیست	این راز بدیدہ درنہاں نیست
چوں دید محمدؐش شد از ہوش	بگرفت احد سرش در آغوش

الحق مشہود و شاہد است او

احمد۔ محمود و حامد است او

مثنوی میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے ذرا طوالت پیدا ہوگئی ہے۔

مثلاً طے امراحل در وادی دل" "نگارش بر احوال" "خود خطاب بہ نفس خود" "اظہار عشق حقیقی" "اور غاشیہ داری خامہ بر سبیل خطاب بآنجناب" وغیرہ -

آخر میں خواجہ صاحب نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے -

دیدم کہ روان سبک چو آبم — بر سر شدہ چتر زن سحابم
ہم قافلۂ بہار گشتم — بر نکہت گل سوار گشتم
جاں ناقہ براہ دوست می راند — غوغائی نفس حدی ہمی خواند
رہ بود ہمہ زخار وخس پاک — وز ابر بہار خاک نم ناک
دیدم کہ بر آستانہ خاص — استادہ یکے ز ردی اخلاص
بحر عرفان ز آستینش — ملک وحدت تہہ نگینش
لب کرد سپید چوں مرادید — دیدم کہ دمید صبح امید
پیش آمدم و سلام گفتم — گفتا ز کجا، تمام گفتم
فرزند عراق و نے دمشقم — یعنی کہ غریب شہر عشقم
دستم بگرفت و کام جاں داد — نعلین بر درم نشاں داد
چون گشت درست جملہ کارم — دادند بہ بزم خاص بارم
بزمے کہ غبار آستانش — ریزند بعرش ساکنانش
بزمے کہ ز روشنی جا دید — فارغ ز فروغ ماہ و خورشید
یکسوی نشستہ مہ جمالاں — یک سوی ستادہ نونہالاں

خوش سیرت و خوش جمال و خوشروئے — خوش طینت و خوش خصال و خوشخوئے

گز گوشہ چشم مہربانی — ممتاز شدم بہ میہمانی

سیراب ز شہد و شیر گشتیم — خوردیم چنانکہ سیر گشتیم

تا حشر بخواب بودم ای کاش — کاین درد نکش نمی شدی فاش

زاں روز کہ آں جمال دیدم — یک لحظہ بخود نیارمیدم

ہر شب ہمیں خیال خوابم — کاں دولت رفتہ باز یابم

وانگاہ کہ دل بدرد آید — از شدت شوق می سراید

اے یوسف حجلہ گاہ خوابم — بنگر کہ چہ بہ تب و تابم

اے دولت رفتہ زود باز آئے — باز از رہ مہر جلوہ فرمائے

چشمے کہ مدام خوں بگرید — یکرہ بنگر کہ خون بگرید

تا بر سر جلوہ آئے پیشم — یا زود بخواں بسوی خویشم

بے روئ تو گشتہ بزم دوراں — تاریک چو چشم پیر کنعاں

بے روئ تو گشتہ بزم دوراں — تاریک چو چشم پیر کنعاں

دل بے تو کہ بار بار نالد — بنگر کہ چہ زار زار نالد

روزے کہ عزیز با دل چاک — داغ تو برد بخویش در خاک

گویند ز رشک ہے فلاں مرد — آرائش عالم از میاں برد

یارب ز جہاں چو بار بندم — چشم از خود و روزگار بندم

از داغ غم تو توشہ ام بس — وز خاک در تو گوشہ ام بس

بر نام تو باد اختتامم — لبریز ز بادۂ تو جامم

اس کے بعد مثنوی ہدیۃ الثقلین ختم ہو جاتی ہے۔

قیصر نامہ | یہ مثنوی سکندر نامہ کے وزن پر اور اس کے جواب میں ہے۔ اس میں جنگ روم اور روس کا تذکرہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے خواجہ عزیز کی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خواجہ صاحب کی علمی قابلیت کے ثبوت کے لیے قیصر نامہ جس کو جنگ روم و روس کا ایک مرقع کہنا چاہیئے [1] پیش کیا جاسکتا ہے نمونہ حمد ملاحظہ ہو۔

بنام خداوند کار آفریں — ہزار آفریں صد ہزار آفریں
ازل تا ابد بارگاہ و پست — کراں تا کراں در پناہ و پست
اگر از جلالش زند دم زباں — بلرزد سپہر بجنبد جہاں
رخ غازیاں را بجاں غازہ ساز — باآب دم تیغ جاں تازہ ساز
بجلکش ابابیل چوں پر زند — صف زندہ پیلاں بہم بر زند

نمونہ نعت:-

بمعنے ز رحمت نخست آیتے — بظاہر ز دولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دین او — ز آئینہ روشن تر آئین او
ز مہر نبوت کہ بر پشت زد — بمہر سلیماں ز د انگشت رد
بدیدار آن روضہ شاداں شوم — اگر خار باشم گلستاں شوم
بخاک درش کاش خاکم کنند — کز آلائش خاک پاکم کنند

مدح سلطان عبد الحمید:-

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء کی روئداد سال دوم۔ اجلاس قیصر باغ لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء ص ۱۰۱

بادرنگ شاہنشہی پائے اوست　　ولی در دل عالمے جائے اوست
نہیں پاسبانِ[1] کہین خانقاہ　　کہین دیدبان نہین خوابگاہ
زپشتش قوی پشتِ اسلامیان　　بدورش بلند اختر شامیاں
درش مرجعِ ہفت ملت بود　　دلے مرکز پنج نوبت بود

فوج پلونہ دعثمان پاشا :-

بر آشفت سلطان ازیں دار وگیر　　بفرمود بنوشت فرماں دبیر
کہ سالار عثمان جنگ آزمائے　　زایوال بہ میداں شور نگرائے
برآراست اسپہبد صف شکن　　قشونے بترکانِ شمشیر زن
ہمہ کارداں و قواعد شناس　　چو ایمان خود جملہ محکم اساس
ہمہ نوجوانان ماہوت پوش　　بخاکستری جامہ آتش فروش

عثمان پاشا :-

سپہدار عثمان جنگ آزمائے　　خردمند دانا دل تیز رائے
محیطے و چوں کوہِ آتش بجوش　　نہنگے بکف اژدہائے بدوش

جوانان ترک :-

ازیں سوئے ترکان طاعت گزار　　بکار خداوند سرگرم کار
وضو کردہ ہر یک بخوناب خویش　　بشوق سجودی سرافگندہ پیش
نمازی بخوں جا بجا ساختہ　　دل از مہر و آزرم پرداختہ
شمر دند محراب شمشیر را　　رسانند بر عرش تکبیر را

---

[1] خادم الحرمین الشریفین۔

بہ پیکار کارے کہ تکبیر کرد نہ شمشیر میکرد و نے تیر کرد

چناں سوئے شمشیر عریاں شدند کہ گوئی ہم آغوش حوراں شدند

میدان کارزار میں عثمان پاشا کے گھوڑے کے ۔ ۔ ۔ ۔ اترنے کی منظر کشی

سمندش کہ بیگشت در کوہ و دشت زلبش تیز رفت از جہاں درگذشت

عثمان پاشا کے جہاز سے اتر کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کی منظر کشی

نخستیں بپابوس سلطاں رسید بلے قطرہ آخر بہ عماں رسید

سزد ہر را داغ بر دل نہاد کہ سلطاں بہ پیشانیش بوسہ داد

مگو بوسہ تمغائے اخلاص بود کہ تمغائے عثمانئی خاص بود

غرض مختلف اہم جنگی مناظر کا تذکرہ بڑے دلکش انداز میں کرتے کرتے مثنوی اختتام تک پہنچا دیتے ہیں۔ تلواریں نیام میں پہنچ جاتی ہیں۔ اور سلسلہ کشت و خون بند ہو جاتا ہے۔ سہ

چو شمشیر ہا رفت اندر نیام کشیدم زباں من ہم آخر بکام

کسی زمانے میں اس جنگ کا تذکرہ زباں زد خاص و عام تھا ہر مسلمان ترکوں کی کامیابی کی دعا میں مشغول تھا، اب تو شاید اس جنگ کے نام سے بھی نئی نسل آشنا نہ ہو گی،

مثنوی ارمغان لاجواب اس مثنوی کا دوسرا نام "گلگشت کشمیر جنت نظیر" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں کشمیر کے خوبصورت دلکشش مناظر اور اہم و مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ مقالے کی طوالت کے خوف سے صرف منظر کشی کی

چند مثالیں پیش ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں پرپیچ راہوں اور بل کھائی ہوئی پگڈنڈیوں کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہوئے۔ ؎

رہ پیچاں چو مائے حلقہ زن ہست　　کہ انداز ے معلق چوں رسن ہست

رہ پیچیدہ تر از خط ترسا　　تو آن چو آن خامہ ز رفتن بیک جا

بریں رہ دیدہ ہر رہ رو کہ بکشاد　　تو پنداری کہ مو در چشمش افتاد

زبس باریکی ایں رہ جست پیدا　　بزیر پا بود خط کف پا

کشمیر کے دارالسلطنت سری نگر کی تعریف میں خواجہ صاحب یوں رطب اللسان ہیں۔

بہر بامے زند بلبل ترانہ　　بپائے خود رود گل خانہ خانہ

بہر بزمے ز گل روشن چراغے　　بود ہر خانہ را خانہ باغے

بہر سو لالہ زار و سبزہ زار است　　کہ داغستان و ملک سبزہ زار است

دو عالم یک گل رعنائے باغش　　ارم گم کردہ خود را در سراغش

ڈل جھیل کشمیر کی مشہور ترین جھیل ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

خوشا آبے کہ مشہور آں بدل ہست　　نہ دل تسنیم را نعم البدل ہست

بدریا ماہ اندر نقرہ کاری　　بگلشن زر فشاں باد بہاری

غرض غزل ہو کہ قصیدہ، مثنوی ہو کہ مرثیہ، خواجہ صاحب نے ہر ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور اس کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو فارسی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

قصائد | اصنافِ شاعری میں قصیدہ ایک اہم اور نازک صنف ہے۔ اس لئے کہ قصیدہ کا اصل موضوع مدح ہے۔ اور مدح اسی کی ہونی چاہیئے جو مدح کے قابل ہو۔ اور مدح میں جو کچھ کہا جائے سچ کہا جائے۔ جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز ہو۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جو شعر و ادب کے بہترین نقاد تھے۔ مشہور شاعر زہیر کی مدح گوئی کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے، "ان کا ترجمہ یہ ہے" . . . . وہ لوگوں کی صرف ان ہی خوبیوں کی تعریف کرتا تھا جو اُن میں واقعی پائی جاتی تھیں۔

قصیدہ کے الفاظ پرشکوہ اور تشبیب ممدوح کی شان کے مطابق ہونی چاہیئے، اس کے بعد قصیدہ کا وہ حصہ آتا ہے جو گریز کہلاتا ہے، یہ بہت نازک مرحلہ ہوتا ہے اس میں کامل شاعر بڑے حسین انداز سے مدح کا رخ موڑ کر اصل مقصد کی طرف آتا ہے، جو شاعر جتنا زیادہ کہنہ مشق ہوگا اتنی ہی خوبصورتی سے اس نازک مرحلہ سے گذرے گا۔

قصیدہ کسی لالچ اور انعام کی خواہش میں نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ اہم صنفِ سخن اسی تملق اور چاپلوسی کی وجہ سے بدنام ہوئی۔ مگر یہ شرطیں کم ہی شعرا پوری کرتے ہیں۔

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے قصیدوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک باکمال شاعر کے معیاری قصائد میں ہونی چاہئیں۔

خواجہ صاحب نے امرا کی شان میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعتیں بھی اور ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے قصائد عموماً مختصر ہیں۔ اور ان کی ابتدا بڑے اچھے انداز کی ہے۔ مثلاً ایک نعتیہ قصیدہ انسان کی بڑائی اور عظمت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ پھر عظیم انسانوں کے ذیل میں حضرت عیسیٰ علیہ والسّلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان تمام پیغمبروں کو ستارے قرار دے کر

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کو طلوعِ آفتاب سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

با این صفا کہ از زمیں انسان بر آمدہ — گوئی ز خاک چشمۂ حیواں بر آمدہ
زاں چشمہ قطرہ قطرہ بود بحر بیکراں — زاں بحر بیکراں دُر و مرجاں بر آمدہ
از خاک چشمۂ کہ بود فیض آں محیط — در نار برق خرمنِ ایماں بر آمدہ
آساں مگیر خلقتِ انساں کہ گوہرش — بسیار سعی رفت کہ ارکاں بر آمدہ
گہ با جمال عیسیٰ مریم نمود روئے — گہ با جلال موسیٰ عمراں بر آمدہ
گاہے ز گیر و دار گردہے زپائے دار — بر طارم چہارم گیہاں بر آمدہ
یونس ز بطن ماہی و یوسف ز قعر چاہ — نوح از بلائی ورطہ طوفاں بر آمدہ
شد مہر نیمروز تجلی از فروغ جود — چوں ماہِ نیم ماہ ز گیلاں بر آمدہ
گہ آبیار مرقع شرع شریف شد — گہ چشمہ سار بحرِ عرفاں بر آمدہ
گہ فرخی فزائی جہاں شد چو مشتری — گہ پاسبان خلق چو کیواں بر آمدہ
ہر کو کبے کہ جلوہ ہمی کرد شد نہاں — کز مکہ آفتابِ درخشاں بر آمدہ
فر فروغ آں ہمہ عالم فرا گرفت — ہر ذرہ ہمچو آئینہ حیراں بر آمدہ
ہر شش جہت ز پرتو آں رونقے گرفت — ہر ہفت ہفت گنبد گرداں بر آمدہ
شد خاکِ مردہ زندہ و سرسبز کوہ و دشت — از ہر کنار سنبل و ریحاں بر آمدہ
حسانِ ثابت از عرب آمد مدیح سنج — از ہند ہم عزیز ثنا خواں بر آمدہ

مناسب الفاظ بھی قصائد کے لیے ضروری ہے اسی سے قصیدہ میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً

یکے ز چہرۂ او برقعہ ز آستین کلیم — یکے ز جلوۂ او خانہ وادیٔ ایمن
یکے چو جام مل آمد عیاں ز طاقِ بلند — یکے چو بوئے گل آمد چہاں ز طرفِ چمن

یکے ز طلعت او مرغ جام در فریاد　　یکے ز فرقت او خلق شام در شیون

مضمون کو جاندار بنانے کے لئے پرشکوہ الفاظ کا استعمال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب کے قصائد اس لحاظ سے بھی بڑے پرشکوہ ہیں۔

قطرہ تا دریائی عماں از نوالش مستفیض　　ذرہ تا خورشید تاباں از جمالش مقتبس

این شبِ وصل است یارب تا نیازم من زدن　　صبح راکن مبتلائے علتِ ضیق النفس

یکے بہ طلعت سقلابیان اطلس پوش　　یکے بصورت اعرابیان عریان تن

اے زہے موسیٰ بنام وای خجی موسیٰ عصا　　من عصی و من غوی گردید رزق اژدہا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں خواجہ صاحب کا قصیدہ زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت، معانی کی گہرائی اور پختگی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس قصیدہ میں خواجہ صاحبؒ سب سے پہلے دنیا کا ذکر کیا ہے اور اعلیٰ معیار کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ پرہیزگاری کی زندگی کے باوجود روز محشر کی بازپرس سے ڈرتے رہنا چاہئے

چیست دنیا مشت خاکے تیرہ پس کوری بود　　از برائے مشت خاکے دل مکدر داشتن

بار دنیا ہر کسے برداشت گوے بیش نیست　　شیر مرد ست آنکہ داند دل ازو بر داشتن

لیک باید خویش را باین ہمہ سعی و تلاش　　خوفناک از بازپرس روز محشر داشتن

اس کے بعد دنیا کو ہیچ قرار دے کر اس سے قطع نظر کرنے اور اس سے خود شناسی کا سبق لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

بگذار از بیہودہ گردی بگسل این سر رشتہ را　　خویش را تا چند سرگرداں چو فرفر داشتن

شو جہاں افروز دہری نے کہ ہمچو آئینہ　　میتوانی خانہ خود را منور داشتن

پھر کچھ اور اخلاقی تعلیمات دینے کے بعد حضرت علیؓ کی طرف گریز کرتے ہیں اور

ان کے نام کو اسم اعظم قرار دیتے ہیں۔

رہنمائی کردہ ام در پردۂ این رمز و بس / باید ت راہے بمقصد زیں در آید داشتن

حیدر صفدر کہ اسمش اسم اعظم ہست زاں / میتواں در کف کلید ہفت کشور داشتن

بندہ اش را بس بود بہر شکست لشکرے / در بغل شمشیر و بر لب نام حیدر داشتن

آن جہان پاک خواند از انکسارش بوتراب / خاک را می باید از افلاک برتر داشتن

نیست جز تائید پی درپی کہ چوں خیبر درے / کندن و بر کندہ را بر کندہ معبر داشتن

ہم خدا خرسند باید بخت و طالع ہم بلند / از نبی دختر گرفتن زاں دو اختر داشتن

قصیدہ کا آخری حصہ بھی قابل دید ہے۔ خواجہ صاحب نے کس انداز سے اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اور ممدوح پر جان نچھاور کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوتے ہیں:

بادشاہا سرورا تو خواجہ و من چاکرت / خواجہ را چشم کرم باید بہ چاکر داشتن

بندۂ کم خدمت و دل سادہ را خوش طالعیست / خواجۂ مسکیں نواز و بندہ پرور داشتن

جاں کہ از دور فلک رنجور و محزوں آمدہ / در جوار روضۂ اَت خواہم مجاور داشتن

می رسد گر بر سواد این ورق ناز و عزیز / آسماں بر خود چرا بالد ز اختر داشتن

نامۂ شوقے کہ دارد آں سوادے از خلوص / بایدش بہتر ز صد طومار و دفتر داشتن

گر نہ از وصف فلک خواہد بیرزد سنجیدنم / در ترازو از چہ ہست این خوردۂ زر داشتن

نے غلط گفتم فلک زنیست سنگ این عیار / گوہری نتواں شدن از گنج گوہر داشتن

گر تو با خاک رہ خویشم بسنجی از کرم / پیش من بہتر بود از سنج سنجر داشتن

خوش بہشت ہشت بہر مدح گستر روز حشر
جاں بزیر آں لوائے سایہ گستر داشتن

مکتوب سری لنکا

از پروفیسر ڈاکٹر اختر امام صدر شعبۂ اسلامیات و عربی، سری لنکا یونیورسٹی
۲۰۶، ٹرین کومالی اسٹریٹ، کینڈی، سری لنکا۔

پیارے دیرینہ دوست سید صباح الدین صاحب سلام و محبت

کل صبح ایک طویل سفر کے بعد "وطن" لوٹا ہوں۔ خطوط کے ہجوم میں دیکھا کہ ہمارا دیرینہ دوست اور بیسیوں سنجیدہ کتابوں کا مصنف بھی مسکرا رہا ہے۔ دل میں کہا کہ دوستی کی شریعت میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونگا اگر سب سے پہلے اس مخلص سے ہاتھ نہ ملاؤں اس لئے اولین فرصت میں نیم ملاقات کے بعد آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ سولہ دن شیوعیت کے ہر دواہیں گذارنے کے بعد واپسی میں کراچی اتر پڑا تھا تاکہ عزیز و اقارب سے مل سکوں، اردو میں باتیں کروں، مشاعروں میں شرکت کروں اور گلابی جاڑے میں شمامۃ العنبر یا موتیا سے دل و دماغ کو معطر کروں۔ کراچی کے بعد لاہور گیا جہاں منجملہ اور حضرات کے پروفیسر ارشد بھٹی سے بھی ملنا تھا۔ جنھوں نے اسلامی زاویۂ نظر سے کوئی آدھ درجن درسی کتابیں اردو میں لکھ ڈالی ہیں۔ ان کتابوں سے قطع نظر انھوں نے اسلامیات پر بھی اپنی سنجیدہ تصنیفیں پیش کی ہیں۔ لاہور میں کڑاکے کی سردی تھی تاہم اہل علم کی صحبتوں سے دل کو گرماتا رہا۔ وہاں سے اسلام آباد گیا۔ جہاں بچپن کے ہم سبق شمیم دیسنوی کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ شمیم ڈھاکہ میں طبابت کرتے تھے۔

اور گرداب بلا سے صحیح وسلامت بچ کر نکل گئے تھے۔ جب چوتھائی صدی نہیں بلکہ نصف صدی کے بعد ان سے ملا تو سر کے بال بالکل سفید نظر آئے، ویسے تندرست ہیں مگر ضعیفی کے آثار، خد وخال سے نمایاں تھے۔ اسلام آباد سے کراچی پہنچا۔ اور ۱۰ دسمبر کو جب لنکا کے مطار میں قدم رکھا تو ساون بھادوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں، تاریل کے خوشنما پتے ہواؤں میں جھوم رہے تھے، اور زعفرانی چادروں میں لپٹے لپٹائے ہوئے بھکشو آجا رہے تھے۔ ابھی مشکل سے گھر پر ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ سرکاری حکمنامہ ملا کہ کمر بستہ ہو کر کل جو تجارتی وفد جزیرۃ العرب اور شمالی افریقہ جا رہا ہے اس میں شامل ہو جاؤں، دیار عرب اور مصر کے چپہ چپہ سے واقف پہلے بھی تھا مگر اس سفر میں ایک دلکش عنصر یہ بھی پیش نظر تھا کہ معمر قذافی کے لیبیا میں سانس لینے کا موقع ملیگا۔

کولمبو سے کراچی ہوتا ہوا کویت پہنچا۔ یہ ہمارے طویل سفر کی پہلی منزل تھی، سہ پہر کا وقت تھا ہم لوگ مطار سے تقریباً بارہ میل سفر کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔ کویت کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ تیل کی بیشمار دولت سے ہوگا یہ بھی امیر شہر مگر عام مشرقی شہروں کی طرح جہاں چند سڑکیں تو خوشنما مکانوں اور دکانوں سے دلکش ہوا کرتی ہیں۔ مگر شہر کا بقیہ حصہ عموماً گندہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اور خاک اڑتی رہتی ہے مگر کویت میں داخل ہونے کے بعد کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں ہیمبرگ یا میونک کے کسی حصہ میں سانس لے رہا ہوں، وہی مغربی طرز کے فٹ پاتھ اور سڑک کے وسط میں دور تک درختوں کی قطاریں تاکہ آمد ورفت کے لیے علحدہ سڑک ہو۔ آراستہ مکانوں اور جگمگاتے ہوٹلوں کو دیکھتا چلا گیا۔ رات کے وقت سیر سپاٹے کے لیے نکلا اور قلب شہر سے ہٹ کر رہائشی علاقوں اور گلیوں کا رخ کیا۔ اور ہر دو قدم کے بعد مجھے مغربی یورپ کے شہروں کے مضافات ہی

نظر پڑے۔ دل میں کہا کہ دیارِ عرب اور یہ صفائی! علمی اعتبار سے بھی کویت عربی دانشکدوں کا سرتاج ہے۔ ایک دل خوش کن حقیقت یہ بھی ہے کہ روئے زمین پر کسی ملک میں انفرادی ماہانہ آمدنی کویت کے برابر نہیں ہے۔

کویت سے بغداد پہنچا جہاں پہلے بھی پاکستانی ملازمت کے زمانے میں رہ چکا تھا۔ سڑکوں کے کنارے کتب فروش کتابوں کو پھیلائے بیٹھے تھے۔ جہاں ادب اور مذہب کے علاوہ لینن اور کارل مارکس کے شیوعی تصورحیات پر بھی کتابیں موجود تھیں۔ اخباروں میں پہلے وزیروں کے ناموں کے ساتھ معالی الوزیر یعنی ہزایکسلنسی لکھنے کی رسم تھی اب اس کی جگہ "رفیق" نے لے لی ہے۔ جو کامریڈ کا ترجمہ ہے۔ سرکاری عمارتوں پر جلی حرفوں میں ہر جگہ جو چیز جاذب توجہ تھی وہ یہ ہے کہ

أمة عربية أمة واحدة، ذات رسالة خالدة بعض گلیوں میں بھی نحن، أمة اشتراكية" بھی زینت دیوار تھا۔ سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں سے بھی تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور سبھوں کو یہی کہتے سنا کہ عربی اشتراکیت میں اقتصادی فلاح و بہبودی کا راز مضمر ہے نحن عرب قبل كل شيئ سے بھی گوش آشنا ہوا ــــ وفد کے کاموں اور ترجمانی سے فراغت ہوئی تو سیدنا حضرت محی الدین الجیلانیؒ کے آستانے پر بھی سلام کے لیے حاضر ہوا۔ یہ بھی عجیب روحانی دربار ہے قلب کو فرحت نصیب کیسے نہ ہوتی ؟ جمعہ کی نماز امام ابوحنیفہ کی مسجد میں ادا کی جو اب بھی امام اعظم کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور پورا محلہ الاعظمیہ کہلاتا ہے۔ مسجد کے باہر جو قدیم گورستان ہے اس کا بیشتر حصہ کھود کر برابر کردیا گیا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ہمارا یہ دستور رہا کرتا تھا کہ امام الاعظم کی مسجد سے نکل کر اس تاریخی

گورستان کا رخ کیا کرتا تھا، تاکہ منصور حلاج کے ہمعصر مشہور صوفی حضرت ابوبکر شبلیؒ کو فاتحہ پیش کرسکوں۔ ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ اہل بغداد کس کس قبر کو محفوظ رکھیں اس خاک میں تو سیکڑوں درخشندہ ستارے دبے ہوئے ہیں، امتداد زمانہ سے جہاں اور قبریں مٹ چکی ہیں ان میں امام احمد ابن حنبلؒ کی ضریح مبارک کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ وہی امام حنبل جنھوں نے متضاد سیرت کے حامل المامون کے ہاتھوں قید خانہ کی سختیاں برداشت کیں۔ اور مسند کی ضخیم جلدیں لکھ ڈالی تھیں اور بقول ابن خلکان جب جنازہ اٹھا تو لاکھوں مردوں کے علاوہ کم از کم ساٹھ ہزار عورتیں بھی جنازہ میں شریک تھیں۔ قبروں کا نشان باقی رہے یا نہ رہے، یہ بھی ان نفوس قدسیہ کی طرف سے اعلان ہوتا رہا ہے کہ

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو　　　　در سینہ ہائے محرم عارف مزار ماست

بغداد سے قاہرہ گیا اور پھر وہاں سے اَسواں تاکہ سدٌ العالی بھی دیکھ لوں، پھر ہمارا وفد سرکاری عنایتوں سے لکسر (Luxor) گیا۔ فراعنہ مصر کے عالیشان محلوں کے کھنڈرات دیکھ کر ان کی عظمت بیدار ہو جاتی ہے، ان محلوں کو مصری اقصر کہتے چلے آئے ہیں، اور یہی الاقصر۔۔ اب فرنگی لہجہ سے لکسر کے نام سے مشہور ہے۔

عید کی نماز میں نے ماسکو میں پڑھی تھی، اور عید الاضحیٰ کی الاقصر میں نیل کے کنارے اُس روز رنگ برنگ ملبوسات کی بہار تھی۔ زنگار رنگ بادبان تیز ہواؤں میں آنچلوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

مشہور یہودی کنزورپتی راک فلزیے بیش بہا رقم مصری اثری اکتشافات کے لیے دی تھی، جب آثار فراعنہ منظر عام پر آئے تو دنیا ان کی مردہ ثقافت کو دیکھ کر

انگشت بدندان ہوگئی تھی، پھر مصریوں کو ماقبل اسلام تہذیب فراعنہ کا احساس ہوا اور
رفتہ رفتہ وہ اس کے گرویدہ ہوگئے۔ قاہرہ ریلوے اسٹیشن کے باہر مشہور فرعون رامیس
کا بت نصب کیا گیا، ڈاکخانہ کے ٹکٹوں اور نوٹوں پر فراعنہ کی صورتیں ظاہر ہوئیں اور
یہ فرعونیت اب بھی عروج پر ہے۔

ان انکشافات سے فرنگستان اور امریکہ کا جو مقصد تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا
یعنی یہ کہ مصری اسلامی تہذیب نہیں بلکہ فرعونی تہذیب کے گرویدہ ہوجائیں، آپنے
دیکھا کہ۔

کجا می نماید کجا می زند

مغربی مورخین اپنی تہذیبی میراث کا ذکر خیر یونان سے شروع کرتے ہیں، پھر
رومۃ الکبری کے شاندار کارناموں کو سراہنے کے بعد صدیوں کو پھاندتے ہوئے یورپ کی
نشاۃ ثانیہ پر آکر دم لیتے ہیں جیسے غرناطہ اور قرطبہ قابل توجہ ہیں۔

جب میں طرابلس پہنچا تو فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے اجالا ہونے لگا تھا۔
ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاکر بستروں پر دراز ہوگئے۔ رت جگا کے خمار کو دور کرنا ہی تھا
ناشتہ کے بعد جب باہر نکلا تو پہلی چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ دکانوں کے تختوں پر کہیں بھی لاطینی
رسم الخط میں کوئی تحریر نہ تھی۔ بس عربی ہی عربی، طرابلس ایک دلکش اور آراستہ شہر ہے۔
مغربی طرز کا جنوبی فرانس یا، بلجیم کے پایہ تخت برسلز سے ملتا جلتا۔ جب وزیر تخطیط یعنی
(Minister of Planning) سے ملاقات و تبادلہ خیال کے بعد بحر روم
کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے وزیر النفط یعنی وزیر روغن کے یہاں جارہے تھے، تو
چوراہوں پر موٹے حرفوں میں جو ارشادات نظر آئے ان سے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

" اِدفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم" (قرآن کریم)

آگے چل کر دوسری شاہراہ پر جس آیت کریمہ پر نظر پڑی وہ یہ تھی :-

" وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون (قرآن کریم)

جب سڑک سے کار مڑی تو دیوار پر نمایاں حرفوں میں یہ مطبوعہ کاغذ چپکا دیکھا :-

" اِن اشرف الکسب کسب الرجل من عمل یدہ (حدیث شریف)

قلب شہر میں پھر معمر قذافی کی تقریر کا جو حصہ قابل توجہ تھا وہ یہ کہ :-

" الثورۃ الثقافیۃ لا تنبع من فراغ انما تنطلق مسلحۃ بالنظریۃ الثالثۃ وھی لیست من صنع الانسان انما ھی عودۃ لتطبیق الاسلام"

دوسری جگہ ایک سرکاری عمارت پر یہ آیۃ شریفہ لکھی تھی :-

" وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا " (قرآن کریم)

ایک ریستوران کے اندر موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔

" النظافۃ من الایمان"

یہی نہیں بلکہ تبلیغ کا دائرہ شاہراہوں سے ہوتا ہوا ایک دینار کے نوٹ تک آ گیا تھا۔ نوٹ پر لکھا ہوا تھا۔

" ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالبطل" اور اس کے نیچے " صدق اللہ العظیم"۔ یہاں نہ فرعون کی تصویریں تھیں اور نہ ماقبل اسلام کی روایات سے تہذیبی سلسلہ جوڑا گیا تھا۔

جب میں قرآن و حدیث کے ارشادات عالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ تو مشہور تاریخ "الفخری" کا مصنف ابن طقطقی یاد آیا جس نے بنوامیہ کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔ سلیمان مشہور خوش خوراک تھا، اسے لذیذ کھانوں کا بیحد شوق تھا اس کے عہد میں عوام جب دمشق کے بازاروں میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے رات تم نے کیا پکایا تھا۔ یزید بن معاویہ کے دورِ حکومت میں ناچ گانے کا زور تھا، اور شراب کھلم کھلا پی جاتی تھی۔ کیونکہ بادشاہ شراب کا رسیا تھا، اور گوری گوری دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں سانس لیتا تھا۔ یہی مورخ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگ بازاروں میں جب ملتے تو آپس میں پوچھتے تھے کہ رات تم نے تہجد کی نماز پڑھی یا نہیں؛ صباح الدین صاحب یہ ہے عکس " الناسُ علی دین ملوکھم۔ کا طرابلس میں اسلامی شریعت کی فضا کیسے نہ ہو جب کہ جواں سال معمر قذافی شریعت کا پابند ہے۔

پہلے جہاں شراب خانے تھے، وہ اب مختلف قسم کے شربتوں سے آباد ہیں۔ آپ کو ہوٹلوں میں نارنگی، انار، انگور اور سیب کے رس ملیں گے، شراب کا کہیں نام ہی نہیں ہے۔ قمار خانے اور مراقص (ناچ گھر) ویران پڑے ہیں۔ ملک میں چوری کی وارداتیں گویا ناپید ہو چکی ہیں۔ طوائفوں کی جماعت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دکانوں میں ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ نہ چور بازاری ہے اور نہ دغابازی ۔ اگر کوئی شراب پیتا ہوا پایا گیا یا کسی بیرونی ملک سے بوتل لے آیا تو شریعت کے مطابق سزائیں دی جاتی ہیں۔

ایک دن میں نے اپنے ہوٹل میں چند خوش پوشاک افریقیوں کو دیکھا جو مشک فام تھے میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کس ملک سے آئے ہیں۔ میں نے سوال انگریزی میں

کیا تھا، اس نے فرانسیسی میں کہا کہ وہ مغربی افریقہ کی جمہوریہ گابون (Gabon) سے آیا ہے کیونکہ وہاں کے صدر جمہوریہ عمر گابون کل تشریف لائیں گے۔ یہ پہلے رومن کیتھولک تھے اور گذشتہ سال مشرف باسلام ہوئے۔ صدر گابون کی تشریف آوری کے بعد اسی ہوٹل میں صدر لیبیا معمر قذافی نے ایک دعوت کی جس میں ہمارا وفد بھی شریک ہوا اور میں ان جلیل القدر رئیس ملت سے مل سکا۔ دعوت میں ڈنر کے موقع پر نارنگی اور سیب کا رس گلاسوں بھرا ہوا تھا۔ دوسرے دن شام کو طرابلس کے روزنامہ "الفجر الجدید" میں پڑھا کہ کل شام کو بارہ گابونی عائدین جمہوریہ نے اپنی شریک حیات کیساتھ قذافی کے ہاتھ پر کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلامی برادری میں شریک ہوئے۔ وہ اخبار اسوقت ہمارے سامنے ہے اور سبھوں کے اسلامی نام افریقی ناموں کیساتھ درج ہیں۔

طرابلس کے ساتھ اسلامی تاریخ کے زریں ایام وابستہ ہیں۔ اسی طرابلس کی خاک سے فاطمہ بنت عبداللہ طلوع ہوئیں جن کی جرأت اور شہادت پر ابوالکلام نے ایک خون کو گرمانے والا مقالہ لکھ ڈالا اور اقبال کی وہ معرکۃ الآرا نظم فاطمہ بنت عبداللہ آپ کے سامنے ہے، اسی طرابلس کے جیالے استعمار فرنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، اور برتر عسکری قوت سے جام شہادت پیتے رہے جس کی صدائے بازگشت اقبال کی اس نظم میں ہے جس میں شاعر مشرق کہتے ہیں۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہاں ایک اور خصوصیت لیبیا کی یہ ہے کہ نہ صاحب المعالی اور کامریڈ سے وزراء کو یاد کیا جاتا ہے اور نہ صاحب السعادۃ سے بلکہ محض "الأخ" یعنی بھائی سے۔ دیکھا آپ نے بغداد اور طرابلس کا فرق؟

واپسی میں شاہ فیصل سے ملنے کے لیے ہم لوگ جدہ گئے جہاں شاہی محل میں باریابی ہوئی۔ میں وفد سے رخصت ہو کر مکہ مکرمہ گیا تاکہ عمرہ کی سعادت نصیب ہو۔

ہاں آپ نے ہمارے لندن کے قیام کے بارے میں پوچھا ہے، میں ایک سال سے اوپر یونیورسٹی کی اجازت سے برطانوی میوزیم میں عرب اور سیلون سے متعلق مواد جمع کرتا رہا۔ اب ان مصادر کے سہارے اپنی کتاب کو ترتیب دے رہا ہوں ۱۹۷۱ء کے اکتوبر میں شاہ ایران کی دعوت پر ڈھائی ہزار سالہ جشن ملوکیت میں شرکت کے لیے گیا تھا، جہاں شیراز میں کنگرۂ ایران شناسان (World Congress of Iranologist) میں ایک مقالہ Ceylon-Iran Cultural Relations پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جو اور علماء کے مقالوں کے ساتھ کتابی صورت میں تہران سے شائع ہوا ہے۔

ہماری اہلیہ بھیٹھ سیلونی ہیں۔ یہ لوگ Moor کہلاتے ہیں۔ میں نے انھیں اردو سکھا دی ہے۔ ان سے صرف اردو میں باتیں کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دوران سفر میں بہاریوں کی توجہ سے انھوں نے آلو کی بھجیا، ورقی روٹی، تہری کھچڑی، اور پلاؤ پکانا سیکھ لیا ہے۔

شمالی ہندوستان سے یادیں وابستہ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اچانک اعظم گڑھ آ دھمکوں اور آپ کی زیارت نصیب ہو۔

لنکا کے شہر کینڈی میں جو کولمبو سے بہتر میل وسط جزیرہ میں ہے، رہتا ہوں، ۱۹۶۰ء میں جب کہ میں انڈونیشیا میں تھا، استعفا دے کر چلا آیا تھا اور ۱۹۶۴ء میں باضابطہ طور پر یہاں کا شہری بن گیا۔ اب سیلونی پاسپورٹ پر دیس بدیس مارا مارا پھرتا ہوں۔

یہ جزیرہ بیحد دلکش ہے، شادابیاں تو بس پھٹی پڑتی ہیں۔ خوشبودار مسالوں اور رنگا رنگ وادیوں میں ہمارے لیل و نہار گذر رہے ہیں۔

جزیرہ میں اکثریت سنہالیوں کی ہے، جو بدھ مت کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ اور سور کا بھی۔ ان میں مذہبی تعصب نہیں ہے مسلمانوں سے خوشگوار تعلقات ہیں۔

مورخ البلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ سیلون کو ہم لوگ جزیرۃ الیاقوت بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں کی دوشیزائیں بے حد خوبصورت ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

انما سمیت ھٰذہٖ الجزیرۃ جزیرۃ الیاقوت لحسن وجوہ نساءھا۔

ہمارے لنکائی صاحبزادے اب ماشاءاللہ وکیل ہو گئے ہیں۔

طرابلس سے جو کارڈ یہاں آیا تھا وہ اس وقت حاضر خدمت ہے۔

آپ کا دیرینہ دوست

اختر

مکاتیب شبلی اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ،

جلد اول و دوم:۔ قیمت اول ۵۰-۷، دوم ۲۵-۶

مطبوعات جدیدہ

اہلحدیث اور سیاست، مرتبہ مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۳۲ مجلد مع گردپوش قیمت للعہ پتہ۔ (۱) مکتبہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) پوسٹ بکس ۱۹ بنارس، (۲) مکتبہ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند ۳۱۲۷ پریس اسٹریٹ دہلی

جمعیۃ اہلحدیث کے علماء واعیان کے تراجم اور ان کے علمی و تصنیفی خدمات کے متعلق مولوی ابویحییٰ امام خان نوشہروی مرحوم کی کتابیں عرصہ ہوا چھپ چکی ہیں، زیر نظر کتاب میں جمعیۃ کے معروف صاحب علم و قلم اور پرجوش کارکن مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم نے گذشتہ تحریک آزادی میں طبقہ اہلحدیث کی سرگرمیاں دکھائی ہیں، اس کی ابتداء مولانا اسماعیل شہیدؒ کے مجاہدانہ کارناموں سے کی گئی ہے اس کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین کے اُن اصحاب کا ذکر ہے، جو ان کے زمانہ میں اور ان کی شہادت کے بعد ان کے مشن کو چلاتے اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جو مصنف کے خیال میں اہلحدیث تھے کتاب کے نصف آخر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز واقعات اور اس دور کی سیاسی تحریکوں کا مختصر ذکر کرنے کے بعد میاں سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا مفصل ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں میاں صاحب کی تحریک آزادی سے وابستگی اور تعلق کا ذکر کم ہے، اور ان پر انگریزوں کی وفاداری کے الزام کی تردید میں زیادہ زور صرف کیا گیا ہے، یہ کتاب دراصل اس الزام کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ "ہندوستان کی تحریک آزادی میں اہلحدیث کا کوئی حصہ نہیں ہے" اس لیے اس کا انداز علمی و تحقیقی کے بجائے مناظرانہ ہو گیا ہے، اور کہیں کہیں تحریر میں الجھاؤ

بھی ہے، شروع میں ہندوستان میں تحریک اہلحدیث کی ابتدا، کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے، گو شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کی اولاد و احفاد تقلید کے قائل نہ تھے، اور سید احمد شہیدؒ کی جماعت میں حنفی وغیر حنفی سبھی شامل تھے، تاہم اہلحدیث کی باقاعدہ جماعتی تشکیل ان حضرات کے بعد ہی عمل میں آئی، یہ بھی بجا ہے کہ اہلحدیث کے متعدد علما و زعما جن کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصہ میں آئیگا، آزادی کی جدوجہد اور سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہے ہیں، لیکن جمیعۃ کا من حیث الجماعۃ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا مصنف کی اس کدوکاوش کے باوجود بھی پوری طرح ثابت نہیں ہوسکا ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب تلاش و محنت کا نتیجہ اور سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اور گذشتہ صدی کے بعض اہم واقعات کا مختصر خاکہ ہے۔

انیس نما - مرتبہ جناب عبدالقوی صاحب دسنوی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰ مجلد - قیمت ـــ ہے رغالباً اس پتہ سے ملے، شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال

جناب عبدالقوی دسنوی کو اشاریہ سازی کے کام سے خاص ذوق ہے، چنانچہ وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، اور مولانا ابوالکلام آزادؔ کے مضامین اور مرزا غالب مرحوم پر لکھی گئی تحریروں کے اشارے اور انڈکس پہلے ترتیب دے چکے ہیں، اور اب انھوں نے اردو کے ممتاز اور صف اول کے شاعر میرانیس مرحوم کا اشاریہ ترتیب دیکر شائع کیا ہے، یہ مقالہ پہلے دلی کے سہ ماہی رسالہ تحریر میں چھپا تھا، اور اب مزید افادہ کے لیے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ان سب کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو میر صاحب کے متعلق مستقلاً لکھی گئی ہیں، یا جن میں انکا تذکرہ ضمناً درج ہے۔ ان سب مضامین کی فہرست بھی اس میں آگئی ہے جو میر صاحب کے بارہ میں وقتاً فوقتاً مختلف اخبار و رسائل میں لکھے گئے ہیں، اشاریہ سازی کا کام خاصا دشوار ہے، مگر عبدالقوی صاحب نے اس کو محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیکر ایک مفید لوبی

خدمت کی ہے، اس سے انیس مرحوم پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملیگی۔

غزل، از۔ جناب کرشن موہن صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۰۰، مجلد گرد پوش، قیمت ۱۶ر پتہ نیشنل اکیڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱

جدید اردو شاعری میں قدیم شعری روایات و قیود سے آزاد ہو کر جو نئے تجربے کئے جا رہے ہیں، کرشن موہن صاحب اس کے مقبول و نمائندہ شاعر ہیں، ان کے کلام کے متعدد مجموعے طبع ہو چکے ہیں زیر نظر مجموعہ ان کی غزلیات پر مشتمل ہے، اس میں جابجا انھوں نے اپنی "جدیدیت" کا بڑے فخر سے ذکر کیا ہے مثلاً ؎

یہ نیا رنگ، نئی سوچ، نئی لچک　　　　روش عام سے بالکل ہے جدا فن اپنا

انھوں نے ہندی الفاظ کے کثرت استعمال سے اپنی غزلوں کو ایک نئی فضا اور نیا مزاج دینے کی کوشش کی ہے اور اس مجموعہ میں موضوع کی طرح قافیہ و ردیف میں توسیع اور اوزان میں بھی کمی بیشی کے نمونے ہیں، گو اس طرح کی بعض جدتیں اور تجربے غزل کے لطیف و نازک مزاج پر بار ہیں تاہم کرشن صاحب نے بڑی حد تک اس کی رعنائی و شگفتگی کو قائم رکھا ہے۔ اور یہ مجموعہ موجودہ عہد کے حقائق و واقعات کا عکس اور گرد و پیش کے حالات کا آئینہ ہے، شروع میں محمود ہاشمی صاحب نے ان کے خصوصیات کلام تحریر کئے ہیں۔

امثال آصف الحکیم، از۔ الاستاذ الامام عبد الحمید الفراہی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۵۶ قیمت۔ ۵ روپیے پتہ۔ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

یہ عربی ریڈر مشہور حکیم آصف کی سبق آموز امثال و حکایات کا مجموعہ ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے اسکا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، اسکے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ رسالہ عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے امید ہے کہ یہ نیا ایڈیشن بھی مقبول ہوگا، اور عربی کے مبتدی طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ "ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی
کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو
دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر
عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ ؍ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات
خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت
سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ
انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی
کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی
ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے
ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

جون سنہ ۱۹۷۴ء
جسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب تبلہ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات، کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۴ء عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آہ ڈاکٹر فریدی

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا وہ بالآخر پیش آکر رہا اور جس کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے ہزاروں مایوس مریضوں کو شفا بخشی تھی اُس نے بھی گذشتہ ۱۹ رمئی کو جان جان آفریں کے سپرد کردی، مرحوم فریدی کے کن کن اوصاف کو یاد کیا جائے۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

وہ ایک حاذق طبیب، بے غرض مخلص اور جری لیڈر، اور سراپا انسانیت اور شرافت تھے، قومی و ملی مفاد کے مقابلہ میں کسی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اس کے لیے آخر وقت تک حکومت سے جنگ کرتے رہے۔ اور اپنی دولت صحت اور زندگی کسی چیز کی بھی پروا نہ کی، اور ایک بہادر سپاہی کی طرح اس راہ میں جان تک دیدی، انھوں نے قوم و ملت کیلئے جو قربانیاں کیں اس دور کے مسلمانوں میں مشکل سے اسکی مثال مل سکتی ہے، انکا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے خوف و ہراس اور احساس کمتری دور کرکے ان میں جرأت و ہمت پیدا کی، ان کا دامن فرقہ پروری سے بالکل پاک تھا، انھوں نے اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے مفاد کیلئے مختلف سیکولر پارٹیوں سے مل کر اس کا عملی نمونہ پیش کیا، اگرچہ وہ مسلم مجلس کے بانی اور اس کے صدر رہے تھے لیکن کانگریسیوں سے بھی ان کے تعلقات تھے، اور وہ بھی ان کی عزت

کرتے تھے، انکی موت پر مختلف طبقوں کے اکابر اور جن کو ان کی سیاست سے اختلاف تھا، انھوں نے بھی جو تاثرات ظاہر کیے ہیں وہ اُن کی مقبولیت کے شاہد ہیں۔

اس دور میں وہ تنہا شخص تھے، جس نے سیاست سے کسی قسم کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنا کھویا، اگر وہ چاہتے تو حکومت کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن اس کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، ان کے پیشہ کی آمدنی بڑے بڑے وزرا کی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی، اس کو انھوں نے بڑی فیاضی سے قوم وملت کی راہ میں صرف کیا، اور اپنی سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے ہزاروں روپیہ کا نقصان اٹھایا، ان کی زندگی شاہانہ تھی، مگر قوم کی خاطر انھوں نے اپنے کو سادہ اور سخت زندگی کا عادی بنا لیا تھا، جس نے انکی صحت کو نقصان پہنچایا،

مریضوں کو ان کی حذاقت پر اتنا عقیدہ تھا کہ ان کے پاس پہنچکر ان کو اپنی صحت کا یقین ہو جاتا تھا، آدھا مرض تو وہ اپنی باتوں سے دور کر دیتے تھے، وہ جس پایہ کے ڈاکٹر تھے اگر وہ چاہتے تو ان کی آمدنی دونی ہو سکتی تھی، لیکن صبح سے دوپہر تک وہ مریضوں کو مفت دیکھتے تھے، اور بہت سے غریبوں کو دوا بھی اپنے پاس سے مفت دیتے تھے، انکی شخصیت میں بڑی کشش تھی، ان کی سرو قامتی، ہنستا ہوا شگفتہ وشاداب چہرہ، ان کی جامہ زیبی، ان کا حسن اخلاق، ہر چیز دامن دل کھینچتی تھی، وہ عملاً دیندار اور راسخ العقیدہ بلکہ خوش عقیدہ مرد مومن تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ وہ علی میاں سے ملنے کے لیے ندوہ آئے، اتفاق سے میں بھی موجود تھا، کسی سلسلہ میں داڑھی کا ذکر آگیا، ڈاکٹر صاحب کلین شیو تھے، میں نے اس کی سند جواز میں یہ واقعہ سنایا کہ مولانا حمید الدین فراہی ایک زمانہ میں داڑھی منڈوں سے مصافحہ نہ کرتے تھے، مگر جب حج سے واپس آئے تو

مصافحہ کرنے لگے، لوگوں نے پوچھا حضرت اس تبدیلی کا کیا سبب ہے، فرمایا حج میں ایسے داڑھی منڈے ترکوں سے ملاقات ہوئی جن کے جسم پر جہاد کے کئی کئی زخم تھے، جو ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے، اس وقت مجھے خیال آیا کہ ایمان داڑھی پر موقوف نہیں ہے، یہ واقعہ سنا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ بھی ان ہی مجاہدین میں ہیں، اس پر انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جھک کر سلام کیا،

ان سے آخری ملاقات گذشتہ الکشن میں اعظم گڈھ کے دورے کے موقع پر اور اس سے چند مہینے پیشتر لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس وقت ان کی صحت گر چکی تھی، دو چار قدم چلنے میں سانس لینے لگتی تھی، میں نے ان سے کہا ڈاکٹر صاحب اگر آپ کو قوم و ملت کی خدمت کرنا ہے تو اپنی صحت پر رحم کیجئے" زیادہ دوڑ دھوپ نہ کیا کیجئے، جواب دیا اب میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں معلوم نہیں کب وقت آجائے، اس لیے چاہتا ہوں کہ جو مہلت بھی ہے اس میں جتنا کام بھی ہو سکے کر لیا جائے،

آج انکا یہ جواب بے اختیار یاد آرہا ہے، اس میں کتنی بلندی اور بڑائی ہے،

دارالمصنفین سے ان کا تعلق بڑا مخلصانہ تھا، وہ اسکے محسن اور اسکی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، اسلیے انکی موت دارالمصنفین کا ذاتی حادثہ اور قحط الرجال کے اس دور میں بہت بڑا قومی حادثہ ہے جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی، ان کے غم میں ہزاروں آنکھیں اشکبار اور ہزاروں زبانیں دعائے مغفرت میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے اور مرحوم کے نیک اعمال کے صدقہ اور اپنے حبیب پاک کے طفیل میں ان کو دنیا کی طرح آخرت کی سرخروئی اور سربلندی بھی عطا فرمائے اللھم اغفر لہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ - ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے، مگر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مقالات

کچھ قابل غور باتیں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

کائنات کی ساری مخلوق کے کچھ نہ کچھ خواص و لوازم ہوتے ہیں، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے، جب وہ چیز پائی جائے گی تو اس کے خواص و نتائج بھی پائے جائیں گے، مثلاً آفتاب کے طلوع سے روشنی اور غروب سے تاریکی پھیلے گی، بخارات ارضی کے صعود سے بارش اور بارش سے روئیدگی پیدا ہوگی، آگ جلائے گی، پانی ٹھنڈک پہنچائے گا، زہر ہلاک کرے گا، گندگی سے وبائیں پھیلیں گی، اسی طریقہ سے انسانی اعمال کے بھی خواص و لوازم اور اس کے نتائج ہوتے ہیں، نیک اعمال سے دل میں انشراح اور بد اعمالی سے انقباض پیدا ہوتا ہے، اعلیٰ سیرت و کردار، علم و فضل، اخلاص و صداقت خدمت خلق، بیکسوں کی دستگیری اور فیاضی و سیر چشمی وغیرہ اچھے اعمال سے خود اپنے قلب کو راحت ملتی ہے، اور سوسائٹی کی نگاہوں میں عزت و وقعت پیدا ہوتی ہے، اور بدکردار نگاہوں سے گر جاتا ہے، چور کو سزا ملتی ہے، جھوٹے کا اعتبار نہیں ہوتا، بخیل ذلیل سمجھا جاتا ہے، یہی حال دوسرے اچھے برے اعمال کا ہے۔

اس لیے انسان کو دنیا و آخرت، دونوں میں جو جزا یا سزا ملتی ہے وہ درحقیقت

اس کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے، تجربہ و مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے اور مذہب کی تعلیم بھی یہی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنْ احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلها	اگر تم نیکی کروگے تو اپنی ذات کیلئے کروگے اور برائی کروگے تو اس کے لیے کروگے
من عَمِلَ صالحا فَلِنفْسِہٖ ومَنْ اساء فعلیھا وما ربک بظلام للعبید	جس نے نیک کام کیا اس نے اپنے نفس کے لیے کیا اور جس نے برا کام کیا تو اس کا وبال اسی پر ہوگا، خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

یعنی خدا کی طرف سے کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوتی،

فمن اھتدی فلنفسہ وَ من ضل فانما یضل علیھا	جس نے ہدایت پائی تو اپنی ذات کے (فائدہ) کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اسکے (نقصان) کیلئے
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ	جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی نیک عمل کریگا تو وہ قیامت میں اسکو دیکھے گا اور جو برا کام کریگا تو وہ بھی قیامت میں اسکے سامنے آئے گا۔
یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء	جس دن ہر شخص نے جو اچھے کام کیے ہیں انکو موجود پائے گا اور جو برے کام کیے ہیں ان کو بھی (موجود پائے گا۔)

یعنی آخرت میں اعمال کی جو جزا و سزا ملے گی وہ انسان کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوگی۔

انسان میں خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں کی صلاحیتیں ہیں، حسن عمل میں وہ فرشتوں سے بھی بڑھ سکتا ہے اور بد اعمالی میں شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس کی اصلاح کی دو ہی

شکلیں ہیں، اخلاقی تعلیم و تربیت اور وحی الٰہی کی ہدایت و رہنمائی، تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ ایک قادرِ مطلق ہستی پر ایمان ویقین اور اس کے خوف وخشیت کے بغیر محض اخلاقی تعلیم انسانی اصلاح کے لیے کافی نہیں ہے، دنیا میں بڑے بڑے اخلاقی مصلح پیدا ہوئے، فلسفۂ اخلاق پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا، ان کی کامیابی محض عارضی تھی، ان کی تعلیمات ان کے بعد فراموش کردی گئیں، اور انھوں نے اپنے بعد اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ کوئی جماعت نہیں چھوڑی جس سے آنے والی نسلوں میں اصلاح کا سلسلہ قائم رہتا۔ اور آج انکا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے، اور ان کا فلسفۂ اخلاق صرف کتب خانوں کی زینت ہے، اور دنیا میں اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت و رہنمائی، اس کے تزکیہ و تطہیر، نیکی و بدی کی وضاحت، اس کی تعلیم و تربیت اور ترغیب و ترہیب کے لیے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔

یاایھا النبی انا ارسلنٰک شاھدًا	اے پیغمبر ہم نے تم کو شہادت دینے والا، خوشخبری
ومبشرًا ونذیرًا وداعیا الی	سنانے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے بلانے والا
اللّٰہ باذنہٖ وسراجًا منیرا	روشن چراغ بناکر بھیجا۔
ھوالذی ینزل علی عبدہ	وہی اللہ ہے جو اپنے بندہ پر اپنی کھلی آیتیں
الکتاب آیٰت بینات لیخرجکم	اتارتا ہے، تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی
من الظلمات الی النور	میں لائے۔
یتلوا علیھم آیٰتہ ویزکیھم	پیغمبر لوگوں کو خدا کی آیتیں سناتا،
ویعلمھم الکتاب والحکمۃ	ان کو پاک کرتا اور حکمت سکھاتا ہے۔

خدا نے ان کے ذریعہ نیکی اور بدی کی راہیں بھی بتادیں۔

وھدینٰہ النجدین | اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھا دیے،
ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دساھا | اور انسان اور اس ذات کی قسم جس نے اس کو درست بنایا پھر اسکو بدکاری اور پرہیزگاری دونوں چیزیں سمجھا دیں جس نے اس (نفس) کو پاک کیا اس نے یقینی فلاح پائی اور جس نے اسکو دبا دیا وہ ناکام و نامراد ہوا۔

ان اچھے برے اعمال کی وضاحت، نیک کاموں کی ترغیب اور برے کاموں سے ترہیب اور ان کی جزا و سزا کی پوری تفصیل تمام الہامی صحیفوں میں ہے، اور علم صحیح اور ہدایت و رہنمائی کا سب سے قابل اعتماد ذریعہ یہی صحیفے اور انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن موجودہ دور کے مادی نقطۂ نظر کا سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ انسانی عقل و شعور حد کمال کو پہنچ گئے ہیں اور اس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں، سائنس کی ایجادات و انکشافات نے دنیا کو عالم طلسمات اور سامان تعیش کی فراوانی نے نمونۂ جنت بنا دیا ہے، انسانی اولو العزمی اور عظمت کا جھنڈا سیاروں تک پر گڑ گیا ہے اور آیندہ اس سے بھی حیرت انگیز کارناموں کے امکانات ہیں، عقل کے سوا اس کو اور کسی طاقت کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے،

انسان کے عقلی و ذہنی کمالات اور سائنس کے کارناموں کے متعلق جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ سب تسلیم ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، اس پر اس کے سارے اسرار منکشف ہو گئے ہیں، اور اب کوئی چیز پردۂ راز میں نہیں رہ گئی ہے، سائنس کی ساری ترقیوں کے باوجود پوری کائنات کا کیا ذکر کرۂ ارض کے متعلق بھی اس کا علم اور اس کی تحقیقات بہت

محدود اور ناقص ہے۔ اور خود علمائے سائنس کو اس کا اعتراف ہے کہ سائنس نے اب تک جو انکشافات کیے ہیں وہ غیر معلوم چیزوں کے مقابلہ میں سمندر کا ایک قطرہ ہیں،

پھر جس عقل و حواس پر انسان کو ناز ہے وہ صرف کرۂ ارض کے حالات کا ادراک کر سکتے ہیں، جو پوری کائنات کا حقیر ترین حصہ ہے۔ پوری کائنات میں اس سے کہیں بڑی جو بیشمار دنیائیں موجود ہیں ان کے احاطہ سے انسانی عقل قاصر ہے، اور ابھی بہت سی دنیاؤں کا علم بھی نہیں ہو سکا ہے، ان کے طبعی قوانین کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل جدا ہیں، جو زمین سے چند میل کی بلندی پر بالکل بدل جاتے ہیں، اور ہمارے حواس وہاں کے لیے بالکل بیکار ہو جاتے ہیں، اور ہم ان کے بارہ میں ظن و تخمین کے علاوہ کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔ جب اس مادی کائنات میں ہمارے حواس کے تعطل اور ہماری عقل کی نارسائی کا یہ حال ہے تو اس مادی کائنات کے ماوراء جو عالم ہے اس کے احوال و کوائف کا ادراک کس طرح کر سکتے ہیں،

اس عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علم و تجربہ میں نہیں ہے، لیکن کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں، خود اس دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک ان کا تجربہ و مشاہدہ نہیں ہوتا ہماری عقل ان کو قبول نہیں کرتی لیکن تجربہ ہونے کے بعد حقیقت بنجاتی ہیں۔ ریڈیائی لہریں ہمیشہ سے موجود تھیں لیکن اب سے چند سال پہلے کون اس کا یقین کر سکتا تھا کہ دنیا بھر کی آوازیں ہزاروں میل کی دوری سے آن واحد میں سنی جا سکتی ہیں، لیکن آج ایک عامی بھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں، اس لیے اس مادی عالم کے ماوراء کسی عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے لیکن جس طرح اسی عالم مادی کے حقائق کے ادراک اور اس کے اسرار کے انکشاف

کے لیے عقلی و ذہنی قویٰ اور علمی تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے، اسی طرح ماورائے مادہ عالم کے ادراک اور اس کے احوال و کوائف کی معرفت کے لیے روحانی قویٰ کی ضرورت ہوتی ہے، جو انبیاء علیہم السلام اور خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہوتے ہیں، اور اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے، خاص قسم کی ریاضت سے غیر انبیاء کو بھی یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کو روحانی تلاش و تحقیق کہہ سکتے ہیں، لیکن سب سے معتبر ذریعہ وحی الٰہی ہے جس میں کسی غلطی کا احتمال نہیں انبیاء و اولیاء کے لیے عالم غیب عالم شہود بنجاتا ہے، اور وہ اس کو عالم مادی سے زیادہ حقیقی مانتے ہیں، اس عالم پر یقین مذہب کی جان ہے، اس لیے سارے الہامی مذاہب نے اس پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے، اور انسانیت کی فلاح کا صحیح راستہ یہی ہے، اس کے بغیر دنیا میں بھی اس کو فلاح نہیں ہو سکتی

اس مادی نظام حیات اور اس کی زائیدہ تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس ایمان و یقین کی دولت اور ان کے حقیقی شرف و عظمت سے محروم کر کے محض گوشت پوست کی ایک مشین اور نفس پرست حیوان بنا دیا ہے، جس کی زندگی کی غرض و غایت تعیش و نفس پروری اور جاہ و اقتدار کا حصول ہے، اور اس کے وسائل دولت اور مادی ترقی اس کا مقصود و معبود بن گئے ہیں، ان کے سامنے انسانی شرف و عظمت کے اصلی ستون حق و صداقت، عدل و مساوات، انسانی ہمدردی، اور عفت و پاکیزگی وغیرہ اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کے بغیر نہ صرف انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں عدل و مساوات قائم نہیں ہو سکتا، اخلاقی قیود کے ٹوٹنے کے بعد پھر انسانی خود غرضی اور بے راہ روی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی، چنانچہ بغیر کسی اخلاقی قید کے نفس کے مطالبات کی تسکین اور زندگی کی لذتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی

کا نتیجہ وہ اخلاقی انارکی اور فسق و فجور ہے جس کے سامنے حیوانیت بھی شرماتی ہے، اور حب جاہ و اقتدار کا نتیجہ ظلم و زیادتی اور فساد فی الارض ہے، جس کا مشاہدہ آج کی دنیا میں کیا جا سکتا ہے، بڑی طاقتیں دنیا کے بڑے سے بڑے حصے اور کمزور ملکوں اور قوموں کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لیے مختلف قسم کے ذرائع اختیار کرتی ہیں، اب سیاسی غلامی کا زمانہ ختم ہو چکا اس لیے مختلف خوبصورت ناموں، اور مالی، فوجی اور ٹکنیکل امداد کے ذریعہ چھوٹے اور کمزور ملکوں کو پھانستی ہیں، اس دام میں ایشیا کے پسماندہ اور ترقی پذیر ملک آسانی سے آجاتے ہیں جس سے مشکل ہی سے کوئی ملک مستثنیٰ نکل سکتا ہے،

اس لیے خود ان قوموں میں مستقل رقابت اور کشمکش پیدا ہو گئی ہے، اور ان میں ہمیشہ گرم یا سرد جنگ جاری رہتی ہے، آپس کا اعتماد اٹھ گیا ہے، ایک قوت دوسری قوت سے خائف ہے اور اپنے تحفظ اور حریفوں کے مقابلہ کے لیے اس کی ساری ذہنی و دماغی قوتیں ایسے آلات و اسلحہ کی ایجاد میں صرف ہو رہی ہیں جس سے ان کو زیر کیا جا سکے، چنانچہ سائنس کی بیشتر اہم ایجادات جنگ اور اس کے متعلقات ہی کے لیے ہوتی ہیں، جن چیزوں کو انسانی عزم و حوصلہ کی فتح اور سائنس کے معجزے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی جذبۂ مسابقت کا نتیجہ ہیں، جس نے دنیا کا امن و سکون خطرے میں ڈالدیا ہے،

اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کی سیاست سراسر فریب و نفاق بن گئی ہے دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ، لبوں پر تبسم اور زبان میں شیرینی ہے، اور دل میں بغض و عناد کی بھٹی سلگ رہی ہے، سیاست کی زبان بھی ذو معنی ہوتی ہے جس کے ظاہری معنی کچھ ہوتے ہیں اندرونی کچھ، اور معاہدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی ہے، مختلف قوموں سے بیک وقت متضاد معاہدے کیے جاتے ہیں، اس دور کا سب سے بڑا اور کامیاب مدبر وہی ہے جو سب سے بڑا منافق ہو،

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا، ڈاکٹر اقبال جس زمانہ میں لندن میں پڑھتے تھے، انکی لینڈلیڈی نے ان سے پوچھا، مسٹر اقبال کیا بات ہے کہ سارے پیغمبر ایشیا میں پیدا ہوئے، یورپ میں کوئی پیدا نہیں ہوا، انھوں نے جواب دیا یورپ میں شیطان پیدا ہوتے ہیں، اس نے کہا یہ کیسے، اقبال نے کہا، یورپ کے مدبرین شیطان ہی تو ہیں، یہ لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے، آج دنیا میں جو فساد بھی برپا ہے وہ سب انہی کا لایا ہوا ہے،

اس تہذیب کی بعض خوبیوں اور مادی فوائد سے انکار نہیں، اس کے متعلق جو بھی کہا جاتا ہے سب صحیح ہے، اس نے انسانی راحت اور اس کی تکلیفوں کے ازالہ کے ایسے ایسے سامان فراہم کر دیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مغربی قوموں میں انسانی ہمدردی بھی ہے، جب کوئی ملک کسی ارضی وسماوی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ امداد کے لیے دوڑ پڑتی ہیں، انھوں نے انسانی بھلائی کے بہت سے کام کیے ہیں، مگر ان کے مادی تصور حیات نے ان کی ان خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، یہی قومیں سیاست کے میدان میں چنگیز و ہلاکو بن جاتی ہیں، وہ انسانی ہمدردی اور مادی ترقی کس کام کی جو انسان کو جوہر انسانیت سے خالی کرکے اسکو حیوان بنادے اور انسانی راحت و آسایش کے ساتھ اس کی ہلاکت و تباہی کے سامان بھی فراہم کر دے، اس کی مثال ایسی ہے کہ اعلیٰ درجہ کا عرق گلاب کھینچنے کے بعد اس میں نجاست بھی ملا دیجائے،

درحقیقت مذہب ہی میں وہ قوت ہے جو انسان کو اس کی حیوانی جبلت اور اخلاقی بے راہ روی سے روکتی ہے، اس سے ہماری مراد رسمی مذہب نہیں، بلکہ سچی خدا پرستی ہے، جو انسانوں میں ایسا اخلاقی احساس پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ طبعاً نیکی اور بھلائی کی طرف راغب اور برائی سے نفور ہو جاتا ہے، یا کم سے کم برائی کو برائی سمجھتا اور اس کے

نتائج سے خائف رہتا ہے، برائی کو آرٹ اور ہنر نہیں سمجھتا، یہ صحیح ہے کہ مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت بھی اس کی پوری پابند نہیں ہوتی، اور ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا رہتی ہے، حقیقۃً ایسے لوگوں کا مذہب رسمی اور موروثی ہوتا ہے، حقیقی نہیں، اس کے باوجود جو لوگ خدا اور مذہب کو مانتے ہیں، ان کے دل اس کے خوف سے بالکل خالی نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ان کو اپنی بد اعمالی کا احساس ہوتا ہے، اور ان کی اصلاح کی امید رہتی ہے، لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں، اور ان کا فلسفۂ حیات

ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ہے، انکی اصلاح کی کوئی امید نہیں، اس لیے موجودہ دنیا کو پہلے زمانہ سے زیادہ مذہب کی ضرورت ہے، جب انسان کی عقل وخرد خام اور اس کی زندگی سادہ تھی، اسکی برائیاں بھی سادہ اور محدود تھیں، تیش ونفس پروری میں یہ تفنن اور آرٹ نہ پیدا ہوا تھا، اس کی وحشت اور درندگی کے نتائج بھی محدود تھے، جن سے زیادہ سے زیادہ چند ہزار جانوں کا اتلاف ہوتا تھا، یا ان کو نقصان پہنچتا تھا، لیکن موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسانوں کے ہاتھوں ایک ایک جنگ میں لاکھوں انسان ہلاک اور کروروں بیکار ہوتے ہیں، ہلاکت خیز اسلحہ سے بڑے بڑے بارونق شہر چشم زدن میں خاک کا ڈھیر بنجاتے ہیں، ان سفاکیوں کو روکنے، قوموں وملکوں کے درمیان عدل وانصاف کے قیام اور ان کے اختلافات کے پُرامن تصفیہ کیلئے بین الاقوامی مجالس قائم ہیں، لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہیں، اور طاقتور قوموں کا آلۂ کار بن گئی ہیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتیں اور آج بھی

جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ ہے۔ بڑی طاقتیں ان کے فیصلوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں اور یہ مجالس ایک تماشا بنکر رہ گئی ہیں، اس کا سبب بھی مادی تصورِ حیات ہے۔ جب تک یہ نہ بدلے گا کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

جب کوئی قوم خدا فراموشی اور اخلاقی گراوٹ کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے، ایسی قوموں کا عبرتناک انجام تاریخوں میں پڑھا جا سکتا ہے، بعض باجبروت قومیں ایسی مٹیں کہ آثارِ قدیمہ کی زبان کے علاوہ ان کی داستانِ عبرت سنانے والا کوئی نہیں، روما کا زوال تو تاریخی عہد کا واقعہ ہے، اس کے دورِ عروج میں کون اس کے زوال کا یقین کر سکتا تھا، مگر اس کے اخلاقی بگاڑ نے اس کو ایسا مٹایا کہ وہ دوسروں کے لیے سامانِ عبرت ہے، جو قومیں اپنی بداعمالیوں کے باوجود زندہ ہیں ان کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ ابھی زندگی کے بعض اصولوں پر ان کا عمل ہے، مثلاً قومی وحدت، محنت و جفاکشی، علم و تحقیق کی راہ میں جگر کاوی، ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح، ملک و قوم کی راہ میں ہر قسم کی جانی و مالی قربانی وغیرہ لیکن اخلاقی بگاڑ کے ساتھ یہ اوصاف بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے اور ان کے اعمال کا نتیجہ دیر سویر ظاہر ہو کر رہے گا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح قومیں صدیوں میں بنتی ہیں، اسی طرح ان کو بگڑنے اور مٹنے میں بھی ایک زمانہ لگ جاتا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو قومیں آج بامِ عروج پر ہیں وہ ہمیشہ رہیں گی، ان کے عروج کا ایک سبب ایشیا اور افریقہ کی دولت تھی، وہ ان کے ہاتھوں سے چھن گئی ہے، برطانیہ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا، انگلینڈ کے جزیرہ میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہٹلر کا انجام نگاہوں کے سامنے ہے، جرمنی کا غرور

...ٹ چکا، سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں میں گھن لگ چکا ہے، عجب نہیں کہ دونوں
...یک دوسرے کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں، مادی تہذیب کے ان نتائج کو دیکھ کر خود یورپ کے
...فکرین اس کے انجام سے خائف ہیں، قوموں کو ان کے اعمال کی جو سزا ملتی ہے، کبھی
...خرق عادت کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی قانون قدرت کے مطابق مثلاً سیلاب،
...لزلے، ہوا کا طوفان، وبائیں، بدامنی، فتنہ و فساد، جنگ و خونریزی، قحط، معاش کی
...نگی وغیرہ، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دنیا کے حالات عذاب الٰہی سے کم نہیں ہیں،
...رکشی و بغاوت عام اور امن و سکون مفقود ہے، ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے، بڑی
...اقتیں تک ایک دوسرے سے ہراساں اور اپنے تحفظ اور حریف کے مقابلہ کے لیے ہلاکت خیز
...لحہ کی دوڑ میں مشغول ہیں، حکومتوں میں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں، کسی ملک کے
...ربراہ کی جان محفوظ نہیں، ایشیائی ملکوں کا حال اور بھی برا ہے، اس کی مثال خود ہمارا
...ملک ہے، ذاتی مفاد کے مقابلہ میں کم لوگوں کو ملک کے مفاد کی پروا ہے، قانون کا احترام
...م ہو گیا ہے، قانون شکنی عام ہے، بات بات پر اسٹرائیکیں اور فساد ہوتے ہیں، گولیاں
...تی ہیں، جان و مال کا اتلاف ہوتا ہے، دیانتداری عنقا اور رشوت عام ہے، جس سے
...کل ہی سے کسی صاحب اختیار کا دامن پاک نکل سکتا ہے، دولت معبود و مقصود بن گئی
...، ہر شخص اس کے پیچھے سرگرداں ہے، زندگی اتنی گراں ہو گئی ہے کہ وبال جان بن گئی ہے
...یہ ہے کہ ملک نے صنعتی حیثیت سے بڑی ترقی کی ہے، قرض کی دولت بھی بڑھ گئی ہے،
...طبقوں کا معیار زندگی بھی اونچا ہو گیا ہے، جن کے یہاں حلال و حرام کی قید نہیں،
...جائز آمدنی سے مشکل ہی سے کوئی آدمی معیار زندگی قائم رکھ سکتا ہے، ان ساری خرابیوں
...صرف ایک علاج ہے، اس کو مذہب کہہ لیجئے یا اخلاقی ذمہ داری کا احساس جو

بغیر مذہب کے پیدا نہیں ہو سکتا،

ہندوستان کے سارے لیڈروں میں اس پہلو پر صرف گاندھی جی کی نظر تھی، ان کے دماغ میں آزاد ہندوستان کا نقشہ موجودہ نقشہ سے بالکل مختلف تھا، انکی سیاست اور آزادی کی جد و جہد کی بنیاد حق و صداقت اور اخلاق و روحانیت پر تھی، سیاست جیسی ناپاک چیز میں بھی اخلاق کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا، اس وصف میں وہ ساری دنیا میں منفرد تھے، انھوں نے ہمیشہ خدمت کو عہدوں پر ترجیح دی، اور ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ کانگریس کو ایک خدمت گذار جماعت دیکھنا چاہتے تھے، لیکن عہدوں اور دولت کے مقابلہ میں کون ان کی سنتا، وہ عمر بھر عملاً سادگی کا سبق دیتے رہے، ان کے نزدیک کارخانوں کے قیام کے مقابلہ میں دیہاتوں کی اصلاح مقدم تھی، انھوں نے نیچے طبقوں کو اٹھانے کی کوشش کی، اور اپنے عمل سے سادگی اور مساوات کا سبق دیتے رہے، لیکن آج کی کانگریس اور حکومت کو ان کی تعلیمات اور ان کے عمل سے کوئی نسبت نہیں ہے، ہندوستان میں جو بحران بپا ہے، وہ سب ان کی تعلیمات کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہے، اور اس کی فلاح انکی تعلیمات پر عمل ہی پر موقوف ہے۔

دینِ رحمت

داخلی نقد حدیث

از

جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۲)

حدیث کے دو جزو ہیں۔

(۱) متن اور۔ (۲) سند۔

"متن" اصل حدیث کو کہتے ہیں، اور "سند" اس تک پہونچنے کے ذریعہ اور راستہ کو کہتے ہیں "سند" اگرچہ اصل حدیث کا جزو نہیں ہے لیکن چونکہ اولاً حدیث کی صحت کا مدار سند ہی پر ہے، اس بناء پر محدثین کے نزدیک اس کی حیثیت کسی طرح "جزو" سے کم نہیں ہے۔

متن پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے۔

"سند" پر گفتگو، کا تعلق خارجی نقد حدیث اور "متن" پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں۔

کثیرا ما یحکمون بذٰلك	بسا اوقات حدیث کے وضعی (جعلی)
ای، بالوضع باعتبار امور	ہونے کا حکم ان امور کی وجہ سے لگاتے
ترجع الی المروی والفاظ	ہیں جنکا تعلق مروی (متن حدیث)

الحدیث [1]	اور الفاظ حدیث سے ہے۔

ابن صلاح کہتے ہیں،

وقد یفہمون الوضع من	کبھی حدیث کی وضعیت (جعلی ہونا)
قرینة حال الراوی او	راوی یا مروی (متن) کی حالت سے
المروی فقد وضعت احادیث	سمجھی جاتی ہے، چنانچہ بہت سی طویل
طویلة یشهد بوضعها رکاکة	حدیثوں کے الفاظ و معانی کی رکاکت
الفاظها و معانیها [2]	(سطحیت) خود وضعی ہونے کی شہادت ہے

ابوالحسن علی بن محمد کتانی کہتے ہیں

قرینة فی المروی لمخالفته	مروی (متن) میں وضعی ہونے کا قرینہ
لمقتضی العقل بحیث لا یقبل	یہ ہے کہ وہ مقتضائے عقل کے خلاف
التاویل ویلتحق به ما	اسطرح ہو کہ کوئی تاویل نہ قبول کر سکے
یدفعه الحس والمشاهدة و	اسی میں وہ بھی شامل ہے جو حس،
والعادة [3]	مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو۔

مقدمہ المغنی میں ہو۔

لم یقف العلماء عند نقد الحدیث	علماء نے نقد حدیث کے معاملہ میں

---

[1] شمس الدین محمد سخاوی۔ فتح المغیث بشرح الفیة الحدیث، الموضوع۔ [2] عثمان بن عبد الرحمٰن ابن صلاح علوم الحدیث (مقدمہ ابن صلاح) النوع الحادی والعشرون معرفة الموضوع۔ [3] ابوالحسن علی بن محمد کتانی تنزیہ الشریعة المرفوعة عن الاخبار الشنیعة الموضوعة فصل فی حقیقة الموضوع و اماراته وحکمه۔

من حیث سند لا بل تعدوا	صرف سند پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متن
الی النظر فی متنہ فقضوا	کی طرف ہی توجہ کی چنانچہ بہت سی
علی کثیر من الاحادیث	ایسی حدیثوں کے وضعی ہونے کا
بالوضع وان کان سندہا	فیصلہ کیا جن کی سندیں اگرچہ درست
سالماً اذ وجدوا فی متونہا	تھیں لیکن ان کے متن میں خرابیاں
عللاً تقضی بعدم قبولہا[1]	پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قابل
	قبول نہ تھیں۔

ذیل میں داخلی نقد حدیث کی بنیاد قرآن حکیم، سنت نبوی اور صحابہؓ کے فرمودات سے ذکر کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں داخلی نقد کی بنیاد قرآن حکیم میں داخلی نقد کی بنیاد یہ آیتیں ہیں۔

فقد لبثت فیکم عمراً	عمر کا بڑا حصہ میں تمھارے اندر
من قبلہ[2]	گذار چکا ہوں۔

آیت میں صحت کی ضمانت زندگی کے اس حصہ کے لئے پیش کی گئی ہے جو قبل نبوت ہے تو بعد نبوت کی زندگی اور اس کے فرمودات میں کیونکر ایسا نقص پایا جائے گا۔ جس سے علم و عقل کی خلاف ورزی لازم آئے۔

واذا جاءھم امر من الامن	جب ان کے پاس امن یا ڈر کی خبر آتی
او الخوف اذاعوا بہ	ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر
ولو ردوہ الی الرسول	اس کو رسولؐ اور اولو الامر تک

[1] ابو حفص عمر بن بدر الموصلی الحنفی: المغنی عن الحفظ و الکتاب مقدمہ ص ۱۰۔ [2] یونس رکوع ۲

والی اولی الامر منهم لعلمه	پہونچا دیتے ہیں تو جو اُن میں ملکہ ،
الذین یستنبطونه منهم[1]	استنباط رکھنے والے تھے وہ اس کو
	پوری طرح معلوم کر لیتے ۔

"الامر" میں ہر بات و شرعی واقعہ شامل ہے۔

لان الامن والخوف حاصل	کیونکہ امن اور خوف ہر اس چیز میں
فی کل ما یتعلق بباب	موجود ہے ۔ جس کا تعلق باب
التکلیف[2]	تکلیف سے ہے ۔

"اولو الامر" سے مراد اہل علم و صاحب فقہ ہیں اھل العلم والفقہ[3] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل علم و صاحب فقہ حدیث کی داخلی نقد و تحقیق اور اس کی صحیح حیثیت متعین کرنے پر مامور ہیں پھر یستنبطونه کے اضافہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نقد و تحقیق کے زیادہ مستحق وہ اہل علم و صاحب فقہ ہیں جو "ملکہ استنباط" رکھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی کئی آیتوں میں رسول اللہ کے کاموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس میں اہم کام "تعلیم حکمت" ہے۔ اگر آپ کی طرف منسوب الفاظ کے معانی اور مفہوم میں کوئی نقص پایا گیا تو حکمت کی خلاف ورزی ہوگی ۔ جو شان نبوت کے منافی ہے۔

سنت نبوی میں داخلی نقد کی بنیاد | سنت نبوی میں داخلی نقد کی بنیاد یہ حدیثیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا۔

اذا سمعتم الحدیث تعرفه	جب کوئی ایسی حدیث تم سنو جس سے
قلوبکم و تلین له	تمہارے دل کو انسیت ہو اور

---

[1] النساء رکوع ۱۱ [2] رازی ۔ تفسیر کبیر ج ۳ نساء [3] قرطبی ۔ نساء رکوع ۱۱ ۔

اشعارکم وابشارکم و	تمہارے بال دکھال اس سے متاثر ہوں
ترون انہ منکم قریب	اور اپنے سے اس کو قریب سمجھو تو میں
فانا اولاکم بہ واذا	اس کا تم سے زیادہ حقدار ہوں اور
سمعتم الحدیث عنی	جب کوئی ایسی حدیث تم سنو جس سے
تنکرہ قلوبکم وتنفر منہ	تمہارے دل اسکو قبول نہ کریں اور
اشعارکم وابشارکم	تمہارے بال وکھال اس سے متوحش
وترون انہ معکم بعید	ہوں اور اپنے سے اس کو دور سمجھو تو
فانا ابعدکم منہ[1]	میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا،

ماحدثتم عنی ما تنکرونہ	تم سے ایسی حدیث بیان کی جائے
فلا تاخذوا بہ فانی	جس سے تمہارا دل اس کو ناپسند کرے
لا اقول المنکر ولست	تو اسکو مت قبول کرو کیونکہ میں نہ
من اہلہ[2]	منکر کہتا ہوں اور نہ اسکا اہل ہوں

ظاہر ہے کہ مذکورہ روایتوں میں حدیث کی شناخت سے متعلق رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا اس کا تعلق متن حدیث یا داخلی نقد حدیث سے ہے جس کے لیے خاص مناسبت اور فنی ذوق کی ضرورت ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ حدیث (سنت نبوی) کا سرچشمہ شعور نبوت ہے جس کے لیے نہایت

---

[1] مسند احمد حدیث ابی اسید الساعدی [2] ابو الحسن علی بن محمد کتانی۔ تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ فصل فی حقیقۃ الموضوع

اعلیٰ درجہ کا فہم و تدبر ضروری ہے۔ اسی بنا پر متعدد روایتوں میں فقہ و تفقہ (فہم و تدبر) سے کام لینے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ اس لیے اگر رسول اللہؐ کی طرف منسوب الفاظ۔ معانی اور مفہوم میں کوئی نقص پایا جائے تو اس سے شعور نبوت مجروح ہوگا اور نبوتؐ کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔

صحابہ کے فرمودات میں داخلی نقد کی بنیاد

صحابہؓ کے فرمودات میں داخلی نقد کی بنیاد حسب ذیل روایتیں ہیں

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے جب یہ حدیث بیان کی کہ

الوضوء مما مست النار ولو من ثور اقط[1]	جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ پنیر کا ایک ٹکڑا ہی ہو۔

تو ابن عباسؓ نے فرمایا۔

انتوضأ من الدھن انتوضأ من الحمیم[2]	کیا ہم چکنا ہٹ اور گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو کریں۔

وضو سے مراد کلی کرنا ہے۔ یہ محل متعین کرنے کی ضرورت اسی بناء پر پیش آئی کہ حدیث کا ظاہری پہلو "درایت" کے خلاف تھا۔

حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے، تو انھوں نے فرمایا۔

حسبکم القرآن ولا تزر و　　　قرآن کافی ہے جس میں مذکور ہے

---

[1] و [2] ابن سعد ترمذی حدیث الوضوء مما غیرت النار

ولا تزر وازرة وزر اُخریٰ[1]	کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔

اس حدیث میں عذاب کو اس صورت پر محمول کیا گیا ہے۔ جس میں مردہ پر رونے کا سبب بنے یعنی رونے کی وصیت کر جائے یا کسی کو مقرر کر جائے، اس کے بغیر قرآن سے ربط نہیں قائم ہوسکتا۔

محمود بن ربیع صحابی نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی۔

فان اللہ قد حرم علی النار	جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لئے
من قال لا الٰہ الا اللہ یبتغی	لا الٰہ الا اللہ کہا اللہ نے اس پر آگ
بذالک وجہ اللہ[2]	حرام کر دی۔

حضرت ابو ایوبؓ انصاری نے سنکر فرمایا۔

واللہ ما اظن رسول اللہ	خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ جو تم نے کہا رسول
قال ما قلت قط[2]	اللہؐ نے کبھی نہ فرمایا ہوگا۔

اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے چونکہ عمل کی اہمیت گھٹتی ہے جو درایت کے خلاف ہے اس بناء پر ابتدائی مرحلہ میں حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو اس کے قبول کرنے میں تامل ہوا لیکن حدیث کا محل متعین ہونے کے بعد تامل کی گنجائش نہیں رہتی وہ یہ کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے تقاضہ پر عمل بھی کیا ہو جو خالص رضاء الٰہی کے لیے کہنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

محدثین نے داخلی نقد حدیث سے دریغ نہیں کیا

قرآن وسنت اور صحابہؓ کے فرمودات میں چونکہ یہ بنیادیں موجود تھیں اس بناء پر محدثین نے حدیث کی تحقیق میں داخلی نقد سے کام لینے میں دریغ نہیں کیا جیسا کہ درج ذیل تصریحات سے ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت [2] بخاری ج ۱ باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ

عمرو بن میمون کہتے ہیں۔

رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا قردۃ قد زنت فرجموھا فرجمتھا معھم[1]	میں نے زمانہ جاہلیت میں بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا اس پر بندروں نے جمع ہوکر اس کو سنگسار کیا چنانچہ میں نے بھی ان کے ساتھ سنگسار کیا۔

حافظ ابن عبد البر (مشہور محدث) نے اس واقعہ پر نکیر کرتے ہوئے کہا ہے۔

فیھا اضافۃ الزناء الی غیر مکلف واقامۃ الحد علی البھائم وھذا منکر عند اھل العلم[2]	اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد (سزا) قائم کرتا ہے جو اہل علم کے

نزدیک یہ منکر ہے۔

ایک روایت میں ہے۔

خلق اللہ آدم وطولہ ستون ذراعا[3]	اللہ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو انکا قد ساٹھ ذراع تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کی شرح میں لکھا ہے۔

ویشکل علی ھذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفۃ کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علی	اس میں یہ اشکال ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار پائے جاتے ہیں مثلاً قوم ثمود کی بستیاں ان کے مسکنوں سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] بخاری ج ۱ کتاب بنیان الکعبہ باب القسامۃ فی الجاہلیۃ [2] ابن حجرؒ فتح الباری ج ۷ باب القسامۃ فی الجاہلیۃ [3] بخاری ج ۲ کتاب الانبیاء باب خلق آدم وذریتہ

ان قامانهم کم تکن مفرطة	ان کے قد حد سے زیادہ بڑے نہ تھے
الطول علی حسب ما یقتضیه	جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے۔
الترتیب السابق [۱]	

ایک روایت میں ہے۔

من عشق نعف فمات فهو	جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن
شهید [۲]	رہا وہ مرگیا تو شہید ہوا۔

دوسری جگہ ہے۔

من عشق وکتم اعفه وصبر غفر	جس شخص نے عشق کیا اس کو چھپایا
الله له را وخله الجنة	اور پاک دامن رہا اور صبر کیا تو اللہ
	اس کی مغفرت کریگا اور جنت میں

حافظ ابن قیمؒ اسکو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فلو کان اسناد هذا الحدیث	اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح
کالشمس کان غلطا ووهما [۳]	بھی ہوتی تو بھی یہ غلط اور وہم ہوگی۔

محدثین کی زیادہ توجہ جمع حدیث وخارجی نقد حدیث پر تھی

اس میں شک نہیں کہ محدثین حدیث کی تحقیق میں سند کے علاوہ الفاظ معانی اور مفہوم پر بھی نقد کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے جمع حدیث اور خارجی نقد وتحقیق میں جس قدر شاندار کارنامے انجام دیئے داخلی نقد وتحقیق میں اسکا ثبوت نہیں ملتا۔ چنانچہ" گولٹ سیہر جیسے مستشرق نے بھی ان کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

---

[۱] ابن حجر فتح الباری۔ بدء الخلق۔ [۲] [۳] ابن قیم زاد المعاد ج ۲ ذکر حدیث من عشق الخ

حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے محدثین نے اسلامی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارہ اندلس سے وسط ایشیا تک، شہر شہر اور گاؤں گاؤں کا پیدل سفر کیا تاکہ دوسروں تک منتقل کرسکیں اس زمانہ میں۔ حدیث جمع کرنے کی اس سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد صورت نہ تھی۔ رحال (بہت سفر کرنے والے) اور جوال (بہت سیر و سیاحت کرنے والے) کے قابل فخر القاب دراصل ان اونچے درجہ کے لوگوں سے کبھی جدا نہیں ہوئے۔ راہ علم کے مسافروں کے لیے طواف الاقالیم (ملکوں کا طواف کرنے والے) نہ کسی استعارہ پر مبنی ہے۔ اور نہ اس میں کسی طرح کا مبالغہ ہے۔ ان لوگوں نے تمام ملکوں کا سفر محض سیر و سیاحت یا تجربہ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کا مقصد صرف حدیث کے جاننے والوں سے ملنا اور ان سے حدیثیں حاصل کرنا تھا۔ حدیث کی طلب و جستجو میں ان کی مثال اس چڑیا کی تھی جو ہر درخت (اس کی ہر شاخ) پر اس کی پتیوں سے غذا حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھتی ہے۔[۱]

ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

" اگر مسلمانوں کے سوانحی ریکارڈ جمع کیے جائیں تو ہمیں پانچ لاکھ ممتاز شخصیتوں کے حالات میسر آجائیں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ میں کوئی "دبا" یا کوئی اہم مقام ایسا نہیں ہے کہ جس میں ان کی نمائندگی مفقود ہو۔

فقہاء کی زیادہ توجہ داخلی نقد حدیث پر تھی

اسی طرح فقہاء نے داخلی نقد و تحقیق پر جس قدر شاندار کارنامہ انجام دیا ہے خارجی نقد و تحقیق میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ طاہر بن صالح الجزائری، کہتے ہیں۔[۲]

---

[۱] طاہر بن صالح بن احمد الجزائری۔ توجیہ النظر الی اصول الاثر۔ مطلب فی امور ینبغی الانتباہ الخ

ان المحدثین قلما یحکمون علی	حدیث پر محدثین اس صورت میں اضطرا
الحدیث بالاضطراب اذا	کا حکم بہت کم لگاتے ہیں جب کہ نفس متن
کان الاختلاف فیہ واقعا	میں اختلاف ہو کیونکہ بحیثیت محدث یہ
فی نفس المتن لان ذالک	ان کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ مجتہدین
لیس من شانهم من جهة	کا کام ہے۔
کونہم محدثین وانما ھو من	
شان المجتهدین	

حضرت اعمشؒ کا قول اس سلسلہ میں زیادہ واضح ہے۔ انھوں نے فقہاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

انتم الاطباء ونحن الصیادلة[1] تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں

یعنی محدثین کا کام اچھی دوائیں جمع کرنا اور فقیہوں کا کام دوا کی جانچ پڑتال کر کے اس کو برمحل منطبق کرنا ہے۔

حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کے تین گروہ | در اصل حدیث سے تعلق رکھنے والوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جو حدیث کی نقل و روایت میں زیادہ مشہور رہے۔

(۲) جو حدیث کی نقد و درایت میں زیادہ مشہور رہے

(۳) جو حدیث کی روایت و درایت دونوں میں مشہور رہے۔

پہلے میں وہ محدثین ہیں جو فقہ میں ممتاز نہ تھے دوسرے میں وہ فقہا ہیں جو حدیث میں

---

[1] ابن عبد البر جامع بیان العلم وفضلہ باب ذکر من ذم الاکثار الحدیث الخ

ممتاز نہ تھے۔ اور تیسرے وہ اہل علم ہیں۔ جو حدیث و فقہ دونوں میں ممتاز تھے۔

کم و بیش ہر گروہ کو درایت سے دلچسپی تھی	ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کو "درایت" سے دلچسپی نہ ہو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ کیونکہ

ان دراستنا لمتن الحدیث	ہمارا متن حدیث کا مطالعہ اور کتب روایت
وعنایتھا بحفظ کتب الروایۃ	کی حفاظت کی طرف انہماک کوئی معنی نہیں
لیست شیئاً ان لم تکن	رکھتے اگر وہ درایتی علم حدیث پر مشتمل
مقترنۃ بعلم الحدیث درایۃ[1]	نہ ہو۔

ہر طبقہ کو درایت سے دلچسپی ہونے ہی کا نتیجہ ہے، کہ حدیث کی شناخت کے لیے (اصول و ضوابط کے علاوہ) علامت مقرر کی گئی ہے جس تک رسائی "درایت" کے بغیر نہیں ہو سکتی، چنانچہ صحیح حدیثوں کے بارے میں ربیع بن خثیم" کا قول ہے۔

لہ ضوء کضوء النہار[2]	اس میں روشنی دن کی روشنی کی طرح ہوتی ہے

غلط حدیثوں کے بارے میں ہے۔

لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل[3]	جس میں تاریکی رات کی تاریکی کی طرح ہوتی ہے۔

ملا علی قاری کہتے ہیں۔

والاحادیث الموضوعۃ	موضوع حدیثوں میں ایک خاص قسم
علیہا ظلمۃ ورکاکۃ	کی تاریکی، سطحیت اور بے ڈھنگا پن

---

[1] ڈاکٹر صبحی صالح۔ علوم الحدیث و مصطلحہ الفصل الاول علم الحدیث روایۃ و درایۃ

[2و3] الحاکم۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۲

مجازمات بالاتکاد تنادی	ہوتا ہے جو اس کے جعلی ہونے کو پکار
علی وضعها واختلاقها[۱]	پکار کر کہتا ہے۔

حدیث کی شناخت کے لیے فنی ذوق کی ضرورت ہے　حدیث میں روشنی اور تاریکی کی پہچان کے لیے "فنی ذوق کی ضرورت ہے جس کے لیے درایت" لازم ہے۔

ابن دقیق العید کہتے ہیں۔

وحاصله یرجع الی انه حصلت	حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لهم لکثرة محاولة الفاظ	کے الفاظ کی کثرت ممارست سے ایک
النبی صلی الله علیه وسلم هیئة	خاص قسم کی نفسی کیفیت حاصل ہوتی اور
نفسانیة وملکة قویة	ایسا مضبوط ملکہ پیدا ہوجاتا ہے جن کے ذریعہ
یعرفون بها مایجوز ان	نبوت کے الفاظ کی معرفت ہوتی ہے کہ وہ
یکون من الفاظ النبوة ومالایجوز[۲]	کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں

علامہ بلقینی نے فنی ذوق کو اس طرح سمجھایا ہے۔

ان انسانا لوخدم انسانا سنین	اگر ایک شخص کسی کی برسوں خدمت
وعرف مایحب ومایکره	کرکے اس کی پسند وناپسند سے واقفیت
فادعی انسان انه کان	حاصل کرے اور پھر کوئی اس کی پسندیدہ
یکره شیئا یعلم ذالك	شے کے بارے میں کہدے کہ وہ اس کو
انه یحبه فبمجرد سماعه	ناپسند کرتا ہے تو سننے کے ساتھ ہی

---

[۱] ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل وکن ننبہ علی امور کلیتہ الخ [۲] علامہ سخاوی فتح المغیث الموضوع۔

بسیا دسوالی شکن پیدا[50] اس کو جھوٹا قرار دیدیگا اور مزید تحقیق کی ضرورت نہ سمجھیگا

داخلی نقد حدیث کے اصول وضوابط

ذیل میں داخلی نقد حدیث کے اصول وضوابط بیان کئے جاتے ہیں جن سے ایک طرف حدیث قبول کرنے کا بلند معیار سامنے آتا ہے اور دوسری طرف حدیث کی اصل دریافت کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ ہر اصول وضابطہ کے ساتھ مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔ تاکہ دوسری روریتوں کو ان پر قیاس کرنا آسان ہو۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں رکاکت پائی جاتی ہو،

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں کسی قسم کی لفظی ومعنوی رکاکت (سطحیت) پائی جائے

زین الدین عراقی کہتے ہیں۔

وربما یعرف بالرکاکۃ — بسا اوقات حدیث کی وضعیت رکاکت سے معلوم کی جاتی ہے[51]

ملا علی قاری کہتے ہیں۔

ومنہا رکاکۃ الفاظ الحدیث وسماجتہا بحیث یمجہا السمع ویدفعہا الطبع[52] — وضعی ہونے کی پہچان حدیث کے الفاظ کی رکاکت اور خرابی ہے جو سننے والے کو ناگوار ہو اور طبیعت اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

رکاکت کی دو قسمیں ہیں۔

---

[50] ڈاکٹر مصطفی سباعی۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ علامات الوضع فی المتن۔

[51] شمس الدین محمد سخاوی۔ فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث۔ الموضوع۔ [52] ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل ونحن ننبہ علی امور کلیۃ

(الف) لفظی اور (ب) معنوی۔

لفظی رکاکت | لفظی رکاکت یہ ہے کہ الفاظ و جملوں میں فصاحت و بلاغت کے معیار اور قواعد عربیہ کی خلاف ورزی ہو جس کو دیکھ کر

یعلم العارف باللسان	عربی زبان کا ماہر جان لے کہ اس
ان مثله لا یصدر عن	قسم کا کلام کسی فصیح اللسان کا نہیں
فصیح اللسان فضلا من	ہو سکتا چہ جائے کہ رسول اللہ کا کلام
ان یکون کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم[۱]	ہو (جو افصح ترین تھے۔)

شاہ عبدالعزیز محدث کہتے ہیں۔

"رکاکت لفظ مثلاً لفظے روایت کند کہ در قواعد عربیہ درست نشود"[۲]

ظاہر ہے کہ لفظی رکاکت کا تعلق ان ہی الفاظ سے ہوگا جن کے بارے میں صراحت ہو کہ یہ رسول اللہ کے الفاظ ہیں، اور ان کے نقل کرنے میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا ہے۔

لکنه فی اللفظ وحده	لفظی رکاکت اس صورت کے ساتھ
مقید بما اذا صرح	مقید ہے کہ جس میں رسول اللہ کے
بانه لفظ الشارع[۳]	الفاظ ہونے کی صراحت ہو۔

معنوی رکاکت | (ب) معنوی رکاکت یہ ہے کہ معنی و مفہوم میں نادانی و کم عقلی

---

[۱] مولانا عبدالحی لکھنوی ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی۔ الموضوع۔ [۲] شاہ عبدالعزیز عجالہ۔ خاتمہ۔ [۳] فتح المغیث۔ الموضوع

کی بات پائی جائے جو شان نبوت سے فروتر ہو۔ اور کلام معیار نبوت سے گر جائے۔

ان یکون مشتملا علی سخافات وسماجات یصان عنها الفضلاء[1]	حدیث کم عقلی و بھونڈے پن پر مشتمل ہو کہ جس سے عقلاء محفوظ رہتے ہیں۔

ابن قیم کہتے ہیں[2]

ویمج معناها للفطن[3]	اور عقلمند کے لیے اس کے معنی ناگوار ہوں۔

شاہ عبد العزیز کہتے ہیں۔

" رکاکت معنی کہ مناسب شان نبوت و وقار نباشد "[4]

رکاکت کے تحت چند موضوع حدیثیں۔ اس اصول کے تحت یہ حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

الدیك الابیض صدیقی وصدیق صدیقی وعدو عدوی[5]	سفید مرغ میرا دوست ہے اور میرے دوست کا دوست ہے اور میرے دشمن کا دشمن ہے۔
اربع لا یشبعن من اربع ارض من مطر وانثی من ذکر وعین من نظر وعالم من علم[6]	چار کو چار سے شکم سیری نہیں ہوتی، (۱) زمین کو بارش سے (۲) عورت کو مرد سے (۳) آنکھ کو دیکھنے سے اور (۴) عالم کو علم سے۔

---

[1] السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن۔ [2] ابن قیم۔ المنار المنیف فصل ۲۳ ومن امارات الحدیث الخ [3] شاہ عبد العزیز عجالہ نافعہ خاتمہ [4] ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر باب المعالی۔ [5] ایضاً باب الہمزہ

لا تاکلوا القرعۃ حتی تذبحوھا[۱]	"کدو" کو ذبح کیے بغیر نہ کھاؤ۔
انما الباذنجان شفاء من کل داء ولا داء فیہ[۲]	بیگن میں ہر بیماری کی شفا ہے اور اور اس میں کوئی بیماری نہیں ہے۔
علیکم بالعدس فانہ مبارک وانہ یرق لہ القلب و یکثر الدمعہ وانہ قد بارک فیہ سبعون نبیاً[۳]	"مسور" کو استعمال کرو اس میں برکت دی گئی ہے اس سے دل نرم ہوتا اور آنسو زیادہ ہوتے ہیں اس کے لیے ستر نبیوں نے دعا کی ہے۔
اکرموا البقر فانھا سیدۃ البھائم ما رفعت طرفھا الی السماء حیاء منذ عبد العجل[۴]	گائے کی عزت کرو وہ جانوروں کی سردار ہے جب بچھڑے کی پرستش کی گئی اسے شرم کی وجہ سے آنکھ آسمان کی طرف نہیں اٹھائی۔
من فارق الدنیا وھو سکران دخل القبر سکران وبعث من قبرہ سکران وامر بہ الی النار سکران الی جبل یقال لہ سکران[۵]	نشہ کی حالت میں جس کی موت ہوئی وہ قبر میں نشہ کی حالت میں داخل ہوگا۔ اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھایا جائیگا اسی حالت میں آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا ایک پہاڑ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ جس کا نام "سکران" ہے۔

---

۱ فتح المغیث الموضوع ۲ محمد طاہر فتنی۔ تذکرۃ الموضوعات باب البقول۔ ۳ ایضاً باب الحبوب من العدس۔ ۴ ایضاً صنوف الحیوان، ۵ ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ و منار کالکتہ ا ک

ان للہ ملکا اسمہ عمارۃ علی فرس من حجارۃ الیاقوت طولہ مد بصرہ یدور فی البلدان ویقف فی الاسواق فینادی الا لیغل کذا وکذا الا لیرخص کذا وکذا۔[1]

اللہ کے ایک فرشتہ کا نام عمارۃ ہے۔ جو یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، منتہائے نظر تک اس کی لمبائی ہے۔ بازاروں میں وہ ٹھہرتا ہے اور پکار کر کہتا ہے کہ اس قدر گرانی کردو اور اس قدر سستا کردو۔

رکاکت سے متعلق درجۂ ذیل میں اصول بھی ہیں۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف مختلف انداز سے ہو،	(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف ان کی طرف

دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم یا آگ کا عذاب انکو نہ ہونے کی خبر ہو۔

ابن قیم کہتے ہیں۔

کل حدیث فیہ مدح حسان الوجوہ والثناء علیھم اوالامر بالنظر الیھم والتماس الحوائج منھم اوان النار لا یمسھم فکذب مختلق وافک مفتری۔[2]

ہر ایسی حدیث جس میں خوبصورت چہرہ کی تعریف و توصیف ہو ان کی طرف دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم ہو یا آگ کا عذاب ان کو نہ ہونے کی خبر دی گئی ہو تو یہ حدیث گڑھا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔

---

[1] ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ و منہار کاکۃ الحدیث [2] ابن قیم۔ المنار المنیف فی الصحیح و الضعیف فصل ۱۴۔

ملا علی قاریؒ نے بھی یہ اصول نقل کیا ہے[1]

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں | اس کے تحت درج ذیل حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

النظر الی الوجه الحسن یجلی البصر[2]	خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھنا نگاہ کو تیز کرتا ہے۔
علیکم بالوجوہ الملاح والحدق السود فان اللہ یستحیی ان یعذب ملیحا بالنار[3]	حسین چہرے اور بڑی سیاہ آنکھ والے ہم نشینی اختیار کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حسین چہرہ کو آگ کا عذاب دینے سے شرماتا ہے۔
النظر الی الوجه الجمیل عبادة[4]	خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔
ثلاثة تزید فی البصر النظر الی الخضرة والماء الجاری والوجه الحسن[5]	تین چیزوں کی طرف دیکھنے سے نگاہ میں تیزی پیدا ہوتی ہے (۱) سبزہ زار (۲) خوبصورت چہرہ (۳) آب رواں

اس اصول کے تحت موضوع قرار پانے والی بہت سی حدیثیں ہیں ان میں دو کی طرف سے زیادہ مدافعت کی جاتی ہے۔

(۱) اذا بعثتم الی بریداً فابعثوہ حسن الوجه والاسم[6]	جب میرے پاس کوئی قاصد بھیجو تو اچھے نام اور خوبصورت چہرہ والے کو بھیجو

اس میں "عمر بن ارشد" ایک راوی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا۔ اور ابن

---

[1] ملا علی قاری۔ موضوعات کبیر فصل وتحمن نمبر ۲ ص ۱۲۵ موضوعات کبیر ص ۱۱۴ مطبع مجدی [illegible] ایضاً [illegible]

حبان نے واضعین حدیث میں شمار کیا ہے غالباً اسی وجہ سے ابن جوزیؒ نے اس حدیث کو موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ لیکن امام غزالی نے خوبصورتی سے سڈول جسم اور متناسب اعضاء مراد لئے ہیں جس کی طرف دیکھنے سے طبیعت ابا نہ کرے، وہ خوبصورتی مراد نہیں ہے جس کو انسان دیکھتا ہے۔[۱]

(۲) اطلبوا الخیر عند حسان الوجوہ[۲] — خوبصورت لوگوں سے خیر و بھلائی (اپنی ضرورت) مانگو۔

بعض روایتوں میں "اطلبوا" کی جگہ "ابتغوا" اور "التمسوا" آیا ہے۔ جلال الدین سیوطی وغیرہ بعض محدثین نے اس کو موضوع قرار نہ دینے پر اصرار کیا ہے۔ لیکن ابن عباس کی وضاحت سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ

کم من رجل قبیح الوجہ قضاء للحوائج — بہت سے بدصورت ضرورتیں پوری کرنے والے ہیں۔

تو انھوں نے جواب دیا۔

انما یعنی حسن الوجہ عند الطلب[۳] — مراد طلب کے وقت خندہ روئی سے پیش آنا ہے (نہ کہ خوبصورت چہرہ)

اس وضاحت کے بعد ظاہری خوبصورتی کے موقع پر اس قسم کی حدیثوں کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں مختلف پیشوں اختیار کرنے والوں کی برائی

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث مین مختلف پیشون اور

۱؎ عبدالفتاح ابوغدہ تعلیق المنار المنیف فصل ۱۲ ص ۶۳ ۲؎ موضوعات کبیر ص ۴۸ ۳؎ العجلونی با کشف

ان کے اختیار کرنے والوں کی برائی بیان کی گئی ہو۔

وحدیث ذم الحاکة و	پارچہ بافوں۔ موچیوں اور سناروں
الاساکفة والصواغین	یا صباح دستکاریوں سے کسی دستکاری
او صنعة من الصنائع	کی برائی کرنے والی حدیث رسول اللہ ﷺ
المباحة کذب علی	جھوٹ ہے، اللہ اور اسکا رسول ﷺ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ	صباح دستکاریوں کی برائی نہیں
لا یذم رسوله الصنائع	کرتا۔
المباحة۔[1]	

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

اکذب الناس الصباغ[2]	رنگریز سب سے زیادہ جھوٹا ہوتا ہے۔
اذا کان یوم القیمة نادی	جب قیامت کے دن پکارنے والا پکاریگا
مناد این خونة اللہ فی	کہ زمین میں اللہ کی خیانت کرنے والے
الارض فیوتی بالنخاسین	کہاں ہیں تو کنجڑوں۔ صرافوں اور
والصیارفة والحاکة[3]	کپڑا بننے والوں کو پیش کیا جائے گا۔
شرار امتی الصاغون	میری امت کے بدترین لوگ دستکار
الصائغون[4]	اور سنار ہیں۔
ویل للصانع من غد وبعد غد[5]	دستکار کے لیے خرابی ہے کل اور کل کے بعد

[1] ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۳ [2] و [3] کنز العمال کتاب البیوع الباب الرابع فی المکاسب المحظورۃ الاکمال۔
[4] ایضاً [5] ایضاً متفرقات المکاسب المحظورۃ

بخلاء امتی الخیاطون [۱] — میری امت کے بخیل درزی ہیں۔

یحشر اللہ الخیاط الخائنین — اللہ تعالےٰ خیانت کرنے والے درزی کو

وعلیہ قمیص ورداء مما خاط — اٹھائیگا تو اس کے اوپر وہ کپڑے قمیص

وخان فیہ [۲] — اور چادریں ہونگی جن میں اس نے خیانت کی ہے۔

شرار الناس التجار والزراع [۳] — تاجر اور کاشتکار بدترین لوگ ہیں۔

ایسی بہت سی روایتیں ہیں جن میں مختلف پیشوں کی برائی۔ پیشہ والوں سے سلام کرنے کی ممانعت۔ ان کی روزی میں برکت نہ ہونے اور ان کی عقل سلب ہو جانے کی خبر اور دوسری خلاف واقعہ باتوں کا ذکر ہے مثلاً

من ادرک منکم زمانا — جو شخص تم میں سے ایسا زمانہ پائے جس میں

تطلب فیہ الحاکۃ العلم — کپڑا بننے والے علم حاصل کریں تو اس سے

فالھرب [۴] — دور بھاگو۔

لا تستشیروا الحاکۃ و — سینگی لگانے والوں اور کپڑا بننے والوں سے

الحاکۃ ولا تسلموا علیھم [۵] — نہ مشورہ کرو اور نہ ان سے سلام کرو،

من اطلع فی طرز حائک خف — جو شخص کپڑا بننے والے کے گھر میں دیکھیگا

دماغہ ومن کلم حائکا — اس کا دماغ ہلکا ہو جائیگا اور جو ان سے

بخر فمہ ومن مشی مع حائک — بات کرے گا اس کا منہ گندہ ہو جائیگا

ارتفع رزقہ عنہ الذین — اور جو ان کے ساتھ چلے گا۔ اس کا رزق

---

۱ محمد طاہر پٹنی تذکرۃ الموضوعات باب اسبابہ وعقودہ المذمومۃ ۲ ایضاً اسبابہ وعقودہ المذمومۃ

۳ ایضاً باب اسبابہ وعقودہ المحمودۃ الخ ۴ تذکرۃ الموضوعات باب اسبابہ وعقودہ المذمومۃ ۵ ایضاً

بالوافی الکعبۃ ونسرق ا — اٹھ جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں
غزل مریم وعمامۃ یحییٰؑ بن — نے کعبہ میں پیشاب کیا تھا۔ حضرت
زکریا وسمکۃ عائشۃ من — مریمؑ کا سوت اور حضرت یحییٰؑ کا عمامہ
من التنور واستدل لتھم — چرایا تھا۔ اور تنور نے حضرت عائشہؓ
مریم علی الطریق فدلوھا — کی مچھلی چرائی تھی اور حضرت مریمؑ نے
علی غیر الطریق[1] — ان سے راستہ پوچھا تو غلط راستہ بتایا تھا۔

اس حدیث میں معلم کا بھی ذکر ہے۔

لا تستشیروا الحاکۃ ولا — کپڑا بننے والوں اور معلموں سے مشورہ
المعلمین فان اللہ سلبھم — نہ طلب کرو اللہ نے ان کی عقلیں سلب
عقولھم ونزع البرکۃ من — کر لی ہیں اور ان کی کمائی سے برکت
کسبھم[2] — اٹھا لی ہے۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں خاندان، قوم اور شہر کی برائی ہو۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث مین خاندان۔ قوم یا شہر کی برائی ہو۔

ابن قیم و ابن جوزی کہتے ہیں۔

احادیث ذم الحبشۃ و — حبشہ اور سوڈان کی برائی سے متعلق
السودان کلھا کذب — حدیثیں سب جھوٹ ہیں، اسی طرح ترک
منھا احادیث ذم الترک — خصی اور غلامون کی برائی سے متعلق
احادیث ذم الخصیان — حدیثیں بھی جھوٹ ہیں۔

واحادیث ذم الممالیک[3]

---

[1] تذکرۃ الموضوعات باب السیاسیہ وعقود المذمومۃ۔ [2] ایضاً [3] المنار المنیف فصل ۲۲ و ۲۵ صفحہ ۱۲۴ کبیر فصل ومنھا احادیث ذم الحبشۃ الخ ومنھا احادیث ذم الترک الخ

العلل المتناهیۃ فی الاحادیث الواهیۃ۔ میں شہروں کی فضیلت و برائی پر ایک مستقل باب ہے۔ جس میں بہت سی موضوع حدیثیں ذکر کی گئی ہیں [۱]

اس کے تحت چند موضوع حدیثیں | مذکورہ اصول کے تحت اس قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں۔

الزیدیۃ مجوس	زیدی اس امت کے مجوسی ہیں۔
هذه الامۃ ان مرضوا	اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو
فلا تعودوهم وان	اور اگر مرجائیں تو ان کے جنازہ میں
ماتوا فلا تشهدوهم [۲]	نہ جاؤ۔
الزنجی اذا شبع زنی و	حبشی جب شکم سیر ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے
اذا جاع سرق [۳]	اور جب بھوکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے۔
اتقوا الیهود والهنود	یہودیوں اور ہندوؤں سے بچو اگرچہ
ولو سبعین بطنا [۴]	ستر پیٹ میں ہوں۔

---

[۱] ابن جوزی العلل المتناهیۃ (مخطوطہ) احادیث فی فضل بلدان و ذم بلدان ص ۹۔

[۲] محمد بن عبد الرحمن السخاوی؛ المقاصد الحسنۃ حرف الزا ر [۳] تذکرۃ الموضوعات باب مدح العرب و العجم ۱۱۶ [۴] ایضاً

فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے

از

جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

فارسی کا وطن اصلی ایران ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک اس شیریں زبان کی نشو نما ہندوستان کی مقدس سرزمین پر بھی ہوئی۔ اس عرصہ میں خاص ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں بھی فارسی کو کئی درجہ زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل رہی۔ ہندوستان میں مغلوں کا عروج فارسی کے عروج کے لئے نیک شگون ثابت ہوا اور مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی فارسی کی ہزار سالہ بنیاد بھی متزلزل ہوگئی۔ اس دور اقتدار میں فارسی زبان نظم و نثر دونوں دولتوں سے مالا مال ہوئی۔ نظم و نثر میں جو شاہکار وجود میں آئے ان میں سے ایک اہم فن تذکرہ نویسی ہے۔ فارسی تذکرے کئی صورتوں میں مرتب کئے گئے۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور صوفیاء، اولیاء، شیوخ کے علاوہ مفسرین، محدثین کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ لیکن ان سبھوں کے مقابلہ میں شعراء کے تذکروں کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تذکرے ایران اور ہندوستان دونوں ہی جگہوں میں لکھے گئے۔ ایرانی تذکروں کی مجموعی تعداد اگرچہ زیادہ ہے، لیکن دسویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری کے

وسطی زمانے تک ہندوستان میں جتنے تذکرے لکھے گئے۔ وہ معیار اور تعداد دونوں اعتبار سے ایرانیوں کے ہم پلہ ہیں۔ خاص طور پر بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری ہندوستان میں تذکرہ نویسی کے شباب کا دور ہے۔

ہندوستان مین فارسی شعراء کے جتنے تذکرے فارسی میں لکھے گئے ان کی مجموعی تعداد کا تعین دشوار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے تذکرے حوادث اور دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ اب جتنے تذکرے موجود ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً اٹھاسی[1] (۸۸) ہے۔ یہ تذکرے مطبوعہ یا مخطوطہ کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان تذکروں کے علاوہ مکمل یا نامکمل شکل میں کچھ ایسے تذکرے بھی وجود میں آئے جو آج نایید ہیں۔ اور کہیں کے ان کے وجود کا سراغ نہیں ملتا، ان کا علم موجودہ تذکروں سے ہوتا ہے جن میں ان تذکروں کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یا کسی دوسری شکل میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ایسے چند تذکروں کا تعارف کرایا جاتا ہے، جو آج نایاب ہیں۔

(۱) **آفتاب عالمتاب** ـــــ یہ تذکرہ ۱۲۶۹ھ کی تالیف ہے لیکن اتنا قریبی عہد کا ہوتے ہوئے بھی آج ناپید ہے۔ اس تذکرہ کا علم مظفر حسین صبا کے تذکرہ روز روشن سے ہوتا ہے۔ صبا نے اپنی تالیف میں آفتاب عالمتاب کے کئی اقتباسات نقل کئے ہیں۔ اور یہ تذکرہ مستقل طور پر روز روشن کا ماخذ رہا ہے۔

آفتاب عالمتاب کا مولف قاضی محمد صادق خاں اختر کلکتہ میں ہوگلی کا باشندہ تھا۔ مقامی انگریز حکام کی نظروں میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بعد میں شاہان اودھ کی

---

[1] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان مولفہ علی رضا نقوی، مطبوعہ تہران؛

ملازمت سے منسلک ہوگیا اور مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگا۔ غازی الدین حیدر نے اس کی بڑی قدر افزائی کی یہاں تک کہ اس کو ملک الشعراء کا خطاب بھی عطا کیا۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے عہد میں بھی اخترؔ کی مقبولیت قائم رہی۔ اور لکھنؤ ہی میں ۱۸۵۸ء میں اخترؔ کی وفات ہوئی۔

اخترؔ اپنے عہد کا نامور عالم و فاضل تھا۔ جملہ علوم و فنون میں دستگاہ حاصل تھی۔ اور ادبیات عجم و عرب پر حاوی تھا۔ اس کی تالیفات میں سے چند قابل ذکر کتابیں یہ ہیں[۱]:

(۱) محامد حیدریہ (۲) لوامع النوادر فی وجوہ المنثور

(۳) آفتاب عالمتاب (۴) حدیقۃ الارشاد

(۵) نثر در مدح یمین الدولہ (۶) تذکرہ آفتاب عالمتاب

(۲) تذکرۂ اشرف ـــــــ اس تذکرہ کا انکشاف بھی روز روشن ہی سے ہوا ہے۔ اشرفؔ دہلوی کا حال تحریر کرتے ہوئے صباؔ نے اس تذکرہ کو ان سے منسوب کیا ہے۔ اشرفؔ دہلی کا رہنے والا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے ہنگامہ (۱۱۷۰ھ) کے بعد لکھنؤ چلا گیا اور شاعروں کا ایک تذکرہ آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ) کے نام منسوب کر کے نواب موصوف کی خدمت میں پیش کیا، تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں اشرفؔ کی وفات ہوئی[۲]۔ اس کے تذکرہ کا آج وجود نہیں۔

(۳) تذکرۂ حیرت ـــــــ یہ تذکرہ بھی بارہویں صدی ہجری کے آخری عہد کا ہے۔ اس کا مولف قیام الدین حیرتؔ ہے۔ اس تذکرہ کا بھی کوئی وجود نہیں، اس کا علم سفینہ ہندی کے مولف بھگوان داس ہندی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انھوں نے حیرتؔ کے

---

[۱] تذکرہ روز روشن و شمع انجمن ۔ [۲] روز روشن ص ۴۸۔

ذکر میں کیا ہے۔ حیرت کا وطن اکبر آباد (آگرہ) تھا اور اس کے باپ کا نام شیخ امان اللہ تھا جو اسی شہر میں کسی ملازمت سے وابستہ تھا۔ حیرت خود معلم پیشہ تھا۔[۱]

(۴) تذکرۂ سرور ـــــ یہ منظوم تذکرہ تیرھویں صدی ہجری میں لکھا گیا۔ اس کا علم بھی روز روشن سے ہوتا ہے۔ مولف روز روشن نے لالہ بیت پرشاد سرور کے حال میں لکھا ہے کہ سرور قوم کا کایستھ اور شاہ جہاں پور (دہلی) کا رہنے والا تھا۔ تاریخ گوئی کا ماہر تھا۔ اور تذکرہ آفتاب عالمتاب مولفہ صادق خاں اختر کی تالیف کے وقت تک زندہ تھا۔ اسی سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔ اس نے شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا جس میں ہر شاعر کے حال اور اس کی تعریف میں ایک رباعی منظوم کی تھی۔[۲]

(۵) تذکرۂ طبیعت ـــــ اس تذکرہ کا مولف شیخ سیف الدین محمد ہے۔ جو اکبر آباد (آگرہ) کے مضافات کا باشندہ تھا۔ اس نے ایک تذکرۂ شعرا مرتب کیا تھا۔ جو آج نایاب ہے۔ بھگوان داس ہندی نے اپنے سفینہ میں طبیعت کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اصلش از اعیان مشایخ الورمن توابع اکبر آباد است، تحصیل علم متداولہ از عبد الجلیل بلگرامی و دیگر فضلای نامی نمودہ، صاحب فضل و کمال گشت، تذکرۃ الاولیاء و تذکرۃ الشعراء نیز تالیف کردہ، در سنہ یکہزار و یکصد و چہل و ہفت در الہ آباد مولف ریاض الشعرا صحبت داشتہ۔"[۳]

افتخار دولت آبادی نے طبیعت کے وفات کی تاریخ ۱۴ محرم ۱۱۵۰ھ ہجری تحریر کی ہے۔[۴]

---

[۱] سفینۂ ہندی ص ۶۰؛ [۲] روز روشن ص ۲۹۰؛ [۳] سفینہ ہندی
[۴] تذکرۂ بے نظیر ص ۸۶؛ نیز ملاحظہ ہو شمع انجمن اور تذکرۂ حسینی؛

(۶) تذکرۂ منیر لاہوری ــــــ منیر لاہوری گیارہویں صدی ہجری کا مشہور شاعر ہے۔ تقریباً سبھی اہم تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن کسی نے اس کو صاحبِ تذکرہ نہیں قرار دیا۔ صرف نواب ابراہیم خلیل نے اپنے تذکرہ (صحف ابراہیم) کے ماخذ میں اس تذکرہ کا نام لیا ہے [۱]

مولانا ابوالبرکات منیر ملا عبدالمجید ملتانی کے لڑکے تھے۔ ان کی پیدائش لاہور میں میں ہوئی۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت کا زمانہ بسر ہوا۔ پہلے سخن سنج" تخلص کرتے تھے بعد میں منیر اختیار کیا۔ منیر نے جہانگیر اور شاہجہاں دونوں حکمرانوں کا دور دیکھا۔ اور اس عہد کے نامور امرار کی صحبت میں زندگی بسر کی۔ منیر کی وفات عین جوانی میں ۱۰۵۴ھ ہجری میں اکبرآباد میں ہوئی اور انھیں لاہور لے جاکر دفن کیا گیا۔[۲]

تذکرۂ منیر کے متعلق غالب کا قیاس یہ ہے کہ ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۵۴ھ کے درمیان اس کی تالیف ہوئی۔[۳]

(۷) تذکرۂ وارستہ ــــــ سیالکوٹی مل وارستہ ہندو شاعروں اور فارسی دانوں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ وارستہ سیالکوٹ کا باشندہ اور نظم و نثر دونوں پر قادر تھا۔ اس کی ایک اہم تصنیف مصطلحات الشعرار فارسی محاورات اور اصطلاحات کی تشریح میں لغت کی حیثیت سے فارسی کی اہم تالیف سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وارستہ کا مقام فارسی ادب کی تاریخ میں زندہ و بلند ہے۔

---

[۱] صحف ابراہیم دیباچہ ؛ [۲] پرشین لٹریچر ان انڈیا ڈیورنگ دی ٹائم آف جہانگیر اینڈ شاہجہان، ص ۱۴۸ ؛ [۳] تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ۱ ص ۳۰۷ ؛

وارستہ کے حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد راغ سیالکوٹی اس کے استاد تھے۔ عمر کا آخری حصہ وارستہ نے ڈیرہ غازی خاں میں بسر کیا۔ اور یہیں ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ وارستہ کی تصنیفات میں کسی دیوان کا وجود نہیں، البتہ اس کی دوسری تالیفات یہ ہیں۔[1]

(۱) مصطلحات الشعراء (۲) مطلع السعدین۔ . . . .

(۳) صفات کائنات یا عجائب وغرائب (۴) جواب شافی یا رجم الشیاطین (۵) جنگ زنگار رنگ

ان تصنیفات میں تذکرہ وارستہ کا کہیں وجود نہیں۔ اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتے ہوئے۔ لکھا ہے کہ "یہ وارستہ کی بیاض ہے جس میں مختلف شعراء کے عمدہ اشعار جمع ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے ۲۰ عنوان قائم ہیں، شعراء کے سوانح کا التزام نہیں کیا گیا ہے" لیکن تذکرہ بے نظیر کے مولف سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی نے آزاد بلگرامی کا حال قلمبند کرتے ہوئے وارستہ کے تذکرہ کا ذکر جس طرح پر کیا ہے وہ اسپرنگر کے بیان سے بالکل مختلف ہے' افتخار لکھتا ہے کہ اس نے وارستہ کا تذکرہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک شخص نے اس تذکرہ کا دیباچہ نقل کر کے اس کے پاس بھیجا تھا۔ افتخار کا بیان ہے کہ وارستہ نے اس تذکرہ میں آزاد بلگرامی پر سخت اعتراضات کیے تھے۔[2]

مولف بے نظیر نے جس طرح اس تذکرہ کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وارستہ کا یہ تذکرہ تنقیدی اور تحقیقی اعتبار سے بڑا اہم رہا ہوگا۔

(۸) جواہر زواہر ـــــــ مولف تذکرۂ اختر تابان نے اپنے ماخذوں کا

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ۲۴۲ تا ۲۴۹؛ [2] اودھ فہرست اسپرنگر ص ۱۴۲؛ [3] تذکرہ بے نظیر ص ۵۰؛

ذکر کرتے ہوئے اس تذکرہ کا نام لیا ہے، اور مشہور شاعر و مورخ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کو اس کا مولف قرار دیا ہے۔[1] تعجب ہے کہ شفیق کی تصنیف میں اس تذکرہ کا ذکر نہیں، اس کی تالیفات میں شاعروں کے دو تذکرے گل رعنا اور شام غریباں کے نام سے موجود ہیں، لیکن جواہر زواہر کے نام کا اس کا کوئی تذکرہ اب موجود نہیں ہے، البتہ اردو شاعروں کا ایک تذکرہ شفیق نے ضرور لکھا ہے جس کا نام چمنستان شعراء ہے، اور انجمن ترقی اردو نے اس کو شائع کیا ہے۔

شفیق کا نام لچھمی نرائن تھا۔ وہ رائے منسا رام کا لڑکا تھا۔ منسا رام نواب نظام الملک آصف جاہ کا پیشکار تھا۔ شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں ہوئی۔ اس نے پہلے صاحب اور آخر میں شفیق تخلص اختیار کیا۔ شیخ عبدالقادر مہربان اس کے ابتدائی استاد تھے اور آخری دور میں اس نے میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے مقتدر عالم اور شاعر سے استفادہ کیا، پھر نواب نظام علی خان کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔ اور نواب صمصام الدولہ کے عہد میں "دولت چند" کے منصب اور لقب سے نوازا گیا۔[2]

شفیق کا سنہ وفات سخنوران بلند فکر (اردو) کے مولف نے ۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ لیکن یہ تاریخ بالکل لغو ہے کیونکہ اس کے ۱۳ یا ۱۴ سال بعد کی شفیق کی تالیف بساط الغنائم موجود ہے۔ گل رعنا مطبوعہ حیدرآباد دکن کے فصل دوم کے سرورق پر ایک تاریخ ۱۲۲۳ھ درج ہے۔ اس کا ماخذ تو معلوم نہیں، مگر اسکی تائید و تصدیق شفیق کے ایک لائق شاگرد غلام مصطفےٰ خان سخن کے دیوان کے ایک قطعہ سے ہوتی ہے۔ شفیق کی وفات پر اس نے ایک قطعہ لکھا ہے جس کے

---

[1] اختر تاباں، ص ۴؛ [2] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۰۹،

ایک شعر سے سال وفات نکلتا ہے۔ ؎

سال رحلت رقم نمود سخن　　"وائے مشاطۂ معانی رفت"[1]

۱۲۲۳ھ

شفیق کثیر التصانیف تھا۔ اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں، اس کی فارسی تصانیف یہ ہیں۔

(۱) حقیقتہائے ہندوستان (۱۲۰۴ھ) (۲) تمنیق شنگرف (۱۲۰۰ھ)
(۳) مآثر آصفی (۱۲۰۸ھ) (۴) مآثر حیدری (　　) (۵) بساط الغنائم (۱۲۱۴ھ)
(۶) خلاصۃ الہند (　　) (۷) حالات حیدر آباد (۱۲۱۴ھ) (۸) چمنستان شعراء (۱۱۷۵ھ) (۹) شام غریباں (۱۱۸۲ھ) (۱۰) گل رعنا۔ (۸۲-۱۱۸۱ھ)

(۹) حدیقۂ ہندی ـــــ بھگوان داس ہندی کا یہ تذکرہ سفینۂ ہندی کے نام سے مقبولیت اور شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ہندی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"سابق در سنہ یکہزار و دویست تذکرہ حدیقۂ ہندی مشتمل بر حالات شعراء ماضی وحال کہ در ہند تولد یا نشو و نما یافتہ اند بعضے قلم شکستہ رقم درآوردہ و بعضی علوم مفیدہ در او مندرج نمودہ، وان حدیقہ ایست جا نفزا و تالیفی است دلکشا۔"[2]

اسی تذکرہ میں ہندی نے اپنے حال کے ضمن میں لکھا ہے :۔

"تذکرۂ حدیقۂ ہندی مشتمل بر حالات شعرائی ماضی وحال کہ در ہندوستان جنت نشان تولد یا نشو و نما یافتہ اند از ابتدائی ظہور اسلام تا سنہ یک ہزار و دویست ہجری، تالیف نمودہ، چنانچہ آن تالیف ہم تذکرہ ہم نام نخست"[3]

---

[1] رسالہ آج کل اپریل ۱۹۶۲ء میں تمکین شوکت صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو۔ [2] سفینۂ ہندی دیباچہ [3] ایضاً ص ۲۴۲؛

ان دونوں تحریروں سے ظاہر ہے کہ ہندی نے ایک اور تذکرہ "حدیقۂ ہندی" کے نام سے ۱۲۱۰ھ میں تالیف کیا تھا۔ لیکن اس تذکرہ کا آج کوئی وجود نہیں۔

بھگوان داس ذلپت داس بن ہربنس رائے کا لڑکا تھا۔ دلپت داس نواب برہان الملک بہادر (متوفی ۱۱۵۱ھ) کے عہد سے نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹ھ-۱۲۱۲ھ) کے آخری زمانہ تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔[1]

بھگوان داس کی ولادت ۱۱۶۳ھ میں صید پور (سیلک) کے مقام پر اپنے نانیہال میں ہوئی، دو سال بعد وہ باپ کے پاس لے جایا گیا۔ اور باپ ہی کے دامن تربیت میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جوانی ہی میں "میرنجر" کے عہدہ پر فائز ہوا۔ الٰہ آباد کا پورا صوبہ نواب مختار الدولہ کی طرف سے اس کے ماتحت تھا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں راجا ندھی سنگھ بہادر کا دیوان مقرر ہوا اور پانصدی منصب ملا۔ راجا مذکور کی موت کے بعد بیرا چند بہادر کا مصاحب ہوا پھر اس کی وفات کے بعد مہاراجا ٹکیت رائے نرمندر (متوفی ۱۲۱۵ھ) کا مصاحب ہوا۔ آخر میں ہندی راجا جے سنگھ رائے کی ملازمت میں رہا۔ اس نے ہندی کی بڑی قدر دانی کی۔[2]
ایک زمانہ میں ہندی سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں (نائب آصف الدولہ) کا دیوان بھی رہا تھا۔[3]

انتظامی اور سیاسی مشغولیتوں کے باوجود بھگوان داس نے علم و ادب سے اپنا تعلق قائم رکھا، آغاز شباب ہی سے شاعری شروع کر دی تھی ابتدا میں بسمل پھر

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۴۲؛ [2] ایضاً ص ۴۳-۲۴۲؛ [3] انگریزی دیباچہ سفینۂ ہندی مرتبہ پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی مدظلہ؛

ہندی تخلص اختیار کیا۔ شاعری میں فاخر مکین کی شاگردی میں تھا۔

بھگوان داس کے آخری دور کا حال معلوم نہیں حتیٰ کہ سال وفات بھی نامعلوم ہے۔ اس کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے: [1]

(۱) مثنوی سلسلۃ المحبت، (سلسلۃ الذہب جامی اور قران السعدین خسرو کے وزن میں) (۲) مثنوی مظہر الانوار (مخزن الاسرار نظامی کے وزن میں) (۳) مثنوی بھاگوت مسمی بہرضیا (جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کے وزن میں) (۴) دو دیوان فارسی رشوقیہ اور ذوقیہ کے ناموں سے، (۵) تذکرۂ حدیقۂ ہندی (زیر بحث)، (۶) رسالہ سوانح النبوۃ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوازدہ اماموں کے سوانح پاک)، (۷) تذکرۂ سفینۂ ہندی (فارسی شعراء کا تذکرہ جو ۱۲۱۹ھ میں لکھا گیا۔)

(۱۰) حیات الشعراء ـــــ اس تذکرہ کا مولف محمد علی خاں کشمیری ہے، اس کا تخلص متینؔ تھا۔ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اس نے ایک تذکرہ تالیف کیا تھا۔ جس کا آج کوئی وجود نہیں۔ تذکرۂ بے نظیر کے مولف نے متین کشمیری کے حال میں اس تذکرہ کو متینؔ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مولف بے نظیر کے بیان کے مطابق حیات الشعراء میں بہادر شاہ اول کے زمانہ (۱۱۱۸ھ ـ ۱۱۲۴ھ) سے لیکر محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ھ ـ ۱۱۶۱ھ) تک کے فارسی شعراء کا حال تھا۔ اس تذکرہ کو متینؔ نے اپنے محسن اور مخدوم اغز خاں ترک جنگ تخلص دیدہ کے نام سے منسوب کیا تھا۔ تذکرۂ بے نظیر کی عبارت یہ ہے:۔

"متین محمد علی خان با اغز خان ترک جنگ دیدہ" تخلص بسر می برد۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] ان تمام کتابوں سے صرف آخری دستیاب ہے، دوسرے کا کوئی وجود باقی نہیں۔

... بنام او تذکرۃ الشعرائی مسمی بہ حیات الشعرا، تالیف کردہ وصاحب طبعان عہد خلد منزل بہادر شاہ را تا عصر فردوس آرام گاہ محمد شاہ بقید تحریر درآوردہ "[1]

عبدالحکیم لاہوری مولف تذکرۂ مردم دیدہ نے بھی شاہ آفریںؔ لاہوری کے حال میں متینؔ کے تذکرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" محمد علی خان متین پسر حسام الدین متوطن کشمیر در تذکرۂ خود این بیت شاہ آفریں را باندک تغیر مطلع بنام خویش نوشتہ ۔

در مشربے کہ مائیم آلودہ دامنی نیست
ساغر بکف چو تصویر، رندیم و پارسائیم

حال آنکہ این فقیر سی سال پیش ازین، بیت مذکورہ را در دیوان مرحوم دیدہ و در سخن سنجان لاہور بیت مذکور بنام شاہ مرحوم اشتہار دارد"[2]

متینؔ اپنے عہد کے اچھے شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور کشمیر کے فارسی شعرا میں اس کا درجہ ممتاز تھا، اکثر تذکروں میں اس کا ذکر ہے۔ متینؔ دہلی میں اغرخان ترک[3] کے ساتھ رہتا تھا۔ جو محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ اور جنگ دیدہ تخلص کرتا تھا۔

(باقی)

شعرالہند۔ حصہ اوّل

قدماء کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل

[1] تذکرۂ بے نظیر ص ۱۱۳ ؛ [2] مردم دیدہ ص ۳۳ ؛ [3] اس کا مفصل حال مآثرالامرا ج ۱ ص ۲۷۴، اور مردم دیدہ، ص ۱۲۳ میں ملاحظہ ہو ؛

مولوی عبدالحق

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب، دہلی یونیورسٹی

جس وقت میں نے ہوش کی آنکھ کھولی ہے، مولوی عبدالحق صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ سرسید کے حاشیہ نشیں۔ حالی کے جانشین، اردو کے عاشقِ صادق، جامعہ عثمانیہ کے بانی خاص، دارالترجمہ کے روحِ رواں، عثمانیہ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر اعلیٰ اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ مہاتما گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تارا چند اور سر کیلاش ناتھ ہاکسر سے ان کے بے تکلفانہ مراسم تھے، انھوں نے اُردو کی جو گراں قدر خدمات انجام دی تھیں، ان کا میرے دل پر بڑا گہرا نقش تھا۔ جی چاہتا تھا، کہ ہر معاملہ میں ان کی نقل کر دوں۔ ان کی سی عبارت لکھوں۔ اس میں وہی سادگی ہو۔ وہی پُرکاری ہو۔ میرا خط بالکل ان کا سا ہو جائے۔ وہی دائرے ہوں، وہی کشش ہو۔ جس طرح اُن کے دل میں مقصد کی لگن ہے ایسا ہی سوزِ آرزو میرے دل میں بھی پیدا ہو جائے۔ کام کے جو نمونے انھوں نے چھوڑے ہیں، ان کی پیروی میں بھی کر سکوں۔ رسالہ اُردو میں ۱۹۳۸ء سے مضامین لکھتا رہتا تھا۔ اس لیے اُن سے قلمی ملاقات بھی تھی لیکن ابھی تک سامنے

گفتگو کی نوبت نہیں آئی تھی۔

اس ملاقات کی تقریب بڑی دل چسپ ہے۔ کان پور میں ایک بڑے مالدار تاجر تھے، حافظ محمد صدیق —— ان سے میرے خصوصی مراسم تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی فرماتے "فاروقی صاحب میں شاہ جہاں ہوں اور میرا یہ لڑکا اورنگ زیب ہے۔ اس نے مجھے قید میں ڈال دیا ہے، لیکن میں بھی اسے ایک پیسہ نہیں دونگا۔ عاق کردونگا، محروم الارث کر دونگا۔ ساری دولت فقیروں میں بانٹ دونگا۔ وصیت کرجاؤنگا کہ اس بدبخت کو ایک حبہ بھی نہ ملے۔"

پہلے پہل تو میں اسے مذاق سمجھتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ واقعی سنجیدہ ہیں اور یہ چاک دامن کسی طرح رفو نہیں ہو سکتا تو میں نے اس کی کوشش کی کہ وہ یہ گرانقدر رقم قومی اداروں کو، بہ طور عطیہ کے دے دیں۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے دہلی تو آگئی تھی۔ لیکن اس کی مالی حالت لائق رشک نہیں تھی۔ مولوی صاحب نے ایثار کرکے اپنا سارا اندوختہ اور پراوی ڈنٹ فنڈ کا سارا روپیہ انجمن کو دیدیا تھا۔ اس لیے بھی جی چاہتا تھا کہ حافظ محمد صدیق انجمن کو ایک بڑا عطیہ دے دیں۔ بالآخر اس میں کامیابی ہوئی اور پچاس ہزار کا چک ہاتھ میں آگیا۔ لیکن یقین کیجیے کہ اس سعی اور پیروی میں میری جوتیاں ٹوٹ گئیں اور رگ رگ سے لہو ٹپکنے لگا۔ میں نے مولوی صاحب کو پوری روداد لکھی اور گزارش کی کہ وہ تشریف لاکر حلیم کالج کانپور کے جلسے میں چک لے لیں۔ مولوی صاحب نے لکھا: وہ بلاشبہ شاہ جہاں ہے لیکن قسم ہے خدا کی کہ آپ بھی سعداللہ خاں سے کم نہیں۔ بڑا کام کیا آپ نے۔"

میں مولوی صاحب کو لینے اسٹیشن گیا۔ ان کی تصویر بارہا دیکھی تھی۔ فوراً

پہچان لیا۔ اور قیام گاہ پر لے آیا۔ لیکن اب مولوی صاحب ہیں کہ مجھ سے خفا ہیں۔ بڑے ناراض۔ میاں میں تو تمہارے خطوں سے اور مضامین سے یہ سمجھا تھا، کہ تم ۵۵ یا ۶۰ برس کے آدمی ہوگے۔ تم نکلے بالکل نوجوان۔ نوعمر۔ لونڈے بڑا دھوکا دیا تم نے۔"

مولوی صاحب سے پہلی دفعہ ملا تو یہ معلوم ہوا کہ صدیوں کا علم و ادب اس کی بے شمار یادیں اور ہزاروں عاشقوں کا اضطراب ان کی شخصیت میں سموگیا ہے۔ وہ وہ محبت سے گالیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن عجیب تاثیر تھی ان کی گالیوں میں۔ میں کبھی ان کی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔

اس ملاقات کے بعد مولوی صاحب سے بڑی خصوصیت پیدا ہوگئی۔ اور انھوں نے بھی وہ سلوک کیا جو آبا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے مخطوطات تک مجھے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے۔ بڑا اصرار کرکے رسالہ اردو کے لیے مضامین لکھوائے۔ نئی کتابوں پر تبصرے کی فرمائش کی جو "خ۔ ف" کے نام سے رسالہ اُردو میں شائع ہوئے۔ بڑا رنج انھیں کہ میں کوردو کانپور میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ کہنے لگے "رجب علی بیگ سرور بھی یہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ آخر یہاں سے نکلتے کیوں نہیں؟" ۱۹۴۵ء میں انھوں نے مجھے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی ڈائرکٹری پیش کی۔ فیضی صاحب اور بدل الدین صاحب نے طرح طرح سے لکھا اور سمجھایا لیکن بمبئی میں بڑے پیمانے پر فسادات ہو رہے تھے۔ میری والدہ، اللہ بخشے، کسی طرح اتنی دور پرائیوٹ نوکری پر بھیجنے کے لیے آمادہ نہ ہوئیں۔ اس کے بعد لکھنؤ اور ڈھاکہ کی ریڈری کے لیے اصرار کیا۔ لیکن وہاں کے لیے بھی قدم نہ اٹھے۔ بالآخر ۱۹۴۶ء میں

اینگلو عربک کالج دہلی میں اردو کے لکچرر کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق اس وقت دہلی یونیورسٹی میں اُردو کے اعزازی پروفیسر تھے۔ اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دریا گنج میں رہتے تھے۔ انتخابی کمیٹی میں ڈاکٹر عبدالحق، اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بحیثیت ڈین شامل تھے۔ یہ قرعۂ فال میرے نام پڑا۔ اس وقت سے کہ ۲۰ برس ہو گئے ہیں۔ دلی کا روڑا ہوں۔ اور یہ دلی کی گلیاں کسی طرح سے نہیں چھٹتیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں میں پُرانے قلعہ میں تھا اور مولوی صاحب بھوپال میں شعیب قریشی صاحب کے پاس تھے۔ بھوپال سے وہ برابر میری بابت حال پوچھتے رہے اور بڑا شدید اصرار کیا کہ "میرے ساتھ کراچی چلیے"۔

میں نے عرض کیا "مولوی صاحب آپ بھی مت جائیے"۔

کہنے لگے "یہاں لوگ مجھے مار ڈالیں گے"۔

میں نے عرض کیا "تو اُردو بچ جائے گی۔ گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے"

مولوی صاحب بہت بدخط ہوئے: "بڑے گدھے ہو۔ ناسمجھ ہو۔ ٹھہر جاؤ حقیقت معلوم ہوگی"۔ میں برابر یہ اصرار کرتا رہا کہ مولوی صاحب کہیں اور اجازت ہو۔ "اچھا، آپ کے حضور میں تو حق گوئی اور بیباکی کی اجازت ضرور ہونا چاہیے"۔

مولوی صاحب کراچی چلے گئے۔ لیکن ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو پھر دہلی آئے۔ وہ اگلے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتے تھے۔ جن سے ان کی خوب یاد اللہ تھی۔ لیکن انھوں نے برت شروع کر دیا تھا۔ اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔

اس مرتبہ مولوی صاحب نے ۵ جنوری ۱۹۶۱ء کو ایک جلسہ بھی ہمدردان اُردو کا علی گڑھ کے اولڈ بوائز لاج میں منعقد کیا۔ اس میں میں بھی تھا۔ ذاکر صاحب بھی۔ عابد صاحب بھی۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ "اس جلسے میں جو لوگ تھے۔ وہ ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ وہ انجمن ترقی اُردو کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے تھے یا وہ صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔"

۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو مولوی صاحب پھر کراچی سے دہلی تشریف لائے اور اس مرتبہ خلیق منزل چوڑی والان دہلی میں قیام فرمایا۔ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب بھی جو بعد میں مشرقی بنگال کے گورنر ہو گئے تھے، ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے مجھے حکم ہوا کہ فوراً آکر ملوں۔ میں فوراً حاضر نہ ہو سکا۔ میری بچی عذیرہ۔ مرض الموت میں گرفتار تھی۔ جب اس کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوا۔ تو حاضر خدمت ہوا۔ مولوی صاحب نے دروازے سے میری ٹانگ لی: "حضرت یہ اچھی تقسیم ہوئی کہ دل بھی بٹ گئے، مراسم تعلقات سب سینت کے رکھ دیئے۔ اتنے دن کے بعد آئے ہیں آپ۔ شرم نہیں تمھارے نام کی۔"

میں نے معذرت چاہی اور سبب بتلایا۔

فرمایا: "یہ تو خفگی کی تمہید تھی۔ مجھے اصل ناگواری آپ کے اُن خیالات سے ہے۔ جو آپ نے نقوش لاہور کے تازہ شمارے میں ظاہر فرمائے ہیں میں پوچھتا ہوں دماغ سڑ گیا ہے تمھارا" اس کے بعد انھوں نے نقوش کا رسالہ دراز سے نکال کر سامنے ڈال دیا۔ اور عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا دیکھیے صاحب کیا جھک مارا ہے۔ انھوں نے۔"

صدیقی صاحب نے اسے قرأت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ میں نے اُردو کے مستقبل کے بارے میں لکھا تھا کہ "میں پاکستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں زیادہ خوش امید نہیں ہوں۔ اس لیے کہ وہاں کا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں مائیں اپنے بچوں کو اُردو میں لوریاں دیتی ہوں۔ وہاں بنگال میں بنگالی، پنجاب میں پنجابی، سندھ میں سندھی بلوچستان میں بلوچی اور سرحد میں پشتو بولی جاتی ہے۔ ہندوستان اُردو کا گھر ہے۔ یہ بعض دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح گنگا جمنا کے دوآب میں پلی اور بڑھی ہے۔ اگر یہاں کی اُردو آبادی اسے قائم رکھنا چاہتی ہے۔ تو وہ قائم رہے گی۔ اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

یہ بات عبدالرحمن صدیقی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب دونوں کو بہت ناگوار گزری، دونوں سبّ و شتم میں کمال رکھتے تھے۔ دونوں بہت دیر تک مطعون کرتے رہے۔ جب لے بہت بڑھ گئی تو میں نے بڑے ادب سے عرض کیا: "آپ دونوں میرے بزرگ ہیں۔ میں بجز اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ یہ لسانیات کا مسئلہ ہے۔ زور سے بولنے سے طے نہیں ہوسکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مولوی صاحب ناراض ہوگئے۔ ان کو اُردو سے اتنی محبت تھی کہ اس پر وہ ہر محبت کو قربان کردینے کے لیے تیار تھے۔ خط و کتابت بند۔ مراسم تہنیت و تعزیت ختم۔ مجھے ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا۔ میر تقی میر چھپی۔ کوئی خط نہیں البتہ رسالہ اُردو میں ریویو کیا۔ اور اُس میں کتاب کی خوب خوب تعریف کی۔

غالباً ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ مولوی صاحب ڈھاکہ گئے اور انھوں نے وہاں جاکر اُردو کی اشاعت کے سارے جتن کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی

آخر مایوس ہو کر کراچی چلے آئے اور مجھے برسوں کے بعد خط لکھا:

"تم سے خلیق منزل میں پاکستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور میں بہت خفا ہوا تھا۔ تمھارے خیالات سے لیکن اتنے عرصہ ڈھاکہ میں رہتے اور پاکستان میں کام کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تم صحیح کہتے تھے۔ اور میں غلطی پر تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔"

یہ مولوی صاحب کی بڑائی تھی کہ انھوں نے ایک بچہ کی بات کو اتنی اہمیت دی اور مجھ سے معذرت ضروری سمجھی۔

اس خط کو پڑھ کر مجھے کون راد کی وہ کہانی یاد آگئی۔ جو اس نے ایک مہاجر سلاو کسان کی لکھی ہے۔ وہ گھر کی پریشانیوں سے اکتا کر ہجرت اختیار کرتا ہے۔ اور کنٹ (Kent) کے ایک گاؤں میں رہنے لگتا ہے۔ یہاں کی زبان مختلف، آب و ہوا مختلف، ماحول مختلف۔ ایک سیدھی سادی لڑکی اس پر ترس کھاتی ہے۔ اشاروں میں باتیں کرتی ہے اور کبھی کبھی روٹی کپڑا بھی دے جاتی ہے۔ بالآخر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ بھی ہو جاتا ہے۔ ایک روز یہ کسان بیمار پڑتا ہے، اور سرسام کی حالت میں اپنی مادری زبان میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ اُس وقت اس لڑکی پر ایسی شدید اجنبیت کا احساس طاری ہوتا ہے کہ وہ بچے اور شوہر دونوں کو یوں ہی چھوڑ کر فوراً گھر سے نکل جاتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں میں یورپ جا رہا تھا۔ کراچی ہو کر گیا تاکہ مولوی صاحب سے نیاز حاصل ہو سکے۔ بڑے بجھے بجھے سے نظر آئے۔ آواز میں وہ کڑک نہیں تھی۔ میں نے پوچھا مولوی صاحب خیر تو ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ انجمن کا کیا حال ہے؟ دونوں مترادف

الفاظ ہیں۔ لیکن آپ الگ الگ بتا دیجیے۔"

کہنے لگے: "ان حرام زادوں نے حاتم کی قبر پہ لات مار کے صرف ۱۵ ہزار روپیے سالانہ انجمن کے لیے منظور کیے ہیں ــــ میں ہندوستان میں مہابھارت کی لڑائی لڑتا رہا اور بھیم اور ارجن کی طرح لڑا لیکن میاں، اپنوں کے ساتھ نہیں لڑا جاتا ؏

طاقت کہ جس سے تابِ جفا تھی سو ہو چکی"

مولوی صاحب بڑے ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ "دودھ پینے سے دماغ بچوں کا سا ہو جاتا ہے۔ گوشت کھانے سے درندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ترکاری سے آدمی انسان سے مویشی بن جاتا ہے۔ پھل اصل چیز ہے۔ صرف پھل کھانا چاہیے۔"

لیکن آخر زمانہ میں ان کا جو حال تھا۔ اس کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بیوی بچہ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ دولت آشنا سب منحرف، نوکر چاکر دشمن۔ بعض تو پہچاننے کے بھی روادار نہیں تھے۔ اور صرف لوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے۔ آخر زمانہ میں وہ مایوس ہو کر موت کی دعا مانگنے لگے تھے۔ اس سے ان کی مایوسی کا اندازہ کیجیے۔ مالی حالت سقیم ہو گئی تھی موٹر تک بیچنے کے لیے تیار تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا حال یہ ہے کہ میں نے سالن وغیرہ کھانا چھوڑ دیا ہے۔ کیری کی چٹنی پسوا لیتا ہوں اور دو توس چٹنی سے کھا لیتا ہوں اور ایک اُبلا ہوا آلو۔ نمک مرچ سے اللہ اللہ خیر سلّا۔"

بالآخر ۱۸ برس کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو یہ بابائے اردو، یہ حسرتی موت، یہ مردِ قلندر، قیدِ دنیا۔ اور بندِ اردو دونوں سے آزاد ہو گیا ــــ وہ شخص جو حیدرآباد میں

روزگرانڈ ٹرنک اکپریس کو کہ وہ دہلی سے آتی تھی، گھنٹوں حسرت سے دیکھتا رہتا تھا اب دہلی سے دور، بہت دور کراچی میں آسودۂ خاک ہے۔ کراچی کی سرزمین سے اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ

ایں نورِ چشم ما است کہ در بر کشیدۂ

مولوی عبدالحق فرد نہیں، انجمن تھے۔ ایک عہد۔ ایک ادارہ۔ اگر ان کے کام سے قطع نظر کر لیا جائے تو اُردو تہی دامن رہ جائے گی۔ اس کی تجدید اور ارتقا کے صفحے سادے نظر آئیں گے۔ ان کی کوشش سے انجمن ترقی اُردو کی ۲۷۵ کتابیں شائع ہوئیں جو سب بلا استثنا اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے اُردو کی عمر بڑھادی۔ اور اس کی تاریخ میں دوسو سال کا اضافہ کیا۔ لسانیات، تنقید اور تحقیق کے نئے اسالیب قائم کیے۔ دکھنیات کا ذوق پیدا کیا۔ نادر مخطوطات شائع کیے۔ سائنس عمرانیات ادب۔ فلسفہ۔ معاشیات، تاریخ اور علوم جدیدہ پر نئی کتابیں لکھوائیں۔ ترجمے کروائے حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے روحِ رواں وہی تھے۔ ان ہی کی کوشش سے مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سر راس مسعود، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا وحید الدین سلیم، سید سلیمان ندوی، اور مولانا علی حیدر نظم طباطبائی حیدرآباد کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوئے اور انھوں نے اردو کی عظیم بالشان خدمات انجام دیں۔ لغت، املا، ٹائپ، اصطلاحات اور قواعد کے میدان میں وہ کام انجام دیئے کہ اب تک ہم اس پر اضافہ نہیں کر سکے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی سادگی اور پُرکاری ہے اور یہ طرزِ حالی سے زیادہ شگفتہ اور دلکش ہے۔ ان کے خاکے، مقدمے اور ان کے خطوط جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے

خاصہ کی چیز ہیں۔ صرف ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے خود بھی یہ دشوار گزار منزلیں سینے کے بل طے کی تھیں :

"زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ ان کے افراد میں حسد کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو کھاتا پیتا اور خوش حال یا ممتاز نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کرکے نام حاصل کرے، خواہ وہ کام انھی کے فائدہ کا کیوں نہ ہو۔"

مولوی عبدالحق نے باوجود مخالفتوں کے اُردو کی گزرگاہوں کو روشن کیا۔ ایک نئی نسل کی تربیت کی اس کے دل میں اُردو کے ذوق کی چنگاری اور کام کا سلیقہ پیدا کیا۔ ان کی عظمتِ کردار۔ ان کی قطب نما کی سوئی کی سی وفاداری، اردو سے عشق اور مقصد کی لگن۔ وہ اعلیٰ خوبیاں ہیں۔ جو ان کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کشمیر سلاطین کے عہد میں

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو ہر دور میں علمی، وتمدنی، وسیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اسی لالہ وگل کی سرزمین میں مغل فرمان رواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے۔ اسی دور کے کشمیر کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی اور مذہبی تاریخ۔ ضخامت: ۴۷۵ صفحے قیمت :- ۱۲ روپئے۔

خواجہ عزیزالدین عزیز کی شاعری

از۔ جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

(۴)

خواجہ عزیز نے امرا کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں۔ اُن میں سے دو بہت اہم اور قابل ذکر ہیں۔ پہلا قصیدہ در مدح آصف جاہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر والئی ریاست حیدرآباد دکن ہے۔ اور دوسرا قصیدہ در مدح سلطان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ہے۔ ان بادشاہوں کی جود وسخا سے کون واقف نہیں ہے۔ اگر خواجہ عزیز ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو ان کی آرزو سے سوا دولت ان کے ہاتھ لگتی۔ لیکن خواجہ صاحب کی طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کریں۔ وہ عام شعرا کی طرح سلاطین وامرا کی جھوٹی تعریفیں کر کے صلہ اور انعام کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔ اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور اپنی خودی کو برقرار رکھا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں خواجہ صاحب کے اس قصیدہ میں ملتی ہے۔ جو انھوں نے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی شان میں لکھا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

قریب ہست کہ آئی دجشن گاہ شود خرابہ کہ ز ہجر تو ہست ماتم گاہ

منم کہ بر درمن صد سلام عجز آلود رسد نہ خط تمردان چہ شامگہ چہ پگاہ

نہ وصف تست کہ شعرم رسید تا شعری نہ مدح تست کہ نامم فتاد در افواہ

عزیز بس کن و تن زن کہ از مدائح شہ — ز ہند صیت کلامت رسید تا بہراہ
ہمیشہ تا کہ منقش بود صحیفۂ باغ — ہمارہ تا کہ مجدر نماید این خرگاہ
دل محبش خندان چو غنچۂ گل باد — تن عدو لیش پیچان چو صورت دیباہ

اسی طرح سے خواجہ صاحب نے میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے ان کے بہترین قصائد میں ہے۔ کچھ اشعار اس کے بھی "مشتے نمونہ از خروارے" پیش خدمت ہیں

طرب باید بکن شکر و سپاس داور منان — بجکمش یونس از ماہی رہا شد سف از احزان
خود از احکام حق آمد موسیٰ گر تراب آن آب — ز لطف وے بابراہیم گہ گلزار شد نیران
بامر اللہ بگو آصف ز رنج جان نجات او دید — بحمد اللہ بیا کہ رشتہ نوح از دہانۂ طوفان
بہ بے باکی بسے گویا کہ گر دست سوی شہ — بگلشن دیدۂ عبہر ازیں ہر دم بود حیران
چمن گر روزگار دین گل برایں گل آید آن طبیب — زمیں باشد فلک ماہ او جہان تن آمد آن مہ جان
ہم او شاہی است داد آموز دہم ماہے سما آرا — ہم او مہرے ست دل افروز دہم او سایۂ یزدان
بحمد اللہ ازیں موسم کہ آمد جشن صحت ہم — دکن را نو شدہ دیگر مہیا از طرب سامان
شدہ صحت با عاصل تو گوئی جلوہ آن دارد — بر آمد از سحاب ابر جہاں آرا مہ تابان
جہانے باد داد او دراسرا سر ہیں بالطافش — بود ہر یک ز رنج ایمن شدہ ما نجود او شادان
علوِ آستانش ہم سپہر آمد بجاہ و داد — بطوف در گہش ہر دم دوداں گنبد گردان
ہم او ہر چہ در آصف عزیزش مادح آصف — عزیز ار ہست قاآنی و آصف آمدہ قاآن
محبوب خدا اہم نام شے ہم بہر روے — مبارک صحت این باد از بہر آصف گیہاں

اس قصیدہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شعر سے چار چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر مشکل سے اس

اس صنعت سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"از ہر شعر چہار تاریخ برمی آید یکے از مصرع اول و دوم از مصرع ثانی و سیوم

از حروف منقوطہ ہر دو مصرعہ و چہارم از حروف غیر منقوطہ ہر دو مصرع"[1]

قصیدۂ مذکورہ کے ہر شعر سے ۱۳۰۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔ اسی طرح قصیدہ اورنگ حضوری کے ہر مصرعہ سے جو نظام کی مسند نشینی کی تقریب میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ جلوس ۱۳۰۱ھ نکلتی ہے۔

ان قصائد کے علاوہ دیوان میں متعدد قصائد ہیں اور بقول شروانی صاحب "قاآنی کے طرز کا قصائد میں۔ خوب اتباع کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو"[2]

دوشم بگوش آمدہ کاے بندۂ خدا — از بند خود برآ ز در بندگی درآ

دستے فراز کن کہ نیازت شود قبول — صبحے نیاز کن کہ نمازت شود ادا

بردار سر زپیش و زجیب فلک برآر — بگذار پا بخویش و بہ عرش بریں برآ

کبر تو خیر است چرا نشکنی زہم — نفسے تو کافر است چرا نفگنی زپا

طوفے بکوئے عشق کہ ہم کعبہ ہم حرم — سعئ زروئے صدق کہ ہم مروہ ہم صفا

خواجہ عزیز۔ اور۔ حافظ شیرازی

خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا فارسی کے مشہور اساتذہ کا نام آیا ہے۔ وہ حافظ شیرازی سے خاص طور سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے ہیں۔ ان کی پیروی کو اپنے لئے قابل فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دادہ شمس الدین حافظ این فروغت ای عزیز

ورنہ این تاثیر دولت از کدامی کوکب است

---

[1] دیوان خواجہ عزیز ص ۱۱۵ [2] مقدمہ دیوان عزیز ص ۱۲۔

حدیث حافظ شیراز و گفتہ ہائے عزیز

۲- ہماں حکایت گور و دوز و بوریا باف ہست

کلک حافظ و ہم نیز ز شکر کردہ عزیز

۳- ثمرے تازہ ازین شاخ نباتم دادند

شہد و شکر عزیز بشعرم نمی رسید

۴- تا ہر طریق حافظ شیرین زبان شدم

تا ز حافظ بکفت سلسلہ ہست عزیز

۵- دست در حلقۂ آں زلف دوتا نتواں کرد

خواجہ صاحب کی بعض غزلیں حافظ کی ہم ردیف، ہم قافیہ، بلکہ بہت سے اشعار ہم معنی یا قریب المعنیٰ ہیں اُن میں تخیل ضرور حافظ سے لیا گیا ہے۔ لیکن الفاظ کا جامہ خود خواجہ صاحب نے پہنایا ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے۔ کہ بعض شاعر کسی متقدم شاعر کے کسی شعر کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کے تخیل کو زیادہ حسین پیکر میں پیش کرے اور وہ بغیر سرقہ کی نیت کے متقدم شاعر کے شعر کے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش میں کبھی کامیاب ہوتا ہے۔ اور کبھی ناکام رہتا ہے۔

اب ہم اس جملۂ معترضہ کے بعد اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔ اور خواجہ عزیز و حافظ شیرازی کے چند ہم معنیٰ اشعار پیش کرتے ہیں۔

فغاں زاں شوخ شر انگیز شیریں کار بے پروا

خواجہ عزیز- کہ می خواہد بکام خود زبان دادخواہاں را

حافظ شیرازی

فغاں کیں لولیانِ شوخ شیریں کار شہر آشوب
چناں بروند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

خواجہ عزیز

خدا را زود اے پیر طریقت دستگیری کن
شب تاریک و باریک و درچاہ و دو ما اعمیٰ

حافظ شیرازی

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

خواجہ عزیز

بیا ساقی سرت گردم رواں کن کشتئی مے را
باسم اللہ مجریہا باذن اللہ مرسٰہا

حافظ شیرازی

اَلا یا ایُّہا الساقی اَدِرکاساً ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول و لے افتاد مشکلہا

خواجہ عزیز

خلافِ گردہد رو در طریقت دم مزن ہرگز
کہ عقل اینجا بود با عشق ہمراہ خضر موسیٰ

حافظ شیرازی

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ عزیز نے حافظ شیرازی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کا اثر ان کے کلام پر پڑا ہے۔ مگر اس سے خواجہ صاحب کی شاعرانہ صلاحیت اور ان کی سخنوری پر حرف نہیں آتا۔

خواجہ عزیز اور نظیری | اسی طرح سے خواجہ صاحب نظیری اور ظہوری کا نام بھی لیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہمارے کلام میں جو کچھ بھی تاثر ہے وہ "کلام الہٰی" کا اثر ہے بقول علامہ اقبال؎

"یہ فیض ظہوری اور نظیری کا نہیں بلکہ کلام الہی کا ہے۔ اور خواجہ مرحوم کو خود اسکا احساس تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ؎

کے از ظہوری و زنظیری رشد عزیز فیضے کہ از کلام الہی بما رسید"[1]

نظیری اور خواجہ صاحب کے بھی کلام میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ طوالت مضمون کے پیش نظر دونوں کے صرف ایک ایک شعر پر اکتفا کرتے ہیں۔

خواجہ عزیز

خود بخود میوۂ جنت رسد از شاخ بلب
ہمت از کس پئے آں سیب زنخداں مطلب

نظیری

رسن زلف پئے حیلہ در اویختہ اند
جز دل تشنہ ازاں چاہ زنخداں مطلب

خاتمہ | ہندوستان میں فارسی شاعری کا وہ دور جو اکبر کے زمانے سے شروع ہوا۔ خواجہ صاحب بقول اقبال" اس کی کڑی تھے۔ خواجہ صاحب کے زمانے ہی میں فارسی شاعری کا رواج ختم ہوگیا تھا۔ اور اس کی جگہ اردو شاعری نے لے لی تھی۔ تاہم خواجہ صاحب نے فارسی میں طبع آزمائی کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا طبعی میلان فارسی ہی کی طرف تھا۔ دوسرے اس کو فارسی میں اسقدر دسترس تھی کہ وہ اپنے خیالات کو اردو کے مقابلہ میں فارسی میں زیادہ آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ غرض وجہ جو بھی ہو۔ ان کا کلام دور اکبری کی فارسی شاعری کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم بغور ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ان کے یہاں وہ ساری خصوصیات نظر آئیں گی جو اس عہد کی شاعری میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

---

[1] مکتوب علامہ اقبال منسلک بہ دیوان خواجہ عزیز لکھنوی۔

خیال اور طرز ادا کی جدت نے خواجہ صاحب کے کلام میں ایک ۔۔۔۔ حسن پیدا کر دیا۔ اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

طاقت کندن کا ہے بخود عاشق را ... قصۂ کوہ کنی تہمت بے بنیاد است
این صبح سر کشیدہ بگردوں غبار کیست ... وین شام تیرہ دودے دل بیقرار کیست
نباشد خالی این مضمون رنگیں از جنا بستن ... سرم گردم کہ میں بگینہ را کشتن است امشب
کیش عشق بہ نخچیر قربہ نیست قربانی ... نمی خواہد محبت صید این فتراک شاہانہ را
جز رخ سادہ لب لعل نگارم ای عزیز ... آتش بے دخاں کجا بادۂ بے خمار کو
از شربت وصالت دز لذت فراقت ... ہر زخم را نمک ہست ہر درد را دوا نیست

خواجہ صاحب کی شاعری کے سلسلہ میں جتنا بھی مواد اکٹھا کیا جا سکا ہے اس کی حیثیت نقش اول سے زیادہ نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کی پوری شاعری پر باقاعدہ تحقیقی کام کیا جائے۔ اس مختصر مضمون میں اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ فارسی علم و ادب کے ہندوستانی ذخیرہ میں جو خواجہ عزیز کا جو حصہ ہے۔ اس کی مکمل "تصویر نہ سہی" اس کا ہلکا سا خاکہ ضرور ان چند صفحات میں پیش کر دیا جائے۔

باب التقریظ والانتقاد

انڈو ایرانیکا کا سلور جوبلی نمبر

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

معارف کے صفحات میں کلکتہ کے مشہور ادارہ ایران سوسائٹی کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ یہ ادارہ فارسی زبان و ادب کی خدمت میں جس طرح لگا ہوا ہے، اس کے ذکر کے تکرار میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ ڈاکٹر محمد اسحق مرحوم نے اپنے غیر معمولی ذاتی انہماک اور مالی امداد سے اس کو ۱۹۴۴ء میں قائم کیا۔ اس کی طرف سے انڈو ایرانیکا کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا۔ جو اس وقت سے اب تک برابر شائع ہو رہا ہے اور اپنے بلند پایہ مضامین اور عمدہ طباعت کی وجہ سے ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے علمی رسائل میں بھی ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

اس وقت اس کا سلور جوبلی نمبر زیر نظر ہے، اس کے شروع میں ہندوستان اور اس کے باہر کے مشاہیر کے بیانات ہیں۔ اس کے بعد حسب ذیل اعلیٰ معیار کی مضامین ہیں،

(۱) عہد وسطی میں ہندوستان میں لکھی ہوئی وہ تاریخیں جن سے شمالی اور جنوبی ہند میں روابط پیدا ہوئے۔ از پروفیسر ہارون خاں شروانی، مقالہ نگار کے اسم گرامی سے ہندوستان کے علمی حلقے میں کون واقف نہیں، اس مضمون میں انھوں نے سلاطین دہلی

اور مغل بادشاہوں کے دور کی متداول تاریخوں کے علاوہ محمود گاوان کی ریاض الانشاء عزیز اللہ طباطبائی کی برہان مآثر، رفیع الدین شیرازی کی تذکرہ الملوک، ظہور بن ظہوری کی محمد نامہ، قاضی نور اللہ کی تاریخ عادل شاہی۔ فسونی استرابادی کی فتوحات عادل شاہی، ابراہیم زبیری کی بساتین السلاطین کے ساتھ شاہنامہ شہریاری نسب نامہ قطب شاہ و تواریخ قطب شاہی، تاریخ محمد قطب شاہی، حدیقۃ السلاطین از نظام الدین احمد سعیدی شیرازی، حدیقۃ السلاطین فی کلام الخواقین از علی بن طیفور بسطامی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون سے مفید ماخذوں کی ایک فہرست سامنے آجاتی ہے۔

دوسرے مضمون میں ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے عوارف المعارف کے ایک قدیم ترین فارسی ترجمہ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ترجمہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (المتوفی ۶۶۵ھ) کی حوصلہ افزائی ۔ اور سندھ کے حکمران تاج الدین کی فرمائش سے قاسم داؤد و خطیب چ (؟) نے کیا۔ فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ ۶۲۴ھ اور ۶۴۲ھ کے درمیان کیا گیا۔ ان کو اس کے دو نسخے ملے ہیں، ایک تو کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔ اور دوسرا جناب ملکش اکبرآبادی کے پاس محفوظ تھا جو آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار جس موضوع پر لکھتے ہیں، اپنی دیدہ وریزی اور دیدہ دری کا جوہر دکھاتے ہیں، اس مقالہ میں بھی ترجمہ کی ادبی اور لسانی نوعیت دکھانے میں اپنی علمیت کا پورا جوہر دکھایا ہے۔ اس میں عمید سنامی کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے، راقم نے اپنی کتاب بزم ملوکیہ میں اپنے اس قیاس کا اظہار کیا تھا۔ کہ عمید سنامی کا ایک مربی تاج الدین سنجر خان تھا۔ جو ناصر الدین محمود کے دربار کا ایک امیر تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ عمید کا یہ سرپرست سندھ

اور ملتان کا آزاد حکمران تاج الدین ابوبکر بن عزالدین کبیر خان ایاز تھا۔ مگر عمید کے ایک قصیدہ میں یہ دو شعر ملتے ہیں۔

مدار مملکت بہ دیجر تاج الحق   کہ بہر قلزم غم ساخت از امان کشتی

سپہر مرتبہ سنجر کہ فتنہ ز دیدہ کرد   بسوئے معبر دریائے تیر دان کشتی

پہلے مصرع سے سندھ کے حکمراں ہونے کا تو گمان ہو سکتا ہے، مگر تیسرے مصرع میں "سنجر" سے شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ وہی تاج الدین سنجر تو نہیں جو ناصر الدین محمود کے دربار کا امیر تھا۔

تیسرے مضمون میں پروفیسر ڈاکٹر جگدیش نرائن جادو یونیورسٹی نے عماد الدولہ مرزا محمد وحید کے ترتیب دیے ہوئے رقعات شاہ عباس ثانی کے پانچ خطوط سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے شیعی حکمرانوں نے ایران سے مل کر مغل سلطنت کے خلاف معاندانہ سازش کر رکھی تھی، اورنگ زیب کیلئے یہ بات لازمی طور سے ناقابل برداشت ہونی چاہئے تھی، اس لیے اس کا ان حکمرانوں کا مخالف ہونا حق بجانب تھا۔

چوتھا مضمون ڈاکٹر محمد اسحق مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے، جس میں مختصر طریقہ سے گورگان کے ایک شاعر قمری کے اشعار کے کچھ نمونے اور ان کے انگریزی ترجمے دیے گئے ہیں۔

پانچواں مضمون راقم کا ہے۔ جس کا عنوان "ہندوستان کے فارسی ادب میں ہندوستان اور خصوصاً بنگال سے محبت اور تحسین کے جذبات" ہے یہ وہ مقالہ ہے جو ڈاکٹر محمد اسحق موریل لیکچرز کے سلسلہ میں ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ایران سوسائٹی میں پڑھا گیا۔

چھٹا مضمون پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ یونیورسٹی کا ہے، جو اپنی بے لوث علمی خدمت

کی وجہ سے بہت ہی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اس میں انھوں نے ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی بحری قوت کا جائزہ لے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انکی بحری فوج ان کی بری فوج کی طرح طاقت ور نہ تھی۔ اس لئے وہ فرنگیوں کی بحری قزاقی کو دبا نہ سکے۔ اورنگ زیب کو اپنی اس کمزوری کا احساس تھا، اس لیے وہ انگریز بحری تاجروں کو مراعات دیتا رہا، گو ان فرنگی تاجروں کے اختلافات سے فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کی، اس مضمون کو کلمات طیبات عالمگیری اور احکام عالمگیری سے مستند معلومات فراہم کرکے باوزن اور پرمغز بنایا گیا ہے۔

ساتواں مضمون ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی کا ہے، جو ناگپور میں محکمۂ آثار قدیمہ کے روح رواں ہیں، اس کو پڑھ کر بہار والوں کو ضرور غیرت آئے گی کہ جو کام ان کے کرنے کا تھا، وہ صوبہ سے باہر کے ایک ماہر فن نے وہاں پہونچ کر انجام دیدیا، اس میں انھوں نے بڑی تحقیق اور محنت سے ریاست بہار کی ان تاریخی عمارتوں کا جائزہ لیا ہے، جو مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ معارف کے ناظرین بھی ذرا ان بھولی ہوئی عمارتوں کے کم سے کم نام سے واقف ہو جائیں، مقبرہ ملک ابراہیم بیو (بہار شریف) مقبرہ حضرت محمد سستان (بہار شریف) سنگی مسجد (ململ ڈہ، ضلع پٹنہ) مقبرہ شاہ نافہ (مونگیر) مسجد چیرند (ضلع سارن)، مقبرہ شاہ چمن (ہلسا، ضلع پٹنہ)، حسن سور، شیر شاہ سور، اسلام شاہ سور اور عادل خان کے مقبرے (سہسرام) مقبرہ بختیار خان (چین پور) جامع مسجد (رہتاس) قلعہ شیر گڈہ۔ (نزد سہسرام)، حبش خان کی مسجد رہتاس گڈہ کا محل، مقبرہ مخدوم شاہ دولت (منیر) سنگی مسجد (پھلواری شریف) قلعہ پلاموں (چھوٹا ناگپور)، مقبرہ مخدوم صاحب چمپانگر (نزد بھاگلپور)، جامع مسجد

(حاجی پور)، مسجد سنگی دالان (پٹنہ) میر صاحب کے ٹولے کی مسجد (بہار)، شاہ جنگی کی مسجد، مغلپورہ کی مسجد، خلیفہ باغ کی مسجد، مشائخ چک کی مسجد، مدرسہ کی مسجد (جھنجی گھاٹ پٹنہ)، خواجہ کلاں کی مسجد (پٹنہ)، مقبرہ شمشیر خان (شمشیر نگر گیا)، مقبرہ ابراہیم حسین خان (بھاگلپور)، مقبرہ نواب منیر الدولہ (پٹنہ) وغیرہ، یہ مقالہ بہار والوں کے لیے ایک علمی نعمت ہے۔ وہ ان عمارتوں کو شاید بھول چکے ہوں مگر ان کے لیے اس مقالہ کے مفید معلومات سے پھر زندہ ہو گئی ہیں، فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ ان عمارتوں میں پہلے تو سلاطین دہلی کے طرز تعمیرات کے اثرات رہے، پھر بنگال کا طرز نمایاں ہوا، اور جب سور خاندان کی حکومت ہوئی تو وہ اپنے خاص طرز کے بانی ہوئے، آخر میں مغلوں کے اثرات غالب ہوتے چلے گئے۔

آٹھویں مضمون میں ڈاکٹر آر۔ ناتھ (آگرہ کالج) نے فتح پور سیکری اور آگرہ کی عمارتوں کے کتبات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اکبر شروع میں راسخ مسلمان ضرور رہا لیکن رفتہ رفتہ وہ اسلام سے دور ہوتا گیا۔

نواں مضمون بوعلی سینا کے عنوان سے جناب خواجہ محمد یوسف صاحب مینجنگ اڈیٹر انڈو ایرانیکا، کا ہے، خواجہ صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے لائق ایڈوکیٹ ہیں۔ اپنے پیشے کی مشغولیت کے باوجود علم و فن کے چمنستان میں بھی آکر گلگشت مستانہ کیا کرتے ہیں ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلا کرتا ہے۔ بوعلی سینا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب نے اپنے اس مضمون میں اپنے قلم کا اعجاز دکھا کر بوعلی سینا کی عبقریت اور اس کی تصانیف سے متعلق ایسے مفید معلومات فراہم کر دے ہیں کہ اس سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آخری مقالہ ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی کا ہے،

جس میں انھوں نے ایران سوسائٹی کے جشن سیمین کی یادگاری جلد کے مضامین پر تبصرہ کر کے اس کی اشاعت پر ایران سوسائٹی کو مبارکباد دی ہے۔

انڈو ایرانیکا میں زیادہ تر انگریزی مضامین شائع ہوتے ہیں، لیکن اس میں کچھ فارسی مضامین بھی ضرور ہوا کرتے ہیں، زیر نظر سلور جوبلی نمبر میں ڈاکٹر عطا کریم برق (کلکتہ یونیورسٹی) کے دو مضامین ہیں، ایک انجمن بزم ایران در مدت چہار سال اخیر اور دوسرا نظری بہ نفوذ فرہنگ ایرانی در جنبہ ہای ادبی و فرہنگی بنگالہ کے عنوان سے ہے، ڈاکٹر عطا کریم برق ہندوستان کے ان چند ارباب قلم میں ہیں، جو فارسی زبان میں بہت ہی بے تکلف انداز میں مضامین لکھا کرتے ہیں، انھوں نے تاثیر فارسی در زبان و ادبیات بنگالی کے موضوع پر فارسی میں دو جلدیں مرتب کر لی ہیں یہ شایع ہوئیں تو ہندوستان کے علمی حلقہ میں ایک مفید اضافہ ہوگا۔

فارسی میں ڈاکٹر سید امیر حسن (دہلی یونیورسٹی) کا بھی ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے تاریخ سلاطین صفویہ پر تبصرہ کیا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف اسوقت انڈو پرشین لٹریچر کے بڑے مستند عالم ہیں، انھوں نے ہندوستان کے بعض کمیاب فارسی نسخوں کو شائع کر کے ایسی مفید خدمت انجام دی ہے کہ ہندوستان کی فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں ان کا نام برابر احترام کے ساتھ لیا جائے گا، وہ بھی فارسی بہت ہی بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں، زیر نظر مضمون ان کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس حصہ میں جناب آقاے ہاشم کاردوش، رائزن فرہنگی (کلچرل اتاشے) ایران دہلی کی ایک مسلسل فارسی غزل "ہند عزیز مرا ببیند یہ" کے عنوان سے ہے،

آقائے ہاشم کاردوش اپنے حسن اخلاق اور ذوق علمی کی وجہ سے دہلی کے علمی حلقہ میں بہت مقبول ہیں، ہند و ایران کو ثقافتی طور سے ایک دوسرے سے قریب تر کرنے میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ اسی لئے اپنی غزل کے مطلع میں کہا ہے،

اے عزیز آریائی من زایران آمدم　　　من ز ایران برادر بر تو مہمان آمدم

اس غزل کے حسب ذیل دو شعر سے وہی لوگ لطف لیں گے جو ان کی تعلیمات سے واقف ہیں۔

با سیہ چشمان کشمیری نیاز آیند باز　　　با نوائے حافظ آن مرغ خوش الحان آمدم

طوطیان شکر شکن کردند در اقصائے ہند　　　با چنین قندے کہ من از شکرستان آمدم

اخیر میں جناب خواجہ محمد یوسف مینجنگ اڈیٹر انڈو ایرانیکا اور جناب ام۔ اے مجید صاحب جنرل سکریٹری ایران سوسائٹی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنت و کاوش سے انڈو ایرانیکا کا یہ سلور جوبلی نمبر اپنے دیرینہ شاندار روایت و معیار کے ساتھ شائع ہوکر ارباب علم کے ہاتھوں میں ایک عمدہ علمی تحفہ کی صورت میں پہونچ گیا، اس باتصویر رسالہ کی ضخامت ۲۲۱ صفحے ہے، ایران سوسائٹی۔ ۱۲ ڈاکٹر ام۔ اسحٰق روڈ۔ کلکتہ ۱۶ سے مل سکتا ہے۔

بزم مملوکیہ

مطبوعات جدیدہ

فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر: مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب تقطیع کلاں کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۳۳ مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ قیمت غیر مجلد عہ
پتہ۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

فاضل مصنف نے "اسلامی فقہ و اجتہاد" پر جو ان کا خاص موضوع ہے، کئی کتابیں لکھی ہیں اور وقتاً فوقتاً اس پر محققانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا چھپا تھا۔ اب ترمیم و اضافہ کے بعد اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس میں فقہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی مختصر تاریخ، عہد بعہد ارتقاء، اس کے مآخذ، اصول، فقہی احکام میں تخفیف و سہولت اور فقہاء کے اختلافات کے اسباب پر مدلل و مربوط بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث مصنف کی محنت و تحقیق، وسعت نظری اور فقہی ژرف نگاہی کا نمونہ ہے، کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب خصوصیت سے اہم ہیں۔ اول الذکر میں اسلامی فقہ کے بارہ مآخذ، (۱) قرآن حکیم (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس (۵) استحسان (۶) استصلاح۔ (۷) استدلال (۸) ماقبل کی شریعت (۹) تعامل (۱۰) مسلمہ شخصیتوں کی رائیں (۱۱) عرف و رواج (۱۲) ملکی قانون کی مفصل وضاحت کی گئی ہے، اور چوتھے باب میں ان فقہی اصول و کلیات کا ذکر ہے جن سے فقہاء نے احکام کی جمع و تدوین میں مدد لی ہے۔ مثلاً مشقت، حرج، ضرر، عذر، اور ضرورت وغیرہ، لائق مصنف نے ان مباحث پر اس قدر معلومات جمع کر دی

جو عربی کتابوں میں بھی یکجا نہ مل سکیں گے۔

فاضل مصنف فقہ کی جدید تشکیل و تدوین کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف اور موجودہ حالات میں اجتہاد کے بند دروازہ کو کھولنے کے حامی ہیں، یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس سے فقہ کی تشکیل جدید میں مدد ملے گی۔

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ :۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر محمد یسین صاحب متوسط سائز۔ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۵۰۳ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت عہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

انگریزی ادب کی اس مختصر تاریخ میں اس کی ابتداء (۶۰۰ء) سے موجودہ صدی تک کے شعر و ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ مندرجہ ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے (۱) ابتدائی انگریزی ادب (۶۰۰-۱۵۳۰) (۲) نشاۃ ثانیہ (۱۵۳۰-۱۶۶۰) (۳) دور بحالی (۱۶۶۰ء-۱۷۰۰ء) (۴) جدید کلاسیکی دور اور پیش رومانی عہد (۱۷۰۰-۱۷۹۸) (۵) رومانی دور (۱۷۹۸-۱۸۳۲) (۶) عہد وکٹوریہ (۱۸۳۲-۱۹۰۰) (بیسویں صدی (۱۹۰۰-۱۹۶۰)

لائق مصنف نے اس کتاب میں انگریزی ادب کی ابتداء، ارتقاء کی سرگذشت اور مختلف اصناف خصوصاً شاعری، ڈرامہ، ناول، انشائیہ اور رپورتاژ وغیرہ کے عہد بعہد فروغ و ترقی کی داستان بھی بیان کی ہے اور ہر عہد کے نامور و ممتاز اصحاب فن و کمال کا مختصر تذکرہ اور ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی قابل ذکر خصوصیات بھی تحریر کی ہیں گو یہ کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے۔ لیکن انگریزی جیسی وسیع اور بین الاقوامی زبان و ادب کی ہزار سالہ تاریخ کو ایک مختصر کتاب میں نہیں سمیٹا جا سکتا اور نہ صرف اردو جاننے والے اس سے خاطر خواہ مستفید ہو سکیں گے تاہم اردو میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اسلئے قابل قدر اور آئندہ لکھنے والوں کے لئے ایک خاکہ کا کام دے گی۔

اردو کا المیہ :- از پروفیسر مسعود حسین خانصاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۲، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ستے پتہ (۱) شعبۂ لسانیات علی گڈھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پروفیسر مسعود حسین خان صاحب حال وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی نے، انجمن ترقی اردو کے اخبار ہماری زبان میں اردو سے متعلق بڑے مفید مضامین اور اداریے لکھے تھے۔ ان میں اردو کے رسم الخط اس کی لسانی تعلیمی اور تہذیبی اہمیت علاقائی اور دستوری حیثیت، اس کی حق تلفی اس کے ساتھ حکومت کی زیادتیوں سیاسی پارٹیوں کی وعدہ خلافیوں اردو دانوں کی جد وجہد اور ان کی کوتاہیوں اور آئندہ کے طریقہ کار بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اور پوری قوت واستدلال سے اردو کی حمایت کی گئی ہے۔ جس سے اردو سے متعلق جملہ مسائل اس کا ہر پہلو اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے اس کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے۔ انداز بیان سنجیدہ ومتین لیکن پرزور اور دلنشین ہے ان مضامین کی حیثیت عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے اس لئے مرزا خلیل احمد بیگ صاحب نے اس کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے پروفیسر صاحب کی نظر ان مسائل پر بڑی گہری اور مبصرانہ ہے اور انھوں نے بڑی خوبی سے ان کا احاطہ کیا ہے اس لئے۔ اس کی حیثیت اردو کے حقوق کی دستاویز کی ہو گئی ہے ...... اور وہ اہل علم خاص طور پر اردو کے حامیوں کے مطالعہ کے لائق ہے

سیرت رسولؐ :- مترجمہ :- مولوی طلحہ بن ابوسلمہ ندوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۵۲ قیمت ستے پتہ ادارہ ترجمہ وتالیف ۲۵ پھول بگان روڈ، کلکتہ ۱۴

زیر نظر کتاب علامہ ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب المعارف کے اس حصہ کا ترجمہ ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق ہے، اس میں پہلے آپ کے نسب و خاندان، اجداد و اعمام، پھوپھیوں، دادیوں، نانیوں، ازواج مطہرات آل اطہار اور غلاموں وغیرہ کا تذکرہ اور آخر میں ولادت و بعثت اور غزوات وغیرہ کا بیان ہے، متن کے اختصار کی وجہ سے لائق مترجم نے حاشیے میں بعض وضاحت طلب امور کی تفصیل اور قابل ذکر بحثوں کا اضافہ کر دیا ہے، اور آخر میں اخلاق و عادات کا باب بھی شامل کر دیا ہے، اردو میں سیرت پر مبسوط و محققانہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر یہ تیسری صدی ہجری کی تصنیف کا ترجمہ ہونے کی بنا پر سیرت نبوی پر مستند ماخذ ہے۔

الاعلام فی کلام اللہ الملک العلام :- مرتبہ جناب عادلہ صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۹۱ قیمت عہ گوہر پریس ٹریپلیکین ہائی روڈ مدراس نمبر ۵

یہ کتاب قرآن مجید کی اسماء و اعلام کا اشاریہ ہے، لائق مرتبہ نے انبیاء، ملائکہ، شیاطین اور اقوام و بلاد وغیرہ کے جو الفاظ اور نام قرآن مجید میں آئے ہیں ان کو حروف تہجی کے رو سے مرتب کر دیا ہے، اور ان سورتوں اور آیتوں کے بھی نمبر دیدئے ہیں، لیکن مختلف نوعیت کے ناموں کو ایک ساتھ ذکر کر کے خلط ملط کر دیا گیا ہے، اگر مختلف نوعیت کے ناموں کا علحدہ علحدہ ذکر کیا جاتا جیسے انبیاء کے عنوان کے ماتحت تمام نبیوں کا ذکر کیا جاتا اسی طرح اقوام و بلاد کے مستقل عنوانات قائم کر کے ان کے ماتحت قوموں اور شہروں کے نام دے گئے ہوتے تو زیادہ سہولت ہوتی، عبادات میں حج کا انڈکس تو دیا گیا ہے لیکن صلوٰۃ و زکوٰۃ اور صیام کا نہیں ہے، اسی طرح شیاطین و ملائکہ کا انڈکس ہے، مگر جنوں کا نہیں، بعض جگہ حوالے بھی غلط درج ہو گئے ہیں۔ مثلاً حزب اللہ کے لئے صرف سورۂ مائدہ کا حوالہ دیا گیا

حالانکہ یہ لفظ سورہ مجادلہ میں بھی آیا ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ ایک مفید علمی و قرآنی خدمت ہے۔ مگر قیمت زیادہ ہے۔

کلام حشر و پیام حشر :- مرتبہ جناب عبدالقدوس صاحب نیرنگ تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات (۱) ۱۵۰ و (۲) ۴۸ قیمت ۱۲ چار پیسے (۲) ۴ پتہ کتاب محل دال منڈی۔ وارانسی۔

آغا حشر کاشمیری مرحوم کی اصل شہرت ان کے ڈراموں کی وجہ سے ہے، لیکن وہ بڑے ذہین و طباع اور شعلہ نوا شاعر بھی تھے، مذکورۂ بالا کتابوں میں اول الذکر ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس میں ان کے حالات و کمالات اور شاعرانہ خصوصیات کا بھی ذکر ہے اور اس کے شروع میں آغا صاحب کے متعلق پرانے اخبار و رسائل کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں آغا صاحب کی دو مشہور و ولولہ انگیز نظمیں "شکریہ یورپ" اور "موج زمزم" درج ہیں، یہ دونوں نظمیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں اور بڑی پرزور اور موثر ہیں لائق مرتب نے ان کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں آغا صاحب کے متعلق مضامین بہت لکھے گئے، لیکن غالباً ابھی تک نہ ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا اور ان کے ادبی و فنی خدمات کے بارہ میں کوئی مستقل کتاب لکھی گئی تھی۔ اس لئے یہ دونوں مجموعے غنیمت ہیں، لیکن ان کی ترتیب میں خوش سلیقگی کی کمی ہے۔ اور آغا صاحب کے ادبی و شعری خدمات کا تجزیہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا گیا ہے۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمداللہ چھپ کر شائع ہوگئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کان پور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات تحریکِ جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دارالمصنفین سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سال قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

.....

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

جولائی سنہ ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اتبلہ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علماء، فضلاء، وشعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۴ - ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق جولائی ۱۹۷۴ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اتحاد اسلامی اتنی بڑی طاقت ہے کہ اگر اس سے کام لیا جائے تو بین الاقوامی دنیا میں مسلمانوں کا وزن پیدا ہو جائے اور بہت سے مسائل میں بیلنس ان کے ہاتھ میں آ جائے، اس وقت ۳۰۔ ۳۵ اسلامی ملک ہیں، جنکا سلسلہ افریقہ سے لیکر ملیشیا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور مراکش سے لیکر لاہور تک مسلسل اسلامی ملک ہیں، اگر یہ سب متحد ہو جائیں تو بڑی بڑی طاقتوں سے اپنا لوہا منوا سکتے ہیں، زبانوں پر تو ہمیشہ اتحاد اسلامی کا نام رہا لیکن وہ عملاً قائم نہ ہو سکا، جب بھی اسکی تحریک ہوئی مغربی حکومتوں نے اسکے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ وہ آگے نہ بڑھ سکی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں بیشتر اسلامی حکومتیں مغربی طاقتوں کے زیر اقتدار یا کم سے کم انکے زیر اثر تھیں، آزاد حکومتیں بھی نیم جان تھیں، انکی مالی حالت نہایت خراب تھی اور وہ ہر چیز میں مغربی حکومتوں کی محتاج تھیں، اس لیے انکی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں،

اب صورت حال بدل گئی ہے، قریب قریب یہ سارے ملک آزاد ہو چکے ہیں، مشرق وسطیٰ کی سرزمین پٹرول کی شکل میں سونا اگل رہی ہے، جسکی ساری حکومتیں محتاج ہیں اور ان ملکوں کے پاس اتنی دولت ہو گئی ہے کہ اسکے رکھنے کا ٹھکانا نہیں ہے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اب بین الاقوامی حالات ایسے ہو گئے ہیں جنھوں نے متضاد عقیدہ رکھنے والی طاقتوں کو آپس میں مفاہمت پر مجبور کر دیا ہے، اور ہر ملک اپنے مفاد کیلئے اپنا حلقہ بنا رہا ہے اسلیے مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر خالص سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی ملکوں کے مفاد کیلیے ان میں اتحاد ضروری ہے، اس کا انکو تجربہ ہو چکا تھا کہ قومیت اور وطنیت ان کو متحد نہ کر سکی، اسلیے انکا شیرازہ منتشر کر دیا، اس نے عثمانی حکومت کا خاتمہ کیا، اور عربوں کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر کے انکی قوت توڑ دی، اسی نے مصر کو فرعونیت، ترکی کو تورانیت اور ایران کو مجوسیت کے احیاء پر ابھارا، جس نے انکو ایک دوسرے سے دور کر دیا،

اسلیے اسلام ہی انکو متحد کر سکتا ہے، اس مقصد کیلیے انکو امیر فیصل جیسا مدبر رہنما مل گیا جس نے اپنے سارے وسائل اتحاد اسلامی کے لیے وقف کر دیے ہیں،

اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی کانفرنسیں سب اسی احساس کا نتیجہ ہیں، لاہور کی اسلامی کانفرنس اور کوالالمپور کی اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، وزرائے خارجہ کی کانفرنس کی پوری روداد اخبارات میں آچکی ہے، اس میں جو تجویزیں پاس ہوئیں وہ اسلامی ملکوں کے تمام اہم مسائل اور ان کی عہد حاضر کی جملہ ضروریات پر حاوی ہیں، اس سے پہلے لاہور کانفرنس میں ترقی پذیر ملکوں کی امداد کی تجویز پاس ہو چکی ہے جس میں غیر مسلم ملک بھی شامل ہیں، یہ اس کا ثبوت ہے کہ کانفرنس کے پیش نظر ایشیا و افریقہ کے تمام کمزور ملکوں کی فلاح و ترقی ہے، اس لیے اتحاد اسلامی اور اسلامی کانفرنس سے ان سب کو فائدہ پہنچے گا اور اس کی قوت سے ان کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔

مسلم اقلیتوں کی شکایتوں کے تدارک کے بارہ میں جو تجویز ہے اس میں اسکی وضاحت ہے کہ وہ ان کی حکومتوں کے ذریعہ ہوگی، اس لیے اس تجویز سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، مظلوم طبقہ کو ظلم سے بچانا تو انسانی فریضہ ہے، ایسے موقع پر تو ہر انسان دوست ملک مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، اس لیے اگر اسلامی ملک کسی ملک کی مسلم اقلیت کی شکایتوں یا ان پر ظلم و زیادتی کے تدارک کے لیے ان کی حکومت کو توجہ دلائیں تو اس میں کونسی قابل اعتراض بات ہے، ہماری حکومت کو خاص طور سے اس سے کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونی چاہیے کہ ہمارے دستور میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، اگرچہ ان پر ابھی پورا عمل نہیں ہے، دوسرے یہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ وہ اسلامی برادری کا رکن بننے کا حق رکھتی ہے، اس لیے ہماری حکومت کو لاہور کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مدعو نہ کیے جانے کی شکایت تھی جو بالکل بجا تھی، ہمارے نزدیک اس قسم کی کانفرنسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو نمائندگی ملنی چاہیے

اس سے یہاں کے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور حکومت کو بھی بدگمانی کا موقع نہ ملے گا۔

مسٹر بھٹو کا بنگلہ دیش میں بڑا پُرجوش استقبال ہوا، اور اس نے میزبانی کے سارے فرائض انجام دیے، لیکن پاکستان سے بنگلہ دیش کے اربوں روپئے کے مطالبات اور بہاریوں کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ وہ جلد حل نہیں ہوسکتے، اس لیے اس سفر سے جو توقعات تھیں وہ سب پوری نہیں ہوئیں، لیکن مسٹر بھٹو کا بنگلہ دیش جانا بجائے خود مصالحت کے لیے ایک مفید قدم ہے، جس سے آیندہ مفاہمت کی راہ کھلے گی، بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو پاکستان آنے کی دعوت دی ہے، جو انھوں نے قبول کرلی ہے، یہ بھی ایک اچھی علامت ہے، اگر پاکستان کے ذمہ بنگلہ دیش کے مالی مطالبات ہیں تو بہاریوں نے بھی بنگلہ دیش میں اربوں روپئے کی املاک چھوڑی ہے، اس لیے دونوں میں مفاہمت کا نقطہ نکل سکتا ہے، اب ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح اسلامی ملکوں نے مسٹر بھٹو اور مجیب الرحمٰن کو ملایا تھا، اسی طرح ان معاملات میں بھی مفاہمت کی کوشش کریں، اس کی ذمہ داری ہندوستان پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر برصغیر میں امن قائم نہیں ہوسکتا، اس سلسلہ میں بھٹو کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایٹمی دھماکے کی وجہ سے سارے معاملات پر گفتگو ختم نہ کردیں، کم سے کم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت اور خط و کتابت وغیرہ کی آزادی کا مسئلہ جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت تکلیف ہے طے کرنے کی کوشش کریں، اس سے آیندہ کے لیے خوشگوار فضا پیدا ہوگی۔

مقالات

کچھ قابلِ غور باتیں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

مغربی تہذیب دنیا پر اتنی چھا گئی ہے اور ہوا کی طرح سرایت کر گئی ہے کہ کوئی قوم بھی
اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی اور اس کے سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی،
انسانی تہذیب کوئی جامد چیز نہیں، بلکہ ارتقا پذیر ہے، اس کا قدم برابر آگے بڑھتا رہتا ہے،
جو قوم بھی اس ارتقا کا ساتھ نہ دے گی اور دوسری تہذیبوں کی مفید چیزوں کو قبول
نہ کرے گی وہ ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جائے گی، اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا،
اس لیے مختلف قوموں کے درمیان تہذیبی لین دین کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے، لیکن ہر قوم
کا مزاج اس کی روایات اور اس کا کلچر جدا ہوتا ہے جس پر اس کی انفرادیت اور قومی وجود
کا دارومدار ہوتا ہے، اس لیے کسی قوم کی تہذیب کے سارے اجزاء دوسری قوم کے لیے
قابل قبول نہیں ہوتے، اگر وہ قبول کرے گی تو وہ اس قوم میں ضم ہو جائے گی، اور اس کا
قومی وجود ختم ہو جائے گا،

اس لیے تہذیبی لین دین میں اس کا لحاظ ضروری ہے کہ کسی قوم کے لیے دوسری تہذیب

کے کونسے اجزاء قابل قبول ہیں اور کونسے قابل رد، مفید اور صالح اجزاء کے قبول کرنے سے تہذیبی ترقی اور قومی زندگی میں استحکام پیدا ہوگا اور مضر اور قومی مزاج کے خلاف عناصر کے قبول کرنے سے قومی انفرادیت ختم ہو جائے گی، مسلمانوں کا سابقہ مختلف تہذیبوں سے رہا اور انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اُن کی مفید چیزیں قبول کیں، حتیٰ کہ جن قوموں کو انھوں نے مغلوب کرلیا تھا ان سے بھی تہذیبی استفادہ کیا، چنانچہ حکومت کے اداروں کی تنظیم اور معاشرتی نفاستوں میں ایران و روم سے، علوم و فنون میں یونان، ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے فائدہ اٹھایا، ہندوستانی معاشرت سے تو اتنے متاثر ہوئے کہ اُن کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، مگر اس پر اپنی تہذیب کی ایسی چھاپ لگا دی کہ وہ اسلامی تہذیب کہلانے لگی، اور اس کو ایسا نکھارا کہ وہ اپنے دور کی معیاری تہذیب بن گئی جسکو دوسری قومیں فخریہ اختیار کرتی تھیں، مگر اس اخذ و استفادہ میں اپنے عقائد و افکار اور قانون و شریعت کو بڑی حد تک محفوظ رکھا، اور ہر زمانہ میں ایک جماعت ایسی موجود رہی جو ان چیزوں کو بیرونی اثرات سے پاک کرتی رہی جس سے ان کا کلچر جس پر ان کے ملی تشخص کا مدار تھا، بڑی حد تک محفوظ رہا۔

لیکن مغربی تہذیب کے سامنے انھوں نے سپر ڈال دی، اس کا سبب سیاسی زوال کے ساتھ ان کی اخلاقی پستی اور علم و فن سے تہی دامنی تھی، ایک زمانہ میں انھوں نے مغربی قوموں کو علم و فن اور تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا تھا، پھر ان پر ایسا زوال آیا کہ حکومت کے ساتھ علم و فن اور اخلاقی فضائل بھی ان سے رخصت ہوگئے، اسی زمانہ میں مغربی تہذیب کا عروج ہوا، اور اس نے جدید علوم کی فوج، صنعتی ایجادات کے اسلحہ اور سائنس کی قوت کے ساتھ مشرق پر یلغار کی، مسلمانوں کے ایک طبقہ نے جو اس کے مقابلہ

کے صحیح طریقوں سے واقف نہ تھا، قدیم حصار میں محصور رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور بلا امتیاز خوبی وخرابی اس کی ہر چیز کی مخالفت کی، اس سے یہ طبقہ تو اس کے اثرات سے محفوظ رہا، لیکن مغربی تہذیب کا سیلاب اتنا طاقتور اور ضرورت زمانہ کے مطابق تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اس کے سامنے سپر ڈال دی اور عیب وہنر کے امتیاز کے بغیر اس تہذیب کی ہر چیز قبول کرلی،

مغربی تہذیب کے دو رخ ہیں، اس کے سائنسی علوم، ٹکنالوجی، صنعت وحرفت، زندگی کے اصولوں پر عمل اس کا روشن اور قابل تقلید رخ ہے جس کے بغیر آج کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی اور اسکی مادہ پرستی، فسق وفجور، قوت ودولت کی پرستش، اخلاقی اقدار کی پامالی تاریک اور قابل ترک رخ ہے، مسلمانوں نے اپنی پست ہمتی اور تن آسانی سے اس کا تاریک رخ جس میں نفس کے مطالبات کی تسکین کا زیادہ سامان تھا، قبول کیا، اور روشن رخ کی طرف جس کے لیے محنت، جفاکشی، جگر کاوی وجانکاہی اور ایثار وقربانی کی ضرورت تھی بہت کم توجہ کی، اس لیے ان میں مغربی تہذیب کی برائیاں زیادہ اور خوبیاں کم پیدا ہوئیں،

اگرچہ مغربی اقوام کی یلغار پورے ایشیا پر تھی، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس کا نشانہ مسلمان زیادہ تھے، عیسائیت کو سب سے زیادہ نقصان اسلام اور مسلمانوں سے پہنچا تھا، دونوں میں صدیوں مقابلہ جاری رہا، جنگ صلیبی میں مسلمانوں نے یورپ کی متحدہ طاقتوں کو شکست دی، اور ان کے قدم ایشیا سے اکھاڑ دیے، اور خود یورپ کے مختلف حصوں کو فتح کرلیا، مسلمانوں کی جغرافیائی اہمیت یہ تھی کہ یورپ کے دروازے مراکش سے لیکر ہندوستان تک جو ایشیا میں داخلہ کا راستہ تھا، مسلسل اسلامی حکومتیں تھیں،

ان کو زیر کیے بغیر اُن کے قدم ایشیا میں نہیں جم سکتے تھے، اس لیے ان کی اصل ٹکر مسلمانوں سے تھی، انھوں نے ان کو سیاسی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے مغلوب کرنے کی کوشش کی، ایک طرف ان کی فوجیں مسلمان حکومتوں کو زیر کرنے کی مہم میں مصروف تھیں، دوسری طرف عیسائی مبلغین اور مستشرقین، ان کے مذہب پر حملہ آور ہوئے، اور اسلام اور اس کی تعلیمات، قرآن مجید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو علمی رنگ میں اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کی ایسی تاریک تصویر پیش کی جس سے نہ صرف اسلام اور مسلمان دوسری قوموں میں بدنام ہوں بلکہ خود مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں، اور مذہب سے جو ان کی قوت کا سرچشمہ ہے، ان کا رشتہ کمزور ہو جائے،[1]

اسی کے ساتھ جہاں ان کو قدم جمانے کا موقع ملا، انھوں نے نظام تعلیم ایسا بنایا جس سے خود بخود ذہن و دماغ اس کے سانچہ میں ڈھل جائیں، اور مسلمان ہر چیز کو انہی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھنے اور انہی کی زبان میں بولنے لگیں، اس تعلیم نے ہر اسلامی ملک میں ایک طبقہ پیدا کر دیا جو مغرب کی تقلید ہی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتا ہے، لیکن اس زہر کا تریاق

---

[1] یہ تو صرف چند موٹی موٹی باتیں ہیں، مستشرقین نے اس قسم کی بہت سی شکلیں اختیار کیں جس کی تفصیل میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے، اس میں انھوں نے ہر قسم کے کذب اور تدلیس سے کام لیا، مسلمان علما اور محققین نے اس کے جواب بھی دیے لیکن ایک طبقہ اس سے پوری طرح متاثر ہوگیا۔

مستشرقین میں بعض ایماندار اور منصف مزاج بھی تھے، ان کے احسان کا اعتراف بھی ضروری ہے، انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر بڑی محققانہ کتابیں لکھیں اور ان میں ان کی صحیح تصویر پیش کی، اور مسلمانوں کے علمی اور تہذیبی کارناموں کا پورا اعتراف کیا، عربی اور فارسی کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں تلاش کر کے ان کو بڑی صحت اور اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور ان کی بدولت اہل علم کو ان نایاب کتابوں سے جن کے صرف نام معلوم تھے، استفادہ کا موقع ملا۔

بھی مہیا ہوتا رہا اور تجدد پسندی کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریکیں بھی جاری رہیں، اور مسلمان علماء و محققین مستشرقین کے پھیلائے ہوئے اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے، اس سے دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں سے مذہب کی چنگاری بجھنے نہ پائی،

مسلمانوں کو ہر دور میں اس قسم کی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ان کا ایک طبقہ اس سے متاثر بھی ہوا لیکن من حیث القوم وہ اس کو جھیل لے گئے، ابھی مغربی تہذیب کے حملہ سے نجات نہیں ملی تھی کہ اس سے بھی مہیب سیلاب کمیونزم کا امنڈ پڑا جو مغربی تہذیب سے بھی زیادہ خطرناک ہے، مغربی قوموں سے اگرچہ عملاً مذہب ختم ہو چکا ہے، لیکن اس کا نام باقی ہے اور رومن کیتھلک میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر بھی موجود ہے کلیسا کا تبلیغی نظام پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن کمیونزم کی بنیاد ہی الحاد اور بے دینی پر ہے، وہ سارے مذاہب کا دشمن ہے، اور کسی نظام اخلاق کا پابند نہیں، اس لیے اس میں مغربی تہذیب سے بھی زیادہ آزادی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ مذہب کے لیے خطرناک ہے، اور اس کا نعرہ سرمایہ داری کی مخالفت، مزدوروں کی حمایت، اقتصادی مساوات اتنا موثر اور دلکش ہے کہ ایک دنیا اس کے سحر میں گرفتار ہے، سرمایہ دار ملکوں میں بھی اس کے قدم پہنچ گئے ہیں، اور نوجوان نسل تو بے سمجھے بوجھے اس کے پیچھے دوڑی چلی جا رہی ہے، اور اب کمیونزم میں ایسی طاقت آگئی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس سے خوفزدہ ہیں، اور اس کے مخالفین بھی سوشلزم کا نام لینے پر مجبور ہیں، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونزم ساری دنیا میں پھیل کر رہے گا لیکن ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے، اور اس کی بنیاد مذہب و اخلاق کے بجائے مادیت اور الحاد اور تعمیر کے بجائے تخریب پر ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔

کمیونزم درحقیقت یورپ کی مفرط سرمایہ داری اور اس کی برائیوں کا ردعمل ہے، اس میں بعض خوبیاں بھی ہیں، لیکن اس کی مادیت، الحاد اور انتہا پسندی نے اس کی خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، خود اسلام انسانوں میں ادنیٰ و اعلیٰ کی تقسیم، جاگیرداری اور ایسی اقتصادی ناہمواری کا مخالف ہے، جس میں ایک شخص قارون بن جائے اور دوسرے کو پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہ ہو، اس نے سرمایہ کے حصول اور ذاتی املاک کو ختم تو نہیں کیا اور مکمل اقتصادی مساوات قائم نہیں کی جو بالکل خلاف فطرت ہے، لیکن سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کو دور کر دیا، اور سرمایہ پر ایسی قیدیں لگا دیں اور سرمایہ داروں پر اتنی قانونی پابندیاں اور اخلاقی ذمہ داریاں عائد کر دیں کہ اگر ان پر پورا عمل ہو تو غیر معتدل سرمایہ داری اور غربت و افلاس دونوں کا خاتمہ ہو جائے، افسوس ہے کہ اس مضمون میں اسلامی نظام، اقتصادیات پر بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے لیکن مکمل اقتصادی مساوات بالکل خلاف فطرت ہے، ایک تعلیم یافتہ، ذہین، عالی دماغ صناع اور سائنس کے ماہر اور معمولی مزدور کی محنت اور اس کے نتائج برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے ان میں مکمل اقتصادی مساوات بھی نہیں ہو سکتی، دونوں کو مساوی درجہ پر رکھنا ذہین انسانوں کی دماغی صلاحیتوں پر ظلم ہے، اس لیے اب خود کمیونسٹ ان میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں

کمیونزم کی سب سے بڑی خرابی اس کی مادیت، الحاد اور کلیت پسندی ہے، بظاہر وہ انسانی آزادی کا مدعی ہے، لیکن حقیقۃً بدترین قسم کا استبدادی نظام ہے، جس میں انسانی ذہن و دماغ پر بھی پابندی ہے، سوویٹ یونین میں کمیونزم کے خلاف کچھ سوچنے اور حسن نیت کے ساتھ بھی اس پر تنقید کی اجازت نہیں، اس کی سزا جلاوطنی یا قتل ہے، چنانچہ روس کے بڑے بڑے مفکرین اور صاحبِ علم و قلم اس استبداد کی بھینٹ چڑھ گئے، اس لیے

کمیونزم دوسری خرابیوں کے ساتھ انسانی ذہن و دماغ کے لیے بھی خطرہ ہے، مگر اس کا سیلاب اتنا تند و تیز ہے کہ وہ قوتیں جو اس کی مخالف ہیں، اس کے روکنے کی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اس سے مفاہمت پر بھی مجبور رہیں، اس لیے اہل مذاہب ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور یہ ان کا اخلاقی و انسانی فریضہ ہے، لیکن اس زمانہ میں مذہب کا اثر اتنا کم ہو چکا ہے کہ اس کے ماننے والوں کو بھی مذہب کے موافق و مخالف تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور وہ ہر ہوا کے ساتھ ہو جاتے، اور ہر قالب میں ڈھل جاتے ہیں اگر اس گئی گذری حالت میں مسلمان ہی اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں، اس لیے کمیونزم کا اصل مقابلہ اسلام اور مسلمانوں سے ہے، جیسا کہ کمیونسٹوں کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں،

اس پہلو کے علاوہ کمیونزم اور مسلمانوں کے درمیان مخالفت کے سیاسی وجوہ بھی ہیں، مسلمانوں سے روس کا مقابلہ اور ان میں اختلاف مدتوں سے چلا آرہا ہے، روسی ترکستان کا پورا علاقہ آزاد تھا جس میں کئی کروڑ مسلمان ہیں، یہ علاقہ صدیوں سے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز چلا آرہا تھا، اور اس کی خاک سے بڑے بڑے ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، روس اپنے پہلو میں اس کا وجود کس طرح گوارا کر سکتا تھا، چنانچہ اس کو سویٹ یونین میں ضم کر کے اپنے قہر و استبداد اور ملحدانہ نظام تعلیم کے ذریعہ نئی نسل کو بالکل مسخ کر دیا، مذہب کی پرانی یادگاروں میں کچھ بوڑھے رہ گئے ہیں جن سے اسلام کا نام زندہ ہے، لیکن روس کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام کی چنگاری بجھ نہیں سکی ہے، اور ایک طبقہ میں اپنی اسلامی قومیت کا احساس باقی ہے، جو ممکن ہے آیندہ چل کر بھڑک اٹھے اور روس کے پنجے سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرے جن سے روس بھی فکرمند ہے اور اس چنگاری کو بھی بجھا دینا چاہتا ہے،

افغانستان، ایران اور ترکی روس کے ہم سرحد ہیں، افغانستان کا کبھی کوئی شمار نہیں رہا، اس لیے روس کے لیے ناقابل توجہ رہا اور اب تو وہ اس کا ضمیمہ بن گیا ہے، لیکن ایران اور ترکی مدتوں اس کے حریف رہے اور ان میں بڑے بڑے معرکے ہوئے لیکن روس ان کو زیر نہ کر سکا، اب بین الاقوامی حالات نے ان کو مصالحت پر مجبور کر دیا ہے لیکن اب بھی ان کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی روس سے مطمئن نہیں ہے، پاکستان سے روس کی دشمنی بالکل کھلی ہوئی ہے، بنگلہ دیش ابھی تو زائیدہ ملک ہے، روس اس کو بھی پھانسنا چاہتا ہے، اور اسکا خطرہ ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ ایران اور سعودی عرب میں بھی جو کمیونزم کے مخالف اور اتحاد اسلامی کے علم بردار ہیں انقلاب پیدا کر دے، کمیونزم کا دوسرا مرکز چین ہے، اس نے بھی چینی ترکستان کے مسلمانوں کے ساتھ جن کی کچھ مذہبی اور تہذیبی اہمیت تھی وہی سلوک کیا جو روس نے روسی ترکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، لیکن خاص چینی مسلمانوں کی کبھی کوئی سیاسی، تاریخی اور تہذیبی اہمیت نہیں رہی، وہ چین کے رنگ میں بالکل رنگے ہوئے تھے، اس کے باوجود ان میں اسلام کے جو اثرات بھی تھے، چین نے ان کو بڑی بے دردی سے مٹایا اور لاکھوں چینی مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، روس اگرچہ اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کا حامی اور ان کا مددگار رہے، لیکن یہ حمایت عربوں سے اخلاص اور ہمدردی کی بنا پر نہیں، بلکہ مشرق وسطیٰ میں امریکن اثرات کے مقابلہ کے لیے ہے، ورنہ اسرائیل کے قیام کے جرم میں وہ بھی برابر کا شریک ہے، فلسطین میں زیادہ آبادی روس کے یہودی مہاجرین کی ہے، جس کا سلسلہ ابتک قائم ہے، اور آج بھی روس اسرائیل کو ختم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ایک حد کے اندر قائم رکھنا چاہتا ہے، اسی لئے عربوں کی ایسی امداد سے گریز کرتا رہا جس سے عرب اسرائیل کو زیر کر سکیں اور اب تو وہ

کی خود غرضی کھل کر سامنے آگئی ہے اور سادات اس کو چھوڑ کر امریکہ سے تعلقات پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں،

درحقیقت روس کی حمایت و ہمدردی بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے، وہ اس کا معاوضہ کمیونزم کا نظام یا کم سے کم اس کے اثرات قبول کرنے کی شکل میں وصول کرتا ہے، چنانچہ جس ملک میں بھی روس کے قدم پہنچے ساتھ ساتھ کمیونزم کے اثرات بھی پہنچ گئے، ناصر کے زمانہ میں مصر میں بڑی تیزی سے کمیونزم پھیل رہا تھا جس کو سادات نے روکا، اس کے دوسرے حلیف شام اور عراق کمیونزم کا شکار ہیں، ہند روس دوستی کے اثرات سب کی نگاہ کے سامنے ہیں، لیکن آج کی دنیا میں کوئی ملک خصوصاً چھوٹے ملک بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور اپنی بقا کے لیے ان سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان خطرات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے، ورنہ کمیونزم کا سیلاب ان کو بہالے جائے گا،

ہر نیا نظام اپنی دعوت و تبلیغ اور دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بڑی دلفریب اصطلاحیں ساتھ لاتا ہے، جن کے حقیقی مفہوم و منشا پر غور کیے بغیر لوگ اس کے ظاہری معنی سے مسحور ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے باطنی معنی کچھ اور ہوتے ہیں، مغربی تہذیب اور کمیونزم دونوں نے اس قسم کی اصطلاحیں ایجاد کی ہیں، ان سب کی تفصیل طویل ہوگی، اس لیے صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، آزادی فکر و خیال مغربی تہذیب کی بڑی دین سمجھی جاتی ہے، جو بظاہر بڑی معقول چیز ہے جس سے کوئی انسان بھی انکار نہیں کر سکتا، اور ہر عاقل و بالغ کو آزادی فکر و خیال کا پورا حق ہے، لیکن اس میں اپنے عقائد و تصورات اور اپنی روایات و مذہبی قیود سے آزادی بھی شامل ہے، اسلام نے اپنی تعلیمات پر ذمہ

عقلی حیثیت سے غور وفکر کی اجازت دی ہے بلکہ کلام مجید میں اس کی بڑی تاکید ہے، اور اسکی آیات افلا یتفکرون، افلا یتدبرون جیسے الفاظ سے معمور ہیں، لیکن اس کے کچھ حدود ہیں، اس کے اندر عقلی غور وفکر کا پورا حق ہے، مگر اس کے باہر اس کی آزادی نہیں ہے، ہر مذہب وملت کے کچھ بنیادی عقائد اور مسلمات ہوتے ہیں جن کا ماننا ہر حال میں ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، اس سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں ہے،

انسانی عقل محدود ہے، اس کی رسائی صرف محسوسات تک ہے، اس کے ماوراء عالم کے ادراک سے وہ قاصر ہے، پھر عقل کا کوئی ایک معیار نہیں ہے، ہر شخص کی عقل مختلف ہوتی ہے، جو چیز ایک شخص کی عقل میں نہیں آتی، وہ دوسرے کی عقل میں بالکل بدیہی نظر آتی ہے، ایک جاہل کی عقل سے جو چیز باہر ہوتی ہے، ایک تعلیم یافتہ شخص اس کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے، پھر پیشہ اور علم و فن کے اعتبار سے بھی عقلیں مختلف ہوتی ہیں، جو اپنے فن کے دائرے میں تو کام دیتی ہیں، مگر اسکے باہر بیکار ہو جاتی ہیں، بلکہ ایک ہی شخص کی عقل عمر کے مختلف مرحلوں میں بدلتی رہتی ہے، اسلیے ہر چیز میں تنہا عقل کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اور کچھ چیزوں میں اپنے سے زیادہ صاحب عقل ثقہ کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، زندگی کا سارا کاروبار اسی پر قائم ہے، فلسفہ اور سائنس کے پیچیدہ مسائل پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے، ان میں انکے ماہرین کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اور اس کو ہر شخص بے چون وچرا مان لیتا ہے، علاج میں ڈاکٹر کی اور قانونی معاملات میں وکیل کی رائے معتبر مانی جاتی ہے، اور کوشش کر کے اس کو حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح مذہب کے مابعد الطبیعی مسائل میں جو انسانی عقل سے ماوراء ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بیان پر جن کو انکا علم وعرفان حاصل ہوتا ہے اعتماد کرنا ضروری ہے، اس لیے کلام مجید نے ایک طرف تو اپنی تعلیمات پر عقلی غور وفکر کی تاکید کی ہے لیکن جو چیزیں انسانی عقل سے ماوراء ہیں، اُن پر ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا ہے،

دوسری اصطلاح رواداری ہے، اس کا یہ مفہوم تو بالکل صحیح ہے کہ دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو برا نہ سمجھا جائے، ان کی خوبیوں کا اعتراف اور ان کے صلحاء و اخیار کا احترام کیا جائے، ان کے حقوق رفاقت ادا کیے جائیں، ان کے درد دکھ میں شرکت کیجائے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں کہ ان کے دینی عقائد و تصورات کو بھی خواہ وہ ہمارے دین و مذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں مانا جائے اور ان کے مذہبی رسوم و شعائر میں شرکت کیجائے، رواداری کا صحیح مفہوم دوسرے مذہب والوں کے ساتھ حسن معاشرت اور شریفانہ و برادرانہ سلوک ہے، تعصب اس معنی میں تو ناپسندیدہ ہے کہ دوسرے مذہب کو برا سمجھا جائے، ان کے ماننے والوں کی بدخواہی کیجائے، لیکن اپنے فرقہ کی خیر خواہی اور اپنے عقائد میں رسوخ اور عمل میں استقامت تعصب نہیں ہے، بلکہ ہر صاحب مذہب کے لیے ضروری ہے، ہر مذہب کے کچھ مثبت اور کچھ منفی عقائد ہوتے ہیں، مثبت عقائد کا ماننا اور منفی سے انکار ضروری ہے، مثلاً توحید و رسالت اسلام کا رکن اعظم ہیں، اس کے اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، اس لیے کوئی مسلمان اس میں اور دوسرے اسلامی شعائر میں رواداری نہیں برت سکتا، اس قسم کی رواداری وہی مذاہب برت سکتے ہیں جن کے کوئی مثبت اور منفی عقائد نہیں ہیں اور متضاد عقائد رکھنے والے اسمیں داخل رہتے ہیں، دنیاوی نظاموں میں بھی اسی پر عمل ہے، اس کی سب سے بڑی مثال کمیونزم ہے، جو شخص اس کے بنیادی اصولوں سرمایہ داری کی مخالفت اور اقتصادی مساوات کو نہیں مانتا وہ کبھی کمیونسٹ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی کمیونسٹ اس میں رواداری برت سکتا ہے، اس لیے جو چیز دنیاوی نظاموں کے لیے ضروری مانی جاتی ہے، وہ مذہب میں کیوں بری سمجھی جائے، مذہب تو دنیاوی نظاموں سے زیادہ بلند و برتر نظام حیات ہے، درحقیقت یورپ نے مذہب سے جو آزادی حاصل کی ہے اس کو ساری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے،

اور اس کے لیے یہ خوبصورت اصطلاحیں ایجاد کی گئی ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ یورپ جس حد تک اور جس رنگ میں بھی مذہب کو مانتا ہے اس پر آج بھی قائم ہے، اور ان یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر جنھوں نے مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دیا ہے، کوئی یہودی اور عیسائی اپنے عقائد کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو اور یہودی حضرت موسیٰؑ کو انسانوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، تثلیث اور کفارہ پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور ساری دنیا کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اسکے لیے دنیا بھر میں ان کا تبلیغی نظام قائم ہے، یہودی ابتک ارض موعودہ کی واپسی کے لیے دیوار گریہ پر روتے ہیں حتیٰ کہ بت پرست اپنی بت پرستی پر سختی سے قائم ہیں، اور اپنی تہذیب کا کوئی جز بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اس کی فلسفیانہ توجیہیں کرتے ہیں، اس لیے اگر مسلمان اپنے مذہب میں پختگی دکھائیں تو اس کو تعصب پر محمول کیوں کیا جائے،

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

درحقیقت اس زمانہ میں مذہب کو مادی نظاموں سے بھی زیادہ غیراہم بنا دیا گیا ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جب اور دنیاوی نظاموں میں اس کے بنیادی اصولوں سے انحراف کی اجازت نہیں تو مذہب میں اس کی آزادی کیوں ہو، اس معاملہ میں کمیونزم جو اس دور کا سب سے مقبول نظام ہے، سب سے زیادہ سخت ہے، کسی کمیونسٹ کو اس کے کسی جز سے آزادی اور اختلاف کی اجازت نہیں، اس کی سزا کم سے کم پارٹی سے اخراج اور بعض حالتوں میں قتل یا جلاوطنی ہے لیکن مذہب ہی ایسا گیا گذرا ہے کہ ہر آزادی کا مستحق ہے، الفاظ کا جادو بھی عجیب ہے، اس سے جو چیزیں ایک زمانہ میں خوبی و کمال سمجھی جاتی تھیں، عیب بن جاتی ہیں اور عیب برائی بن جاتے ہیں، چنانچہ اشرافِ طبقۂ اعلیٰ، جاگیردار، جاگیرداری اور سرمایہ داری

جو کسی زمانہ میں اعزاز اور امتیاز کے نشان تھے، آج کمیونزم کی اصطلاح میں تحقیر کی علامت بن گئے ہیں، چنانچہ کمیونزم کے مخالفین کو بورژوا، رجعت پسند اور سرمایہ داری کا ایجنٹ کہا جاتا ہے، جو کمیونزم کی اصطلاح میں بہت بڑی گالی ہے۔

گانے بجانے اور رقص و سرود کا پیشہ ایک زمانہ میں ایک خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص تھا، اور کم سے کم مسلمان اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، اور جن لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی، وہ بھی اس کو ثقاہت کے خلاف سمجھتے تھے، اب اس کو کلچرل پروگرام کے لقب سے معزز بنا دیا گیا ہے، جس میں بڑی بڑی شریف زادیاں اپنے کمالات دکھاتی ہیں، یہ تو ایک معمولی مثال ہے، آرٹ اور فنون لطیفہ کے نام سے مشرقی غیرت و حیا کے خلاف کیسی کیسی چیزیں رائج ہو گئی ہیں، اور فحاشیوں تک کو سند جواز مل گئی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک نئی اصطلاح قومی یکجہتی اور قومی دھارے میں بہنے کی نکلی ہے، جس کا مفہوم آج تک واضح نہ ہو سکا، اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے، اختلاف مذہب کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں، برادرانہ الفت و محبت کے ساتھ رہیں، آپس میں انسانی، وطنی اور معاشرتی حقوق و فرائض کا پورا لحاظ رکھیں، ملک کے مفاد میں متحد رہیں، اس کے لیے شانہ بشانہ مل کر کوشش کریں، اس کی خدمت میں کسی کا قدم پیچھے نہ رہے، اس قسم کا اتحاد و یکجہتی ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے ضروری ہے، اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر محب وطن کا فریضہ ہے۔

لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ سب فرقے اپنے مذہبی اور تہذیبی امتیازات مٹا کر ایک رنگ میں رنگ جائیں، اور من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے، اس قسم کا اتحاد و یکجہتی نہ کوئی فرقہ گوارا کرے گا اور نہ عملاً ممکن ہے، کبیر، اکبر اور دارا شکوہ سے لیکر اس زمانہ تک اس کی جتنی کوشش

دمیں سب ناکام رہیں، اور آئندہ بھی ناکام رہیں گی، مذہبی وحدت کا مطالبہ تو اس زمانہ میں رئی بھی نہیں کرسکتا، مکمل تہذیبی وحدت بھی ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ اصلاً اسلامی تہذیب اسلام ے الگ کوئی چیز نہیں، لیکن عربی اور دوسری تہذیبوں کے اختلاط سے ایک نئی تہذیب بن گئی ہے جس میں عربی، ایرانی اور ہندی سب تہذیبوں کے عناصر ہیں، یہی تہذیب صدیوں سے ہندو مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ستھرے طبقہ کی مشترک تہذیب تھی، اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ مشترک بھی تھی اور اس میں دونوں فرقوں کا کلچرل امتیاز بھی قائم تھا، ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ مشترک تہذیب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے، لیکن مسلمانوں میں اب تک قائم ہے، اور وہی ان کا امتیازی نشان رہ گئی ہے، اگر وہ بھی قومی اتحاد و یکجہتی کی نذر ہو جائے تو پھر مسلمانوں کی امتیازی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی، اسی طرح قومی اتحاد و یکجہتی کی سب سے بڑی نشانی اردو کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ سب کو معلوم ہے

اس لیے اتحاد و یکجہتی اور قومی دھارے میں بہنے کا صحیح طریقہ اتحاد ہے، انضمام نہیں جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اور جس کا عملی نمونہ ہندو مسلمان دونوں نان کوآپریشن کی تحریک میں پیش کر چکے ہیں، اس دور کے مسلمان لیڈر شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا ابو الکلام، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے نمائندے بھی تھے اور قومی اتحاد و یکجہتی کا نمونہ بھی، ان کی مذہبیت ان کے حب وطن میں حائل نہ ہو سکی، انہی نے تحریک آزادی میں جان ڈالی تھی، اور انھوں نے وطن کی محبت اور خدمت اور اس کی راہ میں ایثار و قربانی کا وہ نمونہ پیش کیا، جو اس دور کے کٹر سے کٹر قوم پرور اور سیکولر مسلمان بھی نہیں پیش کر سکے، اور آج بھی قومی اتحاد و یکجہتی کا صحیح طریقہ یہی ہے، اس کے سوا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا، اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا،

یہ بحث مختلف قوموں کے درمیان تہذیبی اخذ و استفادہ اور اس کے حدود و شرائط سے شروع ہوئی تھی، درمیان میں ضمناً بعض اور باتیں بھی آگئیں، اس بحث کا یہ مقصد نہیں ہے کہ مسلمان اس ایٹمی دور میں پھر قرون وسطیٰ کی طرف پلٹ جائیں، جن چیزوں میں مغربی تہذیب سے استفادہ ضروری ہے، وہ تو مسلمہ حقیقت بن چکی ہے، اور اس پر ہر قوم عامل ہے اس لیے وہ خارج از بحث ہے، مابکہ مغربی تہذیب کی جو چیزیں ہماری معاشرت کا جز بن چکی ہیں، مثلاً لباس، رہن سہن کے طریقے وغیرہ جن کی کسی خاص قوم کے ساتھ تخصیص نہیں رہ گئی ہے، ان کے متعلق بھی گفتگو نہیں ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب و روایات کے خلاف ہیں اور جن پر ہمارے ملی امتیاز اور تشخص کا دارو مدار ہے، ان میں کورانہ تقلید نہ کیجائے، مثلاً شرعی قوانین اور دینی و ملی شعائر کو مغربی قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہ کیجائے، گو زبان سے کوئی اس کا اقرار نہیں کرتا لیکن اصل مقصد و منشا یہی ہے، ورنہ پرسنل لا میں تبدیلی کا اس کے سوا کیا مقصد ہے؟ اس کے غلط استعمال نے جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں، ان کے ازالہ پر بعد میں بحث آئے گی:

ہماری تقلید کا تو یہ حال ہے کہ یورپ کے مفکرین اور سماجی مصلح تجربہ کے بعد جن چیزوں کو مغربی معاشرہ کے لیے مہلک سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف آوازیں بلند کرتے رہتے ہیں، انہی میں بھی ہم پرانی لکیر کو پیٹتے چلے جاتے ہیں، مثلاً عورتوں کی بے مہار آزادی، مردوں سے بیباکانہ اختلاط، شوہروں سے بے نیازی، گھریلو ذمہ داریوں سے آزادی، کلب اور سیر سپاٹے کی زندگی جس نے یورپ کی خانگی زندگی کی مسرتوں کو ختم کر دیا ہے، اور میاں بیوی دونوں گھروں کے بجائے بازاروں میں سکون تلاش کرتے ہیں، اور ان میں ایسی ایسی مضحکہ انگیز باتوں پر طلاق ہوتی ہے کہ ہم مشرقی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے،

ہندوستانی عورت ابھی ترقی کی اس منزل پر تو نہیں پہنچی ہے لیکن اس کے قدم تیزی سے اسکی طرف بڑھ رہے ہیں، اس کا مشاہدہ بڑے شہروں کی سوسائیٹیوں اور عورتوں اور مردوں کے مخلوط مجمعوں میں کیا جا سکتا ہے، جو حسن کا بازار اور دلبری و دلستانی کی نمائش گاہ معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے شرمناک نتائج ہوسٹلوں اور کالجوں میں دیکھے جا سکتے ہیں، اس کے شرمناک واقعات آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، اب ہماری تعلیم گاہیں تعلیم و تربیت کا گہوارہ ہونے کے بجائے حسن و عشق کی درسگاہ بن گئی ہیں، بغیر کسی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دینے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے، اتفاق سے جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں، اخبارات میں مخلوط تعلیم کی مخالفت میں ایک امریکن ماہر تعلیم کا بیان نظر سے گذرا، سینما سے اصلاح و تربیت کا بھی کام لیا جا سکتا ہے لیکن مذاق اتنا بگڑ گیا ہے کہ ہمارے نوجوان ان سے صرف عشق و عاشقی اور جرائم کا سبق سیکھتے ہیں جس کی تصدیق اخبارات سے ہوتی رہتی ہے، اس ماحول میں نوجوانوں کا بگڑنا تعجب انگیز نہیں، سلامت روی پر قائم رہنا تعجب انگیز ہے یہ تو صرف چند موٹی موٹی مثالیں دی گئیں، ورنہ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی حال ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم یورپ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں لیکن ذہنی اور دماغی غلامی میں بدستور گرفتار ہیں، ہر چیز کو اسی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے اور اسیکے ساختہ دماغ سے سوچتے ہیں، خود ہمارے دماغوں سے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی اور جن چیزوں کو تجدید و اصلاح کے نام سے پیش کیا جاتا ہے درحقیقت وہ بھی تقلید ہوتی اور اس کی جو آواز بھی اٹھتی ہے وہ یورپ کی صدائے بازگشت ہے، اگر ہمارے متجددین ایک بات بھی اپنے دماغ سے کہتے تو بھی اس میں کچھ وزن ہوتا۔

تاہم اس سے انکار نہیں کہ بعض پرانے مسائل میں ترمیم اور نئے مسائل کا حل نکالنے کی ضرورت ہے، مگر اس کا معیار یہ نہیں ہے کہ یہ مسائل جدید رجحان کے خلاف ہیں، اس لیے ان میں ترمیم کیجائے بلکہ یہ ہے کہ اس سے واقعی مسلمانوں کو دشواریاں پیش آتی ہیں یا کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے، اس قسم کے مسائل ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور اس دور کے علماء و مفکرین انکا حل نکالتے رہے ہیں۔ اس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ سے شروع ہوگیا تھا۔ پھر اس سلسلہ کے علما اور سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اپنے اپنے دائرہ میں نئے مسائل حل کیے۔ اب اس دور کے جو نئے مسائل ہیں اس زمانہ کے علماء کو ان کا حل نکالنا ہے، اب تک اس میں دو رکاوٹیں رہی ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی نظام نہیں ہے، جو اس قسم کے کاموں کو انجام دے سکے، اگر امارت شرعیہ بہار کے طرز پر پورے ہندوستان میں ایک وسیع اور مؤثر نظام قائم ہو جائے جس کو سارے مسلمان مان لیں اور اس کے فیصلوں کو عدالت کے فیصلوں کی طرح تسلیم کریں تو بہت سی مشکلات دور ہو جائیں، دوسرا سبب تقلید جامد ہے، ہمارے علما نئے مسائل میں جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے جھجکتے ہیں، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح علمائے قدیم نے اپنے دور کے مسائل حل کیے، اس زمانہ کے علما موجودہ دور کے مسائل کو حل نہ کر سکیں، بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ اگر ان میں کسی خاص مکتب فقہ کی پابندی ضروری نہ سمجھی جائے تو کسی نہ کسی مکتب فقہ میں ان کا حل نکل آئے گا، اور جو اس سے حل نہ ہو سکیں تو کتاب و سنت، استنباط مسائل کے شرعی اصولوں اور گذشتہ نظائر کی روشنی میں ان کا حل نکالا جائے، اس لیے جس طرح علماء نے پرسنل لا کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اسی طرح دوسرے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے،

جو طبقہ اس مطالبہ میں زیادہ سرگرم ہے، وہ مبہم باتیں کہتا ہے، یہ نہیں بتاتا کہ پرانے

کن مسائل میں کس قسم کی ترمیم اور نئے مسائل کا کس قسم کا حل چاہتا ہے، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو علانیہ شرعی قوانین کو مغربی انداز میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ تو خارج از بحث ہیں لیکن کچھ مخلصین ہیں جو مسلمانوں کی خیرخواہی میں اس دور کی مشکلات اور مسائل کا حل چاہتے ہیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کے مسائل کی ایک فہرست تیار کیجائے اور جو مسئلہ جس دائرے سے تعلق رکھتا ہو اسکے ماہرین اور علماء مل کر اسکے حل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ مسائل کسی خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ عالمگیر ہیں، اور اسلامی ملکوں نے ان کو حل کیا ہے بعض نے تو مغربی قوانین کی کورانہ تقلید کی ہے، اور بعض نے شریعت کے اصولوں کی روشنی میں ان کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے مجموعے مرتب کیے ہیں اور مصر کے علماء نے فقہ جدید پر کتابیں لکھی ہیں، خود ہندوستان کے علماء نے ان پر مضامین اور کتابیں لکھی ہیں، اس لیے اب ان مسائل کا حل زیادہ دشوار نہیں ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے، مگر اس سے زیادہ وسیع پیمانہ اور اجتماعی طریقہ پر اس کام کو انجام دینے کی ضرورت ہے، ورنہ زمانہ خود اپنے ذوق و رجحان کے مطابق ان کو حل کرے گا، جس کی ذمہ داری علماء پر ہوگی۔

حدیث کا درایتی معیار

داخلی نقد حدیث

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۳)

چند موضوع حدیثیں

یقول (النبطی) قتلة	رسول اللہ صلعم فرماتے تھے کہ نبطی قوم نبیوں
الانبیاء واعوان الظلمة فاذا	کے قاتل اور ظالموں کے مددگار ہیں ،
اتخذ والرباع وشیدوا البنیان	جب وہ حویلی بنانے لگیں اور عمارت
فالھرب الھرب[۱]	مضبوط کرنے لگیں تو ان سے بھاگو ،
اربع مدائن من مدن النار	چار شہر دوزخ کے شہروں میں سے ہیں
فی الدنیا القسطنطنیة والطبریة	(۱) قسطنطنیہ (۲) طبریہ (۳) جلا ہوا
والطاکیة المحترقة وصنعا[۲]	انطاکیہ اور (۴) صنعاء۔
لوعلم اللہ فی الخصیان خیراً	اگر اللہ تعالیٰ خصی ہیجڑا میں خیر بھلائی
لاخرج من اصلابھم ذریة	جانتا تو ان کی پشت سے ایسی اولاد نکالتا
یعبدون اللہ[۳]	جو اللہ کی عبادت کرتے ۔
شر المال فی آخر الزمان الممالیك[۴]	آخر زمانہ میں بدترین مال غلام ہونگے ۔

---

[۱] جلال الدین السیوطی، اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة، باب بقیة المناقب [۲] ایضاً مناقب البلاد والایام [۳] المنار المنیف فصل ۲۵ و موضوعات کبیر ص ۱۲۳ مطبع محمدی

رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں	(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں جو رسول اللہ

کی شان سے بعید ہوں۔

اشتمالہ علی امثال ھذہ المجازفات — رسول اللہ علیہ وسلم کی حدیث ایسی
التی لا یقول مثلہا رسول اللہ — بیڈھنگی باتوں پر مشتمل ہو جو آپ کی زبان
صلی اللہ علیہ وسلم[۱] — سے نہیں نکل سکتی ہیں،

عربی کا محاورہ ہے "جازف فی کلامہ" یعنی۔

تکلم من غیر قانون وبدون تبصر[۲] — قاعدہ قانون اور سمجھ بوجھ کا لحاظ کیے بغیر بات کہہ دی

اسکے تحت چند موضوع حدیثیں	اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع ہیں :-

من قال لا الہ الا اللہ خلق اللہ — جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اللہ تعالیٰ
من تلک الکلمۃ طائرا لہ سبعون — اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرے گا جس کے
الف لسان لکل لسان سبعون الف لغۃ — ستر ہزار زبانیں ہونگی۔ ہر زبان کی ستر ہزار
یستغفرون اللہ[۳] — لغت ہوں گی اور وہ استغفار کریں گی۔

یا مثلاً جس شخص نے فلاں کام کیا اس کے لیے ستر ہزار شہر ہوں گے، ہر شہر میں ستر ہزار محل ہوں گے اور ہر محل میں ستر ہزار حوریں ہوں گی[۴]۔

من ترک الصلوۃ حتی مضی وقتہا — جس شخص نے نماز چھوڑ دی یہاں تک کہ
ثم قضی عذب فی النار حقبا — اس کا وقت گذر گیا، پھر قضا کی تو اسکو

---

[۱] المنار المنیف فصل ۶ و موضوعات کبیر ص۱۰۸ مطبع محمدی [۲] المنجد [۳] موضوعات کبیر ص۱۱

والحقب ثمانون سنة والسنة	ایک "حقب" آگ کا عذاب دیا جائے گا،
ثلثمائة وستون يوما كل يوم كان	"حقب" اسّی سال کا ہوتا ہے اور ہر سال
مقدارہ الف سنة[1]	تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے اور (قیامت کے)
	ہر دن کی مقدار ایک ہزار سال کی ہے،

اس لحاظ سے دو کرور اٹھاسی لاکھ سال کی سزا صرف ایک وقت کی نماز چھوڑ دینے سے ہوئی وہ بھی جس کی قضا پڑھ لی گئی ہو،

ركعتان من العاقل افضل من	عاقل کی دو رکعتیں جاہل کی ستر رکعتوں
سبعين ركعة من الجاهل	سے افضل ہیں، اور اگر میں سات سو کہوں
ولو قلت سبعمائة ركعة لكان	تو وہ بھی درست ہے۔
كذا عات[2]	

اعتبروا عقل الرجل فی طول	داڑھی کی لمبائی، انگوٹھی کے نقش اور کنیت
لحيته ونقش خاتمه وكنيته[3]	سے آدمی کے عقل کا اندازہ کرو، جس کسی
من شم الورد ولم يصل علی	شخص نے گلاب کا پھول سونگھا اور میرے
فقد جفانی[4]	اوپر درود نہیں بھیجا اس نے میرے اوپر ظلم کیا،
من قال فی كل يوم ثلاث مرات	جس نے ہر دن تین مرتبہ صلوات اللہ علی آدم
صلوات الله علی آدم غفر الله	کہا تو اللہ اس کے گناہوں کو بخش دیگا اگرچہ
له الذنوب وان كانت اكثر من	وہ گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں اور جنت
زبد البحر وكان فی الجنة رفيق آدم[5]	میں وہ آدم کا رفیق ہوگا۔

---

(۱) مجالس الابرار المجلس الحادی والخمسون (۲) تذکرۃ الموضوعات باب العقل والبلاہ (۳) ایضاً (۴) ایضاً باب فضل الصلوٰۃ وکتابتہا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں لغویت اور تمسخر اور کم عقلی و بے قوفی کی بات پائی جائے

جس حدیث میں ایسی لغویت و تمسخر اور کم عقلی و بے قوفی کی بات پائی جائے جس سے ذمہ دار لوگ پرہیز کرتے ہیں ۔

سماجة الحديث وكونه مما يسخر منه[1]	حدیث میں لغویت اور ایسی بات ہو کہ جس سے تمسخر کیا جاتا ہے ،

اسکے تحت چند موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں ،

لو كان الارز رجلا لكان حليما ما اكله جائع الا اشبعه[2]	اگر چاول مرد ہوتا تو وہ بردبار ہوتا ، جو بھوکا بھی اسکو کھاتا شکم سیر ہو جاتا ،
فضل دهن البنفسج على الادهان كفضل اهل البيت على سائر الخلق[3]	بنفشہ کے تیل کی فضیلت دوسرے تیلوں پر ایسی ہے جیسی اہلبیت کی فضیلت تمام مخلوق پر ہے -
نقطة من دواة عالم احب الى الله من عرق مائة ثواب شهيد[4]	عالم کی دوات کا ایک نقطہ اللہ کو شہید کے سو کپڑوں کے پسینہ سے زیادہ محبوب ہے ۔
لا تقولوا قوس قزح فان قزح هو الشيطان لكن قولوا قوس الله فهو امان لاهل الارض من الغرق[5]	قوس قزح نہ کہو کیونکہ قزح شیطان ہے قوس اللہ کہو کہ اسکے ذریعہ غرق سے اہل زمین کی حفاظت ہوتی ہے ۔

---

[1] المنار المنیف فصل ۸ موضوعات کبیر ص۱۱۱ [2] تذکرۃ الموضوعات باب المحبوب من العدس ۔

[3] المنار المنیف فصل ۸ [4] تذکرۃ الموضوعات باب فی من ارش الصحبۃ [5] محمد بن شوکانی ۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ خاتمہ فی احادیث متفرقۃ

لا تضربوا اولادکم علی بکائهم
فبکاء الصبی اربعة اشهر شهادة
ان لا اله الا الله واربعة اشهر
الصلوٰة علی محمد صلی الله علیه وسلم
واربعة اشهر دعاء لوالدیه[1]
ان لابراهیم الخلیل ولابی بکر
الصدیق لحیة فی الجنة[2]
نبات الشعر فی الانف امان من
الجذام[3]
انه صلی الله علیه وسلم کان اذا بلغه
عن احد من اصحابه شدة
عبادة یسأل کیف عقله فان
قالوا حسن قال ارجوه واذا قالوا
غیر ذالک قال لو یبلغ صاحبك
حیث تظنون[4]
الله للقلب فرحه عند اکل اللحم[5]

اپنی اولاد کو رونے پر نہ مارو چار مہینے[1] تک
بچے کے رونے میں لا الہ الا اللہ کی شہادت
ہوتی ہے، اور چار مہینے تک وہ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے اور چار مہینے
تک اپنے والدین کے لیے دعا کرتا ہے۔
جنت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ابوبکر
صدیق کی داڑھی ہوگی،
ناک میں بال اگنا جذام سے امن کی
علامت ہے،
رسول اللہ کو جب آپ کے صحابیوں میں سے
کسی کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ بہت
عبادت کرتا ہے تو اس کی عقل کے بارے میں
معلوم کرتے اگر کہا جاتا کہ عقل ٹھیک ہے
تو فرماتے کہ میں خیر کی امید کرتا ہوں، اور اگر کہا جاتا
کہ ٹھیک نہیں ہے تو فرماتے کہ کاش تمہارا
ساتھی تمہارے گمان کے مطابق ہو جائے۔
گوشت کھانے کے وقت قلب کو
فرحت ہوتی ہے۔

---

[1] محمد بن شوکانی: الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعہ خاتمہ فی احادیث متفرقہ [2] علامہ سخاوی المقاصد الحسنہ حرف الہمزہ [3] محمد بن شوکانی الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعہ خاتمہ فی ذکر احادیث متفرقہ۔ [4] ایضاً [5] المنار المنیف فصل ۸۔

ذرۃ من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال الظاہر[1]	باطنی اعمال کا ایک ذرہ ظاہری اعمال کے اونچے اور مضبوط پہاڑ سے بہتر ہے۔
علیکم بالملح فانہ شفاء من کل داء[2]	نمک ضرور کھاؤ اس میں ہر بیماری کی شفاء ہے۔

مذکورہ مجازفات (بے ڈھنگا پن) اور سماجت (لغویت) کے تحت یہ بھی آتا ہے کہ

(۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے واقعہ کی تشریح اس انداز سے ہو کہ نبوت پر حرف آئے، اور معیار نبوت برقرار نہ رہے، جیسا کہ حضرت آمنہ سے منقول ہے۔

رسول اللہ کی پیدائش کے واقعہ میں شان نبوت پر حرف آئے اور معیار نبوت برقرار نہ رہے

"جس وقت میں حاملہ ہوئی تو پیدائش کے وقت تک میں کسی قسم کی تکلیف (جو دوسری عورتوں کو ہوتی ہے) میں مبتلا نہیں ہوئی۔"

"پیدائش کے بعد آپ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور آپ کے ساتھ ایک نور نکلا جس نے مشرق و مغرب کو روشن کر دیا، میں نے اس کے ذریعہ شام کے محلات دیکھے یہاں تک کہ بصریٰ میں اونٹوں کو سر اٹھائے ہوئے دیکھا۔"[3]

"مجھے یہ بشارت دی گئی کہ تو خیر الثقلین کے ساتھ حاملہ ہے اور پیدائش کے بعد اسکا نام محمد رکھنا۔"

"مجھے سفید شربت پیش کیا گیا جو شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔"

"پرندوں کے ایک جھنڈ نے میرے حجرے کو ڈھک لیا جس کی "زمرد" کی چونچ تھی اور "یاقوت"

---

[1] تذکرۃ الموضوعات باب خرقۃ الصوفیہ (۲) المنار المنیف فصل ۸ (۳) ابن عساکر الشافعی تاریخ ابن عساکر باب ذکر مولد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

کے پرتھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور ندا آئی کہ اس کو مشرق و مغرب کی سیر کرادو تاکہ سب لوگ پہچان لیں۔"

"پیدائش کے وقت ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش فارس بجھ گئی جو ایک ہزار سال سے نہ بجھی تھی اور بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا وغیرہ[1]"

اس قسم کی روایتیں تاریخ وسیر کی کتابوں میں ملتی ہیں مگر حدیث کی مستند کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ تاریخ وسیر کی کتابوں میں داخلی نقد حدیث کے اصول بالعموم نظر انداز کر دیے گئے ہیں، پھر رسول اللہؐ کی پیدائش کے وقت کوئی صحابی موجود نہ تھا جس کی روایت قابل قبول ہو، ایسی حالت میں یہ روایتیں یا عوامی شہرت کی بنا پر ہوں گی یا رسول اللہؐ نے خود اس کی وضاحت فرمائی ہو گی، اگر ان واقعات کی شہرت اس طرح ہوتی جیسی ان روایتوں سے ظاہر ہوتی ہے تو بعد میں رسول اللہ کو تبلیغ رسالت میں جس قدر دشواریاں پیش آئیں وہ نہ پیش آتیں، اور ہر شخص ان واقعات کی شہرت کی بنا پر ایمان لانے پر مجبور ہوتا، اور اگر رسول اللہؐ نے بنفس نفیس ان کی وضاحت فرمائی ہوتی تو اتنے اہم واقعات کا تذکرہ حدیث کے مستند ذخیروں میں ضرور ہوتا، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی پیدائش کے وقت کے ان دلائل نبوت کو محدثین ..... نظر انداز کر دیتے،

پھر تاریخ وسیر کی کتابوں میں ان واقعات کا جس انداز سے ذکر ہے، ایک معمولی آدمی بھی اپنی پیدائش کے واقعات اس طرح بیان کرنا پسند نہیں کرتا، چہ جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اس سے ارفع و اعلیٰ تھی،

---

[1] محمد بن عبد الباقی الزرقانی، شرح المواہب اللدنیہ ج ۱، المقصد الاول باب فی تشریف اللہ تعالیٰ له علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو، چہ جائیکہ رسول اللہ کا کلام جس کو مختلف وجوہ سے فوقیت حاصل ہے،

ان یکون کلامہ لا یشبہ	آپ کی طرف منسوب کلام نبیوں کے
کلام الانبیاء فضلا عن کلام	کلام کے مشابہ نہ ہو چہ جائیکہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]	کا کلام،

آدمؑ کے قبول توبہ کا ایک موضوع واقعہ

مثلاً آدمؑ کے قبول توبہ کا واقعہ،

لما اقترف آدم الخطیئۃ قال	جب حضرت آدمؑ سے غلطی سرزد ہوگئی تو انھوں نے
یارب اسألک بحق محمد لما	عرض کیا کہ اے اللہ میں آپ کو محمد کا واسطہ دیتا
غفرت لی قال وکیف عرفت	ہوں کہ آپ میری خطا معاف فرمادیں، اللہ
محمدا قال لانک خلقتنی	نے فرمایا کہ تم نے محمدؐ کو کیسے جانا، حضرت آدمؑ نے
بیدک ونفخت فی من روحک	جواب دیا کہ جب آپ نے مجھ کو پیدا کیا اور مجھ میں اپنی
رفعت رأسی فرأیت علی قوائم	روح سے (کچھ) پھونکدیا تو میں نے سر اٹھا کر عرش
العرش مکتوبا لا الہ الا اللہ	کے پایوں پر نظر ڈالی تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
محمد رسول اللہ فعلمت انک	لکھا ہوا دیکھا، اس سے میں نے سمجھ لیا کہ آپ نے
لم تضیف الی اسمک الا احب	اپنے نام کے ساتھ جس کا نام شامل کیا ہو وہ
الخلق الیک قال صدقت	یقیناً آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہوگا، اللہ نے
یا آدم ولولا محمد ما خلقتک[2]	فرمایا اے آدم تم نے سچ کہا، اگر محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو بھی

[1] المنار المنیف فصل ۱۲، وموضوعات کبیر ص ۱۱۸ [2] حاکم مستدرک باب استغفار آدم علیہ السلام بحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"حاکم" نے اس حدیث کو "صحیح" قرار دیا ہے لیکن اس میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم راوی بالاتفاق ضعیف ہے، غالباً اسی بنا پر ابن تیمیہؒ نے حدیث نقل کرنے کے بعد کہا ہے،

واما تصحیح الحاکم لمثل هذا الحدیث	حاکم کے اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنے پر
وامثاله فهذا مما انکر علیه	ائمۂ حدیث نے نکیر کی ہے، اور کہا ہے کہ
ائمة العلم بالحدیث فقالوا	حاکم بہت سی ان حدیثوں کو صحیح کہتے
ان الحاکم یصحح احادیث وهو	ہیں جو ماہرین حدیث کے نزدیک موضوع
موضوعة مکذوبة عند اهل	اور جھوٹی ہوتی ہیں،
المعرفة بالحدیث[1]	

اسی طرح حضرت آدمؑ کے رونے سے متعلق روایتیں کہ تمام آدمیوں کا رونا جمع کیا جائے تو بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا یا انکے آنسوؤں کو اولاد آدم کے آنسوؤں سے وزن کیا جائے تو آدمؑ کے آنسو کا پلہ جھک جائے وغیرہ،

عرش معلی پر جانے کی روایت موضوع ہے | یا معراج کے واقعہ میں یہ حدیث کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج تشریف لے گئے اور عرش معلی تک پہنچے، تو آپ نے نعلین مبارک اتارنے کا ارادہ کیا (جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی مقدس طویٰ میں اتارا تھا) تو ندا آئی

یا محمد لا تخلع نعلیك فان	اے محمد! آپ نعلین نہ اتاریے
العرش یتشرف بقدومك	عرش آپ کے نعلین پہنکر آنے سے
متنعلا[2]	شرف حاصل کرے گا،

---

[1] ابن تیمیہ کتاب التوسل سوال آدم بحق محمدؐ [2] مولانا عبدالحئی لکھنوی. الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعۃ ص ۲۶،

احمد مغربی المالکی نے اپنی کتاب "فتح المتعال فی مدح خیر النعال" میں اس پورے قصہ کو موضوع قرار دیا ہے، کیونکہ معراج کی کسی مستند روایت سے نہ عرش پر جانا ثابت ہے اور نہ جوتا پہنکر تشریف لے جانا، [۱]

علم و حسن سے متعلق بعض موضوع روایتیں | یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و حسن سے متعلق بعض روایتیں کہ آپ کو پیدائش ہی کے وقت سے پورے قرآن کا علم تھا حضرت جبریلؑ کے جواب میں آپ کے "ما انا بقارئ (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) فرمانے کا مطلب یہ تھا،

لا اقرأ بامرك فانی عالم به قاری من قبل [۲]	میں آپ کے حکم سے نہ پڑھوں گا کیونکہ میں پہلے ہی سے عالم و قاری ہوں،

اسی طرح یہ واقعہ کہ

انه فی لیلة من اللیالی سقطت من ید عائشة ابرتها ففقدت فالتمستها ولم تجد فضحك النبی صلی اللہ علیہ وسلم وخرجت لمعة اسنانه فاضاءت الحجرة ورأت عائشة بذلك الضوء ابرتها [۳]	ایک رات حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے سوئی گر گئی اور تلاش کرنے کے باوجود نہ مل سکی، اس پر رسول اللہؐ کو ہنسی آئی، اور آپ کے دانتوں کی چمک سے حجرہ اتنا روشن ہو گیا کہ سوئی مل گئی،

اس قسم کی اور روایتیں بھی ہیں جن کو واعظ اور میلاد خواں بیان کرتے ہیں، اگرچہ ان کا تذکرہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں ہے لیکن روایۃً و درایۃً وہ موضوع ہیں، [۴]

---

[۱] الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ ص ۲۴۷ [۲] ایضاً ص ۲۹ [۳] ایضاً ص ۲ [۴] ایضاً

خرقۂ صوفیہ کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف صحیح نہیں ہے، | یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خرقۂ صوفیہ کی نسبت محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی کہتے ہیں

انہ لیس فی شیٔ من طرقھا
ما یثبت ولم یرو فی خبر صحیح
ولا حسن ولا ضعیف ان النبی
صلی اللہ علیہ وسلم البس الخرقۃ
علی الصورۃ المتعارفۃ بین الصوفیۃ
لاحد من اصحابہ ولا امر
احدا من اصحابہ یفعل
ذلک وکل ما یروی فی ذلک
صریحا فباطل [1]

صوفیہ میں خرقہ پہنانے کی جو صورتیں متعارف ہیں ان کے مطابق رسول اللہ نے کسی صحابی کو خرقہ پہنانا، ان کو ایسا کرنے کا حکم دینا کسی صحیح حسن اور ضعیف روایت سے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اس سلسلہ میں روایت کیا جاتا ہے وہ سب صراحۃً باطل ہے ۔

حضرت علیؓ کا حضرت حسن بصری کو خرقہ پہنانا ثابت نہیں ہے | اسی طرح حضرت علیؓ کا حضرت حسن بصری کو خرقہ پہنانا بھی ثابت نہیں ہے،

فان ائمۃ الحدیث لم یثبتوا
للحسن من علی سماعا فضلا
عن ان یلبسہ [2]

ائمۂ حدیث کے نزدیک حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصری کا سماع (ملاقات) بھی ثابت نہیں ہے، خرقہ پہنانا تو دور کی بات ہے۔

فقراء صوفیہ سے متعلق بعض موضوع روایتیں | اسی طرح فقراء صوفیاء سے متعلق یہ حدیثیں بھی موضوع ہیں،

حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء کی

---

[1] محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی: المقاصد الحسنۃ [2] ایضاً

مجلسا للفقراء ورقص حتی شق	مجلس میں تشریف لائے اور رقص کیا
قمیصه [1]	یہانتک کہ اپنی قمیص پھاڑ ڈالی ،
اتخذوا مع الفقراء ایادی فان	فقراء کے ساتھ احسان کرو ، قیامت
لھم دولة یوم القیمة [2]	کے دن ان کے پاس دولت ہوگی ،
من اکل مع مغفور له غفر له [3]	جس شخص نے اس شخص کیساتھ کھایا جسکی مغفرت کیگئی
من سرہ ان یجلس مع اللہ فلیجلس	جو شخص اللہ کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتا ہے
مع اھل التصوف [4]	اس کو صوفیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے ،

رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب حدیث فی نفسہ باطل ہو

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث ایسی کھلی ہوئی باطل ہو کہ اس کا بطلان خود دلالت کرتا ہو کہ یہ اللہ کے رسولؐ کا کلام نہیں ہو سکتا ،

ان یکون الحدیث باطلا فی	حدیث فی نفسہ ایسی باطل ہو جس کا
نفسه فیدل بطلانه علی انه	بطلان دلالت کرتا ہو کہ یہ رسول اللہ صلعم
لیس من کلام الرسول صلی اللہ	کا کلام نہیں ہوسکتا ،
علیه وسلم [5]	

اس اصول کے تحت چند موضوع حدیثیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پاتی ہیں ،

ابغض الکلام الی اللہ تعالیٰ	اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ
الفارسیة وکلام الشیطان	کلام فارسی ہے ، اور شیطان کا کلام

[1، ۲ و ۳] المنار المنیف فصل ۴۰ [4] تذکرۃ الموضوعات باب اللباس الخ [5] ملا علی قاری موضوعات کبیر ص ۱۱۳ و

عربی	ترجمہ
الخوزیة وکلام اهل النار	خوزیوں (ایک قبیلہ) کا کلام ہے اور
البخاریة[1]	دوزخیوں کا کلام، بخاریوں کا کلام ہے،
ان اللہ تعالیٰ اذا رضی انزل	اللہ جب خوش ہوتا ہے تو عربی زبان
الوحی بالعربیة واذا غضب	میں وحی اتارتا ہے اور جب ناراض ہوتا
انزل الوحی بالفارسیة[2]	ہے تو فارسی زبان میں وحی اتارتا ہے،
من تکلم بالفارسیة زادت	جو شخص فارسی زبان میں گفتگو کرتا ہے اسکی
فی خبثه ونقصت من مروته[3]	دنائت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اسکی
	شرافت میں کمی آجاتی ہے،
ست خصال تورث النسیان	چھ چیزیں نسیان پیدا کرتی ہیں (۱) چوہے
اکل سور الفار والقاء القمل	کا جھوٹا کھانا (۲) آگ میں زندہ جوں
فی النار وهی حیة والبول فی الماء	ڈالنا (۳) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا
الراکد وقطع القطار ومضغ	(۴) اونٹ کی قطار کے درمیان سے نکلنا
العلك واکل التفاح الحامض	(۵) گوند چبانا (۶) کھٹا سیب کھانا۔
الحجامة علی القفا تورث النسیان[5]	گدی پر پچھنا لگانا نسیان پیدا کرتا ہے،
یا حمیراء لا تغتسلی بالماء المشمس	اے عائشہ سورج سے گرم پانی سے غسل
فانه یورث البرص[6]	نہ کیا کرو اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔
آلیت علی نفسی ان لا یدخل	میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جس کا نام احمد یا محمد

---

[1]تا[3] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات باب مدح العرب والعجم [4] العجلونی کشف الخفاء، ص ۴۴۴
[5]: المنار المنیف فصل ۱۱ [6] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۳

النار من اسمہ احمد محمد[1]	سو گا وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔
من ولد لہ مولود فسماہ	جس شخص کے لڑکا پیدا ہوا اور اس نے
محمد تبرکا بہ کان ہو والدہ	برکت حاصل کرنے کے لیے اس کا نام محمد
فی الجنۃ[2]	رکھا تو لڑکا اور باپ دونوں جنت میں
	جائیں گے۔
ما من مسلم دنا من زوجتہ	جو مسلمان اپنی بیوی کے پاس اس نیت
وھو ینوی ان حبلت منہ	سے گیا کہ اس سے جو حمل ہوگا اس کا
ان یسمیہ محمد الا رزقہ	نام محمد رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو
ولدا ذکرا[3]	لڑکا عطا کرے گا۔
ما من عبد یبکی یوم قتل حسین	اللہ کا جو بندہ شہادت حسین کے دن
الا کان یوم القیمۃ مع اولی	روئے گا قیامت کے دن اس کا حشر
العزم من الرسل[4]	اولو العزم رسولوں کے ساتھ ہوگا۔
لو احسن احد کم ظنہ بحجر	تم میں سے جو شخص پتھر کے ساتھ بھی حسن ظن
لنفعہ[5]	رکھے گا تو وہ اس کو نفع دیگا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث محسوس عالم، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہے

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث محسوس عالم، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو۔ ابوالحسن علی ابن محمد کنانی لکھتے ہیں۔

---

[1] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] تذکرۃ الموضوعات فمن ادعی الصحبۃ کذب

[5] المنار المنیف فصل ۴۹

ویلتحق بہ ما یدفعہ الحس والمشاھدۃ او العادۃ[1]　　رکاکت میں وہ حدیثیں بھی آتی ہیں جو حس، مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہوں۔

علامہ سخاوی کہتے ہیں:

او یکون مما یدفعہ الحس و المشاھدۃ[2]　　یا ایسی حدیثیں ہوں جن کو حس اور مشاہدہ قبول نہ کرے۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع قرار پائی ہیں۔

السواک یزید الرجل فصاحۃ[3]　　مسواک سے فصاحت میں زیادتی ہوتی ہے۔

اذا عطس الرجل عند الحدیث فھو صدق[4]　　جب بات کے وقت آدمی چھینکے تو وہ سچا ہے۔

من قارف ذنبا فارقہ عقل لم یعد الیہ[5]　　جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اسکی عقل اس سے جدا ہو جاتی ہے، پھر نہیں لوٹتی ہے۔

ایک شخص نے اولاد کم ہونے کی شکایت کی تو رسول اللہؐ نے اس کو پیاز اور انڈا کھانے کا حکم دیا، اس نے پوچھا کس کے انڈے کھائے جائیں، آپ نے جواب میں فرمایا

کل بیض ولو بیض النمل[6]　　ہر انڈا خواہ چیونٹیوں کا ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] ابوالحسن علی کنانی: تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعۃ فصل فی امارات الموضوع الخ [2] فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث الموضوع [3] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات باب خصال الوضوء الخ [4] موضوعات کبیر فصل ونحن ننبہ الخ [5] تذکرۃ الموضوعات باب خصال الوضوء الخ [6] ایضاً فصل السعی فی الاولاد

النطفة التی تخلق منها الولد	جس نطفہ سے لڑکا پیدا ہوتا ہے جب
ترعد لها الاعضاء والعروق ؟	نکل کر رحم میں گرتا ہے تو تمام اعضا اور
کلها اذا اخرجت ووقعت ...	عروق میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔
ان یمن المرأة تبکیرها بالانثیٰ[۲]	عورت کی برکت پہلے لڑکی جننا ہے۔
اشربوا علی الطعام تشتبعوا[۳]	کھانے پر پانی پی لیا کرو سیراب ہو جاؤ گے،
لا یفعلن احدکم امرا حتی	تم میں سے کوئی شخص کوئی کام مشورہ
یستشیر فان لم یجد من	کیے بغیر نہ کرے، اگر مشورہ دینے والا نہ ملے
یستشیر فلیستشیر امراة	تو عورت سے مشورہ کرے، پھر اس کے
ثم لیخالفها فان فی خلافها	خلاف کرے، کیونکہ عورت کے خلاف
البرکة[۴]	کرنے میں برکت ہے،
شرارکم عزابکم[۵]	تم میں بدترین غیر شادی شدہ لوگ ہیں،
رکعتان من المتزوج افضل	شادی شدہ کی دو رکعتیں غیر شادی شدہ
من سبعین رکعة من الاعزب[۶]	کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں،

اسی طرح غیر شادی شدہ لوگوں کی فضیلت سے جس قدر حدیثیں ہیں، سب موضوع ہیں[۷]،

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو، | (۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو یعنی فرد واحد یا کسی خاص طبقہ کی عقل کے خلاف نہیں، بلکہ عام طور پر لوگ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں،

---

[۱] تذکرۃ الموضوعات فصل السعی فی الاولاد [۲] موضوعات کبیر ص ۱۱۱ [۳] ایضاً [۴] تذکرۃ الموضوعات باب تادیب النساء الخ [۵] ایضاً فصل النکاح الخ [۶] المنار المنیف فصل ۳۲

ابن جوزیؒ کہتے ہیں

کل حدیث رأیتہ یخالف المعقول	ہر وہ حدیث جس کو تم معقول (عقل) کے خلاف ....
فاعلم انہ موضوع فلا تتکلف اعتبارہ[1]	دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا،

مختلف محدثین نے ابن جوزیؒ ہی کے حوالہ سے یہ اصول نقل کیا ہے،
علامہ سخاویؒ اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں،

ای لا تعتبر رواتہ و لا تنظر فی جرحھم[2]	یعنی ایسی حدیث کے راویوں کا اعتبار نہ ہوگا اور نہ ان کی جرح میں نظر کی جائے گی (اس کے بغیر ہی وہ رد ہو جائے گی)

اسکی مزید وضاحت ابن جوزی کی اس عبارت سے ہوتی ہے،

الا تری انہ لو اجتمع خلق من الثقات فاخبروا ان الجمل قد دخل فی سم الخیاط لما نفعتنا ثقتھم ولا اثرت فی خبرھم لانھم اخبروا بمستحیل[3]	کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اگر ثقہ لوگوں کی ایک پوری جماعت خبر دے کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو گیا تو نہ ان کی ثقاہت ہمیں نفع دے گی اور نہ ان کی خبر ہی... اثر کرے گی؛ کیونکہ انھوں نے امر محال کی خبر دی ہے

[1] عبدالرحمن بن علی بن جوزی، کتاب الموضوعات، کتاب التوحید باب فی ان اللہ عز وجل قدیم
[2] فتح المغیث۔ الموضوع [3] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات، کتاب التوحید

اس اصول کے تحت وہ حدیثیں موضوع قرار پائیں گی جو عقل کی عمومی سطح کے خلاف ہوں، خصوصی سطح کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ اس کی بنیاد پر حدیث کے بارے میں فیصلہ ممکن ہے، چنانچہ

ان یکون الحدیث مخالفا البدیھیات العقول من غیر ان یمکن تاویلہ[1]	حدیث عقل کی بدیہیات کے خلاف ہو جس کی تاویل ممکن نہ ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع ہونگی،

ان سفینۃ نوح طافت بالبیت سبعا وصلت عند المقام رکعتین[2]	حضرت نوحؑ کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھی،
طول اللحیۃ دلیل قلۃ العقل[3]	داڑھی کی درازی کم عقلی کی دلیل ہے،
ان الورد خلق من عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم او من عرق البراق[4]	گلاب کا پھول رسول اللہ یا براق کے پسینہ سے پیدا کیا گیا۔
الورد الابیض خلق من عرقی لیلۃ المعراج والورد الاحمر خلق من عرق جبریل	سفید گلاب معراج کی رات میں میرے پسینے سے پیدا کیا گیا، سرخ گلاب جبریلؑ کے پسینے سے اور زرد گلاب

---

[1] مصطفی سباعی۔ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی۔ علامات الوضع فی المتن

[3] المقاصد الحسنۃ حرف الطاء، [4] ایضاً حرف الھمزہ

والورد الاصفر من عرق البراق[1]	براق کے پسینہ سے پیدا کیا گیا۔
الجوز دواء والجبن داء فاذا صار فی الجوف صار شفاء[2]	اخروٹ دوا ہے اور پنیر بیماری ہے، جب وہ پیٹ میں جاتی ہے تو شفاء بنجاتی ہے،
من لم یکن له مال تیصدق به فلیلعن الیهود والنصریٰ[3]	جس شخص کے پاس مال خیرات کرنے کے لیے نہ ہو تو اس کو یہود و نصاریٰ پر لعنت کرنی چاہیے،
من اخذ لقمة اوکسرة من مجری الغائط او البول فاماط عنها الاذی وغسلها غسلا نقیا ثم اکلها استقر فی بطنه حتی یغفر له[4]	جس شخص نے ایک لقمہ یا ٹکڑا پاخانہ یا پیشاب کی نالی سے اٹھایا اور اس سے گندگی دور کرکے خوب دھویا پھر کھالیا تو پیٹ میں جانے کے ساتھ ہی اس کی مغفرت ہوجائے گی
لا تقطعوا اللحم بالسکین فان ذالک من صنیع الاعاجم[5]	گوشت کو چھری سے نہ کاٹو کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔
من طول شاربه فی الدنیا	جس شخص نے دنیا میں اپنی مونچھیں

[1] المنار المنیف فصل ۸ [2] ایضاً فصل ۱۱ [3] ایضاً [4] قاضی شوکانی۔ الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الاطعمۃ والاشربۃ [5] ایضاً

طول اللہ ندامتہ یوم القیمۃ	بڑھائیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن
وسلط علیہ بکل شعرۃ علی	اس کی ندامت کو بڑھائے گا، اور
شارب ہ سبعین شیطاناً	مونچھوں کے ہر بال پر ستر شیطان مسلط
فان مات علی ذلک الحال	کردے گا، اگر اسی حالت میں مرگیا
لا یستجاب لہ دعوۃ ولا	تو نہ اس کی دعا قبول ہوگی اور نہ اس پر
ینزل علیہ رحمۃ[1]	رحمت نازل ہوگی۔
من قص اظفارہ مخالفا	جس شخص نے اپنے ناخن مخالف سمت
لم یرفی عینیہ رمداً[2]	سے کاٹے وہ آشوب چشم سے محفوظ رہے گا،

(باقی)

[1] الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ باب الخضاب والطیب، [2] تذکرۃ المنار المنیف فصل ۲۹

ایک ضروری تصحیح

معارف ماہ جون ۱۹۶۲ء کے ص ۴۱۲ میں گولڈ سیہر کی تحریر کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس میں کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے، جو حسب ذیل ہے:۔

Muslim Studies by Ignaz Goldziher
(English Translation)
Vol II Part vi Talabal Hadith PP165-166

اسی طرح ڈاکٹر اسپرنگر کی عبارت کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس میں بھی کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

Alisabah: Forward by A. Sprenger

مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء

از۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی

موجودہ ضلع اعظم گڈھ کے مغرب میں پندرہ میل پر قصبہ ماہل مشہور بستی ہے، جو شاہانِ شرقیہ کے دور سے سواد جونپور میں علما و مشائخ اور ارباب علم وفن کا مرکز رہی ہے، علمی تاریخ میں سب سے پہلے پرگنہ ماہل کا نام سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کے دور میں سنا گیا، جب کہ سلطان نے حضرت شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ کو یہاں جاگیر دی اور انھوں نے اس علاقہ میں دو گاؤں بہاءالدین پور اور کندھیارا (شاید کندھرا پور ؟) آباد کئے، اس کے بعد شیخ صدرالدین قریشی ظفرآبادی چراغ ہند کی اولاد سے ایک بزرگ شیخ خیرالدین ظفرآبادی ترکِ وطن کر کے ماہل آئے، اور اپنے نام پر ایک گاؤں خیرالدین پور آباد کر کے مقیم ہوئے، ان کے صاحبزادے شیخ مبارک محمدی ماہلی متوفی ۹۸۳ھ کے نام پر اس دیار میں مبارکپور ایک گاؤں آباد ہوا، اسی دور میں شیخ نصیرالدین قلندر ظفرآبادی متوفی ۹۱۵ھ ماہل کے قریب نیگون میں اقامت پذیر ہوئے، جہاں ان کا مزار ہے، آخری دور میں شیخ گلشن علی ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولانا حسن علی متوفی ۱۲۵۸ھ گذرے ہیں، موخرالذکر دونوں حضرات فارسی شعراء میں ممتاز مقام کے مالک ہیں، غرض شرقی دور سلطنت سے یہ قصبہ علم وفضل اور علما و فضلاء کا مسکن رہا، مغل دور میں بھی اس کا تعلق سرکار جونپور کے

محال اور پرگنہ جات تھا اور اودھ کی نوابی کے دور میں دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کے اہل علم و فن وظائف اور جاگیروں کی ضبطی کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا ہوئے، کہنا چاہئے کہ اسی دور میں یہاں سے علم و علماء کا دور ختم ہو گیا۔

برطانوی دور میں پرگنہ ماہل انتظامی امور میں مختلف علاقوں سے متعلق رہا۔ لارڈ ولزلی اور نواب سعادت علی خان کے درمیان ایک صلح نامہ کی رو سے ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء (۲ر رجب ۱۲۱۶ھ) میں چکلہ اعظم گڈھ، پرگنہ ماہل اور پرگنہ مئو کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کر کے برطانیہ کے نئے ضلع گورکھپور سے متعلق کر دیا گیا، پھر ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) کی ابتداء میں دیوگاؤں، نظام آباد، اور پرگنہ ماہل وغیرہ کو گورکھپور سے علیحدہ کر کے جونپور میں شامل کیا گیا، اور ۱۸ر دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں اعظم گڈھ مستقل ضلع قرار دیا گیا مگر اب بھی دیوگاؤں اور ماہل جونپور کے کلکٹر کے ماتحت رہے، پھر کچھ دنوں کے بعد انکو بھی اعظم گڈھ میں شامل کر دیا گیا۔[1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باشندگان ماہل نے بڑی بہادری دکھائی اور تین ماہ سے اس دیار پر اپنا قبضہ رکھا، ۳ر جون کو اعظم گڈھ میں ہندوستانی رجمنٹ نے بغاوت کی تو ارادت جہان نے فوج تیار کر کے نائب ناظم جونپور ہونے کا دعویٰ کر دیا اور ماہل کی تحصیل پر قبضہ کر کے شمس آباد تحصیل پھولپور تک چودہ کوس کا علاقہ اپنے زیر تصرف کر لیا، انگریزی فوج کو اعظم گڈھ کی شورش سے فرصت ملی تو ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو کرنل راٹن بھاری فوج لیکر ارادت جہان سے مقابلہ کے لئے ماہل سے متصل مبارکپور نامی گاؤں میں پہونچا، جہاں ارادت جہان نے مضبوط پناہ گاہ بنا رکھی تھی، جانبین میں سخت مقابلہ ہوا مگر کرنل راٹن نے

---

[1] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۲۳،

اوارات جہاں کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی، اور ماہل پر انگریزی قبضہ ہوگیا۔[۵]

یہ ہے ماہل کے قصبہ و پرگنہ کی مختصر گذشتہ تاریخ، اب ہم یہاں کے علماء فضلاء شعراء اور مشائخ کے جو حالات مل سکے ہیں لکھتے ہیں۔

شیخ فتح اللہ اودھی رح | حضرت شیخ فتح اللہ اودھی دہلی کے علماء کبار اور مدرسین عظام میں تھے، ابتدا میں مینارہ شمسی کے عقب میں واقع جامع مسجد میں درس دیتے تھے، پھر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ شیخ صدر الدین حکیم کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہوگئے، مگر جب مجاہدہ و ریاضت کے باوجود سلوک و معرفت کے اسرار و رموز منکشف نہیں ہوئے تو اپنے مرشد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، انھوں نے حکم دیا کہ تم درس و تدریس اور کتابوں سے یکسوئی حاصل کر لو، انھوں نے اس پر عمل کیا، مگر کچھ کتابیں اب بھی ان کے مطالعہ میں رہیں جس کی وجہ سے مرشد کی نصیحت پر پورے طور سے عمل نہیں ہوسکا آخر میں ان کتابوں سے علحدگی کے بعد شیخ فتح اللہ پر احسان و تصوف کی راہ صاف ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر معرفت کے دروازے کھول دیئے، شیخ صدر الدین نے ان کو خلافت دیکر علاقۂ اودھ کی طرف روانہ کیا جہاں سلاطین شرقیہ کی قدردانی اہل علم و فضل کے لیے چشم براہ تھی، یہاں آنے کے بعد شیخ فتح اللہ بیعت و ارشاد کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول ہوگئے، اس وقت ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپور کی تعلیمی و تدریسی فضا پر چھائے ہوئے تھے، شیخ فتح اللہ نے اپنے نوعمر مرید و مسترشد شیخ محمد بن عیسیٰ تاج کو پہلے قاضی صاحب کے مدرسہ میں داخل کراکے علوم شرعیہ کی تعلیم دلائی پھر ان کو سلوک و معرفت کی تلقین کی،

صاحب مشکوٰۃ النبوت نے شیخ فتح اللہ کو عارف باللہ اور قدوۂ اہل اللہ کے لقب سے

---

[۵] اعظم گڈھ گزیٹیر

یاد کیا ہے، اور ان کے بارے میں لکھا ہے، او سرِ حلقۂ مشائخ اودھ بود، و کرامات و خوارق عادات وے مشہور است" بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے تعارف القاب میں "صوفی" لکھا ہے، ان کا حلقۂ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا، ان کے مریدین و خلفاء میں بڑے بڑے اہلِ فضل و کمال تھے، جن میں شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری، شیخ قاسم بن برہان الدین دہلوی اودھی مصنف آداب السالکین اور شیخ سعد الدین اودھی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، شیخ فتح اللہ اودھی ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں فوت ہوئے، [1] ان کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک عالم مولوی علی حسن ماہلی متوفی ۱۳۵۸ھ نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ راقم کے اجداد میں سے ایک بزرگ شاہ فتح اللہ انصاری بن عبداللہ انصاری سلطان تغلق کے دور میں دہلی آئے، کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد سیر و سیاحت کرتے ہوئے جونپور پہنچے جو ان دنوں سلاطین شرقیہ کا دارالسلطنت تھا، یہاں انکے ارشاد و تلقین کا شہرہ عام ہوا، اور حاکم وقت ان کی زیارت کا مشتاق ہوا، ایک دن جامع مسجد میں ان سے ملا، اور مہینہ میں دوبار ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتا رہا، کچھ دنوں کے بعد سلطان نے شاہ فتح اللہ کی اولاد کے گذر بسر کے لیے چند مواضع پرگنہ ماہل میں جو جونپور کے پرگنات و مضافات میں ہے بطور جاگیر عطا کئے، انھوں نے پرگنہ مذکور میں اپنے بڑے صاحبزادے شاہ بہاء الدین کے نام سے بہاء الدین پور۔ اور کندھیارا (کندھراپور؟) دو گاؤں آباد کئے، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی، ان کا مزار بھی اسی قریہ میں ہے۔[2]

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۳ و صفحہ ۱۶۴، مشکوٰۃ النبوت قلمی صفحہ ۱۵۸ تا صفحہ ۱۶۰، تذکرہ علماء صفحہ ۱۵۹، نزہۃ الخواطر بحوالہ گنج ارشدی جلد ۳ صفحہ ۱۱۲،

[2] تذکرہ صبح وطن، صفحہ ۵،

ہمارے نزدیک شیخ فتح اللہ اودھی اور شاہ فتح اللہ انصاری ایک ہی شخصیت ہیں، ان کے سب سے پہلے تذکرہ نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اور بعد کے سب تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کو صرف اودھی کی نسبت سے یاد کیا ہے، کسی نے انصاری نہیں لکھا ہے، شاہ صاحب نے نہ ان کی ولدیت لکھی ہے، نہ سنہ وفات اور نہ ہی مدفن کا ذکر کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالہ سے ان کی تاریخ وفات ۲۰ ربیع الثانی ۸۲۱ھ بتائی ہے، مگر مشکوٰۃ النبوت میں ہے کہ "سنہ وفاتش در نظر نیامدہ ولیکن معاصر سلطان ابراہیم شرقی بود"۔ سلطان ابراہیم کا دور حکومت ۸۰۴ھ سے ۸۴۴ھ تک ہے، نزہۃ الخواطر میں ان کے والد کا نام نظام الدین درج ہے، اور مولوی حسن علی ماہلی نے شاہ عبداللہ انصاری لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ نظام الدین لقب اور عبداللہ نام ہو، بعد کے کئی مورخوں نے ان کا مزار اودھ میں بتایا ہے، مگر مولوی حسن علی نے لکھا ہے"، بالجملہ در پرگنہ مذکور از نام شاہ بہاؤ الدین پسر بزرگ خود قریہ بہاؤ الدین پور دکندھیا را آبادان ساختہ دران سکونت اختیار کردند، مزار متبرکہ شاہ فتح اللہ موصوف درہماں قریہ واقع است"۔ ان دونوں اقوال میں یہ تطبیق ہو سکتی ہے کہ یہ علاقہ اس زمانہ میں اودھ میں شمار ہوتا تھا، اس کے علاوہ کسی اور فتح اللہ نامی بزرگ کا تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ علامہ فتح اللہ ملتانی اس دور کے مشہور عالم تھے، جن کا مولد و منشا اور مدفن ملتان ہے، شیخ فتح اللہ اودھی کا یہ شعر بہت مشہور رہے،

یک دوست پسند کن چوں یک دل داری

گر مذہب مردمانِ عاقل داری

شیخ نصیر الدین قلندر ظفر ابادیؒ: شیخ نصیر الدین بن محمد بن رفیع الدین عباسی

لے عظم گڈھ گزیٹیر،

سمرقندی ظفرآبادی سلسلۂ قلندریہ کے مشائخ کبار میں ہیں، ان کے حالات انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، کشف النقاب عن الاحوال والانساب، اصول المقصود، فصول مسعودیہ، بحر زخار، تجلی نور اور نزہۃ الخواطر وغیرہ میں ہیں، شیخ قطب الدین بنیادل قلندر جونپوری کے اجل خلفاء میں ان کا شمار ہوتا ہے، ظفرآباد سے ترک وطن کر کے پرگنہ ماہل کے مقام نیگوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اور یہیں فوت ہوئے، اس علاقہ میں ان کو حکومت وقت سے کئی مواضع بطور جاگیر عطا ہوئے تھی قلندری روایت کے مطابق شیخ عبدالعزیز مکی علمبردار کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مبارک شیخ نصیرالدین کو ملا تھا، جو بطور تبرک محفوظ تھا، واللہ عالم، شیخ نصیرالدین کی بیوی ان کے مرشد شیخ قطب الدین بنیادل کی صاحبزادی تھیں، ان کے صاحبزادے شاہ نور قلندر بن شاہ نصیر قلندر کو شیخ قطب الدین بنیادل اور اپنے والد دونوں بزرگوں سے خلافت حاصل تھی، انتصاح میں ہے کہ شاہ نصیر نے اپنے صاحبزادے شاہ نور کے علوئے مرتبت کو دیکھ کر ان سے کہا کہ دو آفتاب ایک جگہ نہیں رہ سکتے ہیں، اس لیے شاہ نور نے نیگوں چھوڑ کر شہر پور (فیض آباد) میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور وہیں فوت ہوئے، ان کا مزار بھی وہیں ہے، شیخ نصیرالدین کا وصال ۵ جمادی الاولی ۹۱۵ھ میں نیگوں میں ہوا اور وہیں دفن کئے گئے، مزار پر شاندار روضہ ہے، ان کی تاریخ وفات میں یہ اشعار کسی نے کہے ہیں،

آنکہ شاہ نصیر دین بودہ	صاحب صدق وہم یقین بودہ
اوز بنیائے دل خلافت یافت	علم پیر را بصدق افراشت
بعد چندے بہ قصبۂ نیگوں	کرد از حکم پیر خویش سکوں
بست و پنج از جمادی اولی بود	کہ ز دنیائے دوں سفر فرمود

سال تاریخ او بجا باشد　　گفتہ ام۔ شاہد خدا باشد[1]

شیخ مبارک محمدی ماہلی | شیخ مبارک بن شیخ خیرالدین ماہلی جونپوری، شیخ صدرالدین قریشی ظفرآبادی چراغ ہند کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ خیرالدین ظفرآباد سے ترک وطن کرکے پرگنہ ماہل میں چلے آئے، اور اس کے قریب اپنے نام پر خیرالدین پور گاؤں آباد کرکے باپ بیٹے رہنے لگے، شیخ مبارک نے بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور جونپور کے اساتذہ و شیوخ سے تحصیل و تکمیل کی، طریقت و روحانیت کی تلقین و تربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقان سرائمیری متوفی سنہ ۹۵۰ھ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگان علم و عرفاں اس چشمۂ صافی سے سیراب ہو رہے تھے، میر صاحب شیخ مبارک کے ہموطن تھے، ماہل اور سرائے میر کے درمیان معمولی سا فاصلہ ہے، شیخ مبارک نے بھی میر علی عاشقان کے آستانہ پر حاضری دی اور ان کی خدمت و صحبت میں رہکر خلافت و مشیخت کا مرتبہ پایا، مرشد نے مسترشد کو خلافت کے ساتھ محمدی کے لقب سے بھی نوازا، اس کے بعد شیخ مبارک نے میر صاحب کے حکم سے جونپور کے محلہ سپاہ میں خانقاہ تعمیر کی اور علائق دنیا سے یکسو ہو کر زہد و تقویٰ اور عبادت و قناعت میں پوری زندگی گذاری، آپ کی ذات سے ایک مخلوق نے فیض اٹھایا، تجلی نور میں ہے کہ شیخ مبارک نے خاندانی فیوض و برکات کے علاوہ میر سید علی قوام سے تمام سلاسل مروجہ کے فیوض حاصل کئے اور اس قدر نفس کشی اور ریاضت کی کہ ان کے مشاہیر خلفاء میں شمار کئے گئے، انھوں نے ارشاد و تلقین اور باطنی اشغال کے ساتھ تعلیم و تدریس اور ظاہری علوم کا مشغلہ بھی رکھا اور ان کی خانقاہ علمی درسگاہ اور روحانی تربیت گاہ دونوں تھی ۱۴ شوال ۹۸۳ھ میں جونپور میں

---

[1] انتصاح عن ذکر اہل الصلاح ص ۹ و نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۰۶، نیز بعض حالات جناب سلطان احمد صدیقی گورکھپوری نے اوجین سے روانہ کئے ہیں،

فوت ہوئے "فخر زمانہ" تاریخ وفات ہے۔

شیخ گلشن علی ماہلی شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کا تذکرہ محمد قدرت گوپاموی کی کتاب تذکرہ نتائج الافکار (تصنیف ۱۲۵۴ھ) میں مل سکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ فتح اللہ اودھی (شاہ فتح اللہ انصاری) کی اولاد سے ہیں، بارہویں صدی کے مشہور فارسی شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے، محمد قدرت گوپاموی کا بیان ہے کہ شیخ گلشن علی پسر شیخ عطاء اللہ انصاری ماہلی کی ولادت ۱۱۷۰ھ میں ہوئی، انھوں نے فارسی کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور نحو و صرف کی تعلیم اپنے دیار کے بعض اساتذہ سے حاصل کی، خوش نویسی کی مشق بھی کی، اور خط نستعلیق و شکستہ و ثلث بہت اچھا لکھتے تھے، بعد میں دہلی گئے، اور میر افضل ثابت کی خدمت میں رہکر مشق شعر و سخن کی، ان کے انتقال کے بعد شمس الدین فقیر کو اپنے اشعار دکھانے لگے، علی حزین سے بھی شاعری میں اکتساب فیض کیا، ایک مدت تک دہلی میں نواب شیر افگن خان باسطی اور چند سال نواب علی قلی خان والہ کی خدمت میں رہے، آخر میں ماہل میں آکر گوشہ نشیں ہوگئے اور یہیں ۱۲۳۳ھ کے اواخر میں انتقال کیا، شیخ گلشن علی کے چند اشعار یہ ہیں،

رفتی از بزم و طرب رفت و تمنا باقی است ۔۔۔ بادہ شد صرف و ہوا در دل مینا باقی است

لالہ در دشت نشانی ست ز مجنونم ہنوز ۔۔۔ داغہائے غم او بر دل صحرا باقی است

دلم از اختلاط یار با اغیار می نالد ۔۔۔ کہ چون بلبل بہ بیند پہلوئے گل خار می نالد

در چشم فتنہ ساز تو باشد بلا نگاہ ۔۔۔ باز آفت نگاہ و تو دار و خدا نگاہ

رباعیات

گر غنچۂ گل تنگ دہانی دارد (۱) چون لعل تو کے گہر افشانی دارد

ہر چند کہ سرو مصرعہ موزوں کرد   چوں قامت تو کجا روانی دارد

شام آن بت مہ طلعت خورشید غلام   آمد بنظارۂ مہ نو بر بام
او را بفلک نظر، مرا بر رویش (۲)   آں شوخ ہلال دید ومن ماہ تمام

مولوی محمد حسن علی ماہلی | آخری دور کے ماہلی علماء و فضلاء میں مولانا محمد حسن علی صاحب حسن انصاری ماہلی متوفی ۱۲۵۰ھ کو خاصی شہرت و ناموری حاصل ہوئی ان کو اپنے دور کے فارسی شعراء میں ممتاز مقام حاصل تھا، متعدد تذکرہ نگاروں نے ان کا حال لکھا اور انتخاب کلام درج کیا ہے، سب سے پہلے محمد قدرت گوپاموی نے نتائج الافکار مدراس تصنیف ۱۲۴۱ھ) میں ان کا حال لکھا، اس کے بعد نواب والاجاہ محمد غوث خان اعظم نے تذکرہ صبح وطن (طباعت ۱۲۵۹ھ) میں ان کے خود نوشت حالات درج کیے اور گلزار اعظم میں ان کا تذکرہ کیا، یہ تینوں کتابیں مولوی صاحب کی زندگی میں لکھی گئیں، اس کے بعد نواب علی حسن خان بن نواب صدیق حسن خاں نے صبح گلشن میں (طباعت ۱۲۹۵ھ) ان کا حال لکھا ہے، حدیقۃ المرام نام کی کسی کتاب میں بھی ان کا حال درج ہے جس سے صاحب نزہۃ الخواطر نے استفادہ کیا ہے صبح وطن" کا تذکرہ سب سے زیادہ مفصل اور بعد والوں کا ماخذ ہے، پھر بھی دوسرے تذکروں میں بعض نئی معلومات ہیں،

مولوی محمد حسن علی بن شیخ نوازش علی حنفی انصاری ماہلی کا تخلص حسن ہے، ۱۱۹۶ھ میں ماہل میں پیدا ہوئے، بنارس میں تعلیم حاصل کی فراغت کے بعد کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، کچھ دنوں کے بعد مدراس کمپنی کے مدرسہ میں چلے گئے اور مدرسہ ٹوٹ جانے کے بعد مدراس کی عدالت کے صدر مفتی ہوئے، اسی عہدہ پر تھے، کہ ۲۹ رجب ۱۲۵۰ھ میں مدراس ہی میں فوت ہوئے،

صبح وطن میں انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ قریہ بہاالدین پور میں ان کے جد امجد شاہ فتح اللہ انصاری کی اولاد احفاد بزرگان علم و فضل کے اندر موجود تھی ان میں سے اکثر متوکل اور گوشہ نشیں اور بعض شاہان دہلی کے مناصب جلیلہ و خدمات عمدہ پر مامور تھے، میرے جدامجد نے کبھی دائرۂ توکل سے باہر قدم نہیں رکھا، اور فقر و فاقہ میں اپنی عمر بسر کی، البتہ مجھکو سیر و سیاحت اور شہروں کے عجائب و غرائب کے مشاہدہ کا شوق دامن گیر ہوا۔

"در ایام طفولیت از وطن مالوف برآمد، در بنارس تحصیل کتب درسیہ فارسیہ بخدمت ملامحمد عمر کہ بلاواسطہ نسبت تلمذ بہ سراج الدین علی خاں آرزو و شیخ علی حزین داشتند در سن پانزدہ سالگی کردم و بمروز ایام دریافت تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ جابجا کردہ در سن بست و پنج سالگی فراغ حاصل نمودم نسبت تلمذ در علوم متداولہ معقول و منقول بیک واسطہ بمولوی برکت الہ آبادی قدس سرہ کہ از علمائے فحول بودند میرسد

اتفاقاً بعد از تحصیل علوم قائد تقدیر بہ ملکت بنگالہ رسانید، در انجا شطرے از اوقات را بدرس و تدریس علوم مروجہ گذرانیدم، و ارادۂ مراجعت بوطن مالوف داشتم، اتفاق نشد و حسب طلب حکام وقت در ۱۲۳۰ھ یکہزار و دوصد و سی و دو سال وارد مدراس حرسہ اللہ عن الافات گردیدہ سنگ بموزہ ام افتاد و از عرصہ بست سال دکسرے در انجا رحل اقامت افگندم، مجملے از حال من آوارہ دور از دیار اینست"[1]

اس مجمل سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی میں وطن سے نکل کر بنارس پہونچے اور پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۱۹۶ھ میں پیدائش کے حساب سے ۱۲۱۰ھ میں فارسی کی تعلیم سے فارغ ہوئے اس کے بعد مختلف مقامات پر علوم مروجہ کی تحصیل کر کے پچیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۲۰ھ میں عالم و فاضل ہو گئے،

---

[1] صبح وطن ص ۵۵

اسکے بعد ہی کلکتہ میں مدرس ہوئے، جہاں کم و بیش بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، اور ۱۲۳۲ھ
میں کلکتہ ہی سے مدراس جاکر وہاں کے سرکاری مدرسہ میں بیس سال سے زائد تک تعلیم دی، یہ واقعات
۱۲۵۲ھ تک کے ہیں، اس کے بعد صدر مفتی ہوئے، اور چار سال اس عہدہ پر رہکر ۱۲۵۵ھ میں
راہی ملکِ عدم ہوئے،

اس بیان میں تحصیل علم کے سلسلہ میں صرف ایک مقام بنارس اور ایک استاد ملا محمد عمر بنارسی کا نام ہے، اسکے
بعد جا بجا علوم متداولہ کی تحصیل کی اور بیک واسطہ مولوی برکت الہ آبادی سے شرف تلمذ کی تصریح کی ہے،
ظاہر ہے کہ جا بجا مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا ہوگا، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ کسی کا نام نہیں لیا، اسکی
اسکی کوئی خاص وجہ ان کے نزدیک رہی ہوگی ۔

مولوی ملا محمد عمر بن غوث عمری بنارسی ۱۱۳۳ھ میں مرزاپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے
والد سے حاصل کی پھر دہلی جاکر وہاں کے علما سے کسب فیض کیا، اسکے بعد سراج الدین خان آرزو اکبرآبادی (ولادت
۱۱۰۱ھ وفات ۱۱۶۹ھ) اور فارسی کے مشہور شاعر علی حزیں بنارسی سے شاعری میں استفادہ کیا ملا محمد عمر صاحب
دیوان شاعر تھے، انھوں نے گنج شایگان کے نام سے فارسی شعرا کے حالات میں ایک کتاب بھی تصنیف
کی ۹۰ سال کی عمر میں ۱۲۲۳ھ میں بنارس میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے فراغت کے بعد مستقل سکونت اختیار
کر لی تھی اور درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا تھا،

مولانا محمد برکت بن عبدالرحمٰن کا خاندان امیٹھی سے الہ آباد جاکر آباد ہو گیا تھا، انھوں نے شیخ ملا کمال الدین
فتح پوری وغیرہ سے تعلیم پائی اور علوم ریاضیہ میں خاص طور سے مشہور رہے، پوری عمر درس و تدریس
میں بسر کی، ریاضی کی مشہور و متداول کتابوں پر ان کے حواشی ہیں،

مولوی حسن علی صاحب نہایت ذہین و طباع اور ذی علم تھے، ان کے حالات عام طور سے فارسی شعرا کے
تذکروں میں درج ہیں، اسلئے ان کی شاعری کا پہلو زیادہ اجاگر ہوا، اور انکی دوسری علمی حیثیات ابھر نہ سکیں

محمد قدرت گوپا موی نے ان کو "جامع علوم عقلی و نقلی" کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے۔

"و بذہن نقاد در جمیع این فنون مہارت شائستہ و مہارت بابستہ حاصل ساخت" (نتائج الافکار ص ۲۰۰)

علوم مروجہ متداولہ میں مہارت کے ساتھ ریاضی اور شاعری سے خاص تعلق تھا اور ان میں وہ استاد وقت مانے جاتے تھے ریاضی میں انکی متعدد کتابیں اور رسائل ہیں نواب والاجاہ نے لکھا ہے "احسن تخلص مولوی محمد حسن علی است کہ در علم فارسی و عربی و ریاضی استاد وقت خود است، رسالہ تبصرۃ الحکمہ در طبیعیات و الٰہیات بنام این راقم السطور مرقوم ساختہ، و رسالہ منتخب التحریر در علم ریاضی و رسائل تکسیر و جفر در مل وغیرہ از مؤلفات اوست (صبح وطن ص ۵۶)

غالب گمان ہے کہ تبصرۃ الحکمۃ کے ساتھ منتخب التحریر اور تکسیر و جفر اور رمل وغیرہ کے رسائل بھی مدراس میں طبع ہوئے ہوں گے، نواب والاجاہ سے مولوی صاحب کے خوشگوار تعلقات تھے اور از راہ قدردانی نواب صاحب نے انکی کتابوں کی طباعت کا انتظام کیا ہو گا،

مدراس میں مولوی صاحب کو علمی ماحول ملا اور ان کی پوری قدردانی ہوئی، اور وہ شعر و شاعری اور فارسی زبان کے ساتھ علوم ریاضیہ کے استاد یگانہ و منتخب زمانہ" قرار پائے نواب والاجاہ نے گلزار اعظم میں لکھا ہے،

"بتدریس کتب فارسیہ خصوصاً کلام متقدمین و علم ریاضی استاد یگانہ و منتخب زمانہ" (ص ۱۶)

اسی کے ساتھ بڑے شریف و نجیب اور با اخلاق عالم تھے، عزت نفس و شرافت طبع حلم و انکسار کے پیکر تھے، نواب والاجاہ۔ جامع انداز میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں،

"نور شرافت از جبینش پیدا بودے، نجابت از گل حلقش ہویدا حلمش با انکسار توام و اخلاقش با اکرام ہمدم" (گلزار اعظم ص ۱۶)

دینی علوم میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، کتاب و سنت اور فقہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، مدراس میں صدر مفتی ہونا اس کی دلیل ہے، معلوم ہوا یہ وصف بعد میں

نمایاں ہوا جب کہ شعر و سخن، ریاضی دان اور مدرسی کی شہرت عام ہو چکی تھی، اس لئے ان کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی گوشوں کو زیادہ اجاگر کیا۔

اصل میں وہ ایک کامیاب مدرس اور استاد وقت تھے شعر و شاعری ان کا خاص مشغلہ نہیں تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسی میں ان کو زیادہ شہرت و ناموری حاصل ہوئی، شعر کبھی کبھی کہتے تھے، مگر طبیعت موزوں پائی تھی، اس لئے جو کچھ کہتے تھے اچھا کہتے تھے، انکے تلامذہ میں اچھی خاصی تعداد ان شعراء کی ہے جو تیرہویں صدی میں جنوبی ہند کے آسمان شعر پر نمایاں تھے،

ایام طفولیت میں وطن سے نکلنے کے بعد ان کو واپسی کا موقع نہیں ملا، ممکن ہے فراغت کے بعد ایک آدھ بار وطن آنے کا اتفاق ہوا ہو، ورنہ بقول ان کے تحصیل علوم کے بعد قائد تقدیر نے ان کو کلکتہ پہونچا دیا، وہاں سے وطن کی مراجعت کا ارادہ کیا مگر اس کا موقع نہ مل سکا، اور ادھر ہی سے مدراس چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، غالباً انھوں نے مدراس میں متاہل زندگی بسر کی ہوگی، اور انکے بال بچے رہے ہوں گے مگر انکا حال معلوم نہیں،

باوجودیکہ مدراس میں ان کو بہترین ماحول ملا، قدردانی بھی ہوئی، اونچا عہدہ پایا مگر اپنے وطن والوں سے مجبوری اور اپنی مجبوری کی وجہ سے ہمیشہ دل گرفتہ رہے اور اپنے کو "آوارہ دور از دیار" ہی سمجھتے رہے،

"قائد تقدیر" کی قیادت میں اس "آوارۂ دور از دیار" کا دور نہایت پرآشوب تھا، علماء و فضلاء سخت ابتلاء و آزمائش میں مبتلا تھے، نوابان اودھ کی اہل علم و فضل کے ساتھ زیادتی اور نظام سلطنت کی ابتری عام تھی، اس دور پرُ فتن کا پورا نقشہ علامہ آزاد بلگرامی نے کھینچا ہے

۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین کی مٹی میں علم وعلما کی سرگرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خان نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا، اس نے یہاں کے اکثر بڑے بڑے شہر ان جیسے جونپور، بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور، کوڑا جہان آباد وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کرکے قدیم وجدید خاندانوں کے وظائف اور جاگیروں کو یکسر ضبط کر لیا، جس کی وجہ سے شرفاء و نجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی، لوگوں کو معاش ومعیشت کی الجھنوں نے کسب علم سے باز رکھکر پیشۂ سپہ گری میں ڈال دیا، اور درس وتدریس کا رواج یوں ختم ہوگیا کہ جو مدارس قدیم زمانہ سے معدنِ علم وفضل تھے بالکل ویران ہوگئے، اور اکثر ارباب کمال کی بھری انجمنیں اجڑ گئیں، برہان الملک کے بعد اس کے بھانجے ابو المنصور صفدر جنگ کو حکومت ملی وظائف اور جاگیریں بدستور ضبط رہیں، اور جب محمد شاہ کے آخری عہد میں ۱۱۵۵ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی اس کے حوالہ کردی گئی تو اس صوبہ کی جاگیریں اور وظیفے بھی باقی نہ رہ سکے، احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ وزیر بنا تو صوبہ اودھ وغیرہ کے نائب نے وظیفہ یاب طبقہ پر سختی کی، جس کے باعث یہ دیار پامال ہوگیا[۱]

پھر آخری دور میں انگریزی اقتدار کے عروج اور پورے ملک میں عام بے چینی کی وجہ سے ہرطرف ابتری پھیلی ہوئی تھی، اس لئے ارباب علم وفن نوابوں، امیروں اور راجوں کے دروازوں کا رخ کرنے لگے بہتوں نے برطانوی مدرسوں سے تعلق پیدا کرلیا، چنانچہ مولوی حسن علی ماہلی اور ان کے دیار کے کئی علماء نے کلکتہ مدراس اور ارکاٹ وغیرہ کا رخ کیا،

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲،

ان کا انتقال مدراس کی عدالت کی صدارتِ افتاء کے دور میں ۱۲۵۸ھ میں ہوا،
گلزار اعظم میں ہے،

"بعد چند سال لوائے خدمت افتائے صدر مفتی عدالت افراخت، و در ہمانی کارگزاری
در سال ۱۲۵۸ھ کوس رحلت ازیں دار سرا سر وحشت نواخت" (ص ۱۹۰)

سب تذکرہ نگاران کی وفات ۱۲۵۸ھ میں لکھتے ہیں،

نزہۃ الخواطر میں حدیقۃ المرام کے حوالے سے ۲۹ رجب ۱۲۵۸ھ درج ہے،

مولوی صاحب تمام علوم متداولہ اور عقلیہ و نقلیہ میں استاد یگانہ اور منتخب زمانہ ہونے کے
اتھ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، جو ان کے فطری ذوق کا نتیجہ تھا،
، ذوق نے بنارس میں ملا محمد عمر کی صحبت میں اور جلا رپائی، مگر وہ کبھی کبھی شاعری کرتے
، محمد قدرت گوپاموی نے لکھا ہے،

چونکہ در فنون نظم ہم طبع بلند دارد، و تلاشِ ارجمند گاہ گاہ بفکر سخن ملتفت می شود
(نتائج الافکار ص ۲۰۰)

نواب والاجاہ نے بھی یہی لکھا ہے، باقتضائے موزونیت طبع گاہ گاہ بفکر سخن ہم
ل بودہ مشاطۂ طبع رسایش باین زیبائش حسن شاہد کلام می افزاید (گلزار اعظم ص ۱۹۰)

کلام یہ ہے،

دلبران بے رونق از روئے نگارم شد	بلے قدرے بہ پیشِ مہر کے رہا شاہ اغان را
تا آں قدر دارد کف پائے نگار نیش	کہ برگ گل بجائے خار باشد پائے جانان را
نکِ ختن می بینم امشب کوہ و صحرا را	مگر باد صبا داکرد آں زلف چلیپا را
ے خود نگن صلا با این نقاب را	پوشیدہ کس ندید رخ آفتاب را

ہائے اے حسن! وصال ازاں مہر رخ مجو — دربر گرفتہ است کسے آفتاب را

ازبسکہ وحشی است دل بے قرار ما — رم می کند ز سایۂ مردم غبار ما

در بر نہالِ قامت او نشاندہ ایم — گل کرد صد بہار ز باغِ کنار ما

تا جلوۂ رخ تو ملکِ دلم تافت — آئینہ زار گشت ز حیرت دیار ما

روزے بہر قدم گذارے سنگدل کہ آہ — از حد گذشت مرتبۂ انتظار ما

بر روئے زرد ما است دواں اشک لالہ گوں — یکجا بہم شدہ است خزان و بہار ما

دوش رفتم بسر کوئے صنم استادم — دید و گفتا کہ گدای، ز چہ کار است اینجا

اے حسن! سیر گلستان چہ ضرور است ترا — گوشۂ دامنت از گریہ بہار است اینجا

نادیدہ است گل بچمن روئے یار من — از پنجہ ہائے خار گریباں دریدہ است

سبزہ بروئے دلبر من نیست اے حسن — طوطی بآبِ چشمۂ حیوان رسیدہ است

دوش چون بے رحمی ظالم، دل من یاد کرد — من جدا فریاد کردم دل جدا فریاد کرد

از سرشکِ لالہ گون گشتم چو گل رنگیں لباس — نور چشم من لباسِ دیگرم امداد کرد

قطرۂ اشکم بخاک افتاد و وصلش رو نداد — دیدہ این دُرِّ یتیمم رایگاں برباد کرد

اے حسن! پیکِ دیارِ آن صنم اینک رسید — مرحبا کہ خانۂ ویرانہ ام آباد کرد

اے باد پیش یار بردیا ادب بگو — کیں دل برائے دیدنِ تو زار می طپید

چشم تو دوست دارم اگرچہ طبیبم بجا است — تیمار دار از غم بیمار می طپید

دوشینہ در برآن بتِ عیار داشتم — خوش طالعے کہ دولتِ بیدار داشتم

کالم پُر از حلاوت دنیا است اے حسن! — شاید بخواب لب بلب یار داشتم

اے حسن! داغِ دلِ من رونق من بس بود — احتیاج شمع دیگر نیست در کاشانہ ام

شاید کہ بتِ ماگذرد بر سرِ راہے   بر خاک نشینم با میدنگاہے
ہرچند ضعیفیم ولے حامی عشقیم   سرتیزیٔ آتش بود از برگ گیاہے

ہم نے یہ اشعار صبح وطن سے نقل کئے ہیں، دوسری کتابوں میں ان ہی کا مختصر انتخاب درج ہے ۔

مولوی حسن علی صاحب کی پوری زندگی وطن سے دور کلکتہ اور مدراس میں گذری ان ہی دونوں جگہوں میں ان کے کمالات علم وادب کے میدان میں ظاہر ہوئے، مدراس میں ان کو زیادہ مدت تک قیام کرنے اور کام کرنے کا موقع ملا اس لئے یہیں ان کی علمیت و قابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے، چنانچہ شاعری میں ان کے کئی تلامذہ کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں، جن کا تعلق جنوبی ہند سے ہے، ان میں سے چند نام یہ ہیں،

ولا تخلص اور مولوی سید حمید الدین بن سید ابو طیب خان نام ۱۲۱۳ھ میں رحمت آباد میں پیدا ہوئے، مدراس کے مشہور علماء مثلاً مولوی محمد سعید اسلمی مدراسی، مولوی علاء الدین لکھنوی، مولوی تراب علی خیر آبادی، اور مولوی حسن علی ماہلی سے علوم عربی کی تحصیل کی تھی، (صبح وطن صفحہ ۲۱۷)

بھجت تخلص مولوی محمد تاج الدین حسین بن غیاث الدین خان خوشنویس نام ۱۲۱۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر کے بعد سے بارہ سال تک مدرسہ کمپنی میں مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی تراب علی نامی سے علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی (گلزار اعظم صفحہ ۱۳۰)

بلیغ تخلص، شاہ محمد روح اللہ بن شاہ محمد نور اللہ نقشبندی خوشنویس ۱۲۲۳ھ میں

پیدا ہوئے، کتب فارسی، فن عروض و قوافی و بیان و بدیع و نجوم و رمل و تکسیر وغیرہ مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی حاجی محمد محی الدین میران سے حاصل کیے، اور ان ہی دو ان سے شعر و سخن کی مشق کی۔ (رر، گلزار اعظم ص۱۳۳)

حیران۔ تخلص، مولوی حاجی محی الدین بن فقیر محمد، ساکن کرنول، نواب عمدۃ الامراء بہادر کے مطبخ کے دار و غہ تھے، ۱۲۱۰ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، سن شعور کے بعد اکتساب علم کا شوق پیدا ہوا، مولو حسن علی ماہلی، اور مولوی صاحب حسینی سے فارسی و عربی علوم پڑھکر فراغت کے قریب پہونچے (رر ص۱۶۱)

صاحب۔ تخلص، مولوی غلام علی المخاطب بہ منشی الملک دبیر الدولہ اعتنا خان بہادر، عطارد جنگ بن محمد نائطی المخاطب بہ دبیر الملک مشیر الدولہ راز دار خان بہادر محوز جنگ، ۱۲۱۷ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، مولوی حسن علی ماہلی، اور مولوی ارتضی خان بہادر کی خدمت میں رہکر کتب عربیہ کی تعلیم حاصل کی (رر ص۲۴۷)

قادر۔ تخلص، مولوی قادر علی بن حاجی تراب علی نائطی، ۱۲۳۲ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے، کتب عربیہ ہدایہ تک مولوی حسن علی ماہلی، مولوی سید عبد الودود عاشق، مولوی، سید عبد القادر حسینی اور مولوی یوسف علی خان سے پڑھیں (رر ص۲۹۵)

فارسی کے چند نایاب ہندوستانی تذکرے

از جناب محمد توحید عالم صاحب ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

(۲)

(۱۱) خزینۂ گنج ـــــ اس تذکرہ کے وجود کا علم دو فہرستوں سے ہوتا ہے ایک اسپرنگر کی تیار کردہ اور دوسری برلن لائبریری فہرست۔ اودھ کا مخطوطہ اگرچہ اب نایاب ہے۔ لیکن برلن مخطوطہ کا وجود باقی ہے۔ اس طرح اس تذکرہ کو نایاب نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن اس مضمون میں اس تذکرہ کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ مذکورۂ بالا فہرستوں سے جو اطلاعات ملتی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ دونوں مخطوطات نامکمل ہیں، اور ان میں شروع اور آخر کا حصہ موجود نہیں ہے۔ چونکہ اس تذکرہ کے دوسرے نسخے کہیں موجود نہیں ہیں اس لئے موجودہ نسخوں کے غیر موجود حصے یقیناً نایاب ہیں۔

خزینۂ گنج کے جن نامکمل مخطوطات سے متعلق اسپرنگر اور برلن فہرستوں میں جو اطلاع فراہم کی گئی ہے، اس کے مطابق اس میں نویں اور دسویں صدی ہجری کے چار سو، اور آٹھویں صدی ہجری کے بعض شعراء کا ذکر حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ شعراء کے حالات کے ساتھ ان کی تصنیفات و تالیفات کا بھی ذکر ہے، اس کی ابتدا ابن یمین فریومدی ہوئی ہے، اور خاتمہ ہمایوں بادشاہ پر ہوا ہے۔ ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے۔

سنہ اسپرنگر نمبر ۱۱؛ برلن ۶۶۴، خود نوشت نسخہ؛

صاحب مقطعات موعظت آئین امیر محمود مشہور بہ ابن یمین[1] ......"

اس تذکرہ کے شعرا کی فہرست اسپرنگر نے اپنی فہرست میں درج کی ہے۔[2] اس کی تالیف میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔[3]

(۱) تذکرۂ دولت شاہ۔ (۲) مجالس النفائس۔ (۳) مذکر احباب نثاری (۴) مقالۃ الابرار (۵) مجالس عبد القادر (۶) جواہر العجائب (۷) عرفات العاشقین۔

ماخذ کی اس فہرست پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف میں مذکر احباب کے علاوہ زیادہ استفادہ عرفات سے کیا گیا ہے کیونکہ فہرست بالا میں مذکر احباب کے سوا دوسری تمام کتابیں عرفات کا ماخذ ہیں، اس لئے ان سب کے بجائے تنہا عرفات سے استفادہ کرنا کافی ہوا ہوگا، دوسری وجہ یہ ہے کہ مقالۃ الابرار خالص تاریخی نوعیت کی کتاب ہے جس سے تقی اوحدی کے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نگار کو بلاواسطہ استفادہ کا موقع نہیں ملا، ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مولف کے پیش نظر عرفات اور مذکر احباب ہی رہے ہوں گے البتہ انھوں نے عرفات کے ماخذوں کی مناسبت سے ان تمام کتابوں کو اپنا ماخذ قرار دیا جو خود عرفات کے ماخذ تھے۔

خزینۂ گنج کا مولف میر عماد الدین محمود بن میر حجۃ اللہ اور اس کا تخلص الٰہی ہے۔ تخلص ہی سے اس کی شہرت ہے۔ اس کا تعلق سعد آباد (ہمدان کے مضافات میں ایک مقام) کے حسینی سادات سے تھا۔ ۱۰۱۰ھ میں الٰہی شیراز گیا، اور تقریباً ساڑھے تین سال تک وہاں تحصیل علوم میں مشغول رہا، پھر وہاں سے وہ عراق گیا، اور ایک یا دو سال تک صفاہان میں

---

[1] اسپرنگر نمبر ۱۱؛ برلن نمبر ۴۴۲۔ [2] ایضاً ص [3] ایضاً

اقامت کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا، اور سنہ ۱۰۲۰ھ میں قندھار پہونچا جہاں
مرشد بروجردی کی وساطت سے میرزا غازی ترخان کی ملازمت سے منسلک ہوگیا، اسی زمانہ
میں الٰہی کابل بھی گیا، اور ظفرخان احسن کی بارگاہ میں اس کی رسائی ہوئی، یہیں حکیم حاذق
گیلانی سے اس کی ملاقات ہوئی جو حاکم بخارا امام قلی خاں کے دربار سے ہندوستان کی طرف
سے سفارت کی خدمت انجام دے کر اسی زمانہ میں واپس ہوا تھا، اس کے ایک سال بعد
۱۰۲۱ھ میں الٰہی کابل سے آگرہ آگیا، اسی سال اس کی ملاقات تقی اوحدی سے ہوئی،
اس کے کچھ عرصہ بعد تقریباً ۱۰۲۳ھ سے ۱۰۲۴ھ تک الٰہی مہابت خاں کی ملازمت
میں داخل ہوا، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی رسائی جہانگیر اور شاہجہاں کے دربارون
تک بھی ہوئی، ۱۰۴۱ھ میں ظفرخاں احسن کے ساتھ کشمیر گیا، اور آخری عمر تک یہیں
مقیم رہا اور ۱۰۶۳ھ میں یہیں اس کی وفات ہوئی، "بود سخن آفرین" سے اس کا سال
وفات نکلتا ہے، اور یہی مادۂ تاریخ اس کے لوح مزار پر کندہ ہے۔

الٰہی ایرانی مذاق سخن رکھتا تھا، اور شاعری میں اس کا مرتبہ بلند تھا۔ تقی اوحدی
اسے "مجموعۂ کمال ہمہ دانی" اور صالح کنبوہی لاہوری "مظہر فیض نامتناہی" کے الفاظ سے اسے
یاد کرتے ہیں۔ الٰہی جب ہندوستان آیا تو اس وقت اس کی جوانی کا زمانہ تھا، تقی اوحدی نے
اس کے ایک سال بعد ۱۰۲۲ھ میں اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا، آگرہ میں الٰہی سے اس کی
ملاقات ہوئی تھی، اس کی ملاقات کا ذکر اور تاثر اوحدی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"الحق جوانیست در غایت دقت طبع و ادراک عالی، کمال شوخی فطرت و صفائی
خاطر دارد و آب نظمش در نہایت عذوبت، ابر فکرتش در غایت رطوبت بہر گونہ
سخن قدرتی تمامش ہست، اگر توفیق مشق یابد شاعری بغایت خوب خواہد شد،"

تا غایت دو ہزار بیت گفتہ، و ادراک درست رسائی دارد سخن نیز خوب میرسد۔[1]
محمد صالح کنبوہی لاہوری جس کو الٰہی کے آخری دور کا ہم عصر کہا جاسکتا ہے، اس کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتا ہے۔

"...... میر الٰہی کہ با فیضی رابطہ الٰہی دارد و با سخن استیناس طبیعی، طرز سخنش بسیار تازہ و اشعارش بلند آوازہ، لطف کلامش از قیاس افزوں وجزالت الفاظش از خیال بیروں است۔ در قصیدہ قصد ہائے نیکو می کند و در غزل معنی برجستہ می بندد استعارہ و تازہ گوئی را بمرتبۂ کمال رسانیدہ و در خانۂ بیت خصوصیات دیگر را طفیل دانستہ، بیشتر در تازگی ادا و نزکت و استعارہ می گوید۔"[2]

الٰہی کی تصنیفات میں زیر نظر تذکرہ کے علاوہ اس کا دیوان ہے، جو برٹش میوزیم اور برلن کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے نامور شاعر اور اہل قلم کے حالات لکھتے وقت کسی تذکرہ نگار نے اس کے تذکرۂ شعراء کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۲) **دفتر عصمت** ——— یہ خواتین شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کی اطلاع مولوی عبد الشکور المعروف بہ رحمان علی کے تذکرۂ علمائے ہند سے ملتی ہے۔ مولوی حافظ عبداللہ بلگرامی کے سلسلہ میں انہوں نے اس تذکرہ کا ذکر کیا ہے اس کی عبارت یہ ہے۔

"وی (مولوی حافظ عبداللہ بلگرامی) تصانیف زیادی بعربی و فارسی و اردو دارد و آنچہ فارسیست عبارتست از مفیض فارسی در قواعد فارسی، دفتر عصمت تذکرۂ زنان سخنور، شاہد نظم شرح گلدستۂ دانش، مکاتیب و اشعار۔"[3]

دفتر عصمت کا اب وجود باقی نہیں بلکہ کسی دوسری جگہ اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ مولف تذکرہ

---

[1] عرفات العاشقین ص ۲۲۳ - ۱۲۳ [2] عمل صالح ج ۳ ص ۴۱۵ [3] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰۵۱۰۲؛

کا حال بھی صرف تذکرۂ علمائے ہند میں ہے۔ ان کا نام عبداللہ تھا، اور مولوی حافظ عبداللہ کے نام سے معروف تھے۔ والد کا نام سید آل احمد واسطی تھا، نسباً سادات واسطی حنفی المذہب اور قادری المشرب تھے، قصبۂ بلگرام میں ولادت ہوئی۔ اپنے عہد کے نامور علما و فضلا سے اکتساب علم کیا۔ حفظ قرآن کے ساتھ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، تفسیر و فقہ اور حدیث میں استاد اور بنارس کے مدرسہ عربیہ میں عہدۂ معلمی فائز تھے۔ ۲۱ رمضان ۱۳۰۵ھ کو ان کی وفات ہوئی۔ کسی نے سال وفات اس قطعہ سے ظاہر کیا۔ ؎

نکو سیرت چو عبد اللہ حافظ سوی ملک بقا ناگاہ رفتہ

بسال رحلتش ہاتف ندا داد بجنت خاک پاک عبداللہ رفتہ
۱۳۰۵ھ

(۱۳) **سفینۃ الشوق** ـــــ اس تذکرہ کا مولف رائے منکہ رائے شاہ جہان آبادی تھا جس کا تخلص شوق تھا۔ اس تذکرہ کا کوئی وجود نہیں بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"(رائے منکہ رائے شوق) خلف اصغر رائے مجلس رائے نائب دیوان خالصۂ شریفہ از عمدہ ہائے معروف شاہ جہان آباد است، طبع ارشاد و کمال ادراک داشت، ہنگام اختلال سلطنت ہندوستان بوقوع حادثۂ شورش افغان در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد۔۔۔ ترک وطن کردہ وارد اکبرآباد شد دران ایام تذکرۂ ای مسمی بہ سفینۃ الشوق تالیف مینمود، گاہی شعر ہم میگفت"[۲]

(۱۴) **سفینۂ عشرت**:ـــــ یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے، اس کا مولف دوگا داس عشرت ہے عشرت کے بارے میں تذکرے بالکل خاموش ہیں، سفینۂ عشرت کی

[۱] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۰۴، ۱۰۵؛ [۲] سفینۂ ہندی ص ۱۱۴؛

پہلی جلد خدا بخش کتب خانہ بانکی پور پٹنہ میں موجود ہے۔ لیکن دوسری جلد اب نایاب ہے، غالب قیاس یہ ہے کہ اس تذکرہ میں "ش" سے "ی" تک کے شعراء کا ذکر رہا ہوگا کیونکہ پہلے حصہ میں "الف" سے "س" تک کے شاعروں کا ذکر ہے پہلے حصہ میں حروف تہجی کی ترتیب سے ۵۵۴ قدیم و جدید شعراء کا ذکر ہے، اس تذکرہ کی تالیف ۱۱۷۵ھ میں ہوئی، اس کا نام تاریخی ہے۔

(۱۵) عارف الآثار ـــــــ اس کے مؤلف خواجہ محمد عارف بقائی بخاری ہیں جو دسویں صدی ہجری کے آخر اور گیارھویں صدی کے ابتدائی دور کے شاعر ہیں انکے ہمعصر نامور مورخ ملا عبدالباقی نہاوندی نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خواجہ عارف نے ایک تذکرہ عارف الآثار کے نام سے آگرہ کے مقام پر تالیف کیا تھا، اسی تذکرہ کے حوالہ سے ملا عبدالباقی نہاوندی نے خواجہ عارف کا حال بھی قلم بند کیا ہے،

خواجہ عارف بقائی بخارا میں پیدا ہوئے ملا مشفق بخاری کے شاگرد تھے تحصیل علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد ایک عرصہ تک ماوراء النہر میں ازبک بادشاہوں کی ملازمت سے منسلک رہے، ۹۷۹ھ میں ہندوستان کا رخ کیا اور اڑیسہ و بنگال میں مقیم ہوئے۔ کچھ دن یہاں گذار کر دارالحکومت آگرہ گئے، ایک مدت یہاں بسر کرنے کے بعد دکن کا رخ کیا اور سپہ سالار اعظم خانخانان (عبدالرحیم) کی ملازمت اختیار کی، خان خاناں کی تعریف میں ایک مثنوی شاہنامۂ فردوسی کی بحر میں لکھی، اور اس کا نام "گلشن اشعار" رکھا مثنوی کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:-

در آن خانہ از صورت بی روان چراغی برافروخت از نور جان

مولف مآثر رحیمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ عارف کی ایک دوسری تالیف مجمع الفضلاء بھی

خانخاناں کی مدح میں ہے، اس کی عبارت یہ ہے۔

"خواجہ عارف بقائی در عارف الآثار کہ از مصنفات اوست گوید "تولد من در بخارا واقع شدہ۔۔۔۔۔۔ مدتہا در ماوراء النہر۔۔۔۔۔۔ بودم و بتاریخ تسع و تسعین وسبعین وتسعمایہ۔۔۔۔۔۔ در ولایت اودیسہ و بنگالہ میبودہ واز انجا بدار الخلافہ آگرہ و تذکرہ خود را کہ عارف الآثار نام نہادہ در دار الخلافہ آگرہ نوشتہ و بعد از مدتی کہ در ہندوستان بودہ بصوبہ دکن آمدہ، در بندگی این سپہسالار (خانخاناں) بنظم اوردہ ۔۔۔۔۔ و تصنیف دیگر کردہ کہ مجمع الفضلا و نام کردہ و آن نیز مبنی بر مدح این نامدار است و خود از جملۂ مداحان اوست"[1]

اس عبارت کا آخری حصہ جو مجمع الفضلاء سے متعلق ہے، عبدالباقی نہاوندی کی غلط فہمی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ مجمع الفضلاء کو انھوں نے خانخاناں کی مدح میں لکھی گئی کتاب بتایا ہے، حالانکہ وہ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ لاہور یونیورسٹی پنجاب (پاکستان) میں ناقص الآخر موجود ہے۔ اسی مخطوطہ کی بنیاد پر ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اپنی کتاب "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" میں اس کا ذکر فارسی شعراء کے تذکرہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ مولف مآثر رحیمی کی اس غلط فہمی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ عارف الآثار ہی مجمع الفضلاء ہے اور غلط فہمی میں انھوں نے عارف الآثار کو تذکرہ اور مجمع الفضلاء کو خانخاناں کی مدح سمجھ لیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے سامنے دونوں مخطوطے ایک وقت میں موجود نہیں رہے ہونگے لیکن یہ باتیں صرف قیاس ہیں قطعی طور پر مآثر رحیمی کی بات کی تردید مشکل ہے، ڈاکٹر علی رضا نقوی نے بھی اپنی کتاب میں مجمع الفضلاء کے ذکر میں اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا کہ عارف الآثار اور مجمع الفضلاء دونوں ایک ہیں یا دونوں الگ الگ کتابیں ہیں

---

[1] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۱۔ ۱۲۶۵

بہرحال، جب تک یہ اس کی تحقیق نہیں ہوجاتی کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں، اس وقت تک ہم عارف الآثار اور مجمع الفضلاء کو خواجہ عارف کے دو تذکروں کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، چونکہ عارف الآثار کا اب کوئی وجود نہیں ہے، اس لئے یہ تذکرہ نایاب کہا جائے گا۔

(۱۶) قند پارسی اور سخن الشعراء ——— یہ بھی نایاب تذکرہ ہے، کسی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ یہ تذکرہ تیرہویں صدی ہجری میں لکھے گئے کئی فارسی تذکروں کا ماخذ رہا ہے۔ ابوالقاسم محتشم[1] اور سید نورالحسن بھوپالی[2] نے اپنے تذکروں میں اس کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس تذکرہ کے نسخے تیرہویں صدی ہجری کے آخری زمانے تک موجود تھے، لیکن اب یہ نایاب ہے۔

قند پارسی کے مولف مولوی عبدالغفور خاں بہادر المتخلص بہ نساخ ہیں، نساخ مولف شمع انجمن کے معاصر تھے، مولف شمع انجمن نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے نساخ[3] کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے باپ کا نام قاضی فقیر محمد تھا جو وکیل عدالت[4] تھے اور ان کے بھائی مولوی عبداللطیف خان بہادر انگریزوں کے یہاں بلند عہدہ پر فائز تھے، نساخ کی ولادت کلکتہ کے مقام پر ۱۲۴۹ھ میں عیدالفطر کے دن ہوئی اور یہیں اپنی تحصیلات مکمل کیں اور فارسی زبان وخط نسخ میں مہارت نامہ حاصل کی۔ تادم تحریر (۱۲۹۲ھ) وہ انگریزی سرکار کی طرف سے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کی مجسٹریٹی اور کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔

مولف شمع انجمن نے نساخ کے نام سے ایک دوسرا تذکرہ منسوب کیا ہے جس کا نام

---

[1] اختر تاباں ص ۴ ؛ [2] نگارستان سخن ص ۱۲۱ ؛

"سخن الشعراء" ہے[1] اتفاق سے یہ تذکرہ بھی اب نایاب ہے۔

(۱۷) **مجمع البلغاء** ——— اس تذکرہ کا مولف مشہور شاعر اور ادیب میر علی شیر قانع ٹھٹوی (متوفی ۱۲۰۳ھ) کا لڑکا میر سید غلام علی ہے جو خود بھی اچھا شاعر تھا اور مائل تخلص کرتا تھا۔ قانع نے ۱۱۷۵ھ میں سندھ کے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ مقالات الشعراء کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مائل نے والد کی وفات کے بعد مجمع البلغاء کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جو مقالات الشعراء کے سلسلہ کی آخری کڑی یا اس کا تکملہ تھا۔ مائل نے اس میں مقالات الشعراء کے درج شدہ شعراء کے بعد سے اپنے عہد تک کے ان فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے جو سندھ میں رہتے تھے۔ اس تذکرہ کی تالیف ۱۲۱۸ھ میں ہوئی مگر اب اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں اور وہ اب نایاب ہے۔

"تذکرۂ مجمع البلغاء کے متعلق جو اطلاعات موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۸ھ میں مرتب ہوا۔ اس میں تقریباً ۳۳۹ شاعر تھے اور ۵۰۰۰ منتخب اشعار مختلف شعراء کے نقل کئے گئے تھے۔[2]

مولف تذکرہ مائل مسمی بہ میر غلام علی ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوا۔ شعرگوئی کا ذوق باپ ورثہ میں ملا تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ ۱۲۵۱ھ میں مائل کی وفات ہوئی۔ اس کی تالیفات یہ ہیں:۔

(۱) دیوان فارسی (غزلیات) (۲) دیوان اردو (۳) دیوان فارسی (قصائد، منقبت، ساقی نامہ و رباعیات وغیرہ) (۴) مجمع البلغاء۔

(۱۸) **مخزن اخبار** ——— اس تذکرہ کا ذکر ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی کے مشہور

---

[1] شمع انجمن ص ۹۰۸ – ۲۰۸، [2] تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ۲ ص ۳۲ – ۱۲۹۔

تذکرہ میخانہ میں ہے۔ ملا قزوینی نے اس تذکرہ میں مخزن اخبار" کے حوالہ سے چھ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ساقی نامہ کہا تھا، ان شعراء کے نام ہیں نظامی گنجوی، (ص ۱۲) شیخ فخر الدین عراقی (ص ۲۸) امیر خسرو دہلوی (ص ۵۹، ۶۲، ۶۳) خواجو کرمانی (ص ۸)، عبداللہ ہاتفی جامی (ص ۱۲) حکیم پرتوی لاہیجانی شیرازی (ص ۲۶)؛

ملا قزوینی نے تذکرہ کے مولف کا نام امیر مختار لکھا ہے۔ مولف کے بارے میں اس سے زیادہ کہیں سے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ خیال ہے کہ ۹۴۱ھ اور ۱۰۲۸ھ کے درمیانی زمانے میں یہ تذکرہ ہندوستان میں لکھا گیا[1]

(۱۹) معاصر الشعراء ــــــ یہ ایک مختصر تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویس نے اپنے معاصر شعراء کا ذکر کیا تھا۔ اس تذکرہ کا کہیں وجود نہیں۔ مولف گلزار اعظم نے غلام دستگیر نایطی المتخلص بہ لایق کے ذکر میں اس تذکرہ کو لایق کی تالیف قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"تذکرہ ای بکمال اختصار بطور بیاض ترتیب دادہ و نامش معاصر الشعراء نہادہ"

حکیم غلام دستگیر خان بن غلام احمد نایطی کا لقب غیاث اور تخلص لایق تھا حکیم باقر حسین خاں رائق کے بھانجے تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مولوی واقف اور حاجی زین العابدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی میں بھی اس دور کے مشہور علماء سے استفادہ کیا طب میں خاص مہارت پیدا کی شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا اور اساتذۂ فن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔[2]

(۲۰) معدن الجواہر ــــــ اس تذکرہ کا ذکر بھی گلزار اعظم کے مولف نواب غوث خان بہادر ہی نے کیا ہے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ معدن الجواہر میں

---

[1] تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ج ۲ ص ۳۰۱؛ [2] گلزار اعظم ص ۳۰۴، [3] ایضاً

چند نامور اساتذہ پر بے جا اور غلط اعتراض کئے گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا دوسرا تذکرہ بنام گلزار اعظم اس کے جواب میں لکھا۔

معدن الجواہر کا مولف ...... مولوی محمد مہدی بن محمد عارف الدین خان رونق واصف تخلص کرتا تھا، اس کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں مدارس میں ہوئی۔ فارسی کی تعلیم اور شاعری کی مشق والد کی صحبت میں اور عربی اور علوم معقول و منقول کی تحصیل اس خطہ کے نامور علماء سے کی۔ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا، ابتدائے شباب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی، ایک درسگاہ میں نوجوان انگریزوں کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر سترہ سال تک قائم رہے، بعد میں اس سے علحدہ ہو گئے اور نواب اعظم (مولف گلزار اعظم) کے مجلس مشاعرہ میں شریک ہو کر نواب کی ملازمت سے منسلک ہو گئے[1]۔

واصف اپنے عہد کے نامور اہل قلم ہیں ان کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں،

(۱) دلیل ساطع. (۲) حکایات دلپسند، (۳) گلزار عجم مختصر برہان قاطع؛ (۴) تذکرۂ معدن الجواہر؛ (۵) مطلوب الاطبا ترجمہ موجز (اردو) (۶) ترجمۂ آداب الصالحین (۷) دلیل الشعراء؛ (۸) رقعات واصفی؛ (۹) املانامۂ واصفی؛ (۱۰) خلاصۃ التکمیل (۱۱) روضۃ العابدین ترجمہ درمختار؛ (۱۲) حدیقۃ المرام (عربی)

تذکرہ معدن الجواہر کا کوئی نسخہ آج دستیاب نہیں، اور اب یہ نایاب ہے۔

(۲۱) مرقع ظفرخان احسن ــــــــ ظفرخان احسن شاہجہاں اور جہانگیر کے عہد میں نامور سیاست داں اور انتظامی شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اپنے باپ خواجہ ابوالحسن تربتی کی جگہ کشمیر کی صوبہ داری کی نیابت کی۔ بعد میں کشمیر اور کابل کے

---

[1] گلزار اعظم ص ۳۰۷ تا ۳۹۹[illegible]، [2] ایضاً ص ۳۹۰ تا ۳۹۹؛

صوبہ دار بنائے گئے، سیاست میں نام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی ت
میں نمایاں حصہ لیا، شعراء، ادبا، اور علماء کی کثیر تعداد ان کی ذات سے وابستہ
انھوں نے خود بھی کئی شعری اور نثری کارنامے یادگار چھوڑے۔ شاعری سے
ذوق کی بنا پر ان کو معاصر شعراء کی صحبت بڑی عزیز تھی۔ چنانچہ احسن نے اپنے ہ
شعراء کا کلام خود ان ہی کے ہاتھوں سے لکھوا کر ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا، جس
ان شعراء کی تصویریں بھی تھیں۔ سرخوش نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا

"تذکرۂ اشعار شعرائے کابل کہ باری ربط و آشنائی داشتند ۔ ۔ ۔ انتخاب
ہر کدام بخط او نویسانیدہ بر پشت ہر ورق صورت آن معنی سنج نیز ثبت کردہ بود
یک ورق کہ بر و شبیہہ کلیم بودہ، نیقر دیدہ و صورتش را زیارت کردہ ام"[۱]

سرخوش کے علاوہ خوشگو[۲] اور آزاد[۳] نے بھی اسے "مجموعہ" ہی کہا ہے، لیکن مولانا
عبدالرحمٰن[۴] اور نواب علی بن ابراہیم خلیل[۵] اسے مجموعہ کے بجائے "بیاض" کہتے ہیں، ا
علی رضا نقوی[۶] نے سرخوش اور خوشگو کے قول کو رد کرتے ہوئے اس انتخا
نام مرقع رکھا ہے،

افسوس کہ اب اس مرقع کا کوئی وجود نہیں، بقول مولانا شبلی نعمانی[۷] اگر
آج ہاتھ لگ جائے تو اس کی قیمت لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہوگی۔

---

[۱] کلمات الشعراء ص ۴؛ [۲] سفینۂ خوشگو؛ [۳] نثر و آزاد؛ [۴] بزم تیموریہ صباح
عبدالرحمٰن طبع اول؛ [۵] صحف ابراہیم ص ۲۲؛ [۶] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک
ورق ۱۳؛ [۷] فہرست مخطوطات بانکی پور نمبر ۱۸۱؛

ڈاکٹر تاراچند کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

از جناب الطاف حسین خان صاحب شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

افسوس ہے ابھی ہمارے آنسو پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے انتقال پر خشک نہیں ہوئے تھے کہ ہمکو اپنے ایک دوسرے عظیم مورخ ڈاکٹر تاراچند کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مجھے دو مرتبہ حاضر ہونے کا شرف نصیب ہوا ہے ایک مرتبہ اپنے ایک تاریخی مقالہ کے سلسلہ میں جو معارف میں نامکمل صورت میں شائع ہوا، اور دوسری مرتبہ اپنی کچھ تاریخی گتھیوں کے سلجھانے کے سلسلہ میں[1] مرحوم کا اخلاق، ان کی محبت، ان کا علم کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے ہماری علمی مجلس میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا ؎

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کے نماند

میرے مقالہ "ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ اور مورخین پر ایک تنقیدی جائزہ"[2] پر ڈاکٹر صاحب نے

---

[1] دوران ملاقات ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "مشرق میں ڈاکٹر عسکری صاحب پٹنہ یونیورسٹی اور مغرب میں ڈاکٹر عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی فارسی کے ان شعراء کے سلسلہ میں اچھا کام کر رہے ہیں، جنھوں نے ہندؤں اور ہندوستان سے محبت کا تذکرہ اپنے کلام میں کیا ہے، خدا کا شکر ہے ہمارے دوآبہ (میرا وطن فتحپور گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں واقع ہے) میں آپ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے، اس وقت ہم سب کو ہندؤں اور مسلمانوں کی محبت کی بھولی بسری داستانیں سنانا ہے تاکہ سینوں میں نرم گوشے پیدا ہوں اور شک و شبہ کا ماحول چھٹے۔"

[2] دیکھئے:۔ معارف، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۲ء

ایک تعارف سپرد قلم فرمایا تھا، جو اتفاق سے ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس موقع پر یہ میرا علمی فرض تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس تحریر کو معارف پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس تحریر کو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:-

تعارف :- قرون وسطیٰ کی تاریخ کے متعلق مورخوں کی رایوں میں جس قدر اختلاف پایا جاتا ہو اتنا فرق ہندوستان کی کے اور کسی دور کے بارے میں نہیں، انگریز مورخوں نے کچھ تو اپنی سیاسی ضروریات کے تحت اور کچھ ایشیائی لوح سماج کے بنیادی اصولوں اور ہندوستانی ذہنوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اس زمانے کی تاریخ کو مسخ کر دیا ہے، یورپ کا موجودہ زمانے کا ذہن اور اس ذہن پر قائم موجودہ معاشرہ مشرق کے نظام سے اس قدر دور ہیں کہ یورپ کے فلسفی اور تاریخ دان اس کے سمجھنے میں زیادہ تر ناکام رہے ہیں، مغربی تعلیم کے اثر اور یورپ کے علمی ارتقا نے ہندوستانی ذہنوں کو اس قدر مرعوب کر دیا ہے کہ سارے مورخ مغربی تاریخی اصولوں اور طریقوں کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں، پھر بھی انسان کے ذہن میں فطرتی آزادی کار فرما ہے، اس لئے کچھ لوگ ضرور کوشش کرتے ہیں کہ ذہنی غلامی کی زنجیروں کو توڑیں اور آزاد ہندوستان میں بے لاگ طریق خیال کو اپنائیں۔

اس آزاد خیالی کی جس قدر گذشتہ زمانہ کے سمجھنے میں ضرورت ہے اتنی شاید کسی اور شعبہ علم میں نہیں ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ علم کی بنیاد سچائی پر ہے اور سچائی ہر طرح کے تعصب سے پرہیز کرتی ہے، حق کی تلاش اور حق کی دریافت فرد اور سماج دونوں کے لیے لازم بھی ہے اور مفید بھی۔ حق پرست انسان اخلاقی عظمت کی اہلیت حاصل کرتا اور حق پرستی ملت کی یک جہتی اور محبت کی کڑیوں کو مضبوط بناتی ہے۔ تاریخ مدت کے ماضی کی یاد ہے، جو ملت کے حال اور مستقبل کی کڑیوں کو جوڑتی ہے، تاریخ کی انفرادی

اور خصوصی کردار کی آئینہ دار ہے۔ تاریخ داں کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ ہے، کیونکہ اس کی تالیف اور تصنیف کا قوم کے افراد پر اور کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے، گمراہ کن تاریخ ناقابلِ معافی جرم ہے، چونکہ اس سے قوم کا ذہن بگڑتا ہے، اور ذہن کی خرابی قوم کے قوام کو کمزور کرتی ہے۔

افسوس کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر پرایوں ہی نے نہیں اپنوں نے بھی اس کی نقل میں سخت ظلم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ملک میں وہ تاریک فضا پھیلی جس نے ہندوستان کو شک وشبہہ خوف اور حرص کی گھٹاؤں سے ڈھانپ رکھا ہے، اگر امید، امن، مسرت اور ترقی کے اجالے سے دلوں کو بھرنا ہے تو صحیح تاریخ کا سہارا ضروری ہے۔ شری الطاف حسین خاں شروانی نے کچھ ایسے ہی جذبوں کے تحت قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور مورخین پر تنقیدی تبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان کی کوشش اور ان کا مقصد قابلِ تحسین ہے۔ اس لیے بھی کہ فارسی تاریخ نویسوں نے اپنے زمانہ کے ماحول کے مطابق کتابیں تصنیف کیں۔ یہ مورخ زیادہ تر ایسے علماء تھے جن کا ذہن کتابی دائروں اور فقہی بحثوں سے آگے نہیں جاتا تھا، ان کی دنیا عمل کی دنیا نہیں تھی، انھیں سیاسی اور معاشی حقیقتوں سے کوئی واسطہ نہ تھا، لکیروں کے فقیر تھے، اور جدت سے متنفر۔ چھ سو سال کے طویل زمانہ کا جائزہ لیں تو علماء کی تحریروں میں بادشاہوں کے طرزِ عمل کی تنقیص زیادہ ملے گی، شریعت سے انحراف کے تذکرے، اسلامی شعائر سے تغافل کی شکایتوں سے تاریخ بھری ہوگی، یہی کتابیں زمانہ حال کے ہندی اور غیر ہندی مورخوں کا سرمایہ ہیں۔ کم لوگوں نے کوشش کی ہے کہ فارسی ماخذوں کا تجزیہ کرنے کے بعد سچ اور جھوٹ، افراط اور تفریط، تخیل کی پرواز اور ذہنوں کے میلان کا اندازہ لگائیں۔ میں

اس مختصر رسالہ کے نوجوان مولف کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی، اور کچھ حقیقتوں کے واضح کرنے کی زحمت برداشت کی۔
ہے اس پہلی تصنیف میں اس وسیع موضوع کا احاطہ ممکن نہ تھا، لیکن یہ حرف اول ہے، اُمید ہے ان کی سعی جاری رہے گی اور ان کے قلم سے ایسی مبسوط معرض تحریر میں آئے گی، جو تاریخ کے اس اہم پہلو پر روشنی ڈالے گی، اور جس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔"

(ڈاکٹر) تاراچند
(۱۶۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد)

مطبوعات جدیدہ

افت راشدہ اور ہندوستان، مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، ز کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰۰ مجلد قیمت للعہ قیمت غیر مجلد للعہ پتہ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

ب و ہند کے تعلقات، اور ان سے متعلق مباحث فاضل مصنّف کا خاص موضوع ہے وہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں زیر نظر کتاب میں خلافت راشدہ کے زمانہ میں عرب و ہند تعلقات لیا ہے، پہلے مختصراً عہد رسالت میں پھر خلافت راشدہ میں دونوں ملکوں کے جو تعلقات کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اس سلسلہ میں اس دور میں ہندوستان میں فتوحات اور یہاں کے سیاسی و انتظامی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور آخری ابواب میں ہندوستان میں عربوں کی آمد اور عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی ستان میں آنے والے صحابہ و تابعین کے مختصر تراجم سے متعلق بھی معلومات فراہم کیے گئے کتاب محنت و تحقیق اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے، لیکن حشو و زوائد سے مصنّف کی کئی کتابوں کا مرکزی موضوع یہی رہا ہے، اس لئے ان میں یکسانیت کے مباحث کا تکرار بھی ہے، شروع میں مراجع و مصادر کی مفصل فہرست دیگئی ہے، مہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی اس موضوع کی مستم بالشان کتاب "عرب و ہند" کا ذکر پتہ نہیں کیوں رہ گیا ہے،

آن مجید کا چیلنج ۔ مرتبہ مولانا داؤد اکبر اصلاحی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ہے پیسے ناشر دائرۃ المصنفین مبارکپور
اعظم گڈھ، یو۔پی

اس میں قرآن مجید کی ان آیتوں پر بحث کی گئی ہے، جن میں منکرین و مخالفین سے یہ کہا
ہے کہ وہ اس کے مانند کوئی اور سورہ یا آیت پیش کریں، لائق مصنف نے پہلے ان آیات
متعلق قدیم وجدید اہم مفسرین کے خیالات نقل کر کے یہ دکھایا ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک
کی نوعیت لفظی ہے یعنی قرآن فصاحت و بلاغت اور طرز ادا کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن
کے خیال میں اس کی نوعیت معنوی ہے یعنی قرآن کی دعوت و تعلیم اس کے نظریہ توحید
اور اس کے دلائل و شواہد کا کوئی جواب ممکن نہیں، مصنف کے نزدیک قرآن کی فصاحت
و بلاغت مسلم ہونے کے باوجود دوسرا نقطۂ نظر مرجح ہے، اور اس کو انھوں نے دلائل
پر واضح کیا ہے، اور پہلے نقطۂ نظر پر مختلف اشکالات اور شبہات وارد کئے
ممکن ہے ان کی بعض توجیہات سے کسی کو مکمل اتفاق نہ ہو تاہم مجموعی حیثیت سے ان کی
میں وزن ہے اور یہ کتاب وسیع مطالعۂ قرآن کا نتیجہ ہے لیکن کہیں کہیں ٹھیٹ ہندی الفاظ
جیسے سنگھٹن، باشی (بجائے باسی) چالو اور ہڑبونگ وغیرہ کا استعمال ذوق سلیم پر گراں گ

تذکرۂ سعید۔ مرتبہ۔ جناب افضل اقبال صاحب ایم اے، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و
طباعت بہتر صفحات ۱۳۰، قیمت تحریر نہیں، پتے (۱) سعیدیہ لائبریری اینڈ ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد (۲) مکتبۂ نشأۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد وغیرہ،

حیدرآباد دکن کا کتب خانہ سعیدیہ لائبریری وہاں کے مشہور اہل علم بزرگ اور عدا
العالیہ کے چیف جسٹس مفتی محمد سعید خاں (م ۱۸۹۵ء) کی یادگار ہے، جہاں عربی و فارسی
کی قدیم اور اہم قلمی کتابوں کا عمدہ ذخیرہ ہے، اب اس کے ماتحت ایک ریسرچ انسٹی

کیا گیا ہے اور اسی کی طرف سے سو نیر شائع کیا گیا ہے، جو مختلف اصحاب قلم کے مضامین
ہے، اس میں مفتی صاحب مرحوم کے حالات و کمالات ان کے خاندان کے کارنامے کتبخانہ
رشت، اس کے متعلق ضروری معلومات و کوائف اور بعض اہم نوادر کے خصوصیات
گیے ہیں، ایک مضمون میں مفتی صاحب کے خانوادہ کی خواتین کی ادبی و تصنیفی خدمات
سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا ذکر ہے، ڈاکٹر محمد یوسف الدین استاذ عثمانیہ یونیورسٹی
ریڈیائی تقریر بھی شامل ہے جس میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و تمدن، اور
سرے شعبوں میں تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے، شروع میں مشاہیر علم و قوم کے
ت نقل کیے گئے ہیں جو انھوں نے لائبریری کے معائنہ کے وقت قلمبند کیے تھے آخر کے
احصہ میں وزرار و اعیانِ حکومت کے پیغامات اور لائبریری اور رانسٹی ٹیوٹ
فید معلومات دیے گئے ہیں۔ اگر لائبریری کے مخطوطات کی فہرست شائع
تو علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملتی۔

صحیفۂ بشارت۔ مرتبہ۔ جناب مبشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت د
ت غنیمت صفحات ۱۴۰ قیمت للعہ، پتہ مصنف سے گلی وحید بخش، محلہ سوتھ۔ بدایوں۔

مصنف کے چند ادبی و تنقیدی اور دو ایک تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں سودا و حاتی کی
اکبر کی ظرافت جگر مرادآبادی کے تغزل اور مجاز و ترقی پسندانہ شاعری کے متعلق اظہار
مضامین نذیر احمد کی ناول نگاری اور عبد الحلیم شرر کی مقالہ نگاری پر ہیں، ایک مضمون میں اردو میں
ور ایک دوسرے میں اردو کے تین اہم تذکروں نکات الشعرا (میر) آب حیات (آزاد) اور گل رعنا
تقابلی مطالعہ ہے، آخر میں چند کتابوں پر تبصرے بھی ہیں، گو تمام مضامین مختصر اور بعض تشنہ بھی
کی رایوں میں اعتدال اور تحریر میں سلاست ہے اختصار کی بنا پر یہ مجموعہ طلبہ کیلئے خصوصیت سے مفید ہوگا۔

انسانی فریضہ - مرتبہ - جناب افتخار فریدی صاحب چھوٹی تقطیع کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، صفحات ۴۶، پتہ مصنف فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ مرادآباد،

مصنف تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز اور سرگرم کارکن ہیں، اس رسالہ میں انھوں نے تبلیغ و دعوت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کو مسلمانوں کا اصلی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور موجودہ دور کے ابتر حالات، انسانیت کی تباہی، اخلاقی و ذہنی پستی، مادیت و خدافراموشی وغیرہ کا ذکر کرکے انسانوں کی صحیح رہنمائی اور دعوت و شہادت علی الناس کے فریضہ کی جانب امت کو توجہ دلائی ہے۔ اور ضمناً تبلیغ و دعوت کے ضروری اصول و آداب اور اتمام حجت کی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا تھانوی، مولانا آزاد، مولانا احتشام الحسن، مولانا علی میاں اور مولانا امین احسن اصلاحی کی دعوتی و تبلیغی تحریروں کے اقتباسات بھی درج کر دئے ہیں، اس حیثیت سے یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے سبق آموز اور بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

پیغام حیات - مرتبہ - جناب ہینسن ریکانی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۲، قیمت - سے، پتہ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ باکس ۱۵۳ حیدرآباد، آندھرا پردیش

پیغام حیات ہندوستان کے چونتیس مسیحی شعراء کے اردو کلام کا مجموعہ ہے، ہر شاعر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ . . . . . اس میں عیسوی مذہب کے عقائد و افکار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کا نام پیغام حیات رکھا گیا ہے، مرتب نے حاشیے میں مذہبی اصطلاحی الفاظ کی تشریح و وضاحت کر دی ہے مذہبی حیثیت سے قطع نظر یہ مجموعہ شاعرانہ لطف سے خالی نہیں، اس سے اردو کی غیر فرقہ داریت، اس کی ہمہ گیری اور ہر مذہب و ملت میں یکساں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ض)

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵/۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح بڑے خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گ
یہ محض جانشینِ شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے،
اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مر
جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی وع
وادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کان پور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات تح
جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدام مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، آ
کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، او
سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیامِ دارالمصنفین، سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان، او
پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف
وفود کے رکن و مدبر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل
روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب وطرز
انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپیے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

......❊......

اگست ۱۹۷۴ء

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جلد ۱۱۴ ماہ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۴ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مئی میں مجاہد جلیل مفتی امین الحسینی نے انتقال کیا، ان کی پوری زندگی جہاد مسلسل کی ایک داستان ہے، اسرائیل کے قیام کے بعد سے برابر وہ اس کے خلاف جد وجہد میں لگے رہے، فلسطین کا مسئلہ اگرچہ ابتدا سے مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ تھا۔ اور انھوں نے اسی وقت سے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا، لیکن جب تک اسرائیل نے پر و بال نہ نکالے تھے اسکے عواقب ونتائج پر انکی پوری نظر نہ تھی، مفتی صاحب کی دور بین نگاہ نے . . . اسکو محسوس کر لیا تھا، اور انھوں نے پوری دنیائے اسلام کا سفر کرکے مسلمانوں کو اس کے خطرات سے آگاہ اور اس کے مقابلہ پر آمادہ کیا، اس سلسلہ میں وہ ہندوستان بھی آئے تھے، اس لئے اس مسئلہ میں جان ان ہی نے ڈالی تھی، اور اس راہ میں قید و بند جلا وطنی ہر قسم کی مصیبتیں جھیلیں اور اسی جہاد پر ان کا خاتمہ ہوا۔ ایسی عظیم شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے انکی موت تنہا عربوں کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل کے مدارج بلند فرمائے۔

دوسرا حادثہ سعودی عرب کے سابق ہندوستانی سفیر شیخ انس یسین کی وفات کا ہے، ابھی وہ جوان تھے، لیکن تدبر و معاملہ فہمی میں تجربہ کار بوڑھوں سے کم نہ تھے، وہ مختلف اوقات میں مختلف ملکوں کی سفارت پر رہے، آج کل ترکی میں سفیر تھے، وہیں کار کے حادثہ میں وفات پائی، ان میں اپنے مذہب وملت کا بڑا درد تھا، ہندوستان کے اسلامی اداروں سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اپنی سفارت کے زمانہ میں متعدد اداروں کو دیکھا اور ان کی مدد بھی کی، دارالمصنفین کے بھی محسن تھے، یہاں آنے کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ آنا نہ ہو سکا، دو سال ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلماء

کے مدرسہ ثانویہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے لکھنو آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی، اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

راقم کے لیے تیسرا حادثہ طالب علمی کے زمانہ کے رفیق مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم کی وفات کا ہے، مرحوم درجہ میں مجھ سے دو تین سال نیچے اور غالباً عمر میں بھی اسی قدر چھوٹے تھے، لیکن ہم دونوں عرصہ تک ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اس لئے ان سے دوستانہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے اسی زمانہ سے ان میں مضمون نگاری کا ذوق تھا، چنانچہ عشاق عرب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو زمانہ کانپور کے کئی نمبروں میں چھپا تھا، ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے، اور وہاں تعلیم کے ساتھ مختلف اوقات میں جامعہ کے مختلف شعبوں سے انکا تعلق رہا، بچوں کا ادب لکھنے میں ان کو خاص ملکہ تھا اسکے وہ صاحب طرز ادیب تھے، برسوں بچوں کے رسالہ پیام تعلیم کے اڈیٹر رہے اور اسکو انکا بڑا مقبول رسالہ بنا دیا، پیام تعلیم کے مضامین کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ذوق کی بہت سی کتابیں لکھیں اور بچکانہ ادب کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، ان سے تعلقات کا سلسلہ برابر قائم رہا، کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جاتی تھی گذشتہ دسمبر میں دلی میں ملاقات ہوئی تھی کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ایک خاصے بڑے طبقہ میں یہ ذہنیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ اور جنگ آزادی کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام مٹا دیا جائے یا کم سے کم انکی بڑی تاریک تصویر پیش کیجائے چنانچہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے کارناموں اور انکی قربانیوں کا ذکر اور ان کے ان لیڈروں کا نام تک مشکل سے آنے پاتا ہے جنھوں نے تحریک آزادی میں جان ڈالی تھی، حالانکہ انھوں نے اس زمانہ میں آزادی کا علم بلند کیا جب ہندوستان میں اسکا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا، اور حضرت سید احمد شہید اور مولانا

محمد اسمٰعیل شہید کے وقت سے لیکر ہندوستان کی آزادی تک اسکا مسلسل سلسلہ قائم رہا ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن اسکے اصل قائد و رہنما مسلمان ہی تھے اور اسکا خمیازہ سب سے زیادہ ان ہی کو بھگتنا پڑا، ترک موالات کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے، اس راہ میں ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں ہیں محض ہندوستان کی تقسیم کے الزام میں ان کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے پھر یہ بھی ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ اس تقسیم کے حقیقی اسباب کیا تھے، اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے محض مسلم لیگ کے نعرے سے اتنا بڑا انقلاب نہیں ہو سکتا تھا، اس نے تو صرف ان اسباب سے فائدہ اٹھایا دوسرے لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری تنظیمیں آخر تک تقسیم کے خلاف رہیں، اگر کانگریس نے جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا تو تقسیم کی نوبت نہ آتی اور اب تو خود منصف مزاج ہندو اہل قلم تک حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹا رہے ہیں،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو جنگ آزادی کی تاریخ لکھنی چاہئے اور اسمیں مسلمانوں کا حصہ پوری طرح دکھانا چاہئے اسکی ذمہ داری جامعہ ملیہ اور اسکے بعد مسلم یونیورسٹی پر عائد ہوتی ہے، جامعہ تو جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کی زندہ یادگار ہے اس کام کیلئے پروفیسر ہارون خان شروانی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر خلیق نظامی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے اول الذکر دونوں بزرگ جنگ آزادی کے عینی شاہد ہیں، مگر اب وہ عمر کی اس منزل کو پہنچ گئے ہیں کہ خود اس کام کو انجام نہیں دے سکتے لیکن انکی نگرانی میں ہو سکتا ہے ادارۂ اسلام اور عصر جدید کے دائرہ میں جن کا نام آجاتا ہے خلیق احمد صاحب نظامی نامور صاحب علم و قلم اور پختہ کار مصنف ہیں لیکن افسوس ہے کہ انکے علمی ذوق کو پرو وائس چانسلری کے چکر نے غارت کر دیا انکا اصلی مقام تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف کی مسند تھی چانسلری اور پرو وائس چانسلری کا خارزار نہیں مسلم یونیورسٹی کو وائس چانسلر بہت مل جائیں گے مگر خلیق احمد نظامی جیسا صاحب علم و قلم کا ملنا آسان نہیں کاش وہ اسپر غور کرتے ع تو بہار عالم دیگری زکجا بہ این چمن آمدی ۔

مقالات

حدیث کا درایتی معیار
(داخلی نقد حدیث)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۴)

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے اصول کے خلاف ہو

(۱۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے عام اصول کے خلاف ہو۔

ان یکون مخالفاً للقواعد العامۃ فی الحکم والاخلاق[1]　　　حدیث حکمت و اخلاق کے عام قواعد کے خلاف ہو۔

ابن جوزی کہتے ہیں :-

او یناقض الاصول[2]　　　یا حدیث اصول کو توڑنے والی ہو۔

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پاتی ہیں :-

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

افضل الناس اعقل الناس[3]　　　لوگوں میں سب سے افضل وہ لوگ ہیں جو عقل میں افضل ہیں،

انما یرتفع العباد غداً فی الدرجات وینالون الزلفی　　　بندے کل (آخرت میں) اللہ کا قرب اور بلند درجات اپنے عقل کے مقدار سے

---

[1] مصطفی سباعی۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [2] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات کتاب التوحید باب فی ان اللہ عزوجل قدیم، [3] موضوعات کبیر فصل اول وما یلحق بہ الخ ص ۱۰۵

من ربهم على قدر عقولهم[۱]	حاصل کریں گے۔
شرارکم معلموا صبیانکم اقلهم	بچوں کے معلم تم میں زیادہ برے ہیں،
رحمة على اليتيم واغلظهم على	یتیموں پر بہت کم مہربان اور مسکینوں
المسكين[۲]	پر زیادہ سخت ہیں،
النظرة الى المرءة الحسناء	خوبصورت عورت کی طرف دیکھنے سے
يزيد في البصر[۳]	بصارت بڑھتی ہے،
لا يصح المكر والخديعة	مکر اور دھوکا نکاح کے علاوہ اور کسی
الا في النكاح[۴]	میں درست نہیں ہے۔
لو اغتسل اللوطي بماء البحر	(فعل قوم لوط کرنے والا) اگر سمندر کے پانی
لم يجئ يوم القيمة الا جنبا[۵]	سے بھی غسل کرے جب بھی وہ قیامت کے دن
السخي حبيب الله ولو كان فاسقا	سخی اللہ کا دوست ہے اگر چہ
والبخيل عدو الله ولو كان	فاسق ہو اور بخیل اللہ کا دشمن ہے
راهبا[۶]	اگر چہ عابد و زاہد ہی ہو،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كانت عندي امرءة تسمعني	میرے پاس ایک عورت (گانا) سنا رہی تھی،
فدخل صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے،
وهي على تلك ثم دخل عمر	وہ بدستور سناتی رہی، پھر حضرت عمرؓ آئے

۱۔ موضوعات کبیر فصل اول و ملا علی بر ص۱۰۱ ۲۔ ایضاً حرف الشین ۳۔ قاضی شوکانی۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الادب والزہد الخ ۴۔ ایضاً کتاب النکاح ۵۔ علامہ سخاوی۔ المقاصد الحسنۃ حرف اللام ۶۔ موضوعات کبیر حرف الکاف

فضحت فضحك صلی اللہ علیہ وسلم فقال ما یضحك یا رسول اللہ فحدثه فقال واللہ لا اخرج حتی اسمع ما سمع صلی اللہ علیہ وسلم فاسمعته[1]

تو وہ بھاگ گئی، اس پر رسول اللہ کو ہنسی آگئی، حضرت عمرؓ نے ہنسی کی وجہ پوچھی، آپ نے عورت کے گانا سنانے اور بھاگنے کا واقعہ سنایا تو حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میں وہی نہ سن لوں جو رسول اللہ صلعم کو سنا رہی تھی، پھر عورت نے حضرت عمرؓ کو سنایا۔

رتن ہندی سے منقول ہے:۔

کنت فی زفاف فاطمة علی علی فی جماعة من الصحابة فکان ثمة من یغنی نطابت قلوبنا و رقصنا فلما کان الغد سألنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن لیلتنا فلم ینکر علینا ودعا لنا[2]

میں صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کی شب زفاف میں موجود تھا، اس موقع پر ایک گانے والا موجود تھا، اور ہمارے دل اس قدر مسرور تھے کہ ہم لوگوں نے رقص کیا، دوسرے دن رسول اللہؐ سے گذشتہ رات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کوئی نکیر نہیں کی اور ہمارے لیے دعا کی۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث شہوت و فساد کی داعی ہو

(۱۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث شہوۃ و فساد کی رغبت دلاتی ہو:

او داعیا الی الشھوۃ والمفسدة[3]

یا حدیث شہوت و فساد کی داعی ہو،

---

[1] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات باب السماع والسوق [2] ایضاً باب فیمن ادعی الصحبۃ کذبا [3] الخ مصطفی سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی حدیثیں موضوع ہوں گی:

شهوة النساء تضاعف على شهوة الرجال[1]	عورتوں کی شہوت مردوں کی شہوت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے،

حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے:-

فضلت المرءة على الرجل تسعة وتسعين من اللذة ولكن الله القى عليهن الحياء[2]	عورتوں کو مردوں پر لذت میں ننانوے درجہ فضیلت حاصل ہے، لیکن اللہ نے ان پر حیا کا پردہ ڈال دیا ہے،
عقولهن فى فروجهن[3]	عورتوں کی عقلیں ان کی شرمگاہوں میں ہیں
شكوت الى جبريل ضعفى من الوقاع فامرنى باكل الهريسة[4]	میں نے جبریل سے ضعف باہ کی شکایت کی تو انھوں نے حریرہ کھانے کا حکم دیا،
قال معاذ هل اتيت من الجنة بطعام قال نعم اتيت بهريسة فاكلتها فزادت فى قوتى قوة اربعين وفى نكاحى نكاح اربعين	معاذؓ نے کہا کیا آپ جنت سے کوئی کھانا لائے ہیں، آپ نے فرمایا ہاں حریرہ لایا ہوں، میں نے اس کو کھایا تو میری قوت میں چالیس مردوں کی قوت کا اضافہ اور میری شہوت میں چالیس عورتوں کی شہوت کا اضافہ ہوا،
وكان معاذ لا يعمل طعاما الا بدأ بالهريسة[5]	معاذؓ ہر کھانے سے پہلے حریرہ استعمال کرتے تھے،
ان الرجل ليجامع فيكتب له	انسان اپنی عورت سے جماع کرتا ہے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات فصل تادیب النساء الخ [2] المقاصد الحسنۃ باب العین [3،4] تذکرۃ الموضوعات فصل الادام کاللحم والھریسۃ [5] ایضاً

اجر ولد ذکر قاتل فی سبیل الله فقتل [1]	تو اسکو ایسے لڑکے کا اجر ملتا ہے جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا پھر شہید ہو گیا ،
ما من رجل من المسلمین یاخذ بید امرأته یراودها الا کتب الله له عشر حسنات فاذا عانقها فعشرون حسنة فاذا قبلها فعشرون ومائة حسنة فاذا جامعها ثم قام الی مغتسله لم یمر الماء علی شعرة من جسده الا کتب له بها عشر حسنات وحط عنه عشر خطیئات وان الله عزوجل لیباهی به الملائکة فیقول انظروا الی عبدی قام فی هذه اللیلة الشاتیة بردها فاغتسل من الجنابة مومنا انی ربه اشهدکم انی قد غفرت له [2]	کوئی مسلمان نفسانی تقاضے کے تحت اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو اس کو دس نیکیاں ملتی ہیں، جب معانقہ کرتا ہے تو بیس ملتی ہیں، جب بوسہ لیتا ہے تو ایک سو بیس اور جب جماع کرتا اور اس کے بعد غسل کرتا ہے تو اس کے بدن کے جس بال سے بھی پانی گذرتا ہے اس کے بدلہ دس نیکیاں ملتی اور دس گناہ دور کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فخریہ انداز میں کہتا ہو کہ میرے بندہ کو دیکھو کہ سردی کی رات میں اس نے غسل جنابت کیا اور ایمان کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہوا تو تم گواہ رہو کہ میں نے اس کو بخش دیا ۔

[1] قاضی شوکانی : الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ کتاب النکاح [2] جلال الدین السیوطی : اللالی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب النکاح ج ۲ ص ۹۳ ۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث قواعد طب کے خلاف ہو

(۱۴۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث قواعد طب کے خلاف ہو۔

او یکون مخالفا لقواعد الطب المتفق علیہا[1] یا حدیث طب کے متفقہ قواعد کے خلاف ہو۔

ابن قیم اور ملا علی قاری نے زیادہ وسعت سے کام لیکر یہ تعبیر اختیار کی ہے:

ان یکون الحدیث بوصف الاطباء والطرقیہ اشبہ والیق[2] حدیث اطباء اور چٹکلا بازوں کے بیان کے زیادہ مشابہ اور لائق ہو

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی:-

الباذنجان شفاء من کل داء[3] بیگن میں ہر بیماری کی شفاء ہے۔

فضل الکراث علی البقول کفضل الخبز علی سائر الاشیاء[4] "گندنا" کی فضیلت سبزیوں پر ایسی ہی ہے جیسی روٹی کی فضیلت تمام چیزوں پر ہے۔

یا علی علیک بالملح فانہ شفاء من سبعین داء الجذام والبرص والجنون[5] اے علی! نمک کو استعمال کرو، اس میں ستر بیماریوں کی شفاء ہے، جذام برص اور جنون۔

---

[1] مصطفی سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن
[2] المنار المنیف فصل ۴۱ و موضوعات کبیر ص ۱۰۵ [3] علامہ سخاوی المقاصد الحسنہ حرف الباء
[4،5] جلال الدین السیوطی: اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ کتاب الاطعمۃ

من اکل القثاء باللحم وقی الجذام[1] — جس شخص نے ککڑی کو گوشت کے ساتھ کھایا وہ جذام سے محفوظ رہا۔

اللحم ینبت اللحم من ترك اللحم اربعین یوما ساء خلقه[2] — گوشت گوشت کو اگاتا ہے جس نے چالیس دن گوشت کھانا چھوڑ دیا اس کے اخلاق و عادات خراب ہو گئے

الشرب من فضل وضوء المومن فیه شفاء سبعین داء[3] — مومن کے وضو کا بچا ہوا پانی پینے سے ستر بیماریوں کی شفاء ہوتی ہے۔

قواعد طب کے موافق حدیثوں کی حیثیت طب سے متعلق جو روایتیں قواعد طب کے خلاف نہیں ہیں ان کا سرچشمہ نہ شعور نبوت ہے اور نہ وہ رسالت کے فرائض منصبی میں داخل ہیں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ نے ایسی روایتوں کو دوسری قسم کی روایتوں میں شمار کیا ہے،

وثانیهما لیس من باب تبلیغ الرسالة ...... فمنه الطب[4] — دوسری وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے، ان ہی میں طب ہے۔

اس قسم کی روایتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے:

انما انا بشر اذا امرتکم بشیء — میں صرف ایک بشر ہوں، جب تمہارے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات باب الادام کاللحم [2] جلال الدین سیوطی۔ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الاطعمۃ [3] قاضی شوکانی، الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الاطعمۃ

[4] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ باب اقسام علوم النبی صلعم۔

من دینکم فخذوا به واذا — دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اس
امرتکم بشیٔ من رأی فانما — پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی
انا بشر[1] — حکم دوں تو سمجھو کہ میں بشر ہوں

غالباً اسی بنا پر ابن قیم اور ملا علی قاری نے ان کو حدیث میں شامل کرنا پسند نہیں کیا۔

رسول اللہؐ کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔

مخالفته لحقائق التاریخ المعروفة — یا حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو جو رسول اللہ
فی عصر النبی صلی اللہ علیہ وسلم[2] — کے زمانہ میں مشہور تھے،

ابن قیم کہتے ہیں

ومنها ما یقترن بالحدیث — حدیث میں تاریخی قرائن ایسے پائے
من القرائن التی یعلم انه — جائیں جس سے معلوم ہو جائے کہ
باطل[3] — وہ باطل ہے۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی۔

ان النبی وضع الجزیة علی اهل — رسول اللہؐ نے خیبر والوں سے جزیہ
خیبر ورفع عنهم الکلفة و — معاف کر دیا، کلفہ اور بیگار کو بھی معاف
السخرة بشهادة سعد بن معاذ — کر دیا، اس کے شاہد سعد بن معاذؓ

---

[1] شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب اقسام علوم النبی صلعم [2] مصطفیٰ سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [3] ابن قیم المنار المنیف فصل ۲۷

وکتابة معاویة[1]　　اور کاتب معاویہ ہیں،

یہ روایت ان وجوہ سے باطل ہے،

(۱) جس وقت اہل خیبر (۷ھ) سے معاہدہ ہوا، اس وقت تک جزیہ کا حکم نہیں نازل ہوا تھا، قرآن حکیم میں جزیہ کا حکم غزوہ تبوک (۹ھ) کے بعد نازل ہوا۔

(۲) اس میں سعد بن معاذ کی گواہی ہے حالانکہ ان کی وفات غزوہ خندق (۵ھ) کے ایک ماہ بعد ہو چکی تھی،

(۳) اس کے کاتب حضرت معاویہؓ ہیں، حالانکہ اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، فتح مکہ کے بعد وہ اسلام لائے،

(۴) اس میں بطور نشان کلہ (سر پر باندھنے کی پٹی) اور بیگار کا ذکر ہے، حالانکہ اس زمانہ میں نہ یہ نشان تھا اور نہ بیگار لیا جاتا تھا،

حضرت انسؓ سے روایت ہے:

دخلت الحمام فرأیت رسول اللّٰہ	میں حمام میں گیا تو رسول اللہ کو
جالسا وعلیه مئزر فهممت	اس میں تہبند باندھے ہوئے بیٹھا پایا،
ان اکلمه فقال یا انس حرمت	میں نے آپ سے گفتگو کا ارادہ کیا تو
دخول الحمام بغیر مئزر	آپ نے فرمایا کہ اے انس میں نے اسی وجہ سے
من اجل هذا	بغیر تہبند کے حمام میں داخل ہونے کو حرام کیا ہے

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ حمام تشریف لے جانا ثابت ہے اور نہ اس وقت حمام کے رواج کا ثبوت ملتا ہے،

---

[1] السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن ص

بعض روایتوں میں ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن اُبی کے ساتھیوں اور رسول اللہ کے صحابہ کے درمیان جھگڑا ہوگیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا[2]	اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

حالانکہ جس وقت آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک عبداللہ اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی مسلمان نہ تھا جبکہ قرآن میں مومنوں کے دو گروہ کا ذکر ہے، اس بنا پر آیت کا شان نزول یہ واقعہ نہیں ہو سکتا،

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد موجود ہوں

(۱۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد ایسے موجود ہوں جن سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہو۔

ان یکون الحدیث مما تقوم الشواھد الصحیحۃ علی بطلانہ[3]	حدیث ایسی ہو کہ اس کے بطلان پر صحیح شواہد موجود ہوں،

ملا علی قاری کی بھی یہی عبارت ہے،[4]

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

عوج بن عنق کے بارے میں ہے:۔

ان طولہ ثلاثۃ الاف ذراع وثلاث مائۃ وثلاثۃ وثلثین	عوج بن عنق (جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا) کا قد تین ہزار تین سو تینتیس

---

[1] زمخشری: تفسیر کشاف سورہ حجرات [2] القرآن: حجرات رکوع ۱ [3] ابن قیم: المنار المنیف فصل ۱۷
[4] موضوعات کبیر ص ۱۱۹

وثلثاً [1]　اور ثلث ذراع تھا

حضرت آدمؑ کے بارے میں ہے کہ.

خلق اللہ آدم طولہ ستون ذراعا فلم یزل الخلق ینقص بعد [2]　اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ستر ذراع تھا، پھر اس کے بعد اولاد آدم کا قد ابتک کم ہوتا رہا،

کوہ قاف کے بارے میں ہے :۔

ان قاف جبل من زبرجدۃ خضراء تحیط بالدنیا کاحاطۃ الحائط فی البستان والسماء واضعۃ اکنافھا علیہ فزرقتھا منہ [3]　کوہ قاف سبز زمرد کا ہے جو دنیا کو ایسے ہی محیط ہے جیسے چہار دیواری باغ کو محیط ہوتی ہے اور آسمان اپنے کناروں کو اس پر رکھے ہوئے ہے آسمان کی نیلگونی اسی وجہ سے ہے.

زمین کے استقرار کے بارے میں ہے

ان الارض علی صخرۃ والصخرۃ علی قرن ثور فاذا حرک الثور قرنہ تحرکت الصخرۃ فتحرکت الارض وھی الزلزلۃ [4]　زمین چٹان پر ہے اور چٹان بیل کی سینگ پر، جب بیل اپنی سینگ کو حرکت دیتا ہے تو چٹان کو حرکت ہوتی ہے، پھر زمین کو حرکت ہوتی ہے. اسی کا نام زلزلہ ہے،

رتن ہندی کے بارے میں ہے :۔

---

[1] المنار المنیف فصل ۱۰ و موضوعات کبیر ص ۱۱۷ [2] ایضاً فصل ۱۶ ص ۱۷ [3] [4] ملا علی قاری : موضوعات کبیر ص ۱۱۸

عاش ست مائة ستة وثلاثين سنة[1]	کہ وہ چھ سو چھتیس سال تک زندہ رہا

رتن ہندی سے بہت سی نہایت لغو قسم کی روایتیں مروی ہیں، وہ سب موضوع ہیں[2]،

ابن عمرؓ کہتے ہیں:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان بعض اوصیاء عیسیٰ بن مریم حی بالعراق فاذا انت رأیتہ فاقرئہ منی السلام[3]	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ عیسیٰ بن مریم کے بعض "وصی" عراق میں زندہ ہیں جب ان کو دیکھو میرا سلام کہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریین کی زندگی اور ان سے ملاقات کے بارے میں مختلف روایتیں آتی ہیں لیکن وہ سب موضوع اور باطل ہیں[4]،

مذکورہ ساری باتیں اللہ کی عادت (سنۃ اللہ) وحقیقت کے خلاف ہیں۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث اللہ کی تنزیہ وکمال کے خلاف ہو

(۱۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث اللہ تعالےٰ کی تنزیہ وکمال کے خلاف ہو،

او مخالفا لما یوجبہ العقل للہ من تنزیہ وکمال[5]	"عقل" اللہ کے لیے جو تنزیہ و کمال واجب کرتی ہے حدیث اسکے خلاف ہو۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات باب فمن ادعی الصحبۃ کذبا [2] ایضاً [3] جلال الدین سیوطی: اللالی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب الانبیاء والقدماء [4] ایضاً [5] مصطفےٰ سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن

اس اصول کے تحت موضوع حدیثیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

ان اللہ خلق الفرس فاجراها فعرقت فخلق نفسہ منہا[1]	اللہ نے گھوڑے کو پیدا کیا، اس کو دوڑایا، وہ پسینہ پسینہ ہو گیا، اس سے اپنی ذات کو پیدا کیا۔

دوسری روایت میں لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا

مما ربنا قال من ماء مرور لا من ارض ولا سماء خلق خیلا فاجراها فعرقت فخلق نفسہ من ذلک العرق[2]	ہمارا رب کس چیز سے پیدا کیا گیا، آپ نے فرمایا گذرے ہوئے پانی سے نہ زمین سے نہ آسمان سے، گھوڑے کو پیدا کیا، اس کو دوڑایا وہ پسینہ پسینہ ہو گیا، اس پسینہ سے اپنی ذات کو پیدا کیا۔

العیاذ باللہ کس قدر مہمل یہ روایتیں ہیں:

ان بین اللہ وبین الخلق سبعین الف حجاب واقرب الخلق الی اللہ تعالیٰ جبریل ومیکائیل واسرافیل وان بینھم وبینہ اربعۃ حجب حجاب من نار وحجاب	اللہ اور مخلوق کے درمیان ستر ہزار پردے ہیں، پردوں میں زیادہ قریب جبریل میکائیل اور اسرافیل ہیں، ان کے درمیان اور اللہ کے درمیان چار پردے ہیں (۱) آگ کا پردہ (۲) تاریکی کا پردہ

---

[1] مصطفیٰ سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [2] ابن عراق: الموضوعات (مخطوطہ) کتاب التوحید

عربی	اردو
من ظلمة وحجاب من غمار وحجاب من الماء[1]	(۳) ابر کا پردہ اور (۴) پانی کا پردہ،
کنت کنزاً مخفیاً لا اعرف فاحببت ان اعرف فخلقت خلقا فعرفتهم بی فعرفونی[2]	میں پوشیدہ خزانہ تھا جس کو کوئی پہچانتا نہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو مخلوق کو پیدا کیا میں نے ان کو اپنی نسبت سے پہچانا، انھوں نے مجھ کو پہچانا،
ان اللہ عزوجل یجلس یوم القیمة علی القنطرة الوسطی بین الجنة والنار[3]	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بیچ کے پل پر بیٹھے گا جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے،
ان اللہ عزوجل ینزل فی کل لیلة جمعة الی دار الدنیا فی ستمائة الف ملک فیجلس علی کرسی من نور وبین یدیه لوح من یاقوتة حمراء فیه اسماء من یثبت الرؤیة والکیفیة والصورة من امة محمد فیباهی بهم الملائکة ویقول تبارک وتعالیٰ هؤلاء	اللہ تبارک وتعالیٰ ہر جمعہ کی رات دار دنیا کی دنیا کی طرف چھ ہزار فرشتوں کے درمیان نزول اجلال فرماتا ہے، نور کی کرسی پر بیٹھتا ہے اور اس کے آگے یاقوت کی تختی ہوتی ہے جس میں امت محمدیہ کے ان لوگوں کے نام ہوتے ہیں جن کی رویت صورت اور کیفیت ثابت ہے اور فرشتوں سے فخریہ انداز میں کہتا ہوکر یہ میرے بندے ہیں جنھوں نے میرا انکار

---

[1] ابن جوزی: العلل المتناہیہ فی الاحادیث الموضوعہ (مخطوطہ) باب ذکر الصورة [2] تذکرة الموضوعات کتاب التوحید [3] السیوطی: اللآلی المصنوعہ کتاب التوحید

عبیدی الذین لم یجحدوا بی	نہیں کیا اور میرے نبی کی سنت قائم کی
واقاموا سنۃ نبیی ولم یخافوا فی	اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے
اللہ لومۃ لائم اشھدکم یا ملائکتی	کی پروا نہیں کی، اے فرشتو میں تمہیں
وعزتی وجلالی لادخلنھم	گواہ بناتا ہوں میری عزت وجلال کی
الجنۃ بغیر حساب[1]	قسم میں انکو جنت میں بغیر حساب داخل کرونگا۔

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث صراحت قرآن کے خلاف ہو	(۱۹) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث صراحت قرآن کے خلاف ہو۔

مخالفۃ الحدیث صریح القرآن[2]	حدیث صریح قرآن کے خلاف ہو
مخالفتہ لصریح القرآن بحیث	حدیث کی مخالفت صریح قرآن کی
لا یقبل التاویل[3]	اس طرح ہو کہ تاویل قبول کرے،

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں	اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

لا یدخل الجنۃ ولد زنا ولا	ولد الزنا اور اس کی نسل سے سات
بشئ من نسلہ الی سبعۃ	پشت تک کوئی شخص جنت میں
اباء الجنۃ[4]	نہ جائے گا۔
یحشر اولاد الزنا فی صورۃ	قیامت کے دن ولد الزنا، بندر
القردۃ والخنازیر[5]	اور خنزیر کی شکل میں جمع کیے جائیں گے

ایسی روایتیں قرآن حکیم کی اس آیت کے خلاف ہیں،

---

[1] اللآلی المصنوعہ کتاب التوحید [2] المنار المنیف فصل ۱۰ [3] مصطفٰے سباعی: السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [4] ۵ محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات حد الزنا والردۃ والزنا الخ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[1] — کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا،

دنیا کی عمر کے بارے میں ہے:

انها سبعة آلاف سنة و نحن فی الالف السابعة[2] — دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہم ساتویں ہزار سال میں ہیں۔

یہ قرآن حکیم کی ان آیتوں کے خلاف ہے جن میں کہا گیا ہے کہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مثلاً

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ[3] — لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا، آپ کہدیجئے کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے وہی اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔

دوسری جگہ ہے

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ[4] — بیشک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے

زمین وغیرہ کی پیدائش کے بارے میں ہے

خلق الله عز وجل التربة یوم السبت وخلق فیها الجبال یوم الاحد وخلق الشجر یوم الاثنین وخلق المکروه یوم الثلاثاء وخلق النور یوم الاربعاء — اللہ نے زمین کو سنیچر کے دن، پہاڑ کو اتوار کے دن، درخت کو دوشنبہ کے دن، ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن پیدا کیا، جانوروں کو اس میں جمعرات کے دن پھیلا[یا] اور

---

[1] القرآن: سورہ الانعام رکوع ۲۰ [2] ملا علی قاری: موضوعات کبیر فصل ومنها مخالفة الحدیث الخ [3] الاعراف رکوع ۲۳ [4] سورہ لقمان رکوع ۴

وبث فیھا الدواب یوم الخمیس	آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر
وخلق آدم علیہ السلام بعد	کے بعد پیدا کیا، آدم کی پیدائش آخری
العصر من یوم الجمعۃ فی آخر	تھی، وہ جمعہ کے دن آخری ساعت
الخلق فی آخر ساعۃ من	میں عصر و مغرب کے درمیان ہوئی۔
ساعات الجمعۃ فیما بین	
العصر الی اللیل[1]	

اس میں پیدائش کی مدت سات دن ہے، جبکہ قرآن حکیم میں مدت تخلیق چھ دن (دور) بیان کی گئی ہے۔

خلق السموات والارض	اللہ نے آسمان و زمین کو چھ دن
فی ستۃ ایام[2]	(دور) میں پیدا کیا۔

پھر اس میں آسمان کی پیدائش کا ذکر نہیں ہے، صرف زمین اور اس کی چیزوں کو سات دن میں پیدا کرنے کا ذکر ہے، جبکہ قرآن حکیم میں ہے کہ زمین اور اس کی چیزیں چار دن (دور) اور آسمان دو دن (دور) میں پیدا کیے گئے[3]۔

یہ در اصل کعب احبار کا قول ہے، جس کو غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔[4]

(۴) رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو توڑنے والی ہو | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو۔

---

[1] مسلم: کتاب صفات المنافقین باب ابتداء خلق [2] الاعراف۔ ۵ [3] حم سجدہ۔ ۲۰ [4] بخاری تاریخ کبیر و موضوعات کبیر ص ۱۳۰

مناقضة الحديث لما جاءت به السنة الصريحة مناقضة بينة[۱]
حدیث ان باتوں کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو جو سنت صریحہ سے ثابت ہوں،

اس اصول کے تحت درج ذیل دو قسم کی حدیثیں موضوع قرار پائیں گی۔

(۱) وہ جو فساد، ظلم فعل عبث، باطل کی تعریف اور حق کی برائی پر مشتمل ہوں۔

(۲) وہ جنہیں نام و القاب کی اسقدر اہمیت بیان کیگئی ہو کہ اس سے ایمان و عمل صالح کی اہمیت مجروح ہوتی ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | چند روایتیں یہ ہیں :۔

لو يربي احدكم بعد الستين ومائة جروكلب خير له من ان يربي ولدا[۲]
ایک سو ساٹھ سال کے بعد کوئی کتے کے پلہ کی پرورش کرے اس سے بہتر ہے کہ وہ اولاد کی پرورش کرے

لا يولد بعد ست مائة مولود ولله فيه حاجة[۳]
چھ سو سال کے بعد کوئی بچہ نہ پیدا ہوگا کہ اللہ کی اس میں حاجت باقی رہے۔

ان الناس يوم القيمة يدعون بامهاتهم لا باٰبائهم[۴]
لوگ قیامت کے دن اپنی ماؤں کے نام کے ساتھ پکارے جائیں گے، باپ کے نام کے ساتھ نہیں۔

اذا دعت احدكم امه وهو في الصلوٰة فليجب واذا دعاه ابوه فلا يجب[۵]
اگر کسی شخص کی ماں اسوقت بلائے جبکہ نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پاس جائے اور باپ بلائے تو نہ جائے۔

اذا اتت من امتي ثلاث مائة وثمانون سنة فقد قلت لهم العزبة والترهب على رؤس الجبال[۶]
جب میری امت پر تین سو اسی سال گذر جائیں تو ان کے لیے مجرد رہنا اور پہاڑوں کی چوٹی پر رہنا اختیار کرنا حلال ہے۔

ان الصلوٰة فيه بخمسين الف صلوٰة[۷]
بیت المقدس میں نماز پچاس ہزار نماز کے برابر ہے۔

نام و القاب سے متعلق فضیلت کی حدیثیں کہ جس سے عمل کی اہمیت مجروح ہوتی ہو اصول ۹ میں گذر چکی ہیں، یہ سب سنت صریحہ کے خلاف ہیں۔

[illegible]

اندلس کی عربی شاعری

از

جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

تعارف | اندلس سے مراد مسلم اسپین ہے جسے اہل روم کبھی ہسپانیہ اور اہل یونان ایبیریہ کہتے تھے۔ یعنی براعظم یورپ کا وہ خوبصورت ہرسبز و شاداب اور وسیع و عریض جزیرہ نما جسے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر جیسے اولوالعزم سپہ سالاروں نے ۷۱۱ء میں فتح کیا اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس اموی خلافت کا پرچم لہرایا جو دمشق میں بانی خلافت عباسیہ ابوالعباس (مشہور زمانہ سفاح) کے ہاتھوں تہس نہس ہو چکا تھا، یہ حکومت اس ہرے بھرے جزیرہ نما میں ۱۴۹۲ء تک شاہانہ فرماں روائی کرتی رہی،

تسمیہ | اندلس جس کے ایک طرف کوہ کلبہ (جبل الطارق) اور تین طرف بحر زقاق نامی نیلگوں سمندر موجیں مارتا ہے، ہمیشہ سے اہل علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے، یہ مسئلہ کہ عربوں نے اسپین سے متعلق اپنے تمام مفتوحہ علاقوں کو اندلس ہی کے نام سے کیوں موسوم کیا؟ یہ اہل تاریخ کے درمیان زیر بحث رہا۔ لیکن ابھی تک اس کی کوئی معقول وجہ تسمیہ سمجھ میں نہ آسکی، بعض لوگ حضرت نوحؑ کے شجرۂ نسب سے متعلق ایک شخص اندلس بن طوبال بن یافث کی طرف اسے منسوب کرتے ہیں۔ بطرس بستانی اور دوسرے اہل نظر کا خیال ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں اسپین کو جرمنی کی ایک قوم فندلس (Vandalen) نے فتح کیا تھا، اس کے بعد سے یہ خطہ کبھی وانڈال، کبھی واندلیشیہ اور کبھی اندالس

کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ عربوں نے سب سے پہلے جنوبی اسپین میں اپنے قدم جمائے، جہاں اس قوم کا اثر زیادہ رہ چکا تھا اس لیے وہ اپنے مخصوص عربی لہجہ میں اسکو اندلیسہ اور پھر اندلس کہنے لگے، اور فتوحات میں وسعت کے بعد بھی مسلمانوں کے تمام مفتوحہ اسپینی علاقوں کو اسی نام سے پکارا جانے لگا۔[1]

علمی ادبی سرگرمیاں اندلس کے مسلمانوں نے علمی ادبی، سیاسی اور معاشرتی میدانوں اور فلسفہ و حکمت اور فنون لطیفہ میں اتنے اہم کارنامے انجام دیئے کہ یورپ کی نگاہیں عرصۂ دراز تک خیرہ رہیں، یورپ کا بیشتر علمی ادبی سرمایہ اسپین ہی کا رہین منت ہے، آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک عربوں نے علوم و فنون کی شمعیں اس طرح روشن کیں کہ ادبیات عالم اور تاریخ تمدن میں اندلس (مسلم اسپین) کو بھلایا نہیں جا سکتا، ہر علم و فن اور شعبۂ حیات میں عرب اور عربی زبان کا تسلط مکمل طور پر اس اہم وسیع و عریض اور بہار آفریں خطہ پر صدیوں تک رہا، تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ جس عظیم سرمایہ سے نیا یورپ تیار ہوا، اس کا نقطۂ آغاز مسلم اسپین ہی تھا۔

اندلس محل وقوع کے اعتبار سے یورپ میں اور اقتدار کے لحاظ سے اہل مشرق کے زیر اثر رہا، جغرافیائی اور طبعی خصوصیات کی دلکشی و رعنائی نے اس پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اور جلد ہی وہ مشرق و مغرب کی تہذیب و ثقافت کا سنگم بن گیا، فلسفہ کو اولیت دی گئی۔ نومسلموں اور غیر مسلموں کی اہمیت افزائی کی گئی، زریاب بحیثیت موسیقی کار شرق و غرب میں مشہور ہوا، ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن حزم جیسے فلاسفہ نے

---

[1] پطرس بستانی ادباء العرب فی الاندلس ص ۱۰

تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا، حکم ثانی کا کتب خانہ شعر و ادب، فلسفہ و حکمت اور دوسرے علوم و فنون کے عدیم المثال خزانہ کی حیثیت سے تمام عالم میں مشہور تھا، حکم کی قدر افزائی کا عالم یہ تھا کہ اس نے الاغانی کے ایک نسخہ کے حصول کے لیے ابو الفرج کو ایک ہزار دینار بھجوائے تھے، قُرطبہ کی عظیم الشان یونیورسٹی مشرق و مغرب کا مرکز اور علوم و فنون کا سرچشمہ تھی، فرانس اور اٹلی کے طلبہ بڑی تعداد میں یہاں حصول تعلیم کے لیے آتے تھے، بقول علی احمد رفعت یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب (Renaissance and Reformation) کی جو تحریکیں قرون وسطیٰ میں ظہور پذیر ہوئیں، ان کے پیشرو وہی افراد تھے جنھوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اندلس کی یونیورسٹیوں سے استفادہ کیا تھا، (تاریخ ادب عربی)

نحو، ادب اور روایت نگاری میں ابو علی قالی عراقی (م ۹۶۷ء) اور ان کے شاگرد محمد بن الحسن زبیدی نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے، الحکم اور ہشام کے زمانہ میں ان کی خدمات علم و ادب بہت ممتاز رہیں، ابن عبد ربہ جو عبد الرحمٰن ثالث کا ملک الشعراء تھا، ہشام اول کے غلاموں کی اولاد سے تھا، ابن حزم (۱۰۶۳ء) ایک بڑے مفکر فلسفی اور دینی علوم کے مجتہد تھے، یہ عبد الرحمٰن المستظہر اور ہشام المعتز کے وزیر بھی رہے تھے، ابن خلکان نے تاریخ، مذہبیات، حدیث، منطق اور شاعری وغیرہ میں اُن کی چار سو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے،

شعر و شاعری، جہاں کہیں عربی زبان کو قدم پہنچے اس کے جلو میں شعر و شاعری اور اسکی پرجوش خصائص بھی پہنچے خیالات اور مضامین سے قطع نظر اس کی لسانی خوبیوں، موزونیت، فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تاثر نے سب کو متاثر کیا عربی شاعری

کی تمام اعلیٰ خصوصیات کا مظاہرہ اندلس میں بھی ہوا، اور اندلسی شعراء نے محض روایتی شاعری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید اندلسی شاعری کی بنیاد ڈال کر دو جدید اصناف زجل اور موشحہ کو فروغ دیا، اور مناظر فطرت حب الوطنی اور جمال قدرت سے خصوصی لگاؤ ظاہر کر کے نیچرل شاعری کو اوج کمال پر پہنچایا، عروض البلد کے نام سے شہروں اور ملکوں کی کیفیات و مشاہدات نظم کئے، الکاری الملعبہ اور المزدوج کے نام سے اصناف و بحور کو رواج دیا۔ عربی شعر و سخن کی دنیا میں ابن زیدون کو غالباً سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے، ابن عبد ربہ ابن حزم، ابن الخطیب، ابن ہانی، ابن زمرک وغیرہ کے نام بھی بحیثیت شاعر کے بہت ممتاز و نمایاں ہیں۔

لوئی یاردو (Louis Viardot) نے اپنی کتاب (History of The Arabs And Barbers in Spain) میں لکھا ہے کہ "فرانسیسی شاعری بھی ہسپانوی شاعری کی طرح عرب شعراء کی رہین منت ہے۔ اہل فرانس نے یونان و روما سے کوئی اثر نہیں قبول کیا، اور چودہویں صدی عیسوی تک جب کہ ان کے ادب عالیہ کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، عربی نمونے ہی ان کے پیش نظر رہے، شعر کے صنائع اور قوافی محض عربوں کی بدولت انھیں حاصل ہوئے، یہ تمام چیزیں ان ہسپانوی تاجروں کی بدولت فرانس اور یورپ کے دوسرے علاقوں میں پہنچیں جو طلیطلہ اور مرسیلیا وغیرہ کے راستے وہاں آیا جایا کرتے تھے"[۱]

رائج اصناف شعر میں اندلسی شعراء نے بہت سے اضافے کئے۔ اجتماعی سیاست، تاریخی حوادث، اور وصف نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں، انھوں نے پلوں، محلوں، قلعوں، بتوں، مجسموں،

---

[۱] ابوالفضل تاریخ ادبیات عربی،

عمارتوں، حوضوں، چشموں، باجوں، سازوں، باغوں، وادیوں، پہاڑوں، دریاؤں، پھلوں پھولوں، کے علاوہ، رقص و سرود کی محفلوں اور فنون لطیفہ کی مختلف صنفوں کے بارے میں بھی نظمیں کہیں، اور یہ تمام نظمیں رقت، گداز اور دلکشی سے معمور ہیں، اور ان کے سانچے اور اسالیب وہی ہیں جو مشرق میں رائج تھے، بعض مقامات پر تنوع قوافی سے بھی کام لیا گیا ہے، بحریں عموماً چھوٹی ہیں۔ موسیقیت اور غنائیت ہر جگہ نمایاں ہے، اندلس کی شاعری نے اہل مغرب کے اس خیال خام کی پوری تردید کردی کہ عربوں کے پاس داخلی شاعری اور تخیل کی فسوں کاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اندلسی شعراء نے خارجی شاعری کے ایسے شاندار نمونے پیش کئے ہیں کہ خود اہل مغرب کو ان سے استفادہ کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

اندلسی شاعری کے عوامل و محرکات اندلس میں عربی شاعری نے بہت جلد مقبولیت حاصل کی، خصوصاً ازجال اور موشحات نے انسانی جذبات و احساسات کے اظہار اور مناظر فطرت سے لطف اندوزی اور سبق آموزی کا جو نمونہ پیش کیا۔ اس کی مثال دنیا کی ترقی پسند شاعری کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ شعر و سخن کے اس فروغ و ارتقا کے حسب ذیل اہم محرکات تھے۔

(۱) اندلس کے اموی خلفاء شعر و سخن کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے، ان میں سے اکثر خود بھی شاعر تھے۔ پہلا اموی خلیفہ عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر شاعر تھا، اس کے کئی جانشین بھی شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اشبیلیہ کے اکثر فرماں روا شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔

(۲) خلفاء کے ساتھ امراء و اعیان مملکت کی ہمت افزائی سے بھی شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ تقریباً ہر حاکم سے متعدد شعراء وابستہ رہتے تھے۔ ہر بڑا شاعر خلیفہ کی سرپرستی اور قدر افزائی سے متمتع ہوتا تھا، وہ سفر و حضر میں خلیفہ کے ساتھ رہتا تھا

اور اگرانقدر انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ مشرق کی علم دوستی اور ادب نوازی کی روایت کو اموی خلفاء نے پوری طرح زندہ رکھا۔

(۳) اندلس کا سرسبز و شاداب، حسین جمیل اور رومان پرور ماحول بھی جو مشرق سے بہت مختلف تھا، شاعرانہ ذوق پیدا کرنے میں اہم محرک ثابت ہوا، اسپین کے باغات و لالہ زار، وسیع و عریض میدان اور چراگاہیں، پہاڑ اور ان میں جنگلوں کا لامتناہی سلسلے، دریا اور ان کے شاداب، ہرے بھرے کنارے پھولوں اور پھلوں کی کثرت منطقۂ معتدلہ کے باعث حسن و نزاکت کی فراوانی متعدد اقوام و ملل کا امتزاج، بحری زندگی کے اثرات اور حسین فطری مناظر کی کثرت نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھارا اور وہ فطری شاعری پر مائل ہو گئے۔

(۴) اس شاعرانہ ماحول میں عربوں کی خداداد شاعرانہ فطرت و وجدان نے عجیب عجیب شاعرانہ روپ اختیار کیے۔ فصاحت و بلاغت انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

(۵) تہذیب کی ثقافت کے ساتھ عیش و عشرت کی فراوانی اور اس کے اسباب کی رنگارنگی بھی ان کے کلام میں جدت، ندرت اور نئے نئے اصناف سخن پیدا کرنے کا سبب بنی اور ان کے کلام میں لوچ، رقت موسیقیت اور گداز بھر گئی [1]

ان اسباب و عوامل کی بنا پر فصحاء نے موشحات کو گلے لگایا، اور عوام زجل کی طرف مائل ہوئے اور رفتہ رفتہ زجل نے بھی ادب کی ایک اعلیٰ صنف کی حیثیت سے اپنا درجہ منوا لیا

---

[1] عبدالمنعم خفاجہ۔ قصۃ الادب فی الاندلس ص ۹۸

اندلسی شاعری کی امتیازی خصوصیات | الفاظ، اسالیب، تخیل اور موضوعات کے لحاظ سے اندلسی شاعری کی نمایاں امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) الفاظ و اسالیب کے لحاظ سے نہایت سلیس و شگفتہ ہے، جو اندلس کے نرم اور معتدل رومان پرور ماحول کا لازمی نتیجہ اور صنائع بدائع کی تکلفات سے بری ہے، ابن ہانی اندلسی کے یہاں کچھ بداوت مشکل پسندی اور تصنع ضرور ہے، مگر وہ عمومی روش سے الگ ہے،

(۲) دقیق خیالات اور فلسفیانہ مسائل سے مکمل احتراز۔ بعض فلسفی شعراء مثلاً ابن الطفیل اور ابن باجہ کے یہاں جو فلسفیانہ تخیلات ہیں وہ بھی نہایت صفائی و شگفتگی کے ساتھ ہیں۔

(۳) ہرے بھرے جزیرہ نما میں جمال فطرت کی رعنائیوں کی بنا پر انوکھے تخیلات اور آسان تراکیب کے ساتھ خوبصورت تشبیہات اور لطیف کنایات شعر و سخن کے لطف کو دوبالا کرتے ہیں۔

(۴) عرب حکمرانوں کے اسپین میں قدم جمنے کے بعد شاعری کا فروغ درج ذیل اغراض کے تحت ہوا۔

مدح، ہجا، مراثی، فخر، حماسہ، تہنیت، وصف و غزل، ساقی و میخواری، توصیف غلمان و نساء، تصوف اور شعر الطبیعۃ، اسکے باوجود اندلسی شعراء کچھ چیزوں میں مشرق سے فائق و ممتاز اور کچھ اوصاف میں ان سے کمتر رہے، فلسفہ و حکمت اور زہد و تصوف میں اندلسی شاعری ہمیشہ مشرقی شاعری سے پیچھے رہی۔

(۵) اسلامی مقبوضات سے نکلے ہوئے ملکوں کا مرثیہ مثلاً صالح بن شریف رندی کا مرثیہ رثاء الاندلس،

لکل شیئ اذا ما تم نقصان فلا یغر بطیب العیش انسان[1]

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد ان کان فی القلب اسلام و ایمان

(جو چیز کمال کے درجہ کو پہنچ جائے اس کے لئے زوال یقینی ہے اسلئے کسی انسان کو عیش و عشرت کی زندگی سے دھوکا نہ کھانا چاہئے جس کے دل میں اسلام اور ایمان ہو اس کا دل ایسے حوادث (اندلس کا زوال) پر شدت غم میں گھل جاتا ہے۔)

(ب) وصفیہ شاعری خصوصاً نیچرل شاعری (Poetry of Nature) میں اندلسی شاعری پوری عربی شاعری پر فائق ہے، جمال فطرت کی رعنائیوں کا وصف جس خوبی و خوش اسلوبی سے اندلسی شعراء نے کیا ہے وہ ادب لطیف اور ذوق جمال کی تسکین کے لیے گنج گراں مایہ ہے۔

شاہین قریش خلیفہ عبد الرحمٰن اوّل ایک دن قرطبہ میں اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا اسکی نظر ایک کھجور کے درخت پر پڑی جو ملک شام سے لاکر یہاں لگا یا گیا تھا اسے دیکھکر اسکے حب وطن کے فطری جذبات جاگ اٹھے اور وہ جلا وطنی کے تلخ واقعات کو یاد کرکے یوں نغمہ سرا ہوا۔

یا نخل انت فرید مثلی فی الارض نائیۃ عن الاھل

تبکی وھل تبکی مکممۃ عجماء لم تجبل علی جبل

ولو انھا عقلت اذن لبکت ماء الفرات ومنبت النخل

لکنھا حرمت واخرجنی بغضی بنی العباس عن اھلی

لنشأت بارض انت فیھا غریبۃ فمثلک فی الاقصاء والمنتأی مثلی

سقتک الغوادی المزن فی المنتأی الذی یسح ویستمری السماکین بالوبل

شاعر مشرق ڈاکٹر سر اقبال نے جب سرزمین اندلس میں عبد الرحمٰن اوّل کے بوئے ہوئے

---

[1] عبد المنعم خفاجہ - قصۃ الادب فی الاندلس، ص، ۱۶۲

اس درخت کو دیکھا تو انھیں عبد الرحمن اوّل کے مندرجۂ بالا اشعار یاد آگئے،
جنھیں المقری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، یہ درخت مدینۃ الزہرا، میں تھا، اس کو
دیکھتے ہی اقبال کے شاعرانہ جذبات بھڑک اٹھے، اور انھوں نے یہ مشہور نظم لکھی،

میری آنکھوں کا نور ہے تو	میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں	میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا	صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس مین ناصبور ہوں میں	پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوائیں بارور ہو	ساقی ترا نم سحر ہو
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے	مومن کا مقام ہر کہیں ہے

ان شعار کو عبدالرحمن اوّل کی پوری نظم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ تو نہیں کہا جاسکتا
لیکن اکثر بیشتر اشعار کو یقینی طور پر اسی کا مکمل اردو روپ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اندلسی شاعری کی غرض وغایت | اسلوب کے لحاظ سے اندلس کی شاعری
کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) روائتی (مشرقی) شاعری، (۲) نئی (اندلسی) شاعری،
نئی اندلسی شاعری کی بنیاد دو نئے اندلسی اسلوب نگارش زجل اور موشحہ پر ہے،
بحیثیت مجموعی تمام شاعری پر رومانیت اور نیچر کے اثرات وعناصر چھائے ہوئے ہیں،
ان ہی اثرات وعناصر کی تنظیم وترتیب نیچرل شاعری شعر الطبیعۃ" کے نام سے
یاد کی جاتی ہے،

عموماً اندلسی شاعری درج ذیل اغراض کے ماتحت وجود میں آئی تھی :-

مدح | قدیم اسلوب کے مطابق اندلسی شعرا مدح سے گریز تو نہ کرتے تھے، لیکن انکی مدح میں شخصی تملق، طوالت اور ثقالت وغرابت نہیں ہے، متنبی کا انداز صرف ابن ہانی کے یہاں پایا جاتا ہے، جسے عمومیت حاصل نہ تھی، عام طور پر اندلسی شعرا کے مدائح مناظر فطرت، شراب، شہر اور معشوقوں سے متعلق ہوتے تھے، قدیم مدحیہ قصائد کے اجڑے دیار، ٹیلے، چٹیل میدان اونٹ اور گھوڑے یہاں تقریباً ناپید ہیں۔

مرثیہ | اہل مشرق کی طرح مشرقی اسلوب ہی میں یہ لوگ بھی مرثیہ گوئی کرتے تھے انہیں درد و اثر تو ضرور ہوتا تھا، مناقب اور مصائب کے تذکرے بھی ہوتے تھے، لیکن اندلس میں امثال وحکم کی گہرائی اس درجہ کی نہ تھی، زیادہ تر گردش ایام کے شکوے ہوتے تھے، البتہ اجڑے دیار سے متعلق مرثیے اندلسی شاعری میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، یہ مرثیے درد و اثر، تاثیر و تاثر، اور خوبی و دلکشی میں مشرق کے مراثی سے آگے ہیں، ابوالبقاء صالح بن شریف رندی اندلس کے مرثیہ میں کہتا ہے، ؎

وھذہ الدار لا تبقی علی احد	ولا یدوم علی حال لھا شان
اتی علی الکل امر لا مرد لہ	حتی قضوا فکان القوم ما کانوا

(یہ دنیا کسی کے لئے ایک حال پر نہیں رہتی، اس کی حالت بدلتی رہتی ہے، ہر شخص پر ایسا وقت آتا ہے جو ٹالا نہیں جا سکتا اور قدرت کا فیصلہ ناطق ہو جاتا ہے اور قوم جیسی تھی ویسے ہو جاتی ہے) شکوہ و گلہ اور لطف وکرم کی درخواست مناصب گم گشتہ اور متاع گم کردہ کی حسرت پر بہت سے شعرا نے اشعار لکھے، انھیں بھی اسی ضمن میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً معتمد ابن عباد کے وہ اشعار جو اس نے غریب الوطنی و جلاوطنی کی زندگی میں افریقیہ کے اغمات کے مقام پر قید کی حالت میں لکھے ہیں۔

ہجو | ہجو گوئی کا بازار اندلس میں گرم نہیں ہوا، اور جریر، فرزدق، اور اخطل کی سیاسی ہجووں کو یہاں تلاش کرنا بے سود ہے، سیاسی جماعتیں بھی یہاں کچھ زیادہ نہ تھیں، اکثر لوگ اپنے اپنے کاموں یا آسائشوں میں مست تھے، تاہم جہاں کہیں اس کا کوئی نمونہ ملتا ہے اس کا انداز پرانا مشرقی ہے اس میں کوئی قابل لحاظ جدت وندرت نہیں ہے امراء کے عہد میں مضریوں اور یمنیوں کے درمیان کچھ چشمک اور ہجو گوئی ہوئی، لیکن ان ہجویات کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا، اسی طرح شعوبیہ اور فرنگ کی ہجو گوئی کے آثار بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، ابوبکر المخزومی نام کا ایک اندھا شاعر اندلس کا سب سے بڑا ہجو گو شاعر بتایا جاتا ہے، اس نے نزہون بنت القلاعی نامی ایک شاعرہ کی فحش انداز میں ہجو کی نزہون نے بھی اس کا بھرپور جواب دیا تھا جسے بخوف طوالت قلم انداز کیا جا رہا ہے،

حکمت و فلسفہ کی باتیں | فلسفہ کا ظہور و ارتقا، اندلس میں پانچویں صدی کے اواخر میں مرابطین اور موحدین کے دور میں ہوا، جو فلسفیانہ افکار اور علوم و فنون کے فروغ کا زمانہ تھا، اسی میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن میمون، ابن خاقان، ابن بشکوال، ادریسی ابن جبیر اور ابن بسام وغیرہ نمایاں ہوئے، اس سے پہلے اگر ابن حزم کا وجود نہ ہوا ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ زمانہ فلسفہ کے بحران کا زمانہ تھا، اندلس میں فلسفہ کے ارتقا کی تاخیر کا سبب وہ تنگ خیال شیوخ تھے، جو حریت فکر کو ناجائز، اور تفلسف کو کفر کہتے تھے، تاہم حکمت و فلسفہ کے میدان میں ابن ہانی کا مقام سب سے بلند سمجھا جاتا ہے، اس نے متنبی کی پوری تقلید کرنا چاہی۔ لیکن اس سے بہت پیچھے رہا، اس کے یہاں زمانہ کا شکوہ اور دنیا سے بیزاری بکثرت ہے،

تصوف و زہد | زاہدانہ خیالات کی ترجمانی بھی اندلسی شاعری میں کم نہیں ہے کچھ چیدہ مثال

دستار والے شیوخ خلفاء کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے لیے زاہدانہ خیالات ظاہر کرتے تھے، البتہ ملوک الطوائف کے عہد میں لوگ شر و رنج سے تنگ آکر اس دنیا کو سرائے فانی گردانے لگے تھے، ابن عبد ربہ کہتا ہے :-

هی الدار ما الآمال الا فجائع　　علیها ولا اللذات الا مصائب

فلا تکحل عیناك منها بعبرة　　علی ذاهب منها فانك ذاهب

بہت سے شعرا نے محض تفنن طبع کے طور پر زاہدانہ خیالات کی ترجمانی کی ہے،

ابن عربی (شیخ المتصوفین) کی صوفیانہ شاعری حقیقۃً جاندار شاعری ہے، ان کے صوفیانہ خیالات کی دھوم مغرب سے لیکر مشرق تک تھی، لوگ ان کے کلام کو شوق ذوق سے پڑھتے تھے۔ اندلس کے سب سے بڑے صوفی شاعر یہی ہیں،

حماسی شاعری : اندلس کے شعرا نے بذات خود کبھی معرکہ آرائیوں میں حصہ نہیں لیا، جس طرح قدیم شعرا حصہ لیتے تھے، یہاں کے شعرا قلم سنبھالنے کے بعد تلوار کے دھنی نہ رہتے تھے اسلئے ان کی شاعری میں حماسیات (جواں مردی کے عناصر) بہت ہی کم ہیں اور وہ معرکہ آرائیوں میں اپنے تجربات و مشاہدات بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور صرف امراء و خلفاء کے جنگی کارناموں کی خیالی تصویر پیش کرتے ہیں،

ملوک الطوائف کے دور کے شعراء تو محض گریہ و بکا اور یاس و ناامیدی کے شعراء معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ان کو عیش و عشرت کی زندگی نے انتہائی نرم دل، نازک طبع اور جمال پرست بنا دیا تھا، منافرت کے جذبات بھی بہت کم ہیں، البتہ دینی مفاخرت کہیں کہیں ملتی ہے، البتہ ابن دہبون کے کلام میں جو معتمد بن عباد کا درباری شاعر تھا مفاخرت اور شجاعت و بہادری کے کچھ عناصر ملتے ہیں۔ مگر ان میں تکلف اور آورد زیادہ ہے۔

غزل اور بادہ کشی | یوں تو فطرت اور مظاہر فطرت اور جمال کائنات کی وصف نگاری اندلسی شاعری کی جان ہے، اسی کو پہلا درجہ دیا جاتا ہے۔ لیکن رندی و سرمستی اور غزل سرائی پر مبنی اشعار کی حیثیت بھی اندلس میں کبھی کم نہیں رہی، درحقیقت ذوق جمال کی آسودگی کی تلاش ہی کا دوسرا نام غزل سرائی و سرمستی کہا جا سکتا ہے۔ کنیزوں اور غلمان کی خرید و فروخت اور ہر ہر شہر میں اس مقصد کے لئے نخاسہ بازار کا وجود اس قسم کے قوی ادب کے پیدا کرنے کا ذریعہ رہے، اور لوگ زندگی کی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کر کے حکایت بایار گفتن کے تصورات کے ساتھ یک گونہ بے خودی میں غرق رہے، اندلسی شاعری میں اس قسم کی شاعری کی کمی نہیں، ان کی اکثر غزلیں تقلیدی اور تکلف و تصنع سے بھی بھری ہوئی ہیں، انھوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ اسلوب قدیم کی کچھ چیزیں ترک کر دیں، مثلاً تغزل و تشبیب کے اشعار میں بادیہ کا ذکر راستہ کی مشقت و صعوبت اثنائے راہ میں قیام، محبوب کی یاد کا ذکر اور پھر روانگی اور اسی طرح کی دوسری تقلیدی باتیں چھوڑ دیں، لیکن اس کے بعد بھی ترقی پسندانہ تشبیب کا رجحان پیدا نہ ہوا، بلکہ اس کی جگہ فحش گوئی اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں نے لے لی، اور ملوک الطوائف کے عہد تک پہنچتے پہنچتے غزل گوئی عریاں نگاری اور فحش گوئی کا دوسرا نام ہو گئی۔

خارجی شاعری | خارجی شاعری وصف نگاری تمام اندلسی شاعری پر حاوی ہے، شعرائے اندلس کا اصل کمال فطرت کی عکاسی اور جمال کائنات کی تصویر کشی ہے، لہو و لعب، رقص و سرود، سیر و شکار، مجالات اور مظاہر تمدن کی مصوری ان کا محبوب موضوع تھا، اور رزم و بزم دونوں کی مرقع نگاری اوج کمال پر پہنچ گئی تھی،

اندلسی شاعری نے مختلف اغراض واصناف کے لیے جو اسلوب بیان اختیار کیا وہ قدامت کے باوجود اپنی مخصوص سادگی، موسیقیت اور نغمہ ریزی میں اپنی مثال آپ ہے، ... شعرائے اندلس کا حقیقی کارنامہ موشحات و ازجال میں نیچرل شاعری کی دلکش تعبیر ہے، روایتی شاعری پر ان کی عظمت فن کی بنیاد نہیں ہے۔[۵۸] ابن خفاجہ پھول کی توصیف میں کہتا ہے کہ پھول تکبر سے اترا رہے ہیں، اور ان کو حیا نے سرخ زیور اور سبز چادروں میں ملبوس و مزین کر رکھا ہے۔

ومسائسة تزهی وقد خلع الحیا　　علیها حلی حمراً وأردیة خضرا

شعر الطبیعۃ (رومانی شاعری) | شعر الطبیعہ (Poetry of Nature)

اندلسی شاعری کی جان ہیں شعرائے اندلس نے موشحات کے حسین پیکر میں نیچرل شاعری کی روح پھونک کر یورپ کو فطرت پسندانہ روایات (Romanticism) سے آشنا کر کے سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کرنے اور پھر اس کے وسیلہ سے ازلی و ابدی حقیقت (Ultimate Reality) تک پہنچنے کا فن سکھایا، یہ شاعری اندلس کی تمام اصناف سخن پر حاوی ہے۔

مناظر فطرت اور جمال کون و مکان سے محظوظ ہونا انسان کی فطرت ہے، ہرے بھرے باغوں صاف شفاف جھیلوں اور دریاؤں گنگناتی ہوئی ندیوں اور دوسرے لاتعداد جمال فطرت کے مظاہر سے کون سرور و انبساط محسوس نہیں کرتا؟ اندلس اس قسم کے حسین مناظر سے مالامال تھا، اس لئے اندلسی شعراء قدرۃً اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے جس کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی ہوتا ہے، جو اس قسم کے دلکش مظاہر کی جیتی جاگتی

---

۵۸ حوت الترکابی "فی الادب الاندلسی" ص ۷۱

تصویر ہے۔

یوں تو عصر جاہلیہ میں بھی اس قسم کی شاعری کی کمی نہیں تھی لیکن اس میں یہ عناصر تشبیہات و استعارات کے پردوں میں غیر منظم انداز میں بکھرے ہوئے تھے، باقاعدہ طور پر جمال فطرت کی توصیف پر توجہ اس دور میں نہیں کی جا سکی اموی دور میں جب بدویت کا اثر کم ہو گیا اس وقت غزل، مدح خمریات اور مظاہر فطرت کے عناصر زیادہ نکھر کر سامنے آئے۔

عباسی دور علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا دور تھا۔ تاہم ابوتمام، بحتری، ابن الرومی اور ابن المعتز نے فطرت پسندانہ ادبی روایات کی شمعیں روشن رکھیں، لیکن اس کی جانب باقاعدہ توجہ نہ تھی، چودھویں صدی ہجری میں صنوبری نے کی جو اسکا امتیازی وصف ہے۔ لیکن اسی کی ذات تک اس کا دائرہ محدود رہا۔

اندلس کی نیچرل شاعری کو تین مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نیچرل شاعری کا پہلا مرحلہ اموی خلافت کی ابتدا سے گیارہویں صدی عیسوی تک رہا، اس دور میں ابن ہانی، ابن عبد ربہ، ابن دراج اور قسطلی جیسے شعرا، مشرق کے انداز پر تقلیدی شاعری میں منہمک رہا اس لیے نیچرل شاعری ابتدائی مرحلہ کے آگے نہ بڑھ سکی۔

(۲) دوسرا مرحلہ گیارہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے اس کی انتہا تک حاوی رہا اس پوری صدی میں تقلید مشرق سے مکمل آزادی تو حاصل نہ ہوئی، لیکن اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ موشحات بھی لکھے جانے لگے تھے۔ جدت و ندرت اور ذوق جمال کی آسودگی سے متعلق ادبیات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اس دور کے نمائندے ابن زیدون، معتمد اور ابن حمدیس تھے۔

(۳) تیسرا مرحلہ بارہویں صدی پر محیط ہے، یہ مسلم اسپین کی آخری صدی تھی،

اس صدی میں نیچرل شاعری کے لبل وجواہر عام ہوئے، یہ دور ابن خفاجہ، ابن سہل اور
ابن الخطیب کی شاعرانہ جدتوں سے شعر الطبیعۃ کا دور عروج بن گیا، رہا موشحات اور زجال کا
فروغ باقاعدہ طور پر اسی دور میں ہوا۔

اندلس کی نیچرل شاعری کی نمایاں خصوصیات | اندلسی شاعری میں فطرت پسندانہ عناصر
سے تاثیر و تاثر کی خصوصیت عام رہی اس کے نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

(۱) اندلسی شعراء اگرچہ عرب تھے لیکن ان کا قلبی تعلق اندلس سے تھا جس کی جھلک انکے
پورے کلام میں نمایاں ہے۔ اس کو وہ جنت ارضی تصور کرتے تھے۔

وہ اہل اندلس کو مخاطب کرکے وہاں کے دریاؤں، چشموں اور سایہ دار درختوں کی
تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است　　　ہمین است و ہمین است و ہمین است

ابن خفاجہ اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے۔ ؎

یا أهل اندلس لله دركم　　　ماء وظل وانهار واشجار

ماجنة الخلد الا في دياركم　　　ولو تخيرت هذا كنت اختار

اے اہل اندلس اللہ نے تمکو آب رواں کا سایہ، نہریں اور درخت عطا کئے جنت خلد
تمھارے ہی ملک کا نام ہے اگر مجھے ان دونوں میں سے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو اندلس
کی جنت کو اختیار کر دوں۔

(۲) اس کی نیچرل شاعری کی دوسری خصوصیت اندلس کی خارجی توصیف اور
مادی ظواہر کی تحسین ہے۔ وہاں کے شعراء جس طرح مظاہر فطرت کی مصوری کرتے تھے اسیطرح
عمارتوں کے حسن کی بھی توصیف کرتے تھے، اور چاند سورج، دریاؤں اور آبشاروں کے

ساتھ ساتھ محلوں، مسجدوں، حوضوں اور دوسری عمارتوں کی توصیف کے نمونے بھی موجود ہیں۔ نوبردوں کی توصیف ایک شاعر اس طرح کرتا ہے۔

قضب من اللجین اثمر فرعها　　لما انتهت باللؤلؤ المتحدر

(فوارے گویا بلور (شیشہ) کی مکمل شاخیں ہیں جن کی ٹہنیوں میں ڈھلکتے ہوئے موتی ثمربار ہوں)

(۳) اپنے اپنے شہروں کی ثنا وصفت بیان کرتے تھے، ابن زیدون نے قرطبہ کی تعریف کی ہے۔ ابن زہر اشبیلیہ کی یاد میں رطب اللسان ہے تو ابن نزار وادی اشات کو جنت نشان بتاتا ہے۔

وادی الاشات یھیج وجدی کلما　　اذکرت ما قضیت بک النعماء

اے وادی اشات جب میں تیری نعمتوں اور اس پر لطف زندگی کو یاد کرتا ہوں جو تیرے یہاں بسر کی ہے، تو میرا وجدان بھڑک اٹھتا ہے۔

سیر و سیاحت میں جو جو مقامات جاذب نظر ہوئے سب کا دلکش وصف مرقوم ہے

(۴) وہ نیچر کو جاندار فرض کرکے خوشی و غمی کے جذبات اس کی جانب منسوب کرکے تصور کرتے تھے کہ نیچر ان کے سکھ دکھ میں برابر شریک و سہیم ہے۔ جیسا کہ ابن نزار کہتا ہے۔

والنھر یبسم بالحباب کانہ　　سلخ نضتہ حیتہ رقطاء

طبقات الامم

اندلس کے نامور فاضل صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ کی کتاب جس میں انھوں نے اپنے زمانہ تک کی تمام قوموں کی عموماً، اور مسلمانوں کی خصوصاً علمی و ادبی تصانیف اور علوم و فنون کی تاریخ عربی میں لکھی تھی، اوسکا میاں اختر جوناگڈھی مرحوم کے قلم سے نہایت شگفتہ اردو ترجمہ۔　　قیمت:- ے

تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری

(تحقیق مزید کی روشنی میں)

مترجمہ ۔ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے

ایک زمانہ تک تاج محل اور لال قلعہ کے معمار یورپین خیال کئے جاتے تھے، استاذالاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اب سے تقریباً نصف صدی قبل ۱۹۳۳ء میں دیوان مہندس کی دریافت کے بعد اسی کی روشنی میں غالباً پہلی بار یہ انکشاف کر کے حقیقت کی پردہ کشائی کی تھی کہ مذکورہٗ بالا دونوں عمارتوں کی نقشہ سازی اور تعمیر دراصل استاذ احمد لاہوری کے جودت تخیل اور چابکدستی کا نتیجہ ہے، موصوف نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" کے عنوان سے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے اجلاس میں پڑھا تھا، اس کے بعد معارف ۱۹۳۶ء کے کئی نمبروں میں بالاقساط شائع ہوا، اور اب مقالات سلیمان جلد اول، تاریخی میں بھی آگیا ہے۔

ذیل کا مقالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، فاضل مقالہ نگار ایچ، آئی، ایس کنور صاحب (دہلی) گذشتہ پندرہ ۱۵ سال سے تاج محل اور اس کی تعمیر کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ اور اس موضوع پر ایک تحقیقی کتاب

تیار کر رہے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں انھوں نے سید صاحب کی قیمتی تحقیقات سے استفادہ کرنے کے ساتھ بہت سے نو دریافت و نایاب قلمی ماخذوں سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے جن تک سید صاحب کی رسائی نہیں ہو سکی تھی، اس طرح یہ مقالہ نہ صرف سید صاحب کے مضمون کے تتمہ و تکملہ کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں بعض نئی تحقیقات اور جدید انکشافات پہلی بار منظر عام پر لائے گئے ہیں، اسی افادیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، یہ مقالہ مشہور انگریزی رسالے اسلامک کلچر کے اپریل ۶۰ئہ کے شمارے میں شائع ہوا ہے، (نعیم ندوی،)

تاج محل کی تکمیل ۱۶۵۳ء میں ہوئی۔ اس وقت سے فن تعمیر کا یہ لافانی نمونہ برابر دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے، تین صدی سے زیادہ کے عرصہ میں جس سیاح اور اہل علم نے بھی اسے دیکھا ہے اس کے بے نظیر فن تعمیر اور نقاشی پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے، ان میں سے کچھ لوگ تو اس کے حسن سے اسقدر مرعوب ہوئے کہ ان کا قلم ان کے صحیح جذبات کی ترجمانی سے قاصر رہا، اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے والوں میں کچھ تاریخ فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے ماہرین ایسے بھی رہے ہیں جو تاج کی دلکشی سے مسحور ہو کر اس سے وابستہ بعض رموز کو حل کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں، ان ہی رموز میں سے ایک معمہ ان اشخاص کی تحقیق کا بھی ہے جنھوں نے تاج محل کا نقشہ تیار کیا تھا۔

ابھی کچھ عرصہ قبل تک اس کا سہرا مندرجۂ ذیل لوگوں کے سروں پر باندھا جاتا رہا ہے، اٹلی کا ایک جوہری جیرانیمو ویرونیو (Geronimo Veronco) ایک فرانسیسی صراف آسٹن دی بورڈو[۱] (Austin de Bordeaux)

(حاشیہ نمبر ۱ ص ۱۳۲)

ایک ایرانی پناہ گزین علی مردان خان جو عہد شاہجہانی کا ایک مشہور انجینیر تھا۔ چوتھا، شخص استاد عیسیٰ آفندی ہے جو رومؒ کا ایک ترکی باشندہ اور آگرہ میں مقیم تھا مذکورہ بالا تمام افراد کے معمار تاج ہونے کی موافقت میں بہت سے دلائل فراہم کئے گئے ہیں لیکن ابھی یہ تحقیق کسی اطمینان بخش مرحلہ تک نہیں پہنچ سکی ہے، اور اس کا کوئی حتمی ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ان ہی اشخاص میں سے کوئی تاج محل کا معمار تھا،

یہ اختلاف رائے ۱۸۴۴ء سے شروع ہوا جب سر ولیم سلیمن (Sir William Sleeman) نے یہ تحقیق پیش کی کہ تاج محل کا نقشہ آسٹن دی بوردو نے تیار کیا تھا، ۱۹۰۳ء سے اسوقت یہ جوش اور بڑھا جب ای۔ بی۔ ہیول (E. B. Havell) نے عیسیٰ آفندی کی موافقت میں دلائل پیش کئے۔ اس کے بعد پادری ایچ ہاسٹن (H. Hosten) نے سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ اصل معمار اٹلی کا جیرانیمو ویرونیو تھا، جیمس فرگوسن (James Fergusson) نے یہ تحقیق پیش کی کہ دراصل تاج محل کا نقشہ نویس علی مردان خاں تھا،

مگر مذکورۂ بالا تمام محققین میں سے کسی نے بھی اپنے دعوی کے ثبوت میں کوئی ایسی واضح دلیل نہیں دی، جس سے غیر مشتبہ طور پر تاج محل کے نقشہ ساز کی تعین ممکن ہو سکے۔ ظاہر ہے اس طرح کا مستند ثبوت عہد شاہجہانی یا اس کے قریبی عہد کی کسی

(حاشیہ نمبر ا ص ۲۱) لہ یہ بات اب مسلم ہو چکی ہے کہ آسٹن بوردو کا تاج محل کے نقشہ سازی یا نقاشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ملاحظہ ہو راقم سطور کا مقالہ "آسٹن بوردو" رسالہ انڈیکا بمبئی مارچ ۱۹۵۳ء۔ لہ ملاحظہ ہو میرا مقالہ "نام نہاد استاد عیسیٰ اور تاج محل" رسالہ انڈیکا بمبئی مارچ ۱۹۵۳ء جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ استاد عیسیٰ کا نام اٹھارہویں صدی کی محض ایک فرضی ایجاد ہے،

دستاویزہی سے فراہم ہو سکتا ہے،

۱۹۳۰ء کے اوائل میں بنگلور کے ایک محقق سید محمود خاں ایک دن اپنی لائبریری کی قدیم کتابوں اور قلمی نسخوں کو الٹ پلٹ رہے تھے کہ اتفاقاً ان کا ہاتھ ایک فارسی مخطوطہ پر پڑ گیا، جس کا نام دیوان مہندس مصنفہ لطف اللہ مہندس تھا۔ اس میں تاج محل اور لال قلعہ کا تذکرہ تھا۔ اس مخطوطہ کے مصنف کے بیان سے محمود خاں کو پتہ چلا کہ تاج محل اور لال قلعہ دہلی دونوں کا نقشہ شاہجہان کے حکم سے استاد احمد لاہوری نے تیار کیا تھا، وہ شاہی معمار تھے، اور انھیں نادر العصر کہا جاتا تھا۔[1]

اس سے محمود خان کو اس مخطوطہ کی اہمیت کا احساس ہوا اور انھوں نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح دیون مہندس کا یہ مخطوطہ ان کے ہاتھ لگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب منظوم اور فارسی رسم الخط میں ہے۔ اس کے مصنف لطف اللہ مہندس ہیں۔ یہ تقریباً تین سو سال قدیم ہے، اور شاہجہانی دور کے آخری ایام تک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مہندس کی ذاتی تحریر ہے۔ اس کتاب کی مختلف نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مصنف شاہجہاں کے بڑے لڑکے داراشکوہ کا منشیٔ درحامی تھا۔ جب داراشکوہ کو شکست دیکر اورنگ زیب نے عنان حکومت سنبھالی تو مصنف اور اس کے اہل خاندان کو سخت نقصانات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس نے شاہجہان کی خدمت میں ایک عرضداشت بھجوائی (جس) لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اور بالآخر اس خاندان کو گوشۂ عزلت میں اور غربت

---

[1] تاج محل کے معمار ——— ایک قدیم راز کا انکشاف۔ از محمود خان السٹریٹڈ ویکلی بمبئی، ۱۸ اپریل ۱۹۳۳ء ص ۳۰

پناہ لینی پڑی۔ (ص ۶۸)"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے خوف سے مصنف کے خاندان والوں نے اس کتاب کو چھپائے رکھا۔ کیونکہ اس میں دارا شکوہ کی شان میں نظمیں تھیں' بعد کی تاریخوں اور آخری صفحہ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مشہور تاریخی شخصیت نواب ابراہیم خان ہزبر جنگ نے خرید کر اپنی لائبریری میں داخل کر لیا تھا، نواب موصوف ایک مشہور مسلمان فوجی افسر تھے، جن کا عرف گارڈی تھا، انھوں نے ۱۷۶۱ء کی جنگِ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف مرہٹوں کا ساتھ دیا تھا۔"

"یہ کتاب میرے خاندان میں کئی نسلوں سے چلی آرہی ہے، لیکن اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اسوقت ہوا جب یہ مشہور مورخ، مصنف اور محقق علامہ سید سلیمان ندوی کے ہاتھ لگی۔ اسی کتاب سے مواد فراہم کر کے علامۂ موصوف نے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور میں تاج محل کے معماروں کے بارے میں ایک طویل وبسیط مقالہ پڑھا۔"

اب سید محمود خاں کو لطف اللہ مہندس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور انھوں نے ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کو ایک مبسوط خط لکھا، اس کے جواب میں علامہ موصوف نے سید محمود خاں سے وہ مخطوطہ مطالعہ کے لیے مانگا، جب یہ کتاب سید صاحب مرحوم کو ملی تو اس کے مطالعہ سے ان کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، کیونکہ ۹۰ صفحات پر مشتمل اس منظوم مخطوطہ میں تاج محل اور لال قلعہ کے نقشہ نویسوں اور معماروں کے بارے میں کافی معلومات اور

واضح تفصیلات درج تھیں۔ اس کے مصنف لطف اللہ مہندس کا بیان ہے کہ ان کے باپ کا نام استاد احمد لاہوری تھا، جنھیں نادر العصر کا خطاب ملا تھا۔ مخطوطہ میں انکے بارے میں یہ تفصیلات درج تھیں۔

"احمد معمار جو اپنے فن میں دوسرے فنکاروں سے سیکڑوں منزل آگے تھے، وہ فن تعمیر سے متعلق کتابوں اور مقالات پر بھی پوری دسترس اور واقفیت رکھتے تھے، اور فن تعمیر کے مختلف نمونوں اور تفصیلات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ انھیں علم نجوم و ہیئت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، عالم پناہ سے ان کو نادر العصر کا خطاب عطا ہوا تھا، وہ شاہی معمار تھے، ان کو تقرب شاہی حاصل تھا جب شاہی علم آگرہ پر لہرا رہا تھا، اُس وقت ان پر شہنشاہ کی خاص نظر کرم تھی، اس فاتح عالم بادشاہ کے حکم پر انھوں نے ممتاز محل کا مقبرہ تعمیر کیا۔"

"اسی شہنشاہ کے ایما و پر احمد نے لال قلعہ دلی بھی تعمیر کیا، جو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہ دونوں عمارتیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے، اور جن کے محاسن اجاگر کرنے میں میرے قلم نے بڑی جولانی و روانی دکھائی ہے، استاد احمد کی مہارت فن کا محض ایک نمونہ ہیں، یا یوں سمجھیے کہ موتیوں کی لڑی میں سے محض ایک موتی ہے۔"[۵]

ان تفصیلات کے علم اور انکشاف سے ظاہر ہے سید صاحب کو حد درجہ فرحت و مسرت

---

۵ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" از علامہ سید سلیمان ندوی انگریزی ترجمہ شائع شدہ جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۴ ۳ مارچ تا جون ۱۹۴۸ء ص ۱۸ ڈاکٹر ایم۔ اے چغتائی نے اپنے مقالہ "مغل معماروں کا خاندان" اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۰۲ پر اس پیراگراف کا ترجمہ ذرا مختلف ڈھنگ سے کیا ہے۔

سوس ہوئی۔ اسی زمانہ میں ماہنامہ معارف" میں ڈاکٹر ایم عبداللہ چغتائی کا مقالہ
ج اور اس کی تعمیر" شائع ہوا۔ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء کو سید صاحب نے ڈاکٹر چغتائی
د ایک خط لکھا جس میں انھوں نے چغتائی صاحب کی توجہ اس طرف مبذول
رائی تھی کہ انھوں نے اپنے مذکورہ مقالہ میں استاذ احمد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔
سید صاحب نے اس خط میں یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کیا ڈاکٹر چغتائی کو لطف اللہ مہندس کی
تصنیفات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، ڈاکٹر چغتائی نے جواب میں عہد مغلیہ سے متعلق ایک
ایسے خط کا حوالہ دیا جس میں شاہجہان اور عالمگیر کے عہد حکومت کا ذکر موجود ہے،
یہ دلچسپ خط جس کا کاتب نامعلوم ہے عمدۃ الملک نواب جعفر خان کو بھیجا گیا
تھا، یہ نواب مغلوں کی ملازمت میں تھا، اور بتدریج ترقی کرکے سنہ ۱۶۴۵ء سے ۱۶۵۷ء
تک پنجاب کا گورنر رہا۔ اور دو سال بعد شاہجہاں کا وزیر مقرر ہوا، بعد میں
اورنگ زیب نے بھی نواب جعفر خان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ سنہ ۱۶۷۰ء میں اس نے
وفات پائی۔

اس خط کے مطالعہ کے بعد علامہ سلیمان ندوی نے ڈاکٹر چغتائی کو لکھا "خدا کے
فضل سے احمد معمار پر میرا مقالہ مکمل ہوچکا ہے، جعفر خان کے متعلق خط کا حوالہ دیتے
ہوئے میں نے آپ کے نام کا بھی تذکرہ کیا ہے، یہ مقالہ انشاءاللہ لاہور میں پڑھا جائیگا"[1]
نواب جعفر خان سے متعلق یہ خط کافی طویل ہے، جس میں شمالی ہندوستان
میں شاہی تعمیرات خصوصاً قلعہ شمشیر گڑھ کا مفصل تذکرہ موجود ہے، یہ خط کئی حیثیتوں سے

---

[1] اس خط کا مضمون، ڈاکٹر ایم عبداللہ چغتائی کے مقالہ "احمد معمار اور اس کا
خاندان" میں موجود ہے"

بڑی اہمیت کا حامل ہے، اور اس کا ثبوت ہے کہ عہد مغلیہ میں کتنے جامع تعمیراتی پلان پر عمل ہوتا تھا۔ خصوصاً شاہجہانی دور میں جب کہ مغل تعمیرات اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھیں، یہ مختلف چیزوں کے ماہرین اور نگران کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ مناصب پہ فائز لوگوں کو انکی نااہلی پر فوراً موقوف کر دیا جاتا تھا۔ اہل ہنر، وفادار، ایماندار اور باصلاحیت افراد کی بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ شعبۂ تعمیرات کو نہایت بااصول طریقہ پر منظم کیا جاتا تھا۔

یہ خط اس زمانہ میں لکھا گیا ہے، جب نواب جعفر خان پنجاب کے گورنر تھے گو اسکے کاتب کا نام معلوم ہے لیکن اس کا لب و لہجہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا لکھنے والا شاہجہان کا معتمد کوئی اعلیٰ درجہ کا افسر ہے۔ جس کو شاہ کے حضور میں خصوصی تقرب حاصل تھا، اس طرح اس خط کے کاتب کے نہ صرف ماہرین تعمیرات (جن میں استاد احمد بھی شامل ہیں) سے قریبی تعلقات تھے، بلکہ نواب جعفر خاں سے بھی اس کے اچھے مراسم تھے۔ جیساکہ القاب کے بے تکلفانہ، دوستانہ اور آزادانہ انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنا اردو مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" کے عنوان سے ۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور کے ادارۂ معارف اسلامیہ کی پہلی نشست میں پڑھا۔ یہ مقالہ اس ادارہ کی پہلی رپورٹ میں ۱۹۳۵ء میں اور بعد میں شبلی اکیڈمی کے آرگن ماہنامہ معارف فروری تا اپریل ۱۹۳۶ء میں بھی شائع ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں سید صاحب موصوف کے ایماء پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا[۱]

---

[۱] یہ انگریزی ترجمہ جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی کے شمارہ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

اس حقیقت میں قطعی دو رایوں کی گنجائش نہیں کہ علامہ سلیمان ندوی کا مذکورہ مقالہ بڑی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ دیوان مہندس کی روشنی میں سید صاحب موصوف نے انکشاف کیا ہے کہ استاذ احمد کے خانوادہ کے سبھی افراد بہ یک وقت فن تعمیر، نقشہ سازی، انجنیرنگ، علم ریاضی، فلسفہ، ہئیت و نجوم اور شعر و ادب مختلف فنون لطیفہ کے ماہر تھے۔ استاذ احمد کے تین فرزند تھے، عطاء اللہ، لطف اللہ اور نور اللہ۔ اس مخطوطہ کا مصنف یہی ثانی الذکر لطف اللہ ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے گرانقدر مقالہ کے خاص نکات درج ذیل ہیں۔

"دیوان مہندس اس بات کو شک و شبہ سے بالاتر قرار دیتا ہے کہ تاج محل کے معمار استاذ احمد تھے۔ وہ عہد جہانگیری ہی سے ایک معمار اور کاریگر کی حیثیت سے شہرت عامہ حاصل کر چکے تھے اور شاہجہان کے عہد میں لال قلعہ دہلی بنانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ استاد احمد کا خاندان شاہزادہ دارا شکوہ اور اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کا کٹر حامی تھا۔ اور عالمگیر کے ہاتھوں دارا شکوہ کی پسپائی کے بعد یہ خاندان شاہی عنایات سے محروم ہو گیا۔ استاذ احمد شاہجہان کے خاص شاہی معمار تھے، بادشاہ نے انھیں نادر العصر کا عظیم خطاب، ان کی اہلیت اور شاندار خدمات کو سراہتے ہوئے دیا تھا"[1]

سید صاحب موصوف نے استاذ احمد کے اہل خاندان کی جو تفصیل دی ہے، اس سے مندرجۂ ذیل شجرہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی شمارہ مارچ تا جون ۱۹۴۳ء ص ۱۰۵، تا ۱۱۰،
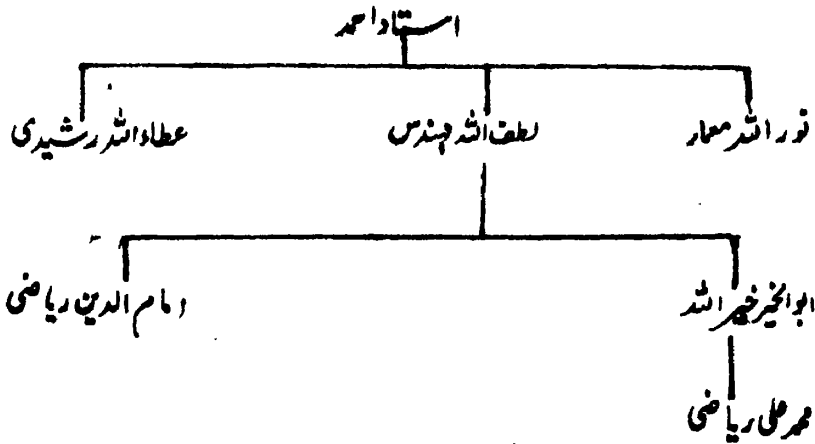
دیوان مہندس کے بارے میں کچھ قابل ذکر باتیں درج ذیل ہیں،

(۱) اس قلمی نسخہ کے ابتدائی دس صفحات کے چار قصائد میں سے دوسرا اور تیسرا قصیدہ شاہزادہ دارا شکوہ اور غالباً اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کی مدح میں ہے۔ جس میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ "شاہ کی عنایات اور نظر خاص کی بدولت فن تعمیر کا معیار میرے ذریعہ بہت بلند ہوگیا۔ دارا شکوہ میں آسمان کی رفعت ہے۔ اور ان کے دل میں فیاضی کا دریا رواں ہے۔ جواہر کی طرح موتیوں کی بارش کرتا ہے"[۱]

(۲) ایک مثنوی بھی کسی شاہزادے سے معنون ہے، اور یہ شاہزادہ بھی اغلباً دارا شکوہ ہی ہے، مثنوی میں کہا گیا ہے کہ مصنف اس شاہزادے کے توسط سے شاہجہاں تک پہنچنا چاہتا ہے۔

---

[۱] مترجم:- یہ فارسی کے درج ذیل اشعار کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔

بدستاری لطف شہ بلند اقبال — بلند پایہ زمن گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریا دل — کہ ہم چو ابر کفش می کند گہر باری

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۱۹)

"اگر شہنشاہ کا کوئی مقرب خاص میرا یہ پیغام بادشاہ کے کانوں تک اسوقت پہونچا دے جب وہ اچھے موڈ میں ہو تو خدا اسکو اجر عظیم دیگا"[1]

(۳) مخطوطہ میں ایک غزل بھی شاہزادہ داراشکوہ اور شاہجہاں کی مدح میں ہے۔

"داراشکوہ اور شاہجہاں بانی عالم ہیں۔ پروردگار اس عظیم سلطنت کا نگہبان ہو جس طرح وہ دنیا کی حفاظت کرتا ہے آپ لوگوں کے اقبال کی بھی حفاظت فرمائے جب تک دنیا میں آب و آتش موجود ہے۔ کرۂ ارض آپ کے قدموں پر سجدہ ریز رہے گا۔ اے عالم پناہ! ساری دنیا آپ کی مدح خواں ہے اور دنیا کی اس مدح سرائی کو سنئے کب تک ھندس کی حالت زلف یار کی طرح رہے گی، آپ ہی دنیا کے انتشار کو دور کر سکتے ہیں"[2]

---

[1] مترجم:- اصل فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

این سخن از مقیم این درگاہ	برساند بسمع حضرت شاہ
اجر باید کرد گار کریم	نہ کہ اجر قلیل اجر عظیم

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۴)

[2] مترجم:- دیوان ھندس کے اصل فارسی اشعار جن کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ اوپر مذکور ہوا یہ ہیں۔

داراشکوہ، شاہجہان بانی جہان	بردے مبارک است سلیمانی جہان
پروردگار باد نگہبان دولتت	زانرو کہ کار تست نگہبانی جہان
تا ز آب و آتش است در زبانہ یاد	روشن ز خاک پائے تو پیشانی جہان
اے بانی جہاں کہ جہان در ثنائے تست	یک لحظہ گوش دار ثنا خوانی جہان
تا کے ھندس است پریشان چو زلف یار	اے از تو در گذشتہ پریشانی جہان

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۲۴)

(۴) ایک قطعہ میں شہنشاہ کی یوں تعریف کرتا ہے: "اے شہنشاہ تیرے مدح خوان کو جامِ جمشید کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ معرفت حقیقی کے سرور میں مخمور کو شراب کی حاجت نہیں ہوتی۔ اگر آپ چاہتے ہوں کہ آپ کے محل کا معمار آپ کی توصیف کرے تو لطف اللہ کو اینٹ اور چونے کے کام میں مصروف نہ کیجئے"[1]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ ہندس اور ان کا خاندان شاہجہاں کے مقربین خاص میں تھا، اور بعد میں شاہزادہ داراشکوہ کا حامی رہا، جیسا کہ دیوان مہندس کے نسخہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے ۱۶۵۰ء میں داراشکوہ کے لیے ایک محل تعمیر کیا اور ۱۶۵۲ء میں اس کے لیے ایک خاص کلید بھی تیار کی۔ یہ کنجی یقیناً بہت ہی مخصوص طرز کی رہی ہوگی، اسی لئے دیوان مہندس میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ غالباً یہ کنجی لطف اللہ مہندس کے تیار کئے ہوئے کسی خاص قسم کے تالے کی رہی ہوگی۔ یا پھر کوئی سونے کی کنجی رہی ہو۔

لطف اللہ اور ان کا خاندان شاہزادہ داراشکوہ کا انتہائی وفادار تھا، چنانچہ مصنف نے اس کی پرزور مدح کی ہے۔ اور شاہزادۂ موصوف کے جانی دشمن عالمگیر پر طنز و طعن کے تیر بھی پھینکے ہیں، لطف اللہ نے داراشکوہ کی تعریف اس طرح کی ہے،

"آپ کے خیر خواہوں کو خدا ہمیشہ عروج دے اور آپ کے دشمنوں کو خاک میں ملائے۔"[2]

---

[1] مترجم:۔ مخطوطہ کے اصل اشعار

ثناخوان ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن	بجام بادہ حاجت نیست مست جام سرمد را
چومی خواہی کہ باشد بانی قصر ثنائے تو	بکار خشت و گل مگذار لطف اللہ احمد را

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۵۵۰)

اورنگ زیب کے متعلق لکھتا ہے: "اے شہنشاہ آپ دادخواہوں پر توجہ نہیں دیتے،
اور محتاجوں پر نظر کرم نہیں ڈالتے۔ میرے دشمنوں نے میرے قتل کا فتویٰ۔۔۔
جاری کیا ہے، ورنہ آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا"[1]

یہی وجہ ہے کہ جب عالمگیر اورنگ زیب اورنگ شاہی ہوا تو شاہزادہ دارا شکوہ کی
شدید حمایت کے سبب سے لطف اللہ اور اس کے خانوادہ کے حالات ناگفتہ بہ ہوگئے،
اور ان کی جانیں اس حد تک خطرہ میں پڑ گئیں کہ انھیں روپوش ہو جانا پڑا، ان
حقائق کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیوان مہندس شب میں لکھا گیا کیونکہ
دن میں لکھنے میں خطرہ تھا، بایں ہمہ اس کا بھی ثبوت موجود ہے کہ کچھ عرصہ بعد اورنگ زیب
نے لطف اللہ کو اپنی ملازمت میں لے لیا تھا، جیسا کہ اس کتبہ سے ظاہر ہے جو ساٹ
انچ لمبا ۱/۲ ۳ انچ چوڑا دھات کا بنا ہوا سلاطین مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں بادشاہ
ہوشنگ غوری کے مقبرہ کے صدر دروازے پر دائیں جانب نصب ہے، کتبہ میں ہے،
کہ "۹ ربیع الثانی ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۶۵۹ء کو خاکسار لطف اللہ بن احمد شاہجہانی
معمار اور خواجہ جادو رائے استاد شیورام اور استاد حامد اسے دیکھنے آئے تھے"

لطف اللہ مہندس کے خاندان پر شہنشاہ اورنگ زیب کی نظر عنایت ہونے کا
ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ لطف اللہ کے بڑے بھائی عطاء اللہ نے اورنگ زیب
کی محبوب بیوی ملکہ رابعہ دورانی بیگم کے مقبرہ کی تعمیر کی تھی، جس کا انتقال ۱۶۵۷ء

---

[1] ترجمہ:- شہا گوش بر دادخواہی نداری | بحال گدایان نگاہے نداری
رقیبان بقتلم نوشتند فتوی | دگرنہ تو ہرگز گناہے نداری

(مقالات سلیمان تاریخی ص ۳۰۶)

مین ہوا تھا۔ اس مقبرہ پر تاج محل کی نقل مین یہ کتبہ لگا ہوا ہے،

"اس صدر دروازے کی تعمیر عزت مآب ابوالقاسم بیگ داروغہ کے زیر
اہتمام ہوئی۔ اس شاندار مقبرہ کی تکمیل معمار عطاء اللہ کے ہاتھوں گورزیب
رائے کے دور میں ۱۰۷۱ھ مطابق ۱۶۶۰-۶۱ء میں انجام پائی"

کیونکہ لطف اللہ نے دیوان مہندس کی تکمیل ۱۷۰۳ء میں کی جو اورنگ زیب کی حکومت کا ۴۶واں سال تھا، اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ گو مصنف اور اس کے خاندان کے لوگ عالمگیر کی ملازمت میں آگئے تھے، تاہم مصنّف کے جذبات میں کشیدگی اور لب و لہجہ میں ترشی باقی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب مصنف کے حقیقی جذبات سے ناواقف تھا، لطف اللہ مہندس کے خلف الرشید امام الدین ریاضی نے لکھا ہے، کہ جب ان کی تصنیف تذکرہ باغستان ۱۷۰۳-۴ء میں مکمل ہوئی تو اس وقت ان کے والد لطف اللہ بقید حیات نہ تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لطف اللہ مہندس کا انتقال ۱۷۰۳ء کے اواخر یا ۱۷۰۴ء کے اوائل میں ہوا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اس بات کا نہایت دلچسپ تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح استاد احمد نادر العصر کا نام وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے استاد عیسیٰ میں تبدیل ہوا۔ اور یہ مذکور ہوا کہ بعض جدید محققین نے کسی واضح ثبوت کے بغیر استاد عیسیٰ ہی کو تاج محل کا نقشہ نویس قرار دیا ہے۔

بہر کیف راقم سطور علامۂ موصوف کے اس نظریہ سے متفق نہیں کہ

"سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس (مخطوطہ) میں ہندو کاریگروں کو بھی

ساکن روم، بلخ، قندھار، اور سمرقند لکھا ہے[1] علی گڑھ یونیورسٹی، حیدرآباد، بھوپال ندوہ اور دارالمصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں اور ان کے علاوہ اور بھی جو نسخے نظر سے گذرے۔ ان میں بھی یہ شتر گربگی موجود ہے[1]

حقیقت یہ ہے کہ دو ہزار سال قبل جب سے ہندوستان کا مذکورہ بالا مقامات سے ثقافتی تعلق قائم ہوا ہندوستانی ماہرین فن نے بیرونی ممالک میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، اور وہ اکثر نمائش ہنر کے لیے وہاں مدعو کیے جاتے تھے۔ جہاں تک مسلم تاریخ کا تعلق ہے ہمیں ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں بھی یروشلم میں ہندوؤں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے ہندو فن کار، معمار اور ماہرین کی وسط ایشیا میں بڑی قدر و منزلت تھی، کیونکہ وہ بڑے تجربہ کار اور نقاشی سے مزین پتھر کی عظیم عمارتیں بنانے کے لیے بہت مشہور تھے جیسا کہ تزک بابری سے ظاہر ہوتا ہے اس میں تیمور بیگ کی پتھر کی مسجد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اس عمارت کی تعمیر میں دو سو سنگ تراشوں نے کام کیا، جو آذربائیجان، فارس، ہندوستان اور دوسرے ممالک سے آئے تھے[2] جب بابر ہندوستان وارد ہوا، اور پہلے مغل حکمران کی حیثیت سے اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی اس وقت وہ بہت سے صنعت کار اور ماہرین فن بھی اپنے ہمراہ یہاں لایا، ان میں ایک بڑی تعداد ایسے ہندوستانیوں کی بھی تھی جو اس کے ساتھ سمرقند و بخارا میں خدمات انجام دے چکے تھے

---

[1] تاج محل اور لال قلعہ کے معمار انگریزی ترجمہ شائع شدہ جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی، مارچ تا جون ۱۹۳۴ء ص ۸۰ [2] ملاحظہ ہو راقم سطور کا مقالہ تاج محل کس نے تعمیر کیا، ماہنامہ آدی مارگ، بمبئی، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۶۰

تزک بابری میں لکھا ہے،

"صرف آگرہ میں اسی شہر کے رہنے والے تقریباً ۶۸۰ سنگ تراشوں کو میں روزانہ اپنے محل کی تعمیر میں لگاتا تھا، اور آگرہ، فتح پور سیکری، بیانا، دھولپور، گوالیار اور کوائل میں میرے کاموں پر ۱۴۹۱ سنگ تراش روزانہ لگائے جاتے تھے"

عہد مغلیہ میں ہندو کاریگروں کا نام بھی مختلف شواہد میں ملتا ہے۔ چنانچہ ہوشنگ شاہ غوری کے مقبرہ پر نصب ۱۶۵۹ء کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے معمار جو اجہ جادو رائے، استاد شیو رام تھے، ایک دوسرا کتبہ ۱۶۶۲ء کا ہے اسکے مطابق جوگی داس اور دیال داس تحویلدار دو ایسے معمار تھے، جنھوں نے بمقام مارگلہ (راولپنڈی) شاہراہ سوری کی مرمت کی تھی۔

اب یہ بات مسلم ہو چکی ہے اور اس کے تاریخی ثبوت بھی موجود ہیں کہ عہد قدیم سے ہی ہندو معمار، سنگتراش اور دیگر فن کار مختلف بیرونی ممالک کو جاتے رہتے تھے، ان میں بہت سے اپنے پسندیدہ ملکوں میں مقیم بھی ہو گئے، ان فن کاروں نے وہاں کے باشندوں کو اپنے فن سے روشناس کرایا، اور ہندو ثقافت اور بیرونی تہذیب نے ملکر انڈونیشیا کے اسٹوپا، برما، کمبوڈیا، لنکا اور تھائی لینڈ کے مندروں جیسے شاہکار پیدا کئے۔ اس طرح بہت سے ہندو معمار اور اہل ہنر وسط ایشیا کے ان علاقوں میں بھی گئے، جسے اب مشرق وسطی کہا جاتا ہے،

کچھ عرصہ بعد جب ان میں سے کچھ لوگ اپنے آبائی وطن ہندوستان کو لوٹے تو

لے "ہندوستان میں مسلم حکومت کی مختصر تاریخ" (انگریزی) ایشوری پرشاد جلد ۲ ص ۴۷۰

خواہ ہندو تھے یا مسلمان ان کو اسی ملک کی طرف منسوب کیا جانے لگا، جہاں سے وہ لوٹ کر آئے تھے، اس لیے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ ہمیں ہندوستانی تاریخوں میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور عہد مغلیہ کے فارسی مخطوطات میں ان کا ذکر موجود ہے، اسی وجہ سے ڈاکٹر ایم، عبداللہ چغتائی نے تاج محل کی نقاشی، تزئین اور آرائش و زیبائش پر تبصرہ کرتے ہوئے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے اتفاق مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ سبھی طغرا نگار جن کا تذکرہ مسٹر ہیویل نے کیا ہے، وہی لوگ ہیں جن کا ذکر میرے پاس موجود فارسی کے مخطوطات میں بھی ملتا ہے، اور جو وسط ایشیا کے باشندے تھے، چنانچہ چرنجی لال کا وطن سمرقند بتایا گیا ہے، موہن لال روم (قسطنطنیہ) سے وابستہ خیال کیے جاتے ہیں اور منوہر سنگھ کا وطن بلخ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن راقم سطور کے خیال میں یہ بات ناممکن ہے میری رائے کے مطابق یا تو ان فنکاروں کے اسلامی نام بگاڑ کر ہندو نام دے دیئے گئے ہیں یا پھر ان قلمی نسخوں کا سارا مواد جعلی ہے، بہرکیف اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مسٹر ہیویل کا بھی یہی خیال ہے۔[1]"

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ بابر سے لے کر شاہجہان تک کے پورے مغلیہ دور میں سبھی سلاطین علم و ہنر کے بڑے دلدادہ اور حسن کے بہت زبردست پرستار تھے۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ یہ تخلیق کسی ہندو کی ہے یا مسلمان کی اور یقینی طور پر فارسی یا مغل مصنفین نے کسی ہندو کی تعریف اس وقت تک نہ کی ہوگی، جب تک وہ اس کا واقعی مستحق نہ رہا ہوگا، اور مسلمان مورخین نے تو اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ اسلامی ناموں کی جگہ ہندو نام رکھ دیے جائیں۔ اس حقیقت کا بھی کافی

---

[1] تاج محل کی نقاشی" انگریزی مقالہ، از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، اسلامک کلچر حیدرآباد، اکتوبر ۱۹۳۷ء ص ۴۶۹،

ثبوت موجود ہے کہ مغلیہ دور کے مروج آرٹ کی تخلیق و تقلید میں ہندو کاریگر بھی بہت ماہر تھے۔ اس لئے میرے نزدیک ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مذکورۂ بالا نظریہ قابل قبول نہیں ہے، امور بالا کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد مغلیہ میں ہندو فن کاروں کو بھی مسلم خطابات مثلاً خواجہ اور استاد دیئے جاتے تھے، اور استاد کا لقب پانے پر ان کو وہی درجہ حاصل ہوتا تھا۔ جو استاد احمد اور استاد حامد کو حاصل تھا، اس خطاب کی اہمیت یہ تھی کہ ان فنکاروں کو کسی مخصوص فن یا ہنر میں پورا کمال حاصل ہوتا تھا، یہ بھی حقیقت ہے کہ مغل سلاطین مسلم خطابات ان غیر مسلموں کو بھی عطا کیا کرتے تھے، جو کسی خاص وصف کے باعث بادشاہ کے منظور نظر ہو جاتے تھے۔ مثلاً جے پور کے راجپوت شاہزادے راجہ جے سنگھ کو مرزا کا خطاب ملا تھا،

(باقی)

مقالات سلیمان جلد اول

(تاریخی)

ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات کا مجموعہ، جس میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی، بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، نادر العصر استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار۔ نالندہ کی سیر، قنوج، سلطان ٹیپو کی چند باتیں جیسے اہم اور معرکۃ الآرا مضامین بھی آگئے ہیں،

شائع کردہ دار المصنفین۔ قیمت ۱۲ روپے

وحشت اور جگر

از جناب شعیب عظیم، ڈھاکہ

یکم نومبر ۱۹۵۵ء کی ایک شام کو "دبستان فکر و نظر ڈھاکہ" کی ایک پرائیوٹ نشست میں یہ دلچسپ مسئلہ زیر غور رہا کہ فن اور تغزل کے لحاظ سے وحشت کلکتوی اور جگر مراد آبادی میں فوقیت کسے حاصل ہے اس تقابل کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ خالص علمی تجزیہ تھا، اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بغیر تجزیہ کیے ہوئے کسی مسئلہ کی گہرائی تک پہنچنا ممکن نہیں، شرکائے بزم کے بھی پیش نظر یہ باتیں تھیں۔ خوش گوار ماحول میں علمی بحث ہوئی۔ لیکن مسئلہ جہاں کا وہیں رہا۔ اس لیے طے پایا کہ مشاہیر ادب سے اس معاملے میں رجوع کیا جائے۔ چنانچہ ہند و پاک کے ادیبوں اور نقادوں سے اسبارہ میں رائیں حاصل کی گئیں یہاں یہ سب رائیں پیش کی جاتی ہیں جو یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں

۱۔ علامہ آصف بنارسی، ڈھاکہ (جانشین وحشت) — خدا غریق رحمت کرے علامہ وحشت علیہ الرحمۃ کو مبدءِ فیاض نے فروغ طبع کے ساتھ ساتھ صحتِ فن کا ذوق بھی بدرجۂ اتم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کافی ریاض کرکے اہل فن کے زمرے میں نہایت بلند مقام حاصل کیا۔ ان کا دیوان شروع سے آخر تک اعلیٰ تغزل اور کمال فن کا آئینہ دار ہے۔ ہر ہر شعر سے عالمانہ اور استادانہ شان منعکس ہوتی ہے۔ مرحوم اللہ بخشے جگر مراد آبادی مرحوم فطری شعراء میں اچھا مقام رکھتے تھے، مگر حصول فن

انھوں نے محنت نہیں کی، اس لیے ان کے کلام میں عالمانہ شان کم اور عامیانہ طرز زیادہ ہے۔ انھیں اہل فن میں اہمیت بھی اسی مناسبت سے حاصل ہے، اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ ان کی زیادہ تر غزلیں والہانہ تغزل کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

(مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۰ء)

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | وحشت استاد ہیں جگر کے یہاں کہیں کہیں ناہمواری بھی ہے، فن کے لحاظ سے وحشت کا درجہ بلند ہے، مگر جگر ان سے بہت بہتر شاعر ہیں۔

(مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۵ء)

۳۔ ابو جعفر کشفی۔ کراچی | آپ نے فرمائش کی ہے کہ میں حضرت وحشت مرحوم اور جگر صاحب کی غزل گوئی پر اپنی رائے ظاہر کردں اور یہ لکھوں کہ ان دونوں حضرات میں کون تغزل کے اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے میں تعمیلِ فرمائش سوان وجوہ سے قاصر ہوں۔

۱۔ فن عروض میں میری نظر نہایت محدود ہے۔ لہذا قابلِ استناد نہیں۔

۲۔ مدتوں سے میں خود غزل نہیں کہتا۔

۳۔ میں نے جگر صاحب کا کلام کم دیکھا ہے، جو دیکھا ہے وہ پرکھنے کی نظر سے نہیں۔

۴۔ حضرت وحشت مرحوم میرے استاد تھے، میرے دل مین ان کی عظمت بھی ہے اور محبت بھی اور شاید محبت کا عنصر غالب ہے۔

لیکن مین کچھ بنیادی باتین عرض کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اگر آپ ان کو پسند کرین تو خود ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ جائین تغزل کے ارکان مسلمہ یہ ہیں۔

۱۔ سخن یار گفتن اور سخن با یار گفتن۔

۲۔ عشق اور اس کے متعلقات (روایتی عشق نہیں)

۳۔ حسن اور اسکے متعلقات (بازاری حسن نہیں)

۴۔ عاشق کے ذاتی حالات اور شخصی مشاہدات اور دلی جذبات وتاثرات

۵۔ زبان کی شستگی اور بیان کی سلاست۔

۶۔ پست اور مبتذل خیالات، معاملہ بندی اور نقاشئی برہنہ سے ایسا پرہیز کہ شعر ماں بہن کے سامنے پڑھا جا سکے،

۷۔ قوانین عروض کی پابندی۔

ان باتوں کے علاوہ شاعر کا با علم ہونا ضرور ہے ظاہر ہے کہ ایک بے پڑھے لکھے آدمی کے جذبات دلی اور محسوسات تخیلی نہ وسیع ہو سکتے ہیں نہ بلند۔ یہ بھی ضرور ہے کہ شاعر کا نفس اور عمل ارکان اخلاق حسنہ سے ٹکراتے نہ ہوں۔۔۔ عموماً شاعر کے اطوار وعادات کی جھلک اشعار میں ضرور دکھائی دے گی، اس شرط کی پابندی غزل گوئی میں آسان نہیں لیکن یہ یاد رہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" غزل کی نزاکت بد اخلاقی کے بوجھ کی متحمل نہیں۔ میں نے اپنے استادوں سے یہی سنا ہے۔

(مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۹ء)

۴۔ پروفیسر ارشد کاکوی مرحوم ڈھاکہ | جگر کے یہاں تغزل کی جو

نرم ونازک مثالیں ہیں وحشت کے یہاں نہیں، وحشت کے یہاں فن ہے استادانہ رکھ رکھاؤ ہے قدرت کلام ہے، وقار ہے، شکوہ ہے، لیکن تیز داخلیت، شدید کیفیت اور رچا ہوا، تغزل نہیں۔ فن کے اعتبار سے وحشت صاحب کو فوقیت حاصل ہے

ﻪ یہاں کچھ نازیبا الفاظ تھے اسکو قلم زد کر دیا گیا ہے۔

اور یہ اعتبار تغزل، جگر کو۔ (۲۶ مارچ ۱۹۵۹ء)

۵۔ وفیسر اظہر قادری صدر شعبۂ اردو جگن ناتھ کالج ڈھاکا | مولانا وحشت اور جگر

مرادآبادی دونوں کثر غزل گو شاعر ہیں اور اس لحاظ سے تغزل کے بنیادی عناصر دونوں کے یہاں موجود ہیں مگر اس کے باوصف فطری طور پر دونوں کے تغزل میں بڑا بنیادی فرق ہے، یہ فرق دراصل ان کی ذہنی تہذیب و تربیت اور شعوری رجحان کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ ذہنی طور پر وحشت کا تعلق غالب اسکول سے ہے اور اس لیے غالب کی فکری روایت کا غالب ورثہ وحشت کی شاعری کا اہم جزو بن گیا ہے، وحشت نے غالب کی طرز فکر سے جو کسب فیض کیا ہے، اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے انداز تخیل میں ایک طرف بلا کی متانت اور سنجیدگی آگئی ہے اور دوسری طرف انکی فکری کاوشوں میں غیر معمولی نظم وضبط پیدا ہوگیا ہے متانت و سنجیدگی اور نظم وضبط کا یہی وہ احساس ہے جو وحشت کو جگر اور جگر جیسے دوسرے شاعروں سے الگ کرتا ہے۔

اس کے برخلاف جگر کی شاعری دراصل داغ کی شاعری کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہے لیکن انداز بیان کی وہ شوخی اور زبان کا وہ چٹخارا جو داغ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے، اور جس کی بنا پر داغ ہمیشہ زندہ رہیں گے، جگر کے یہاں مفقود ہے، البتہ داغ کے برخلاف جگر کا انداز والہانہ ہے جس کی وجہ سے عوام الناس کے لئے ان کی شاعری میں غیر معمولی کشش اور اپیل پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے یہاں تغزل کے کچھ اشعار ضرور ایسے ملتے ہیں جو بڑے بلند، چوکھے اور معرکے کے اشعار کہے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک زبان و فن کا تعلق ہے وحشت کو اس پر مکمل عبور حاصل ہے وہ فنی مسائل سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تراش خراش اور صحت زبان پر ان کی نظر گہری ہے، جگر کے کلام میں زبان و فن سے بے اعتنائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے،

فنی اعتبار سے ان کا کلام سند کے مرتبے تک مشکل ہی سے پہنچ پاتا ہے۔ اور اس کا احساس خود جگر کو بھی تھا، وہ وحشت کی استادانہ حیثیت کے معترف تھے، اور وحشت کی قادرالکلامی کو بڑی خندہ پیشانی سے صرف تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ مخصوص ادبی نشستوں میں اسکا ذکر بھی کیا کرتے تھے' وہ جب بھی کسی مشاعرے کے سلسلے میں تشریف لاتے تو سب سے پہلے مولانا وحشت سے ملتے۔ ایک مرتبہ جب وہ یہاں آئے اور مولانا وحشت کے یہاں حسب دستور پہنچے تو مولانا وحشت نے از راہ انکسار کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی تو جگر صاحب نے کہا کہ مولانا اگر میں نہ آتا تو تکلیف ہوتی، جگر صاحب جب بھی آتے تو مولانا وحشت کو اپنا تازہ کلام ضرور سناتے اور رائے چاہتے۔ ایک مرتبہ مولانا وحشت کو جگر اپنی غزل سنا رہے تھے، جب وہ اس شعر پر پہنچے۔ ؎

مری نظر نے شب غم انھیں بھی دیکھ لیا		وہ بیشمار ستارے جو جگمگا نہ سکے

تو مولانا نے جگر صاحب سے کہا کہ دوسرے مصرع میں جو جگمگا اصل میں جگمگ ہو جاتا ہے، اور فصاحت کے خلاف ہے اس لیئے "جو" کو "کہ" سے بدل لیجیۓ، جگر صاحب نے فوراً کہا کہ مولانا اسی کا نام استادی ہے، میری نظر اس باریکی تک نہ پہنچ سکی، اسی بنا پر جگر صاحب کی نظر میں مولانا وحشت کی بڑی قدر تھی، اور وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں مولانا وحشت کو اصغر گونڈوی مرحوم کی جگہ سمجھتا ہوں۔

مختصر یہ کہ وحشت کا انداز تغزل متین و سنجیدہ ہے، اور جگر کا والہانہ۔ زبان وفن کے لحاظ سے وحشت کا کلام استاد کی حیثیت رکھتا ہے اور جگر کے یہاں زبان وفن سے بڑی حد تک بے نیازی کا احساس ہوتا ہے، ویسے ذاتی طور پر

میرا خیال ہے کہ وحشتؔ اور جگرؔ میں تقابل ممکن نہیں۔

(۵ دسمبر ۱۹۶۰ء)

۶۔ تلوک چند محروم۔ دہلی | جو سوال آپ نے کیا ہے، اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں
وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ان شعرا میں سے کسی کا کلام پورا نہیں پڑھا، چند غزلیں، ہر ایک کی پڑھی ہونگی اس سے نتیجہ منضبط کرنا خلاف مصلحت ہے۔

(۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

۷۔ تمکین کاظمی مرحوم حیدرآباد دکن | جگر مرادآبادی، اور وحشت کلکتوی دونوں
استاد ہیں، فن پر عروض دانی اور قابلیت اور عام معلومات کی وجہ سے وحشتؔ کو بڑا عبور تھا، جگرؔ اس پایہ کو نہیں پہنچے مگر بہ حیثیت غزل گو دونوں استاد اور اپنے فن کے ماہر اور کامل ہیں۔

یہ مسابقت اور مقابلہ کا طریقہ غلط ہے، ہر شاعر کا انفرادی رنگ ہوتا ہے اس رنگ سے اس کا اندازہ فرمائیے۔ دو شاعروں کو ٹکرا کر ایک کو ابھارنا غلط طریقۂ تنقید ہے۔

(۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

۸۔ مولانا تمنا عمادی مرحوم ڈھاکہ | ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔
بقدر ضرورت فن وہ بھی جانتے تھے یہ بھی جانتے ہیں۔

(۱۰ اگست ۱۹۵۹ء)

۹۔ پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم کراچی | جگرؔ اور وحشتؔ کا کوئی مقابلہ نہیں
جیسے میرؔ اور غالبؔ کے متعلق یہ سوال نہیں ہوسکتا۔

(۷ مارچ ۱۹۵۹ء)

۱۰۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ آپ نے جس بحث میں حصہ لینے کی دعوت دی ہے، اس میں شرکت سے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

(۲ر فروری ۱۹۵۹ء)

۱۱۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم۔ مدیر "ساقی" کراچی | بہ لحاظ فن اور بہ اعتبار تغزل وحشت مرحوم کو جگر پر فوقیت حاصل ہے۔

(۱۰ر اگست ۱۹۵۹ء)

۱۲۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | جگر اور وحشت فن میں دونوں استاد ہیں۔ مگر تغزل میں جگر اور فکر میں وحشت بڑھے ہوئے ہیں۔

(۲۳ر نومبر ۱۹۵۹ء)

۱۳۔ سید طاہر علی شاکر کلکتوی مرحوم۔ کلکتہ | میں ایک معمولی شخص ہوں نہیں معلوم یہ سوال آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ بہرحال تعمیل ارشاد مجھ پر فرض ہے۔

میرے خیال ناقص میں نہ صرف حضرت جگر بلکہ دور حاضر کے تمام اساتذہ میں بہر لحاظ علامہ وحشتؒ کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت جگر میرے کرم فرما ہیں۔ خود ان کا بھی یہی عقیدہ ہے، جس کا کئی ملاقات میں انھوں نے مجھ سے اظہار کیا۔

(۲۰ر نومبر ۱۹۵۹ء)

۱۴۔ سید عابد علی عابد مرحوم۔ لاہور | وحشت کلکتوی کو فوقیت حاصل ہے۔

(مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۵۹ء)

۱۵۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم۔ کراچی | مجھے اس قسم کے مباحث سے مطلق دلچسپی نہیں۔ ایسی بحثوں اور مقابلوں کو میں تضیع اوقات سمجھتا ہوں، جن لوگوں کے پاس وقت بہت ہے اور کام کچھ نہیں، یہ ان کے شوق کی چیز ہے، افسوس میں آپ کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہوں۔

(۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء)

۱۶ مولانا عبدالماجد دریا بادی | سوال میرے لیے مشکل ہو اس لیے اور بھی کہ میں نے وحشت کا کلام بہت کم پڑھا ہے۔ اجمالی طور پر دونوں ہی کو بلند پایہ غزل گو سمجھتا ہوں۔

(۱۲ نومبر ۱۹۵۸ء)

۱۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور | تغزل اور فن کے لحاظ سے جگر کا مقام بلند ہے کسی بھی شاعر یا ادیب کے علمی اور ادبی مقام کا تعین کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

(۷ نومبر ۱۹۵۸ء)

۱۸۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل۔ صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ | آپ کا سوال وضاحت طلب ہے اس لئے کہ "فن اور تغزل" جو دو الفاظ آپ نے استعمال کئے ہیں۔ مختلف اور ایک گونہ متبائن معانی و مفہوم کے حامل ہیں، "فن شعر" اور "تغزل" کو ترقی پسند نقادوں نے اتنی وسعت دے رکھی ہے کہ اس میں ساری دنیا اب ان میں سمائی جا سکتی ہے، میں آپ کے سوال علامہ جمیل مظہری صاحب کو بھی دیئے۔ جواب ملا میں ان کا جواب دینا نہیں چاہتا ہوں۔ وجہ دریافت کی

لیا گیا کہ انصاف اور حقیقت اور مروت اور صداقت کی کشمکش۔ انکا اجتناب واحتراز
باہے میں نے ان کو معاف کر دیا۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے اور میری وجہ
بلا وجہ نہیں ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وحشتؔ کے رنگ تغزل کو جگرؔ اپنا
نہ سکے اور میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وحشتؔ کے کلام میں "تغزل" بہ مفہوم خاص جگرؔ سے
کہیں زیادہ ہے فن کے لحاظ سے بھی وحشتؔ کا پایہ جگرؔ سے بلند ہے۔ ہاں بحیثیت
شہرت" کے وحشت جگرؔ کے گرد کو بھی نہیں پہونچتے۔

(۲۰ مارچ ۱۹۵۹ء)

۱۹۔ قاضی عبدالودود۔ پٹنہ۔ | وحشتؔ اور جگرؔ کا رنگ الگ الگ ہے بحیثیت
مجموعی کسے ترجیح حاصل ہے اس کا فیصلہ ہو بھی سکے تو اس کے لیے پہلے دونوں کے
دواوین کے استیعاب مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ میں نے نہ کیا ہے اور نہ مستقبل
قریب میں اس کا ارادہ ہے۔

(۸ اپریل ۱۹۵۹ء)

۲۰۔ پروفیسر عندلیپ شادانی مرحوم۔ صدر شعبۂ اردو وفارسی ڈھاکا یونیورسٹی | میرے
ایک کرم فرمانے جو وحشت صاحب مرحوم سے بہت خصوصیت رکھتے تھے، اور جگر صاحب
سے بہت خصوصیت رکھتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک مشہور خوش گو شاعر اور صاحب نظر
نقاد ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "بڑے استاد وحشت اور بڑا شاعر جگر"
اور مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔

(۹ فروری ۱۹۵۹ء)

۲۱۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم۔ لاہور | استفسار کا جواب عرض کرنے میں متامل ہوں

اس لیے کہ وثوق سے رائے اس وقت دی جا سکتی ہے جب امور مستفسرہ کے متعلق اتنی واقفیت ہو جس کی بنا پر رائے قائم کرنا خالی از خدشہ نہ رہے۔ میں نے بعض مشہور اساتذہ کا کلام تو ایک حد تک بالاستیعاب پڑھا ہے مثلاً غالب، اقبال، حالی، امیر مینائی، داغ، ذوق، میرانیس، بعض کو جستہ جستہ دیکھا ہے، مثلاً سودا، میر، میر درد، مومن، شیفتہ، ناسخ، آتش وغیرہ لیکن متاخرین کا کلام دیکھنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے ہیں کبھی کبھار کسی رسالے یا اخبار میں کوئی چیز چھپی اور پڑھ لی، ظاہر ہے کہ ایسی سرسری معلومات مستند و محکم رائے کا مبنی نہیں بن سکتیں،

میں نے جگر کے اشعار زیادہ پڑھے ہیں، اگرچہ محلسوں یعنی مشاعروں میں کبھی نہیں سنے اس لیے کہ مشاعروں میں جانے کا عادی میں نہیں، وحشت مرحوم کا کلام بھی بارہا دیکھا ہے، ایک مرتبہ ان سے ڈھاکا میں ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، وہ بڑے پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر تھے، لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ جگر کے اشعار ان سے بہتر ہوتے ہیں یعنی فی الجملہ البتہ فن اور تغزل کی قید کے ساتھ دونوں کے کلام بلاغت نظام کا تقابلی مطالعہ کبھی نہیں کیا، (۱۹ر نومبر ۱۹۵۸ء)

۲۲۔ فراق گورکھپوری۔ الہ آباد | جگر اور وحشت کلکتوی میں فوقیت جگر کو ہے، لیکن وحشت کا کلام بھی بہت قابل قدر ہے، (۸ر فروری ۱۹۵۹ء)

۲۳۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور | وحشت کلکتوی فن اور تغزل کے اعتبار سے جگر مرادآبادی سے کہیں بہتر ہیں۔

(۲۸ر اگست ۱۹۵۹ء)

۲۴۔ چودھری محمد علی ردولوی مرحوم۔ ردولی | رضا علی وحشت مرحوم بہت کہنہ

مشق پختہ گو شاعر تھے، ان کا کلام تحویل حافظہ میں تھا، مگر فالج سب لوٹ کرلے گیا، جگر صاحب کی شاعری کا نمونہ میں نے دیکھا ہے، جب اصغر گونڈوی مرحوم زندہ تھے، تو جگر کے کلام پر اعتنا کم ہوتی تھی، مگر نقاد اس وقت بھی سمجھتے تھے کہ جگر میں کوئی بات ایسی ہے جو اصغر (مرحوم) کو بھی نصیب نہیں، جو شخص خود شاعر نہ ہو وہ شعر کے مشکلات سے کیا واقف ہو سکتا اس لئے مجھ کو جرأت نہیں کہ میں ان دونوں میں مقابلہ کروں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اگر میں شاگرد ہوتا تو وحشت مرحوم کا شاگرد ہوتا اور شعر جگر کے رنگ میں کہتا۔

(۱۴ر نومبر ۱۹۵۸ء)

۲۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم۔ حیدرآباد (دکن)، وحشت اور جگر اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ جگر کے کلام کو ان کے طرز ادا اور پڑھنے کے انداز نے اور زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

(۳ر مارچ ۱۹۵۹ء)

۲۶۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور، (صدر شعبۂ فارسی' اردو و عربی پنجاب یونیورسٹی، کیمپ کالج۔ نئی دہلی

وحشت کلکتوی کو فن کے لحاظ سے کامل فن کہا جاسکتا ہے۔ جگر مرادآبادی اصولِ فن کے زیادہ پابند نہیں، وحشت کا کلام پختہ اور استادانہ ہے مگر اس میں جدتِ افکار کی کمی پائی جاتی ہے، یعنی وہی مضامین جو مدت سے بندھتے چلے آرہے تھے، ان کے کلام میں بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں، جگر کے افکار میں تازگی کے علاوہ وسعت بھی ہے' فن اور صحتِ زبان کے اعتبار سے وحشت کا رتبہ بلند ہے۔ اور جدتِ فکر کے لحاظ سے جگر بڑھے ہوئے ہیں'

تغزل دونوں کے کلام میں رچا ہوا ہے، فرق اتنا ہے کہ وحشت کا تغزل روایتی اور جگر کا انفرادی ہے،

(۵ مارچ ۱۹۵۹ء)

۲۷۔ نصیر الدین ہاشمی مرحوم، حیدرآباد دکن | وحشت کلکتوی کو فن کے لحاظ سے اور جگر مرادآبادی کو تغزل کے لحاظ سے میں ممتاز تصور کرتا ہوں،

(۳۱ اگست ۱۹۵۹ء)

۲۸۔ علامہ نیاز فتحپوری مرحوم۔ مدیر ماہنامہ نگار لکھنؤ | فن اور تغزل کے لحاظ سے وحشت کا شمار اساتذہ میں ہے، اور جگر کا محض اچھے شعراء میں،

(۲ اگست ۱۹۵۹ء)

کیا بیدل، عظیم آبادی نہ تھے؟

از

از جناب احسن الظفر صاحب ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

"بیدل کے وطن کے بارہ میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک محققانہ مضمون معارف میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں بھی اس سلسلہ میں بعض مفید معلومات ہیں، اس لئے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔" "م"

مرزا عبدالقادر بیدل کا شمار ہندوستان کے عظیم ترین فارسی گو شاعروں میں ہوتا ہے، بیدل سنہ ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے، اور سنہ ۱۱۳۳ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ بیدل کی جائے پیدائش عرصہ سے موضوع بحث رہی ہے، اور ابھی تک دانشوروں کے حلقے میں ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت اسے حاصل ہے، اس مضمون میں اس مختلف فیہ مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکرہ نویسوں میں شیر خاں لودی بیدل کے معاصر ہونے کے علاوہ اُن کے دوست بھی رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں: "وہ (بیدل) ہندوستان میں نشوونما پائے"[1]، بندرابن داس خوشگو، بیدل کے شاگرد اور ارادتمند، جنھوں نے اپنے بیان کے مطابق ایک ہزار دفعہ سے زیادہ بیدل کی صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے، اور مرزا بیدل کے حالات نسبتہً زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں، لکھتے ہیں، "بیدل اکبرآباد کے رہنے والے تھے"، مزید لکھتے ہیں، طاہر نصرآبادی نے جو اُن کے وطن کے سلسلے میں

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۵۹،

ھا ہے کہ لاہوری ہیں، اس کی کوئی بنیاد نہیں[۱]" مرزا قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں "بیدل ایرانی الاصل ی[۲] نظامی بدایونی لکھتے ہیں: "بیدل کا اصلی وطن توران ہے، اور بخارا میں پیدا ہوئے[۳]"

ان اقوال کے مقابلے میں تذکرہ نگاروں کی اکثریت بیدل کو "عظیم آبادی" لکھتی ہے، ان ں میر غلام علی آزاد بلگرامی سرفہرست ہیں، جو خوشگو کے بیان سے بھی واقف تھے[۴]، ان کے علاوہ ملی ابراہیم خان خلیل[۵]، حسین قلی خان[۶]، قدرت اللہ گوپاموی[۷]، بھگوان داس ہندی[۸]، عبدالغنی[۹] ور عبدالوہاب افتخاری[۱۰] وغیرہ ہیں:-

بیدل کی نثری تصنیف "چہار عنصر" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر ہندوستان ہی میں رہے کبھی بیرونی ملک کا دورہ نہیں کیا۔ اپنی جائے پیدائش کے سلسلے میں وہ کوئی واضح بیان نہیں دیتے، البتہ کچھ اشارے ملتے ہیں جن سے ایک نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے، یہ اشارے درج ذیل ہیں:

بیدل دورِ طفولیت میں اپنے چچا مرزا قلندر کے ہمراہ رانی ساگر گئے، اور وہاں سے سرائے بنارس پہونچے، یہ دونوں قصبے اس وقت آرہ (بہار) اور شاہ آباد ضلع میں پڑتے ہیں۔ وہاں سے آرہ آئے[۱۱] ۱۰۶۹ھ میں اپنے چچا مرزا قلندر اور مرزا عبداللطیف کے ہمراہ ترہت میں مقیم تھے، مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج میں ایک دستہ کے کمانڈر تھے، شجاع کی فوج جب اورنگ زیب کی فوج سے آویزش کے بعد ہار گئی تو مرزا عبداللطیف بھی انتشار کے شکار ہو کر ایک طرف کو بھاگے، مرزا بیدل ان کے ہمراہ حیران و سرگرداں پٹنہ پہونچے، اور وہاں سے چاند پور آئے[۱۲] چاند پور پٹنہ کے پاس ہی واقع ہے چند دنوں بعد مقام "مسی" پہونچے[۱۳] مسی چمپارن ضلع کا ایک قصبہ ہے ۱۰۷۰ھ میں مرزا قلندر کے ہمراہ

---

[۱] سفینۂ خوشگو دفتر ثالث ص ۱۰۳ [۲] مجموعۂ نغز [۳] قاموس: مشاہیر ج ۱ ص ۱۲۶

[۴] خزانۂ عامرہ ص ۱۵۲ [۵] صحف ابراہیم ص ۱۴۳ [۶] نشتر عشق ص ۲۱۲ [۷] تاریخ الافکار [۸] سفینۂ ہندی ص ۲۸ [۹] تذکرۃ الشعراء ص ۲۹ [۱۰] تذکرہ بینظیر [۱۱] کلیات بیدل نولکشور ص ۳۲ [۱۲] ایضاً ص ۵۵۱ [۱۳] ایضاً ص ۵۶۲

بنگال روانہ ہوئے،

اس ترتیب سے بیدل ۱۶ سال کی عمر تک بہار میں تھے، اُن کی زندگی کا یہ دور رانی ساگر آرہ، سرائے بنارس، ہسی، ترہت اور پٹنہ کے اردگرد گذرا، یہ سارے علاقے صوبہ بہار ہی میں واقع ہیں، اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہی میں سے کسی ایک جگہ پیدا ہوئے اور وہ جگہ عظیم آباد (موجودہ پٹنہ) کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے اطراف کا تذکرہ بطور سیرگاہ کے آیا ہے۔ شاد عظیم آبادی نے "نوائے وطن" میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے دعویٰ کی تائید کرتا ہے :۔

"جو نقلیں اپنے اگلے بزرگوں سے سنی ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ مرزا صاحب خاص عظیم آباد کے رہنے والے تھے، اور پنڈ اہی محلہ اُن کا مسکن تھا"[۵]

جس زمانے میں ناچیز کا قیام پٹنے میں تھا، وہاں کے دانشوروں کے سامنے یہ موضوع رکھا جس کا ماحصل درج ذیل ہے :۔

سب سے پہلے قاضی عبدالودود صاحب سے ملاقات کی، موصوف کا شمار ہندوستان کے مشہور محققوں میں ہوتا ہے، خصوصاً فارسی اور اردو ادبیات اور تاریخ پر اُن کی اچھی نظر ہے، انھوں نے فرمایا،

"اس سلسلے میں نقل سے زیادہ ہمیں اپنی عقل پر اعتماد کرنا چاہئے، اتنی بات مسلم ہو کہ تذکرہ نویسوں میں صرف ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو براہ راست نقل کرتا ہے باقی نقل در نقل کرتے ہیں، یہاں بھی دیکھنا ہوگا کہ براہ راست نقل کرنے والا کون ہے، ایسا آدمی صرف خوشگو نظر آتا ہے جس نے بقول خود ایک ہزار دفعہ سے زیادہ مرزا کی صحبتوں میں حاضری دی، اور استفادہ کیا، وہ بیدل کو "اکبرآبادی" لکھتا ہے، جب کہ غلام علی

---

[۵] بیدل نے شاہ یکہ آزاد کے حالات کے سلسلہ میں ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے "جن دنوں قصبہ آرہ میں ہمارا اتفاقی قیام تھا" کلیات بیدل ص ۳۱۹، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب مقامات میں گردش کیا کرتے تھے[۶] نوائے وطن ص ۷۰

آزاد اور دوسرے تذکرہ نگاروں کو ایک دفعہ بھی بیدل سے ملاقات نصیب نہیں ہوئی ہے، وہ انھیں عظیم آبادی لکھتے ہیں، آپ خود ہی انصاف کیجیے کس کی بات زیادہ قابلِ اعتماد ہوگی رہے، شاد جنھوں نے محلے تک کی تعیین کر دی ہے، تو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے بہت سی جگہ غلطیاں کی ہیں، یہاں صرف وطن پرستی کے جذبے سے کام نہیں چلے گا، تذکرہ نگاروں کے ہر قول کو عقل و فہم کے ترازو میں تولنے کی ضرورت ہے۔"

قاضی عبدالودود صاحب کے بعد پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی کی خدمت میں حاضر ہوا، کاکوی صاحب پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ فارسی اور فارسی و عربی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر ہیں، بیدل اُن کا خاص موضوع رہا ہے، اور اس سلسلے میں اُن کی معلومات نہایت وسیع اور عمیق ہیں، انھوں نے "حیرت زار" نام کی ایک کتاب بھی لکھی ہے غرض قاضی عبدالودود صاحب کی ملاقات کی ساری تفصیلات اُن کے سامنے رکھیں، جناب کاکوی صاحب نے فرمایا:-

"جس شاعر کو اکثر تذکروں میں عظیم آبادی لکھا گیا ہے اگر وہ بطور مسافرت کبھی اکبرآباد یا دہلی پہنچا ہے، تو اُسے اکبرآبادی یا دہلوی نہیں کہا جا سکتا، جس طرح کوئی اکبرآبادی ہو اور کبھی عظیم آباد آجائے تو اُسے عظیم آبادی نہیں کہا جا سکتا، غلام علی آزاد نے اپنے تینوں تذکروں (سروِ آزاد، خزانۂ عامرہ، یدِ بیضا) میں بیدل کو "عظیم آبادی" لکھا ہے، جبکہ خوشگو کے بیان سے باخبر تھے بلکہ خوشگو نے اپنا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" آزاد ہی کے حسبِ ہدایت لکھا ہے اس کے باوجود وہ بیدل کے عظیم آبادی ہونے پر کیوں مصر ہیں، ؟

پروفیسر میر حسن شاہ صدر شعبۂ فارسی کابل یونیورسٹی اپنے ایک مقالہ بعنوان "بیدل" میں جو مجلۂ ادب کابل میں چھپا ہے، لکھتے ہیں:-

"دہلی کو اس لحاظ سے بیدل کا وطن کہہ سکتے ہیں کہ بیدل نے آخری دورِ حیات میں وہیں قیام کیا ہے"[۵۱]

لیکن وطن اگر جائے پیدائش کا نام ہے تو دہلی کو وطن نہیں کہا جا سکتا، ورنہ جہاں کہیں بھی زندگی کا کوئی مخصوص دور گزرا ہے، اسے اس لحاظ سے وطن کہا جا سکتا ہے،

اوپر کی تفصیل سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بیدل کے ایام طفولیت ۲۰ سال کی عمر تک بہار کے مختلف علاقوں اور شہروں میں گذرے ہیں، انہی حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے مشہور محقق علامہ سید سلیمان ندوی نے کسی مخصوص جگہ کی قید لگائے بغیر لکھا ہے کہ:-

"بیدل کا مولد و منشاء بہار رہا ہے، ان کا بچپن اور جوانی کا دور یہیں گذرا ہے"[۵۲]،

بیدل کی زندگی کا پہلا دور جب متفقہ طور پر بہار میں گذرا ہے، تو یقیناً انہی مقامات میں سے کسی جگہ وہ پیدا ہوئے ہیں، اور وہ عظیم آباد کے سوا دوسری جگہ اس لئے نہیں ہو سکتی کہ کم از کم کوئی بھی تذکرہ نویس خصوصاً بہاری تذکرہ نویس مثلاً علی ابراہیم خاں خلیل صاحب "صحف ابراہیم" اور حسین قلی خاں صاحب "نشتر عشق" اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے،

رہا خوشگو کا بیان جسے قاضی ودود صاحب مستند تر سمجھتے ہیں، تو وہ غلط فہمی پر مبنی ہے،

---

[۵۱] مجلۂ ادب کابل سال نزدہم ۱۳۵۰ ش ۔ [۵۲] نقوش لاہور شخصیات نمبر ص ۱۳۴۱،

کیونکہ اس قدر قریب تعلق کے باوجود خوشگو نے مرزا کے بعض حالات غلط لکھے ہیں جن کا اندازہ چہار عنصر سے مقابلہ کرنے پر ہوتا ہے، مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو، خوشگو لکھتے ہیں:۔

چوں از رضاع برآمد، و قدم بہ پنج سالگی واشت، زبان راکہ از اعضا رئیسۂ انسانست بختم کلام مجید تازگی بخشیدہ، و در اواسط ہماں سال مرزا عبد الخالق رخت ہستی بربست .... در سال ششم از صدر عمر از خدمت والدہ ماجدہ حروف تہجی آموخت[1]	جب شیر خوارگی کی حد سے باہر نکلے، اور پانچویں سال میں قدم رکھا، زبان کو، جس کا شمار انسان کے اعضائے رئیسہ میں ہوتا ہے، قرآن مجید ختم کرکے تازگی بخشی، اسی سال کے وسط میں (یعنی ۵ ½ کی عمر میں) مرزا عبد الخالق کا انتقال ہوا .... چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ سے حروف تہجی سیکھے،

مرزا بیدل لکھتے ہیں:۔

"باندک تحریکے از نسیم فرصت والد مجازی بسیر گلشن حقیقت شتافت .... زمانے	نسیم فرصت کے معمولی جھونکے سے والد مجازی چمن حقیقت کی تفریح کو روانہ ہوئے، ....

[1] سفینۂ خوشگو دفتر ثالث ص ۱۰۵

"چند بوضع بے سرو پائی گذشت،
در مبادی شہر سادسہ از سال
سادس والدہ مشفقہ ......
......استفادۂ خدمت
اساتذہ میروش معنی گردید
و باستفہام ابجد تہجی عنان توجہ
منعطف گردانید..........
با مداد تربیتش ہفت ماہ تردد
انفاس توام ورق گردانی بود
.... درنہایت حول
مسطورمیت فضل و اہب العطیات
زبان عجز بیان را باختتام قرآن
مجید فائز گردانید....[۵۱]"

کچھ دنوں کیف ما اتفق زندگی
گذاری، چھٹے سال کے چھٹے مہینے
کی ابتدا (چھ سال پانچ مہینے
اور چند دن کی عمر) میں مادر
مہربان اساتذہ کی خدمت میں
استفادہ کے لئے فرشتہ معنی ثابت
ہوئیں (اساتذہ کی طرف رجوع
کیا) اور حروف تہجی کی شناخت پر
اپنی توجہ مرکوز کی..........
ان کے زیر تربیت سات مہینے تک
نفس کی آمد و شد کتاب کی ورق
گردانی سے ہم آہنگ رہی....
.... درج بالا سال کے آخر
میں خدا کے فضل و کرم سے زبان
عجز بیان کو قرآن مجید ختم کرکے
مشرف کیا،

مرزا بیدل اور خوشگو کے اقتباسات کا تقابلی مطالعہ کیجئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ:

۵۱؎ کلیات بیدل ص ۳۰۰ - ۳۰۱

بیدل	خوشگو
۱- والد کی وفات جب ہوئی جب کہ بیدل کی عمر تقریبًا پانچ سال تھی،	۱- والد کی وفات اس وقت ہوئی، جب کہ بیدل کی عمر ساڑھے پانچ سال کی تھی،
۲- والدہ نے اساتذہ کی طرف رجوع کیا،	۲- تعلیم کے لئے پہلے والدہ نے اپنے پاس بٹھایا،
۳- قرآن پورے سات سال کی عمر میں ختم کیا،	۳- قرآن پانچ سال کی عمر میں ختم کیا،

لہذا خوشگو کے سارے بیانات کو آنکھ بند کر کے نہیں ماننا چاہئے، زیادہ سے زیادہ پروفیسر میر حسن کی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبرآباد بیدل کا وطن اس لحاظ سے ہے کہ اُس نے زندگی کے کچھ دن وہاں گذارے ہیں، اگر وطن اسی کا نام ہے، تو پھر اکبرآباد اور دہلی ہی کیوں، متھرا، بنارس، میوات، کٹک، حسن ابدال، پٹنہ، ترہٹ اور بہار کے تمام وہ قصبات جہاں زندگی کے مختلف ادوار گذرے ہیں سب کو وطن کہنا چاہئے،

مطبوعات جدیدہ

اخلاق الوزیرین، (عربی) تالیف ابوحیان علی بن محمد توحیدی تحقیق وتحشیہ محمد بن تاویت طنجی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ المجمع العلمی العربی دمشق

ابوحیان علی بن محمد توحیدی چوتھی صدی ہجری کا نامور عربی مصنف اور مشہور ادیب و انشاپرداز تھا، یہ اس کی اہم اور ادب ومحاضرات کی بلند پایہ کتابوں میں ہے، اس میں اس نے آل بویہ کے دو ممتاز انشاپرداز وزیروں کی اس لیے ہجو لکھی ہے کہ جب وہ ان کے پاس بغداد سے رے پہنچا تو انھوں نے اس کی کوئی پذیرائی اور قدردانی نہ کی۔ اس میں اس نے انکے بعض محاسن وکمالات بھی لکھے ہیں لیکن اصلاً مثالب بیان کئے ہیں، اور جاحظ وغیرہ کی طرح بات میں بات پیدا کرکے دوسری گوناگوں دلچسپ ومفید وحکیمانہ باتیں بھی قلمبند کی ہیں، مقدمہ میں مصنف نے دونوں کی مذمت تحریر کرنے کے جواز اور اسباب پر بڑی دلچسپ گفتگو کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح محسن کو ملامت کرنا ناروا ہے اسی طرح بدسلوکی کرنے والے کی مذمت کرنا مناسب ہے، پوری کتاب نہایت دلچسپ اور شعر وادب کے نکات پر مشتمل ہو مصنف کی انتہاپسندی اور مبالغہ آرائی سے قطع نظر ہر جگہ اس کی ذہانت وطباعی تخیل کی ندرت، استدلال کی قوت اور زور بیان کے دلآویز نمونے موجود ہیں، غالباً اس کتاب کا ایک ہی قلمی نسخہ استنبول کے کتب خانہ اسعد آفندی میں پایا جاتا ہے، محمد بن تاویت طنجی نے اس کو تصحیح وتحشیہ کے بعد شائع کیا ہے،

شروع میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس میں کتاب کے نام اور سبب تصنیف وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، اور حاشیہ میں حوالوں کی تخریج، لغات کی تحقیق اور اسماء اعلام کے مختصر تراجم قلمبند کئے گئے ہیں۔ آخر میں آٹھ مختلف فہرستیں دی گئی ہیں، اس ادبی وعلمی کتاب کی اشاعت پر فاضل مرتب اور المجمع العلمی العربی دمشق دونوں شکریے کے مستحق ہیں۔

۔۔۔۔۔ پا جا سراغ زندگی۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ پتہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنو۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم کے تعلیمی سال کے آغاز و اختتام پر عموماً طلبہ سے خطاب کرتے ہیں، یہ رسالہ ان ہی خطابات کا مجموعہ ہے، دو تقریروں میں دارالعلوم دیوبند اور ایک میں جامعہ رحمانیہ مونگیر کے طلبہ سے خطاب کیا گیا ہے، ایک مختصر تقریر میں مولانا مسعود علی ندوی مرحوم سابق منیجر دارالمصنفین کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس کے سوا سب تقریروں کا موضوع یکساں ہے یعنی طلبہ کے اصلی فرائض، عالمانہ و داعیانہ ذمہ داریاں، موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہونے اور عصری فتنوں کا مقابلہ کرنے کی صورتیں اور تدبیریں وغیرہ اس سلسلہ میں عربی مدارس کے مقاصد اور علم دین کی اہمیت وعظمت واضح کرکے طلبہ کو احساس کمتری اور پست ہمتی دور کرنے اور عالی حوصلگی اور محنت وجفاکشی اختیار کرنے کی تلقین بھی کی ہے، اس لئے یہ مجموعہ عربی کے طلبہ کے لیے لائحہ عمل اور عربی درسگاہوں سے وابستہ افراد کے لئے ایمان، اخلاص، ایثار، علوے ہمت اور استغنا کا درس ہے، ہر تقریر میں فاضل خطیب کی دلسوزی، دردمندی اور ایمانی احساس نے بڑی کیفیت پیدا کردی ہے، یہ تقریریں پہلے بھی چھپ چکی تھیں، مگر اب افادہ عام کے

خیال سے انکا مجموعہ شائع کیا گیا ہے، اس کے لئے انجمن طلبات سابق ندوہ عام عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے شکریے کے مستحق ہیں۔

لینن ۔ تصنیف رابرٹ کنکوئسٹ ترجمہ جناب جلیس عابدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۸ قیمت ۴؍ نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری، مارکیٹ دریا گنج، دہلی،

اس میں لینن کی غیر معمولی، اور عہد ساز شخصیت کا مرقع اور اس کے حالات و خیالات اور انکار و اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں پس منظر کے طور پر اس عہد اور ماحول کا ذکر ہے، جس میں اس کی نشو و نما اور ذہنی پختگی ہوئی تھی پھر سامراج و سرمایہ داری کے خلاف اس کی جدو جہد، ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں اس کی سرگرمیوں حکمراں کی حیثیت سے اس کے زوال اور اس کے ان فکری و نظری اثرات کو بیان کیا گیا ہے، جو اس نے اپنے بعد چھوڑے تھے، آخر میں لینن کے بارہ میں اس کے پرستاروں کی مبالغہ آمیز رائیں اور اس پر لکھی گئی، بعض اہم کتابوں اور مضامین کی فہرست دیگئی ہے۔ اس کتاب میں لینن کے اصلی درجہ اور اس کی صحیح تصویر کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور اس کے واقعی کمالات اور حقیقی کارناموں کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اور اس کی فکری و نظری خامیوں اور آمرانہ ذہنیت کو بھی دکھایا گیا ہے۔ اس سے اس کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا مختصر خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ نیشنل اکیڈمی کی دوسری مترجم کتابوں کی طرح اسکا ترجمہ بھی شگفتہ ہے۔

"ض"

.....ــــ.....

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵/ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح بڑے خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملّی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملّی و قومی و سیاسی و علمی وادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیام دارالمصنفین، سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۷ روپیے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

ستمبر ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

عدد ۳

ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۴ء

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بڑی خامی ہے کہ وہ وقتی جوش میں آکر ایک مرتبہ بڑی سے بڑی قربانی کرسکتے ہیں مگر کسی معاملہ میں متحد اور منظم ہوکر مسلسل جدوجہد نہیں کرسکتے، حالات کی ناسازگاری نے اُن کو اور بھی پست ہمت بنا دیا ہے، ہر حال میں قناعت یا حکومت کا شکوہ ان کا مزاج بن گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کو جو دستوری حقوق حاصل ہیں یا جو دوسری اقلیتوں کے طفیل میں مل جاتے ہیں اُن سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے، مثلاً اب مرکزی اور اترپردیش کی حکومتوں نے پہلے کے مقابلہ میں اردو کو بہت سی تعلیمی سہولتیں دی ہیں اور اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کو قومیانے سے مستثنیٰ کردیا ہے، گو یہ رعایتیں اردو والوں کے مطالبہ کے مقابلہ میں بہت کم ہیں لیکن اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو اُردو کو بنپنے کا موقع مل سکتا ہے، اسلئے مسلمانوں کو اُن سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے، اپنے بچوں کو اردو میڈیم میں تعلیم دلائیں، اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کریں، قائم شدہ اسکولوں اور کالجوں کے پرائمری سیکشن میں اردو میڈیم میں تعلیم دیں، اونچے درجوں میں ہر درجہ میں ایک سیکشن اردو میڈیم کا قائم کریں، یہ اُن کا مانا ہوا حق ہے، اس میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، مسلم درسگاہوں میں اسلامی روایات کا پورا احترام کیا جائے، اس سے اردو زبان اور مسلمانوں کی تہذیب وروایات دونوں کا تحفظ ہوجائے گا،

اگر وہ اتنا بھی نہیں کرسکے تو پھر اُن کو حکومت کی شکایت اور اپنی زبان وتہذیب کے تحفظ کے مطالبہ کا کیا حق ہے، اور مسلم اور غیر مسلم یا سرکاری تعلیم گاہوں میں کیا فرق رہ جائے گا، اور اس کا خطرہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا تو آیندہ چل کر حکومت یہ کہہ سکتی ہے کہ جب

ماحول کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم اسکولوں اور کالجوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر اُن کی
یت کیوں قائم رکھی جائے، یہ صحیح ہے کہ ابھی تک حکومت کے تمام محکموں میں فرقہ واریت
ہے اس لئے ان سب امور میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی لیکن جب حکومت صراحت کے ساتھ
ق کو مان چکی ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلہ نے معاملہ کو بالکل صاف کر دیا ہے تو ان
کے حصول میں زیادہ دشواری نہ ہو گی۔ مگر جائز حق بھی جد و جہد کے بغیر نہیں ملتا، اس لئے
لات کا مقابلہ بہر حال کرنا پڑے گا لیکن آخر میں مسلمانوں کو کامیابی ہو گی، اپنے جائز
ستوری حق کے لئے لڑنا فرقہ واریت نہیں بلکہ جمہوریت، سیکولرزم اور ملک کی بہت بڑی
ہے، جن اداروں کو اس سلسلہ میں کوئی دشواری پیش آئے وہ ظفر احمد صاحب صدیقی انجمن
دین گوین روڈ لکھنؤ کی طرف رجوع کریں، انھوں نے تعلیمی اداروں کے حقوق اور اُن کے
کے طریقوں پر پورا لٹریچر جمع کر دیا ہے، اُس کو بھی منگا کر مطالعہ کرنا چاہئے،

اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کی آزادی قابل ستائش ہے لیکن مسلمانوں کا سب سے بڑا اور مرکزی
دارہ جس کے فیض سے یہ سارے ادارے قائم ہوئے، اب تک اس سے محروم ہے، حالانکہ
ن کی جمہوریت اور سیکولرزم اور فیاضی کا سب سے بڑا امتحان مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ ہے، افسوس ہے
نام نہاد مسلمانوں کے مشورے سے حکومت نے یہ غلط قدم اٹھا دیا جس کا مسلمانوں پر بڑا
اثر پڑا، اس غلط فیصلہ پر قائم رہنا دوسری غلطی اور تدبر کے سراسر خلاف ہوگا، حکومت اب
لم یونیورسٹی ایکٹ میں مسلمانوں کے حسب منشا ترمیم کرکے اسکی تلافی کر سکتی ہے، اس کے
مطمئن نہیں ہو سکتے،

دارالعلوم ندوۃ العلماء محض ایک دینی درسگاہ نہیں، بلکہ دینی تعلیم کی تجدید و اصلاح اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق علم و دین کی خدمت کی ایک مستقل تحریک ہے، جس سے کم و بیش ہندوستان کے سارے دینی مدارس اور اسلامی اور علمی ادارے متاثر ہوئے، ان مقاصد کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ایک زمانہ میں ہندوستان کے مختلف مرکزی شہروں میں اس کے سالانہ جلسے بڑے دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے، جن میں ہندوستان کے نامور علماء و مشاہیر شریک ہوتے تھے، مگر مختلف اسباب خصوصاً ملک کے ناسازگار حالات کی بنا پر برسوں سے اُن کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، اب ندوہ کی روز افزوں توسیع و ترقی کے ساتھ ان کو دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ ہے، لیکن اب اسلامی ملکوں میں ندوہ کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شہرت اور تعلقات کی بنا پر ندوہ ہندوستان کے اندر ہی نہیں محدود رہ گیا ہے، بلکہ اس کی شہرت اسلامی ملکوں تک پھیل چکی ہے اور اس کی حیثیت دنیائے اسلام کی ایک مرکزی درسگاہ کی ہوگئی ہے، چنانچہ اس وقت مختلف اسلامی اور عرب ملکوں کے طلبہ ندوہ میں زیر تعلیم ہیں، اس لئے اسی پیمانہ پر جلسہ کرنے کا بھی خیال ہے جس میں ہندوستان کے علاوہ اسلامی دنیا کے علماء اور اہل علم بھی مدعو کئے جائیں گے، اس لئے دینی تعلیم اور موجودہ عہد کے دینی مسائل کے متعلق اُن کے خیالات اور تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا، اس کے مصارف کا تخمینہ تین لاکھ روپئے ہے۔ اگر حالات سازگار رہے، اور مطلوبہ رقم فراہم ہوگئی تو فروری یا مارچ تک جلسہ ہوگا، ہم کو امید ہے کہ مسلمان اس کارِ خیر میں اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کریں گے، اور سرمایہ کی فراہمی میں پورا حصہ لیں گے،

مقالات

عہد ہشام کا سندھ
۷۲۴ تا ۷۴۳ء

از جناب ڈاکٹر عبد الباری صاحب لکچرار شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(الف) عرب سیاسی اور جنگی پالیسیوں کا ایک تحقیقی جائزہ۔

(ب) سندھ میں عرب اقتدار کے تہذیبی ورثے۔

(الف) ہندوستان کی تہذیبی قدامت سے ہم آپ سب اچھی طرح واقف ہیں، اس ملک کے مغربی کنارے پر واقع سندھ کی وادی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں (قریب ...۵ سال ق،م) کی آماجگاہ رہی ہے، تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ یہاں سولہ قوموں نے اپنے تمدنی اور ثقافتی اثرات ثبت کیے ہیں[1]، موہن جوڈارو کے کھنڈرات کے انکشاف نے ایسے تاریخی شواہد پیش کیے ہیں کہ ہمیں باور کرنا پڑتا ہے کہ اس خطۂ ارض پر ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب تہذیب کی دوڑ میں ہم یہاں کے باشندوں کو دیگر اقوام عالم سے پیچھے نہیں پاتے ہیں[2]، خوش قسمتی ہے کہ اسلامی تمدن نے بھی، سرزمین ہند

---

[1] انسائیکلوپیڈیا امریکیہ جلد ۲۵، ص ۳۲ نیویارک ؁۱۹۶۶ء؛ گریرسن: لنگوسٹک سروے آف انڈیا ج ۸، قسم ۱، ص ۳، کلکتہ ؁۱۹۱۹ء [2] دی آرین کلچرس آف انڈیا اینڈ ایتھنولوجیکل بیک گراؤنڈ آف اسلام: ہیرن عمر رولف امر نفلس، اسلامک کلچر ج ۱۳ نمبر ۲ ص ۱۸۳، اپریل ؁۱۹۳۹ء حیدر آباد۔

میں اسی زرخیز وادی میں برگ و بار پیدا کیے جس سے عرب و ہند کے روابط کا ایک ایسا چمن وجود میں آیا جو آج بھی سرسبز و شاداب ہے،

سندھ میں عربی اقتدار کے زمانے میں اسلامی کلچر کے جو دوررس اثرات مرتب ہوئے انکی اہمیت پر مسلم و غیر مسلم علماء و مورخین نے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" اسکا بیش بہا نمونہ ہے، خالص تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی اولین فاتح سندھ محمد بن قاسم کے کارناموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلے میں پروفیسر محمد حبیب کا کام بڑا وقیع ہے[1]، مگر اسکے باوجود ابھی اسکی تاریخ کے گوشے دھندلکے میں گھرے ہوئے ہیں انکی تحقیق کے لیے ضرورت ہے کہ عربی ماخذ کے ساتھ ساتھ جہانتک ممکن ہو مقامی ماخذ سے بھی پورا کام لیا جائے، اور مستشرقین کی تاریخی کتب بھی پیش نظر رکھی جائیں، میں نے اپنے اس مقالہ میں اسی رخ پر ایک حقیر سی کوشش کی ہے،

میرے نزدیک عربی ماخذوں میں سب سے اہم اور مستند بلاذری کی "فتوح البلدان" ہے، اسکے علاوہ میں نے طبری، قرطبی، مسعودی اور دیگر عرب مورخوں اور جغرافیا دانوں کی کتابوں سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور ہند کی تاریخ سے متعلق مستشرقین کے تنقیدی نظریات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور قدیم و جدید ہندوستانی تاریخ اور چینی سیاحوں کے سفرناموں سے بھی واقعات کی تطبیق میں فائدہ اٹھایا ہے، اس سلسلے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اسکا اندازہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو ہوگا، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی منضبط تاریخ نہیں ملتی، اس دور کی کتابوں میں تاریخی واقعات کا تسلسل قائم رہتا ہے اور نہ مکمل تاریخی شواہد ملتے ہیں، قدیم کتبوں اور پلیٹوں سے البتہ بڑی حد تک رہنمائی ملتی ہے، محمد بن قاسم جیسی تاریخ ساز شخصیت ہی کو لے لیجئے، تاریخ کی کتابوں میں وہ محض ایک فاتح نظر آتا ہے، جو سندھ کی وادی کو سرنگوں کرتا ہے، اسکے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کا کام ختم اور عربوں کا اقتدار ہندوستان سے اٹھ چکا، نہ ان کا کوئی کارنامہ باقی ہے، اور نہ کوئی تہذیبی ورثہ،

---

[1] دیکھیے اسلامی کلچر، حیدرآباد جلد ۳، جنوری و اکتوبر ۱۹۲۹ء

مگر جب ہم حقیقت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ عربوں کی حکومت سندھ سے کبھی ختم نہیں ہوئی، بلکہ مستقل طور پر انگریزوں کے برسر اقتدار آنے تک برابر قائم رہی۔[1]

اس سلسلہ میں سب سے بڑی ضرورت اس غلط فکر کی تردید ہے کہ عربوں کا حملہ حصول زر اور ملک گیری کے لیے ہوا تھا، میرے نزدیک محمد بن قاسم کی فتوحات اور اس کے بعد عہد ہشام کی پیش قدمیوں کا سبب ملک گیری اور زر کی ہوس نہ تھی، بلکہ سندھ میں محمد بن قاسم نے دراصل عرب و ہند کے دائمی تعلقات کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور عہد ہشام میں ان ہی بنیادوں پر ایک ایسا حسین اور پائیدار پل تعمیر ہوا جس سے تیرہ سو برس قبل سے لیکر آج تک اسلامی دنیا اور برصغیر ہند کے درمیان تمدنی و ثقافتی لین دین تسلسل کے ساتھ جاری ہے، اور مستقبل میں بھی جاری رہنے کے امکانات روشن ہیں۔ انسان کی فلاح و بہبود کی جو انقلابی تحریک اسلام نے چلائی اس کی رو جس طرح عربوں نے اہل فارس، اہل روم اور اہل مصر و مغرب تک پہنچائی، اسی طرح سندھ کے راستے رو اہل ہند تک پہنچی اور آہستہ آہستہ ان کے رہن سہن اور انداز فکر میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔

حیرت ہوتی ہے جب مستشرقین کا ایک طبقہ خصوصیت سے لین پول اور فاضل مورخین میں ایشوری پرشاد جیسی شخصیتیں یہ کہتی ہیں کہ "ہند کی تاریخ میں عربوں کی فتوحات محض ایک افسانہ ہے اور اسلامی تاریخ میں ان کارناموں کو نتیجہ خیز نہیں شمار کیا جا سکتا"۔[2]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا امریکہ، جلد ۲۵، ص ۳۲، نیویارک ۱۹۶۶ء [2] ایشوری پرشاد: ہسٹری آف میڈیاول انڈیا، ص ۶۶ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۶ء

آئندہ سطور میں ہم حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں گے۔

فتح سندھ کا پس منظر | عربوں کے ہند سے تعلقات صدیوں پرانے ہیں، جغرافیائی اعتبار سے بھی عرب و ہند کے درمیان صرف بحر عرب حائل ہے، مشرق میں اگر اس کی موجیں ہند کے ساحل کو چومتی ہیں تو دوسری طرف مغرب میں یہی جزیرہ نمائے عرب سے بغل گیر نظر آتی ہیں، تجارتی آمد و رفت نے سمندر کی یہ خلیج صدیوں پہلے پار کرلی تھی، چنانچہ ۲۰۰۰ قبل مسیح فینیقیوں کے تجارتی قافلے ہند کے سواحل پر آتے جاتے تھے[1]، یہ تجارتی لین دین برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ جب یہ عربی النسل تجار حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تب بھی تجارتی روابط میں کمی نہیں ہوئی، ان کی تجارت بحری و بری دونوں راستوں سے ہوتی رہی، اہل ہند نے عرب تجارتی قافلوں کا خیر مقدم کیا، ان کی نوآبادیاں بھی خصوصیت سے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں قائم ہوئیں[2] اسی اثناء میں ایران و عرب کی پرانی مخاصمت رنگ لائی، اور جب خلیفہ دوم حضرت عمر ابن الخطاب کے عہد میں جنگ کا سلسلہ طویل ہوا تو سندھ کی جاٹ اور میدقوموں[3] نے ایران کی فوجی امداد میں عملی حصہ لیا[4]، ہند کے گجراتی چالوکیا خاندان کے راجہ پولکیشن دوم کے بھی ایران سے گہرے روابط تھے، چنانچہ ایران کا سفیر راجہ کے پاس رہا کرتا تھا[5]، یہ چیزیں عربوں کے لیے باعث تشویش تھیں، کیونکہ ایران کی سرحد سندھ کے ذریعہ ہندوستان سے ملی ہوئی تھی، سندھ کے سواحل سے عرب علاقوں پر کامیاب حملہ ہو سکتا تھا،

---

[1] ریاست علی ندوی: عہد اسلامی کا ہندوستان ص ۴۳ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۰ء [2] سید سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۵۹، الٰہ آباد ۱۹۳۰ء [3] سونیتی کمار چٹرجی: لینگویجز اینڈ لٹریچر آف موڈرن انڈیا۔ ص ۳۴۳۔ کلکتہ ۱۹۶۳ء "جاٹ (زط) پراکرت کے لفظ جٹا اور سنسکرت کے جرتا سے ماخوذ ہے۔ جو جدید ہند آریائی زبان میں جاٹ یا جٹ ہوگیا ہے۔ مید غالباً میدا سے نکلا ہوا لفظ ہے جو ماقبل آریائی نسل کے لوگوں کے لیے مستعمل ہوا جنکا مستقر میداپاٹ (میواڑ) تھا۔ راجپوتانہ کے میو قبائل انہیں سے ہیں جو مسلمان ہوگئے"۔
[4] ریاست علی ندوی: عہد اسلامی کا ہندوستان ص ۴۴ [5] ویدیا: میڈیاول ہندو انڈیا، ج ۲ ص ۲۷۰۔ پونا ۱۹۲۱ء

یہ خطرہ حقیقتاً عہد صدیقی میں پیش آچکا تھا، جب سندھ کے جاٹوں اور دیگر ہندی اقوام نے بحرین میں مرتدوں کے سردار حطم بن ضبیعہ کی معیت میں اسلامی افواج سے باقاعدہ مقابلہ کیا تھا اور شکست کھانے کے بعد ہندوستان بھاگ آئے تھے[1]۔ ان حالات میں فوجی نقطۂ نگاہ سے عربوں کے لیے سندھ کے سواحل کی نگرانی ضروری تھی، اس کے علاوہ سندھ کے سواحل پر کچھ ایسی قومیں آباد تھیں، جن کا پیشہ بحری قزاقی تھا، انھوں نے اپنے بڑے بڑے جتھے بنا لیے تھے، اور کافی مرفہ الحال تھے[2]، سندھ کے راجے ان پر مکمل کنٹرول رکھنے سے قاصر تھے، ان سے عربوں کے تجارتی قافلوں کو جو ہند کے مغربی علاقوں اور سیلون کی طرف سے آیا جایا کرتا تھا، خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر عربوں کی طرف سے سندھ اور مغربی ہند کے سواحل کی فوجی نگرانی ہونے لگی،

سب سے پہلا نگراں دستہ ۱۵ھ میں بحرین و عمان کے حاکم عثمان بن ابوالعاصؓ ثقفی کے ایما سے ان کے بھائی حکم بن ابی العاص کی سرکردگی میں بھڑوچ پہنچا، دوسرا دستہ گجرات کے ساحلی بندرگاہ "تھانہ" اور تیسرا دستہ مغیرہ بن ابی العاص کی قیادت میں "دیبل" پر جو سندھ کا مشہور بندرگاہ اور ساحلی شہر تھا، حملہ آور ہوا جن کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوئیں اور عربی دستہ فتح یاب واپس گیا[3]، اسی طرح کے گشتی دستوں کو سندھ اور مغربی ہند کے سواحل پر بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ غیر ملکیوں کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ عرب اپنی بحری سرحدوں کی حفاظت سے نہ تو

---

[1] قاضی اطہر مبارکپوری: اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ص ۸۳ دہلی ۱۹۶۹ء، ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۲ مصر ۱۳۵۲ھ [2] پروفیسر محمد حبیب: دی عرب کنکوئسٹ آف انڈیا، ص ۲۰۰ اسلامک کلچر جلد ۳ جنوری ۱۹۲۹ء [3] بلاذری: فتوح البلدان ص ۴۲۰

غافل ہی ہیں اور نہ جنگ سے خائف ہیں، اسلامی مملکت کے حدود ایران کے مشرقی علاقوں اور اس کی ماتحت ریاستوں کی طرف بڑھتے جارہے تھے، اور اس لیے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں سندھ کا شمار "ثغرالہند" میں ہونے لگا تھا، ثغر کے لفظ کا اطلاق ان علاقوں پر ہوتا تھا جو اسلامی حدود کے فوراً بعد شروع ہوتے تھے[1]، اور اسلامی اور غیر عرب علاقہ کے درمیان سرحد کا کام دیتے تھے، گویا یہ سرحدی چوکی تھی، جو لازماً اسلامی حدود کے باہر ہی ہوتی تھی، سندھ کی سرحد بھی ایک اہم سرحدی چوکی سمجھی جاتی تھی، اس لیے حضرت عثمانؓ کے وقت میں ایک تجربہ کار شخص حکیم بن جبلہ کی سرکردگی میں سندھ کے تفصیلی حالات جاننے کے لیے ایک دستہ بھیجا گیا، اس نے سندھ کے مختلف علاقوں کا فوجی نقطۂ نظر سے سروے کیا اور اس کی رپورٹ دربار خلافت میں پیش کردی[2]۔ اس کے بعد چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں خشکی کی سمت سرحد کو مضبوط بنانے کی کوششیں جاری رہیں، چنانچہ حارث بن مرۃ العبدی نے خراسان کی سرحد سے ملحقہ قیقان کے علاقہ پر کامیاب حملہ کیا اور مال غنیمت اور قیدیوں کے ساتھ واپس ہوا، اس کے بعد جب اموی اقتدار کا دور آیا تو سندھ سے اسلامی حکومت کے تعلقات میں مزید خرابیاں پیدا ہوئیں، سندھ کے راجہ کے پاس اموی حکام کے احتجاجی مراسلے بھی پہنچے، اس نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہ کی، اس لیے پہلے اموی خلیفہ حضرت معاویہؓ (۶۶۲ — ۶۸۰ء) کے وقت میں خشکی کے راستے مزید حملے ہوئے، ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرۃ نے ملتان اور کابل کے درمیان اہواز کا علاقہ فتح کرلیا، ان ہی ایام میں سنان بن سلمۃ الہذلی

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۳ [2] ایضاً۔ علی بن حامد کوفی: چچ نامہ ص ۳۰ ب قلمی نمبر ۵۹۷ بانکی پور پٹنہ

کی قیادت میں "مکران" اور پھر "قصدار" فتح ہو کر اسلامی حدود میں داخل ہوئے، اسی عرصہ میں عراق میں مسلمانوں میں سیاسی اختلافات نے زور پکڑا اور ایک طبقہ نے حکومت سے باغیانہ رویہ اختیار کیا، مگر اس عہد کے مدبر اور سخت گیر گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کے ہاتھوں شکست کھا کر سندھ کی طرف بھاگ گیا، ان باغیوں میں محمد بن حارث علافی کے ہوا خواہوں کی کثیر تعداد تھی، ان کو سندھ میں پناہ دی گئی، ان باغیوں نے نہ صرف سندھ میں پناہ لی بلکہ تھوڑے ہی عرصہ بعد "مکران" پر قبضہ کر لیا، اور اسکے مسلمان گورنر کو قتل کر ڈالا، اس میں سندھ کی حکومت غیر جانبدار نہیں سمجھی گئی، اس لیے جب مکران کی بازیابی کے لیے محمد بن ہارون کی ماتحتی میں ایک فوجی دستہ بھیجا گیا تو اس نے علافیوں کو شکست دیکر بھگا دیا، اور ان کی تلاش میں حدود سندھ میں بھی داخل ہو کر "قنداببیل" فتح کر لیا[1]، ادھر شکست خوردہ علافی گروہ پھر سندھ میں "اروڑ" کے مقام پر آکر پناہ گزیں ہو گیا، ان کا پناہ دینا گویا سندھ کی حکومت کی طرف سے عربوں کے لیے کھلا چیلنج تھا، اب صورت حال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ ثغر الہند کی حفاظت کے لیے عربوں نے ایک مستقل گورنر مقرر کر دیا[2]،

اس درمیان میں عربوں کے تجارتی قافلوں پر سندھ کے سواحل سے وقتاً فوقتاً تاخت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، اموی حکومت نے مسلسل احتجاج کیا اور سندھی حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ دلائی، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا،

---

[1] فتوح البلدان، ص ۲۳۳۔ ۴۰۲، مصر ۱۹۳۲ء [2] عبد الحئی: نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۱۳۔ ۱۴، حیدر آباد ۱۹۴۷ء طبع دوم۔ عرب دور حکمران سندھ۔ ص ۱۹۲، ۱۵ اسلامک کلچر، حیدر آباد، اپریل ۱۹۴۴ء

عربوں کی بحری تجارت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی ان کے معاشی نظام کو درہم برہم کرنا تھا، کیونکہ اس تجارت پر ان کے مستقبل کے تجارتی فروغ کا دار و مدار تھا، اور ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ بحر ہند کا یہ علاقہ عالمی تجارتی شاہ راہ کی جگہ لینے والا تھا،

ابھی تک عربوں نے سندھ کی حکومت سے براہ راست تعرض نہیں کیا تھا، اور ان کا ارادہ سندھ پر قبضہ یا کسی قسم کے لوٹ مار کرنے کا نہیں تھا، لوٹ کھسوٹ کا جذبہ ان جگہوں کے لیے پیدا ہوتا ہے جہاں دولت کی فراوانی اور سامان معیشت کی بہتات ہوتی ہے، اور سندھ کا علاقہ حکیم بن جبلہ کی رپورٹ کے مطابق اس زمانہ میں مرفہ الحال نہیں تھا، کاشت کی کمی تھی، بنجر علاقے بہت زیادہ تھے، رس بھرے اور شیریں پھل کمیاب تھے، چنانچہ حکیم کا اندازہ تھا کہ اگر ایک بڑی فوج سندھ میں اتاری جائے تو اسے بھوکوں مرنا پڑے گا،[۱] اس لیے قزاقوں کی سینہ زوری اور حملوں کی بنا پر بحری تجارت بھی کمزور رہی ہو گی، مشہور مورخ ایشوری پرشاد کا بھی اندازہ ہے کہ سندھ ان دنوں مالی اعتبار سے بہت اچھی حالت میں نہیں تھا، سرسبزی و شادابی کی جگہ ریگستانی علاقے پھیلے ہوئے تھے،[۲]

ان حالات میں عربوں کو کیا طمع ہو سکتی تھی کہ وہ جنگ و جدل کا خطرہ مول لیتے اور سندھ پر قبضہ کرنے کا ارادہ کرتے، بلکہ وہ ہندوستان اور سندھ سے

---

[۱] بلاذری: فتوح البلدان ص ۱۲۰؛ علی بن حامد کوفی: چچ نامہ ص ۱۳۱ الف قلمی نمبر ۵۹ بانکی پور لائبریری پٹنہ [۲] ایشوری پرشاد: ہسٹری آف میڈیاول انڈیا ص ۶۶

دوستانہ تعلقات کے خواہاں تھے اور تجارتی روابط بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر جب تھوڑے ہی دنوں کے بعد عربوں کے ایک بڑے قافلے کے لوٹے جانے کی اطلاع دارالخلافہ پہنچی جس میں عرب عورتوں اور بچوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی تو اموی حکومت کے لیے خاموش رہنا مشکل ہو گیا۔ اور عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے ایک احتجاجی مراسلہ حاکم سندھ داہر کو لکھا اور بحری قزاقوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کی فہمائش کی۔ لیکن داہر نے اس سے معذوری کا اظہار اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کارروائی سے اجتناب کیا۔[۱] اس کے بعد عربوں کے لیے سندھ کا خطہ نہ صرف ایک دشمن ملک کی صورت اختیار کر گیا بلکہ فوجی اور تجارتی نقطۂ نگاہ سے اس پر بالادستی ان کے لیے ضروری ہو گئی۔ سندھ عربوں کی وسیع سلطنت اور برصغیر ہند کے درمیان ایک سرحد کی حیثیت رکھتا تھا اس پر بالادستی کے بعد عربوں کی پوزیشن بیرونی حملوں سے بہت محفوظ ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بحر عرب پر بھی اپنی بالادستی قائم رکھ سکتے تھے۔ اس لیے حجاج بن یوسف نے جوان سال اور اولوالعزم سپہ سالار محمد بن قاسم کو سندھ پر اقتدار قائم کرنے کے لیے ہند کی طرف روانہ کیا۔[۲] اس نے اپنی جنگی لیاقت اور حسن تدبیر سے چند برسوں کے اندر پورا سندھ فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا۔ محمد بن قاسم کا مقصد صرف ملک فتح کرنا اور اس کی دولت لوٹ کر لے جانا نہیں تھا۔ بلکہ سندھیوں کے دلوں کو فتح کرنا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا۔ ان کے مذہبی امور میں کسی قسم کی

---

[۱] بلاذری :۔ فتوح البلدان ص ۴۲۴ ۔ ۴۲۶

[۲] بلاذری :۔ فتوح البلدان ص ۴۲۴ ۔ ۴۲۶

خلت نہیں کی۔ برہمنوں کی دینی برتری کو باقی رکھا۔ اور مقامی لوگوں کو حکومت
، شریک کیا اور داہر کے دو وزیروں کو اپنا مشیر خاص بنایا تاکہ عوام کی فلاح و
دکا زیادہ سے زیادہ کام کیا جا سکے۔ زرعی اصلاحیں اور سماجی مساوات قائم
سیاسی استبداد کے چنگل سے عوام کو نجات دلائی۔[۱] اس سے سندھ کے عوام
، اسکی ایسی عقیدت پیدا ہو گئی کہ اہلِ کیرج[۲] نے اس کی واپسی پر اس کا مجسمہ بنا کر
ی عقیدت کے پھول چڑھائے۔[۳] تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے کہ ایک دشمن
سے کے عوام نے غیر ملکی فاتح کو اس طرح کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہو۔

اس زمانہ میں سندھ مختلف چھوٹی چھوٹی یا جگیر داریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے
یادہ سندھ کی مشرقی سرحد پر بھی ہندوستان میں چند جاگیرداریاستیں تھیں ان ہی
، کیرج کی ریاست بھی تھی داہر کی شکست کے بعد ان ریاستوں کے حکمران مختلف اطراف
ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔ مگر ان کی کوششیں برابر جاری
ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت بحال کرلیں۔ سندھ سے ملحقہ ہندوستانی
یاستوں کے راجگان کی طرف سے ان شکست خوردہ راجاؤں کی برابر ہمت افزائی
ی ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے سندھ تک پہنچ جانے سے انھیں دشمن دروازے
دستک دیتا نظر آرہا تھا۔ اسی لئے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان
رحد پر معمولی جھڑپوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ادھر اسلامی مملکت میں پے بہ پے خلفاء

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھئے پروفیسر محمد حبیب کا مضمون دی عرب کنکوئسٹ آف سندھ اسلامک کلچر ج ۳،
جنوری، اکتوبر ۱۹۲۹ء[۲] کیرج راجستھان کا ایک علاقہ دیکھئے ص ۱۳۔ [۳] بلاذری: فتوح
البلدان، ص ۴۲۶ - ۴۲۸ -

بدلتے رہے جس سے اندرونی خلفشار اور سیاسی رسہ کشی بڑھ گئی، صوبائی گورنروں اور اس کے متعلقہ ریاستوں کے عمال نے مرکزی اقتدار کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ سندھ اور دیگر ہندوستانی ریاستوں میں محمد بن قاسم کی معزولی، موت اور اسلامی ریاستوں میں انتشار کی خبریں مل چکی تھیں؛ اس بنا پر یہاں کے راجاؤں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اموی حکومت کے باغیوں کی اچھی تعداد سندھ کے علاقے میں آباد تھی، جو اموی اقتدار کو کمزور کرنے کے لیے مقامی راجاؤں کو مدد پہونچا رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ پالیسی اختیار کی کہ نومسلم مقامی اشخاص کو حکومت کی ذمہ داری سونپ دی جائے کہ وہ اپنے علاقوں کی خود نگرانی کریں۔ چنانچہ سندھ کے سابق حکمران داہر کے بیٹے "جے سنگھ" کو جو مسلمان ہو چکا تھا۔ سندھ کی گورنری عطا ہوئی[۵] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پالیسی نے اہل ہند کی نظر میں اموی حکومت کے براہ راست کنٹرول کو اور بھی کمزور کر دیا۔ چنانچہ سندھی اور دیگر ہندوستانی راجاؤں نے اپنی شکست کی تلافی کے لئے لہذا سرنو شیرازہ بندی شروع کر دی اور یہاں کے وہ راجے بھی جن کی سرحدی مخاصمت مسلمانوں سے بہت پہلے سے چلی آتی تھی۔ سندھ پر چڑھ دوڑنے کے لیے پر تولنے لگے۔ اور سندھ کی اسلامی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے منصوبے بن رہے تھے کہ اموی خاندان کے ایک مدبر خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے زمام حکومت سنبھالی۔

---

[۵] بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۲۸، مصر ۱۹۳۲ء

خلیفہ ہشام کی سندھ سے خصوصی توجہ کے اسباب

ہشام بن عبد الملک ایک اولو العزم حکمران تھا اس کا شمار عرب کے مدبر حکمرانوں میں ہوتا ہے خاندان بنی امیہ میں حضرت معاویہؓ اور عبد الملک کے بعد اس کو اموی حکومت کی پرشکوہ عمارت کا تیسرا اہم ستون سمجھا جاتا ہے[۵۱] اس نے جب یورپ سے محاذ آرائی کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی تو ایسی جنگی اسٹرائیجی کو کام میں لایا کہ نامور یورپین مورخ گبن بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ ان دنوں یورپ دو شعلوں کے مابین گھرا ہوا تھا۔ اور اگر فرانس میں [۵۲] ٹور کی جنگ مسلمانوں نے جیت لی ہوتی تو لوگ کیمبرج اور آکسفورڈ میں قرآن و حدیث کا درس ہوتا ہوا دیکھتے[۵۳]

ہشام نے جس وقت تخت خلافت پر قدم رکھا اس وقت اس کے حدود مغرب میں شمالی افریقہ سے لیکر فرانس تک اور مشرق میں ماوراالنہر اور سندھ کی وادیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ خراسان میں ترکوں سے ایشیائے کوچک میں رومیوں سے جنگ افریقہ میں بربروں سے یورپ میں فرانسیسیوں سے اور سندھ میں ہندیوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا اسی زمانہ میں اسکے بھائی یزید بن عبد الملک کی کمزوریوں نے ملکی نظام میں بھی خلل پڑ گیا تھا۔ اندرون ملک میں بھی بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ سا چل رہا تھا اور سرحد پر بیرونی حملوں کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مفتوحہ ممالک کے بعض دور دراز

[۵۱] المسعودی:۔ مروج الذہب، جلد ۳، ص ۲۲۳، مصر ۱۹۴۸ء

[۵۲] ٹور (Tours) وسطی فرانس کا ایک شہر ہے۔

[۵۳] ڈلہوزی۔ عرب کنگڈم اینڈ اٹس فال، ص ۳۴۲، کلکتہ ۱۹۲۷ء

علاقے حکومت کے کنٹرول سے نکلتے جا رہے تھے۔ عمال اور گورنروں کی من مانی کارروائیوں کی رپورٹیں بھی موصول ہو رہی تھیں۔ ایسے سنگین حالات میں اسقدر وسیع مملکت کے نظام کو سنبھالنے کیلئے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی، چنانچہ ہشام نے ان مشکل مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی سیاسی پالیسی کے کچھ خطوط وضع کیے تو ان پر پوری سختی سے کاربند ہوا، آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کی یہ پالیسی بڑی حد تک کامیاب رہی۔

ہشام کے زمانہ میں سندھ عراق کی ... ٹسر العلمیٰ کا ایک چھوٹا سا صوبہ تھا۔ جہاں عراق کے والی کی ماتحتی میں ایک گورنر حکومت کرتا تھا۔

ہشام کی سب سے مقدم سیاسی پالیسی گورنروں کی صوبائی خود مختاری کو ختم کر کے مرکزی اقتدار کے تحت کرنا تھا۔ اسلئے اس نے ایسا نظام حکومت بنایا کہ جو ظاہری طور پر وفاقی (Federal) ہوتے ہوئے بھی وحدانی طریقۂ کار (Unitory) کا حامل ہوا۔ ہشام سے قبل حکومت کی بنیاد قبائلی طاقت پر منحصر تھی۔ اموی خلفاء خود بھی سب سے بڑی سیاسی پارٹی بنی امیہ کا ایک فرد ہوتے تھے۔ اور دوسرے گروہوں سے مفاہمت اور جوڑ توڑ سے حکومت کا نظام چلاتے تھے۔ یہاں تک کہ فوج میں بھی قبیلوں کی تفریق ہوا کرتی تھی۔ طاقت در قبیلہ کی بات چلتی تھی۔ ہشام نے حکمت عملی سے اس کو توڑ دیا۔ کیونکہ اس میں قائدین اور مختلف ریاستوں کے عاملوں اور گورنروں کی خود مختاری کا خطرہ تھا۔

چنانچہ خراسان کے مشہور اسلامی سپہ سالار مسلم بن قتیبہ نے ہشام سے پہلے یزید بن عبد الملک کے عہد میں اس سے اختلاف کی بناء پر ایسے خیالات

ظاہر کیے تھے، جس سے خود مختاری کی بو آتی تھی۔ سندھ میں آل مہلب کا حال بھی اسی قسم کا تھا۔ اس لیے ہشام کی یہ سیاسی پالیسی اسلامی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اس خطرے کو اپنی دوربین نگاہ سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ جو عباسی عہد میں طوائف الملوکی کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ اور اس کو اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر مرکزی اقتدار کو پورے طور پر نافذ نہ کیا گیا تو اتنی وسیع و عریض مملکت طوائف الملوکی کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی پسند اور کنٹرول کے گورنروں کو مختلف صوبوں میں بحال کرنا شروع کیا اس سلسلے میں بعض گورنروں کی معزولی بھی عمل میں آئی۔ جنید بن عبدالرحمٰن المغربی کا سندھ پر تقرر اسی پالیسی کے نفاذ کی کڑی تھی۔ جب جنید بحیثیت گورنر سندھ پہونچا تو جے سنگھ جو مسلمان ہوچکا تھا۔ سندھ کی حکومت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا۔ براہ راست ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے ۱۰۶ھ میں جنید اور جے سنگھ (علی شاہ) کے درمیان جنگ ہوئی جس میں جے سنگھ جنگ میں کام آیا۔[1]

ہشام کا دوسرا اہم مقصد اسلامی مملکت کے تحفظ و بقا کے لیے اس پر مکمل کنٹرول تھا۔ اس لیے اس نے دو صورتیں اختیار کیں۔

(۱) اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کا مکمل سد باب تاکہ حکومت کی مشینری معطل نہ ہو اور مرکزی اقتدار پوری طرح قائم رہے۔

(۲) بیرونی خطرات کا مقابلہ کرکے مخالف طاقتوں کو ان کے علاقوں میں ہی روک دیا جائے۔ اور وہ اسلامی حدود پر تاخت نہ کرسکیں، اس سلسلہ میں

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان ص ۴۴۵، الیعقوبی: تاریخ الاسلام ج ۳ ص ۱۵، ۳۱۴

قریب قریب سبھی اہم سرحدی ناکوں پر جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا[1]

تیسرا اہم مقصد حکومت کے مالیاتی نظام کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ کیونکہ پچھلے حکمرانوں کی کمزوریوں کی بنا پر اندرونی خلفشار اور بیرونی ممالک سے مسلسل جنگوں سے مالیاتی نظام پر بڑا اثر پڑا تھا، چنانچہ زراعت و تجارت دونوں کے فروغ کی اسکیمیں بروے کار لائی گئیں[2] عالمی تجارتی رابطہ قائم کیے گئے۔ اس سلسلہ میں ہند و چین سے تجارتی روابط کو بڑھانے کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی گئی۔ چین سے تجارتی تعلقات استوار کرنے کے لیے متعدد سفارتیں بھیجی گئیں[3] صغدیوں پر جنھوں نے نہ صرف چین اور مغرب کے درمیان ہونے والی تجارت پر اجارہ داری قائم کرتی تھی[4] بلکہ عربوں سے ماوراء النہر کے علاقے میں برسرپیکار رہا کرتے تھے۔ مکمل غلبہ حاصل کر لیا گیا۔[5]

اس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم عالمی تجارتی شاہراہ (SILK R) جو چین سے ہو کر بلاد روم کو جاتی تھی[6] وہ عربوں کے لیے بھی کھول دی جائے؛ اور اسلامی حکومت اس راستہ کی حفاظت کی ذمہ دار بن جائے، اسی طرح ہندوستان سے بھی زیادہ سے زیادہ تجارتی روابط کو فروغ دینے کی شکلیں اختیار کی گئیں، چنانچہ سندھ کی فتح کے بھی دکھنی ہندوستان سے تجارتی لین دین کا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ مقالہ ہشام بن عبدالملک ہز لائف اینڈ ٹائم از ڈاکٹر عبدالباری پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۶۰ء۔ [2] ایضاً۔ [3] نورالدین حسینی، چین و عرب کے تعلقات اور انکے نتائج، ص ۹۰، ۲ کراچی۔ ۱۹۴۹ء۔ [4] دی۔ دی بارتھولڈ، فور اسٹڈیز آن سنٹرل ایشیا، جلد ۱ ص ۱، لندن ۱۹۵۶ء۔ [5] ہشام بن عبدالملک ہز لائف اینڈ ٹائم ڈاکٹر عبدالباری ص ۱۲۳، پٹنہ یونیورسٹی۔ ۱۹۶۰ء

سلسلہ اس طرح جاری رہا۔ جس طرح طلوع اسلام کے وقت شروع ہوا تھا۔ اس تجارت کو فروغ دینے اور بیرونی خطرات کے مکمل انسداد کے لیے سندھ پر مکمل اقتدار اور زیادہ ضروری ہوگیا تھا۔

چوتھا اہم مقصد دین اسلام کی تبلیغ کو بروئے کار لانا تھا۔ تاکہ انسانی برادری کو عالمی پیمانے پر اسلام کے منصفانہ نظام سے قریب تر لایا جائے۔ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر ایک ازلی آقا کی بندگی میں داخل کر دیا جائے۔ دنیا کی مختلف قوموں کے سامنے ایک ایسا نظام حیات پیش کیا جائے۔ جو انسانی مساوات و اخوت کی عملی تعلیم دیتا ہو اور پوری انسانیت کے لیے رنگ، نسل، زبان، اور علاقہ کی تفریق سے بالاتر ہو کر فلاح و بہبود کا ضامن ہو۔ ہندوستانی اقوام کو بھی اسلامی تبلیغ کے مروجہ طریقوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اسلام کے اخلاقی اقتدار اور طریقہ حیات سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی، بلاشبہ سندھ میں اسلامی حکومت کا وجود اور مسلمانوں کا بود و باش اختیار کرنا بھی ہندی اقوام کے لیے مسلمانوں کے طرز رہائش۔ ان کے معتقدات اور سماجی معاملات کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ سندھ میں اہل ہند اور عرب قوموں کے اختلاط نے اسلامی تبلیغ کا ایک بڑا کام انجام دیا۔

آئیے اب ہم ہشام کی مذکورہ پالیسیوں کے نفاذ میں صوبہ سندھ کی صورت حال کا جائزہ لیں۔ (باقی)

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی نقد حدیث)

از

ازجناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۵)

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث قرآن وسنت کے قواعد کے خلاف ہو

(۲۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث ان عام قواعد کے خلاف ہو جو قرآن وسنت سے مستنبط کیے گئے ہیں۔

او یکون مخالفا للقواعد العامۃ الماخوذۃ من القرآن والسنۃ[1]

یا حدیث قواعد عامہ کے مخالف ہو جو قرآن وسنت سے نکالے گئے ہیں۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں

اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی۔

ان الرجل لیکون من اھل

انسان نمازی ہوتا ہے اور جہاد کرتا ہے

---

[1] مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن۔

الصلوٰة والجہاد وما یجزی الاقدر عقلہ[۱] — لیکن بدلہ اس کو عقل کی مقدار پر ملے گا۔

لا صلوٰة لمن علیہ صلوٰة[۲] — اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس کی کوئی نماز رہ گئی ہو۔

من قضی صلوات من الفرائض فی آخر جمعة من رمضان کان ذالک جابراً لکل صلوٰة فائتة فی عمرہ الی سبعین سنة[۳] — رمضان کے آخری جمعہ میں جس نے چند قضا فرائض ادا کرلیے تو اس سے پچھلے ستر سال کی قضا نمازوں کی تلافی ہوجائیگی۔

الصلوٰة علی النبی افضل من عتق الرقاب[۴] — رسول اللہ پر درود بھیجنا غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں

سئلت النبی علیہ السلام عن علم الباطن ما ھو فقال سئلت جبریل عنه فقال عن اللہ ھو سر بینی وبین احبائی واولیائی واصفیائی اودعه فی قلوبهم لا یطلع علیه ملک مقرب ولا نبی مرسل[۵] — میں نے رسول اللہ سے علم باطن کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اسکے بارے میں حضرت جبریلؑ سے پوچھا تھا، انھوں نے اللہ کی طرف سے جواب دیا کہ وہ میرے اور میرے احبابہ میرے اولیا و اصفیا کے درمیان ایک راز ہے جسکو انکے دل میں ودیعت کیا گیا ہے، اسکی اطلاع نہ مقرب فرشتہ کو ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو۔

۱؎ المنار المنیف فصل ۵ ۲؎ ایضاً فصل ۲ ۳؎ السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن
۴؎ موضوعات کبیر ص۴۴ ۵؎ ایضاً ص۴۵

اذا جلس المتعلم بین یدی	جب کوئی طالب علم عالم کے سامنے بیٹھتا ہے
العالم فتح اللہ علیہ سبعین	تو اللہ اس پر رحمت کے ستر دروازے
بابا من الرحمۃ ولا یقوم من عندہ	کھول دیتا ہے اور وہ اس کے پاس سے
الا کیوم ولدتہ امہ واعطاہ	اسقدر گناہوں سے پاک وصاف ہو کر
اللہ بکل حرف ثواب ستین شہیدا	اٹھتا ہے کہ گویا اسکی ماں نے اب پیدا کیا ہے
وکتب اللہ بکل حدیث عبادۃ	اور اللہ تعالیٰ ہر حرف کے بدلہ ساٹھ ماہ
سنۃ[1]	کا ثواب دیتا ہے اور ہر حدیث کے بدلہ اس
الصلوٰۃ خلف العالم باربعۃ	عالم کے پیچھے نماز چار ہزار چار سو چالیس
آلاف واربعمائۃ واربعین صلوٰۃ[2]	نمازوں کے برابر ہے۔

[illegible]

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں پیشنگوئی ماہ اور سن کے تعین کے ساتھ ہو

(۲۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں آیندہ واقعات کی ایسی پیشنگوئی جو ماہ اور سن کے تعین کے ساتھ ہو۔

ان یکون فی الحدیث تاریخ	حدیث میں فلاں فلاں تاریخ
کذا وکذا[3]	ہو۔

دوسری جگہ ہے:۔

ومنھا احادیث التواریخ	یعنی جن حدیثوں میں مستقبل کی تاریخیں
المستقبلۃ[4]	متعین ہوں

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی۔

[1,2] تذکرۃ الموضوعات فصل العالم العامل [3] المنار المنیف فصل ۱۳ [4] موضوعات کبیر ص ۱۱۴

اذا انکسف القمر فی المحرم کان الغلاء والقتال وشغل السلطان واذا انکسف فی صفر کان کذا وکذا[1] تکون فی رمضان هدة توقظ النائم وتقعد القائم وتخرج العواتق من خدورها وفی شوال همهمة وفی ذی القعدة تمییز القبائل بعضها الی بعض وفی ذی الحجة تراق الدماء وفی المحرم امر عظیم وهو عند انقطاع ملک هولاء قالوا یا رسول الله من قال الذین یکونون فی ذلک الزمان[2] عند رأس مئة یبعث الله ریحا باردة یقبض الله فیها روح کل مومن[3]

جب محرم میں چاند گہن ہو تو گرانی ہوگی، قتل و قتال ہوگا اور بادشاہ (حکومت) پریشان رہے گا اور جب صفر میں چاند گہن ہو تو ایسا اور ایسا ہوگا، رمضان میں ایک "چیخ" ہوگی جو سونے والے کو جگا دیگی، کھڑے ہونے والے کو بٹھا دیگی اور کنواریوں کو خلوت گاہ سے نکالدیگی، شوال میں (گائے اور ہاتھی وغیرہ کی) چنگھاڑ ہوگی، ذیقعدہ میں قبائل کی باہمی تمیز ہوگی، ذی الحجہ میں خون بہایا جائیگا اور محرم میں بڑا حادثہ ان لوگوں کی حکومت کے خاتمہ پر ہوگا، تو لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! کون لوگ، آپ نے فرمایا جو اس زمانہ میں ہونگے، سو سال پر اللہ تعالیٰ ٹھنڈی ہوا بھیجے گا جس میں ہر مومن کی روح کو قبض کرلے گا۔

---

[1] موضوعات کبیر ص ۱۱۳ [2] جلال الدین سیوطی: اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة کتاب الفتن
[3] ایضاً کتاب الفتن ۔

اذا کانت سنة ستین ومئة	سنہ ایک سو ساٹھ میں چار چیزیں اجنبی
کان الغرباء اربعة قرآن فی	ہو جائیں گی (۱) قرآن ظالم کے پیٹ میں
جوف ظالم ومصحف فی بیت	(۲) مصحف قوم کے گھر میں کہ اس میں
قوم لا یقرأ فیه ومسجد فی	پڑھا نہ جائیگا (۳) مسجد قوم کی مجلس میں
نادی قوم لا یصلون ورجل	کہ وہ نماز نہ پڑھیں گے اور (۴) صالح
صالح بین قوم سوء[1]	آدمی برے لوگوں میں۔
انا واصحابی اهل ایمان وعمل	میں اور میرے اصحاب چالیس سال
الی اربعین واهل بر وتقوی	تک ایمان وعمل والے ہوں گے، اسی سال
الی الثمانین واهل تواصل و	تک نیکی و تقویٰ والے، ایک بیس سال
تراحم الی العشرین ومائة	تک باہمی صلہ رحمی ومحبت والے اور
واهل تقاطع وتدابر الی	ایک سو ساٹھ سال تک قطع تعلق ونفرت
الستین ومائة ثم الهرج	والے۔ پھر اضطراب ولے چینی
الهرج الهرب[2]	ہو گی۔

اس طرح کی اور بھی باتیں ہیں، مثلاً

اذا کان سنة کذا وکذا	جب فلاں فلاں سنہ ہوگا تو ایسا
وقع کیت وکیت واذا کان	ایسا ہوگا اور فلاں فلاں مہینہ ہوگا
شهر کذا وکذا وقع کیت وکیت[3]	تو ایسا ویسا ہوگا۔

---

[1] ابن جوزی کتاب الموضوعات ج ۳ کتاب الفتن ص ۱۹۲ [2] سیوطی: اللالی المصنوعہ کتاب الفتن [3] المنار المنیف فصل ۱۳

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹے کام پر بڑے بھاری ثواب کی بشارت	(۲۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹے کام پر بڑے بھاری ثواب کی بشارت ہو

اشتمال الحدیث علی افراط فی الثواب العظیم علی الفعل الصغیر[1] — حدیث میں چھوٹے کام پر ثواب عظیم کی افراط ہو۔

علامہ سخاوی کہتے ہیں :-

یتضمن الافراط بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر[2] — حدیث معمولی کام پر بڑے وعدہ کی افراط پر مشتمل ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں	اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی :-

من اغتسل یوم الجمعة بنیة حسبة کتب اللہ بکل شعرة نورا یوم القیمة ورفع اللہ له بکل قطرة درجة فی الجنة من الدر والیاقوت والزبرجد بین کل درجتین مسیرة مائة عام[3] — جس نے جمعہ کے دن طلب ثواب کی نیت سے غسل کیا، اللہ تعالیٰ ہر بال کے بدلہ قیامت کے دن "نور" لکھے گا اور ہر قطرہ کے بدلہ جنت میں موتی، یاقوت اور زمرد کے درجات بلند کرے گا، جس کے ہر دو درجہ کے درمیان سو سال کی مسافت ہوگی۔

---

[1] مصطفی سباعی: السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن [2] علامہ سخاوی: فتح المغیث شرح الفیة الحدیث الموضوع [3] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۱۰

من صلی الضحی کذا وکذا رکعۃ اعطی ثواب سبعین نبیاً[1]
جس شخص نے چاشت کی اتنی اتنی رکعتیں پڑھیں اسکو ستر نبیوں کا ثواب دیا جائیگا۔

من تعلم القرآن وحفظہ ادخلہ اللہ الجنۃ وشفعہ فی عشرۃ من اھل بیتہ کل قد اوجب النار[2]
جس شخص نے قرآن سیکھا اور اس کو یاد رکھا، اللہ اس کو جنت میں داخل کریگا اور ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اسکی سفارش قبول کیجائیگی جن پر دوزخ واجب ہوچکی ہے۔

لو یعلم الامیر مالہ فی ذکر اللہ لترک امارتہ ولو یعلم التاجر مالہ فی ذکر اللہ لترک تجارتہ ولو ان ثواب تسبیحہ قسم علی اھل الارض لاصاب کل واحد منھم عشرۃ اضعاف الدنیا[3]
اگر امیر جانتا کہ اللہ کے ذکر میں کسقدر ثواب ہے تو وہ اپنی امارت چھوڑ دیتا اگر تاجر جانتا کہ اللہ کے ذکر میں کسقدر ثواب ہے تو وہ اپنی تجارت چھوڑ دیتا اگر ایک تسبیح کا ثواب زمین والوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر ایک کو ان میں سے دنیا کے دس گنے کے برابر پہنچے۔

من صلی الفجر فی جماعۃ فکانما حج خمسین حجۃ مع آدم[4]
جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو اس نے گویا حضرت آدمؑ کے ساتھ پچاس حج کیے۔

---

[1] ملا علی قاری: موضوعات کبیر ص ۱۰۰ [2] قاضی شوکانی: الفوائد المجموعہ کتاب فضائل القرآن
[3] محمد طاہر پٹنی: تذکرۃ الموضوعات فضل الذکر ۱۷ [4] ایضاً کتاب الصلوٰۃ۔

من قال لا الٰہ الا اللہ ومدھا	جس نے مد کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ
ھدمت لہ اربعۃ الاف ذنب	کہا اس کے چار ہزار کبائر گناہ
من الکبائر[1]	معاف کیے جاتے ہیں،

یہ اور اس قسم کی بہت سی روایتیں صوفیاء و واعظین نقل کرتے رہتے ہیں جو خارجی نقد (روایتی) کے لحاظ سے بھی موضوع ہیں،

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں جھوٹی بات پر سخت وعید کا مبالغہ ہو | (۴۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں جھوٹی بات پر سخت وعید کا مبالغہ ہو،

اشتمال الحدیث علی المبالغۃ	حدیث امر حقیر پر مبالغہ آمیز سخت
بالوعید الشدید علی الامر	وعید پر مشتمل ہو
الحقیر[2]	

علامہ سخاوی کہتے ہیں :

یتضمن الافراط بالوعید	حدیث میں چھوٹے کام پر سخت
الشدید علی الامر الیسیر[3]	وعید کی افراط ہو۔

اس اصول کے تحت موضوع روایتیں | اس اصول کے تحت درج ذیل قسم کی روایتیں موضوع قرار پائیں گی،

من نظر الی عورۃ اخیہ المسلم	جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی
متعمداً لم یقبل اللہ صلوتہ	شرمگاہ کی طرف قصداً دیکھا تو اللہ
اربعین یوماً[4]	چالیس دن تک اسکی نماز نہ قبول کریگا۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات فصل المذکر [2] مصطفٰی سباعی: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی علامات الوضع فی المتن
[3] فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث الموضوع [4] قاضی شوکانی: الفوائد المجموعہ کتاب الحدود

عربی	اردو
ما من رجل یدخل بصرہ	کوئی شخص کسی کے گھر میں دیکھتا ہے
فی منزل قوم الا قال الملک	تو اس کا متعینہ فرشتہ کہتا ہے کہ
الموکل بہ اُف لک آذیت	تجھ پر اُف ہے تو نے تکلیف دی
وعصیت ثم یوقد النار	اور نافرمانی کی پھر قیامت تک
علیہ الی یوم القیٰمۃ [۱]	اس پر آگ بھڑکائی جاتی رہے گی،
من قرض بیت شعر بعد	جس شخص نے عشا کے بعد کوئی
العشاء الآخرۃ لم تقبل	شعر کہا تو اس کی اس رات کی کوئی
لہ صلوٰۃ تلک اللیلۃ [۲]،	نماز نہ قبول ہوگی،
سب اصحابی ذنب لا یغفر [۳]	میرے اصحاب کو گالی دینا ایسا گناہ ہے جس کی مغفرت نہیں ہے،
من تکلم بکلام الدنیا	جس شخص نے مسجد میں دنیوی
فی المسجد احبط اللہ	بات کی تو اس کے چالیس سال کے
اعمالہ اربعین سنۃ [۴]،	اعمال ضائع ہو جائیں گے،
من تواضع لغنی لاجل	جس نے مالدار کے مال کی وجہ سے
غناہ ذہب ثلثا دینہ [۵]	اس کے سامنے خاکساری دکھائی
	تو اس کا دوثلث دین رخصت ہوگیا،

[۱] قاضی شوکانی الفوائد المجموعۃ کتاب الحدود [۲] جلال الدین السیوطی اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ کتاب العلم [۳] موضوعات کبیر حرف السین [۴] و [۵] موضوعات کبیر حرف المیم،

من لعب بالشطرنج والناظر الیها کآکل لحم الخنزیر[۵۱]	جو شطرنج کھیلے، اور جو اس کی طرف دیکھے وہ خنزیر کھانے والے کے مثل ہیں،

اس باب میں بھی بہت سی روایتیں واعظین و صوفیا نقل کرتے رہتے ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے بعض روایتیں تو اس قدر مضحکہ خیز ہیں کہ انسان کو اللہ کی صفت رحمت پر شک ہونے لگتا ہے، اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ بھی ظالم فرمانروا کی طرح معمولی قصور پر سخت قسم کی سزا دیتا ہے،

رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث میں مفاد، عصبیت اور اختلاف کو دخل ہو،

حدیث روایت کرنے میں کوئی مفاد، گروہی عصبیت دین و مسلک کے اختلاف کو دخل ہو، اس کا ثبوت درج ذیل عبارتوں سے مستنبط ہوتا ہے،

الا یکون نامتیا عن باعث نفسی حمل الراوی علی روایتہ[۵۲]	کوئی ذاتی محرک راوی کو روایت پر ابھارنے والا نہ ہو۔
موافقتہ الحدیث لمذہب الراوی وھو متعصب غال فی تعصبہ[۵۳]	حدیث راوی کے مسلک کے موافق ہو اور وہ اپنے مسلک میں انتہائی درجہ کا متعصب ہو،
ان یکون الحدیث خبرا عن امر جسیم تتوفر الدواعی	حدیث میں کسی بڑے کام کی خبر ہو جس کے نقل کرنے کے دواعی زیادہ

---

[۵۱] موضوعات کبیر حرف المیم [۵۲] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی قواعد النقد فی السند والمتن،

[۵۳] ایضاً علامات الوضع فی المتن،

علی نقله بحضرة الجم الغفير	ہوں اور جم غفیر کے سامنے بیان
ثم لا ینقله الا واحد منهم[1]	ہوئی ہو، لیکن ان میں سے صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو،
او انفراده بشئ مع کونه	راوی کسی ایسی شے کے بیان
فیما یلزم المکلفین علمه و	میں منفرد ہو جس کا علم ہر مکلف کے
قطع العذر فیه،[2]	لئے لازم اور اس میں کسی عذر کی گنجایش نہ ہو۔
بما صرح بتکذیبه فیه جمع	حدیث میں ایسی بات مذکور ہو
کثیر یمتنع فی العادة تواطؤهم	جس کے جھوٹ ہونے کی ایک بڑی
علی الکذب وتقلید بعضهم	جماعت نے تصریح کی ہو، جس کا
بعضاً،[3]	جھوٹ پر اتفاق کر لینا، اور ایک دوسرے کی تقلید کرتے رہنا عادةً ممتنع ہو،

مفاد کے تحت موضوع روایتیں

(الف) مفاد کے تحت اس قسم کی روایتیں آتی ہیں۔

مثلاً:۔

الهریسة تشد الظهر،[4]	حریرہ کمر کو مضبوط کرتا ہے،

---

[1] علی بن محمد کنانی تنزیہ الشریعۃ المرفوعہ عن الاخبار الشنیعۃ الموضوعہ، امارات، [2] علامہ سخاوی فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث۔ الموضوع [3] ایضاً

[4] موضوعات کبیر ص ۱۱۵، السنۃ ومکانتہا رکذا لسند والمتن،

اس کا راوی حریرہ کی تجارت کیا کرتا تھا، جس کے فروغ کے لئے یہ حدیث وضع کی گئی،

معلموا صبیانکم شرارکم[۵۰]	تمہارے بچوں کے معلم تم میں بدترین ہیں،

یہ اس وقت وضع کی گئی جب راوی کا بچہ روتا ہوا آیا، کہ معلم نے اس کو مارا ہے،

انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلّم کان یطیر الحمام[۵۲]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبوتر اڑایا کرتے تھے۔

یہ اس وقت وضع کی گئی جب کہ ہارون رشید کبوتر اڑاتا تھا، بعض روایتوں میں اسی طرح کا ایک واقعہ خلیفہ مہدی کی طرف منسوب ہے، جس میں اس کی خوشنودی کے لئے اگلی روایت میں لفظ "جناح" اضافہ ہے،

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر او جناح[۵۳]	بازی صرف اونٹ، تیر، گھوڑے اور پرندہ میں جائز ہے،

واعظین اور صوفیا نے اپنے موقف کی تائید، محفل آرائی اور عزت و شہرت بڑھانے کے لئے بھی بہت سی روایتیں وضع کیں، اور کئی مواعظ رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیئے ہیں، جو موضوعات کی کتابوں میں درج ہیں،[۵۴]

---

[۵۱] موضوعات کبیر ص ۱۱۵، السنتہ و مکانتہا از فوائد الشدہ والمتن، [۵۲] جلال الدین سیوطی اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ، کتاب الاطعمہ، [۵۳] شاہ عبد العزیز، عجالہ نافعہ ص[illegible]

[۵۴] ملاحظہ ہو، جلال الدین سیوطی۔ اللآلی المصنوعہ، کتاب المواعظ والوصایا و کتاب الادب والزہد و تذکرۃ الموضوعات، باب القصص والمواعظ وغیرہ،

گروہی عصبیت کے تحت موضوع حدیثیں

(ب) گروہی عصبیت کے تحت اس قسم کی روایتیں آتی ہیں۔ مثلاً، امام ابوحنیفہ کی تعریف میں

ابوحنیفة سراج اُمتی[1]،	ابوحنیفہ میری امت کا چراغ ہے،

امام شافعی کی مذمت میں،

سیکون فی امتی رجل یقال	میری امت میں ایک آدمی ہوگا،
لہ محمد بن ادریس ھو اضر	جس کا نام محمد بن ادریس شافعی ہوگا
علی اُمتی من ابلیس[2]،	وہ میری امت کے لئے ابلیس سے
	زیادہ ضرر رساں ہے، معاذاللہ،

کسی امام کی تعریف یا مذمت میں جس قدر روایتیں رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، وہ سب موضوع ہیں[3]،

اسی طرح قبیلہ، خاندان، قرابت پروری، شہر زبان وغیرہ سے متعلق جو روایتیں اوپر گذر چکی ہیں، وہ سب گروہی عصبیت سے وضع کی گئی ہیں،

اختلافِ دین کے تحت موضوع روایتیں

(ج) دین کا اختلاف، ملحد بے دینوں نے اسلام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے اور اُن کا مذاق اُڑانے کے لئے درج ذیل قسم کی روایتیں وضع کیں،

ینزل ربنا عشیة عرفة	عرفہ کی شام کو اللہ رب العزت خاکستری
علی جمل اورق یصافح	رنگ کے اونٹ پر نزول اجلال فرماتا ہے،

---

[1] موضوعات کبیر حرف الہمزہ، [2] اللآلی المصنوعہ فوائد متفرقہ،

[3] المنار المنیف فصل ۳۶،

الرکبان ویعانق المشاۃ[1]،	اور سواروں سے مصافحہ اور پیادہ سے معانقہ کرتا ہے،
خلق اللہ الملائکۃ من شعر ذراعیہ وصدرہ[2]،	اللہ نے فرشتوں کو اپنے بازو اور سینہ کے بال سے پیدا کیا،
ان اللہ اشتکت عیناہ فعادتہ ملائکۃ[3]،	اللہ کی آنکھیں دُکھ آئیں تو فرشتوں نے عیادت کی،
ان اللہ لما خلق الحروف سجدت الباء ووقفت الالف[4]،	اللہ نے حروف پیدا کئے تو باء نے سجدہ کیا، اور الف کھڑا رہا،

اختلاف مسلک کے تحت موضوع روایتیں

(د) مسلک کا اختلاف جس میں کلامی، فقہی اور سیاسی وغیرہ بھی قسم کے اختلاف شامل ہیں، مثلاً

من زعم ان الایمان یزید وینقص فزیادتہ نفاق ونقصانہ کفر فان تابوا والا فاضربوا اعناقھم بالسیف اولئک اعداء الرحمن فارقوا دین اللہ تعالیٰ واستحلوا الکفر وخاصموا اللہ طھر اللہ الارض	جنھوں نے کہا کہ ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے تو اس کی زیادتی نفاق اور کمی کفر ہے، اگر توبہ کرلیں تو خیر، ورنہ اُن کی گردن تلوار سے ماردو۔ یہ لوگ رحمن کے دشمن ہیں، انھوں نے اللہ کے دین میں تفریق کی، کفر کو حلال اور اللہ سے جھگڑا کیا

---

[1] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ البواعث التی ادت الی الوضع ص ۸۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً،

منهم الا فلا صلوٰة لهم الا فلا زكوٰة لهم الا فلا صوم لهم الا فلا حج لهم الا فلا دين لهم هم براء من رسول الله صلى الله عليه وسلم و رسول الله بری منهم[1]	اللہ ان سے زمین کو پاک کیے ان کی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کوئی قبول نہیں، ان کا کوئی دین نہیں، اللہ کا رسولؐ ان سے بری، اور یہ اللہ کے رسول سے بری ہیں،
القرآن کلام الله غیر مخلوق فمن قال بغیر هذا فقد کفر[2]	قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے، جس نے اس کے خلاف کہا وہ کافر ہے،
من رفع یدیه فی الصلوٰة فلا صلوٰة له[3]	جس شخص نے نماز میں اپنے ہاتھ اٹھائے، اس کی نماز نہ ہوگی،
امنی جبریل عند الکعبة فجهر ببسم الله الرحمن الرحیم[4]	حضرت جبریل نے خانہ کعبہ کے پاس میری امامت کی، اور انھوں نے بسم اللہ الخ زور سے پڑھی،

یا مثلاً:-

[1] جلال الدین سیوطی اللآلی المصنوعہ کتاب الایمان، [2] ملا علی قاری، موضوعات کبیر صرف الثقات [3] تذکرۃ الموضوعات باب الصلوٰۃ [4] السنۃ و مکانتہا الخ البواعث التی امرت الی وضعہا،

وقد امرنی جبریل عن ربی	حضرت جبریلؑ نے مجھکو میرے
ان اقوم فی هذا المشهد	رب کی طرف سے حکم دیا ہے کہ
واُعلم کل ابیض واسودان	میں اس مجمع میں کھڑے ہوکر ہر
علی ابن ابی طالب اخی و	سیاہ سفید کو بتادوں کہ علیؓ بن
وصی وخلیفتی والامام	ابی طالب میرے بھائی میرے
بعدی۔[1]	وصی میرے خلیفہ اور میرے بعد
	امام ہوں گے،

غدیر خم کے مقام پر حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا جو واقعہ مشہور ہے، اس پر ابن تیمیہؒ وابن حزم وغیرہ نے بڑی سخت تنقید کی، اور اس کی روایت کو موضوع قرار دیا ہے لیکن شیعہ حضرات نے اس کو حد تواتر تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، ابن ابی الحدید حسینی شرح نہج البلاغہ میں کہتے ہیں:-

واعلم ان الآثار فی هذا الباب	اس باب میں آثار اتنے زیادہ ہیں
کثیرة جداً ومن تاملها و	جو شخص انصاف کے ساتھ غور کرےگا
انصف علم انه لم یکن	وہ جان لے گا، کہ اس بارہ میں
هناک نص صریح ومقطوع	کوئی ایسی صریح اور یقینی نص نہیں ہے
به لا تختلجه الشکوک و	جس سے شکوک واحتمالات نہ پیدا
لا تتطرق الیه الاحتمالات	ہوں، لیکن امامیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ

---

[1] احمد الامینی۔ الغدیر ج ۱۔ الغدیر فی الکتاب الغدیر ۲ ایضاً و الوافی (محسن فیض) طبقات الانوار (حامد حسین)

کما تزعم الامامیة فانهم
یقولون ان الرسول صلی اللہ
علیہ وآلہ نص علی امیر المؤمنین
علیہ السلام و نصاً صریحاً جلیاً

(امامیہ کے خیال کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علیؓ کی خلافت کی کھلی
تصریح کی ہے الخ

اس کے بعد کہتے ہیں :-

ولا ریب ان المنصف اذا
سمع ما جری لهم بعد وفاة
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یعلم قطعاً انه لم یکن هذا
النص ؎۲ ،

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی
منصف مزاج رسول اللہ کی وفات
کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو
سنے گا تو یقین کرے گا کہ اس باب
میں کوئی صریح نص نہ تھی ،

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کی اور روایتیں بھی ہیں جن کو محققین نے
موضوع قرار دیا ہے ، اسی طرح حضرت معاویہؓ کے بارے میں ہے ،

الامناء ثلاثة انا وجبریل
ومعاویة انت منی یا معاویه
وانا منک ،

"امین" تین ہیں ، میں - جبریل ، اور
معاویہؓ ، اے معاویہؓ تو مجھ سے
اور میں تجھ سے ہوں ،

لا افتقد فی الجنة الا
معاویة فیاتی آنفا بعد

میں جنت میں صرف معاویہؓ کو
تلاش کروں گا ، پھر وہ بعد وقفہ

؎۱ ابن ابی الحدید حسینی - شرح نہج البلاغة فی عدم نص صریح علی خلافة والجواب بما تمسک به الشیعة من النصوص ، ؎۲ شرح نہج البلاغة ص ۱۳۵ ،

وقت طویل فاقول من	کے بعد اسی ساعت آجائیں گے
این یا معاویۃ فیقول من	میں ان سے پوچھوں گا کہ معاویہؓ
عند ربی نیا جینی واناجیہ	تم کہاں تھے، وہ جواب دیں گے
فیقول ھذا بما نیل من	میں اپنے رب کے پاس سرگوشی کر رہا
عرضک فی الدنیا	تھا، اور وہ مجھ سے سرگوشی کر رہا
	تھا، یہ اس کے بدلے میں ہے جو دنیا
	میں تمہاری بے عزتی کی گئی،

حضرت عباسؓ کے بارے میں ہے :-

العباس وصیی ووارثی	عباسؓ میرے وصی اور میرے
	وارث ہیں،
ان النبی قال للعباس اذا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
کان سنۃ خمس وثلاثین	(حضرت) عباسؓ سے فرمایا
ومائۃ فھی لک ولولدک	کہ جب سنہ ایک سو پینتیس ۱۳۵ ہوگا
السفاح والمنصور والمھدی[1]	تو وہ تیرے بعد اور تیری اولاد
	سفاح، منصور اور مہدی کے
	لئے ہوگا،

اسی طرح ان بزرگوں کی برائی سے متعلق جس قدر روایتیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب

---

[1] السنۃ ومکانتھا بحوالہ البواعث التی ادت الی الوضع - ابن قیمؒ المنار المنیف فصل ۳۴-۳۵-۳۷-

کی جاتی ہیں وہ سب موضوع ہیں[۵۱]،

داخلی نقد حدیث کے یہ چند اصول ہیں، جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل علم نے حدیثوں کے جانچنے کے لئے کس قدر بلند معیار قائم کیا ہے ان کے علاوہ بھی محدثین نے کچھ کلی قواعد ذکر کئے ہیں، جن میں ابواب کے تحت روایتوں کو موضوع قرار دیا گیا ہے[۵۲]، طوالت کے خیال سے قصداً اُن کو نہیں ذکر کیا جا رہا ہے،

---

۵۱ المنار المنیف فصل ۳۴-۳۵-۳۷، ۵۲ ملاحظہ ہو رسالہ امام صغانی المنار و موضوعات کبیر وغیرہ،

تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری

(تحقیق مزید کی روشنی میں)

مترجمہ۔ محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم اے

(۲)

دیوان ہندس کے علاوہ دوسرے ماخذ میں استاد احمد کا تذکرہ۔

دیوان ہندس کے علاوہ استاد احمد کا تذکرہ بعض دوسری ہم عصر دستاویزات میں بھی ملتا ہے مثلاً "محمد صالح کنبوہ شہر دہلی کی بنیاد رکھے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جمعہ کی رات پچیسویں ذی الحجہ مطابق انیسویں اردی بہشت دور شاہجہانی کے بارھویں سال (۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸-۳۹ء) کی ایک مبارک ساعت میں استاد احمد و حامد نے جو مشہور ماہرین فن میں تھے، ایک ایسے پروگرام کے مطابق اس شہر کی بنیاد رکھی۔ جس کا تصور بھی دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں کیا گیا۔ یہ رسم اس علاقے کے گورنر اور اس مہم کے سربراہ خیرات خان کے زیر نگرانی انجام پائی۔"[۱]

اس کی تصدیق ایک اور فارسی مخطوطہ تاریخ شاہجہانی[۲] سے بھی ہوتی ہے، اس کے دوسرے باب میں قلعہ شاہجہاں آباد اور اس کے اندر بنی ہوئی دوسری

---

[۱] اعمال صالح از محمد صالح کنبوہ جلد ۳ ص ۲۸ (کلکتہ ایڈیشن)

[۲] یہ مخطوطہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے۔

عظیم عمارتوں اور شالیمار باغ کا تفصیلی ذکر ہے،

سرسید احمد خان نے بھی اپنی کتاب آثار الصنادید[1] میں استاد احمد اور استاد حامد کی مختلف علوم میں مہارت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یہ لوگ اپنے فن میں بے نظیر تھے۔ اور ہندسہ و نجوم میں ثانی اقلیدس اور رشکِ ارشمیدس تھے۔"

استاد احمد اور حامد کے علاوہ شاہجہان آباد کی تعمیرات میں کئی اور ماہر معماروں کا بھی اشتراکِ عمل تھا، جن میں سے ایک لطف اللہ ہندس بھی تھا، تذکرہ سفینۂ خوشگو (مخطوطہ) اس کے بارے میں رقمطراز ہے۔

دار السلطنت شاہجہان آباد کا قلعہ لطف اللہ کے صلاح مشورے سے بنایا گیا تھا۔"[2]

اسکی مزید تصدیق حسین قلی خاں کے نشترِ عشق سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے،

"مولانا امام الدین لطف اللہ ہندس کے فرزند تھے۔ جن کے مشورے سے دار السلطنت شاہجہان آباد کے شاہی قلعہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ امام الدین کا انتقال سنہ ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں ہوا۔"[3]

احمد علی سندیلوی کی تصنیف تذکرہ مخزن الغرائب (سنہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۳۰ء)، صبح گلشن

---

[1] آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد سنہ ۱۸۵۴ء اور سنہ ۱۸۷۶ء میں لکھنؤ سے دوسرا اور پھر کانپور سے بھی سنہ ۱۹۰۴ء میں اسکا ایک اڈیشن شائع ہوا۔ [2] "قلعہ دار الخلافہ شاہجہان آباد تجویز و صوابدید او بنا یافتہ" [3] امام الدین خلف لطف اللہ ہندس لاہوری است کہ قلعہ ارک شاہجہان آباد برائے وے بنیاد شدہ ....."

اور تاریخ علمائے ہند آخری عہد کے وہ ماخذ و دستاویزات ہیں، جو شاہجہان آباد کی تعمیر میں لطف اللہ کی شرکت کی تصدیق کرتے ہیں، ان کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ استاد احمد اور ان کا خاندان لاہور سے دہلی منتقل ہوگیا تھا، تاکہ شاہجہان آباد اور آگرہ کی تعمیرات میں شریک ہوسکے۔

اس عہد کی کئی ہم عصر تحریروں میں استاد احمد اور استاد حامد کا بار بار ایک ساتھ اس طرح ذکر آتا ہے کہ قارئی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں صرف رفیق تھے یا رشتہ دار یا بھائی تھے، علامہ ندوی کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں وہ بھائی تھے۔ ایک بار سید صاحب موصوف کی ملاقات دہلی کے ایک معزز اور قدیم خاندان کے ایک شخص سے ہوئی اس نے ان کو بتلایا کہ استاد احمد اور استاد حامد بھائی تھے، اس شخص کی یہ رائے ان روایات پر مبنی تھی جو اپنے اجداد سے سنی تھیں، دہلی کے قدیم باشندوں نے بھی علامہ ندوی کو بتلایا کہ جامع مسجد دہلی کی تعمیر استاد حامد نے کی تھی۔ اور استاد بھیرا بھی اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ (ظاہر ہے کہ یہ نام اس کے ہندو ہونے کی دلیل ہے) جامع مسجد اور دریبہ بازار کے درمیان ایک گلی ہے جس کا نام "کوچۂ استاد حامد" ہے۔ مقامی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ استاد حامد اور احمد کے ورثہ جو ۱۹۵۰ء تک اس کوچہ میں رہتے تھے، "لاہور والوں" کے نام سے مشہور تھے۔

علامہ ندوی کی مذکورۂ صدر رائے سے راقم سطور متفق نہیں کیونکہ اس عہد کی کسی دستاویز سے احمد اور حامد کے رشتہ دار ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، یہاں تک کہ لطف اللہ کے دیوان مہندس میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے

کہ حامد ان کے چچا تھے۔ اور نہ امام الدین حسن ریاضی ہی کی کسی تحریر سے اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، حالانکہ لطف اللہ مہندس اور امام الدین دونوں نے اپنے اسلاف و اہل خاندان کے بارے میں بکثرت تفصیلات دی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ احمد اور حامد بھائی تھے۔ درست نہ ہوگا۔

استاد حامد کے ورثہ کے بارے میں جو دریبہ بازار دہلی کے نزدیک "کوچہ اوستا حامد" میں رہتے تھے، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے لکھا ہے کہ یہ لوگ صراف تھے[۱] لیکن اس کا تعین بہت دشوار ہے کہ یہ لوگ ان ہی استاد حامد کی اولاد ہیں، اس لیے ڈاکٹر چغتائی کی رائے ہے کہ لال قلعہ دہلی کی تعمیر میں شریک استاد حامد اور جن استاد حامد کے نام سے یہ گلی موسوم ہے دو مختلف افراد ہو سکتے ہیں[۱] لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ معاصر دستاویزات میں کسی دوسرے استاد حامد کا تذکرہ نہیں ملتا، دوسرے اس کی شہادتیں موجود ہیں کہ ماہر تعمیرات استاد حامد ہی نے لال قلعہ دلی اور جامع مسجد کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ لہٰذا "کوچہ اوستا حامد" یقینی طور پر اسی معمار کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں تک تاج محل کی نقشہ سازی اور معمار سے کے تعین کا تعلق ہے اس سے استاد حامد اور احمد کے بھائی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ استاد احمد کا نام درج ذیل تحریروں میں بھی ملتا ہے۔

(۱) کتبہ بمقام مارگلہ۔ (ضلع راولپنڈی پاکستان) اس کتبہ میں تحریر ہے کہ

---

[۱] "عظیم مغل معماروں کا خاندان" (انگریزی مقالہ) از ڈاکٹر ایم عبداللہ چغتائی۔ اسلامک کلچر حیدرآباد۔ اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۰۱

شاہراہ سوری شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ اور اس کی مرمت مرزا محمد نے معمار استاد احمد کی نگرانی میں کی تھی۔ جن کے معاون جوگی داس اڈیال داس تحویل دار تھے۔ اس کتبہ پر تاریخ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۳ء کندہ ہے، چونکہ استاد احمد کا انتقال ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں ہوچکا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد احمد کا تعلق اس شاہراہ کی مرمت سے ضرور تھا، لیکن یہ کتبہ ۲۲ سال بعد اس وقت نصب کیا گیا جب یہ تعمیری کام پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا۔ یہ کتبہ شاہراہ سوری کے وسط میں ایک بلند پہاڑی کی چٹان پر سطح زمین سے ۱۰۔ ۱۵ فٹ اوپر نصب ہے۔ اور اکثر محققین کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔[۵]

(۲) انشائے ہرکارہ، یہ ایک فارسی مخطوطہ ہے جس کا ایک باب مکمل استاد سے متعلق ہے۔ دریاؤں، سمندری محافظوں اور ملاحوں کے تذکرہ میں مرقوم ہے کہ "چونکہ شاہی احکام کی تعمیل کے سلسلہ میں احمد کو اکثر اس آبی شاہراہ سے گذرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر متعلقہ شخص کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ استاد احمد کے گذرنے میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے"[۶] اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی نظروں میں استاد احمد کی کتنی قدر و منزلت تھی اور وہ تعمیرات کے سلسلہ میں شاہی احکام کی بجا آوری کے لیے اکثر دور دراز ملکوں کا سفر بھی کیا کرتے تھے۔

(۳) خط مورخہ ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء[۷] یہ خط ملا فرید ابراہیم کے نام ہے اس میں مرقوم ہے کہ ملا فرید ابراہیم کو ریاضی دانوں کے بادشاہ استاد احمد سے بڑی تقویت ملی تھی، یہ

---

[۵] خواجہ رشید الدین کا مقالہ شائع شدہ ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۵۶ء، [۶] استاد احمد اور اسکا خاندان، مصنفہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لاہور ۱۹۵۷ء [۷] مخطوطہ برٹش میوزیم

یہ نام احمد ہمارے زیر بحث استاد احمد ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس خط پر سنہ ۱۶۳۰ء کے وسط کی تاریخ درج ہے۔ یعنی ممتاز محل کی وفات سے ایک سال قبل کی تاریخ۔ یہ وہ وقت تھا جب اس نادرۂ عصر معمار کا ستارۂ اقبال عروج پر پہونچنے والا تھا۔ چنانچہ اس کے صرف ایک سال بعد ۱۶۳۱ء میں اس کو ملکہ کے شاندار مقبرہ کی تعمیر کا کام سپرد ہوا۔

(۴) تذکرۃ الاولیاء[1] مصنفہ فرید الدین عطار۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا کاتب لطف اللہ بن احمد بن یوسف بن حسن بن عبدالطیف تھا۔ یہ کتاب سنہ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں بمقام دولت کدہ محمد لکھی گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ترکی مورخین نے دو معماروں عیسی اور یوسف کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ سنہ ۹۳۳ھ/۱۵۲۶-۲۷ء میں شہنشاہ بابر کے ہمراہ آئے تھے، عیسی اور یوسف ترکی معماروں میں سب سے ہوشیار و ماہر سینان پاسنیان بے کے شاگرد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ہندوستان میں مقیم رہا۔ اور یہیں اس کے بیٹے احمد کی ولادت ہوئی۔

اتفاق سے ایک اور فارسی مخطوطہ تذکرہ باغستان[2] مصنفہ امام الدین ریاضی بن لطف اللہ مہندس بن استاذ احمد بھی دستیاب ہو گیا ہے، یہ کم و بیش سنہ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء کا مکتوبہ ہے۔ مصنف نے اپنے والد بزرگوار کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

---

[1] مخطوطہ بوڈلین لائبریری [2] امام الدین حسین ریاضی نبیرہ استاذ احمد معمار تاج اور اسکا تذکرہ باغستان (انگریزی مقالہ) از ڈاکٹر نذیر احمد شائع شدہ اسلامک کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۳۳۰ تا ۳۵۰،

"عظیم ترین ریاضی داں، معماروں میں بہترین لطف اللہ ہندس
بن احمد ہروی لاہوری"

ان کے ابتدائی وطن کے بارے میں امام الدین لکھتے ہیں کہ الہروی
(یعنی ھراۃ کا باشندہ) ثم لاہوری ثم دہلوی" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
ان کے مورث اعلیٰ یوسف ہرات سے ترک وطن کر کے لاہور آئے تھے۔ اور
وہیں مقیم ہو گئے۔ اور اس کے بعد استاذ احمد دہلی منتقل ہو گئے۔ جہاں
اب بھی ان کا خاندان لاہوری کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۵) مرأۃ واردات۔ مصنفہ محمد شفیع نگینوی مکتوبہ ۱۱۴۶ھ / ۱۷۳۳-۳۴ء اس میں
عہد شاہجہانی (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ مصنّف
خانہ آصف خان کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"شاہجہانی دور میں تعمیر کردہ شاہی عمارات لال قلعہ، جامع مسجد
تاج محل، شالیمار باغ اور پنجم خانہ آصف کا ساری دنیا میں ثانی
نہیں مل سکتا ہے۔ نواب آصف خان کا محل[1] بھی حیرت انگیز فن تعمیر
کا نمونہ ہے۔ جس کے کئی قطعے اور لاتعداد کمرے ہیں۔ نواب آصف
خان کی موت کے بعد شاہزادہ دارا شکوہ نے شاہجہاں سے درخواست
کی تھی کہ یہ محل اسے دیدیا جائے۔ چنانچہ وہ اسے مل گیا۔ اپنے محل کے
سامنے دارا شکوہ نے دو چھوٹی عمارتوں کی تعمیر شروع کی تھی۔
لیکن ابھی نصف کام بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس کا خزانہ خالی ہو گیا۔

---

[1] جو شیش محل بھی کہلاتا ہے۔

اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ ولی عہد شاہزادہ تھا۔ اور اسے پانچ لاکھ کا صرف خاص ملتا تھا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ جب خانہ آصف خان مکمل ہو گیا تو معمار استاذ احمد نواب موصوف کو اپنے ہمراہ محل دکھانے لے گیا۔ نواب اس کو دیکھکر سخت برافروختہ ہوا۔ اور بولا" ارے کمبخت تو نے ایک ایسی عمارت بنائی ہے جس میں کوئی شخص پاؤں پھیلا کر آرام سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔" استاد احمد جس کو توقع رہی ہوگی۔ کہ نواب اس کے فن کو سراہے گا۔ اور انعام و اکرام سے مالا مال کرے گا۔ شدید مایوس ہوا۔ اور یہ منہ توڑ جواب دیا۔"جناب والا! آج تک میں نے کوئی ایسا محل نہیں دیکھا جس میں کوئی اپنے پاؤں کو پھیلا سکے، اور آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے حضور کے پاؤں سوائے قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری کے اور کہیں نہیں پھیل سکتے۔" اس دانشمندانہ جواب سے نواب آصف خان بہت خوش ہوا۔ اور اسی وقت ایک لاکھ روپے انعام خلعت فاخرہ اور دیگر تحائف سے سرفراز کیا۔ ان شاندار عمارتوں میں وسیع ہال اور بیش قیمت سامان آرائش سے مزین لاتعداد کمرے ہیں،

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے ... استاذ احمد لاہوری کو تاج محل کا نقشہ نویس اور معمار قرار دئے جانے پر بہت شک و شبہہ کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے۔

"استاد احمد لاہوری دور شاہجہانی کے ایک ماہر معمار تھے۔ لیکن تاج محل کی تعمیر سے ان کے تعلق کو شبہہ سے بالاتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ان کے فرزند لطف اللہ مہندس نے دیوان مہندس میں شاہجہانی دور کے معماروں میں اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے افراد کو خصوصی طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔[لے]

اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مہندس کا جو قلمی نسخہ ڈاکٹر چغتائی کو اپنے دوست ابو صالح محمد عمر یافعی حیدر آبادی سے پونہ میں ملا تھا۔ اس میں وہ اہم نظم شامل نہیں ہے۔ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہجہاں نے استاد احمد لاہوری کو ممتاز محل کے مقبرہ کی تعمیر کا کام سپرد کیا تھا۔[سے]

ڈاکٹر چغتائی کو گرچہ عمل صالح اور تاریخ شاہجہانی کے اس بیان سے اختلاف ہے کہ لال قلعہ کے بنانے میں استاذ احمد کا ہاتھ تھا۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ تاج محل کی تعمیر سے بھی استاذ موصوف کا کوئی تعلق تھا۔ اس یقین نہ کرنے کی وجہ محض یہ ہے کہ اس کے واحد گواہ لطف اللہ مہندس ہیں انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں عمارتوں کے معمار ان کے والد بزرگوار تھے۔ لیکن مہندس کی اس شہادت کو ناقابل یقین ہونے کا

لے "تاج محل کی تعمیر" مقالہ از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ رسالہ کاروان لاہور ۱۹۳۴ء سالانہ نمبر ص ۱۲۵، و "عظیم معماروں کا خاندان" (انگریزی مقالہ) اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۴ء ص ۲۰۰ و "آگرہ کا تاج محل (کتاب مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء) ص ۱۱۵، احمد معمار لاہوری اور اس کا خاندان (انگریزی کتاب مطبوعہ لاہور ۱۹۳۸ء) توشیحی لکچر پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۷ء۔ سے "استاد احمد لاہوری اور اس کا خاندان" مصنفہ چغتائی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء۔

کوئی مدلل و معقول جواب ڈاکٹر چغتائی نے نہیں دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوان ہندس کے ایک سے زیادہ نسخے موجود ہیں۔ اور ان میں صرف ایک ہی نسخہ اصلی ہوگا۔ ممکن ہے کہ پونہ والا نسخہ (جو چغتائی کی نظر سے گذرا ہے۔) اصلی نسخہ کی ہوبہو نقل نہ رہا ہو۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا دیوان ہندس کے تمام نسخوں کا سراغ لگایا جاچکا ہے؟ دیوان مذکور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد کے خاندان کے افراد دارا شکوہ کے پر زور حامی تھے۔ غالباً اسی سبب سے تاج محل اور دوسری اہم عمارتوں کے کاریگروں کی فہرست سے استاد احمد کا نام خارج کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے اورنگ زیب کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ لطف اللہ ہندس اپنے عہد کی نہایت ذی علم اور معزز شخصیت تھے، ان کو دیوان ہندس کی حقیقتوں کو منظر عام پر لانے کے سوا کسی کذب بیانی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اور اگر انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو اس کا پردہ فاش ہونے میں زیادہ وقت نہ لگتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عہد مغلیہ سازشوں سے بھرا ہوا تھا۔

تاریخ کے طلبہ اور محققین کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی کہ شاہجہانی دور کے تذکروں مثلاً عبد الحامد لاہوری کے بادشاہ نامہ اور محمد صالح کنبوہ کے عمل صالح میں صرف مکرمت خان اور میر عبد الکریم ہی کے نام ملتے ہیں ان دونوں کو تاج محل کی تعمیر کی نگرانی کا کام سپرد ہوا تھا۔ ظاہر ہے ان کو مشاہرے بھی نسبتہً زیادہ ملتے رہے ہوں گے۔ یہ محض ایک اتفاق ہی معلوم ہوتا ہے۔

کہ مندرجۂ بالا کتابوں کے مصنفوں نے تاج محل کے معمار کی حیثیت سے استاد احمد
کا تذکرہ نظرانداز کر دیا۔ اور یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی یہ ذرا سی غفلت
دو صدیوں کے بعد کتنی شعلہ ساماںیوں کو جنم دے گی۔ اور ایک ایسی غیر منتہی
بحث کا دروازہ کھول دے گی جس کی ابتدا ۱۸۴۴ء میں سر ولیم سلی مین
(William Sleeman) نے آسٹن دی بوردو کو معمار تاج
قرار دے کر کی تھی۔ اگر عبدالحامد لاہوری اور محمد صالح نے اس غفلت کے
انجام پر غور کیا ہوتا تو وہ اس ضروری نکتہ کو ظاہر کرنا اپنا فرض خیال کرتے
کیونکہ یہ دونوں شاہجہانی دور کے بلند پایہ محقق تھے۔

ایک اور نکتہ جو ہمیں دعوت فکر دیتا ہے، یہ ہے کہ جس طرح دیوان ہندس
کے نسخۂ پونہ میں استاد احمد کا نام معمار تاج کی حیثیت سے مذکور نہیں ہے اسی طرح
بہت ممکن ہے کہ بادشاہ نامہ اور عمل صالح کی بھی متعدد نقلیں ہوئی ہوں جن میں
سے بعض میں کسی مصلحت کے پیش نظر یا کسی وجہ سے تاج محل کے نقشہ نویس کا
تذکرہ درج نہ کیا ہو۔ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ ان مخطوطات کی کتنی ہی نقلیں
ہند و بیرون ہند میں موجود ہیں۔ ان تمام نسخوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اصل
نسخہ کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے، تب یہ تحقیق ہو سکے گی کہ اس اصل نسخہ میں
معمار تاج کا تذکرہ ہے یا نہیں؟

جب تک یہ تحقیق... مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک لطف اللہ کے
بیان پر شبہہ کرنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ اور نہ کوئی ایسا معقول سبب
نظر آتا ہے جس سے دیوان مہندس میں لطف اللہ کے دیئے ہوئے بیانات کی

تردید کیجا سکے محض اتنی بات تردید کے لیے کافی نہیں ہے۔ کہ لطف اللہ ہندس استاذ احمد معمار کے فرزند تھے۔ اور وہ اپنے والد بزرگوار کی صلاحیتوں اور شاندار کارناموں کے لیے ان کی توصیف کرتے تھے۔ یا وہ اپنے اہل خاندان کے مدح خوان تھے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مشہور محقق ڈاکٹر نذیر احمد کے نظریات کا مطالعہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے عالمانہ مقالہ "امام الدین حسین ریاضی نبیرہ نادر العصر استاذ احمد معمار[۱] تاج محل" میں بڑے پر زور الفاظ میں لکھا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کئی برس کی تحقیق و کاوش کے بعد یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کہ لطف اللہ ہندس کے والد بزرگوار استاذ احمد ہی اس اعجوبہ دوراں تاج محل کے معمار تھے۔[۲] دیوان ہندس میں اس بات کا بین ثبوت موجود ہے۔ اس میں ایک چھوٹی سی مثنوی ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے والد اور دوسرے اہل خاندان کا تعارف کراتے ہوئے استاذ احمد کا ذکر لال قلعہ اور تاج محل کے معمار کی حیثیت سے کیا ہے۔[۳]

دیوان ہندس کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں۔

"تمام مثنویوں میں وہ مثنوی سب سے اہم ہے جس میں لطف اللہ ہندس نے اپنے والد اور بھائیوں کا ذکر کیا اور استاد احمد کو بنام مشہر

---

[۱] شائع شدہ اسلامک کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۳۳۳ تا ۵۰۰

[۲] امام الدین حسین ریاضی نبیرہ استاذ احمد معمار تاج اور اس کا تذکرہ باغستان (انگریزی مقالہ) از ڈاکٹر نذیر احمد اسلامک کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۳۳۰

[۳] ایضاً ص ۳۳۱

پر پہونچا یا ہے۔[1]

ہندس خاندان کے داراشکوہ اور اس کے بیٹے سے تعلقات کی تصدیق بھی ایک مثنوی سے ہوتی ہے۔ اس میں کچھ قطعات داراشکوہ سے متعلق ہیں ایک قطعہ اس کی تعمیرات کے بارے میں ہے۔ ایک دوسرے قطعہ کا تعلق اس کی خاص کلید سے ہے، تیسرے قطعہ میں اس کے بیٹے سلیمان شکوہ کی جشن عروسی کا تذکرہ ہے۔ لطف اللہ ہندس ایک جگہ بہت پرزور الفاظ میں لکھتے ہیں۔ ہم سب معمار و ماہر تعمیرات ہیں، میرے تیار کردہ نقشے اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے مہر درخشاں کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ جب میں اپنا کام کرنے بیٹھتا تو بادشاہ امور سلطنت میں مصروف ہوجاتا ہے۔[2]

لطف اللہ ہندس کا آبائی وطن ہرات تھا۔ جہاں سے اس کے مورث اعلیٰ ترک وطن کرکے ہندوستان آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کی پھر وہاں سے ان کے والد (استاذ احمد) دہلی منتقل ہوگئے۔ امام الدین حسین ریاضی کے تذکرے باغستان کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں۔

"ہم عصر مورخین نے استاذ احمد کو دور شاہجہانی کے ایک ممتاز معمار کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ تعمیرات کے تمام شعبوں سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ ان کے فرزند ہندس کے بیان کے مطابق انھیں کمال

---

[1] از ڈاکٹر نذیر احمد اسلامک کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۳۳۲

[2] مترجم :- اصل فارسی اشعار جن کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

ماہمہ معمار و عمارت گریم

چنان منیر شود شبیہ عمارت من	کہ نور مہر بود تیز و نور او تاری
دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول	ملک مصالح کار ادر د بسر باری

ا مقالہ سلطان ... ص ...

فن کے باعث نادر العصر کا خطاب ملا تھا۔ لیکن ریاضی کے باغستان میں ہمیں نادر العصر کے بارے میں کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا۔ ریاضی نے اپنے باپ لطف اللہ کی تصنیف "تذکرہ ہندس" (یعنی دیوان مہندس) کے حوالہ سے محض یہ بتایا ہے کہ استاذ احمد کے مولانا مرشد شیرازی سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ شیرازی کو مکرمت خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اور وہ استاد احمد کے خلف اکبر عطاء اللہ رشیدی کے استاد تھے۔[1]

یہ اقتباسات دیکر ڈاکٹر نذیر احمد نے یہ بتایا ہے کہ کن کن مواقع پر استاد احمد نے اپنے کو ریاضی اور دوسرے سائنسی علوم میں مکرمت خان سے برتر و افضل ثابت کیا تھا۔ بقول ڈاکٹر صاحب موصوف یہ بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ استاد احمد علم کے ایک بحر بیکران تھے۔ مکرمت خان جیسے عالم کا نادر العصر سے پسپا ہو جانا اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ استاد احمد علم ریاضی نجوم اہیئت وہندسہ اور دوسرے سائنسی علوم میں بڑی عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے درمیان بحث ومناظرہ کے باوجود مکرمت خان اور استاد نادر العصر نہایت گہرے دوست تھے یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں عالم ایک ہی سال عالم جاودان کو سدھارے۔

استاد احمد کی دریافت سب سے پہلے کس نے کی؟

استاد احمد لاہوری کی شخصیت کا سب سے پہلے کس نے انکشاف کیا؟ اس کی وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

---

[1] امام الدین حسین ریاضی نبیرہ استاد احمد معمار تاج" از۔ ڈاکٹر نذیر احمد اسلامک کلچر حیدرآباد اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۳۱۶-۳۳۰۔

اٹلی کے ماہر طغرا نگار انٹونیو زوبی ——— (Antonio zobie)
نے اپنی مشہور تصنیف (Notize Storiche Sull origine e Progressi dei lavori e di commesso in Pietre dure) میں ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔ جو انھیں ہندوستان
کے برطانوی گورنر جنرل چارلس مٹکاف (C. Metcalfe) نے
۱۸۵۳ء میں لکھا تھا اس خط میں ہے کہ

"تحریروں اور روایتوں سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہانی دور
کی کل تعمیرات استاد احمد اور استاذ حامد کی عظیم صلاحیتوں کا نتیجہ
تھیں۔ یہی دونوں وہ معمار تھے۔ جن کی ذہنی صلاحیت اور جمالیاتی
ذوق نے ہمیں آفاقی شہرت کا حامل تاج محل عطا کیا۔ اور وہ تمام شاندار
سنگی عمارتیں بھی تعمیر کیں جو دہلی اور آگرہ کی زینت بڑھا رہی ہیں"

مندرجہ بالا اقتباسات پر تبصرہ کرتے ہوئے پادری ایچ آسٹن
(Rev. H. HosTen) نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یقیناً مٹکاف
کو بھی یہ بات اس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہو گی جس سے سرسید احمد خاں کو
معلوم ہوئی تھی۔[1]

لیکن راقم سطور چارلس مٹکاف کے جمالیاتی ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے
یہ عرض کرتا ہے کہ ۱۸۵۳ء کے بہت پہلے سرسید احمد خان ایک ممتاز عالم،
تاریخ داں اور ماہر آثار قدیمہ تسلیم کیے جا چکے تھے۔ لہذا یہ قرین قیاس ہے کہ

---

[1] رسالہ یوپی، ہسٹاریکل سوسائٹی مئی ۱۹۳۲ء ص ۱۳۲

مٹکاف کو یہ اطلاع خود سرسید کی مشہور تصنیف آثار الصنادید سے ملی ہوگی۔ جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی لائبریری کے سبحان اللہ خاں کلکشن میں "رسالہ احمد معمار" نامی ایک مخطوطہ (مکتوبہ ۱۳۰۶ھ) کا حوالہ دیتے ہوئے سرسید احمد نے استاد احمد کا تذکرہ دوسرے رسائل میں بھی ملنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ملا فرید ابراہیم کے نام ایک خط مکتوبہ ۱۶۸۷ء کی تصنیف تذکرۃ الاولیا و شیخ فرید الدین عطار محمد شفیع نگینوی کی کتاب "مرآۃ واردات" (مکتوبہ ۱۳۳۴ھ) ممکن ہے ان کو مانڈو میں ہوشنگ شاہ کے مقبرہ کے کتبہ (مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۶۵۹ء) میں بھی استاذ احمد کا نام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

چونکہ مٹکاف نے سرسید احمد خان کے اس بیان کی تائید کی ہے کہ استاد احمد ہی وہ شخصیت ہے جس نے تاج محل کا نقشہ تیار کیا تھا۔ لہذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سرسید نے بھی لطف اللہ مہندس کے دیوان مہندس کا مطالعہ کیا تھا۔ جو انھیں علی گڑھ میں دستیاب ہوا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید احمد پہلے شخص ہیں جنھوں نے دنیا کو استاد احمد کے معمار تاج ہونے کی حقیقت سے روشناس کرایا۔

اختتامیہ۔ مذکورہ بالا ماخذوں سے حاصل شدہ معلومات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ استاد احمد اور ان کا خانوادہ صاحب علم و فن تھا اور اس کے افراد مختلف سائنسی موضوعات پر بکثرت کتابوں کے مصنف اعلی درجہ کے شاعر، اور سب سے بڑھکر بہترین معمار اور نقشہ نویس تھے،

یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ استاد احمد نے ممتاز محل کے مقبرہ کی نقشہ سازی اور تعمیر کی۔ اور ان کے بیٹے عطاء اللہ رشیدی نے اورنگ آباد میں شہنشاہ اورنگ زیب کی محبوب بیوی دلرس بانو بیگم[1] (رابعہ دورانی) کے مقبرہ کی تعمیر کی۔ جس کا انتقال زچگی کی حالت میں ۱۲۵۷ء میں اسی طرح ہوا تھا۔ جس طرح ممتاز محل کا۔ چونکہ رابعہ دورانی کے مقبرہ کی تعمیر اس کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۱۶۵۹ء میں شروع ہو گئی تھی۔ لہذا اس بات کو محض حسن اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ دونوں مقبرے (جن میں سے ایک کی تعمیر باپ نے کی اور دوسرے کی بیٹے نے) بہت حد تک باہم مشابہت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے بیٹے کو تعمیر کا فن اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس لئے اگر اورنگ زیب نے بھی اپنے باپ شاہجہاں کی طرح خزانہ کا منہ کھول دیا ہوتا۔ تو عطاء اللہ رشیدی اورنگ آباد میں اس بھونڈی نقالی کے بجائے یقیناً تاج محل کا ثانی اور مدمقابل کھڑا کر دیتا۔

مذکورۂ بالا معلومات کو یکجا کر کے ہم استاد احمد لاہوری کی داستان اس طرح ترتیب دے سکتے ہیں کہ جب ۱۵۲۵ء میں بابر ہندوستان آیا۔ تو اس کے ہمراہ آنے والے لوگوں میں بہت سے فنکار، معمار، اور صنعت کار بھی تھے۔ جو بادشاہ کے ذوق جمال کی تکمیل کے لیے اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ فن کاروں اور معماروں کے اس گروہ میں یوسف اور عیسیٰ بھی تھے۔ جو ترکی کے عظیم ماہر تعمیرات سینان کے شاگرد تھے۔ بعض ترک مورخین کا خیال ہے کہ یہ دونوں شاگرد بھی ترک

---

[1] دلرس بانو بیگم دربار اکبری کے نمایاں شخص خان خانان عبد الرحیم خان کی پوتی اور شاہنواز خان کی بیٹی تھی۔

نژاد تھے۔ لیکن امام الدین ریاضی اور اس کے والد لطف اللہ کے بیانات سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ یوسف بن حسن بن عبداللطیف ہراۃ کے باشندے تھے۔ جو غالباً سینان کے زیر نگرانی مزید تعمیری مہارت حاصل کرنے کے لئے ترکی گئے ہوں گے۔ یہاں سے وہ وسط ایشیا پہونچے اور اس کے بعد بابر سے ملے۔

یوسف کی تعمیراتی مہارت کی بنا پر بابر اسے ہندوستان لایا یہ تو ثابت نہیں کہ یوسف نے بابر کے لئے بھی کچھ تعمیر کیا ہو۔ لیکن اتنا مسلّم ہے کہ وہ لاہور میں مقیم ہو گیا اور یہیں اس کے فرزند احمد کی ولادت ہوئی جو آگے چل کر بڑا ہونہار ثابت ہوا۔ اور فن تعمیر میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ احمد کو علم نجوم، فن تعمیر ریاضی و ہندسہ وغیرہ علوم طبیعات سے گہری دلچسپی تھی۔ لاہور اور مغلیہ سلطنت کے کسی حصہ میں جہاں اس کی تعمیری ذمہ داریاں اس کو لے گئیں اس کی ذہانت اور شہرت نے اسے ہر فن کے ماہرین سے روشناس کرایا۔ یہاں تک کہ میر عبدالکریم عرف ماہور خان جیسے لوگوں کے ساتھ اس کا شمار ہونے لگا۔ اس کی شہرت نے اسے نامور معمار ملا مرشد شیرازی المخاطب بہ مکرمت خان اور استاد حامد کار (جو بعد میں لال قلعہ کی تعمیر میں اس کے شریک کار رہے) ہم پلہ بنا دیا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ دربار مغلیہ کے بعض مقربین خاص مثلاً نواب آصف خان اور نواب وزیر خان (شاہی طبیب) سے بھی متعلق رہا۔

جس زمانے میں اس کا قیام پنجاب میں تھا۔ وہ استاد احمد لاہوری کی

حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں بادشاہ نے اس کو شاہراہ سوری کی مرمت کے کام پر مامور کیا۔ اس کام میں دو ہندو ماہرین جوگی داس اور دیال داس تحویلدار بھی اس کے معاون تھے۔ اس کام میں احمد کی شرکت کا ثبوت مذکورۂ بالا کتبہ سے بھی ملتا ہے یہ کتبہ اس کی وفات کے کئی سال بعد ۱۷۰۱-۱۶۹۲ء میں کام مکمل ہو جانے کے بعد مارگلہ میں نصب کیا گیا۔ قیام لاہور کے دوران میں استاد احمد نے نورجہاں کے بھائی نواب آصف خان کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کیا۔ اور شاہزادہ دارا شکوہ اور اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کے بھی بہت سے تعمیری کام انجام دیئے۔

استاد احمد کے تین فرزند تھے۔ عطاء اللہ۔ لطف اللہ اور نور اللہ ان سب کو اپنے باپ کے تمام فنون ورثہ میں ملے تھے، عطاء اللہ کی تعلیم مکرمت خان کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ جو استاد احمد کے گہرے دوست تھے۔ شہرت کے عروج پر پہونچنے پر ان تینوں لڑکوں کو عطاء اللہ رشیدی، لطف اللہ مہندس اور نور اللہ معمار کے نام سے موسوم کیا جانے لگا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہان نے احمد کو شاہی ملازمت پر برقرار رکھا۔ اور اپنے دارالسلطنت آگرہ کی تحسین و تزئین کا کام سپرد کیا۔ جب شکستہ دل شہنشاہ نے اپنی ملکہ ممتاز محل کے لیے ایک لافانی شاہکار تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ تو اس کے لیے وزراء کی ایک کمیٹی

تشکیل دی۔ اور پورے ملک کے ماہر معماروں کو مقبرہ کا بہترین نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ ان تمام نقشوں کا شاہجہان نے بغور مطالعہ کیا۔ اور آخریں استاد احمد کے نقشہ کو شرف قبولیت حاصل ہوا۔ اور اس نے استاد احمد کو اس کے نقشہ کے مطابق لکڑی کا ماڈل تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس ماڈل کو شاہجہان نے بہت پسند کیا۔ اور استاد احمد کو یہ شاہکار تعمیر کرنے کا حکم ملا، اور آج اسی تخلیق کو ہم نوادرین شمار کرتے ہیں۔ اس تعمیر کے صلہ میں استاد احمد کو نقد انعامات کے علاوہ نادر العصر کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔

اس تعمیر کے دوران استاد احمد کے دو قدیم رفقائے کار میر عبدالکریم اور مکرمت خان نگران اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۶۳۹ء میں جب تاج محل تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھا۔ شہنشاہ نے دہلی میں ایک نیا دار السلطنت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تدرۃ آگرہ میں استاد احمد لاہوری کی چابکدستی کا شاہکار دیکھنے کے بعد شاہجہاں کی نظر انتخاب استاد احمد ہی پر پڑی۔ اس کام میں احمد کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک اور ماہر معمار استاد حامد کو آپ کا معاون مقرر کیا گیا۔ جس کے بارے میں کچھ مورخین کا خیال ہے کہ وہ استاد احمد کے بھائی تھے۔ استاد احمد کے دوسرے فرزند لطف اللہ بھی ان لوگوں میں تھے۔ جن کو لال قلعہ کی تعمیر میں بطور کاریگر مقرر کیا گیا تھا۔ اور لطف اللہ کو اس کی

مہارت کی بنا پر شاہجہاں نے ہندس یعنی انجینئر کا خطاب عطا کیا۔ شاہجہان سے لطف اللہ کے قریبی روابط کی شاہد وہ تحریریں بھی ہیں۔ جن میں اس نے خود کو شاہجہانی لکھا ہے۔

استاد احمد غالباً ۱۶۳۱ء کے قریب لاہور سے آگرہ آئے اور اسکے سات سال بعد وہ دہلی پہونچے۔ جہاں انکا خاندان سکونت پذیر ہو گیا۔ دہلی میں مستقل اقامت اختیار کرنے کے باوجود ان لوگوں کو ہمیشہ لاہوری کہا جاتا۔

اپریل ۱۹۷۶ء میں مقالہ نگار کو آگرہ میں ایک ایسے مقبرہ کا پتہ چلا جو کے ڈی پالیوال پارک کی شمالی دیوار سے بالکل متصل ہے۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ استاد عیسیٰ کا مقبرہ ہے۔ لیکن جیسا کہ راقم سطور پہلے ثابت کر چکا ہے کہ استاد عیسیٰ کا کوئی وجود نہیں مگر ایک صدی سے زائد تک لوگ استاد عیسیٰ ہی کے تاج محل کے نقشہ نویس ہونے کا غلط تصور قائم کیے رہے لہذا ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ مقبرہ میں مدفون جسد خاکی استاد احمد کے علاوہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ مقبرہ اس شارع عام کے ٹھیک کنارے واقع ہے۔ جو مذکورہ پارک اور سنٹرل ہندی انسٹیٹیوٹ لائبریری کے درمیان سے گذرتی ہے۔ اور یہ مقبرہ تاج محل سے بھی نظر آتا ہے۔

اس معمار کے ورثہ وزیر پورہ اور کربلا کی کالونیوں کے آس پاس اب بھی موجود ہیں۔ وزیر پورہ کالونی نواب وزیر خاں کے نام سے موسوم ہے، جو شاہی طبیب تھے۔ ان ہی نے ممتاز محل کے مرض الموت میں اس کا علاج کیا تھا۔ یہ بھی ممکن کہ وزیر خاں کے

اہل خاندان نے استاذ احمد کے گھر والوں کو اپنے یہاں پناہ دی ہو۔ کیونکہ استاد احمد اور نواب وزیر خان کے درمیان عرصۂ دراز سے دوستانہ مراسم تھے۔

یہ دلیل کسی طرح قابل قبول نہیں کہ تاج محل کے نقشہ نویس کی شخصیت پر اس دور کی کوئی دستاویز ایسی روشنی نہیں ڈالتی جس سے لطف اللہ کے اس بیان کی تصدیق ہو سکے کہ اس کے والد استاد احمد ہی تاج محل کے نقشہ نویس تھے، کیونکہ مغلیہ دور کی بہت سی مشہور عمارتوں کے معماروں کا تذکرہ اس دور کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ عہد شاہجہانی میں تعمیر کردہ عمارتوں کی کہکشاں میں تاج محل ایک کوکب تاباں کی حیثیت رکھتا ہے مغلیہ دور کے۔۔۔ مورخین کے پاس تاریخ نگاری کا اتنا مواد تھا کہ اس میں ہر نام اور ہر واقعہ کا ذکر کسی طرح ممکن نہ تھا اس لیے مغلیہ دربار کے نقطۂ نظر سے صرف ایسے مشہور معماروں کا نام مورخین نے لکھا ہے۔ جو تعمیری شعبوں میں اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے۔ استاد احمد لاہوری نادر العصر کا نام رفتار زمانہ کے ساتھ بدلتا رہا چنانچہ پہلے تو وہ استاد نادر العصر ہوا۔ پھر استاذ عصر ہوا۔ اور آخر میں استاد عیسیٰ رہ گیا انیسویں صدی کے اوائل تک یہی نام لوگوں کی زبانوں پر تھا۔ اور اس وقت تک قائم رہا۔ جب تک سنہ ۱۹۳۰ء میں لطف اللہ کے دیوان ہندسہ کی دریافت نہ ہوئی۔

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

از جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی ہیوا سدن کالج پونہ

برہان پور کی عظیم الشان شاہی جامع مسجد فن تعمیر کا عجیب نمونہ ہے، اسکے فلک بوس مینارے، کشادہ صحن، وسیع احاطہ، بلند دروازہ، حجروں کی قطاریں، دو حوض، سنگِ خارا کے لمبے ستون، کمانوں اور محرابوں کی ساخت اور ان کے نقش و نگار عجیب دلکش منظر پیش کرتے ہیں، عبد الباقی نہاوندی اور خافی خاں جیسے موٴرخوں نے اس کی نادر تعمیری صنعت کی تعریف کی ہے، اس جامع مسجد کا بانی فاروقی سلطنت کا اولوالعزم بادشاہ راجہ علی خاں الملقب بہ عادل شاہ تھا، جو نیک خصلت رعایا پرور، عالم باعمل، علماء کا قدردان صلحاء کا معتقد، اعلیٰ درجہ کا مدبر اور بڑا شجاع و بہادر تھا، اسے فن تعمیر سے بھی دلچسپی تھی، وہ سنہ ۹۸۴ھ میں اپنے بھائی محمد شاہ فاروقی کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا، اور اکیس[۲۱] سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۱۰۰۵ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا، اس نے اپنے دور حکومت میں امن و امان قائم کیا، رعایا کو خوشحال بنایا، مسجدیں، مدرسے، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، اور فوجی طاقت بڑھائی، محمد قاسم فرشتہ نے عادل شاہ فاروقی کی مدح میں ایک نظم لکھی ہے، جس میں اس کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے ؎

چو نسبت دار فاروقی است بادا جاوداں عدلش ہلاہل خوردگانِ ظلم را تریاقِ فاروقی

مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی اہم شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دربار اکبری میں تحریر کیا ہے کہ " راجہ علی خاں (عادل شاہ فاروقی) ایک کہن سال تجربہ کار تھا، نام کو برہان پور اور خاندیس کا حاکم تھا، مگر تمام خاندیس اور دکن میں اس کی تاثیر اثر برقی کی طرح دوڑی ہوئی تھی اور امور سلطنت کے ماہر اسے دکن کی کنجی کہا کرتے تھے۔"[1] اکبر نے دکن کی فتوحات کا دروازہ اسی کلیدِ دکن سے کھولا، یعنی عادل شاہ فاروقی کی حمایت سے اس کو دکن کی جنگوں میں فتح حاصل ہوئی، اس نے دکن کی مہمات کے سلسلہ میں شہزادہ مراد کو تاکید کی تھی کہ ہر معاملہ میں عادل شاہ فاروقی سے مشورہ اور اسی کی رائے پر عمل کرنا خواہ وہ رائے تمھیں غلط ہی کیوں نہ معلوم ہو۔[2] اکبر کے اس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عادل شاہ کے فہم وتدبر کا کس قدر قائل تھا۔

عادل شاہ فاروقی کا دورِ حکومت جنگ وجدل اور سیاسی کشمکش میں گذرا، اسکے باوجود اس نے اپنے فطری ذوقِ تعمیر کی بنا پر کئی عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) عادل پورہ زین آباد کی عظیم جامع مسجد اور اس سے ملحقہ سرائے

(۲) عادل پورہ برہانپور کی شاندار مسجد اور اس سے ملحقہ سرائے۔

(۳) حضرت شاہ منصورؒ کی مسجد (۹۹۰ھ)

(۴) قلعۂ اسیر کی شاہی جامع مسجد (۹۹۳ھ تا ۹۹۶ھ)

(۵) اسیرگڑھ کی عید گاہ (۹۹۷ھ)

(۶) برہان پور کی شاہی جامع مسجد (سنہ تاسیس ۹۹۶ھ)

---

[1] دربار اکبری ص ۷۹۵ [2] ظفرالوالہ جلد اول۔ ذکر عادل شاہ۔

آخری چار عمارتوں میں عادل شاہ فاروقی کے کتبات ہیں، لیکن اس مضمون میں صرف جامع مسجد برہان پور کے کتبوں کا ذکر کیا جائے گا۔

برہان پور کی جامع مسجد میں تین کتبے ہیں، ان میں سے دو عادل شاہ فاروقی کے ہیں اور ایک شہنشاہ اکبر کا۔ شہنشاہ اکبر کا کتبہ جنوبی مینار کے زیریں حصہ پر ہے، جس کا تعلق فتح اسیر گڑھ سے ہے اور عادل شاہ فاروقی کے دونوں کتبے مسجد کی مغربی دیوار پر ہیں، اور دونوں کا تعلق تعمیر مسجد سے ہے، ان میں سے ایک کتبہ دائیں جانب کی محراب پر ہے اور دوسرا منبر کے قریب کی وسطی محراب پر۔ دائیں جانب کا کتبہ دو لسانی ہے جس میں اوپر کی تین مختصر سطریں عربی میں ہیں اور نیچے کی چھ طویل سطریں سنسکرت میں، یہ عادل شاہ فاروقی کی رواداری کا ثبوت ہے کہ اس نے شاہی جامع مسجد میں جہاں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی میں کتبہ کندہ کرایا وہیں ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت میں بھی عبارت تحریر کرائی۔ اس کتبہ کی عربی عبارت حسب ذیل ہے:۔

(سطر ۱) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَبِهٖ ثِقَتِیْ

(سطر ۲) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ وَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ مَنْ بَنٰی لِلّٰهِ مَسْجِدًا وَلَوْ کَمَفْحَصِ قَطَاةٍ بَنَی اللّٰهُ لَهٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ ۔ اَمَرَ بِبِنَاءِ هٰذَا الْمَسْجِدِ الْمُبَارَكِ الَّذِیْ هُوَ مِنْ حَسَنَاتِ الزَّمَانِ ۔ وَکَالشَّامَةِ عَلٰی وَجْهِ الْحِسَانِ ۔ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا السُّلْطَانُ ۔

(سطر ۳) عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ بن حسن خان بن قیصر خان بن غزنی خان بن راجا مَلِكُ الفَارُوقِی العَدَوِی

خلد اللہ ملکہ وسلطانہ۔ وافاض علی العالمین برّہٗ واحسانہ۔
خالصًا مخلصًا لوجہِ اللہ الکریم۔ وطلبًا لمرضاتِ اللہ الجسیم۔
نقبّلہٗ منہ صالحَ الاعمال۔ بمحمدٍ وّصحبِہٖ والاٰلِ۔ کان ابتدائُ
فی ایام السلطنۃِ سنۃ سبع وتسعین وتسع مائۃ

عربی عبارت کا ترجمہ:۔

میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے
اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اور بیشک مسجدیں اللہ (کی عبادت) کے لیے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو" اور (نبی) علیہ السلام نے فرمایا ہے "جو شخص اللہ کے لیے مسجد بناتا ہے اگرچہ وہ قطاۃ پرندے کے گھونسلہ کی طرح (مختصر) ہو، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔" ہمارے سردار اور آقا سلطان عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ بن حسن خاں بن قیصر خاں بن غزنی خاں بن راجا ملک الفاروقی العدوی نے، اللہ ان کے ملک وسلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے اور مخلوقات پر ان کی نیکی اور احسان کا فیض جاری رکھے، خلوص و نیک نیتی سے خدائے کریم کی خوشنودی اور اس کی عظیم رضامندی حاصل کرنے کے لیے اس مبارک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا جو زمانہ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے اور (روشن فضا میں سنگ سیاہ کی یہ عمارت) ایسی (نظر آتی) ہے جیسے حسینوں کے (گورے) چہرہ پر (کالا) تل۔ اللہ تعالیٰ حضرت محمدؐ اور آپ کے آل و اصحاب کے طفیل میں اس (بادشاہ) کے اعمال صالحہ کو قبول فرمائے۔

(تعمیر مسجد کی) ابتدا (اس بادشاہ کے) عہد سلطنت میں ۹۹۶ھ میں ہوئی تھی۔

کتبہ پر تبصرہ | کتبۂ مذکورہ خطِ نسخ میں ہے جس میں خط طغرا کی آرائشیں شامل ہیں، اس میں قرآن مجید کی ایک آیت، ایک حدیث، بانی مسجد کا سلسلۂ نسب، دعا اور تعمیر مسجد کے آغاز کا سنہ درج ہے، تکمیل کا سنہ نہیں ہے، کاتب نے مختصر سی جگہ میں اتنی طویل عبارت کندہ کر کے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے، اس اختصار کے لیے اس نے یہ تدبیر کی کہ چوڑی سطروں میں کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑی، ہر سطر میں نیچے، اوپر اور درمیان میں جہاں بھی جگہ ملی کوئی نہ کوئی لفظ یا حرف بلا لحاظ ترتیب کندہ کر دیا ہے، اسکے علاوہ بعض جگہ ایک ایک حرف سے دو دو اور تین تین حرفوں کا کام لے لیا ہے، مثلاً "حسناتُ الزمان وکالشامۃ علی الحسان" کو اس طرح لکھا ہے:-

حسناکالشامۃ والی الحسان

یعنی "حسنات" کے ایک ہی الف سے تین حرفوں کا کام لیا ہے ایک تو "حسنات" کے الف کا، دوسرے زمان کے الف کا اور تیسرے "کالشامۃ" کے لام کا، اسی طرح "کالشامۃ" میں کا کے الف سے دو الفوں کا کام لیا ہے، ایک تو کا کے الف کا، دوسرے شامۃ کے الف کا، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کاتب نے کالشامۃ کے جزو "لشا" کی تحریر میں صرف "ش" کے شوشے (شـ) بنا کر انھیں "حسنا" اور "کا" کے دو الفوں کے درمیان اس طرح جوڑا ہو کہ خود بخود "لشا" بن گیا ہے، اس طرح اس نے نصف حرف سے تین حرفوں کا کام لیا ہے، کاتب نے عبارت کی تحریر میں چوڑی سطروں میں جہاں جہاں الف اور لام آئے ہیں ان کو اس طرح کھینچکر لکھا ہے کہ بے شمار لمبے لمبے ستون بن گئے ہیں، باقی الفاظ یا حروف ان ستونوں کے اوپر نیچے اور درمیان میں ایک خاص انداز میں تحریر کر کے ایک دلکش ڈیزائن بنا دی ہے۔ کتبہ کی عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے مخمل پر کارچوبی کام

یہ طرز تحریر کی ظاہری خوبی ہے، معنوی خوبی یہ ہے کہ عبارت نہایت فصیح و بلیغ اور مسجع و مقفیٰ ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں کے آخر میں ہم قافیہ الفاظ کی صوتی ہم آہنگی عجیب لطف دیتی ہے

دو لسانی کتبہ کی سنسکرت عبارت

श्री स्टिष्टि कर्त्रे नमः अव्यक्त व्यापकं नित्यं गुणातीतं चिदात्मक व्यक्तस्य कारणं वंदे व्यक्ताव्यक्तत मीश्वरं ॥१॥ यावद्यं द्रार्क तारा

दिस्थितिः स्यादंबरांगणे तावत्फारू किवंशो सौविरं नंदतु भूतले ॥२॥ वंशे य तस्मिन्नू मिल फारूकीट्रोन भूवराजा मलिकाभिधानः तस्याभवत्सूं

नुरूदारचेताः कुलावंत सो गजनी नरेशः ॥३॥ तस्माद भू केसर खान वीरः पुत्रस्तदीयो हसन क्षितीशः तस्माद भूदे दल शाह भूपः पुत्रो भवत्तस्य मुबारखेंद्र ॥४॥

तत्सूनुः क्षितिपाल मौलि मुकुट व्याघृष्ट पादांबुजः सत्कीर्त्ति विलस प्रतापवश गामिन्नः क्षिती शेश्वरः यस्याहर्निशिममान ति गुणि गणातीते परे ब्रह्माणि श्री आदिल भूपति

विजियते भूपाल चूडामणिः ॥५॥ स्वस्ति श्री संवत १६५६ वर्षे शाके १५११ विरोधि संवत्सरे पौष मासे शुक्ल पक्षे १० घटी २३ सहैकादश्यां तिथौ सोमे कृत्तिका घटो

३३राह रोहिणयां

शुभ घटी ४२ योगेवणिज करणेस्मिम दिनरात्रि
मत घटी ११समये कन्या लग्ने श्री मुबारख शाह सुत
श्री ७ एदल शाह राज्ञा मसीतिरियं निर्मित्ता स्वधर्म
पालनार्थं ॥

ترجمہ:۔ (۱) عزت وجلال والے خالق کائنات کو سلام۔ میں اس خدا کی عبادت کرتا
ہوں جو نظر نہیں آتا، جو ہر جگہ موجود ہے، ازلی اور ابدی ہے اور تمام اوصاف
سے برتر ہے، وہ دل میں رہتا ہے، جو کچھ نظر آتا ہے اس (کی تخلیق) کا وہی
سبب ہے۔ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔
(۲) جب تک آسمان پر چاند سورج اور تارے موجود ہیں تب تک یہ فاروقی
خاندان روئے زمین پر خوشی وترقی سے زندگی گزارے۔
(۳) اس خاندان میں اول فاروقیوں کا سردار مسمی راجہ ملک تھا، جس کا
فرزند بادشاہ غزنی خاں تھا جو ممتاز دل اور تاج خاندان تھا۔
(۴) غزنی خاں کا فرزند بہادر قیصر خاں تھا۔ قیصر خاں کا فرزند مالکِ زمین
حسن خاں تھا حسن خاں کا فرزند بادشاہ عادل شاہ تھا۔ عادل شاہ کا
فرزند آقا مبارک شاہ تھا۔
(۵) مبارک شاہ کا فرزند فاتح ونامور بادشاہ عادل شاہ ہے، جو بادشاہوں
کے تاج کا گوہر ہے، دوسرے بادشاہوں کے تاجوں کے جواہرات اس کے
کنول جیسے قدموں پر رگڑے جاتے ہیں (یعنی جب دوسرے بادشاہ سلطان

عادل شاہ کی قدم بوسی کے لیے جھکتے ہیں تو ان کے تاجوں کے جواہرات اسکے قدموں سے چھوتے ہیں)۔ اس کی نیک نامی کی شہرت پھیلی ہوئی ہے، اور اسکے دشمن اس کی شجاعت (کو دیکھ کر اس) کے فرمانبردار بن گئے ہیں۔ وہ بادشاہوں کا آقا ہے اور شب و روز اس برتر ہستی (خدا) کے آگے جھکا رہتا ہے، جو ہستی تمام اوصاف سے برتر ہے۔

(۶) مرحبا، سبحان اللہ۔ یہ مسجد بادشاہ شری[1] عادل شاہ نے جو نامور مبارک شاہ کا فرزند ہے، اپنے مذہب کی پابندی کے لیے بنائی سنبت ۱۶۶۴ مطابق شکے ۱۵۱۱ میں، پوس مہینے میں، چاندنی کے پاکھ میں، دسویں تاریخ کی ۲۳ ویں گھڑی[2] میں، جس کے بعد گیارھویں تاریخ تھی۔ پیر کے دن کرت تکا نکشتر کی ۳۳ ویں گھڑی میں، جس کے بعد روہنی تھی، مبارک ساعت میں جو بیالیس گھڑی تک رہنے والی تھی، ونیجا کرنا میں اس وقت جبکہ اس روز کے رات کی گیارہ گھڑیاں گزر چکی تھیں اور کنیا لگن تھا۔

سنسکرت کے کتبہ پر تبصرہ | کتبہ کی زبان سنسکرت اور رسم الخط ناگری ہے، لیکن میں نے مسجد میں لگے ہوئے اصل کتبہ سے سنسکرت عبارت مرہٹی رسم الخط میں نقل کی ہے، کیونکہ اس کتبہ کا رسم الخط اگرچہ ناگری ہے مگر اس کے بعض حروف کا رسم الخط موجودہ ناگری رسم الخط سے بہت مختلف ہے، اس لیے اسے روانی سے نقل کرنا مشکل تھا۔ مذکورہ کتبہ کے رسم الخط کی نوعیت حسب ذیل ہے:۔

---

[1] راجا کے نام کے ساتھ شری کا عدد (عموماً ۱۰۸) لکھا جاتا ہے، لیکن یہاں صرف، لکھا گیا ہے

[2] گھڑی یا گھنٹی سے ۲۴ منٹ کا وقفہ مراد ہوتا ہے۔

(۱) اس کتبہ میں حرف य (ی) اور حرف प (پ) کی تحریری شکل بالکل ایک ہے مثلاً व्यापक (یعنی ہر جگہ موجود) کا رسم الخط व्यापक اور अव्यक्त (یعنی نظر نہ آنے والا) کا رسم الخط अव्यक्त ہے۔ دونوں مثالوں میں य کو بالکل प کی شکل میں لکھا گیا ہے۔

(۲) سنسکرت کا ایک مرکب حرف क्त (کت) ہے۔ اس کا رسم اس کتبہ میں کہیں क्त ہے کہیں क्त، کہیں क्त اور کہیں क्त

(۳) حرف भ (بھ) کا رسم الخط مراٹھی عدد چار (४) کی طرح ہے جس کا سرا ایک لمبی لکیر سے ملا ہوا ہے، اس کی مختلف اعرابی حالتیں ملاحظہ کیجئے۔

भा (بھا)، भू (بھو)، भि (بھ)۔

(۴) حرف च (چ) کی شکل پرچم نما ہے، ملاحظہ کیجئے۔ चन्द्र۔ مزید مثلاً चूडामणिः (چوڑامنی یعنی سر کا زیور)۔ کتبہ میں त اور च (च+त) کی مرکب شکل اس طرح ہے، च्च ۔ مثلاً यावत चंद्रार्क तारा (یعنی چاند سورج اور تارہ) کو اس طرح لکھا ہے यावच्चंद्रार्क तारा ۔

(۵) श्च (شچ) کا استعمال دیکھئے۔ शुभं (شبھ یعنی مبارک)۔ पक्षे (یعنی چاندنی کے پاکھ میں) کے پہلے جزو شکل کا رسم الخط یہ ہے ।

(۶) بڑی ऊ کی ماترا جسے مراٹھی میں दीर्घ ऊकार کہتے ہیں اور جس کے لئے اردو میں واو معروف (ؤ) کا استعمال ہوتا ہے اس کتبہ میں ہر جگہ اردو آٹھ کے ہندسہ (۸) سے ظاہر کی گئی ہے جیسا کہ آپ "بھو" اور "چوڑامنی" تحریر میں دیکھ چکے ہیں۔

(۷) ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کتبہ میں عادل شاہ کو "عیدل شاہ" (एदलशाह) اور مبارک شاہ کو "مبارکھ شاہ" تحریر کیا گیا ہے، غالباً عادل شاہ کا تلفظ ہندی میں عیدل شاہ ہوگا اور اسی بنا پر عادل شاہ کا آباد کردہ قصبہ عادل آباد عوام میں اب تک "عیدلا باد" एदलाबाद کے نام سے مشہور ہے۔

عادل شاہ فاروقی نے اپنی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسیر گڈھ اور برہانپور کی جامع مسجدوں میں اپنی ہندو رعایا کی مذہبی زبان سنسکرت میں بھی کتبے کندہ کرائے ہیں کیونکہ سب زبانیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھاری زبانیں اور رنگ الگ الگ بنائے ہیں لیکن برا ہو تنگ نظری کا کہ بعض لوگوں نے اس رواداری کا غلط مطلب لیا۔ چنانچہ ڈاکٹر بلاک نے اسیر گڈھ کی جامع مسجد کے سنسکرت کتبہ کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ عادل شاہ فاروقی نے یہ مسجد اس لئے تعمیر کرائی تھی کہ ہندو اور مسلمان اس میں اپنے اپنے مذہب اور دھرم کے مطابق عبادت اور پوجا کریں، اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ تحریر کیا ہے کہ سنسکرت کتبہ کے آغاز میں ہندوانہ دعائیہ کلمات ہیں[۱]۔ حالانکہ یہ رائے بالکل غلط ہے، برہان پور اور اسیر گڈھ کی جامع مسجدوں کے عربی و سنسکرت کے دونوں کتبوں کی عبارتیں بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں، برہان پور کی جامع مسجد کے سنسکرت کتبہ کا ترجمہ تو آپ پڑھ چکے ہیں، اس میں ایک بھی جملہ اسلامی عقائد کے خلاف نہیں ہے، بلکہ خدا کی ذات و صفات کا بیان قرآن و

---

[۱] مضمون "اسیر گڈھ کے کتبات" معارف ماہ جون ۱۹۲۳ء

و حدیث کے مضامین کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، اب ایبر گڈھ کے سنسکرت
کی عبارت کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے جس پر اعتراض ہے،

"خالقِ کائنات کو سلام جو تمام اوصاف کا مالک ہوتے ہوئے
مبرّا ہے، جو ظاہر بھی ہے باطن بھی، جو دل میں اور مسرت میں رہتا ہے
ابدی ہے۔ اور دنیا کو قائم رکھنے والا ہے"

ان کے نظریہ کے مطابق کتبہ کی عبارت کا اتنا حصّہ قابلِ اعتراض
میں نہیں آتا، کہ اس کا کونسا جملہ اسلامی عقائد کے خلاف ہے، اس کے
عربی زبان میں ادا کیا جائے تو یہ عبارت بن جائے گی، التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ا
الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ٥ التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ کے الفاظ تو ہر نماز م
کرتا ہے، خَلَقَ سے آخر تک کی عبارت سورۂ طٰہٰ میں موجود ہے اب ا
"جو تمام اوصاف کا مالک ہوتے ہوئے بھی اُن سے مبرّا ہے" تو اس سلہ
صوفیاے کرام کے نزدیک ذاتِ الٰہی کی شانِ ظہور کے چھ مراتب ہیں
اولیٰ اَحَدِیّتْ ہے، اس مرتبہ میں خدا کو تمام اوصاف سے بالاتر مانا گیا
صاحب نے اپنی کتاب" قرآن اور تصوف" کے صفحہ پر اس مرتبہ کی اس
کی ہے" احدیت سے مراد حق تعالیٰ کی ذاتِ محض ہے جیسا کہ ہم نے ا
اپنی کنہ و حقیقت کے لحاظ سے نامعلوم و ناقابلِ علم ہے، اسی لئے اس کا
مقطوع الاشارات، اور مجہول النعت' کہا جاتا ہے، یہ تمام قیود و اضا
ہے...... نہ مطلق نہ مقید، نہ عام نہ خاص، بے وصف، بے نعت، بے
بے مکان، بے زمان، احدیت بے رنگی و بے کیفی کا مرتبہ ہے، ...

حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہؒ نے اسی مرتبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسالہ انوار الاسرار کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے، کہ "وذات اللّٰہِ مُتَعَالِیَۃٌ مِنْ اَنْ یُنْسَبُ اِلَیْہِ وَصْفٌ" یعنی اللہ کی ذات اس بات سے برتر ہے کہ اس کی طرف کسی وصف کی نسبت کی جائے، اب رہا یہ مضمون کہ "اللہ دل میں رہتا ہے" تو یہ حضور کی حدیث قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَرْشُ اللّٰہِ کا ترجمہ ہے، باقی جملے وہ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے وہ ازلی و ابدی ہے، اور دنیا کو قائم رکھنے والا ہے" وہ قرآن مجید کی ان عبارتوں کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں (۱) ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ (۲) ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ،

اس وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ برہان پور اور اسیر گڈھ کی جامع مسجدوں کے سنسکرت کے کتبات میں کوئی بات اسلامی عقائد کے خلاف نہیں ہے،

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے سنسکرت کتبہ کا جو اُردو ترجمہ پیش کیا ہے، وہ پروفیسر کیل ہارن (Kiel horn) کے انگریزی[۵] ترجمہ کا ترجمہ ہے، باقی مضمون مع تبصرہ میرا ہے، اس مضمون میں جامع مسجد برہانپور کے صرف دو لسانی کتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اب صرف دو کتبے باقی ہیں جن میں سے ایک وسطی محراب پر ہے اور دوسرا جنوبی مینار کے زیریں حصہ پر،

---

۵ یہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا ہے، مجھے صرف ترجمہ ملا، سنسکرت عبارت نہیں ملی،

غزل

از
جناب عروج زیدی

اس حقیقت کا بیاں سے حق ادا ہو یا نہ ہو — میرا دل میرا نہیں ہے آپ کا ہو یا نہ ہو

زندگی راحت اثرا راحت فزا ہو یا نہ ہو — یہ مجھے پیاری ہے تصدیقِ وفا ہو یا نہ ہو

ضبطِ عرضِ مدعا تو اپنے بس کی بات ہو — کون کہہ سکتا ہے ترکِ مدعا ہو یا نہ ہو

غم تناسی کے لئے ٹوٹا ہوا دل چاہیئے — یہ غلط ہے آدمی غم آشنا ہو یا نہ ہو

ابتدائے کار کا حاصل خدا پر چھوڑیئے — آپ وعدہ تو کریں وعدہ وفا ہو یا نہ ہو

اب مرے پیشِ نظر ہے اک مقامِ بے مقام — اُس جگہ عقلِ رسا، عقلِ رسا ہو یا نہ ہو

یہ تبا جس کا مُقدر، ہر قدم پر ٹھوکریں — موت اس کی زندگی کا آسرا ہو یا نہ ہو

میں بہ ہر صورت خرابِ لطفِ چشمِ ناز ہوں — آپ کی جانب سے اس کی ابتدا ہو یا نہ ہو

صاحبِ لولاک سے نسبت ہے وجہِ افتخار — وسعتِ کون و مکاں اب زیرِ پا ہو یا نہ ہو

وہ بچھڑتے ہیں ملے تھے جو بچھڑنے کے لئے — دیکھئے اب گردشِ ارض و سماں ہو یا نہ ہو

اضطرابِ شوق کے حق میں نہیں یہ نیک فال — لمحۂ تسکینِ خاطر دیر پا ہو، یا نہ ہو

اُن کی مرضی سے فروزاں ہے چراغِ زندگی — سانس لینے کا قبر میں حوصلا ہو یا نہ ہو

ایک پتھر دل کی پلکوں میں چراغاں ہوگیا
یہ ہماری عرضِ غم کا معجزہ ہو، یا نہ ہو

ایک ہیں اہلِ نظر کے واسطے غیب و شہود
میں اسے خالق کہوں گا سامنا ہو یا نہ ہو

جس کی ہر جنبش پہ میرے جان و دل صدقے ہوں آج!
وہ نظر مجموعۂ اہلِ وفا ہو، یا نہ ہو

غزل

از

جناب چندر پرکاش جوہر صاحب بجنوری

نہ حدود دیدہ و ہم و گماں میں ہے نہ مقام ہوش و خبر میں ہے
وہ جو ایک جلوۂ معتبر مری چشمِ جلوہ نگر میں ہے

مٹے زندگی تو مٹا کرے، لہو دل کا ہے تو ہوا کرے
وہ غریب شکوہ ہی کیا کرے جو فریبِ شام و سحر میں ہے

مرا رازِ دل جو نہ کہہ سکا جو ٹپک سکا نہ جو بہہ سکا
جو امانتِ غمِ عشق ہے وہی اشک دیدۂ تر میں ہے

یہ شبِ فراق کی لذتیں بخدا بہت ہی عجیب ہیں
کوئی شامِ غم سے ہے مطمئن کوئی انتظارِ سحر میں ہے

رہِ شوق میں مرے راہبر نہ تجھے سکوں نہ مجھے سکوں
مری زندگی بھی سفر میں ہے تری زندگی بھی سفر میں ہے

وہی قلب بے حسی وہی بے بسی، کوئی زندگی ہے یہ زندگی
نہ سرورِ گریۂ شب میں ہے نہ گدازِ آہِ سحر میں ہے

نہ ملے گا جوہرِ بے خبر کبھی پھر یہ لمحۂ مختصر
تجھے دیکھنا ہو تو دیکھ لے ابھی کوئی حدِ نظر میں ہے

غزل

از جناب اسلم صاحب سندیلوی

جوشِ مے سے ابھی چھلکا ہے پیمانہ کہاں
اپنا شیدائی ہوا ہے تیرا دیوانہ کہاں

چشمِ ظاہر بیں کہاں اور تیرا دیوانہ کہاں
عقل سے محصور ہوا یہ ایسا افسانہ کہاں

کارفرما ہوتے ہیں کچھ وقت سے جذب سکوں　　ایک عالم میں رہا کرتا ہے دیوانہ کہاں

دل کا جلنا اور کچھ ہے خودکشی کچھ اور ہے　　عشق کی راہوں سے ہے مانوس پروانہ کہاں

لالہ وگل سے تری تشبیہ ہو سکتی نہیں　　حسن ہے لیکن وہ انداز حجابانہ کہاں

جس کی اک ضو سے جلا پاتے ہوں لاکھوں آئینے　　اُس کی حیرانی کا باعث آئینہ خانہ کہاں

یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہے بے نقاب　　غم میں جو صبر آشنا ہے تجھ سے بیگانہ کہاں

مے پرستوں پر کھلا کرتا ہے راز میکدہ　　زاہد خود بیں کہاں اسرار میخانہ کہاں

پوچھئے اسلم سے کیا ہو لطف شعر و شاعری
مدتوں سے وہ شریک بزم رندانہ کہاں

غزل

از جناب سالک رحمانی

بگاڑ سکتی ہے کیا گلوں کا یہ برق کی جانستاں مزاجی　　چمن کے کانٹوں سے پا گئی ہو کلی کلی پاسباں مزاجی

صبا کی اٹکھیلیاں بھی جیسے چمن کو اب ناگوار سی ہیں　　تمہارے حسن خرام نے دی زمیں کو وہ آسماں مزاجی

تمہارے دامن کی نکہتوں سے فضائیں مخمور ہو رہی ہیں　　تمہارے عارض سے مل گئی ہو گلوں کو بھی ضوفشاں مزاجی

تمام عالم فریب جلوہ تمام عالم حجاب رنگیں　　نہ جانے سیکھی حقیقتوں نے کہاں سے یہ داستاں مزاجی

نہ دیر و کعبہ کی سمت دیکھا نہ میکدہ سے نظر ملائی　　ہماری قسمت میں لکھ گئی ہو ازل سے یہ بدگماں مزاجی

نہ جانے کتنے خدا بنائے نہ جانے کتنے حرم سجائے　　جبین آدم کو بخش دی ہو کسی نے وہ آستاں مزاجی

تمہاری آتشکدہ کو اب بھی شعور گلزار دے رہی ہے　　ہماری فطرت ہی بن گئی ہے خلیل کی امتحاں مزاجی

کبھی یہ ظلمت کدہ بھی دل کا ہو نور عرفاں سے ضوفشاں　　کبھی تو ہم کو بھی راس آئے ذرہ کی یہ کہکشاں مزاجی

یہ حسرتوں کا ہجوم لیکر ازل سے اب تک بھٹک رہے ہو
کہاں کہاں لے گئی ہے سالک تمہاری یہ لامکاں مزاجی

مطبوعات جدیدہ

مشیر اوقاف: مرتبہ جناب سید آل حسن صاحب ایم اے، ایل، بی،
تقطیع اوسط، ضخامت ۹۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ
خاص ۱۵ روپے، عام عہ روپے، پتہ: سنی سنٹرل وقف بورڈ نمبر ۱۹
موتی لال بوس روڈ لکھنؤ،

یہ سہ ماہی رسالہ سنٹرل سنی وقف بورڈ اترپردیش کا ترجمان ہے، اور اس کا اصل مقصد اس صوبے کے اوقاف کے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے، لیکن اس کے موجودہ سکریٹری جناب سید رفیع الدین احمد صاحب رحمانی علمی مذاق کے آدمی ہیں، اور ان کو سید آل حسن صاحب جیسا صاحب ذوق اڈیٹر مل گیا ہے جنھوں نے اس کو ایک سنجیدہ علمی رسالہ بنا دیا ہے، ابھی اس کے دو نمبر نکلے ہیں، دونوں اوقاف سے متعلق معلومات کے ساتھ سنجیدہ علمی و مذہبی مضامین پر مشتمل ہیں، دوسرا پرچہ سید سالار مسعود غازی نمبر ہے، اس میں حضرت سید سالار سے متعلق تاریخی مضامین کے علاوہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود، قرآن کے سایہ میں حضرات صوفیہ اور اتباع شریعت جیسے مضامین بھی ہیں، جس سے اس کے معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ادبیات کا حصہ بھی ستھرا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ عام طور پر مذاق بگڑ گیا ہے، اور

سامان طباعت کی ہوشربا گرانی سے پرانے پرچوں کا چلانا مشکل ہو رہا ہے، ایک سنجیدہ علمی رسالہ نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے، جس کے لئے شفیق وقف بورڈ مبارکباد کا مستحق ہے، اس سے سنجیدہ رسائل کی صنف میں ایک اچھے رسالہ کا اضافہ ہوا،

"م"

ایک شہر پانچ مشاہیر۔ مرتبہ جناب عبدالقوی صاحب دسنوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۷، ۱ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔ صہ پتہ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

بھوپال علم وفن اور اصحاب کمال کا مرکز رہا ہے، اسی لئے دوسرے مقامات کے بہت سے مشاہیر وفضلاء بھی اس سے متعلق رہے ہیں، عبدالقوی دسنوی نے ان میں سے بعض اکابر کے متعلق وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں جو مضامین لکھے تھے ان کا ایک مجموعہ "بھوپال اور غالب" کے نام سے پہلے چھپا تھا، اب انھوں نے پانچ اور مشاہیر امیر مینائی، سر راس مسعود، علامہ اقبال، جگر مراد آبادی اور راجندر سنگھ بیدی کے بھوپال سے تعلق پر یہ کتاب شائع کی ہے، اس میں ان کے بھوپال سے تعلق کی تقریب، وہاں کے زمانہ قیام کے واقعات ومشاغل علمی وادبی سرگرمیوں سے دلچسپی، والیان ریاست، امراء اور ارباب فضل وکمال سے تعلقات اور دوسری مفید اور دلچسپ باتوں کے علاوہ ان کی سیرت وشخصیت کے مختلف جلوے بھی دکھائے ہیں، لائق مصنف کو تحریر وتالیف کا اچھا سلیقہ ہے لیکن ان کو اپنی قلمی کاوشوں کا دائرہ تنگنائے بھوپال کے باہر بھی نکالنا چاہئے، صفحہ پر فانی بدایونی کے ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں بھوپال کے ایک مشاعرہ میں شرکت کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ انکا انتقال ۱۹۴۱ء ہی میں ہوچکا تھا، ص ۲۰۵ پر کتابت کی غلطی سے مضائقہ کا املا مضائقہ ہوگیا ہے

مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی متوسط

تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۱۰۸ مجلد، مع گرد پوش، قیمت :- للعہ

پتہ :- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تقریروں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ کی اکثر تقریریں یورپ میں کی گئی ہیں، اور اُن کے اصل مخاطب وہاں تعلیم حاصل کرنے والے ہندو پاک اور بعض مسلم ملکوں کے نوجوان مسلمان ہیں بعض تقریریں ہندوستان کی بھی ہیں، چند مضامین کے ترجمے بھی ہیں، جو عربی رسالوں کے لئے لکھے گئے تھے، ان سب میں مولانا نے مغربی تہذیب وتمدن کی ترقیوں اور برق وبخارات میں کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی سب سے بڑی کمی فیضان سماوی اور وحی وہدایت الٰہی سے محرومی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بحران وانتشار کا ایک دردمند مصلح کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، اُن کا خیال ہے، اور بجا خیال ہے کہ مغرب کی سیاسی واقتصادی برتری مسلم مگر انبیاء کی تعلیم وہدایت کا خزانہ مشرق کے پاس ہے، اس لئے مسلمان نوجوانوں سے اپیل ہے کہ "وہ مشرق سے ایمان ویقین اور عمل صالح کی دولت مغرب کو پہنچائیں، اور مغرب سے اس کے صالح اور بے ضرر وسائل زندگی مشرق کو منتقل کریں، اور مشرق ومغرب کی خلیج کو پاٹ کر انسانیت کے اعلیٰ رہنما اور مسیحا بن جائیں، مولانا نے مغربی فکر وفلسفہ کی خامیوں اور نقائص کو واضح کر کے اُس کی ذہنی غلامی اور اندھی تقلید سے بچنے کی پرزور تلقین کی ہے، اُن کے خطبات اور مضامین کے دوسرے مجموعوں کی طرح یہ بھی اُنکی دلسوزی اخلاص اور دردمندی کا نتیجہ، ایمان ویقین سے معمور اور شیریں بیانی اور اسلوب کی دلکشی لطافت کا نمونہ اور ہر مسلمان خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے،

تسلسلات امدادیہ - مرتبہ ڈاکٹر ماجد علی خانصاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۱۰۰، قیمت ۸/ پیسے پتہ مولوی نصیرالدین کتب خانہ اختری متصل مظاہر علوم سہارنپور،

یہ کتابچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کے مختلف سلاسل اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مختصر حالات پر مشتمل ہے، شروع میں شجرہ کی حقیقت، سلاسل کی تاریخ ہندستان میں سلسلہ چشتیہ کی ابتدا اور مشائخ چشت کے نظام اصلاح اور طریقہ تربیت پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے، یہ رسالہ خصوصیت سے حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ سے منسلک و متوسل لوگوں کی قدر دانی کے لائق ہے۔

بادۂ عرفاں از جناب حفیظ بنارسی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، مجلد مع گردپوش، قیمت: پانچ روپیہ، پتے:-
پروفیسر حفیظ بنارسی، ملکی محلہ آرہ (۲) پروفیسر حفیظ بنارسی ۱۱۶، بازار سدانند بنارس (۳) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ

جناب حفیظ بنارسی خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں، اُن کی غزلوں کا مجموعہ "درخشاں" پہلے چھپ چکا ہے، اور اس پر معارف میں تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے، اب انھوں نے "بادۂ عرفاں" کے نام سے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے، یہ حفیظ صاحب کے دینی ذوق اور ایمانی جذبہ کا ثبوت اور حمد و مناجات اور نعت و منقبت سے متعلق نظموں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے اس کا زیادہ حصہ نعتوں پر مشتمل ہے عموماً نعت گو شعرا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محامد بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور جوش عقیدت میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن حفیظ صاحب حدود و مراتب کے ادا شناس ہیں انھوں نے آپکے اوصاف و کمالات کی طرح آپ کی اعلیٰ سیرت و کردار اور مقدس تعلیمات و ہدایات کا ذکر بھی کیا ہے، امید ہے کہ عقیدتمندان رسالت اس پُرکیف بادۂ عرفاں سے سرشار اور لطف اندوز ہوں گے،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ ؎۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکاتِ خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور متعدد ناشرانِ دار المصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ داغ عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی وادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کان پور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثرِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپے

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

......ہ ......

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰۵

اکتوبر ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب تجلہ

مجلسِ ادارت

بزم تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء، و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علماء و فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۴ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ کئی برسوں کی بندش کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کھل گئی۔ امید ہے کہ جلد ہی آمد ورفت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا، اس مدت میں ان لوگوں کے دلوں پر جن کے اعزہ پاکستان میں ہیں جو گذر گئی اس کا اندازہ بھی دونوں ملک نہیں کر سکتے. ایک دوسرے کی صورت دیکھنے بلکہ خیریت معلوم کرنے تک کو ترس گئے۔ کتنے لوگ مر گئے جن کے اعزہ انکو نہ دیکھ سکے۔ اس حیثیت سے ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کا مسئلہ انسانی اور اخلاقی بھی ہے کاش دونوں کے درمیان دوسرے معاملات بھی اسیطرح طے ہو جاتے تو سب کو سکون واطمینان کا سانس لینے کا موقع ملتا واقعہ یہ ہو کہ ہندوستان و پاکستان اگرچہ سیاسی حیثیت سے دو ملک بن گئے ہیں۔ لیکن قدرتی لحاظ سے وہ ایک وحدت ہیں۔ اور ان کے درمیان اتنے گوناگون رشتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے نہیں ٹوٹ سکتے۔ ان کو توڑنے میں دونوں کا نقصان ہے چنانچہ گذشتہ لڑائیوں کے نتائج آج تک دونوں ملک بھگت رہے ہیں۔ اگر ان کو زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے تو ان کے لیے صلح ومسالمت کے سوا کوئی راہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی ایک بڑی بدبختی ان کا باہمی اختلاف ہے انکی پوری تاریخ گواہ ہے۔ کہ ان کو سب سے زیادہ نقصان آپس کے اختلاف سے پہنچا اور بیشتر اسلامی حکومتیں دوسروں کے نہیں بلکہ اپنوں کے ہاتھوں تباہ ہوئیں، اب زمانہ کے حالات نے اتحاد کا احساس پیدا کر دیا ہے۔

اور اسکی کوشش برابر جاری ہے مگر اب بھی کہیں کہیں سے جنگ و اختلاف کی آواز اٹھ جاتی ہے۔ جو اپنی کم دوسروں کی آواز بازگشت زیادہ ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب کہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملک آزاد ہو چکے ہیں، انکی خارجہ پالیسی کی باگ بڑی قوتوں کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنی مصلحتوں کے مطابق اس کو موڑتی رہتی ہیں، اور جو ملک آزادی سے کام لیتا ہے اسکے خلاف کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کر دیتی، اور خود اہل ملک کے ذریعہ انقلاب پیدا کرا دیتی ہیں، اسوقت انکی نگاہ میں پاکستان بہت کھٹک رہا ہے، وہ چین کی طرف مائل ہے، عرب ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہے، اور عرب حکومتوں کی مختلف ضرورتوں میں امداد و رہنمائی کرتا ہے جسکو روس اور امریکہ دونوں ناپسند کرتے ہیں امریکہ تو تعلقات کی بنا پر خاموش ہے لیکن روس اسکو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا چنانچہ افغانستان کے انقلاب سے پاکستان کو جو اندرونی و بیرونی مشکلات درپیش ہیں ان دونوں میں اسکا ہاتھ ہے، اسلئے اسکی ضرورت ہے کہ ملک فیصل یا انکی جیسی دوسری شخصیت اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں اور جسکی زیادتی نظر آئے اس پر دباؤ ڈالیں ورنہ بڑی قوتیں اس قسم کے تماشے برابر کرتی رہیں گی۔

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر علی محمد خسرو مقرر ہوئے ہیں، انکی فنی شہرت ایک خاص حلقہ میں محدود تھی اسلئے ان سے کم لوگ واقف تھے، وائس چانسلری کے سلسلہ میں انکے اوصاف اور کمالات علم ہوا، دلی کے مسلم اخبارات نے ان کے متعلق بہت اچھے خیالات اور ان سے بڑی توقعات ظاہر کی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کیلئے مفید ثابت ہونگے، انھوں نے اپنی ایک تقریر میں بھی کہا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی آزادی بحال کرانے کی کوشش کرینگے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں حکومت کی پالیسی کچھ بدلی ہے، ورنہ علانیہ وہ اس قسم کا خیال ظاہر نہ کرتے مسلم یونیورسٹی کا سب سے بڑا مسئلہ اسکے اقلیتی کردار کا تحفظ ہے، اسکے بغیر اسکی آزادی کے کوئی معنی نہیں اگر اسمیں نئے وائس چانسلر صاحب کامیاب ہو جاتے ہیں تو

انکا بڑا کارنامہ ہوگا، اور یونیورسٹی کی تاریخ میں انکا نام زندہ رہیگا، اس معاملہ میں حکومت نے بعض ام نہاد مسلمانوں کے مشورے سے ایک غلط قدم اٹھا دیا جس سے مسلمانوں میں بے اعتمادی اور بددلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، جو حکومت کیلئے کوئی اچھی شکل نہیں رہی، اس غلط فیصلہ پر قائم رہنا دوسری غلطی ہوگی، مسلم یونیورسٹی آزادی اور کردار کو برقرار رکھنے میں حکومت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس سے وہ مسلمانوں کا دل جیت سکتی ہے،

اگرچہ شعر العجم کے فارسی ترجمہ کی بات بہت پرانی ہوچکی مگر اس سے کم لوگ واقف ہونگے اسلئے اسکا مختصر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ ترجمہ برسوں پہلے ایران میں ہوچکا تھا، اسکی ایک جلد عرصہ ہوا نظر سے گذری تھی، مگر مکمل سٹ اب ایرانی سفارت خانے نے بھیجا ہے اور یہ اسکا دوسرا اڈیشن ہے، اسکے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی پرانے لوگوں میں تھے علامہ شبلی کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور ان سے ملے بھی تھے جسکا ذکر پہلی جلد کے دیباچہ میں ہے، پانچوں جلدوں میں مترجم کے دیباچے ہیں جنمیں انکی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، تیسری جلد میں ایران کے نامور فاضل آقائے سعید نفیسی کا مقدمہ بھی ہے اس جلد کا ترجمہ عرصہ ہوا افغانستان کے مشہور شاعر اور ادیب سرور خان گویا نے بھی کیا تھا انکا قلمی نسخہ یہاں موجود ہے اس سے ایران و افغانستان میں شعر العجم کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسکی تنقیدیں تو لوگ بھول چکے لیکن وہ اب تک زندہ اور چمنستان شیراز تک اس کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی مشہور و مقبول کتاب اردو غزل کا نیا اڈیشن مع جدید اضافوں کے دار المصنفین سے شائع ہوا ہے، جو پہلے سے زیادہ جامع مکمل ہے، اسکی ضخامت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ تعداد۔ صفحات۔ قیمت:۔ بیس روپیہ

مقالات

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی نقد حدیث)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۶)

خارجی نقد کے بعض اصول داخلی کے ساتھ خاص ہیں	داخلی نقد حدیث کے ان مستقل اصول و قواعد کے علاوہ خارجی نقد کے جو اصول مقرر ہیں ان کا تعلق بھی داخلی نقد سے ہے۔

فعلم مصطلح الحدیث بطبیعة تعریفه لا یقتصر علی مباحث الاسناد بل یجاوزها الی المسائل المتعلقة بالمتن ایضاً[۱]	اصطلاح حدیث کا علم اپنی طبیعت کے لحاظ سے "سند" کے مباحث کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ متن سے متعلق جو مباحث ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

بعض "اصول" داخلی نقد حدیث کے لیے خاص ہیں، مثلاً

مرفوع

هو ما ینتهی الی النبی صلی الله	وہ حدیث (متن) جس کی سند کی انتہا

---

[۱] ڈاکٹر صبحی الصالح: علوم الحدیث و مصطلحہ الفصل السابع

علیہ وسلم غایۃ الاسناد[۱]　　رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے۔

صحابیؓ اس قسم کے الفاظ استعمال کرے:

(۱) میں نے رسول اللہ سے فلاں بات سنی (۲) رسول اللہ نے ہم سے فلاں حدیث بیان کی (۳) رسول اللہ نے یہ فرمایا (۴) رسول اللہ سے یہ روایت ہے (۵) میں نے رسول اللہ کو فلاں کام کرتے دیکھا (۶) رسول اللہ فلاں کام کرتے تھے (۷) میں نے رسول اللہ کی موجودگی میں فلاں کام کیا (۸) رسول اللہ کی موجودگی میں فلاں کام کیا گیا۔ آخر کی دونوں صورتوں میں راوی (صحابی) جب رسول اللہ کا انکار نہ ذکر کرے۔

موقوف

ھو ما ینتھی الی الصحابی غایۃ الاسناد[۲]　　وہ حدیث (متن) جس کی سند کی انتہا صحابی تک پہنچے،

حضرت علیؓ کا قول ہے:

من السنۃ وضع الکف علی الکف فی الصلوٰۃ تحت السرۃ[۳]　　نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا سنت ہے۔

مقطوع

ھو ما ینتھی الی التابعی[۴]　　وہ حدیث جس کی سند کی انتہا تابعی تک پہنچے،

جیسے کہا جائے کہ عطا، یا طاؤس (تابعی) پر فلاں فلاں شخص نے فلاں فلاں حدیث کو موقوف کیا[۵]،

---

[۱] ابن حجر عسقلانی: نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر۔ المرفوع [۲] ایضاً

[۳] فتح المغیث: فروع ص ۳۳ [۴] ابن صلاح: مقدمہ ابن صلاح: النوع السابع معرفۃ الموقوف [۵] ایضاً

مختلف الحدیث

الحدیث الذی عارضہ حدیث وقاما امکن الجمع بین مدلولیھما من غیر تعسف[1]	وہ حدیث جس کی دوسری حدیث معارض ہو اور کسی دشواری کے بغیر دونوں کے مفہوم کو جمع کرنا ممکن ہو۔

ایک حدیث میں ہے:

لاعدوی ولا طیرۃ فی الاسلام[2]	اسلام میں چھوت لگنے اور بدشگونی کا عقیدہ نہیں ہے۔

دوسری میں ہے

فرمن المجذوم فرارک من الاسد[3]	جذامی (کوڑھی) سے ایسے ہی بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔

دونوں حدیثوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی مرض اپنی خاصیت کے لحاظ سے دوسرے کو چھوت سے نہیں لگتا، ورنہ ہر پاس اٹھنے بیٹھنے والے کو لگ جایا کرتا، بلکہ جب اللہ چاہے تو دوسرے کو لگ سکتا ہے، چونکہ مرض لگنا اللہ کی مشیت کے تحت ہوتا ہے اور انسان کم بیماری کی خاصیت سمجھ لیتا ہے، اس بنا پر دوسری حدیث میں ممانعت کردی گئی، اور پہلی میں عقیدہ کی اصلاح کی گئی۔

ناسخ ومنسوخ

ان لم یمکن الجمع فلایخلوا ان یعرف التاریخ اولا فان عرف	اگر دو معارض حدیثوں میں جمع ممکن نہو تو دونوں کی تاریخ کو دیکھا جائے گا اگر

---

[1] نزہۃ النظر۔ مختلف الحدیث [2] ایضاً حاشیہ [3] ایضاً حاشیہ

وثبت المتاخر به فهو الناسخ والآخر المنسوخ[1]	تاریخ کے لحاظ سے ایک مقدم اور دوسری موخر ہے تو پہلی منسوخ اور دوسری ناسخ ہوگی۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زیارت قبور سے منع فرمایا تھا پھر اس کی اجازت دی۔

کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور	میں نے تمھیں زیارت قبور سے منع کیا تھا،
فزوروھا فانھا تذکر الآخرۃ[2]	اب زیارت کیا کرو، آخرت کو یاد دلاتی ہے۔

خارجی نقد کے بعض اصول دونوں میں مشترک ہیں

بعض اصول داخلی وخارجی دونوں میں مشترک ہیں، مثلاً حدیث کی پہلی تقسیم صحیح حسن اور ضعیف کی طرف کیجاتی ہے اور حدیث صحیح کی درج ذیل شرط داخلی نقد سے متعلق ہے۔

ولا یکون شاذا ولا معللا[3]	وہ حدیث جو شاذ اور معلل نہ ہو،

شاذ

ما یخالف الراوی الثقۃ فیہ بالزیادۃ او النقص فی السند او فی المتن الملأ ای الجماعۃ الثقات من الناس بحیث لا یمکن الجمع بینھما[4]	الفاظ حدیث کی زیادتی یا کمی میں ثقہ راوی ثقہ جماعت کی مخالفت کرے اور دونوں کے درمیان جمع ممکن نہ ہو، یہ مخالفت کبھی سند اور کبھی متن میں ہوتی ہے۔

"متن" میں شاذ کی مثال موسیٰ بن علی بن رباح سے مروی وہ روایت ہے جس میں ایام تشریق کی تعداد میں یوم عرفہ کو بھی شامل کیا گیا ہے، جبکہ دوسری تمام روایتوں میں عرفہ شامل نہیں ہے[5]۔

---

[1] نزہتہ النظر ناسخ ومنسوخ [2] ایضاً [3] ابن صلاح: مقدمہ ابن صلاح۔ النوع الاول معرفۃ الصحیح [4] فتح المغیث بشرح الفیۃ۔ الحدیث الشاذ۔ [5] ایضاً

معلل

هو الحديث الذى اطلع فيه علة تقدح فى صحته مع ان الظاهر السلامة منها[1]

وہ حدیث جس میں کسی علت کی وجہ سے اس کی صحت مجروح ہو جائے حالانکہ ظاہر میں کوئی خرابی نہ معلوم ہو۔

"علت" سے مراد وہ مخفی اور باریک اسباب ہیں جو حدیث میں خرابی پیدا کر دیں، مثلاً منقطع کو متصل اور موقوف کو مرفوع بنا دیں یا کسی حدیث کو دوسری میں داخل کر دیں یا اسکے مثل جو بھی تبدیلی حدیث کی صحت کو مجروح کر دے، وہ علت میں داخل ہو گی[2]

"علت" سند اور متن دونوں میں پائی جاتی ہے "متن" میں علت کی مثال وہ روایت ہے جس میں حضرت انسؓ سے نماز کے شروع میں بسم اللہ الخ پڑھنے کی نفی اور قرأت کی ابتدا الحمد للہ الخ سے ثابت ہوتی ہے، جبکہ دوسری روایتوں میں بسم اللہ الخ کا ثبوت موجود ہے،[3]

منکر

انه الحديث الذى ينفرد به الرجل ولا يعرف متنه من غير روايته لا من الوجه الذى رواه منه ولا من وجه آخر[4]

وہ حدیث جس کا راوی تنہا ہو اور اس شخص کی روایت کے علاوہ نہ اس طریق سے اور نہ دوسرے طریق سے حدیث کے متن کا پتہ چل سکے۔

مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا تشریف لے جاتے تو انگوٹھی نکال دیتے تھے، ابو داؤد نے اس کو "منکر" اور نسائی نے اس کو "غیر محفوظ" کہا ہے، مزید تفصیل مقدمہ ابن صلاح

---

[1] مقدمہ ابن صلاح النوع الثامن عشر معرفۃ الحدیث المعلل [2] ایضاً و شیخ عبدالعزیز خولی: تاریخ فنون الحدیث و مفتاح السنۃ۔ علل الحدیث [3] فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث۔ المعلل [4] مقدمہ ابن صلاح معرفۃ المضطرب

کی شرح "التنقید والایضاح" میں دیکھنی چاہیے۔[1]

مضطرب

هو الذی یختلف الروایة فیه	وہ حدیث جس میں روایت کے الفاظ
فیرویه بعضهم علی وجه وبعضهم	مختلف ہوں کوئی راوی کسی طرح روایت کرے
علی وجه آخر مخالف له[2]	اور کوئی اسکے مخالف طریقہ سے روایت کرے۔

مثلاً ایک روایت میں ہے

ان فی المال حقا سوی الزکوٰة[3]	مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔

دوسری روایت میں ہے

لیس فی المال حق سوی الزکوٰة[3]	مال میں زکوٰۃ کے سوا اور کوئی حق نہیں ہے۔

مصحف

هو تغییر لفظ او معنی اما تصحیف	لفظ یا معنی کو بدل دینا سننے کی غلطی سے
سمع او بصر[4]	ہو یا دیکھنے کی غلطی سے ہو

مثلاً روایتوں میں ہے

من صام رمضان واتبعه	جس نے رمضان کے روزے رکھے اور
ستا الخ	اس کے ساتھ چھ شوال کے روزے رکھے الخ

ابوبکر صولی نے ستاً (چھ) کو شیئا (کچھ) روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] التنقید والایضاح معرفة المنکر [2] محمد بن محمد علی فارسی: جواہر الاصول فی علم الحدیث الرسول۔ المضطرب [3] حاشیہ نزہتہ النظر ص ۵۶ [4] جواہر الاصول۔ المصحف [5] ڈاکٹر صبحی صالح علوم الحدیث ومصطلحہ الفصل الخامس

مقلوب

هو الحديث الذى انقلب فيه	وہ حدیث جس میں کسی راوی سے متن میں
على احد الرواة لفظ فى المتن	کوئی لفظ الٹ جائے یا سند میں کسی
او اسم رجل او نسبه فى الاسناد	راوی کا نام یا نسب الٹ جائے یعنی
فقدم ما حقه التاخير او اخر	جس کو مقدم ہونا چاہیے وہ موخر ہو جائے،
ما حقه التقديم او وضع شيئ	اور جسکو موخر ہونا چاہیے وہ مقدم ہو جائے،
مكان شيئ -[1]	یا کسی نام و لفظ کی جگہ کوئی دوسرا نام و لفظ رکھ دیا جائے

متن کی مثال وہ روایت ہے جس میں اس حد تک مخفی طریقہ سے صدقہ کرنے کا ذکر ہے کہ "بایاں ہاتھ نہیں جانتا کہ دایاں ہاتھ کیا خرچ کرتا ہے" بعض روایت میں دایاں کی جگہ بایاں ہاتھ کر دیا گیا ہے،[2]

مدرج

المدرج هو الحديث الذى	وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں ایسی
اطلع فى متنه او اسناده على	زیادتی کا پتہ چلے جو اس کا جز نہیں
زيادة ليست منه[3]	ہے،

مثلاً حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا

اسبغوا الوضوء فان ابا القاسم	پورا وضوء کیا کرو کیونکہ رسول اللہ
صلى الله عليه وسلم قال ويل	نے فرمایا ہے افسوس وہ ایڑیاں جو دوزخ
للاعقاب من النار[4]	میں جائیں گی (یعنی خشک رہ جانے کی وجہ سے)

[1،۲] علوم الحدیث و مصطلحہ الفصل السابع۔ المقلوب [۳] ایضاً۔ المدرج [۴] حاشیہ جواہر الاصول۔ المدرج

"اسبغوا الوضوء" حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے جو حدیث میں داخل ہے۔

خارجی نقد کے اور بھی بعض اصول ہیں جو دونوں میں مشترک کیے جاتے ہیں جن کی بنا پر محدثین نے درایت کی ایسی تعریف کی ہے جو دونوں پر صادق آتی ہے، جیسا کہ درایت کی عام اصطلاحی تعریف میں تفصیل گذر چکی۔

اکثر وبیشتر خارجی و داخلی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا

اسی اشتراک کی وجہ سے اکثر وبیشتر خارجی و داخلی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، بلکہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے جو حدیث صحیح ہوتی وہ داخلی (متن) کے لحاظ سے بھی صحیح ہوتی ہے، اسی طرح داخلی نقد کے لحاظ سے جو صحیح ہوتی وہ خارجی لحاظ سے بھی صحیح ہوتی ہے،

فالغالب علی السند الصحیح	اکثر سند صحیح متن صحیح پر منتہی ہوتی ہے
ان ینتھی بالمتن الصحیح والغالب	اور اکثر متن صحیح معقول جو حس کے
علی المتن المعقول المنطقی	مخالف نہ ہو سند صحیح کی طرف
الذی لا یخالف الحس ان	لوٹایا جاتا ہے،
یرد عن طریق سند صحیح[1]	

لیکن سند و متن کی صحت کے درمیان تلازم نہیں ہے یعنی جب ایک صحیح ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی صحیح ہو، یا ایک حسن وضعیف ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی حسن وضعیف ہو۔

لا تلازم بین السند والمتن	سند اور متن کے درمیان صحت وحسن
فی الصحۃ وغیرھا[2]	وغیرہ میں تلازم نہیں ہے۔

---

[1] ڈاکٹر صبحی الصالح: علوم الحدیث ومصطلحہ۔ الفصل السابع [2] حسن محمد المشاط: رفع الاستار عن محیا مخدرات طلعۃ الانوار شرح الراجی الفوز علی الصراط۔ تنبیہ لا تلازم بین السند والمتن فی الصحۃ وغیرہا۔

ولا یختص ذلک بالصحیح	یہ بات صحیح یا حسن کے ساتھ خاص نہیں ہے
او الحسن بل یجری فی الضعیف ایضاً [۱]	بلکہ ضعیف میں بھی پائی جاتی ہے۔

چنانچہ محدثین جب "سند" کی صحت وغیرہ کا حکم لگاتے ہیں تو وہ "متن" کے لیے لازم نہیں ہوتا، اسی طرح جب "متن" کے بارے میں کوئی حکم لگاتے ہیں تو وہ "سند" کے لیے لازم نہیں ہوتا۔[۲]

ٹکراؤ کی پہلی صورت (۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے حدیث صحیح ہوتی ہے، لیکن داخلی نقد کے لحاظ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہوتی ہے۔

قد یصح السند او یحسن لاتصاله	کبھی سند۔ اتصال۔ راویوں کے ثقہ اور
وثقة رواته وضبطهم دون	انکے ضبط کی وجہ سے صحیح ہوتی لیکن "متن" شذوذ
المتن لشذوذ او علة [۳]۔	اور علت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔

محدث ابن جوزی کہتے ہیں

وقد یکون الاسناد کله ثقات	کبھی کل سند میں ثقہ ہوتی ہیں پھر
ویکون الحدیث موضوعا	بھی حدیث موضوع یا مقلوب
او مقلوباً [۴]	ہوتی ہے۔

اس کی دو شکلیں اس کی عموماً دو شکلیں ہوتی ہیں

(الف) بعض بددین اور جھوٹے راوی کسی موضوع حدیث کو ثقہ راویوں کی حدیث میں داخل کر دیتے، پھر یہ داخل شدہ حدیث ثقہ راوی کی حدیث سمجھکر روایت کی جاتی، مثلاً ابن ابی العوجاء جو حماد بن سلمہ کا ربیب (سوتیلا لڑکا) تھا، وہ ثقہ راویوں کی حدیث

---

[۱] حسن محمد المشاط، رفع الاستار عن محیا مخدرات طلعة الانوار شرح الراجز المعوز علی الصراط۔ [۲] تنبیہ لا تلازم بین السند والمتن فی الصحة وغیرها، ص ۳۵۔ [۳] ایضاً۔ [۴] ابن جوزی کتاب الموضوعات ج ۱ الباب الثالث فی الامر بانتقاد الرجال والتحذیر

میں یہ حرکت کیا کرتا تھا۔ یا عبداللہ بن صالح کا ایک پڑوسی تھا جس کو عبداللہ سے عداوت تھی، وہ حدیثیں وضع کر کے عبداللہ کے شیخ کی طرف منسوب کر دیتا یا اس کے خط کے مشابہ لکھکر اسکے گھر پھینک دیتا اور عبداللہ اس کو غلطی سے اپنا خط سمجھکر اس حدیث کو روایت کرتا تھا، جسکی وجہ سے اس کی حدیثوں میں بعض منکر حدیثیں شامل ہو گئی ہیں۔ حالانکہ عبداللہ لیث کا کاتب اور سچا آدمی تھا۔ اوپر موضوعات میں یہ حدیث گذر چکی ہے جو اسی قبیل کی ہے۔

ان سفینة نوح طافت بالبیت	نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کے
سبعا وصلت خلف المقام	سات چکر لگائے اور مقام ابراہیم کے
رکعتین	پیچھے دو رکعت نماز ادا کی۔

(ب) کوئی راوی جھوٹے اور ضعیف لوگوں سے حدیث سنتا جس کو یہ لوگ اپنے شیخ سے روایت کرتے تھے لیکن روایت حدیث میں حرص کی وجہ سے یہ راوی درمیان سے جھوٹے اور ضعیف لوگوں کے نام نکال کر براہ راست شیخ سے روایت کرنے لگتا تھا، جس سے حدیث مقلوب ہو جاتی تھی۔ مثلاً بقیہ بن ولید کے شاگرد درمیان سے جھوٹے اور ضعیف راویوں کو ساقط کر کے اس کی حدیثیں بگاڑ دیتے تھے، یا عبداللہ بن عطاء، عقبہ بن عامر سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کرتے ہیں

من توضأ فاحسن الوضوء	جس شخص نے ٹھیک وضو کیا
دخل من ای ابواب الجنة	تو وہ جنت کے جس دروازے سے
شاء	چاہے گا داخل ہوگا۔

ایک شخص نے عبداللہ سے پوچھا کہ تم سے کس نے یہ حدیث بیان کی کہا عقبہ نے پھر پوچھا کیا تم نے خود عقبہ سے سنا ہے، کہا نہیں۔ مجھ سے سعد بن ابراہیم نے بیان کی، سعد سے پوچھا گیا تو

تو انھوں نے کہا کہ مجھ سے زیاد بن مخراق نے بیان کی زیاد سے پوچھا گیا تو کہا کہ شہر بن حوشب نے بیان کی اور انھوں نے ابو ریحانہ سے روایت کی ہے، اس طرح مذکورہ حدیث میں درمیان سے کئی راویوں کو نکال کر حدیث کو مجروح کیا گیا۔

اسی طرح حدیث میں یہ سند "معمر عن محمد بن واسع عن ابی صالح عن ابی ہریرۃ" اس میں شخصی طور پر یہ سب ثقہ ہیں، لیکن معمر کا سماع ابن واسع سے اور ابن واسع کا سماع ابو صالح سے ثابت نہیں ہے۔[1]

ٹکراؤ کی دوسری صورت | (۲) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داخلی نقد کے لحاظ سے حدیث صحیح ہوتی لیکن خارجی کے لحاظ سے وہ اس درجہ کی نہیں ہوتی،

وکذالک قد یصح المتن او یحسن	کبھی متن صحیح یا حسن ہوتا ہے لیکن سند
دون السند[2]	ایسی نہیں ہوتی۔

اس کی شکل | اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ

بان یجیئ المتن من طریق آخر	"متن" دوسرے طریق سے بھی مروی ہو
سالم مما فی ھذا الطریق[3]	جس میں اس طریق والی خرابی نہ پائی جائے

مثلاً

اطلبوا العلم ولو بالصین[4]	علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ہو۔

محدثین نے کئی طرق نقل کر کے سند کے لحاظ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے[5] لیکن عراقی نے کہا ہے،

---

[1] ابن جوزی کتاب الموضوعات ج ۱ الباب الثالث فی الامر باستفادہ الرجال و التحذیر [2] حسن محمد المشاط، رفع الاستار تنبیہ التلازم بین السند و المتن الخ [3] ایضاً [4] ابن عبد البر جامع بیان العلم [5] جلال الدین السیوطی اللآلی المصنوعہ کتاب العلم

قد صحح بعض الائمۃ بعض طرقہ[1] — بعض اماموں نے اسکے بعض طرق کی تصحیح کی ہے

"مزی" نے کہا

ان طرقہ تبلغ بہ مرتبۃ الحسن[2] — اسکی کئی سندیں اسکو "حسن" کے درجہ پر پہنچا دیتی ہیں۔

حدیث کا مفہوم اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ عرب وچین کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ اور عرب کی بندرگاہوں میں چینی جہازکی آمد و رفت رہتی تھی۔ اور بعض شہروں میں چینی مال فروخت ہوتا تھا۔[3]

حدیث کا مفہوم سمجھنے میں اس لیے دشواری پیش آئی کہ حدیث میں علم سے دینی علم مراد لیا گیا جو چین میں موجود نہ تھا۔ حالانکہ اس سے "کائناتی علم" مراد ہے اور حدیث کا مقصد اس کی تحصیل کی ترغیب اور اس راہ کی مشقتوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ جیساکہ بیہقی نے "مدخل" میں کہا ہے،

العلم العام الذی لا یسع البالغ العاقل جھلہ[4] — وہ عام علم جس سے کسی عاقل بالغ کو جاہل رہنے کی گنجائش نہ ہو۔

علم ما یطرأ لہ خاصۃ[5] — وہ علم جس کی خاص طور سے ضرورت پیش آئے،

ٹکراؤ کی دوسری صورت کی پہچان زیادہ مشکل نہیں ہے۔ البتہ پہلی صورت کی پہچان زیادہ مشکل ہے،

ھذا اصعب الاحوال[6] — یہ (پہلی صورت) سب سے زیادہ دشوار حالت ہے

---

[1] سخاوی: المقاصد الحسنہ حرف الطاء۔ [2] ایضاً [3] ملاحظہ ہو مسعودی، مروج الذہب ومعادن الجواہر الباب الخامس عشر ذکر ملوک الصین والترک وتفرق، نیز ابن حبیب، المحبّر اسواق العرب المشہورۃ فی الجاہلیۃ وما یفعلہم فیہا۔
[4] ودیکھو سخاوی: المقاصد الحسنہ حرف الطاء [5] ابن جوزی کتاب الموضوعات، الباب الثالث،

ٹکراؤ پر نقد حدیث کا ماہر ہی قابو پا سکتا ہے | اس کو ماہر فن ہی پہچان سکتا ہے۔

ولا یعرف ذلک الا النقاد[1]	اس کی معرفت نقد حدیث کے ماہر ہی کو حاصل ہوتی ہے
ولیس له دواء الا اتقان هذا الفن والرسوخ فیه[2]	اس کا علاج اسکے سوا اور کوئی نہیں کرفنی مہارت اور علمی رسوخ حاصل ہو

سہولت کے لیے خارجی و داخلی نقد کے ٹکراؤ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔

(۲) مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔

غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ دور کرنے کا طریقہ | اگر غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ ہے تو پہلے مستند کتب کی طرف رجوع کیا جائے گا، اگر ان میں نظیر موجود ہے تو روایت کی حیثیت متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی اور اگر کوئی نظیر نہیں ہے تو بالعموم خارجی نقد کے ذریعہ حدیث کی تحقیق ہو جائے گی۔

ابن جوزی کہتے ہیں:

متی رأیت حدیثا خارجا عن دواوین الاسلام کالموطا ومسند احمد والصحیحین وسنن ابی داؤد ونحوها فان کان له	جب تم کسی حدیث کو اسلام کے دواوین مؤطا، مسند احمد، بخاری ومسلم، سنن ابو داؤد اور اس کے مثل کتابوں سے خارج دیکھو اور اس کی نظیر صحیح وحسن

---

[1] ابن جوزی: کتاب الموضوعات، الباب الثالث [2] محمد جمال الدین قاسمی: قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث بیان مفرد الموضوعات۔

نظیر من الصحاح والحسان	حدیثوں میں موجود ہو تو اسکے بارے میں
قرب أمرہ وان ارتبت فیہ و	فیصلہ کرنا آسان ہے اور اگر تمہیں شک ہو
رأیتہ یباین الاصول فتامل	نیز وہ حدیث "اصول" کے خلاف ہو تو
رجال اسنادہ واعتبر احوالھم	سند اور راویوں کے حالات پر غور کرو۔
من کتابنا المسمی بالضعفاء	ہماری کتاب جس کا نام "کتاب الضعفاء
والمتروکین فانک تعرف	والمتروکین" ہے اس سے راویوں کا حال معلوم
وجہ القدح فیہ[1]	ہو جائیگا اور حدیث میں خرابی کا پتہ چل جائیگا۔

بعض نے یہاں تک کہا ہے

"کلی قواعد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ احادیث نبویہ، مسائل فقہیہ اور تفاسیر قرآنی انھیں کتابوں سے نقل کی جائیں جو متداول ہیں، کیونکہ یہ کتابیں محفوظ ہیں اور انکے علاوہ دوسری کتابوں میں زندیقوں اور ملحدوں نے موضوع حدیثیں شامل کر دی ہیں، جس کی بنا پر ہر وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔"[2]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحیح حدیثیں صرف ان ہی کتابوں میں ہیں، ان کے علاوہ اور کہیں ان کا وجود نہیں ہے، امیر یمانی کی کتاب "توضیح الافکار لتنقیح الانظار فی اصول الحدیث" میں ایک مستقل باب "عدم انحصار الصحیح فی کتب الحدیث" کے نام سے ہے جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے۔[3]

---

[1] ابن جوزی: کتاب الموضوعات، الباب الثالث [2] محمد صباغ: مقدمہ۔ الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ (موضوعات کبیر کا اصل نام) بحث لایجوز نقل الاحادیث الامن الکتب المتداولۃ [3] امیر یمانی: توضیح الافکار۔ الموضوع۔

مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی صحت وشہرت کے لحاظ سے جو درجہ ان کتابوں کو حاصل ہے وہ دوسری کتابوں کو حاصل نہیں ہے۔

کتب حدیث کی تقسیم: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے صحت وشہرت کے لحاظ سے کتب حدیث کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے جس سے ان کے درجے متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے،

(۱) پہلے طبقہ میں موطا، صحیح بخاری وصحیح مسلم ہیں

(۲) دوسرے میں ابوداؤد، جامع ترمذی، مسند احمد ونسائی ہیں، یہ کتابیں اگرچہ پہلے کے درجہ تک نہیں پہونچتیں لیکن ان کے قریب ہیں،

(۳) تیسرے میں مسند ابن ابی شیبہ۔ مسند ابویعلیٰ۔ مسند طیالسی، مسند عبد ابن حمید مصنف عبدالرزاق اور بیہقی۔ طبرانی وطحاوی کی کتابیں۔ ان میں صحیح وغلط ہر قسم کی روایتیں شامل ہیں،

(۴) چوتھے میں ابن حبان وکامل عدی کی کتاب الضعفاء، خطیب، ابونعیم، جوزقانی ابن عساکر، ابن نجار اور دیلمی کی کتابیں نیز ابن مردویہ۔ ابن شاہین، ابوشیخ کی کتابیں اور مسند خوارزمی وغیرہ جو بعد میں مرتب ہوئیں، اور جن میں واعظ، صوفیا، اہل ہوا اور ضعفاء کی روایتیں، اسرائیلیات وحکماء کے اقوال وغیرہ کو خلط ملط کر کے سب کو شامل کر دیا گیا "موضوعات" کا زیادہ ذخیرہ ان ہی کتابوں سے لیا گیا ہے،

(۵) پانچویں میں وہ روایتیں ہیں جو فقہا، صوفیا، مورخین وغیرہ کی زبان زد ہیں اور مذکورہ چار طبقوں میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ان میں بہت سی وہ روایتیں بھی ہیں جن کو ملحدوں اور بددینوں نے قوی سند وضع کر کے روایت کیا جس سے اسلام کی اصل صورت مسخ ہوئی اور فتنہ وفساد برپا ہوا[1]

---

[1] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ باب طبقہ کتب الحدیث

حضرت شاہ صاحب مذکورہ طبقات کی حدیثوں کا حکم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

" پہلے اور دوسرے طبقہ کی حدیثیں محدثین کی معتمد علیہ اور ان کی توجہات کا مرکز ہیں، تیسرے طبقہ کی حدیثوں کو نقل کرنا اور قابل عمل ٹھہرانا ان محققین و ماہرین کا کام ہے جو اسماء رجال اور علل حدیث سے واقف ہیں، بسا اوقات ان سے متابعات و شواہد کا کام لیا جاتا ہے، چوتھے طبقہ کی حدیثوں کو جمع اور ان سے استنباط میں مشغول ہونا متاخرین کا ایک قسم کا غلو ہے۔[1]

اس لحاظ سے مستند کتب حدیث میں پہلے اور دوسرے طبقہ کی کتابیں شامل ہوں گی، تیسرے طبقہ کی حدیثوں میں ماہرین کی رائے و تحقیق ضروری ہے۔ (باقی)

---

[1] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ باب طبقۃ کتب الحدیث

عہد ہشام کا سندھ

از۔ جناب ڈاکٹر عبد الباری لکچرار عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

ہشام کی تخت نشینی سے قبل سندھ کے حالات کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد ہی خلیفہ نے اپنی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایک مشہور اور مدبر سپہ سالار جنید بن عبد الرحمٰن کو ۱۰۶ھ میں سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا تاکہ سندھ کی صوبائی حکومت کا انتظام مکمل طور پر مرکزی اقتدار کے تحت آجائے۔ اور اندرونی شورشوں کا سد باب ہو جائے۔ ساتھ ہی اس کی ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے ملحقہ سرحدوں کو بھی بیرونی خطرات سے پاک کرکے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

جنید نے ۱۰۶ھ میں سندھ پہونچ کر وہاں کے نومسلم حاکم جلیشا جو غالباً جے سید (جے سنگھ) کی عربی میں بگڑی ہوئی شکل ہے سے حکومت کی باگ ڈور واپس لینی چاہی۔ جے سنگھ نے انکار کے بعد ارتداد کا راستہ اختیار کیا اور جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ دریائے سندھ میں ہی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ جے سنگھ کو شکست ہوئی۔ اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ سندھ کے صوبہ سے ملحق ایک دوسری ریاست

۱؎ بلاذری۔ فتوح البلدان، ص۔ ۳۰-۴۲۹

کیرج[51] کے راجہ "الراء" (رائے) نے بھی مرکزی اقتدار کی خلاف ورزی کی تھی چنانچہ جنید نے یہاں کے حالات درست کرنے کے لیے اس ریاست کی طرف پیش قدمی میں پہل کی۔ کیرج کے محل وقوع کے بارہ میں مقامی مورخین اور مستشرقین دونوں کے یہاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن نے اس کو کچھ (سوراشٹر) کے علاقہ میں بتایا ہے[54] مگر بلاذری کی روایت کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقام راجستھان میں موجودہ جیسلمیر[55] کے علاقہ کے قریب تھا۔ جدید تاریخی تحقیقات کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ مقام راجستھان میں ۲۷ عرض البلد اور طول البلد کے قریب واقع تھا۔ کیونکہ بقول بلاذری جنید یہاں سے گجرات کی سرحد کی طرف بڑھتا ہے۔ تو ریگستان کے راستے پیش قدمی کرتا ہے۔ ڈاکٹر شرما نے بھی اس علاقہ میں سانبھاری چوہان خاندان کی ریاست لکھی ہے جو پہلے سندھ سے ملحق تھی۔ لیکن محمد بن قاسم کی فتوحات کے وقت یہ خاندان سانبھر جھیل ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔ اور یہ علاقہ جنگلا دیش میں یعنی چھوٹی چھوٹی ریگستانی جھاڑیوں والا ملک کہا جاتا تھا[56]، بعد میں

---

[51] بقول آر۔ سی۔ مجمدار یہ علاقہ کیراگرام میں واقع تھا۔ جو کوٹ کانگڑا سے ۳۰ میل مشرق میں

[52] ۳۲ عرض البلد اور ۷۶ طول البلد پر واقع ہے۔ دیکھئے انڈین آف انڈیا۔ ص ۶۰

[53] بلاذری:۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۳۵ - ۴۴۵۔

[54] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن:۔ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورین، ص ۵۰۳۔

[55] بلاذری: فتوح البلدان۔ صفحہ ۴۳۵ - ۴۴۵۔

[56] ڈاکٹر ڈی۔ شرما:۔ راجستھان تھرو دی ایجز، جلد ۱، ص ۱۲، ۱۸، بیکانیر ۱۹۶۶ء

یہی راجے سا ہبزی راؤ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے یہ ممکن ہے اسی خاندان کا دوسرا راجا جسے بلاذری الراہ کے نام سے یاد کرتا ہے، ان دنوں کیرج کے علاقہ میں مقیم ہو۔ مگر اغلب یہ ہے کہ ان دنوں کیرج کی ریاست میں جیسلمیر کا بھٹی راجا دیورج حکومت کر رہا ہو۔ اسی کا ہمعصر راجا سیلوکا، ماندل کا حکمراں تھا۔ مشہور مورخ ایچ۔ سی۔ رے نے بھی اس علاقہ کو کیرادو کا نام دیا ہے ا ر راجاؤں کی ایک ریاست کی نشاندہی کی ہے۔ بلاذری کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مقامی راجہ "اشند رابید" نامی جنید کا طرفدار ہوگیا تھا۔ اور جنگی پیش قدمی میں اسکے ساتھ تھا۔ اغلب یہ ہے کہ اس راجا کا نام "چندر گپتا" کی بگڑی ہوئی شکل ہو کیونکہ ڈاکٹر ڈی۔ سی سرکار کی حالیہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ راجستھان کے ایک علاقہ میں متھرا کے علاوہ، ایک موریا خاندان بھی برسراقتدار تھا۔ جس کے چار راجے یکے بعد دیگرے حکمران ہوے۔ ان میں ایک "چندر گپتا" بھی تھا۔

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کی آمد سے پہلے سندھ پر موریا ہی خاندان کا راجا حکومت کرتا تھا۔ اسی خاندان کی ایک شاخ "چتوڑ" پر حکمران تھی۔ ممکن ہے۔ خاندانی بربادی اور سیاسی شکست نے اس کے دل میں ہم وطنوں سے بیزاری پیدا کر دی ہو۔ وہ مسلمانوں کی رواداری اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر وہ اسلامی سپہ سالار کے ساتھ ہوگیا ہو۔ جنگ کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ کیرج کی یہ ریاست

ڈاکٹر۔ ڈی۔ شرما۔ راجستھان تھرو دی ایجز، جلد ۱، ص ۲۶۵۔

ایضاً۔ ص ۲۱۷-۲۱۸۔

ایچ۔ سی۔ رے: ڈائناسٹک ہسٹری آف ناردرن انڈیا، جلد ۲، ص ۸۳، ۹۲۔

مضبوط بنیادوں پر قائم اور طاقتور تھی۔ اس کے پاس بڑے بڑے مستحکم قلعے تھے۔ جنکا سر کرنا اس دور میں اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اس کے علاوہ راجا کو ہم وطن ہندوستانی راجوں کی حمایت اور مدد کا بھروسہ بھی تھا۔ چنانچہ جنید کی فوج کے سامنے اس راجا نے سپر نہیں ڈالی بلکہ قلعہ بند ہو گیا۔ جنید نے اس زمانہ کی جدید ترین مسلمانوں کی ایجاد "داس الکبش" کے ذریعہ قلعہ کی دیوار توڑ ڈالی اور قلعہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ کبش کا استعمال دوسری صدی ہجری شروع ہو گیا تھا۔ ممکن ہے اسلامی افواج نے ہندوستان ہی میں پہلی مرتبہ اس ہتھیار کا استعمال کیا ہو۔ یہ حربہ قلعوں کے حصار کے وقت کام میں لایا جاتا تھا۔ اس کا استعمال "دبابہ" کے اندر سے ہوتا تھا۔ دبابہ کو قلعہ کی دیوار سے ملا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جس کے اندر دو بڑے بڑے دس دس میٹر لمبے لکڑی کے بلے نما ڈنڈے زنجیروں کے سہارے دبابہ کی چھت سے لٹکتے رہتے تھے۔ ان کے سرے پر سخت قسم کا نوکیلا لوہا جڑا ہوتا تھا۔ اور متعدد اشخاص دبابہ کے اندر سے اسے اسپرنگ کی کی طرح کھینچ کھینچ کر قلعہ کی دیواروں پر مسلسل ضرب لگاتے تھے جس سے دیوار ٹوٹ جاتی تھی اور فوج اندر داخل ہو جاتی تھی۔ بہرحال کیرج کی فتح نے سندھ اور طرف سندھ کی قوتوں کے حوصلے پست کر دیے۔ اور پورے سندھ میں ملتان[۱] تک مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔[۲]

---

[۱] سندھ کا ملتان ڈویژن سیکالا (جدید سیالکوٹ) تک شمال میں پھیلا ہوا تھا اسکے بعد کاشمیر کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ اس ڈویژن میں قریب قریب پورا مشرقی اور جنوبی پنجاب شامل تھا۔ دیکھئے ار۔ سی۔ مجمدار: دی عرب انوکشن آف انڈیا، ص ۵۴،

[۲] الیعقوبی: تاریخ، جلد ۲، ص ۳۰۵۔

اس کے بعد جنید کے سامنے دوسرا اہم کام سندھ کی سرحدوں کو ہندوستان کی طرف سے لاحق خطروں سے محفوظ و مامون کرنا تھا کہ اس صوبہ کی حکومت کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی شکل باقی نہ رہے۔ اور ایک دوامی استحکام پیدا ہو جائے۔

اسکیلئے راجستھان کی جنوبی سرحد کیرج کی فتح سے محفوظ ہو گئی تھی۔ راجستھان کے چوہان راجے سانبھر کے مشرقی علاقے میں جا چکے تھے۔ دوسرے سرحد کی ناکہ بندی گجرات کی طرف کرنا تھی۔ جس کی شمال سے جنوب تک ایک طویل سرحد سندھ کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ اور عرصہ سے گجرات کے سولانکی چالوکیہ خاندان کے راجوں اور سندھ کی ریاست کے درمیان سرحدی تنازعہ چلا آتا تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد بھی اس میں تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ چنانچہ جنید کیرج کے علاقہ سے راجستھان کے مشہور تھار ریگستان کو عبور کیا۔ اور سب قریب تر ریاست مرمد (مارومد) جو مارواڑ کا قدیم نام ہے[1]۔ جا پہونچا مرمد ان دنوں سیلو کا[2] "راجا حکومت کر رہا تھا۔ جنید سے شکست کھا کر اس نے اطاعت قبول کرلی۔ یہاں سے اسلامی افواج نے مانڈل پر پیش قدمی کی۔ اس علاقہ کو فتح کرنے بعد انکا حملہ دھنیج پر ہوا[3]۔ یہ علاقہ پنچ سر کے قریب ہے۔ یہ سارے علاقے شمالی گجرات میں

---

[1] گجرات سلطنت کی سرحد شمال میں تقریباً مارواڑ سے شروع ہو کر جنوب میں دریا نربدا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسوقت گرجرا پرتیہار خاندان کی سلطنت گجرات اجین تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھیے۔ وی۔ اے اسمتھ: دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، ص ۱۹۹۔ [2] ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ ص ۳؛ بقول مجمدار مارواڑ جودھ پور کا ایک حصہ رہا ہوگا۔ دیکھیے دی عرب انویجن آف انڈیا، ص ۱۴،

[3] ڈاکٹر۔ دی شرما۔ راجستھان جلد ۱، ص ۲۱۰۔ ۲۰۸ [4] یہ علاقہ ویراگرام سے ۱۴ میل شمال مغرب میں واقع ہے اور ویراگرام احمد آباد سے ۳۵ میل پچھم ہے۔ دیکھیے جے برگیس، آرکیالوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا، قسم ۲ جلد ۸ ص ۹۲-۹۱ [5] پنچ سر رادھن پور کے قریب ہے دیکھیے ابو ظفر ندوی تاریخ

کی سلطنت کے ماتحت تھے جس کا پایہ تخت بیلمان (بھیں مال) تھا۔[1] یہاں چالوکیا خاندان کے کاکایا (چوڑیکا) راجے برسراقتدار تھے۔[2] دھنج کی فتح کے بعد گجراتیوں کو پاؤں اکھڑ گئے۔ اور شکست خوردہ افواج بھی بھاگ کر پایہ تخت میں جمع ہوئیں۔ اور عربوں کو گجرات کے علاقے سے نکال دینے کی زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔ اس لیے جنید نے بلاتاخیر خود بیلمان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ پایہ تخت کو بچانے کے لیے گجراتیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ لیکن بالآخر جنید نے بیلمان کو فتح کر لیا۔[3] اس فتح سے گجرات کا چاپا خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔[4] اب گجراتی افواج کے لیے کہیں جائے پناہ نہ رہ گئی تھی۔ اس لئے شکست خوردہ ہندی افواج دکھنی گجرات چلی گئیں۔ اور بروص (بھڑوچ) میں دشمن کو روکنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔[5] دکھنی گجرات میں بھڑوچ "لاٹا ریاست" کے گرجرا خاندان کا پایہ تخت تھا ان دنوں جسے بھٹ سوم (۷۰۰ تا ۷۳۵ء) وہاں حکومت کر رہا تھا۔[6] یہ راجا دکھنی گجرات کے چالوکیہ شاہنشاہ دینا، تیہ منگل راج (۷۳۱ء) کے ماتحت تھا۔[7] جنید نے یہاں بھی پیش قدمی سے کام لیا۔ اور قبل اس کے کہ گجراتی حملہ آوروں نے اس

---

[1] بیلمان (بھین مال یا بھلا مالا) شمالی گجرات کا پایہ تخت تھا۔ اسکا محل وقوع ابوپہاڑ کے پچھم کا علاقہ ہے۔ دیکھیے۔ وی۔ اے اسمتھ: دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔ ص ۱۹۹۔ [2] ایچ۔ سی رے: ڈائنا سٹک ہسٹری آف انڈیا، جلد ۲ ص ۹۳۴۔ [3] البلاذری: فتوح البلدان ص ۴۳۵۔ ۴۴۵
[4] ڈاکٹر ڈی۔ شرما۔ راجستھان تھرو دی ایجز، جلد ۱، ص ۱۲۱، ۱۲۰۔ [5] ایضاً ص ۱۲۲
[6] میٹ۔ پاول ہسٹری آف انڈیا جلد ۱، ص ۲۵۱۔ [7] ابو ظفر ندوی تاریخ گجرات ص ۱۰۸، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۸ء۔

عربی افواج کو نہایت سرعت کے ساتھ بھڑوچ پہنچا دیا۔ گجراتی ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ عربوں کا زبردست حملہ ہو گیا۔ اور ایک شدید جنگ کے بعد گجراتیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب دکھنی گجرات میں صرف مالیہ (مالوہ) کی ریاست بچ رہی تھی۔ جہاں سے عربوں کے خلاف جنگی کارروائی کا امکان ہو سکتا تھا۔ عربوں کی آمد سے قبل یہ ریاست دو الگ الگ ریاستوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک ریاست اجین کے راجا کے ماتحت تھی۔ اور دوسری غالباً مالوہ ہی کے نام سے تھی۔ جس کا ایک اہم مرکز چتوڑ تھا۔ ممکن ہے۔ چتوڑ ان دونوں مالوہ کی ریاست کا پایہ تخت رہا ہو۔ بہرحال، جنید کی لگائی ہوئی مالوہ کے چاپا خاندان کے خاتمے کے بعد۔ لوہ کی اہمیت بہت زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ کیونکہ اسوقت اجین کا راجا "ناگ بھٹ اول" مانا جاتا تھا۔ جو خود چاپا خاندان کا باجگذار تھا۔[۲] اس کے علاوہ گجراتیوں پر عربوں کی خاصی دہشت طاری ہو چکی تھی اور راجگی طاقت بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے جنید کا ارادہ اب آگے بڑھنے کا نہیں تھا۔ کیونکہ جنوب میں لاتار ریاست کے بعد دکھنی ہندوستان کے راجوں کی سرحد شروع ہو جاتی تھی جن سے عربوں کو کوئی پرخاش نہیں تھی۔ اور وہ ان سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان سے ان کے تجارتی روابط بھی اچھے تھے یہی

---

[۱] مالوہ کا علاقہ اراولی اور وندھیا پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ سلطنت دو حصوں میں منقسم تھی، ایک "مالوہ" اور دوسری "اجین"۔ "گرجر اپرتیہار" خاندان کی حکومت تھی۔ دیکھئے ار۔ سی مجمدار۔ دی عرب انویژن، آف انڈیا، ص ۱۴ کے کے۔ دیرجی اینشینٹ ہسٹری آف سوراشٹر ص ۹، ممبئی ۱۹۵۳ء[۲] ایچ۔ سی۔ اے۔ ڈائنا شک ہسٹری آف انڈیا، جلد ا ص ۱۰، کلکتہ ۱۹۳۱ء

وجہ ہے کہ بھڑوچ سے قبل دلبھی راجاؤں کی ساحلی ریاست کو جس پر شلاد ت
نیم حکومت کر رہا تھا۔ جنید نے ہاتھ نہیں لگایا۔[۵] البتہ تنبیہی کارروائی کے طور پر
اپنے ایک ماتحت کمانڈر حبیب بن مرّہ کو ایک دستہ دیکر مالوہ کی طرف
روانہ کر دیا۔ اجین پر چاپا خاندان کا باجگذار راجا حکمران تھا۔ اس لیے گجرات
کی جنگوں میں اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ رہا ہوگا۔ مگر وہ خود سوریت (سورتھ)
کے راستہ بیلمان واپس ہوگیا تھا۔ بلاذری نے جنید کے واپسی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ
وہ دور تک دشمن کے ملک کے اندر چلا آیا تھا۔ اور واپسی میں عرب افواج کو
خطرہ ہوسکتا تھا۔[۶] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنید کی کارروائی محض تادیبی اور
حفاظتی تھی۔ اس کا مقصد ملک فتح کرنا نہیں تھا۔ چنانچہ جنید نے مفتوحہ علاقوں
پر مستقل قبضہ نہیں رکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ جس قدر آگے بڑھتا جاتا مفتوحہ علاقوں
میں عربی نظم ونسق بحال کرتا جاتا۔ مگر پورے گجرات میں ایسی کوئی صورت
پیش نہیں آئی۔ یہ ہمارے مورخین کی غلطی ہے کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جنید کے
فوراً بعد ہی ہندوستانی راجوں نے دوبارہ مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور
عربوں کو ان علاقوں سے بھگا کر سندھ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حقیقتِ حال
اس کے بالکل برعکس ہے۔ جنید کی فتوحات نے ہندوستان میں کتنا خوف وہراس
طاری کر دیا تھا۔ اور عربوں کا رعب کسقدر غالب آگیا تھا۔ اس کا اندازہ

---

[۴] ابوظفر ندوی: تاریخ سندھ، ص ۱۰۸، دارالمصنفین ۱۹۵۰ء۔ [۵] سورتھ
کاٹھیاواڑ کا قدیم نام ہے جسے سوراسٹر بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے انویجن آف انڈیا، ص ۶۰
[۶] بلاذری۔ فتوح البلدان، ص ۴۴۳ - ۴۴۴ -

بقول ڈاکٹر شرما تو ساری علاقہ کے گورنر بولاکین جنا سرے کے ایک کتبہ (۷۳۰ء) سے ہوتا ہے[1]۔ جس میں ہندی راجوں کے سندھوا، کچھیلا، سوراشٹرا، چوٹکا، موریا اور گرجا خاندانوں سے شکست کھانے کا ذکر ہے۔ بہر حال، حبیب ایک دستہ کے ساتھ اجین کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی مہموں سے اس کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مقصد صرف دشمن کی طاقت کو کمزور کرنا اور تادیبی کاروائی کرکے بیلمان میں جنید سے مل جانا تھا۔ جو عربی افواج کے ایک بڑے دستہ کے ساتھ وہاں مقیم تھا۔ چنانچہ وہ اُزَین (اُجین) جا پہنچا۔ اجین کا قدیم نام اونتی ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کے سات مقدس ترین مقامات میں ہوتا تھا۔ قیاس ہے کہ یہاں ناگ بھٹ اول برسر حکومت تھا[3]۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ناگ بھٹ نے حبیب کے حملے کے بعد اجین پر قبضہ کیا ہو اور پھر عربوں سے جنگ اور ان کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنائی ہو۔ اور ناگ بھٹ سے قبل اجین پر کوئی دوسرا راجا حکمران رہا ہو جس کو حبیب کے ہاتھوں بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہوگا۔ اس کی شکست نے عوام کو اس کی طرف سے یقیناً بدگمان کر دیا ہوگا۔ ایسی حالت میں ناگ بھٹ کے لیے اجین پر قبضہ اور عربوں کے خلاف جنگی مہم چلا کر عوامی تائید حاصل کر لینا بڑی بات نہ رہی ہو کیونکہ اجین پر عربوں کے قبضہ کے بعد اس کے اہم ترین مندر ون کے ہاتھوں سے

---

[1] ڈاکٹر ڈی۔ شرما، اجستھان تھرو دی ایجز جلد ۱، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے آگے ص ۳۰ پر

[2] ازین اور مالیہ سے مراد اجین و مالوہ ہے۔ یعنی مشرقی و مغربی مالوہ دیکھئے انویجن آف انڈیا ص ۱۴ عربوں کے حملہ سے قبل ہی مالوہ گرجرا پرتیہار خاندان کے تحت ایک علاحدہ ریاست بن چکا تھا۔ دیکھئے اینشنٹ ہسٹری آف انڈیا از کے۔ ڈی باجپئی ص ۹۰۔ [3] ایچ۔ سی۔ رے ڈائناسٹک ہسٹری آف انڈیا جلد ۱ ص ۹ فٹ نوٹ

نکل جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ بلاذری کی روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اجین کے بعد بھی کئی مقامات پر مالوہ کی ریاست میں مقامی افواج سے جھڑپ کی نوبت آئی۔[1] ممکن ہے ناگ بھٹ ہی نے مختلف جگہوں پر جبیب کے دستہ سے مزاحمت کی ہو۔ مگر جبیب چونکہ آگے جنگی سلسلہ دراز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کا مقصد اپنے قائد جنید کی فوج سے بیلمان میں ملنا تھا اس لیے اس نے یقیناً مقامی افواج سے صرف اسی حد تک جنگ کی ہوگی کہ واپسی کا راستہ مسدود نہ ہو۔ اس صورت حال کو ہندوستانی مورخین نے ناگ بھٹ کی عربوں پر فتح یابی کا گمان کر لیا۔[2] لیکن حقیقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بقول بلاذری جبیب نے اجین میں مقامی افواج کو شکست دیکر بھاری نقصان پہونچایا۔ اور وہاں سے قریب کے ایک دوسرے علاقہ ہریہ جا پہنچا۔ یہاں بھی دشمن بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے بعد اطراف کے دوسرے علاقے جن میں چتوڑ بھی شامل ہے سر کرتا ہوا بیلمان روانہ ہو گیا۔ چتوڑ پر ان دنوں موریہ خاندان کا راجہ دھانیکا برسر اقتدار تھا۔ اسے جبیب کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔[3] مالوہ کی ریاست میں بعض اور جگہوں پر بھی مقامی افواج سے جنگ کی نوبت آئی۔ مگر سب میں عرب افواج کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بالآخر جبیب اپنی مہم کو پایہ تکمیل تک پہونچا کر بیلمان میں

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۴۴-۴۴۵ [2] ایچ۔ سی۔ رے: ڈائناسٹک ہسٹری، ج ۱ ص ۹ فوٹ نوٹ۔ [3] صحیح مقام کی نشاندہی نہیں ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے مالوہ کی ریاست میں "دھار" کا علاقہ ہو۔ [4] آر۔ سی۔ مجمدار۔ دی عرب انویژن آف انڈیا، ص ۴۱۔

[5] ایچ سی۔ رے: ڈائناسٹک ہسٹری آف انڈیا، ج ص ۱۱۵۴۔

جنید سے مل گیا۔ اس کے بعد ہند کے علاقوں میں مزید کارروائی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ اور جنید کی قیادت میں اسلامی فوج سندھ واپس ہو گئی۔[1] مسلم افواج کی ان غیر معمولی فتوحات کی تصدیق نوساری علاقہ کے ایک کتبہ نوشتہ ۷۳۹ء سے بھی ہوتی ہے جو دکھنی گجرات کے چالوکیا خانوادے کے راجا پولکیسن جناسرے کے عہد کا ہے[2] اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ آر۔ سی۔ مجمدار بھی اسی خیال کے موید ہیں کہ یہ فتوحات جنید اور اس کے ماتحت افسر حبیب کے ہاتھوں انجام پائیں۔[3]

گجرات اور راجستھان کے بعد سندھ کی اسلامی مملکت کی سرحد ہندوستان کے عظیم الشان پرایتہار خاندان کی قدیم ریاست قنوج سے ملتی تھی۔ اسی کو بلاذری نے "بلاد الجزر" کا نام دیا ہے۔[4] یہ ایک طاقت ور اور وسیع و عریض مملکت تھی۔ جس میں مشرق کی سمت موجودہ یوپی اور وسطی ہندوستان اور مغرب میں راجستھان کے شمالی مغربی علاقے کے ساتھ ساتھ اس کے حدود پنجاب میں کرنال تک پھیلے ہوئے تھے۔[5] شمال میں اس کی سرحد تبت[6] اور کشمیر سے ملتی تھی۔

---

[1] الیعقوبی۔ تاریخ، ج ۲، ص ۳۱۱-۳۱۶؛ بلاذری: فتوح، ص ۴۴۴ [2] آر۔ سی۔ مجمدار ذی عرب انویزن، ص ۱۴ [3] ایضاً۔ ص ۱۴ [4] بلاذری: فتوح البلدان ص ۴۴۴

[5] قنوج ایک بڑی سلطنت تھی جس کو جُرز کہا جاتا ہے۔ اس میں پرایتہار خاندان کی حکومت پنجاب میں کرنال ضلع تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھئے دی۔ ایج آف امپیریل کنوج: مجمدار اور دوسرے، ص ۱۰، ۱۲۔ [6] تبت سے مراد قدیم بھوٹا ریاست ہے۔ دیکھئے ص ۲۲۔

مشہور مستشرق ایلیٹ اور ڈاؤسن "بلاد الجزر" کو سوراشٹر کاٹھیاواڑ یا گجرات کے کسی علاقہ سے متعلق سمجھتے ہیں۔ لیکن رینو نے قنوج ہی بتایا ہے۔[۱] تاریخی شواہد بھی قنوج ہی کو بلاد الجزر ماننے کے حق میں ہیں۔ اب تک سب مورخین اور مستشرقین "جرز" کا تلفظ جیم کے پیش اور را کو جزم کے ساتھ کرتے آئے ہیں ان کی رائے میں جُرز گُرجرا کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو گجرات کے گرجرا خانوادوں کے لیے بھی عربی میں جرز کا لفظ استعمال ہونا چاہئے تھا۔ جو نہیں ہوا ہے۔ میرے نزدیک یہ لفظ جُرز" کے بجائے "جَرَز" ہے جس کے معنی عربی میں خشک اور غیر آباد علاقہ کے ہیں۔

بلاذری کی روایت سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنید گجرات کی فتوحات کے بعد سندھ واپس آگیا تھا۔[۲] گمان غالب ہے کہ وہ ملتان ہی واپس آیا ہوگا۔ کیونکہ ان دنوں یہی شہر صوبہ سندھ کا پایہ تخت تھا۔ وہاں سے وہ جنگی تیاریوں کے بعد بلاد الجرز" کی طرف بڑھا ہوگا۔ اگر یہ علاقہ گجرات یا کاٹھیاوار میں ہوتا تو جنید کو سندھ واپس آکر دوبارہ مہم شروع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس علاقہ کو سر کرنے کے بعد جب وہ آگے بڑھتا ہے تو ایک ایسی ریاست سامنے آتی ہے جس کے حکمراں کو "ملک الصین" یعنی بادشاہ چین کے نام سے یاد کرتا ہے۔[۳] اس بحث سے قطع نظر کہ وہ چین کا بادشاہ تھا یا نہیں، ہم اس نتیجہ پر ضرور پہنچتے ہیں کہ اس ریاست کا

---

[۱] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن:۔ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورینس، ص ۳۵۸

[۲] بلاذری:۔ فتوح البلدان، ص ۴۴۲۔ [۳] ایضاً۔ ص ۴۴۴۔

تعلق کسی کیسی شکل میں چین کی حکومت سے ضرور تھا۔ خواہ وہ ریاست باجگذار رہی ہو یا براہ راست چین کی قلمرو میں شامل ہو۔ کیونکہ یعقوبی کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنید کی گورنری میں چین کا ایک علاقہ شامل تھا[1]۔ اس لیے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ یہ علاقہ دراصل راجستھان کا شمال مغربی علاقہ تھا۔ جس میں جنوبی پنجاب کے کچھ حصے بھی شامل تھے یہی وہ علاقہ ہے جو کم بارش والا خشک اور قدیم زمانے میں بیشتر غیر آبادی والا علاقہ رہا ہوگا۔ اس لیے بلاذری نے اسے بلاد الجزز" کا نام دیا ہے۔ یعنی غیر مزروعہ بنجر علاقہ، تیسری اہم بات اس علاقہ کو قنوج کا ہی علاقہ تصور کرنے میں یہ نظر آتا ہے کہ محمد بن قاسم نے یہاں کے راجا کو اسلام کی دعوت دی تھی جس کو اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اور جواباً اپنی بے پناہ فوجی طاقت کی دھمکی بھی دی تھی اس لیے یقیناً قنوج کی ریاست سے سندھ کی ملحقہ سرحد کو خطرہ پیش ہو سکتا تھا[2]۔ سندھ اور راجستھان کے کچھ شکست خوردہ راجے بھی قنوج کی طرف بھاگ گئے تھے۔ جو اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس ریاست کی مدد سے سندھ پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جنید کے لیے قنوج کے سرحدی ناکہ پر بھی پیش قدمی ضروری معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لئے ہم جنید کو قنوج سے ملی سرحد کو استوار کرنے کی خاطر بلاد الجزز پر بڑھتے ہوئے پاتے ہیں۔ بلاذری نے اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں لکھی ہے۔ لیکن اس روایت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سرحد سے ملحقہ

---

[1] الیعقوبی۔ تاریخ، جلد ۲، ص ۳۱۵۔ تفصیل کے لیے آگے دیکھئے ص ۲۲۔

[2] علی بن حامد کوفی۔ چچ نامہ، ص ۱۳ تا ۲۵، قلمی بانکی پور لائبریری، نمبر ۵۹۰۔

قنوج کے کچھ علاقے مفتوح ہوئے۔ گو اندرونی ریاست میں دور تک پیش قدمی نہیں ہوئی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قنوج کی ریاست نے اس کے خلاف جوابی کارروائی نہیں کی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی طرف سے بھی کسی جوابی حملہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں کسی قطعی رائے کا اظہار مشکل ہے۔ مقامی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں قنوج کی سلطنت پر یسوورمن نامی راجا حکمراں تھا[۱]۔ اور جنید کی پیش قدمی سے قبل ہی یہ راجا کشمیر کے راجا للتادت مکتاپید[۲]۔ اور دکھنی چالوکیا راجا ونے دت پولکیسن (۶۹۵ء)[۳] سے شکست کھا چکا تھا۔ اور فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ممکن ہے اسی کمزوری نے اسے عربوں سے جنگ کا خطرہ مول لینے سے روک دیا ہو۔ اور خاموشی میں ہی عافیت سمجھی ہو۔ لیکن آئندہ خطرہ کے پیش نظر اس نے غالباً چین سے مدد بھی چاہی تھی۔ چنانچہ اس کا سفیر ۷۳۱ء[۴] میں چین گیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ جنید نے بھی اس ریاست کی کمزوریوں کا اندازہ کر کے شدید پیش قدمی کی ضرورت نہ سمجھی ہو اور صرف سرحد کی حفاظت کے انتظام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ اب فوجی نقطۂ نظر سے صرف ایک ہی علاقہ بچ رہا تھا۔ جس کی ناکہ بندی ضروری تھی۔ یہ وہ پہاڑی خطہ تھا جہاں کشمیر، تبت[۵]، قنوج اور سندھ کی سرحدیں

---

[۱] دسرتھ شرما۔ ارلی چوہان ڈائناسٹی، ص ۲۸۲ [۲] کے۔ ایم۔ پانیکر: تاریخ ہند قدیم مترجمہ اردو، ص ۷۵، مکتبہ جامعہ، ۱۹۲۴ء دہلی ۱۹۷۰ء، کلہنی: راج ترنگنی، ص ۱۲۹، [۳] دیدیا: میڈیاول ہندو انڈیا، ص ۳۳۶۔ جلد ۱، [۴] ایچ۔ سی۔ رے، ڈائناسٹک ہسٹری آف انڈیا، ج ۱، ص ۲۷۷۔ اس۔ سی۔ رے۔ ارلی ہسٹری اینڈ کلچر آف کاشمیر، ص ۴۲، دہلی ۱۹۶۹ء طبع دوم، [۵] الیعقوبی، تاریخ ج ۲، ص ۳۱۵ تبت ان دنوں بھوٹا خاندان کی ریاست تھی اسکی سرحد نسان سے لیکر سالٹ رینج تک پھیلی ہوئی تھی۔

ملتی تھیں جنگی اعتبار سے اس علاقہ کا جغرافیائی محل وقوع بڑا اہم تھا۔ سالٹ رینج کے پہاڑی سلسلے نے کاشمیر کی طرف سے حملہ ناممکن بنا دیا تھا۔ دریائے ستلج نے قنوج کی طرف سے خطرات کو کم کر دیا تھا۔ اب صرف تبت ہی کے راستہ حملہ کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جنید نے اس اہم جنگی محاذ پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے پیش قدمی کی۔ یہی وہ ناکہ تھا جہاں سے چین کی افواج بھی سندھ کے حدود میں آسانی کے ساتھ داخل ہو سکتی تھیں۔ اس ریاست کا پہلا سرحدی مورچہ ایک زبردست قلعہ کی شکل میں نظر آیا۔ یعقوبی کی روایت کے مطابق یہاں کا حکمران "بادشاہ چین" تھا[۴]۔

ابو ظفر صاحب ندوی کے خیال میں یہ علاقہ چینیوں اور چینی تجار سے بھرا ہوا تھا اسلئے اس ریاست کے حکمراں کو عرب مورخ نے "ملک الصین" کے نام سے یاد کیا ہے[۵]۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہیون سنگ، بادشاہ چین (۷۰۵ ۔ ۷۱۳ء) کی بالادستی ان دنوں تبت اور کاشمیر دونوں پر تھی[۶]۔ مگر تاریخی شواہد کی روشنی میں ایک دوسرا نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تبت ان دنوں بھوٹا خاندان کی ایک بڑی سلطنت تھی جسکی سرحد نیپال کی شمولیت کے ساتھ ہند کے بعض شمالی سرحدی علاقوں کو بھی شامل تھی لیکن اس پر چین کی بالادستی تھی۔ اس بالادستی کو ختم کرنے کے لیے بھوٹا خاندان کے راجے جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ٹانگ خاندان کے بادشاہ ہیون سنگ کے زمانہ ہی میں ایک زبردست بغاوت ہوئی۔ جس کو چینی ولیعہد نے قوت سے دبا دیا۔

۴۔ یعقوبی ج ۲ ص ۳۱۵

۵۔ ابو ظفر ندوی: تاریخ سندھ، ص ۱۳۳

۶۔ وی۔ اے۔ اسمتھ: آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، ص ۱۹۲؛ ایچ۔ سی۔ رے: ڈائنا سٹک ہسٹری جلد ۱

مگر کچھ علاقے چین کی دسترس سے نکل بھی گئے۔[1] اس سلسلے میں غالباً کاشمیر کے راجا للتادت سے مدد بھی لی گئی تھی۔ جس نے تبتیوں سے جنگ کی تھی۔[2] ممکن ہے جنید کے حملہ کے وقت اس سرحدی ریاست پر ولی عہد چین خود یا کوئی دوسرا چینی شہزادہ حکومت کر رہا ہو۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی کاشمیر سے ملی ہوئی پنجاب کے شمال مشرق میں ایک ریاست "چینا بھوتی" کا ذکر کیا ہے جہاں کبھی چینی شہزادے رہا کرتے تھے۔[3]

دوسری صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ تبت کا ہی کوئی راجا یا رئیس جو چینی حکومت کا باجگذار یا آزاد ہو، اس سرحدی ریاست پر حکمرانی کر رہا ہو۔ روسی مورخ بارتھولڈ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقہ میں بڑے بڑے کاشتکار اور تجار بھی اپنا اپنا حلقہ رکھتے تھے۔ اور ان کی آراضی گویا ایک چھوٹی سی ریاست ہوتی تھی۔ وہ اپنی فوج بھی رکھتے تھے۔ ان ان رئیسوں کو شہزادوں (ملوک) کا درجہ ملا ہوا تھا۔ عجب نہیں کہ اس تبتی ریاست پر بھی ایسا ہی کوئی شہزادہ حکمران ہوا۔ اور یہ علاقہ چینی حکومت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہو یعقوبی کا یہاں کے حکمران کو "بادشاہ چین" تصور کر لینا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی سندھ کی سرحدی حفاظت کا ایک اہم ناکہ تھا اسلئے جنید نے اسپر فوج کشی کی یہ پہاڑی علاقہ تھا اسکو فتح کرنے کیلئے آگ کا گولہ استعمال کیا گیا جو یہاں کیلئے بالکل نئی چیز تھی اسکی لگائی ہوئی مشکل سے بجھائی جا سکتی تھی۔

---

[1] جیمز کارسن: تاریخ ممالک چین (اردو ترجمہ) جلد ۲، ص ۴۸، نول کشور پریس ۱۸۶۴ء

[2] اس بی۔ ارے ارلی ہسٹری اینڈ کلچر آف کاشمیر، ص ۴۲، دہلی ۱۹۵۰ء [3] سی روی۔ ڈیڈیا: میڈیاول ہندو انڈیا، ج ۱ ص ۳۰۱ [4] ڈبلیو۔ بارتھولڈ: ترکستان ڈاؤن ٹو دی منگول انویژن، ص ۱۸۱ لندن۔ ۱۹۲۸ء۔ طبع دوم

ہندوستان میں یہ جنگی حربہ غالباً پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا، اور بقول بلاذری عربوں کے علاوہ دنیا کی کوئی قوم بھی اس آگ کے بجھانے کا فن نہیں جانتی تھی[۱]، اس جنگ میں یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ جو بھی گولے قلعہ پر پھینکے گئے تھے سب بجھائے جاتے رہے، اس لئے جنید کو شک ہوا کہ قلعہ کے اندر ضرور کچھ عرب باغی مقیم ہیں، جنگ کا سلسلہ جاری رہا، آخر میں صلحنامہ کے ساتھ قلعہ فتح ہو گیا، جب تفتیش کی گئی تو پتہ چلا کہ قلعہ میں دو عرب موجود تھے جو آگ کے بجھانے کا فن جانتے تھے، جنید کے حکم سے ان دونوں کو سزائے موت دی گئی[۲]۔

اس قلعہ کو سر کرنے کے بعد اور کتنی فتوحات ہوئیں، پوری ریاست فتح ہوئی یا نہیں ہوئی اس کی تفصیل نہیں ملتی، بہرحال سندھ کی سرحدی حفاظت کے لئے یہ ایک اہم ناکہ تھا جس پر عربوں کی بالادستی حاصل ہو گئی، مذکورہ بالا فتوحات کے بعد جنید نے اپنی چارسالہ جنگی مہم بند کر کے ان فتوحات کی رپورٹ خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے پاس بھیج دی، اس رپورٹ میں اسیرانِ جنگ کی تعداد ۵۰۰۰۰، اور مالِ غنیمت کا تخمینہ ۸۰۰۰۰۰۰ درہم اور اتنی ہی رقم فوجیوں میں تقسیم کی گئی تھی[۳]۔

اس جگہ ایک اہم تاریخی ضرورت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جس کی طرف مورخین نے توجہ نہیں دی ہے، وہ یہ کہ اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ابتدائی اسلامی عہد کے واقعات کی چھان بین میں عربی تاریخوں سے بھی مدد لی جائے، ان میں اس عہد کا مستند ریکارڈ بیشتر محفوظ ہے، مثال کے طور پر کاشمیر کو لے لیجئے،

---

[۱] بلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۴۸، ۴۴۷، الیعقوبی تاریخ جلد ۲ ص ۱۶، ۳۱۵

[۲] الیعقوبی: تاریخ، جلد ۲، ص ۳۱۵، ۳۱۶،

[۳] " " : " " ص ۳۱۷

کاشمیر کے تاریخی واقعات کا واحد اور قدیم ترین ریکارڈ کلہن کی مشہور نیم تاریخی منظوم کتاب "راج ترنگنی" ہے، کلہن کی روایت کے مطابق ۷۰۰ء سے لیکر ۷۳۶ء تک کارکوٹا خاندان کا ایک مدبر اور جنگجو راجا للتادت مکتا پید کاشمیر پر حکمراں رہا، جب اُس نے فتوحات کی طرف قدم بڑھایا، تو کاشمیر سے جنوب کی طرف قنوج اور بہار کی ریاست کو مغلوب کرتا ہوا دکن تک پہنچ گیا، گجرات کا علاقہ بھی اس نے فتح کیا، اور سندھ کی ریاست سے تعرض کئے بغیر کاشمیر واپس گیا، اُس کے بعد شمال میں افغانستان اور طخارستان کی مہم پر روانہ ہو گیا،[1] اس موقع پر ایک فطری اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے، للتادت ایک مدبر اور عظیم فاتح تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا ہندوستانی راجہ ہے، جس نے بیرونِ ہند بھی اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا، ایسی حالت میں کیا یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے، کہ اس کی موجودگی میں سندھ عربوں کے قبضہ میں چلا جائے، اس راجہ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، ؟ اس طرح عربوں کے لئے بھی یہ اشد ضروری تھا کہ وہ کاشمیر کی طاقت سے بے پروا نہ رہتے، اور اس سرحد کی حفاظت کے لئے خصوصی انتظامات کرتے، ؟ کاشمیر میں ایک بڑی ہندی طاقت کی موجودگی میں ایک دوسری غیر ملکی طاقت کے سندھ میں ورود اور قیام کے بعد بھی دونوں کا ایک دوسرے سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنا، جب کہ سندھ و کاشمیر کی سرحد ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہو، تاریخی اعتبار سے عجوبہ ہی تصور کیا جائے گا، بعض مورخین اور مستشرقین چینی تاریخ کی روشنی میں راج ترنگنی کی روایت کو درست تو مانتے ہیں، مگر للتادت کے عہد کو ۲۵ سال

---

[1] کلہن: راج ترنگنی، تحقیق آر۔ سی۔ پنڈت ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۶۸ء ص ۱۵۴ - ۱۲۰،

اور آگے بڑھا دیتے ہیں، اُن کے خیال میں راجا للتادت نے ۷۲۵ء سے ۷۶۱ء کے لگ بھگ حکومت کی۔[۵۱]

لیکن اسلامی تاریخ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا، جس سے اس دور میں للتادت کا طخارستان اور افغانستان کی طرف جانا ثابت ہوتا ہو، حالانکہ ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کو پوری بالا دستی حاصل ہو چکی تھی، اس کے علاوہ سندھ میں مسلمان اچھی طرح قدم جما چکے تھے، للتادت دکن سے واپسی پر مسلمانوں سے تعرض کئے بغیر کاشمیر کیونکر پہنچ سکتا تھا، اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کی تحقیق میں چینی تاریخ کے ساتھ عربی تاریخ کی کتابوں سے بھی مدد لی جائی،

تاریخ کے گہرے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنید کا شمیر کی طرف سے مطمئن رہتا، او اس سے کوئی تعرض نہ کرنا بے معنی نہیں ہے، جنید کی واپسی کا زمانہ ۷۳۰-۲۹ء کے قریب کا ہے، میرے خیال میں یہ وقت وہ تھا جب للتادت طخارستان کی آخری مہم سر کر رہا تھا یا پھر جنگ میں کام آچکا تھا، کیونکہ اس کے بعد وہ لوٹ کر واپس کاشمیر نہیں آسکا،[۵۲] رہ گیا یہ سوال کہ دکن سے واپسی پر اس نے سندھ کی طرف توجہ کیوں نہیں کی، گمان غالب ہے کہ للتادت ہندوستان کی مہم طے کر کے ۷۱۰ء سے پہلے پہلے کاشمیر پہنچ کر شمال کی مہم پر روانہ ہو چکا تھا، اس وقت عربوں کا وجود سندھ میں تھا ہی نہیں، داہر سے تعرض نہ کرنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے للتادت کی اطاعت قبول کر لی ہوگی یا وہ برہمن خاندان کا راجہ تھا، اور للتادت کی جنگ بیشتر بدھشٹ ریاستوں سے تھی، چچ نامہ

---

۵۱ اسٹین بحوالہ راج ترنگنی تحقیق آر۔ سی۔ پنڈت ص ۱۵۱ (فوٹ نوٹ)

۵۲ کلہن، راج ترنگنی ص ۱۱۵، ۱۲۰، نئی دہلی ۱۹۶۸ء

کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ داہر نے ایک خط میں محمد بن قاسم کو دھمکی دی تھی کہ ہند میں کاشمیر کا راجہ اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر وہ اس کی مدد حاصل کر کے تو عربوں کی ہلاکت و بربادی میں کوئی شک وشبہہ کی گنجایش باقی نہیں رہے گی[۵۱]

اس روایت سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے، اول تو للتادت کے وجود کا علم ہوتا ہے دوسرے اس بات کا کہ داہر للتادت کو اپنے سے بڑا سمجھتا تھا، یہ صورت حال بتاتی ہے کہ دا للتادت کا مطیع تھا، مگر ان دنوں غالباً کاشمیر سے کافی دور شمال کے علاقوں میں مصروف پیکار تھا، للتادت کے بعد کاشمیر کی حکومت کمزور ہوگئی، کیونکہ اس کا بیٹا عیاش نا کارہ تھا، اس کے بعد اس کے بھائی کی حکومت بھی ریشہ دوانیوں کی شکار ہوگئی تھی[۵۲]، ان حالات میں کاشمیر کے حکمرانوں کا عربوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا، اور جلد ہی ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں سے اُن کے تجارتی روابط بھی استوار کلہن کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ للتادت کے لڑکے نے جو خود بھی کاشمیر کا راجا تھا سے ہندی غلاموں کی تجارت شروع کر دی تھی[۵۳]

جنید کی فتوحات نے ہندوستان کے بیشتر شاہی خاندانوں کے سیاسی اقتدار کو کر دیا تھا، اس سے ان شکست خوردہ والیان ریاست اور ان کے خاندان والوں کا غم میں مبتلا ہونا لازمی امر تھا، غیرت کا تقاضا بھی یہی تھا، کہ غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھ شکست کی ذلت کا بدلہ لیا جائے، چنانچہ انھوں نے اپنی کوششیں شروع کر دیں، اسی کچھ نئے خانوادے بھی اُبھرے جنھوں نے شکست خوردہ راجوں کی جگہ حاصل کر لی تھ

---

[۵۱] علی بن حامد کوفی : چچ نامہ ص ۵۴ - الف قلمی نمبر، ۵۹، بانکی پور، پٹنہ،
[۵۲] کلہن : راج ترنگنی، ص ۱۵۴ - ۱۴۹
[۵۳] " : " " " ۱۵۴ -

اندر نیا جوش و ولولہ تھا۔ ادھر جب جنید کی مہم ختم ہوئی تو اُسے خراسان کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا، اور اسکی جگہ تمیم بن زید ۳۰-۷۲۹ء میں سندھ کا حاکم مقرر ہوا، اسکی گرفت انتظامیہ پر اچھی نہیں تھی، وہ اپنے ماتحتوں پر پورا کنٹرول نہیں رکھ سکا، ان میں آپس میں اختلاف پیدا ہوگیا، سندھ کے عوام کا بھی بڑا طبقہ تمیم کے خلاف ہوگیا، تمیم اس پر قابو حاصل نہ کرسکا، اور عراق روانہ ہوگیا، مگر راستہ میں سندھ کے علاقہ میں اس کی موت واقع ہوگئی۔[1]

اس انتشار اور بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر مختلف راجے سندھ کی اسلامی حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئے، اس سلسلے میں اجین کے راجہ ناگ بھٹ اوّل کی کوششیں اغلباً سب سے زیادہ رہی ہوں گی، اجین کو علمی اور مذہبی مرکزیت حاصل تھی، اس علاقہ میں اکالنگا کا مندر دور دور تک مشہور تھا، جیب کے حملوں کے زمانہ میں یہاں کا مذہبی طبقہ بہت زیادہ متاثر ہوا تھا، ملتان کے سورج دیوتا کے مندر کی طرح لوگوں کو خوف ہو چلا تھا کہ اب اکالنگا کا مندر بھی مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔[2] ناگ بھٹ ان عوامی جذبات سے فائدہ اٹھا کر اجین کی شکست کا بدلہ لینے کو تیار ہوگیا، اور بڑھتا ہوا بھڑونچ تک پہونچ گیا، عوام اور شکست خوردہ راجوں سے بے زاری نے ناگ بھٹ کو اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کا موقع فراہم کردیا، چنانچہ اُس نے گجرات کی چالوکیہ ریاست پر قبضہ جمالیا،[3] شمالی گجرات، راجستھان کا بھی کچھ علاقہ اس کے زیرنگیں ہوگیا،[4] ادھر سندھ کی حالت خراب ہورہی تھی، تو سدھارنے کے لئے ہشام کی طرف سے دوسرا گورنر حکم بن

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان ص ۴۴۴-۴۴۵، یعقوبی؛- تاریخ جلد ۲، ص ۲۱۲، ۳۱۲،

[2] اے۔ سی۔ سی۔ اے ڈائناسٹک ہسٹری جلد ۲، ص ۱۱۴۰، [3] ایضاً ص ۱۰۵۷، ڈاکٹر ڈی شرما؛- راجستھان جلد ا ص ۱۲۲، ۱۲۳، [4] ایضاً راجستھان ج ا ص ۱۲۲،

عوانہ کلبی سندھ بھیجا گیا جس وقت وہ سندھ پہنچا یہاں کے سیاسی حالات بہت ہی نازک ہو چکے تھے گمان
غالب ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب ناگ بھٹ کی سیادت میں گجرات راجستھان اور سندھ کے شکست
خوردہ راجے مل کر سندھ کی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہو گئے تھے[1] بلاذری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے
کہ اس وقت سوائے اہل قصّہ (یعنی سوراشٹر) پورا ہندوستان عربوں کے خلاف جنگ آزمائی
کے لئے امنڈ آیا[2] ہندوستان کی مشترکہ افواج مسلمانوں کو دباتی ہوئی سندھ کے حدود میں داخل ہو چکی
تھی، ناگ بھٹ کے اس کارنامہ پر ہندی عوام نے نارائن (خدائی طاقت کا وارث) کے خطاب سے نوازا
تھا[3] عربوں کیلئے یہ صورتِ حال تشویشناک تھی، لشکریوں کے علاوہ جو مسلمان سندھ کے مختلف علاقوں
میں آباد ہو چکے تھے، اُن کی حفاظت کا بھی سوال پیدا ہو گیا تھا، سندھ کے مسلمانوں نے سندھ میں ایک
محفوظ مرکز کے قیام کی تجویز پیش کی، جہاں وہ مطمئن و محفوظ ہو کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں، حکم کو یہ تجویز
پسند آئی، چنانچہ اُس نے دریائے سندھ (مہران) کے مشرقی کنارے ایک مضبوط قلعہ نما شہر کی بنیاد
ڈالی جس کا نام محفوظہ رکھا گیا، اور اسکو عربوں کا مستقل اور مستحکم فوجی ہیڈ کوارٹر بنایا گیا[4] اس کا شمار
ثغر الہند میں ہوا[5] ہندوستان میں عربوں کا بسایا ہوا یہ پہلا شہر تھا۔ جو ۷۳۰ء سے ۷۳۷ء کے
درمیان تعمیر ہوا، بقول ڈاکٹر ممتاز پاکستانی محکمۂ آثار قدیمہ نے اپنی حالیہ تفتیش میں اسکے محل وقوع کا
پتہ چلا لیا ہے، یہ شہر منصورہ کے مخالف سمت دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آباد ہوا تھا[6] حکم بن عوانہ
ایک حوصلہ مند اور باتدبیر افسر تھا، اسنے بڑے زبردست دفاعی انتظامات کئے اور اسکے حملوں نے ہندوستانی
افواج کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور دوبارہ سندھ کی مملکت پر عربوں کا مکمل کنٹرول ہو گیا[7]

---

[1] ڈاکٹر ڈی شرما: راجستھان، جلد ۱ ص ۱۲۱ و ۱۲۰ [2] بلاذری: فتوح ص ۴۴۴
[3] ڈاکٹر ڈی شرما: راجستھان جلد ۱ ص ۱۲۰ - ۲۱ [4] یعقوبی، تاریخ، جلد ۲ ص ۳۱۷
[5] عبدالرؤف عون، الفن العربی فی صدر الاسلام، ص ۲۰۱، [6] ڈاکٹر ممتاز پیریزنٹ ریزلٹس آف المنصورہ اسلامک کلچر جلد ۱۰ ص ۲۶، حیدرآباد ۱۹۵۵ء [7] بلاذری: فتوح ص ۴۴۴

ظفرنامہ اکبری المعروف بتاریخ خاندان تیموریہ مسمّٰی بہ تیمور نامہ

(عہد اکبری کا ایک مصور نسخہ)

از۔ جناب سید مظفر حسین شاہ صاحب علیگ

عہد اکبری کا یہ نادر مصور نسخہ خدا بخش اورینٹل لائبریری (وقف ۱۸۹۱ء) مرادپور میں جولائی ۱۹۰۳ء کے آخری عشرہ میں میری نظر سے گذرا، یہ نسخہ فارسی مخطوطات کے کیٹلاگ مرآۃ العلوم جلد ۷ فہرست کتب اکبری کے تحت شمارہ فارسی ۱۰۷ پر تاریخ خاندان تیموریہ کے نام سے درج ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے بیان کے مطابق اس نسخہ کو خدا بخش خاں متوفی ۱۹۰۸ء نے بادشاہ نامہ کے مصور نسخہ کے ساتھ ساڑھے تین ہزار روپے میں خریدا تھا۔[1]

اول و آخر کے چند اوراق غائب ہو جانے کی بنا پر یہ نسخہ ناقص ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے اصل نام، مصنف کاتب اور سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن خدا بخش خاں نے شاہجہانی تحریر[2] کی روشنی میں اسے تاریخ خاندان تیموریہ کے نام سے درج فہرست کیا ہے، جو کسی طرح اس کتاب کا اصل نام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس نسخہ پر

---

[1] مولوی خدا بخش عظیم آبادی کا کتب خانہ مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۱ء

[2] لوح ثانی نسخہ، ہذا پر شاہجہانی تحریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم این کتاب کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت صاحب قران گیتی ستان و اولاد امجاد آنحضرت وا ایام حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا سال بست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف شدہ حررہ شاہجہان بادشاہ ابن جہانگیر بن اکبر بادشاہ"۔ (کیٹلاگ محبوب اللباب مرتبہ خدا بخش خاں مطبوعہ حیدرآباد دکن ص)

شاہجہانی تحریر کے علاوہ متعدد عرض داشتوں اور تاریخی کتابوں کی روشنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مصور نسخہ دراصل ظفرنامہ کا وہ قیمتی نسخہ ہے جو عہد اکبری ہی کی تصنیف اور شاہی مصوروں کے ہاتھوں مزین ہوا۔ اور آئین اکبری کی ان نو مصور کتابوں میں سے ایک ہے۔ جن کا ذکر آئین ۳۴ مین ابوالفضل نے مصوری کے باب مین کیا ہے۔[۱]

دوسرے آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) کے حاشیہ پر لفظ ظفرنامہ کی تشریح مسٹر مورلے (Morley) کے کیٹلاگ کے حوالے سے "A History of Taimur" درج ہے[۲] جس کا اردو ترجمہ "تاریخ خاندان تیموریہ" ہی ہوتا ہے۔ لہذا اس نسخہ کو ظفرنامہ کے بجائے اس کے ترجمے کو نام ٹھہرانا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ اور اس مقالہ کا مقصد اسی غلطی کی اصلاح ہے۔

میں نے اس کے اصل نام کی وضاحت کے ساتھ نسخہ کے مصنف، کاتب اور سنہ کتابت پر بھی روشنی ڈال کر تشنگی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

محققین کی رائے پر نسخہ تاریخ خاندان تیمور" کا اصل نام۔ خان صاحب عبدالمقتدر کتب خانہ خدابخش کے کیٹلاگ کو ترتیب دیتے وقت اس نسخہ کو "تاریخ خاندان تیموریہ" درج کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ خدابخش خان کے زمانے ہی سے نسخہ کا اندراج اسی نام سے چلا آرہا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار بھی ان الفاظ میں کر دیا کہ جن نو مصور کتابوں کا ذکر آئین اکبری" میں ہے ان میں سب ہی کسی نہ کسی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ سوائے چنگیز نامہ کے یہ نادر نسخہ صرف اسی کتب خانہ میں ہے۔

---

[۱] آئین اکبری (انگریزی) سکنڈ ایڈیشن مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء ص ۱۱۵ [۲] ایضاً

اگر کہیں اور ہوتا تو اس کا پتہ ضرور چلتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبد المقتدر، خدا بخش خان کے درج کردہ نام "تاریخ خاندان تیموریہ" سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور یہی رائے سید نجیب اشرف ندوی کی بھی ہے کہ "ابو الفضل نے جن مصور نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں یہ نسخہ چنگیز نامہ ہی ہے۔"[۱]

تاریخ الفی | لیکن مسٹر بیورج Mr Beverage کے خیال میں اس نسخہ میں "تاریخ الفی" کے بھی ماخذ ہیں۔[۲] اور ڈاکٹر قیام الدین احمد شعبۂ تاریخ پٹنہ" کو شروع سے آخر تک "تاریخ الفی" کی تیسری جلد ہی تصور کرتے ہیں[۳] ڈاکٹر تارا چند، سید احتشام حسین، محبوب اللہ مجیب وغیرہ اس نسخہ کو تیمور نامہ کے نام سے تحریر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی "تیمور نامہ" کی وضاحت نہیں کرتا کہ یہ لفظ اس نے کہاں سے لیا جب کہ کتب خانہ کے کسی کیٹلاگ میں بھی[۴] ۔۔۔ اس نسخے کا نام تیمور نامہ نہیں تحریر ہے۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ "تیمور نامہ" جو تیمور اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ہے اور جو اکبر بادشاہ کے بائیسویں سال تک کے حالات پر مشتمل ہے۔[۵]

۱؎ معارف اعظم گڈھ ج ۱۱ شمارہ ۳ صفحہ ۱۸۳

۲؎ "Notes on Persian Mss in Indian Libraries" R.A.S. Journal 1901 -

۳؎ ایک ذاتی ملاقات۔

۴؎ محبوب اللباب۔ مراۃ العلوم۔ نوادر خدا بخش وغیرہ

۵؎ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر۔ ص ۳۱۲۔

اس کا جو قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے اس میں بہت سارے مصوروں کے نام ملتے ہیں۔[1] ان سب سے الگ سید حسن شیر کی رائے ہے کہ "مؤلف کے نام کا پتہ اس میں کسی عبارت سے کہیں پر نہیں چلتا۔ مگر عنوان کتاب "تاریخ خاندان تیموریہ" مصدقہ ہے۔" لیکن وہ بھی اس دلیل کی کوئی وضاحت نہیں کرتے۔[2]

عبدالمالک آروی، شرف الدین علی یزد کے "ظفر نامہ" کو "تیمور نامہ"[3] اور مسٹر مور لے اسی شرف الدین علی یزد کے "ظفر نامہ" کو "تاریخ خاندان تیموریہ"[4] لکھتے ہیں۔

عبدالمقتدر نے عبداللہ ہاتفی کی مثنوی کو "تیمور نامہ" لکھا ہے[5] اور اسی مثنوی کو نولکشور نے "ظفر نامہ" کے نام سے شائع کیا ہے۔[6]

عہد اکبری کے معتبر نسخے آئین اکبری میں، | آئین اکبری میں ہے کہ فارسی نامہ ہائے نظم ونثر را پیرایہ بستند و مجلس ہائے دل کشا تصویر شد۔ قصۂ حمزہ را دوازدہ دفتر ساختہ رنگ آمیز کردند۔ و استادان سحر پرداز یک ہزار و چہار صد راحیرت افزائے دیدہ وزان گردانید "چنگیز نامہ" و "ظفر نامہ" و این اقبال نامہ و رزم نامہ و راماین و نلدمن و کلیلہ دمنہ و عیار دانش وجز آن بہ پیکرنگاری برآراستند۔"

لفظ آئین اقبال نامہ سے پیدا شدہ غلطیاں، | بلاک مین Blochmann نے اپنے انگریزی ترجمہ میں "این اقبال نامہ" کا ترجمہ This کیا ہے۔[7] اور عبدالمقتدر اور سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنے انگریزی[8] اردو[9] ترجموں میں "این اقبال نامہ"

---

[1] ماہنامہ آج کل اگست ۱۹۵۶ء صہ ۲۶ [2] نوادر خدا بخش صہ ۱۱۳-۱۱۹ [3] مضامین مالک۔ [4] آئین اکبری (انگریزی) صہ ۱۱۵ [5] مرآۃ العلوم جلد اول صہ ۵ [6] فہرست کتب مطبوعہ نولکشور ۱۹۲۹ء [7] آئین اکبری (انگریزی) صہ ۱۱۵ [8] K.K 41-48 [9] D.C. Vol VII [9] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے مطبوعہ معارف اعظم گڈھ۔

کا ترجمہ "اکبر نامہ" کیا ہے جب کہ "آئین اقبال نامہ" سے مراد۔ "آئین اکبری" لینا چاہیے۔ کیونکہ ان کتابوں کا ذکر "آئین اکبری" کے آئین ۳۴ کے باب مصوری میں ہے۔ یہی رائے سرسید کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔ "آئین اکبری در عہد اکبری بہ تصاویر آراستہ بود اما دریں زماں ازاں نشانی نیست"[1]۔ اس تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سرسیدؒ کو جب "آئین اکبری" کا کوئی مصور نسخہ ملا ہی نہیں تو پھر کن بنیادوں پر یہ تحریر کیا کہ "آئین اکبری" بھی مصور ہوئی تھی۔؟ میرے نزدیک یقیناً وہ لفظ "آئین اقبال نامہ" ہی تھا۔ اگرچہ آج کچھ افراد "آئین اکبری" کو "اکبر نامہ" کا ہی ایک جزو تصور کرتے ہیں۔ کیا "آئین اکبری"، "اکبر نامہ" کی تیسری جلد ہو؟ میری رائے میں "آئین اکبری" کو "اکبر نامہ" تصور کرنا بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نوعیت کی کتابیں ہیں ——— جس میں ایک کا تعلق آئین (Acts) سے ہے۔ اور دوسرے کا تاریخ (History) سے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں کا مصنف ابوالفضل ہی ہے۔

"آئین اکبری" ۴۲ جلوس اکبری یعنی ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۸ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن "آئین اکبری" (انگریزی) کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح برار کے بعد ۴۳ جلوس میں اور اضافہ کیا گیا۔ "آئین اکبری" کو اکبر نامہ" کی تیسری جلد کہنے والوں میں سے (مترجم انگریزی "آئین اکبری") ابوالفضل کے حالات میں درج کرتا ہے کہ "اکبر نامہ" کی دوسری جلد ۴۶ جلوس یعنی ۱۰۱۳ھ

---

[1] آئین اکبری (فارسی) مطبوعہ از سرسید احمد خان۔

مطابق ۱۶۰۲ء میں ابوالفضل کے قتل ہونے کی وجہ سے ناتمام رہ گئی۔ اور اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء تک کے بقیہ حالات عنایت اللہ محب علی یا بہ قول الفنسٹن محمد صالح نے مکمل کیے

اب غور کیا جائے کہ جب "اکبر نامہ" کی دوسری جلد ۴۶ جلوس میں ابوالفضل کے قتل کی وجہ سے ناتمام رہ گئی۔ تو پھر ابوالفضل نے تیسری جلد آخر مکمل کیسے کی۔ اور اگر مورخین اب بھی اسے تیسری جلد سے ہی موسوم کریں تو پھر کہنا پڑے گا کہ "آئین اکبری" کا مصنف ابوالفضل نہیں کوئی اور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوالفضل نے "آئین اکبری" پہلے مرتب کی اس کے بعد "اکبر نامہ" لکھنا شروع کیا۔ جو اکبر اعظم کے عہد کی ایک جامع تاریخ ہے۔ مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور اکبری عہد کے باقی ماندہ حالات دوسروں نے مکمل کیے۔

میری رائے میں مورخین نے لفظ "نامہ" سے جو "اکبر نامہ" "ظفر نامہ" "رزم نامہ" "سکندر نامہ" وغیرہ جیسی بیسیوں کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے اور "آئین اکبری" میں درج "چنگیز نامہ" "ظفر نامہ" کے بعد "اقبال نامہ" اور "رزم نامہ" کے اندراج سے "اقبال نامہ" کو بھی تاریخ کی ہی کتاب سمجھ لیا۔ اور جب اسے "تاریخ" سمجھ لیا گیا تو ابوالفضل کی تصانیف میں فن تاریخ سے متعلق ایک کتاب کو "اکبر نامہ" کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اس لیے لفظ "آئین" سے اس کتاب کو بھی "اکبر نامہ" کا ہی جزو سمجھ کر اسے بھی اسی کی تیسری جلد کہنے لگ گئے۔ لیکن یہ ایک ایسی غلطی ہے جو تاریخ پر ستم ہے۔

لفظ "آئین" واضح طور پر "آئین اکبری" ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ابوالفضل خود اس لفظ سے "اکبر نامہ" مراد لیتا تو پھر جملہ اس طرح ہوتا۔ "اقبال نامہ

آئین فقیرۃ لیکن اس کے بجائے۔ آئین اقبال نامہ" درج ہے۔ جس کے معنی واضح طور پر "یہ کتاب" ہوئے۔ اور یہی ترجمہ بلاک مین (Blockmann) نے بھی کیا ہے۔ یعنی .... and this book .... اور سر سید احمد خان کا کہنا بھی یہی ہے۔ ورنہ وہ "آئین اکبری" کا مصور کیا جانا کبھی تسلیم ہی نہیں کرتے۔

"آئین اکبری" میں مذکور مصور نسخوں کی موجودہ ملکیتیں!	(۱) داستان امیر حمزہ :- جس کی بارہ جلدیں ۱۳۷۵ تصاویر کے ساتھ چار سو اوراق پر

مشتمل ہیں۔ ان میں سے تقریباً ایک سو پچاس کا اب تک پتہ چلا ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) وکٹوریہ البرٹ میوزیم ساؤتھ کنگسٹن، لندن۔ (۲) انڈسٹریل میوزیم وائنا۔ (۳) میٹرو پولیٹن میوزیم امریکہ۔ ہندوستان میں اب تک اس کے صرف چھ ورقوں کا پتہ چلا ہے۔ (۴) کلا بھون بنارس۔ دو ورق (۵) اود ھ شیر میوزیم بمبئی دو ورق۔ (۶) بڑودہ میوزیم ایک ورق (۷) سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن ایک ورق

(۲) چنگیز نامہ :- (مصور) اس کا ایک نسخہ پیرس کے میوزیم (Musee Grinzly) میں دوسرا شاہی کتب خانہ طہران میں ہے۔

تعجب ہے کہ عبد المقتدر نے یہ کیسے لکھا کہ "یہ نسخہ کہیں نہیں ہے"!

(۳) ظفر نامہ مصور (اکبری) المعروف بہ "تاریخ خاندان تیموریہ" مسمّٰی بہ "تیمور نامہ" مملوکہ کتب خانہ خدا بخش مراد پور پٹنہ[1]۔

(۴) آئین اکبری :- مصور [آئین اقبال نامہ] اس کا مصور نسخہ

---

[1] موضوع بحث نسخہ۔

امتداد زمانہ سے ضائع ہو گیا یا محققین کی نظروں سے ابتک روپوش ہے۔ سرسید کو جب اس کا مصور نسخہ نہ مل سکا تو انھوں نے دہلی کے ایک مصور سے "آئین اکبری" مطبوعہ نسخہ کے لیے عہد اکبری کی یادگاروں کو مزین کرایا جو آج انگریزی ترجمہ بلاک مین (Block man) میں بھی نظر آتا ہے۔

(۵) رزم نامہ (مصور) ملوکہ پوتھی خانہ جے پور[1] (۶) "راماین" مصور ملوکہ میٹرو پولین میوزیم واشنگٹن، امریکہ[2] (۷) "نلدمن" مصور ملوکہ وکٹوریہ میموریل[3] کلکتہ [نواب مرشد آباد سکشن میں ہے۔] (۸) کلیلہ و دمنہ مصور ملوکہ برٹش میوزیم لندن

عیار دانش مصور، کل ۱۶۳ تصاویر میں سے ۹۶ تصاویر چیسٹر بیٹی میوزیم لندن[4] اور ۶ ورق دہلی آرٹ نمائش ۴۸ء میں رکھے گئے تھے۔[6]

اس کے علاوہ :- "تاریخ الفی" کا مصور نسخہ، ملوکہ برٹش میوزیم لندن[7] اور دو ورق دہلی آرٹ نمائش ۴۸ء میں موجود تھے۔[8]

اور ان متذکرہ بالا نو نسخوں کے علاوہ "اکبر نامہ" کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

---

۱ سکنڈ ایڈیشن ۳۶ء مطبوعہ دہلی۔ ۲ تمدنی جلوے ص ۱۰۹ III Edition. P Fine art in India by smith ۳ ، ، ص ۱۶۶ ۴ an ceylone ۵ کیٹلاگ وکٹوریہ میموریل [نواب مرشد آباد سیکشن] کلکتہ۔ ۶ تمدنی جلوے ۱۶۷ ۷ ماہنامہ آجکل ۵ اردسمبر ۴۸ء ص ۳۰ Art of Paing in India in ۸ ماہنامہ آجکل ۱۵ دسمبر ۴۸ء ص ۳۰ 16 Th century ey srivastava P 112

اکبر نامہ۔ (مصور)۔ ع ۱۱۷ تصاویر وکٹوریہ البرٹ میوزیم لندن[۵] چند تصاویر چیسٹر بیٹی میوزیم لندن[۶] چند تصاویر بوڈلین لائبریری اکسفارڈ یونیورسٹی[۷] چند تصاویر انڈین میوزیم کلکتہ[۸]

ان نسخوں کی موجودہ ملکیتوں کی تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "عہد اکبری" کے "چنگیز نامہ" اور "تاریخ الفی" دونوں کے مصور نسخے موجود ہیں۔ سوائے "ظفر نامہ" (اکبری) کے اگر عبدالمقتدر کیٹلاگ میں تحریر کر دیتے کہ "ظفر نامہ" کا نسخہ کس کتب خانہ یا عجائب خانہ میں ہے تو یہ مسئلہ ہی کھڑا نہ ہوتا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ صاحبقراں امیر تیمور سے لے کر اکبر اعظم تک تین ظفر نامے علی الترتیب ملتے ہیں۔ جو شاہان تیموریہ کے الگ الگ عہد میں اُن کے حکم سے لکھے اور مصور کئے گئے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کا مصنف و مصور بھی جدا ہے۔ جس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

شاہان تیموریہ کے تین "ظفر نامے"

۱۔ "ظفر نامہ" مرتبہ نظام الدین شامی سنہ تصنیف وفات امیر تیمور ۱۴۰۵ء سے ایک سال قبل یعنی ۱۴۰۴ء یہ نسخہ بحکم شاہ رخ مرزا ابن صاحبقران امیر تیمور ۸۳۱ھ مطابق ۱۴۳۰ء میں مصور گنگ النقوہ المحررین کے ہاتھوں مزین ہوا۔[۹]

---

۵ ہندی جلد ے D. C. vol VII C. T. P 41 - 48 ۶

۷ D. C. vol VII C. K. P. ۸ بزم تیموریہ ص ۳ بحوالہ برٹش میوزیم کیٹلاگ فارسی جلد نمبر شمارہ ۱۱ K. 113 Art of Painting in India in 16th Century ۹

(۲) ظفرنامہ :- مرتبہ شرف الدین علی یزدی متوفی ۸۵۸ھ۔ امیر تیمور کی وفات کے چالیس سال بعد ۸۲۸ھ مطابق ۱۴۲۵ء میں تصنیف کیا گیا۔ اس نسخہ کو بہزاد ہروی نے بہ حکم سلطان حسین مرزا [۱۴۶۸ء۔۱۵۰۶ء] بن منصور بن بایقرا مرزا ۸۹۱ھ مطابق ۱۴۶۷ء میں مصور کیا۔

"بزم تیموریہ" کے مصنف صباح الدین عبدالرحمٰن "اکبرنامہ" جلد اوّل ص ۳۰۶ کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا کتب خانہ اپنے ہمراہ رکھا کرتا تھا۔ اور جنگ کھمبات کے محاصرہ کے وقت بھی تاریخ تیمور کا وہ نسخہ جسے بہزاد ہروی نے مصور کیا تھا، ساتھ تھا۔ جو شاہی خیمہ پر شبخون پڑنے کی وجہ سے جاتا رہا۔ لیکن پھر فوراً واپس مل گیا[۱]۔ اب یہ قیمتی مصور نسخہ مسٹر گیرٹ کی ملکیت ہے[۲]۔ عبدالمالک آروی تحریر کرتے ہیں ———— "تیمور نامہ" کے نقش جو مسٹر گیرٹ کے پاس ہیں۔ اسے سرٹامس ارنلڈ نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس میں بہزاد ہروی نے فن مرقع سازی کو ایک بدیع تمثیل اور قوت سے استوار کیا ہے[۳]۔"

Persian miniature. Pain Ting London 1933 جس کے مصنفین J. V. S. wilKnrane اور L. Bi yon اور B. Grey وغیرہم ہیں۔۔۔ اس کتاب کا نام "ظفرنامہ" درج کرتے ہیں۔ ص ۶۴-۶۱ اور اس کی کچھ تصاویر کو بہزاد ہروی کی بنائی ہوئی کہتے ہیں۔

---

[۱] بزم تیموریہ ص ۳۰ و ص ۳۰۵۔ [۲] ماہنامہ کاروان حالنامہ لاہور ۱۹۳۰ء صفحات ۴۰۔۳۲۔۱۲۴۔ [۳] مضامین مالک آروی

(۳۱) ظفر نامہ (اکبری) :- مرتبہ مرزا قوام الدین جعفر بیگ قزوینی المعروف بہ آصف خان [ثالث] متوفی ۱۰۲۱ھ المتخلص جعفر ـــــ یہ نسخہ بحکم اکبر شاہ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں مرتب ہوا، اور ۹۹۳ھ/۱۵۸۴ء میں مصور کیا گیا، جو آج کتب خانہ خدا بخش کی ملکیت ہے۔

لفظ "ظفر نامہ" کی تشریح | لفظ "ظفر" فتح، نصرت، اور کامرانی، کے معنوں میں آتا ہے۔ انگریزی میں [VICTORY) اور (TRUIMPH) اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں "نامہ" تاریخ کتاب اور خط کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس طرح "ظفر نامہ کے معنی "فتح و نصرت کی تاریخ یا کامرانیوں کی کتاب" ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ "A. Book of pleasure" A Hist-ory of victory," A. History of Truimph. A book of happiress" ہے لیکن مسٹر موزلے (Mr Morley) نے اس کی تشریح۔ A His-Tory of The house of Trausr" کی اور اسی روشنی میں خدا بخش نے زیر بحث نسخہ کا نام "تاریخ خاندان تیمور" رکھدیا۔ جو اس کا نام نہیں۔ بلکہ کتاب کی وضاحت ہے۔

مسٹر موزلے آگے چل کر خود لکھتے ہیں کہ اس کا مصنف شرف الدین علی یزدی متوفی ۸۳۰ھ مطابق ۱۴۲۶ء ہے۔ یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ نسخہ کا نام "تاریخ خاندان تیموریہ" تو رکھ دیا لیکن اسی

"ظفرنامہ" اس لیے نہیں کہتے کہ اس کا مصنف شرف الدین علی یزد۔ [متوفی ۸۴۶ھ] ہے، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ "ظفرنامہ" نام کی کتابیں مثنوی خط وغیرہ صرف شرف الدین علی یزدی نے نہیں، بلکہ بارہ[12]، تیرہ[13]، آدمیون نے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱ "ظفرنامہ"	مولفہ	حکیم بوذرجمہر	برائے نوشیروانِ عادل[1]
۲ "	"	نظام الدین شامی	" صاحبقران امیر تیمور [سنہ ۱۴۰۴ء]
۳ "	"	ملا شرف الدین علی یزد	" خاندان تیموریہ سنہ ۸۲۵ مطابق سنہ ۱۴۲۲ء
۴ "	"	فیضی	" جلال الدین اکبر بادشاہ سنہ ۹۸۱ [۱۵۷۳ء][2]
۵ "	"	آصف خان جعفر بیگی در موقع فتح گجرات	سنہ ۹۸۸ [۱۵۸۰ء][3]
۶ "	"	یوسف علی بن محمد الحسینی الجرجانی	" حیدر مرزا دغلت[4] [صاحب مصنف تاریخ رشید]
۷ "	"	عبداللہ ہاتفی	[بھانجہ ملا عبدالرحمن جامی][5]

سنہ[1] مراۃ العلوم جلد دوم صفحہ ۱۱۲۔ [2] بزم تیموریہ صفحہ ۲ مملوکہ برٹش میوزیم کیٹلاگ فارسی جلد ۱ صفحہ ۱۶۱ [3] یہ نسخہ چھپ چکا ہے۔ اور بہت مشہور ہے۔ [4] معارف جلد ۳ شمارہ ۴ صفحہ ۲۹۵ (مثنوی) [5] زیر بحث نسخہ۔ [6] معارف جلد ۲۳ شمارہ ۶ صفحہ ۴۲۵ (مثنوی) مملوکہ رضا لائبریری رام پور۔ [7] مراۃ العلوم جلد اول صفحہ ۵ نے تیمور نامہ درج کیا ہے۔ مگر نولکشور نے فہرست مطبوعہ سنہ ۱۲۶۰ء میں ظفرنامہ تحریر کیا ہے۔

۸ "ظفرنامہ" مؤلفہ قدسی برائے شاہ جہاں بادشاہ[۱]

۹ " " مرتضیٰ علی قاچار " بحکم شاہ جہاں بادشاہ ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء مقدمہ ظفرنامہ[۲]

۱۰ " " عاقل خان رازی عسکری " اورنگزیب عالمگیر [بعد فتح دکن][۳]

۱۱ " " غلام علی خاں لطیف " بعہد ابوالحسن تاناشاہ دکنی [اردو][۴]

۱۲ تاریخ ظفرہ" " مرتبہ گردھاری لال " در تاریخ شیواجی ۱۱۸۵ھ[۵]

۱۳ "فتح نامہ" " شاہ طاہر دکنی[۶]

۱۴ ضمن "ظفر" ایک اکبری ڈھال[۷]

۱۵ "ظفرنامہ" گرو گوبند سنگھ بنام اورنگزیب مطبوعہ پنج خالصہ

بحوالہ سکھ مسلم اتحاد ص ۱۳۵ احمدیہ مشن

۱۶ ظفر محل بہادر شاہ ظفر نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔

اس نسخہ کے نام میں اختلافات کی تفصیل	(الف) عبداللہ ہاتفی کی مثنوی

کو مراۃ العلوم "کے مصنف نے تیمور نامہ" لکھا ہے اور منشی نولکشور نے "ظفرنامہ" کے نام سے شائع کیا ہے۔

۱؎ مراۃ العلوم جلد اول ص ۱۰۰۔ ۲؎ کیٹلاگ Ivanhoe "مطبوعہ ایشیاٹیک سوسائٹی کلکتہ۔ ۳؎ مراۃ العلوم جلد اول ص ۱۶۱ اور بزم تیموریہ ص ۲۶۸، اس نسخہ کا دوسرا نام اورنگ نامہ بھی ہے۔ ۴؎ معارف جلد ۲۳ شمارہ ۶ ص ۴۲۵ انڈیا آفس کیٹلاگ مملوکہ ۱۰۹ ص ۵۸۔ ۵؎ معارف جلد ۳۰ شمارہ ۳ ص ۱۹۵ ۶؎ مراۃ العلوم جلد دوم ص ۱۳۵ ۷؎ سفرنامہ برنیر (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ص ۵۲۳

(ب) ڈاکٹر تارا چند اور سید احتشام حسین وغیرہ: "تاریخ خاندان تیموریہ" کو "تیمور نامہ" کہتے ہیں۔!

(ج) عبدالمالک آروی، شرف الدین علی یزدی کے "ظفر نامہ" کو "تیمور نامہ" لکھتے ہیں۔

(د) مسٹر مورلے نے، شرف الدین علی یزدی کے "ظفر نامہ" کی تشریح "تاریخ خاندان تیموریہ" کی ہے۔

(ہ) خدا بخش خان نے زیر بحث نسخہ کا نام "تاریخ خاندان تیموریہ" درج کیا ہے۔!

(و) عبدالمقتدر، سید نجیب اشرف، مسٹر بیورج اور ڈاکٹر کلیم الدین احمد "تاریخ خاندان تیموریہ" کے عنوان سے اتفاق ہی نہیں کرتے۔

(ز) میرے نزدیک یہ تمام اختلافات فضول ہیں، یہ نسخہ در اصل "ظفر نامہ" [اکبری] ہی ہے جس کا ذکر "آئین اکبری" میں مصور کتابوں کے ضمن میں آیا ہے۔ اور جب "آئین اکبری" نے یہی نام لکھا ہے تو دوسرا نام دینا غلط ہوگا

لوح اوّل کی ایک تحریر | اس نسخہ پر عہد مغلیہ کے اشخاص کی مختلف تحریریں اور یادداشتیں درج ہیں۔ ایک تحریر لوح اول پر اس طرح درج ہے۔

"بتاریخ ۲۶ جمادی الثانی سنہ ۴۲ جلوس، شرف از اخبر فیض این گذشت و بہ عرض مقدس رسید کہ داخل جمع "ظفر نامہ" شد بہ قیمت ہشت ہزار روپیہ"

اس نسخہ پر کہیں بھی لفظ "تاریخ خاندان تیموریہ" درج نہیں ہے۔ البتہ شاہ جہاں کے قلم کی یہ تحریر مرقوم ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"این کتاب کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت صاحبقران گیتی ستان و اولاد امجاد آنحضرت و سوانح ایام حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا سال بست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف شدہ"

حررہ شاہ جہاں بادشاہ بن جہانگیر بن اکبر بادشاہ

اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب تیمور اور اس کے خاندان کی سنہ ۲۲ جلوس اکبری تک کے واقعات پر مشتمل ہے[1]۔ اس روشنی میں نسخہ کا نام جو "تاریخ خاندان تیموریہ" رکھ دینا درست نہیں۔

رہا سوال "بر مجمل احوال" تو اس کی وضاحت مقدمہ کے اس جملے سے ہی ہو جاتی ہے۔ "بموجب حکم جہاں مطاع مسعود اوراق این جزو شرح احوال کہ مقصود بالذات فن تاریخ است می نویسد[1] احوال میں تو تاریخ سے متعلق لیکن مرتب بادشاہ کے حکم سے چیدہ چیدہ واقعات کسی خاص مقصد کے تحت درج کر رہا ہے۔

اور مقدمہ کی عبارت "وصاحب" ظفرنامہ" کہ فی الواقع رشک

---

[1] پہلا موجودہ صفحہ زیر بحث نسخہ شروع کے، ورق پر صرف تصاویر ہیں اس کے بعد لفظ بموجب حکم سے موجودہ نسخہ شروع ہوتا ہے۔

رشک بر دن الائق است چوں احوال حضرت صاحبقران را علٰحدہ کتابی کردہ بہ قدر مقدور در پاکیزگی عبارت کوشیدہ[1]" ثابت کر رہی ہے۔ کہ مرتب کے سامنے شرف الدین علی یزد کا "ظفر نامہ" موجود ہے۔ لیکن کسی مقصد کے تحت اس کی تفصیلی شرح کرنے سے مانع ہے۔

"تعبیراؤ در شرح احوال بایں عبارت کوتاہ محتاج عذر خواہی بسیار است"

وہ مقصد کیا تھا | تیموری خاندان کی فتوحات اور عظمت کو نمایاں کر کے دنیا کو یہ بتانا کہ مغلیہ خاندان اپنے آبا و اجداد کے زمانے سے ہی فاتح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے کارنامے ایسے ہیں۔ جنھیں مثالاً پیش کیا جائے۔

اس لیے اکبر کے حکم سے جہاں "رزم نامہ" [مہابھارت] مصور کیا گیا وہیں "ظفر نامہ" کو مصور کرانا بھی سیاسی نقطۂ نگاہ سے اہمیت رکھتا ہو۔ اگر اہل ہند کے پاس اپنے پرکھوں کی داستانِ عظمت "رزم نامہ" کی شکل میں موجود ہے تو تیموری خاندان اور خود اکبری بھی، اپنی فتح و نصرت کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اور اسے مصور کرانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ اگر کوئی تحریری طور پر اس سے استفادہ نہ کر سکے۔ تو وہ تصاویر سے ہی مقصد تصنیف سمجھ لے کیونکہ مصوری وہ واحد زبان ہے جو ہر چیز کی ترجمانی کرتی ہے۔ چنانچہ آج چار سو برس گذر جانے کے باوجود اس کی تصاویر عبارتوں کو پڑھے بغیر اور اس کا عنوان A History of Triumph an victory فتح و نصرت کی مرقع کشی کر رہے ہیں۔ جو اکبر اور تیموری خاندان کو حاصل تھا۔ اور جس میں اکبر ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔

---

[1] تحریر بر صفحہ اول زیر بحث نسخہ

اب میں بلا کسی شک و شبہ کے اس نسخہ کو "ظفر نامہ" قرار دے کر لفظ "اکبری" سے ملحق کرتا ہوں تاکہ "ظفر نامہ" تیموری، سلطان حسین مرزائی اور ظفر نامہ اکبری میں امتیاز قائم رہے۔ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں مصوری کے باب میں جس کا ذکر کیا ہے۔ بلا شبہ یہ وہی مصدقہ نسخہ ہے جس کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں۔ اس کے اجزا اگر کہیں ہیں تو اس کے غائب شدہ اوراق ہی ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ خود لوح کی یہ تحریر "بعرض رسید کہ جمع "ظفر نامہ" شد بہ قیمت ہشت ہزار روپیہ" اس نام کی وضاحت کرتی ہے۔

خانوادۂ بیدل عظیم آبادی

از

جناب احسن الظفر صاحب سرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

ہندوستان کے مشہور فارسی گو شاعر مرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ) کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یہ بھی اُن کی جائے پیدایش کی طرح نہایت دلچسپ ور مختلف فیہ بحث ہے۔ تذکرہ نویسوں کے علاوہ بیدل پر لکھنے والے ماضی قریب کے مصنفین نے بھی مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے، اس مختصر مضمون میں ایک قریب بہ یقین نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اُسے نقش آخر نہیں کہا جا سکتا،

بیدل کے والد کا نام مرزا عبد الخالق تھا، مرزا عبد الخالق کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی سپاہی تھے، مگر جلد ہی اس پیشے سے دست بردار ہو کر تصوف کے کوچے میں آ گئے، اور مولانا کمال فاروقی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر سلوک کے منازل طے کرنے لگے،

تذکرہ نویسوں نے بیدل کے خاندان کے متعلق چار قول نقل کئے ہیں:- ارلاس[1]

برلاس[2]، ارلات[3]، ارلامی[4]، اور ایک پانچواں قول مغربی مصنف جان ریکا (Jan Rypka) نے

[1] مرآۃ الخیال لودی، ید بیضا آزاد، سفینہ خوشگو، نتائج الافکار قدرت، [2] تذکرۃ الشعراء عبد النبی فخازی [3] مخزن الغرائب علی قلی خان، نشترِ عشق [4] سفینہ مسرت درگا داس، خلاصۃ الکلام ابراہیم خان خلیل، صحف ابراہیم خان خلیل، صحف ابراہیم خاں، [5] مجمع النفائس خانِ آرزو ص ۶۵،

صدرالدین عینی کی کتاب کے حوالے سے ازبک نقل کیا ہے۔[۴۵] ان پانچوں اقوال میں کون زیادہ صحیح ہے خاکسار نے اپنے قیام پٹنہ کے دوران میں اس سلسلے میں پروفیسر حسن عسکری سابق صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کی طرف جو تاریخی موشگافی کے لئے مشہور ہیں، رجوع کیا، انھوں نے صرف اس قدر جواب دیا:-

"ارلاس زیادہ صحیح ہے، جاپان میں اس قبیلے پر ایک مقالہ لکھا گیا ہے"

پروفیسر عسکری کی وسعتِ معلومات خصوصاً تاریخ پر گہری نظر کی بنا پر اُن کے قول پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، مگر اُن کا مختصر جواب تحقیق کے طالب علم کی پیاس نہیں بجھاتا، یہ بات اس وقت اور زیادہ اہم ہو جاتی ہے، جب اُن کے مقابلہ پر کچھ وزنی رائے بھی موجود ہے،

پروفیسر غلام حسن مجددی (کابل یونیورسٹی) نے اپنی کتاب "بیدل شناسی" میں جس انداز سے محاکمہ کیا ہے اس سے بات بڑی حد تک مستند ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"زیادہ قابلِ اعتماد مرأت الخیال کے مصنف شیر خاں لودی کا قول ہے، لودی نے اپنے تذکرے میں بیدل کا حال لکھنے کے بعد نظر ثانی کے لئے بیدل کو دیا، اس طرح اُس نے اپنی تحریر کو بیدل کی نظر سے گذار کر سندِ پسند کی مہر لگا دی، مرأۃ الخیال میں اُس نے بیدل کے قبیلے کا نام "ارلاس" لکھا ہے، ارلاس مغلوں کی ایک شاخ کا نام ہے، لہٰذا قبیلہ ارلاس کی شہرت اگرچہ بہت کم ہے، مگر یہی قبیلہ ہے جس سے بیدل کا تعلق تھا۔"[۴۶]

---

[۴۵] جان ریکا نے اپنی کتاب (History of Iranian Literature) میں ایک تاجک فاضل ادیب و شاعر صدرالدین عینی کے حوالے سے جنھوں نے بیدل پر ایک کتاب لکھی ہے "بیدل اور بیدلیات" کے زیر عنوان لکھا ہے: His Family was of Usbek Descent

[۴۶] بیدل شناسی غلام حسن مجددی ج ۱ ص ۲

پروفیسر مجددی کا استدلال بلاشبہہ قوی ہے، مگر فارسی کی تمام اہم فرہنگوں اور انسائیکلوپیڈیا کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ارلاس "عقل خلک عطار" کا نام ہے[1]، یہ نام کسی قبیلے کے نام سے مناسبت نہیں رکھتا اور نہ کسی قبیلے کے نام کی حیثیت سے کسی فرہنگ میں اس کا ذکر آیا ہے، ہرچند کہ ارلات، ارلاس، برلاس اور ادلال چاروں قول کے ناقلین نے اسے چغتائی تورانی الاصل کی ایک شاخ قرار دیا ہے، اور خوشگو کی تصریح کے مطابق بیدل کا تعلق مغلوں کی چار شاخوں میں سے "ارلاس" سے تھا[2]، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ لفظ "ارلاس"، جیسا کہ پروفیسر مجددی نے ثابت کیا ہے، اگر قابل ترجیح ہے تو پھر لغت کی کتابوں اور مآخذ میں کسی قوم کے نام کی حیثیت سے اس کا ذکر کیوں نہیں آتا، خصوصاً جب کہ سراج الدین علی خاں آرزو جیسے لغت داں شاعر وادیب تمام تذکرہ نویسوں سے جدا "اولاس" ضبط کرتے ہیں، تو بات اور پیچیدہ ہو جاتی ہے، شیرخاں لودی اور بندرابن داس خوشگو دونوں کے بیانات ایک سے ہیں، اس لئے یہ قول اس لحاظ سے مضبوط ہے، کہ دونوں بیدل کے معاصر اور دوست یا شاگرد رہے ہیں، مگر خاں آرزو کو بھی دو دفعہ مرزا کی صحبت حاصل ہوئی ہے، ان کا بیان دونوں سے الگ ہے،

"برلاس" کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرد دلاور وبہادر و پاک نژاد کو کہتے ہیں"[3]، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ قبیلے کا نام ہوسکتا ہے، جو بہادری، دلیری اور بے جگری کی خصوصیات کا حامل رہا ہو، ایک ترکی لغت میں لکھا ہے:

"برلاس بفتح با وسکون رائے مہملہ وفتحہ لام بالف وسکون سین قوم چغتائی جوان شجاع"[4]

---

[1] فرہنگ نفیسی، ناظم الاطباج ۱، ص ۱۸۰ [2] سفینۂ خوشگو ص ۱۰۳ [3] فرہنگ نفیسی ناظم الاطباج ۱، ص ۵۰۳

[4] لغت ترکی، محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، ص ۱۱۶، اس لغت کا سرورق غائب ہے، مگر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ترکی بفارسی لغت ہے،

اس کے مقابلے میں "ارلاس" کافی تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا، اس سے پروفیسر عسکری کے بیان کی تائید ہوتی ہے،

اس قول کے راوی صاحب مخزن الغرائب علی قلی خاں اور صاحب نشتر عشق حسین قلی خاں ہیں، مگر ان سے بیدل کی ملاقات نہیں ہوئی ہے، اس لئے ان کے قول پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا مگر جب ہم چہار عنصر کے ساتھ بہار کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ قول زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے،

چہار عنصر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی نسل میں کئی پشت سے سپہ گری چلی آرہی تھی، ان کے والد مرزا عبدالخالق سپاہی تھے، چچا مرزا قلندر جنھوں نے باپ کے انتقال کے بعد بیدل کی کفالت اپنے ذمہ لی چند فوجیوں کے سرخیل تھے، مرزا قلندر کے ایک رشتہ دار مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج میں اچھے منصب پر فائز تھے، خود بیدل تین برس مرزا عبداللطیف کے ساتھ آبائی پیشہ سے وابستہ رہے، تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن قوموں نے وقتاً فوقتاً ہندوستان پر حملہ کیا، اور بعد میں یہیں بس گئیں، انہی میں سے کسی ایک سے بیدل کے آباء واجداد کا تعلق تھا،

دوسری جانب عہد مغل کی تاریخ کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "برلاس" قبیلے کے کئی تعلقدار اور جاگیردار یا صوبیدار صوبہ بہار میں تھے، مثلاً محمود خاں برلاس یہ اورنگ زیب کے عہد میں صوبہ بہار کے چین پور علاقے کا جاگیردار تھا، (۱۰۷۰ھ تا ۱۰۷۸ھ)[۵۱] دوسرا سلطان جنید برلاس کا نام آتا ہے، یہ بابر کے عہد میں کڑہ مانک پور (بہار) کا حاکم تھا[۵۲] اسی طرح ایک نام "محمد قلی خاں برلاس"[۵۳] کا آتا ہے، یہ اکبر کی طرف سے

---

[۵۱] تاریخ محمدہ تالیف ص ۶۵ - ۴۶ - ۳۰ [۵۲] ایضاً ۱۷۷ [۵۳] ایضاً ،

بہار کا صوبیدار مقرر ہوا تھا، ان ناموں سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ بہار میں اس خاندان کے لوگ رہتے تھے، اور ان کے اکثر افراد فوجی یا انتظامی امور سے وابستہ رہے ہیں اس لئے کچھ عجب نہیں کہ بیدل کا تعلق اسی خاندان سے ہو،

رہا شیر خاں لودی کا قول تو ہو سکتا ہے بیدل نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی ہو، اور یونہی سرسری طور پر مطالعہ کرکے واپس کردیا ہو،

تیسرا قول درگا داس صاحب سفینۂ عشرت اور علی ابراہیم خاں خلیل صاحب صحف ابراہیم کا ہے یعنی بیدل کے خاندان کا نام "ارلات" تھا، یہ لفظ بھی کہیں فرہنگ میں نہیں ملتا، البتہ پروفیسر غلام حسن مجددی اپنی تالیف میں اس خاندان سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"راجع بطائفہ ارلات می گویند کہ پس از مرگ پدر چنگیز خاں، ماکدش یک نفر کہ منگلک ایذکر" نام داشت ازدواج نمود، پسر دوم منگلک ایذکر ارلات نام داشت"[1]

چوتھا قول خان آرزو کا ہے یعنی بیدل کا تعلق "اولامی" قبیلے سے تھا، اس کا بھی فرہنگ وغیرہ میں کوئی پتہ نہیں ملتا ہے،

پانچواں قول صدرالدین عینی کا ہے یعنی بیدل ازبک خاندان سے تعلق رکھتے تھے صدرالدین عینی روس میں سب سے پہلے بیدل پر توجہ کرنے والے تاجکستانی ادیب ہیں، انھوں نے بیدل کے ایک کتاب اور کچھ مضامین بھی لکھے ہیں، یہ کتاب پٹنہ میں ڈاکٹر سید حسن صاحب کے پاس ہے، خواجہ عینی کے صاحبزادے نے دہلی میں کسی تقریب کے موقع پر ان کو دی تھی، افسوس ہے کہ یہ کتاب روسی زبان میں تھی، اس سے براہ راست استفادے کی شکل نہ نکل سکی، جانے کیا Badil and Dedilism Janrxpha کے زیر عنوان بیدل پر لکھی

---

[1] بیدل شناسی ج ۱ ص ۲۔

جانے والی تمام کتابوں کا سروے کیا ہے، مگر اپنی معلومات کی بنیاد خواجہ عینی ہی کی کتاب کو قرار دیا ہے، اور اسی کتاب کے حوالے سے آگے چل کر لکھا ہے،

His mother Tongue was Apparently bengali } یعنی ان کی مادری زبان بظاہر بنگالی تھی"[۱]

حالانکہ کسی تذکرہ نگار نے حتیٰ کہ خود بیدل نے اپنی مادری زبان بنگالی نہیں لکھی ہے، بلکہ یہ مسئلہ بھی طے نہیں ہو سکا ہے، کہ بیدل اردو بھی جانتے تھے، یا نہیں، ان کی طرف کچھ اردو اشعار ضرور منسوب ہیں نکات میر کے حوالہ سے وہ بیدل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں، مگر دوسرے محققین نے اس سے انکار کیا ہے، انشاء اللہ بیدل کا کلام ریختہ کے عنوان سے ایک مستقل مضمون سپرد قلم کروں گا، یہاں اس کی تفصیلی بحث کا موقع نہیں،

پتہ نہیں خواجہ عینی کے پیش نظر کیا ماخذ رہے ہیں، مگر اس قدر واضح ہے کہ وہ بعض جگہ غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں، انہی میں سے ایک یہ بھی ہے،

بہرحال ان پانچوں میں سے جو قول بھی صحیح ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ترک کی مختلف شاخوں کے نام ہیں، اس کے متعلق نا ظم الاطبا نے بڑی معلومات افزا تفصیل لکھی ہے جس کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

ترکان مدت مدیدی در ترکستان و در اراضی واقع در شمال سکنا داشتند و مختلط بودند، با تر و تاتار، و در مایہ ششم مسیحی کہ قبل از ہجرت باشد، با میران و آسیای صغیر ہجرت کردہ در آنجا متوقف گشتند، و ان طوائف صحرا نشینی را کہ اغلب اوقات با نہا مرتبط بودند و یا از روی ارتباط و دوستی

---

[۱] History of iranian liTeratu e by Tan Rage 516.

و بالنتیجہ تابعیت با خود آوردہ، و در ممالک مفتوحہ و متصرفہ خود سلسلہ ہائے چند تشکیل دادکہ مشہور ترین آنہا سلسلہ غزنوی و سلسلہ سلجوقی و سلسلہ عثمانی ست و ازیں طائفہ بزرگ چندیں شعبہ ہا متمیز تولید شدہ و اگرچہ بسیاری ازاں شعب مفقود شدہ ولے آنانکہ اکنوں موجود اند، عبارتند از عثمانی، ترکمان، قزالبیق، اذبک، کیرغیز، یاکوت، و چواش"[۵۱]

---

[۵۱] فرہنگ نفیسی ناظم الاطبا، ج ۱ ص ۵۵-۵۶۔

سلسلۂ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی نے مختلف موضوع پر متعدد ضخیم تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی و تاریخی و ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، اُن کی وفات کے بعد ہی ان مقالات کی ترتیب تدوین و اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا تھا جس کے تین حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، پہلا حصہ تو تمام تر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے، اور تیسرا حصہ تمام تر قرآن سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے، اور حصہ سوم جو علمی و تحقیقی ہے، اس میں حسب ذیل اہم مضامین ہیں، ہندوستان میں علم حدیث، عرب و امریکہ، کتبخانہ اسکندریہ، حکیم سنائی کے سنین عمر، امد مرزا بیدل، سفر گجرات کی چند یادگاریں، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ، کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں،

قیمت: ۱۲ روپیہ،

"منیجر"

تذکرۂ الٰہی

از جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان نے فارسی شعر و ادب کی ترویج و ترقی میں جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے وہ بہت ہی وقیع اور اہم ہے، اور یہ خدمت صرف شعر و ادب تک محدود نہیں بلکہ تاریخ و تہذیب، اعمال و افکار کے بہت سے سرچشمے اسی سرزمین پہ پھوٹے اور پروان چڑھے، پرانے ادب اور اسالیب کو نئی توانائی بھی یہاں سے ملی ہے، غرناطہ اور بغداد کے سیاسی، علمی اور تہذیبی زوال کے بعد دہلی کی مرکزیت کہیں زیادہ دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوئی، دور دراز کے علماء، ادیب اور ماہرین فن نے دہلی کو اپنا مسکن قرار دیا۔ دہلی صرف دار الخلافہ نہیں بلکہ قلب و نظر کی تسکین و تخلیق کا مرکز بھی تھا۔ فارسی شعر و ادب نے تہذیب و تاریخ پر اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

ہندوستان نے فارسی شعر و ادب کی ہمہ گیر خدمت کی، اس کی نئی راہیں نکالیں، اسلوب و آہنگ میں جدتیں پیدا کیں، اس کے اصول مرتب کیے۔ آہنگ شناسی کے اصولوں کا تعین ہندوستان کی اولیات میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی تذکرہ نویسی کا آغاز ہندوستان میں ہوا، عوفی کا تذکرہ لباب الالباب فارسی ادب کا پہلا تذکرہ ہے جو یہاں مرتب ہوا، یہ تذکرہ فارسی شعر و ادب میں سنگ میل ہی نہیں بلکہ چراغ راہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے، بعد کے بیشتر لکھنے والوں نے اسی چراغ سے اپنا چراغ روشن

کیا ہے، اس سلسلے کی ایک مہتم بالشان کڑی عماد الدین محمود بن امیر محبت اللہ اسدآبادی کا تذکرہ "خزینۂ گنج" ہے، یہ ایک نایاب تذکرہ ہے، جو عہد شاہجہاں میں مرتب ہوا، اس تذکرے کے بارے میں معلومات کے ذرائع محدود ہیں، صرف اشپرنگر اور برلن کے کتب خانے کی فہرست سے اس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، مولف اور تذکرے کے بارے میں اشپرنگر نے خاصی تفصیلات دی ہیں، "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک" کے مصنف نے اشپرنگر کے مندرجات کو نقل کیا ہے، معارف جولائی ۱۹۶۵ء کے شمارے کے مضمون "فارسی کے چند نایاب تذکرے" میں خزینہ گنج کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مضمون "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک" کا ترجمہ ہے، مگر اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

اس مضمون میں اپنے ذاتی کتب خانے میں موجود "خزینہ گنج" کے ایک تیسرے اور قابل قدر نسخے کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، یہ نسخہ اس لیے سب سے زیادہ وقیع اور اہم ہے کہ بڑی حد تک مکمل ہے، اسپرنگر نے جس نسخے کا ذکر کیا ہے وہ ناتمام ہے، اس میں بیچ بیچ میں بیاض چھوٹی ہوئی ہے، شاعر کا نام ہے تو دوسری تفصیلات نہیں ہیں، کہیں کہیں اشعار نقل کر دیے گئے ہیں، اگر کسی میں کچھ تفصیل ہے تو اشعار نہیں ہیں، لیکن پیش نظر نسخہ کا پورا مسودہ مکمل اور مربوط ہے، اشپرنگر کے نسخے میں مقدمہ اور ترقیمہ دونوں نہیں ہیں، اس نسخے میں مقدمہ تو نہیں لیکن ترقیمہ ہے، جس سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے، اول یہ کہ اس کا نام "تذکرۂ الٰہی" ہے اور یہ اس کی پہلی جلد ہے، اور یہ جلد شعرائے متقدمین کے حالات میں ہے، اشپرنگر نے بھی ذکر کیا ہے کہ یہ پہلی جلد ہے، اور دوسری جلد کی تکمیل سے پہلے ہی مصنف کی وفات ہو گئی مولف کا پورا نام عماد الدین محمود المتخلص بالٰہی الحسینی ہے، اشپرنگر نے باپ کا نام محبت اللہ بن

لکھا ہے. لیکن اس نسخہ کے ترقیمے میں امیر محبت اللہ درج ہے، جس سے منتخب الاشعار کی تائید ہوتی ہے، عماد الدین ہمدان کے سادات میں ہیں، عہد جہانگیری میں ہندوستان آئے۔

اسپرنگر کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۰۴۲ھ، ۱۰۵۲ھ، ۱۰۹۳ھ اور ۱۰۹۴ھ کے درمیان لکھا گیا، لیکن موجودہ ترقیمے کی عبارت سے ظاہر ہے کہ ۱۰۹۵ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ مولف کی زندگی میں لکھا گیا، اور یہ مصنف کا اپنا ذاتی نسخہ ہے، یا اس کے قریب تر زمانہ کا ہے، اس لیے کہ کہیں نقل کیے جانے کا ذکر نہیں ہے. الٰہی کی تاریخ وفات کی مختلف روایتوں میں ایک روایت ۱۰۹۴ھ کی بھی ہے، یعنی ۱۰۹۴ھ تک وہ زندہ تھا،

اسپرنگر نے لکھا ہے کہ اس کے پیش نظر جو ناتمام نسخہ ہے وہ خود مولف کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، میرا قیاس ہے کہ زیر تعارف نسخہ خود تذکرہ نگار کا تکمیل کردہ ہے، یا اس کا دیکھا ہوا ہے. ترقیمے کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :۔

"تمام شد این دفتر اول از تذکرہ الٰہی کہ در ذکر متقدمین شعرائے علیین مکان را روز دوشنبہ (۱۰) شوال بتاریخ ہزار و نود و پنج و مولف این تذکرۂ الٰہی عماد الدین محمود المتخلص بالٰہی الحسینی ابن امیر محبت اللہ اسد آبادی الہمدانی است"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نسخے میں مقدمہ نہیں ہے. غالباً وہ زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا، اسپرنگر نے لکھا ہے کہ یہ ناتمام نسخہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے، اور ابن یمین سے شروع ہو کر ہمایوں بادشاہ پر ختم ہوتا ہے، پیش نظر نسخے میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہے، اور ہمایوں یعنی ہ پر ختم نہیں ہوا بلکہ آخری حرف ی یوسف بن شیخ احمد جامی پر ختم ہوتا ہے، چند ابتدائی صفحات نہ ہونے کی وجہ سے اس کا آغاز

ابن یمین کے ابو علی سینا کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ اسپرنگر نے اپنے نسخے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں تقریباً چار سو شعراء کا ذکر ہے۔ موجودہ نسخہ اس لیے بھی جامع اور مکمل ہے کہ اس میں تقریباً چھ سو چالیس شعراء کا ذکر ہے۔ شعرا کا نام سرخ روشنائی سے اور بڑے اہتمام سے لکھا گیا ہے، اکثر و بیشتر حروف تہجی کے بدلتے وقت نئے حروف کو بھی سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ آسانی کے پیش نظر دو الگ الگ جلدوں میں جلد سازی کی گئی ہے، اس کی دونوں جلدیں تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد میں الف سے غ تک اور دوسری میں ف سے ی تک حروف شامل ہیں۔ کاغذ کی قدامت ۱۰۹۵ھ پر دلالت کرتی ہے۔ روشنائی بھی اس عہد کی سیاہی کا پتہ دیتی ہے۔ پورا نسخہ خط نستعلیق میں ہے۔ اور بہت ہی بوسیدہ اور جگہ جگہ کرم خوردہ بھی ہے، صفحات کے کنارے خاص طور سے گل گئے ہیں، تحریر بہت روشن اور پختہ ہے۔ پورا نسخہ ایک قلم، ایک طرح کی روشنائی اور ایک ہی طرح کے کاغذ پر لکھا ہے، کتابت کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں، مخطوطہ عام کتابی سائز (۹ × ۴) کا ہے، اور ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں، شعرا کا نام شروع کرنے میں نئی سطر یا نئے پیراگراف کا التزام نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ نسخہ بہت ہی قابل قدر اور اہم ہے، کیونکہ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ سب سے زیادہ ضخیم، مکمل اور قدیم ترین نسخہ ہے اس کی اشاعت سے فارسی تذکرہ و تاریخ اور اسلوب و آہنگ شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ضبط امید بھی، جلوہ گہ یاس بھی
دل مرا تریاق بھی، ریزہ الماس بھی

آنکھ سے اوجھل وہی دل میں وہی جلوہ گر
مجھ سے بہت دور بھی، میرے بہت پاس بھی

آج سفینہ کا ہے صرف خدا ناخدا
آج ہیں بے دست و پا خضر بھی الیاس بھی

اس گل شاداب کی پوچھ نہ عطر افگنی
جس میں ہو شامل تری نکہت انفاس بھی

پھول ہیں کاغذ کے یہ حسن پہ اُن کے نہ جا
رنگ تو دیکھا مگر سونگھ ذرا باس بھی

شکر نہ کیسے کروں مالک کونین کا
بار الم بھی دیا، شدت احساس بھی

آگ لگاتے رہے صحن چمن میں مگر
کس کا جلا آشیاں یہ نہیں احساس بھی

لکھتے ہوئے حال دل خون سے رنگین ہوا
صفحۂ دل کی طرح صفحہ قرطاس بھی

کیوں نہیں اس کو سکوں کیوں ہے یہ سیماب گوں
اب ہے خلش دل میں کیوں ٹوٹ چکی آس بھی

ہاتھ بڑھے کیوں مرا خواہش زر کیوں کروں
مایۂ صد فخر ہے دولت افلاس بھی

سوکھ چکے اشک اور مٹ نہ سکا سوز دل
خشک سمندر نہیں اور نہ بجھی پیاس بھی

فہم پہ سامع کے ہے قدر سخن منحصر
معدن حکمت ہے جو ہو وہی کو اس بھی

سچ ہے ولی زیست کے ناز نہ مجھ سے اٹھے
مجھ کو ولی زندگی آ نہ سکی راس بھی

غزل

از

جناب شرف الدین صاحب ساحل محمد علی روڈ مومن پورہ ناگپور

شکوہ نہیں، ملال نہیں، بددلی نہیں
کیا ہو گیا جو قدرِ فغاں تم نے کی نہیں

قربانِ دل کیا نہیں، یا جان دی نہیں
کب میں نے تیرے حکم کی تعمیل کی نہیں

طوفانِ بحرِ غم میں میری کشتیٔ حیات
ڈوبی کچھ اس طرح کہ کنارے لگی نہیں

کچھ اپنی زندگی کا ہی انجام سوچتے
مہلت تیرے خیال نے اتنی بھی دی نہیں

برباد کر خوشی سے مگر اتنا سوچ لے
یہ تیری زندگی ہے مری زندگی نہیں

لاکھوں دیئے جہاں میں جلے اور بجھ گئے
شمعِ وفا ہماری جلی تو بجھی نہیں

رخصت ہوئی یہ کہہ کے مرے دل سے اُن کی یاد
اجڑے ہوئے چمن میں کوئی دلکشی نہیں

تم مل گئے تو دولتِ کونین مل گئی
اب میرے دل میں کوئی تمنا رہی نہیں

سمجھائے کون زاہدِ جنت طلب کو یہ
جس میں غرض شریک ہو وہ بندگی نہیں

یہ بھی نگاہِ یار کا انداز خوب ہے
مائل بہ التفات کبھی ہے کبھی نہیں

امید و بیم کی ہوں کشاکش میں مبتلا
ہے عرضِ مدعا پہ کبھی ہاں کبھی نہیں

ترکِ تعلقات کو مدت ہوئی مگر
دل سے کسی کی یاد ابھی تک گئی نہیں

کب وہ بھی دیکھیے مری پرسش کو آتے ہیں
جب مجھ میں عرضِ حال کی طاقت ہی نہیں

افسردگی کا غم بھی گلچیں کا خوف بھی
پھولوں کی زندگی میں خوشی ہی خوشی نہیں

گھبرا کے غم سے موت کی ساحل کروں دعا
بیزار زندگی سے میں اس درجہ بھی نہیں

غزل

از

جناب قمر صاحب سنبھلی

اُن کی محفل سے ہمیں لاکھ پکارا جائے
آ گئے اُٹھ کے تو اب کون دوبارا جائے

فکر کو دل کا لہو دے کے نکھارا جائے
اپنی آواز کو ہر دل میں اتارا جائے

تنگ ہو جائے اگر اُس پہ ترا دامن بھی ؟
پھر کہاں گردشِ حالات کا مارا جائے

وہ جو پروازِ تخیل سے بھی بالا ہے اُسے
کیسے الفاظ کے شیشہ میں اُتارا جائے

بھیک میں عشرتِ جاوید بھی مل سکتی ہے
ہم سے دامن کو مگر کیسے پسارا جائے

کچھ تو ہو شرکتِ غم کچھ تو تسلی ہو اُسے
ڈوبنے والے کو ساحل سے پکارا جائے

ذہنِ انساں پہ مسلط ہے قیامت کا جمود
ہے ضرورت کہ اسے آگ سے دھارا جائے

ہے بس اک دامنِ امید مرے ہاتھوں میں
اُن کا منشا ہے قمر یہ بھی سہارا جائے

مطبوعات جدیدہ

اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت (میر کا عہد)

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت

و طباعت بہتر، صفحات ۵۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت عنہ، پتے جامعہ لمیٹڈ اردو بازار

جامع مسجد، دہلی ۔ (۲) شمشاد مارکیٹ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

زیر نظر کتاب میں میر کے عہد یعنی اٹھارہویں صدی کی ہندوستانی تہذیب و معاشرت

کا جائزہ لیا گیا ہے، میر کی زندگی، دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ بسر ہوئی تھی اسلئے یہ کتاب دو حصوں میں ہے

پہلے حصہ میں دلی کا اور دوسرے میں لکھنؤ کا ذکر ہے پہلا حصہ چار اور دوسرا پانچ ابواب پر مشتمل ہے ان ابواب میں دلی اور لکھنؤ کی سیاسی و معاشی

ادبی و تمدنی، معاشرتی و سماجی اور مذہبی و اخلاقی حالت دکھائی گئی ہے، پہلے حصہ

کی ابتدا میں مغلیہ سلطنت کے انحطاط، دلی پر نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں اور مرہٹوں

روہیلوں، جاٹوں اور سکھوں کی شورشوں اور بغاوتوں کا، اور دوسرے حصہ

کے شروع میں اودھ کی ریاست کی مختصر تاریخ اور نوابان اودھ کا مختصر تذکرہ بھی ہے،

اقتصادی و معاشی حالات کے سلسلہ میں دونوں جگہ کے سلاطین و امرا کے اسراف،

عوام کی معاشی زبوں حالی اور مختلف پیشوں اور اہل حرفہ کی ابتر حالت کا مفصل ذکر ہے،

معاشرتی و سماجی حالات کے ذکر میں بڑی تفصیل سے کام لیا گیا ہے، اور پیدائش، شادی

بیاہ کی رسموں، مردوں اور عورتوں کے لباس، آرائش و زیبائش کے ساز و سامان،

ماکولات و مشروبات، مسلم تہواروں، میلوں ٹھیلوں، عرسوں، کھیل تماشوں اور ان سے متعلق چیزوں، مدرسوں، خانقاہوں اور ادبی و شعری محفلوں وغیرہ کا ذکر ہے، مذہبی و اخلاقی حالت کے بیان میں بادشاہوں اور امرا کی شعائر دین سے غفلت، فسق و فجور، اخلاق اور کردار کی پستی وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے حصہ کے پانچویں باب میں میر کے لکھنؤ کے آخری دور اور وفات کے مختصر واقعات دیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب دلی اور لکھنؤ کی تہذیب کا مرقع ہے، مگر زیادہ تر اس کا تاریک رخ پیش کیا گیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں سیاسی زوال کے ساتھ اخلاقی زوال بھی آگیا تھا، اور اسکے بارہ میں جو کچھ بھی کہا جائے سب صحیح ہے، لیکن اسی کے ساتھ اسکے تہذیبی تکلفات اور معاشرتی نفاستوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً اہل لکھنؤ نے تہذیب معاشرت میں ایسی جدتیں اور نفاستیں پیدا کیں کہ ان کی تہذیب معیار بن گئی جس کی تصویر گذشتہ لکھنؤ میں نظر آتی ہے، اس کو مصنف نے بڑی حد تک نظر انداز کر دیا ہے، یہ کتاب میر کی سیرت و شخصیت اور فنی کارناموں کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے اس عہد کے حالات و کوائف تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، مگر صرف واقعات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، یہ نہیں دکھایا گیا ہے کہ میر کی شاعری پر اس کے کیا اثرات مترتب ہوئے، معلومات کی فراہمی میں اس دور کے شعر و ادب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، مگر دوسرے شعراء کے مقابلہ میں میر کے کلام سے کم فائدہ اٹھایا گیا ہے، بعض غیر مستند روایتیں اور واقعات بلا حوالہ نقل کر دیے گئے ہیں، مثلاً غدیر خم سے متعلق روایت اور شاہ عبد العزیز دہلوی کے چھپکلی کا ابٹن لگائے جانے کا واقعہ جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، شروع میں نثار احمد فاروقی صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ میں میر کی فنی عظمت دکھائی گئی ہے، اور ان پر تحقیقی کام کی کمی کا شکوہ کیا گیا ہے، اور آئندہ

کاموں کا مختصر خاکہ بھی دیا گیا ہے۔

(۱) نگارشات بہادر یار جنگ، (۲) بہادر یار جنگ کے خطوط مشاہیر کے نام، (۳) مکتوبات بہادر یار جنگ، (۴) مکاتیب بہادر یار جنگ، (۵) تاثرات بہادر یار جنگ، (۶) بہادر یار جنگ کی ڈائری

مرتبہ جناب نذیر الدین احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۱۱۲-۳۱۳-۱۵۵-۱۳۲-۱۵۴-۲۶۶- قیمت عہ ۵۰ پیسے- ۶ر عہ ۵۰ پیسے- عہ پیسے- بہ ۵۰ پیسے ۶ر

پتہ :- حیدر اینڈ سنس مچھلی کمان، حیدر آباد۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم بڑے اولوالعزم مسلمان اور صحیح معنوں میں مجاہد اسلام تھے، وہ ہمیشہ دینی و ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، خصوصاً دکن کے مسلمانوں میں ایمانی حرارت اور ملی بیداری پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، وہاں کی تحریک اتحاد المسلمین ان کی بدولت بڑی جان پڑ گئی تھی، اور وہ ان کی صدارت کے زمانہ میں مسلمانان دکن کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی تھی، گو مرحوم ایک عملی انسان تھے، اور ان کی پوری زندگی عملی جد و جہد میں گذری لیکن ان کا علمی و ادبی ذوق بھی بلند تھا، اور خطابت میں تو یگانہ تھے، ان کی کچھ قلمی یادگاریں بھی ہیں، ان کی وفات کے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد ان کے ایک لائق قدر دان جناب نذیر الدین احمد صاحب کو ان کی تحریروں کی اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ اس سلسلہ کی دس کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں مگر ہم کو صرف مذکورہ بالا چھ کتابیں موصول ہوئی ہیں، اول الذکر کتاب نواب صاحب مرحوم کے مختصر اصلاحی و مذہبی مضامین اور بعض دوسرے اہل قلم کی کتابوں پر مقدمے اور تبصروں اور تاثرات وغیرہ کا مجموعہ ہے، دوسری میں مذہبی و سیاسی رہنماؤں اور دوسرے اہل علم کے نام مرحوم کے خطوط درج ہیں، مسلم لیگ کے متعدد سرکردہ لیڈروں، قائد اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین

غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان، شہید سہروردی، جنید رنگیرہ، چودھری خلیق الزماں، سر محمد یعقوب، سکندر حیات خاں، اور راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ، دوسرے مشاہیر میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، شیخ عبداللہ، نواب چھتاری، اکبر علی خاں گورنر اتر پردیش، سید قاسم رضوی، میر لائق علی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، عنایت اللہ خاں مشرقی، سلام الدین خاں، سابق وزیر ریاست بھوپال مہدی یار جنگ اور علی یاور جنگ، اور علماء و مشائخ میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے ناموں سے اس مجموعہ کی اہمیت ظاہر ہے، ان خطوط میں مختلف مذہبی، قومی اور سیاسی مسائل کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، اور ان سے مکتوب نگار کی ملی و دینی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ مکتوبات بہادر یار جنگ میں بھی بعض اداروں کے ذمہ داروں اور اخباروں و رسالوں کے اڈیٹروں کے نام خطوط ہیں، اور ۱۹۳۳ء میں ہندوستان آنے والے فلسطینی وفد سے متعلق خط و کتابت بھی شامل ہے، اور آخر میں "گفتگوئے مفاہمت" کے زیر عنوان نواب صاحب اور نرسنگ راؤ کی مراسلت نقل کی گئی ہے، اس کی حیثیت تاریخی دستاویز کی ہے، دوسرے خطوط میں سیاسی، ادبی اور اقتصادی تحریکوں اور مسلمانوں کے مسائل کا ذکر و مذکور ہے، اس لیے وہ بھی اہمیت سے خالی نہیں، چوتھی کتاب تقریباً دو سو خطوط کا مجموعہ ہے اور اس سے بھی گذشتہ دور کی سیاسی و ملی سرگرمیوں کا خاکہ سامنے آتا ہے، پانچویں کتاب میں بہادر یار جنگ مرحوم نے بعض اداروں، تحریکوں، کتب خانوں اور اشخاص کے متعلق اپنے تاثرات، بیانات، بیانات ڈائری اور ریویو میں تحریر کی ہیں، آخری کتاب ان کی ذاتی ڈائری ہے، اس میں انھوں نے ۲۷ء و ۲۸ء میں اپنے روزمرہ کے مشاغل و معمولات قلمبند کئے ہیں، اس سے ان کی

مشغول زندگی اور روزآنہ کے کاموں کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب مجموعے ادبی حیثیت سے دلچسپ اور قوم وملت کے لیے سبق آموز ہیں، اور ان سے نواب صاحب مرحوم کی سیرت وشخصیت کے خط وخال بھی نمایاں ہوتے ہیں اور قومی وملی جذبہ اور دینی وایمانی حرارت کا ایسا مرقع بھی سامنے آتا ہے جو نوجوانوں کے لیے سرمایۂ بصیرت ہے۔ فاضل مرتب نے ان مجموعوں کو شائع کرکے ایک مفید قومی وادبی خدمت انجام دی ہے۔ ہر کتاب میں نواب صاحب اور بعض دوسرے حضرات کے فوٹوؤں کا عکس بھی دیا گیا ہے۔

نذر سجاد - مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب، متوسط تقطیع۔ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۔۔ہم قیمت تحریر نہیں۔ پتہ: سیفیہ کالج بھوپال۔

سیفیہ کالج بھوپال کے طلبہ واساتذہ نے اپنے محسن اور کالج کے بانی ملا سجاد حسین مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں یہ کتاب شائع کی ہے، گو ملا صاحب ایک کامیاب تاجر اور کم پڑھے لکھے شخص تھے، لیکن ان کو قومی اور تعمیری کاموں سے بڑی دلچسپی تھی خصوصاً ملی وتعلیمی اداروں پر کافی صرف کرتے تھے، اس لیے ان کے حالات ان اصحاب ثروت کیلیے سبق آموز ہیں جن کی دولت ان کے ذاتی تعیشات ہی کے لیے وقف رہتی ہے، یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے، ابتداءً شعراء کا خراج عقیدت ہے، اس کے بعد ملا صاحب کے حالات وخدمات، اوصاف وکمالات اور فیاضی وسخاوت وغیرہ کے متعلق مضامین ہیں جس میں کہیں کہیں مبالغہ پیدا ہوگیا ہے، تیسرے حصہ میں کالج کی تعمیر وترقی اور اس کے پرائمری اسکول سے پوسٹ گریجویٹ کالج ہوتے تک کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اور مختلف شعبوں کی کارگذاریوں اور ملا صاحب اور ان کے صاحبزادوں اور کالج کے متوسلین کی خدمات کا مختصر خاکہ ہے، اس حصہ میں شعبۂ تاریخ کیمیا اور نباتات کے متعلق مضامین بھی ہیں، اور دو مضامین میں شعبۂ اردو کے تصنیفی وتحقیقی

کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے، "ماحول" کے زیر عنوان بھوپال کی تاریخ اور اس کی خصوصیات سے متعلق مضامین کے علاوہ یہاں کی ممتاز شخصیتوں نواب صدیق حسن خاں صاحب اور ملا رموزی وغیرہ کا سوانحی خاکہ بھی تحریر کیا گیا ہے، آخر میں لائق مرتب عبدالقوی دسنوی صاحب کا تحقیقی اور سیر حاصل مقالہ "خطوط غالب" درج ہے،

یہ کتاب ملا صاحب کی سبق آموز زندگی کا مرقع اور ان کی یادگار سیفیہ کالج کی خدمات اس کے مختلف شعبوں کی کارگذاریوں اور تاریخی، سوانحی اور ادبی و تحقیقی مضامین کا اچھا مجموعہ اور محنت و خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے،

انتخاب دیوان مومن - مرتبہ جناب حامد حسن قادری مرحوم، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰ قیمت ۲؎ ناشر انجمن ترقی اردو ہند دہلی

مرزا غالب کی طرح مومن کے کلام کو بھی اس کی نازک خیالی نے مشکل بنا دیا ہے، مگر غالب کا عشر عشیر بھی اس کی جانب توجہ نہیں کی گئی، عرصہ ہوا مولوی ضیاء احمد بدایونی مرحوم نے بڑے اہتمام سے مومن کا دیوان ترتیب دے کر مع شرح کے شائع کیا تھا، یہ نیا انتخاب اور شرح نامور مصنف اور دیدہ ور ادیب و ناقد مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے قلم کا نتیجہ ہے، اس میں اشعار کے مطالب اور ان سے متعلق بعض ضمنی امور اور شعر و ادب کے دلچسپ نکات مومن کے اسلوب بیان کے پیچ و خم، تخیل کی نزاکت اور بلندی و پستی اور زبان و محاورہ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ کہیں کہیں معاصرین کے کلام سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ہے مکمل کلام کی شرح نہیں ہے، مگر بلند پایہ اشعار کے ساتھ معمولی درجے کے اشعار بھی دیے گئے ہیں، تاکہ مومن کا رنگ پوری طرح ظاہر ہو جائے،

عقد ثریا، چمنستان شعراء، تذکرہ بزم سخن و طور کلیم } مرتبہ جناب عطاء الرحمن صاحب عطا کاکوی سا

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۶۴ - ۹۶ - ۱۲۸

قیمت اول ۲، دوم ۳، سوم ۳، پتہ: عظیم الشان بکڈپو، سلطان گنج، پٹنہ - ۶

یہ تینوں رسالے اردو شعراء کے تذکرے ہیں، ان میں اول الذکر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ہے، مصحفی نے اردو اور فارسی شعراء کے تین تذکرے لکھے تھے، عقد ثریا اصلاً فارسی شعراء کے تراجم پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ۴۵ ایسے شعرا کا تذکرہ بھی ہے جو اردو فارسی دونوں میں داد سخن دیتے تھے۔ لائق مرتب نے ان شعراء کے حالات علحدہ مرتب کرکے مناسب ترمیم واضافہ کے بعد شائع کیے ہیں، دوسرا تذکرہ مچھمی نرائن شفیق کی تصنیف اور اردو کے اہم تذکروں میں ہے، یہ دونوں تذکرے مدت ہوئی بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے فاضلانہ مقدموں کے ساتھ چھپے تھے، مگر اب نایاب اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے ان کا فائدہ محدود تھا، اس لیے لائق مرتب نے بیجا طوالت، غیر ضروری تکرار اور نمونے کے اشعار وغیرہ حذف کرکے ان کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، آخری کتابچہ دو تذکروں کا مجموعہ ہے، جو نواب صدیق حسن خاں کے فرزندوں علی حسن خاں اور نور الحسن خاں کی یادگار ہیں، یہ دونوں کمیاب اور فارسی میں تھے، لیکن فائدہ سے خالی نہ تھے، اسلیے جناب عطا کاکوی صاحب نے ان کا ترجمہ وتلخیص بھی شائع کی ہے، چمنستان شعرا کی ابتدا میں لائق مرتب کے قلم سے ایک قابل ذکر مقدمہ ہے، اس میں اردو تذکرہ نگاری کی مختصر تاریخ اور مصنف کے مختصر سوانح وکمالات اور اس تذکرے کی خصوصیات وغیرہ تحریر کی گئی ہیں، ان تذکروں کے ترجمہ وتلخیص کی اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دین رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ ؎ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیز

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح برابر خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہوگئی،
یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ داستانِ عمری ہی نہیں ہے، بلکہ
ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے
جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک پھیلا تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی
و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کان پور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ
جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدام مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی
کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور
سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور
پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف
وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل
روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز
انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا نقش ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۷ روپئے۔

مؤلفہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

نومبر سنہ ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اول

بزمِ تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۴ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۴ء عدد ۵

مضامین

ایک ضروری تصحیح:- ماہ اکتوبر میں ظفرنامۂ اکبری کے صاحب مضمون کا نام مظفر حسین غلط چھپ گیا ہے صحیح منظر حسین ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں "ض"

شذرات

قوموں اور ملکوں کی صحیح تعمیر و ترقی کے لئے جس طرح مادی وسائل کی ضرورت ہے، اسی طرح اخلاق و سیرت کردار بھی ضروری ہے، مادی وسائل کی حیثیت اگر جسم کی ہے تو اخلاق و سیرت کی روح کی، جس طرح جسم روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح کوئی قوم اخلاق و کردار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور وہ ہمیشہ بدنظمی اور انتشار کا شکار رہے گی، جس کی مثال ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملک ہیں، ان میں جن ملکوں میں مادی ترقی نظر آتی ہے، اس سے بھی وہ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کو قائم رکھنے اور اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جنگ آزادی ہی کی طرح ایثار و قربانی اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے، فرق یہ ہے کہ آزادی کے لئے جانی و مالی ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے اخلاص و ایمانداری کے ساتھ مسلسل جد و جہد جاری کی اخلاق اور سیرت و کردار کے بغیر ممکن نہیں ہے، ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں کی بدبختی یہ ہے کہ آزادی کے بعد انکی اکثریت تعمیر و ترقی کے بجائے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو جاتی ہے، سیاسی پارٹیاں، اقتدار کی اور دوسرے طبقے اپنے اپنے دائرے میں دولت سمیٹنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں جس سے ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، آج ان ملکوں میں جو سیاسی انتشار اور اقتصادی بحران بپا ہے وہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔

اس دور میں ترقی کا معیار ٹکنالوجی اور بڑے بڑے کارخانے دیو ہیکل مشینیں ان کی

مصنوعات اور اسلحہ و سامانِ جنگ بن گئے ہیں اسلئے ہماری توجہ انہی کی طرف رہتی ہے اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں، لیکن قومی ترقی کے دوسرے اہم رکن اخلاق و سیرت کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر طبقہ خود غرضی اور ذاتی مفاد میں مبتلا ہے، اور مادی ترقی کے باوجود کسی ملک کو بھی سکون و اطمینان میسر نہیں، آئے دن شورش بپا رہتی ہے، تخریبی تحریکیں اٹھتی رہتی ہیں، جس سے پورا ملک انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، جس سے مشکل ہی سے کوئی ملک مستثنیٰ نکل سکتا ہے، ان حالات میں اگر حکومت کوئی اصلاحی قدم اٹھاتی بھی ہے تو خود غرض عناصر اس کو کامیاب نہیں ہونے دیتے، اگر مادی ترقی کی طرح اخلاق و کردار کی تعمیر کی طرف بھی توجہ ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی، اسی لیے گاندھی جی نے سیاست اور اخلاق و سیرت کو ساتھ ساتھ رکھا تھا، ان کی سیاست کی بنیاد ہی اخلاق پر تھی اور وہ عمر بھر اس کا عملی سبق دیتے رہے، اور آج بھی ملک بلکہ انسانیت کی فلاح اسی پر موقوف ہے

جو ملک خالص مادہ پرست اور اخلاق و روحانیت سے تہی دامن سمجھے جاتے ہیں اور جن کا نصب العین صرف مادی ترقی ہے، ان کا بھی ایک قومی کردار ہے، جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، اور جس کے وہ سختی سے پابند ہیں، ان کے اور اعمال کیسے ہی ہوں لیکن انکا ہر فرد اپنے ملک کا بہی خواہ ہے، ذاتی مفاد پر اجتماعی اور ملکی مفاد کو ترجیح دیتا ہے جب ملک پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو ہر طبقہ اپنے اپنے دائرے کے اندر اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جان و مال کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا، اسکے برعکس ایشیائی ملکوں کے باشندے ایسے اوقات میں مدد کرنے کے بجائے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ملک کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، جس کا تجربہ ہر شخص کو ہے،

دوسرے ملکوں سے ہمکو بحث نہیں، ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے اس نے دوسری قوموں

کو اخلاق اور روحانیت کا سبق دیا ہے، آج اس کا بڑا حصہ قومی اخلاق اور کردار سے بھی محروم ہو گیا ہے ملک کے پیچھے ہو اخواہ رہ گئے ہیں، ان کی کوئی آواز نہیں اور نہ ان میں ان حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے، اس کی صرف ایک ہی شکل ہے، کہ ایسے لوگ حکومت اور عہدوں کو چھوڑ کر جس طرح آزادی کی جنگ لڑے تھے، اسی طرح حکومت کی مدد سے خود غرضی اور بد دیانتی کے خلاف جنگ کریں، اس کے علاوہ موجودہ حالات کی اصلاح کی اور کوئی شکل نہیں ہے۔

یہ کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ سرمایہ دار اور کمیونسٹ ملک جو ایک دوسرے کے بالکل ضد ہیں آپس میں مل سکتے ہیں، چین اور روس سے امریکہ کی مفاہمت ہو سکتی ہے، لیکن وہ اسلامی ملک جن میں اسلامی اخوت کا قوی رشتہ ہے نہیں مل سکتے اصل میں چھوٹے ملکوں کے جنگ امن کا دار بھی بڑی قوتوں پر ہے، اگر وہ ان کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار ہو جائیں اور کسی کی حمایت و سرپرستی نہ کریں تو بڑی حد تک ان کے اختلافات ختم ہو جائیں گے، یا کم سے کم اسکا کوئی خطرناک نتیجہ نہ نکلے گا، اس لئے کہ ان میں بڑی طاقتوں کی مدد بغیر اپنے بل بوتے پر لڑنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن وہ اپنے مصالح کی بنا پر اس کھیل سے دست بردار نہیں ہو سکتیں، اس لئے چھوٹے ملکوں کی دانشمندی اسی میں ہے کہ وہ ان کا آلۂ کار نہ بنیں ! جنگ سے فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان پہنچے گا، اور ان کی ترقی کیا آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی،

مقالات

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی نقد حدیث)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی: ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۷)

مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ دور کرنے کا طریقہ

داخلی وخارجی نقد کا ٹکراؤ اگر مستند کتب حدیث کی روایت میں ہے اور خارجی نقد کے لحاظ سے وہ صحیح ہے تو پہلے کلام نبوت کی حیثیت سے اس کا محل متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگر اس سے ٹکراؤ دور نہ ہو تو پھر داخلی نقد کو بنیاد قرار دے کر اس کے صحیح وغیر صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اس کے دلائل یہ ہیں:-

داخلی نقد کی فوقیت کے دلائل (۱) قرآن حکیم میں ہے،

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ[۱]	جب اُن کے پاس امن یا ڈر کی کوئی خبر آتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں، اگر اس کو رسولؐ اور اولوالامر تک پہنچا دیتے تو جو اُن میں ملکۂ استنباط رکھنے والے ہیں، وہ اس کو پوری طرح

---

[۱] نساء - ۱۱

اس آیت میں خبر کی حیثیت متعین کرنے کی جس انداز میں تاکید ہے، اس سے ظاہر ہے کہ صرف راوی کی ثقاہت ہر خبر پر اعتماد کے لئے کافی نہیں ہے، پھر جس خبر سے شانِ نبوتؐ پر حرف آئے یا معیارِ ثبوت برقرار نہ رہ سکے، اس میں راوی کی ثقاہت کو بدرجۂ اولیٰ ناکافی قرار دے کر اصل زور نفس خبر (داخلی نقد) پر ہوگا جس کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جائے گا،

۲۔ اس صورت میں داخلی نقد کو بنیاد بنانے کی ایک بڑی وجہ اس کا تقدم ہے کیونکہ علوم حدیث میں سب سے پہلے داخلی نقد کا وجود ہوا جیسا کہ دورِ صحابہؓ کی بعض مثالیں گذر چکی ہیں، خارجی نقد کا وجود بہت بعد میں ہوا، اب اگر صرف خارجی کو قابلِ اعتماد ٹھہرانے سے "حدیث" پر زد پڑتی ہے، تو لامحالہ داخلی کو فوقیت حاصل ہوگی،

۳۔ محدثین کی درج ذیل صراحت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے،

کل ما خالف الادلۃ القاطعۃ	ظنی حدیث کے متن یا معنی میں جو چیز
العلمیۃ من الاحادیث	بھی علمی قطعی دلائل کے خلاف ہو تو
الظنیۃ فی متنھا او معناھا	بالاتفاق قطعی پر عمل واجب ہے
وجب العمل بالقطعی	ظنی پر نہیں،
دون الظنی اجماعاً[1]	

اسی بنا پر کہا گیا ہے:-

ھذہ مزیۃ حسنۃ وانھا	یہ عمدہ فضیلت اور ان لوگوں پر
لابلغ ردّ علی اولٰئک الذین	بہترین رد ہے، جو کہتے ہیں کہ

---

[1] محمد بن ابراہیم الوزیر الیمانی۔ الروض الباسم فی الذب عن سنۃ ابی القاسم ج۱ ص۱۷۷

یدعون علماء الحدیث	علماء حدیث کو متن کے نقد کی
لم یعرفوا نقد المتن ابداً[1]	معرفت نہیں حاصل ہے،

(۴) قاضی حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی (۲۶۵ - ۳۶۰) کی کتاب المحدث الفاصل بین الراوی والواعی عام خیال کے مطابق اصول حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہے، اس میں ابو عباس حرانی کے حوالہ سے ابو عاصم نبیل کا یہ قول منقول ہے،

الریاسۃ فی الحدیث بلا	درایت کے بغیر حدیث میں سرداری
درایۃ ریاسۃ نذلۃ[2]	ایک ادنیٰ قسم کی سرداری ہے،

اسی کتاب میں ایک مستقل باب القول فی فضل من جمع بین الروایۃ والدرایۃ" ہے، جس میں کئی ایسی روایتیں نقل کی گئی ہیں جو روایت و درایت کو جمع کرنے کی ضرورت اور اسکی فضیلت و برتری کو ظاہر کرتی ہیں[3]،

"داخلی نقد" کی اس اہمیت کے باوجود ہر موقع پر صرف "خارجی" کو بنیاد بنانا اور بات بنانے کے لئے حدیث کی ناقابل قبول تاویل سے بھی دریغ نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے "جواہرات" کے ڈھیر میں اگر چند خزف ریزوں کی آمیزش ہو، تو ڈھیر کی عظمت اس میں ہے کہ ان کو خزف ریزہ تسلیم کیا جائے نہ کہ دوراز کار تاویل کے ذریعہ ان کو "جواہرات" ثابت کیا جائے، اس سے خزف ریزے" تو جواہرات میں تبدیل نہ ہو سکیں گے البتہ ان کی وجہ سے "جواہرات" کی قدر و قیمت یقیناً گھٹ جائیگی،

حق و انصاف کی بات | (۵) حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ مستند کتب حدیث کی کوئی روایت کتنے

---

[1] محمد صباغ: مقدمہ الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعۃ (موضوعات کبیر کا اصل نام یہی ہے جو اب محمد صباغ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے)[2] قاضی حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی: المحدث الفاصل بین الراوی والواعی: القول فی فضل من جمع بین الروایۃ والدرایہ۔

[3] ایضاً

ثقہ راویوں سے مزین ہو اگر وہ علمی قطعی دلائل سے ٹکرائے گی، یا اس سے شانِ نبوت پر حرف آئیگا تو وہ ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی۔ "معیارِ نبوت" گرانے سے یہیں بہتر ہے کہ راویوں کی ثقاہت مجروح قرار دی جائے، خصوصاً جب کہ اس امر کا امکان موجود ہے کہ کسی بددین وجھوٹے راوی نے موضوع روایت کو ثقہ راویوں کی حدیث میں داخل کر دیا ہو، اور یہ داخل شدہ روایت ثقہ راوی کی حدیث سمجھ کر روایت کی گئی ہو، یا درمیان سے جھوٹے اور ضعیف راویوں کو نکال کر براہِ راست "شیخ" سے روایت کی گئی ہو، جیسا کہ ابن جوزی نے ثقہ راویوں کی موجودگی میں حدیث کے موضوع یا مقلوب ہونے کی دو شکلیں پیش کی ہیں، اور اُن کی معرفت کو حد درجہ مشکل قرار دیا ہے' چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

فان قوی نظرک ورسخت	اگر تیری نظر قوی ہے، اور اس علم
فی ھذا العلم فھمت مثل	میں رسوخ حاصل ہے، تو اس جیسی
ھذا وان ضعفت فسئل	صورت کو سمجھ لے گا، اور اگر کمزور ہے
عنہ وان کان قد قل من	تو اس کے بارے میں پوچھ لے، اگرچہ
من یفھم ھذا بل قد عدم[۱]	اُس کے سمجھنے والے بہت کم بلکہ نہ ہونے
	کے برابر ہیں،

نورِ نبوت کی خصوصیات داخلی نقد وتحقیق کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حدیث ماخذ (سرچشمہ) "شعورِ نبوت" ہے، اس کو جو خصوصیات حاصل ہیں، وہ کسی اور کے "شعور" کو [حاصل] نہیں، مثلاً

(۱) نور میں اُس کی پرورش ہوتی اور نورانی شعاعیں اس کے جلو میں رہتی ہیں :-

[۱] ابن جوزی۔ کتاب الموضوعات، الباب الثالث،

(۲) قوت قدسیہ اور تجلیاتی شعور سے ہر وقت متصف رہتا ہے،

(ا) قوتِ قدسیہ۔ خواہشاتِ نفس سے حفاظت کی بنا پر جو شعور کی بیداری اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے،

(ب) تجلیاتی شعور۔ مشاہدۂ حق سے جو نور کی شعاع باطن پر پڑتی اور باطن کے خواص و اسرار کو روشن کر دیتی ہے،

(۳) زندگی کے راز سے واقف کرانا اور "نیچرل کانسٹی ٹیوشن" کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے،

(۴) عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے جو غیر متناہی علوم کا خزانہ اور ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہے،

(۵) غلطی اور سرکشی سے اس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے، وغیرہ،

ان خصوصیات کی طرف درج ذیل آیات میں اشارہ ہے،

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ [1]	آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ (کل) میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا معاملہ کیا جائے گا، میں تو اس کا اتباع کرتا ہوں جس کی وحی میرے پاس آتی ہے،
فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا	آپ اپنے رخ کو اس دین کی طرف

---

[1] الاحقاف رکوع ۱۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون[1]	کر لیجئے، جس میں کجی کا نام نہیں، اللہ کی وہ فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدایش میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہ دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں،
ذلک من انباء الغیب نوحیہ الیک[2]	یہ غیب کی خبریں ہیں، جن کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں،
فلا یظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول[3]	اللہ تعالیٰ غیب کو اپنے برگزیدہ پیغمبر کے سوا اور کسی کے اوپر نہیں ظاہر کرتا،
ما کذب الفواد ما رائی[4]	قلب نے اس میں کوئی غلطی نہیں کی جو اُس نے دیکھا،
ما زاغ البصر وما طغی[5]	نہ نگاہ نے کجی اختیار کی، اور اور نہ سرکشی کی،
ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظلمین[6]	اگر آپ اُن کی خواہشات کی پیروی کریں گے، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے تو آپ اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں میں ہوں گے،

---

[1] الروم رکوع ۴ - [2] آل عمران رکوع ۵ - [3] جن - ۲ - [4] نجم ع ۱ [5] ایضاً

[6] بقرہ رکوع ۱۵

شعورِ نبوت کے ادراک و مشاہدہ میں کوئی شریک نہیں ہے

مذکورہ خصوصیات کی بنا پر شعورِ نبوت کے ادراک و مشاہدہ میں کوئی اور تو کیا شریک ہوتا، اولیاء بھی شریک نہیں ہیں، ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:-

وَلَا یتصوّر ان الولی یعطی	اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ جس
ما اعطیہ النبی من المشاھدۃ	مخاطبت اور مشاہدہ سے انبیاء علیہم
والمخاطبۃ[1]	السلام سرفراز کئے جاتے ہیں، اولیاء
	بھی سرفراز کئے جاتے ہیں،

اس ادراک و مشاہدہ کی رسائی ماورائے عقل تک ہے

یہ ادراک و مشاہدہ عقل تک محدود نہیں، بلکہ اس کی رسائی ماورائے عقل تک ہے،

ابنِ خلدون کہتے ہیں:-

"شارع کے بتائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو، کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور تمہارے فائدہ کی چیزوں کو جاننے والے ہیں کیونکہ اُن کا علم تمہارے ادراک سے بالا اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہونے والا ہے، جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے، یہ چیز عقل اور اس کے ادراک کے منافی نہیں ہے، بلکہ عقل ہی میزانِ صحیح ہے، اُس کے احکام (بڑی حد تک) یقینی اور جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں، لیکن یہ میزان ایسی نہیں ہے جس سے توحید اور آخرت کے اُمور اور نبوت و صفاتِ الٰہیہ کے حقائق کا وزن کرسکو، یہ ایک محالِ طمع ہے، کیونکہ یہ چیزیں عقل کے طریق اور ادراک سے ماوراء ہیں[2]

---

[1] ابن تیمیہؒ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ مطبوعہ کردستان العلمیہ ص ۱۰۷، [2] ابن خلدون

عقل کی محدودیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا چاندی تولنے کے کانٹے (ترازو) سے پہاڑ تولنے کا ارادہ کرے، (اور جب وہ ایسا نہ کرسکے) تو یہ نہ کہا جائے گا کہ کانٹا (ترازو) وزن بتانے میں ناقص ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر ترازو کی ایک حد ہے جس کے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزان عقل کی بھی ایک حد ہے۔ جہاں وہ ٹھہر جاتی ہے، اس سے آگے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا احاطہ نہیں کرسکتی، کیونکہ عقل بھی وجود کے ان ذرات میں سے ایک ذرہ ہے، جو اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، اس سے تم ان لوگوں کی غلطی اور کم فہمی معلوم کرسکتے ہو۔ جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں نقل پر ترجیح دیتے ہیں"[۱]

امام غزالیؒ کا ارشاد ہے:۔

"عقل سے ماورا ایک راستہ ہے جس میں دوسری (باطنی) آنکھ کھلتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ غیب کی باتیں اور مستقبل کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، اور ان امور کا انکشاف ہوتا ہے جن میں عقل کام نہیں دے سکتی، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جن بعض عقلاء نے اس راستہ کا انکار کیا ہے، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ان کا یہ انکار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۱) :۔

مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۴۸۳۔

[۱] ابن خلدون۔ مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۴۸۳۔

محض جہالت کی وجہ سے ہے۔[1]

شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) فرماتے ہیں:۔

"جس طرح عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے ماوراء ہے کہ جو چیز حواس کے ذریعہ نہ جانی جاسکے اس کو عقل معلوم کرلیتی ہے، اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے ماوراء ہے، جو بات عقل سے نہ معلوم ہوسکے تو نبوت کے ذریعہ معلوم ہوجاتی ہے، جو شخص عقل کے ماوراء کوئی ذریعۂ علم نہیں تسلیم کرتا، وہ دراصل نبوت کا منکر اور بداہت سے ٹکرانے والا ہے۔"[2]

نقد و تحقیق میں افراط و تفریط کے دو گروہ

شعور نبوت کا یہ ادراک و مشاہدہ تسلیم کرنے کے بعد اس سے نکلی ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اسکی نقد و تحقیق کا پیمانہ دوسروں کے "پیمانہ" سے یقیناً مختلف ہوگا، ورنہ نبی اور غیرنبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہ قائم رہ سکے گا۔

لیکن بدقسمتی سے حدیث کی نقد و تحقیق میں بھی افراط و تفریط نے دو گروہ پیدا کردیے جنھوں نے نبوت کی قدر و منزلت نہیں پہچانی۔

(۱) ایک گروہ نے کلام نبوت (حدیث) کو جانچنے کے لیے اسی "پیمانہ" سے کام لیا، جو عام لوگوں کے کلام کو جانچنے کے لیے مقرر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہر ایسی حدیث سے انکار کردیا جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی، اور رسول اللہ کے زمانہ میں وہ مشہور نہ تھی، یا کوئی خوشخبری و مستقبل سے متعلق تھی جس کا ابھی وقت نہ آیا تھا، یا قانونی کلیہ

---

[1] غزالی: المنقذ من الضلال القول فی خواص النبوۃ، [2] شیخ احمد سرہندی: مکتوبات جلد ۲ ج ۳

حکمت کا اصول بیان ہوا تھا جو اس وقت کی ذہنی سطح سے بلند تھا، اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہوگیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی تھے، اسرار غیب سے بھی ایک حد تک واقف تھے، علم و حکمت کی ترویج اور قانون و شریعت کا نفاذ آپ کا خاص شن تھا، اس لیے اگر آپ نے کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند کہی یا قانون واصول اس انداز سے بیان کیے جو بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ کے مشابہ قرار پائے تو اس سے نہ شان نبوت پر حرف آتا ہے اور نہ کسی مقنن و فلسفی سے متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے،

(۲) دوسرے گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جو بات بھی دیکھی اس کو "حدیث" قرار دینے میں دین و مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھ لیا، خواہ اس کی خاطر کتنی ہی دور دراز تاویل کرنی پڑے اور معیار نبوت گر کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے، ابن جوزی نے اس گروہ کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے،

فکم قد افسد القصاص من	واعظوں نے موضوع حدیثوں کے
الخلق بالاحادیث الموضوعۃ	ذریعہ مخلوق کو کس قدر خراب کیا، کتنے
کم لون قد اصفر بالجوع وکم	چہرے بھوک کی وجہ سے زرد ہوئے
ھائم علی وجھہ بالسیاحۃ	کتنے لوگ سفر میں بھٹکتے پھرے، کتنوں نے
وکم مانع لنفسہ ما قد ابیح	ان چیزوں سے اپنے نفس کو روک لیا،
وکم تارک روایۃ العلم زعما	جو ان کے لیے مباح تھیں، کتنوں نے علم
منہ مخالفۃ النفس فی ھواھا	کی روایت محض اس بنا پر ترک کر دی کہ
فی ذالک وکم موتم اولادہ	اس میں خواہش نفس کی مخالفت نظر
بالتزھد وھو حی وکم معرض	آئی، کتنوں نے مصنوعی زہد اختیار کرکے

عن زوجته لا يدفيها حقها	زندگی ہی میں اپنی اولاد کو یتیم بنا دیا
فهي لا ايم ولا ذات بعل[1]	اور اپنی بیوی کے حقوق کو نظرانداز کرکے
	اس کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا کہ نہ اس کا
	کوئی شوہر ہے اور نہ وہ بے شوہر ہیں،

عدل واعتدال کی راہ | عدل واعتدال کی راہ یہ ہے کہ مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیثوں کے پرکھنے کے اصول وضوابط پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی حدیث کی معرفت میں واقعی دشواری قائم رہے تو فقہ کی طرح حدیث میں بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور ماہرین حدیث کو مزید اصول وضوابط وضع کرنے اور ان کے ذریعہ حدیث کی معرفت حاصل کرنے کا حق ہے،

ان باب الاجتهاد ولم يقفل	اجتہاد کا دروازہ فقہ کی طرح حدیث
في الحديث كما لم يقفل في	میں بند نہیں ہوا، ان دونوں علم
الفقه ويجب ان يظل بابه	میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا
مفتوحا في كل من هذين	ضروری ہے،
العلمين[2]	

اب تک اس سلسلہ کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، مصر کے مشہور مصنف "احمد امین" نے چند اصول وضع کیے ہیں، مثلاً

(۱) رسول اللہ کی طرف منسوب حدیث ان ظروف کے مطابق نہ ہو جس میں وہ کہی گئی ہو

---

[1] ابن جوزی کتاب الموضوعات فصل وقد کان قدماء العلماء الخ [2] ڈاکٹر صبحی الصالح: علوم الحدیث ومصطلحہ۔ روایۃ الاحادیث الضعیفۃ والعمل بہا۔

(۲) تاریخی واقعات اس کے خلاف ہوں ۔

(۳) حدیث کی عبارت فلسفیانہ تعبیر سے ملتی جلتی ہو جو رسول اللہؐ کی پسندیدہ تعبیر کے خلاف ہے،

(۴) حدیث اپنی شرطوں اور قیدوں میں فقہ کے متن کے مشابہ ہو،[۱]

(۵) حدیث واقع کے مطابق نہ ہو،

(۶) حدیث وضع کرنے کا کوئی سیاسی محرک ہو،

(۷) حدیث وضع کرنے کا کوئی نفسی محرک ہو،

(۸) حدیث اس ماحول کے مطابق نہ ہو جس میں کہی گئی ہے۔[۲]

ان اصولوں کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ ماہرین حدیث نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، حالانکہ اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہو کہ داخلی نقد حدیث کے جو اصول اوپر ذکر کیے گئے ہیں یہ سب ان میں داخل ہیں، مثلاً نمبر ۱، ۲، و، (۱۵) کے تحت ہیں جس میں تاریخی حقائق کی خلاف ورزی کا ذکر ہے، نمبر ۳ (۱) کے تحت ہے جس میں رکاکت کی تفصیل ہے، نمبر ۴، ۶، ۸ (۲۵) کے تحت ہیں جس میں ہر قسم کی عصبیتوں کا ذکر ہے، نمبر ۵ (۱۶) کے تحت ہے جس میں خلاف شواہد موجود ہونے کا ذکر ہے، غرض مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیث کی معرفت کے لیے جس نئے اصول کی بھی ضرورت ہو اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اسی طرح جن حدیثوں پر گفتگو ہو چکی ہے ان پر اگر مزید گفتگو کی ضرورت سمجھی جائے تو اس سے انکار نہ ہونا چاہیے۔ اہل علم کی مساعی انتہائی قابل قدر ہونے کے باوجود نہ آخری ہیں اور نہ بذریعہ وحی ان کی تصدیق ہوئی ہے۔

---

[۱] احمد امین: فجر الاسلام ۔ الفصل الثانی الحدیث [۲] احمد امین ۔ ضحی الاسلام ۔ الفصل الرابع الحدیث والتفسیر۔

اندلسی شاعری میں جدید اصناف

از جناب شفیق احمد صاحب ندوی ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اندلسی شاعری کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے بعد[1] یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ اغراض و مقاصد کے لیے وہ ایک زمانہ تک قدیم روایتی انداز پر شاعری کرتے رہے جس میں کوئی جدت وجودت نہ تھی، بعد میں اندلسی عوام اور مغربی ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے دو مستقل نئی اصناف سخن ایجاد کیں، جنھیں زجل[1] اور موشحہ[2] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، زجل اور موشحہ میں نیچرل شاعری اور ذوق جمال کی تسکین کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

زجل — اندلسی لوک گیت کی مخصوص ہیئت | زجل اندلس کی عربی شاعری کی نئی ہیئت ہے جو مسلم اسپین نے اندلسی عوام کے جذبات و احساسات کی رعایت سے ایجاد کی، اس کو ایک طرح سے اندلس کے لوک گیت کی نئی ترقی یافتہ شکل کہہ سکتے ہیں،

زجل کے لغوی معنی ہیں "التطریب و رفع الصوت" (بلند آواز سے گیت گانا)، اصطلاح میں جیسا کہ عرض کیا گیا اندلسی لوک گیت (Folk song) کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، موشحہ کے بعد زجل کی ایجاد عوامی شاعری سے شروع ہوئی، موشحات اور ازجال دونوں اندلسی ہی کی دین ہیں، بے تکلف عامی زبان میں تکلف، صنعت اور فصاحت کا لحاظ رکھے بغیر خوشی اور غمی کے جذبات کے اظہار کے لیے اس کی ایجاد ہوئی، اور مسلم اسپین کے

---

[1] معارف اگست ۱۹۷۴ء

واسد قد ابتلع ثعبان فیہ غلظ ساق
وفتح فمہ بحال انسان فیہ الفواق[1]

(یعنی انگور کے بیلوں سے لدی ہوئی جھونپڑی چبوترہ کے اوپر کس شاندار ادا سے ہے کہ ایک قوی ہیکل شیر کا مجسمہ ہے جو فوارہ کے بجائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سانپ کو نگل رہا ہے، انسان کی طرح منہ کھولے ہوئے ہے، اسمیں ہچکیاں بھی تو ہیں)

نئی بحر اور قوافی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ شعرالطبیعہ کے عناصر جب کے نمایاں اوصاف مناظر فطرت اور مظاہر جمال کی توصیف ہے، ان زجلیہ اشعار میں بھی بخوبی نمایاں ہیں،

"موشحات" (حقیقت و ماہیت) توشیح اندلسی شاعری کی نمایاں صنعت ہے اور نیچرل شاعری (Poetry of Nature) اندلسی شاعری کی جان ہے، جو سب سے بہتر انداز میں موشحات کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

موشحہ خاص اندلس کی ایجاد ہے، جو غنا اور موسیقی کے عوامی ماحول کے اثر سے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں مستقل صنعت بن کر نمودار ہوئی، اس صنعت میں مختلف قوافی ایک خاص ترتیب کے ساتھ بار بار آتے ہیں، کبھی کبھی اس کا وزن بھی عام روایتی اوزان سے مختلف ہوتا ہے، اس کے بعض اجزاء میں عجمی اور عوامی زبان کا استعمال لازمی طور پر ہوتا ہے، غنا سے اس کا خصوصی تعلق ہے، موشحات کے میدان میں اہل مغرب (مسلم اسپین) کی اولیت اور اولویت مسلم ہے، مشرق نے فن توشیح میں انکی تقلید کی، موشحہ کا لفظ وشاح سے ماخوذ ہے، وشاح چمڑے کے اس تسمے کو کہتے ہیں جو

---

[1] عبدالمنعم خفاجہ: قصۃ الادب فی الاندلس ص ۱۲۳ (ملخصاً)

کے آخری دور میں نہایت مقبول رہی، بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ " اندلس کے فطری ماحول نے شعری احساسات کی ترجمانی اور گانے بجانے کی ضرورت نے لوگوں کو موشحات کی طرف مائل کیا، جو بعد میں ادبی انحطاط اور عربوں کے اضمحلال و پژمردگی کے باعث عوامی لب و لہجہ اور لوگ گیت سے متاثر ہوکر ایک مستقل صنف سخن بن گیا جو زجل کے نام سے موسوم ہوا[1]"

پہلے تو ازجال رواج صرف عوام میں رہا، پھر عوامی مقبولیت اور مغربی اثر نے خواص میں بھی اس کی پذیرائی ہوئی اور ایک زمانہ ایسا آگیا کہ اندلس میں عوام سے لیکر خواص تک سب کے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ و وسیلہ بن گئی۔

زجل کا موجد راشد نامی ایک شخص بتایا جاتا ہے، لیکن معمار زجل اور امام الزجالین کی حیثیت سے ابوبکر بن قزمان کا نام مشہور ہے۔ زجل گو شعراء میں مخلف الاسود، ابن جحدر، سہل بن مالک اور ابن الخطیب زیادہ نامور ہیں۔ ایک خاتون حلبہ علیس کا نام بھی زجل گو شعراء میں مشہور ہے۔

عربی زبان کی تمام بحروں سے اس کی بحر یکسر مختلف ہے۔ یہ عربی اور اسپینی بحروں کا ایک عجیب امتزاج ہے۔ قوافی کا البتہ بہت خیال رکھا جاتا ہے، ابن قزمان ایک مرتبہ کسی پارک میں ٹہلنے گیا، وہاں انگور کی بیلوں سے لدی ہوئی ایک جھونپڑی سے اس کی نگاہ پارک کے سنگ مرمر کے ایک خوبصورت اسٹیچو پر پڑی جس کی شکل شیر کی تھی، اس کے منہ سے صاف شفاف پانی کا فوارہ نکل رہا تھا، اسے دیکھ کر اس کے شاعرانہ احساسات جاگ اٹھے اور بے اختیار ایک زجل وجود میں آگئی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

وعریش قام علی دکان بحال رواق

---

[1] احمد حسن الزیات کی تاریخ ادب عربی (مفہوم)

جواہرات سے مرصع ہو، عرب کی عورتیں پرانے زمانے میں اس کو گلوبند کے طور پر پہنتی تھیں، مراد یہ ہے کہ موشحہ الفاظ، قوافی اور مختلف اجزا سے مزین و مرصع ایک ایسی چیز ہے جس سے ادب کے ذوق جمال کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے، جس طرح عورتوں کو مرصع زیورات سے آسودگی جمال کا سامان فراہم ہوتا تھا،

موشحہ کی اصل عربی ہے یا عجمی ؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، ہمیں اس سے زیادہ سروکار نہیں، البتہ اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ موشحہ عربی مسمط اور عجمی غنائیت کا حسین امتزاج ہے، موشحہ کے آخری جز (خرجہ) کے تمامتر عجمی اور عامی بول چال پر مبنی ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عجمیت کی گرفت اس صنف سخن پر نہایت مضبوط ہے،

عموماً موشحہ کا موجد قبرہ کا ایک نابینا شاعر محمد بن حمود قبری بتایا جاتا ہے، بعض لوگ مقدم بن معان قبری کا نام موجد موشحات کی حیثیت سے لیتے ہیں، جو امیر عبداللہ مروانی کے شعراء میں تھا، مگر اتنی بات مسلم ہے کہ نویں صدی عیسوی میں اس فن کی بنیاد پڑ گئی تھی، شروع شروع میں اس کی حیثیت محض سماعی تھی، تفریح طبع کے لیے لوگ کہتے اور آپس میں سنکر محظوظ ہوا کرتے تھے، شاید اس کی حیثیت اس زمانہ میں وہی تھی جو آجکل اردو میں ہزل گوئی کی ہے،

ایک قرطبی شاعر یوسف بن ہارون ابادی نے اس فن کی طرف باقاعدہ توجہ کی اور پھر یہ فن ترقی کرتا ہوا عبادہ بن ماء السماء کے ہاتھوں بام عروج پر پہنچا، جو مروانی خلافت کے آخری دور کا شاعر تھا، مرابطین کے عہد (۱۰۹۵-۱۱۴۹ء) میں بلند پایہ شعراء نے بھی موشحات لکھنے شروع کیے، جن میں ایک نابینا شاعر ابو العباس الاعمی التطیلی کا نام سرفہرست ہے، ابن بقی اس کا معاصر تھا، ان

دونوں میں چشمک رہا کرتی تھی، دوسرے موشحہ نگاروں میں ابن باجہ، ابن قزمان ابوجعفر بن سعید، ابن حزمون، ابن زہر، ابن عربی اور ابن سہل کے نام مشہور ہیں' ابن سہل کے موشحے اپنی لطافت اور شگفتگی میں بے مثال ہیں، ابن الخطیب کا موشحہ اندلس کے اجڑے دیار کے مرثیہ کی حیثیت سے نہایت مقبول ہے جس کا مطلع یہ ہے:

جادك الغيث اذا الغيث همى   يا زمان الوصل بالاندلس

لم يكن وصلك الا حلما   فى الكرى او خلسة المختلس

دور جدید کے مشہور شاعر احمد شوقی نے بھی ایک موشحہ "صقر قریش" اسی نہج پر لکھا۔

عہد موحدین (۱۱۴۵ء - ۱۲۴۸ء) کے خاتمہ کے بعد فن توشیح بھی اندلس میں آخری ہچکیاں لینے لگا، لوگ موشحہ کے بجائے زجل کی طرف مائل ہو رہے تھے، اور ابن خطیب کی کوششوں کے باوجود زوال غرناطہ کے ساتھ فن توشیح پر بھی زوال آ گیا۔ آخری وشاح شاعر ابن زمرک ۱۳۹۳ء کو بتایا جاتا ہے، کیونکہ اب موشحات کی جگہ ازجال نے لے لی تھی،

اسکے بعد مشرق میں ابن سناء الملک، ابن بنیہ ابن یوسف التعفری اور ابن نباتہ وغیرہ فن توشیح کو سینے سے لگائے رہے، چنانچہ آج بھی وہ کسی نہ کسی حالت میں مشرق میں ناپید نہیں ہے، سلیمان بستانی کے موشحات دور جدید کی پیداوار ہیں، مگر ان میں وہ بات کہاں جو غیر تقلیدی موشحات میں پائی جاتی تھی، تاہم فن کے محافظ کی حیثیت سے سلیمان بستانی نے مشرق کا نام روشن کر رکھا ہے، اسکے لیے وہ قابل تعریف ہیں،

موشحہ کا پودا چونکہ گانے بجانے کے عوامی ماحول میں اگا تھا، اس لیے وہ ابتدا میں

غزل، خمریات اور مناظر فطرت کے موضوعات تک ہی محدود رہا، غزل اور خمریات تو مجالسِ عیش و طرب کے لازمی عناصر ہیں، اور قدرتی مناظر کا بیان اندلس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں ہے، حسین و جمیل مناظر، شاداب باغوں، دلکش بہاروں، رنگ پرور فضاؤں، معطر ہواؤں، خوش الحان پرندوں، خوشنما پھولوں، رنگین پھلوں اور چشموں کے تذکروں سے اندلسی شاعری مالا مال ہے، موشح کو خاص طور پر لحن و طرب اور نغمہ و نشاط ہی کے لیے وضع کیا گیا تھا، اس کا دامن ان عناصر سے کیونکر خالی رہتا، ابن اللبانہ کے موشحات میں یہ عناصر بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے موجود ہیں،

موشحات میں معنی آفرینی اور تخیل کی گہرائی نہ تھی، بس سلاست، حلاوت اور موسیقی پر تمام تر توجہ دیجاتی تھی، عوامی خیالات کو عوامی زبان میں مترنم قوافی سے آراستہ کرکے پیش کر دینا ہی کمال سمجھا جاتا تھا، جس سے موشحات میں ابتذال اور رکاکت بھی پیدا ہو جاتی تھی، بعد میں توشیح میں مدحیہ عناصر بھی شامل ہو گئے، غیر درباری شعراء نے نعتیہ لکھے، مدح کے بعد ہجو یہ موشحات بھی کہے جانے لگے، پھر مراثی اور زہدیہ خیالات بھی اسی پیرایۂ بیان سے ادا کیے جانے لگے،

علم عروض کے موجد خلیل بن احمد نحوی نے ۱۵ بحریں ایجاد کی تھیں، اخفش نے سولھویں بحر عربی شاعری کو عطا کی، عموماً ان ہی بحروں کی پابندی ہمیشہ ہوتی رہی لیکن اندلس کے موشحہ نگار آزاد خیال اور ترقی پسند تھے، طرز کہن سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اس لیے اموی سلطنت کے مستحکم ہوتے ہی ہر باکمال شاعر اوزان و بحور میں جدت کا مظاہرہ کرنے لگا، موشحہ کی بحر یکسر جداگانہ ہے، زجل کا بھی یہی حال ہے، یہ انداز آج کی جدید ترقی پسند آزاد شاعری سے بہت کچھ ملتا ہے۔

موشح میں ایک مطلع اور پانچ ابیات ہوتے ہیں، بیت کو اردو محاورے میں بند کہہ سکتے ہیں
ہر بیت کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ دور اور دوسرا حصہ قفل کہلاتا ہے، پھر ہر دور تین
اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اور اسکے ہر جز کو سمط (لڑی) کہتے ہیں، اسی طرح ہر قفل میں دو جز
ہیں اور اسکے ہر جز کو غصن (شاخ) کہا جاتا ہے، آخری قفل کو خرجہ کہتے ہیں جس طرح پہلا قفل مطلع کہلا
موشحات پر "معارف" میں استاد محترم ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ نے ایک طویل و
مقالہ سپرد قلم کیا ہے، مزید وضاحت اور تفصیل کے لیے اس گرانقدر مقالہ کا مطالعہ ضروری

شعرائے اندلس پر ایک اجمالی نظر | جیسا کہ عرض کیا جا چکا مسلم اسپین (اندلس) علوم و فنو
کا مرکز، شعر و سخن کی بزم اور مشرق و مغرب کا سنگم تھا، اس کے ہر شہر کا یہی حال تھا، ابن
ابن زیدون، ابن حزم، ابن خطیب، ابن سہل، ابن اللبانہ، ابن زہر، ابن ہانی
ابن خفاجہ اور ابن زیدون جیسے سینکڑوں باکمال شعراء کی نغمہ سرائیوں سے سا
ماحول گونج رہا تھا، ابن زیدون کو سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے، جو خلیفہ مستکفی کی لڑ
ولادہ کا عاشق تھا جس کی وجہ سے اس کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں، اس
کلام میں واردات قلب اور سوزشِ عشق کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کا کمال بھ
جھلکتا ہے، اس کو ذوالوزارتین (صاحب سیف و قلم) کے معزز لقب سے یاد کیا جا
کیونکہ یہ معتضد عبادی کا امیر فوج اور امیر قرطبہ ابن جہور کا وزیر بھی رہ چکا تھ
ولادہ خود بھی نہایت باذوق و باکمال حسین و جمیل شاعرہ تھی،
ابن قزمان نے زجل کو بلندی عطا کی، یہ ایک جہاں گشت قسم کا شاعر تھ
موشحہ نگاروں میں ابو العباس اعمی تطیلی جیسے شعراء مشہور رہیں،

---

۵ ملاحظہ ہو "معارف" مئی و جون ۱۹۵۳ء (فن توشیح) ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ

اندلسی شاعری کی تاریخ کو عموماً تین مرحلوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

(۱) تقلیدی شاعری (۲) معتدل شاعری (۳) رومانی شاعری

تقلیدی شاعری کا دور ابتدا سے پانچویں صدی ہجری تک رہا تھا، اس ابتدائی دور میں مکمل طور پر مشرق کی تقلید کیجاتی رہی، ابن عبد ربہ، ابن ہانی، ابن شہید، اور ابن دراج قسطلی کا تعلق اسی دور سے ہے۔

دوسرا دور اعتدال و توازن کے ساتھ نئے نئے رجحانات سے استفادہ کا تھا، یہ دور پوری پانچویں صدی ہجری پر محیط رہا، جس میں شعرا تقلید مشرق کے ساتھ ساتھ ماحول مظاہر جمال اور داخلی جذبات و احساسات کو بھی پیش کرنے لگے تھے، اسکے نمایندہ شعراء میں ابن زیدون، ابن عمار، معتمد بن عباد اور ابو العباس اعمی تطیلی کے نام سرفہرست ہیں۔

تیسرا مرحلہ چھٹی صدی ہجری اور اس کے مابعد پر مشتمل ہے، اس دور میں شعرا اپنے ماحول کی مکمل نمایندگی کرنے لگے تھے، جدت وجودت اس دور کا وصف امتیازی ہے، ابن حمدیس، ابن زمرک، ابن عبدون، ابن خفاجہ، ابن سہل اور لسان الدین بن خطیب اس دور کے نمایندہ ہیں۔[۵]

حاصل کلام یہ کہ شعرائے اندلس نے جہاں ایک طرف قدیم طرز کی مشرقی و روایتی شاعری کے موتی لٹائے، مگر اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی، وہیں زجل اور موشحات کے نام سے دو کامیاب اصناف سخن کی بنیادیں ڈالیں، اور اس میں کمال فن کا مظاہرہ کیا، یہ اصناف مظاہر فطرت اور جمال کائنات کی مصوری میں عدیم المثال ہیں، حب الوطنی کے عناصر بھی ان میں موجود ہیں، بحیثیت مجموعی پورے اندلسی ادب کی

---

۵ جودت الرکابی: فی الادب الاندلسی ص ۱۰۵

روح ان کی فطرت پسندی اور نیچرل شاعری میں ہے، موسیقیت اس کا خصوصی جوہر ہے،
اس نئے ادبی موڑ نے تمام مغربی زبانوں کو متاثر کیا، افلاطونی عشق، تخییلیت اور رومان پسندی
میں اندلس کی اس جدید شاعری نے نکھار پیدا کیا، فرانس کی طربیہ شاعری بارہویں صدی تک
علی الخصوص اندلس کی عربی شاعری سے متاثر رہی، جہاں عربی اسلوب کی فخریہ تقلید
کی جاتی تھی، [۱] حقیقت یہ ہے کہ اندلس کے عربی شعراء ہی نے پورے یورپ کو "فطرت پسندانہ
روایات و جذبات" سے روشناس کرایا، مغربی ادب میں "رومانیت" (Romanticis)
کے عناصر کے فروغ میں اندلسی شاعری کی اہمیت مسلم ہے، اس سے انکار ناقدرشناسی
اور کفران نعمت سے کم نہیں۔

چند مشہور اندلسی شعراء | اب ہم چند مشہور اندلسی شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں،

(۱) **ابن حمدیس** ۔ ابو محمد عبد الجبار بن حمدیس صقلی ازدی کا شمار اُن چند باکمال
شعراء میں کیا جاتا ہے، جو فطرت کی تصویر کشی اور مظاہر جمال کی عکاسی میں اپنی مثال آپ
ہیں، وہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں جزیرہ صقلیہ کے مشرقی ساحل سر قوسہ کے
مقام پر ۴۴۷ھ میں پیدا ہوا، اور وہیں نشو و نما پائی، اسلامی تعلیمات، عربی زبان
و ادب اور فنون وغیرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد بچپن ہی سے شاعری کرنے لگا،
یہ ملوک الطوائف کا دور تھا، صقلیہ کی سرسبزی و شادابی، خوشگوار فضائیں، صاف صاف
چشمے، لہلہاتے ہوئے باغات، ہرے بھرے درخت، چہچہاتے ہوئے پرندے اور بھانت بھانت کی
رومی، اندلسی اور عربی تہذیبیں جو وہاں جلوہ گر تھیں، وہ ابن حمدیس کی شاعرانہ صلاحیتوں
کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنیں، سن و شعور کی آنکھیں کھولتے ہی اس نے ملوک الطوائف

[۱] الاسلام والحضارۃ العربیہ : محمد کرد علی ص ۲۳۳

کی اطاعت پر لوگوں کو نازاں، عیش و عشرت کا دلدادہ اور شعروسخن کا شیدا پایا،
ان سب باتوں کا اس کی سیرت وشخصیت پر اثر پڑا، وہ طبعاً مذہبی جذبات اور
بلند اخلاق وسیرت کا مالک تھا، مگر کبھی کبھی ماحول کے تقاضے سے لہو ولعب کی محلفوں
میں نکل جاتا تھا، مگر ان میں گھل مل نہ سکا، وہ صحیح العقیدہ، باوقار وسنجیدہ، نازک مزاج
وحساس، دوررس، محنتی اور پاک دامن شخص تھا، چنانچہ کہتا ہے کہ میں شراب نوشی
کا وصف بیان کرتا ہوں لیکن اسے پیتا نہیں، ٹھیک اس شخص کی طرح جو جنگوں کو
کمانڈ کرتا ہے، مگر خود جنگ کی آگ میں نہیں جلتا،

وآصف الراح ولا اشربها	وهي بالسند وعلى الشرب تدك
كالذي يامر بالكرولا	يصطلى نار الوغى حيث تقو

یہ صقلیہ میں عربی حکومت کا آخری دور تھا، فرقہ بندی اور عیش کوشی نے سلطنت
کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا، چارلس مٹیل نے دوسری ہجری میں عربوں کے بارے میں
کہا تھا" عرب سیلاب کے مانند ہیں، ان کا مقابلہ تم نہ کرو، انھیں تم تھوڑی سی ڈھیل
دیدو، قبضہ پانے کے بعد وہ خود ہی لہو ولعب میں مشغول، اقتدار کی رسہ کشی اور خانہ جنگی
میں مبتلا ہو جائیں گے، پھر تم ان پر غالب آجاؤ گے" یہی بات اس دور پر صادق آتی تھی،
جب نرمنڈیوں نے ابن حمدیس کے وطن صقلیہ پر حملہ کیا تو اس کا شباب تھا،
شاعری بھی کرتا تھا، لیکن اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا، اس لیے وہ نرمنڈیوں
کے حملے اور مظالم کی تاب نہ لا سکا، اسپین کی طرف بھاگ نکلا، اور معتمد بن عباد کے
دربار اشبیلیہ پہنچا، عرصۂ دراز تک بادشاہ کی توجہ سے محروم رہا، دربار میں رسائی
حاصل کرنے کے انتظام میں برسوں لگ گئے، اسی مایوسی اور نامرادی کے عالم میں جب

اشبیلیہ چھوڑ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک قاصد پہنچا اور بادشاہ کی طرف سے
وت نامہ پیش کیا۔ ابن حمدیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ فوراً دربار میں پہنچا، بادشاہ
اس کو بڑے اعزاز سے سمور کی قالین پر بٹھایا اور کہا "یہ کھڑکی جو تمہارے پاس
ہے اس کو کھولو۔ اس نے کھولا تو کھڑکی سے دور اس کو سیسہ کی ایک بھٹی نظر آئی۔
دہک رہی تھی، اس کو جلانے والا کبھی بھٹی کے دونوں پٹ کھولتا اور کبھی ایک
ولتا اور ایک بند رکھتا تھا۔ پھر اس نے مستقل طور پر ایک کو کھول دیا، اور ایک کو
د رہنے دیا، بادشاہ نے کہا اچھا میرے مصرعوں پر جو میں پڑھوں گرہ (تضمین) لگاؤ

انظرھا فی الظلام قد نجما	دیکھو ان دونوں کو اندھیرے میں چمک رہے ہیں
اس پر ابن حمدیس نے برجستہ کہا	
کما رنا فی الدجنة الاسد	یوں جیسے تاریکی میں شیر کی آنکھ دیکھ رہا ہو
دشاہ: یفتح عینیه ثم یطبقها	جو اپنی آنکھیں کھولتا اور موندتا ہے
ن حمدیس: فعل امرئ فی جفونه رمد	بالکل اس شخص کی طرح جس کی آنکھیں آئی ہوئی ہوں
شاہ: فابتزه الدھر نور واحدة	اور پھر گردشِ ایام نے اس کی روشنی چھین لی
ن حمدیس: وھل نجا من ضرره احد؟	اور کیا گردشِ ایام کی زد سے کوئی بچا ہے

اس برجستگی پر بادشاہ بہت خوش ہوا، انعام و اکرام سے نوازا اور اپنا مقرب
الیا، ابن حمدیس عرصہ دراز تک شاہانہ لطف و کرم سے متمتع ہوتا رہا، تاآنکہ یوسف
ن تاشفین نے اشبیلیہ فتح کر کے معتمد کو جلاوطن کر دیا۔ ابن حمدیس بھی اس کے ساتھ
لاوطنی کی زندگی گزارتا رہا، چار سال کے بعد معتمد فقر و فاقہ میں مبتلا ہو کر مرگیا تو ابن حمد
رنقیہ کے دارالسلطنت مہدیہ پھر وہاں سے میورقہ چلا گیا، جہاں اندھا ہو کر تنگدستی

و مفلسی کی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گیا،

ابن حمدیس کی شاعری | فنی لحاظ سے ابن حمدیس کی شاعری کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے

(۱) صقلیات (۲) وصفیات (۳) اخلاقیات

صقلیات سے مراد وہ قصائد ہیں جنھیں ابن حمدیس نے حب وطن کے سچے اور فطری جذبات و احساسات کو پورے جذب و شوق کے ساتھ بیان کیا ہے، ان ہی میں وہ مراثی بھی ہیں جو اس نے اپنی بچی اور اپنی باندی جوہرہ کی موت پر کہے تھے، اس کے ایک ہمعصر شاعر (ابو الوطن الصقلی) نے کہا تھا "چونکہ میری اصل (نژاد) زمین کی مٹی سے ہے لہذا تمام روے زمین پر میرا وطن اور تمام زمین پر بسنے والے لوگ میرے اقربا ہیں"

اذا کان اصلی فی التراب نکلها بلادی وکل العالمین اقاربی

ابن حمدیس اسکے خلاف تھا، وہ وطن کی محبت کو ایک مثالی محبت قرار دیتا ہے، وہ حب وطن کا دم بھرتا ہے اور کہتا ہے کہ محبوب کسی ہرن کے بچہ کی طرح ہے، میں برابر اسکے عشق میں سرشار رہتا ہوں، اس کی جائے قیام کی طرف میری کشش کا عالم یہ ہے کہ جیسے وہی میرا وطن ہو جہاں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ؎

ے شاأحن الی هواہ کانہ وطن ولدت بأرضہ ونشیت

وصفیات | ابن حمدیس کی توصیفی شاعری کا جواب نہیں، شعرا لوصف میں اکثر قطعات ہیں، اور لمبے قصائد اکثر خمریات کی توصیف اور داخلی جذبات کے اظہار سے متعلق ہیں، اس ذیل میں کئی چیزوں کا وصف اس نے بیان کیا ہے:

(ا) نیچر (طبیعہ) کا وصف (ب) جنگ و جدل کا وصف (ج) خمریات کا وصف

نیچر کی تصویر کشی:-

نثر الجو على الأرض برداً أيّ دُرٍّ لنحورٍ لو جمد

فضا نے زمین پر اولے بکھیر دیے، کیسے شاہوار موتی ہیں، اگر جم جاتے تو حسین گردنوں کی زینت بنتے۔

اخلاقیات | اخلاق و حکم کی شاعری میں دو قسم کے خیالات ہیں: (الف) زہدیہ (ب) دانائی و دانشوری کی باتیں۔

ابن حمدیس بڑا برجستہ گو، قادر الکلام، فطرت نگار شاعر تھا، اس کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہے جس میں دلکش تشبیہات و استعارات کے پردے میں معانی آفرینی کے لعل و گہر پائے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ ابو العتاہیہ کی زہدیہ شاعری سے بہت متاثر تھا، بحتری کا غنائی رنگ اور متنبی کا تفلسف بھی اسکے یہاں کچھ کم نہیں ہے، وہ اکثر بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بچپن کی بے فکریوں، شباب کی رنگینیوں، پھر گردش ایام کی سرد مہریوں اور بڑھاپے کی تلخیوں کو موثر انداز میں بیان کرتا ہے، درمیان درمیان میں عبرت آموز باتیں بھی آتی رہتی ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زہد و تصوف سے ابن حمدیس کا کوئی تعلق نہ تھا، صرف محض "برائے شعر گفتن" یا برائے بیت اس کو ظاہر کرتا تھا، لیکن مشہور نقاد عبد المنعم خفاجہ نے اپنی کتاب قصۃ الادب فی الاندلس میں اس کی تردید کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ اس کا مقصود جولانی طبع اور تفنن خیال نہ تھا بلکہ واقعۃً وہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا، ورنہ اس کے کلام میں یہ تاثیر پیدا نہ ہوتی، بینائی زائل ہونے کے بعد ابن حمدیس کی وصفیہ شاعری بام عروج پر پہنچ گئی، بسا اوقات غریب و نامانوس الفاظ بھی لے آتا ہے، لیکن ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے سیل رواں میں سنگ ریزے۔ شریف رضی اسکے پچاس سال پہلے کا

شاعر ہے، اس کے یہاں روانی وسلاست زیادہ ہے لیکن محسوسات کو معقولات اور معقولات کو مجسم (Persons) شکل اور دلکش انداز میں پیش کرنے کی جیسی مثالیں ابن حمدیس کے یہاں ہیں شریف کے یہاں نہیں ہیں، بے شبہ ابن حمدیس فکر انگیز وجدانی ونفسیاتی خیالات کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے، اسکے کلام میں واقعیت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ خوشی، غمی، حیرت وشک، امید وبیم، رنجش والتفات اور راز ونیاز کے احساسات وتخیلات ایسے بلیغ اسلوب میں موجود ہیں جس سے ہمارے فکر وشعور کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھتا ہے [1]

(۲) **ابن سہل**: مسلم اسپین کے یہودی مستعربین میں ابواسحٰق ابراہیم بن سہل اشبیلی کا نام انتہائی نمایاں ہے۔ ابن سہل کی ولادت ۶۰۹ھ میں موحدین کے زمانہ میں اشبیلیہ میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی، یہ خلیفہ منصور کے لڑکے ابوعبداللہ محمد الناصر کی خلافت کا دور تھا۔

الفنس ہشتم اور اس کی اسپینی فوجوں کے ہاتھوں موحدین کی پسپائی ابن سہل نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، اور اسی ہنگامہ خیز ماحول میں اس نے شباب کی منزلیں طے کیں، اس زمانہ میں اشبیلیہ لہو ولعب اور موسیقی وغنا کی خود فراموشیوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ سیاسی انقلاب اور گردش ایام بھی اس کو ہوشیار نہ کرسکے ابن سہل بھی اس ماحول سے متاثر ہوا، اس دور کے یہودی بھی عربی زبان و ادب کی تعلیم وتدریس کی طرف متوجہ اور اسلامی تمدن میں رنگے ہوئے تھے، صاحب نفح الطیب کی روایت کے مطابق ابن سہل نے کہا:

---

[1] مقدمہ دیوان ابن حمدیس: ڈاکٹر احسان عباس (ملخصاً) مطبوعہ بیروت

اموسی، أتیا ببعض وکل حقیقة ولیس مجاز اقولی الکل والبعضا

(اے موسیٰ کہ جو نہ صرف میری شخصیت کا حصہ ہو بلکہ حقیقۃً میرا جسم اور میری جان ہی ہو، اور یہ بات مجازاً نہیں کہی جارہی ہے)

یہ شعر ابن سہل کی حضرت موسیٰؑ سے عقیدت کا ثبوت ہے، لیکن ابن حبان کا خیال ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ موسیٰ ایک یہودی کا لڑکا تھا جس سے ابن سہل کو محبت تھی، ان کے الفاظ میں اکثر شعرہ فی صبی یھودی کان یھواہ وکان اسمہ موسیٰ بن عبد الصمد۔ اس کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کیے ہیں،

هتف الناعی بشجو الابد اذ نعی موسی بن عبد الصمد

ما علیھم، ویحھم لو دفنوا فی فوادی قطعة من کبدی

جب موت کی خبر دینے والے نے موسیٰ بن عبد الصمد کی موت کی خبر دی تو گویا دائمی غم والم کی خبر دی، کاش وہ میرے جگر کے ٹکڑے کو میرے دل میں دفن کرتے۔

صاحب فوات الوفیات نے اس کے اسلام کے ثبوت میں اس کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جو اس نے موسیٰ اور محمد دو نوجوانوں کی مدح میں کہے تھے،

ترکت هوی موسی لحب محمد ولولا هوی الرحمن ما کنت اهتدی

یعنی موسیٰ کی محبت کو محمد کی محبت کی وجہ سے ترک کردی، اور اگر رحمن (اللہ) کی طلب نہ ہوتی تو میں راہ یاب نہ ہو پاتا۔

اس کے بعد کہتا ہے :-

وما عن قلی منی ترکت، وانما شریعة موسی عطلت بمحمد

اور اس پر میں مورد عتاب نہیں ہوسکتا کیونکہ محمد کی شریعت نے موسیٰ کی شریعت کو معطل کردیا ہے

ابن سہل نے عربی علوم کی تعلیم ابوعلی شلوبین ابوالحسن دباج جیسے جلیل القدر اشبیلی علماء سے حاصل کی، مسلمانوں سے میل جول اور علمی ادبی تعلقات کی بنا پر ابن سہل جلد ہی عربی زبان و ادب کا ماہر بن گیا۔ شعر و سخن کے میدان میں بڑی ناموری حاصل کی۔ اس کی شاعری کی ابتدا کا یہ واقعہ بتایا جاتا ہے کہ مشہور شاعر ہیثمی ایک بار شاہ اندلس متوکل علی اللہ کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش تھے کہ اتنے میں ابراہیم بن سہل نامی ایک بچہ نے بھرے دربار میں کہا "جناب والا — فلاں شعر کے بعد اگر آپ یہ شعر بڑھا دیتے تو قصیدہ میں چار چاند لگ جاتے۔"

أعلامه السود اعلام لسوؤدد   کا نهن بخذ الملك خيلان

ہیثمی نے پوچھا "یہ شعر ہے کس کا؟" بچے نے جواب دیا "میرا ہے میں نے ابھی کہا ہے" سب لوگ اس برجستہ گوئی و ذہانت اور اصلاح و اضافہ پر نہایت مسرور و متاثر ہوئے۔ ہیثمی نے کہا "خدا کی قسم اگر یہ بچہ زندہ رہ گیا تو اندلس کا سب سے بڑا شاعر ہو کر رہے گا۔ (واللہ ان عاش ھذا لیکونن اشعر اھل الاندلس)"

ابن سہل کے مذہب کا معاملہ ابھی تک مختلف فیہ ہے۔ المقری صاحب نفح الطیب نے عبداللہ بن مرزوق سے روایت کیا ہے کہ ابن سہل کی موت اسلام پر ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ محض ظاہری طور پر اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے مذہب سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا للناس ما ظهر ولله ما استتر (اندر کی بات اللہ جانے لوگوں کو تو وہی بات ماننی چاہئے جو ظاہری طور پر ہو) ایک مرتبہ والی اندلس نے یکساں مفہوم کے تین اشعار سنا کر کہا پہلے شعر میں عربی شہزادے، دوسرے میں عربی شاعر اور تیسرے میں کسی یہودی اور

کی نفسیات کی جھلک ظاہر ہے اور ہر ایک کا ظرف رنگ الگ نمایاں ہے۔
ق سے معلوم ہوا کہ تینوں اشعار علی الترتیب امرء القیس، متنبی اور ابن سہل کے تھے
یف اسلامی تعلیمات کی روح اس کے کلام میں نمایاں ہے۔ اس کا مشہور عینیہ قصیدہ
ت رسولؐ، ذکر الٰہی، قافلۂ حجاج کی روانگی اور مناجات رسولؐ کی تنویر سے منور ہے۔
لکھتا ہے:

اد مناجاۃ ا لنبی محمد تنتم بھا مسکا علی الشم ذائعاً

اس قصیدہ میں اس نے یہ تمنا بھی ظاہر کی ہے کہ کاش اس کا جسم نہیں تو دل ہی
لہ حجاج کے ساتھ خانۂ کعبہ تک رسائی حاصل کرتا۔ یہ قصیدہ چونکہ اس نے چالیس
ل کی عمر کے بعد لکھا تھا۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ آخر میں ضرور مشرف بہ اسلام
لیا ہوگا۔

وہ اندلسی الاصل ہونے باوجود عربی اندلسیت پر بھی فخر کرتا ہے، اس کے
ام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اندلس میں عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حامی تھا، چنانچہ
ب لادن اور قشتالہ کی حکومتوں نے متحدہ محاذ بنا کر ۱۲۴۵ء میں اشبیلیہ پر حملہ کیا
ر اڑھ سال کے سخت محاصرہ کے بعد اسکو فتح کر لیا تو ابن سہل نے ایک بڑا پر زور قصیدہ
ا جس میں عربوں کی غیرت وحمیت کو ان الفاظ میں ابھارا ہے۔

یا معشر العرب الذین توارثوا شیم الحمیۃ کابراً عن کابر
ان الالہ قد اشتری ارواحکم بیعوا ویھنکم ثواب المشتری
انتم احق بنصر دین نبیکم وبکم تمھد فی قدیم الاعصر

رے قوم عرب جسکو غیرت وحمیت نسلاً بعد نسل ورثہ میں ملی ہے، خدا نے تمہاری روحوں کو

خرید لیا ہے اسکو بیچکر مشتری اسکا ثواب حاصل کرو تم پر اپنے نبی کی دین کی مدد کا
زیادہ حق ہے، اور پہلے زمانہ میں بھی تم ہی سے اسکو تقویت حاصل ہوئی ہے۔

جب اسپینی اشبیلیہ پر قابض ہو گئے تو وہ اشبیلیہ چھوڑ کر والی سبتہ ابن خلاص سے وابستہ ہو گیا۔ اور تقریباً چالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ کی عمر میں ۱۲۵۱ء مطابق ۶۵۰ھ) میں ڈوب کر مرا۔

ابن سہل کے کلام میں رقت، سلاست اور عجز و مسکنت بے کسی و بے بسی کے جذبات زیادہ ہیں اسی لئے بعض اہل مغرب کا قول ہے کہ اس کے کلام میں عشق اور یہودیت دونوں کی ذلت و مسکنت جمع ہو گئی ہیں، (اجتمع فیہ ذل العشق وذل الیھودیۃ) مگر وہ اندلس کے چند بڑے موشحہ نگاروں میں ہے۔ یوں تو اس نے غزلیات بھی کہی ہیں، مگر موشحات میں اس کا پایہ بہت بلند ہے، اسکے بعض قصائد و موشحات تو گویوں میں زبان زد ہیں۔ جس سے اسکے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، مقری اور ابن الخطیب جیسے اہل علم نے اس کے کلام پر توجہ کی ہے۔
دوسری خصوصیات کے ساتھ وصف الطبیعۃ (فطرت کی روح کی پوری ترجمانی) اسکے کلام میں پوری موجود ہے اور آیات قرآنی سے استفادہ اور صنائع و بدائع سے بھی اس کا کلام معمور و مزین ہے۔[1]

(۳) ابن بقی:۔ ابن بقی جس کا نام یحیٰی تھا۔ قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اسکی وفات ۵۴۰ھ میں قرطبہ ہی میں ہوئی۔ تاریخ ولادت کا ذکر کتابوں میں نہیں ہے یہ دور مرابطین کا عظیم المرتبت موشحہ نگار تھا۔ اس کے موشحات نے مشرق سے

---

[1] مقدمہ دیوان ابن سہل (بیروت)، بطرس البستانی (ملخصاً)

ظفرنامۂ اکبری المعروف بتاریخ خاندانِ تیموریہ مسمّیٰ بتیمور نامہ

(عہدِ اکبری کا ایک مصور نسخہ)

از جناب سید منظر حسین شاہ صاحب علیگ

(۲)

"تاریخ الفی" نہ ہونے کا تاریخی ثبوت۔

۱۔ مسٹر بیورج کا خیال ہے کہ اس نسخہ میں "تاریخ الفی" کی جھلک موجود ہے!

۲۔ ڈاکٹر کلیم الدین احمد پروفیسر شعبۂ تواریخ پٹنہ یونیورسٹی بھی اسے "تاریخ الفی" کی تیسری جلد تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن میری تحقیق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ خیال غلط ہے، اس کے برعکس خود ظفرنامہ (اکبری) کی جھلک "تاریخ الفی" میں موجود ہے اور وہ "تاریخ الفی" کے مأخذوں میں سے ایک مأخذ ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں۔ (الف) "تاریخ الفی" کی تیسری جلد چنگیز خاں متوفی ۶۲۴ھ کے حالات سے لے کر ۹۹۷ھ عہد اکبری تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور زیر بحث نسخہ ۷۳۴ھ یعنی امیر تیمور کے حالات سے لیکر ۲۲ سنہ جلوس مطابق ۹۸۴ھ عہد اکبری کے حالات تک ہے۔

اگر یہ "تاریخ الفی" ہے تو کیا وجہ ہے کہ ۶۲۴ھ سے ۷۳۴ھ تک اور آخر کے ۹۸۴ھ تا ۹۹۷ھ تک حالات یعنی تیرہ سال کے واقعات نظرانداز کر دیئے گئے؟

"تاریخ الفی" ۱۰۰۰ھ میں مکمل ہوئی۔[1]

زیر بحث نسخہ پر ۳۰ سنہ الٰہی کی ایک عرض داشت

[1] منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی۔

اس بات کی شاہد ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں تاریخ الفی کی تیسری جلد کی تکمیل سے پانچ سال قبل ہی ظفر نامہ اکبری کا یہ نسخہ مصور ہو کر بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا جا چکا تھا۔

رزم نامہ۔ اور ظفر نامہ (اکبری) کو مصور کئے جانے کا حکم دسونت، بساون اور لعل کو ۲۶ جلوس یعنی ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں ملا[1]

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ظفر نامہ (اکبری) تاریخ الفی کی تیسری جلد کی تکمیل (۱۰۰۵) سے بارہ[12] سال قبل یعنی ۹۹۳ھ میں تصنیف ہو چکا تھا اور اس کے مصور کئے جانے کا حکم بھی مل چکا تھا۔

اس عہد کی تاریخوں میں تاریخ الفی ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے تین حصے ہیں اور تیسری جلد اس نسخہ سے کچھ مطابقت بھی ضرور رکھتی ہے۔ مگر میں نے جن حقایق کو اوپر درج کیا ہے۔ اس سے یہ پوری طرح واضح ہو گیا کہ تاریخ الفی کی مدد سے زیر بحث نسخہ نہیں لکھا گیا۔ بلکہ خود اس کی مدد سے تاریخ الفی کی تیسری جلد لکھی گئی۔ اور اسی سے ظفر نامہ (اکبری) کی ترتیب کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے۔

دو مصور ورق | دلی آرٹ نمائش ۱۹۴۸ء میں دو مصور ورق تاریخ الفی کے نام سے پیش ہوتے تھے[2]

لیکن مولانا آزاد نے اپنے مضمون میں ان اوراق کی ملکیت درج نہیں کی ہے اس لیے موازنہ کرنے میں یہ دشواری پیش آ رہی ہے کہ واقعی وہ اوراق تاریخ الفی کے تھے۔ یا زیر بحث نسخہ کے علاوہ اوراق تھے جو مہمات گجرات ۱۸ جلوس کے بعد غائب

[1] مغل تہذیب ص ۹۵ محبوب اللہ مجیب [2] ماہنامہ آجکل ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

ہو گئے تھے۔[1]

لیکن خدا بخش کی اس تحریر" از تغیرات زمانہ باین حقیر رسید" سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نادر شاہی اور مرہٹہ کے حملوں، یا ۱۸۵۷ء کے موقع پر دہلی اور لکھنؤ کی وکٹوریہ اسٹریٹ پر جس طرح کتابوں کا ڈھیر بکھیر دیا گیا تھا۔ اور ان کی جلدیں بھی توڑ دی گئی تھیں اس طرح اس قسم کے کسی حادثہ میں اس کتاب کی جلد بھی توڑ دی گئی تھی، حوادث زمانہ کے ہاتھوں زیر بحث نسخہ خدا بخش خان لائبریری تک پہنچا۔ اور دو ورق کسی اور کوملے جو دہلی نمائش میں "تاریخ الفی" کے نام سے پیش کیے گئے۔

"تاریخ الفی" کے مصنفین | اس کے مصنفین میں سے ایک جعفر خان بیگ بھی ہیں۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ "ملا احمد ٹھٹھوی نے ۳۶ سنہ رحلت سے لے کر چنگیز خاں کے حالات تک دو جلدیں ہی لکھی تھیں۔ کہ لاہور کی گلیوں میں مرزا فولاد برلاس نے اسے قتل کر دیا تو اس کتاب کی تکمیل کا کام جعفر بیگ آصف خان کے سپرد کیا گیا، اس نے چنگیز خاں سے لے کر ۹۹۷ھ م ۱۵۸۹ء تک کے حالات قلم بند کئے، پھر بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ جو جلدیں ملا ٹھٹھوی نے لکھی ہیں اس پر ملا بدایونی نظر ثانی کریں اور جعفر بیگ اپنی تصنیف کردہ تیسری جلد خود نظر ثانی کریں۔ اس نسخہ کا دیباچہ ابو الفضل نے تحریر کیا۔

---

[1] غدر دہلی کے حالات میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دست مبارک کے نوشتہ کلام پاک کے چند اوراق پریشاں دستیاب ہوئے۔ اس پر شاہجہانی تحریر بھی موجود ہے اور اس کی فوٹو کاپی بھی شائع کی گئی۔ اسکی جلدوں کو سونے کے حسین کام ہونے کی بنا پر بیچ دیا جاتا تھا۔ اور کتابیں پھینک دی جاتی تھیں" ——— ٹھیک اسی طرح ایک ساہوکار نے پچاس ساٹھ برس قبل ایک حمائل شریف ۱ ۲ × ۳ ۱/۲ جس کے صفحات پر سونے کا بڑا حسین کام ہے بہت باریک چکنا غذ ہے کتب خانہ پیر دھڑیا چھاگلپور بھیج دیا تھا اسکے لوح پر کوئی مہر نہیں لیکن یہ نسخہ عہد اکبری یا جہانگیری معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح "تاریخ الفی" کا کام جسے ۹۹۰ھ میں ملا احمد ٹھٹھوی نے شروع کیا تھا۔ ۱۰۰۵ھ یا ۱۰۱۵ھ رحلت میں مکمل ہوا۔[1]

اس لئے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تاریخ الفی کی تیسری جلد کا مصنف جب آصف خان جعفر بیگ ہے۔ تو اس نسخہ کا مرتب بھی وہی ہے۔

نسخہ کے مرتب آصف خان (ثالث) کے حالات زندگی | مرزا قوام الدین جعفر بیگ قزوینی آصف خان (ثالث) المتخلص بہ جعفر ایران کے شہر قزوین میں ۹۴۸ھ م ۱۵۴۱ء میں پیدا ہوا۔ [اس طرح اکبر شاہ سے ایک سال چھوٹا تھا] یہ مرزا بدیع الزماں کا لڑکا تھا، اور اپنے دادا آغا ملا دولت دار کی طرح شاہ ایران طہماسپ سے منسلک تھا۔ ۲۲ سنہ جلوس اکبری یعنی ۹۸۴ھ م ۱۵۷۶ء میں اپنے حقیقی چچا غیاث الدین علی بیگ آصف خان (ثانی) کے توسط سے سرکاری ملازمت میں بہ عمر چھتیس سال داخل ہوا۔ لیکن بستی [۲۰ ماہانہ] جیسی قلیل تنخواہ کی بنا پر، مظفر خان کی ملازمت میں بنگال چلا گیا۔ پھر ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں فتح بنگالہ کے فوراً بعد دارالسلطنت واپس آ گیا۔

۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء تا ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء تک اس کے حالات نہیں ملتے، یہ وہی دور ہے جس میں اکبر کی قدر شناس نگاہیں اس کی قیمت پہچان چکی تھیں اسلئے اپنے چچا غیاث الدین آصف خان (ثانی) المتوفی ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء کے خطاب آصف خان سے ۳۰ سنہ جلوس اکبری میں نوازا گیا۔ اور میر بخشی کے عہدے پر دو ہزاری کے منصب دار کی حیثیت سے مامور ہوا۔ چھ سال کے عرصے میں بستی [۲۰ ماہانہ] کے ایک ملازم کا دو ہزاری منصب پر پہنچ جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دفعہ میں اس نے ضرور کوئی بڑا کارنامہ

[1] منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی

انجام دیا ہوگا۔ یہ کارنامہ "ظفر نامہ" (اکبری) کی ترتیب تھی۔ جس نے اسے اتنی بلندی پر پہنچا دیا۔

۱۰۱۳ھ میں جہانگیر کی بغاوت کے بعد بہار کا گورنر بھی رہا، اور عہد جہانگیر ۱۰۲۱ھ پنج ہزاری کے منصب پر پہنچ کر برہان پور میں ۶۰ سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔

ممتاز محل اور شایستہ خاں کا حقیقی چچا زاد بھائی تھا۔ جہاں گیر نے شہزادہ پرویز کی اتالیقی بھی اس کے سپرد کی تھی۔

تزک جہانگیری میں ہے ــــــ "آصف خان قابل اور ذہین انسان تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔ اس نے خسرو پرویز کا قصہ منظوم کرکے میرے نام (نور الدین) کی مناسبت سے مثنوی "نور نامہ" سے موسوم کیا۔"

آصف خان طبعاً ذہین، فن ریاضی اور معاشیات میں مہارت کے ساتھ کھیتی باڑی اور باغبانی کا بڑا دلدادہ تھا۔ عقیدۃً آزاد مشرب تھا۔ چنانچہ دین الٰہی کے اٹھارہ حواریوں میں سے ایک اور اکبر کا ہم عمر مصاحب اور منہ چڑھا تھا۔ تاریخ نویسی کے علاوہ شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ــــــ شاعری میں اس کی طبیعت نہایت موزوں تھی۔ لیکن اچھی شاعری کی مشق کم تھی۔

آئین اکبری کا بیان ہے کہ تاریخ نویسی کرتا تھا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ایک ہی کتاب نہیں بلکہ متعدد کتابیں فن تاریخ پر لکھی ہونگی۔

ایک سوال اور اس کا جواب، یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابوالفضل اور بدایونی نے اس کی تصانیف میں ظفر نامہ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

اس جواب یہ ہے کہ یہ نسخہ "ظفر نامہ (اکبری) کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ بلکہ چند کتابوں کے اقتباسات اور شاہی واقعہ نویس کے درج کردہ، واقعات اکبری کا ایک باتصویر مجموعہ ہے۔ اسی لئے ان دونوں نے اس نسخہ کو اس کی تصنیف کی فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس نسخہ میں حسب ذیل کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ ظفر نامہ شرف الدین علی یزد جس پر ۱۲ تصویریں ہیں۔ (اس کے اقتباسات باب اول ۱ سے لیکر باب ۱۰ تک ہیں۔)
بابر نامہ یا تزک بابری کے اقتباسات ۳۵ اوراق پر مشتمل ہیں۔ جس میں نو ۹ تصویریں ہیں۔
ہمایوں نامہ اور تذکرۃ الواقعات کے اقتباسات ۲۲ اوراق پر مشتمل ہیں جن میں تین تصویریں ہیں
عہد اکبری کے واقعات :- ۴۳ اوراق پر مشتمل ہیں جس میں ۸ تصویریں ہیں۔
اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ظفر نامہ (اکبری) کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ظفر نامہ (علی یزد) بابر نامہ ہمایوں نامہ وغیرہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے۔ جس کے ۴۰٪ فیصد اوراق اور ۴۰٪ فیصد تصاویر، ظفر نامہ (علی یزد) کے اقتباسات کے عکاس ہیں۔ لہذا اس کا نام بھی خاندانی روایت کے تحت "ظفر نامہ" ہی رکھ دیا گیا کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام اس نسخہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔

اکبر نے ۱۵۸۶ء میں ظفر نامہ۔ اور رزم نامہ" مصور کرنے کا حکم۔ دسونت، بساون اور لعل کو دیا[۱]

اور ۱۵۸۴ء تا ۱۵۸۸ء کے درمیان "رزم نامہ" [مملوکہ پوتھی خانہ جے پور

---

[۱] مغل تہذیب ص ۵۶

جس میں ۱۹۵ تصاویر ہیں] مصور ہوا۔[۵۱]

جب ۱۵۸۰ء میں "ظفر نامہ" اور "رزم نامہ" دونوں کے مصور کئے جانے کا حکم دسونت وغیرہ کو ملا۔ اور ۱۵۸۲ء تا ۱۵۸۶ء میں رزم نامہ "مصور ہوا۔ تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ "۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۲ء[۵۲] کے درمیانی وقفہ میں "ظفر نامہ" بھی مصور کیا گیا ہے۔"

"رزم نامہ" کی طرح اس میں بھی تصاویر ہیں۔ جن کی موجودہ تعداد ۱۲۳ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین تصاویر اور بھی رہی ہوں جو عہد اکبری کے دو تین سال کے گم شدہ واقعات کی اہم کڑیاں ہوں۔

اس نسخہ میں دسونت کی بنائی ہوئی صرف پہلی تصویر ہے۔ کیونکہ ۱۵۸۱-۸۲ء میں دسونت کو دارالضرب [Mint] میں خواجہ عبدالصمد کے ہمراہ کر دیا گیا تھا۔ اور اس نے ۱۵۸۵ء میں خودکشی کرلی تھی اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۱ء میں ظفر نامہ کو مصور کیا جانے لگا تھا۔ اور وہ ۱۵۸۵ء سے قبل ہی مکمل ہوچکا تھا۔

اے، ایل سریواستو کی رائے کے مطابق۔[۵۳] ۱۵۸۴-۹۹ء کے دوران ظفر نامہ" دیگر

---

[۵۱] راجپوت مصوری ص ۳۶ ماہنامہ آجکل ماہ اگست ۱۹۸۰ء The art

[۵۲] The art of Painting P117-22

[۵۳] میں سریواستو تحریر کرتے ہیں۔ کہ اکبر نے دارالسلطنت of Painting 117-22 لاہور میں چودہ[۱۴] سال تک قیام کیا۔ اسی زمانہ میں زیادہ تر مصور کتابیں شاہی کتب خانہ کے لئے تیار کی گئیں ـــــ ان میں سے چند کتابیں آج بھی محفوظ ہیں مثلاً بابر نامہ، خمسہ نظامی، نفحات الانس، بہارالحیات، داراب نامہ، تاریخ الفی، تاریخ رشیدی اور ظفر نامہ۔

کتابوں کے ساتھ دارالسلطنت لاہور میں مصور ہوا۔

مسٹر ایس اینِ سکہ[1] کا بیان ہے کہ" ان کتابوں کے مصوروں میں بساون لال مکند، کیشو، فرخ چیلہ، جگن ناتھ، دھرم داس، مسکین، مہیش، نند گوالیاری، سن دا (سنو لال) شنکر، مادھو، لچھمن اور اننت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـــــ یہ صحیح ہے کہ یہ تمام مصور" ظفر نامہ" میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس نسخہ کی پہلی تصویر دسونت کی بنائی ہوئی ہے۔ اور مسٹر سکہ کا نام اس فہرست میں نہیں لکھا ہے کیونکہ وہ ۱۵۸۰ء میں ہی دارالضرب سے منسلک ہوچکا تھا۔ اور ۱۵۸۵ء میں خودکشی کرلی

ان دونوں بیانات کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ ظفر نامہ کو مصور کئے جانے کا کام ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں ہی شروع ہوچکا تھا۔ لیکن مسٹر اے۔ ایل سریواستو نے دیگر مصور کتابوں کے ساتھ اس مصور نسخہ کا تذکرہ صرف اس لیے کیا اس کا کام جو باقی رہ گیا ہوگا۔ ۱۵۸۴ء میں ختم ہوا۔

اس لیے ہم اس نسخہ کی مصوری کا دور ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۹۹۲ھ / ۱۵۸۴ء تسلیم کرتے ہیں یہی زمانہ سنہ کتابت کا بھی ہے۔ کیونکہ کتابت اور تصاویر سازی کا کام ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اور کتابت کی ابتدا ۱۵۸۰ء میں دارالسلطنت اکبرآباد (آگرہ) میں ختم ۱۵۸۴ء دارالسلطنت لاہور میں ہوئی۔

کتب خانہ خدابخش میں موجود عہد اکبری کے چند نسخوں کے مقابلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زیر بحث نسخہ کا کاتب مولانا باقر ہے[2]۔ کیوں کہ اس کا کتابت شرح القانون جلد دوم کا ایک نسخہ [Cat, IV, No 29] زیر بحث

---

[1] محراب ڈائجسٹ ۱۹۶۹ء

[2] مولانا باقر بن ملا میر علی کا ذکر آئین اکبری نے کاتبین اکبری میں بھی کیا ہے۔

نسخہ کے رسم الخط سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس نسخہ کی لوح پر مولانا باقر کا دستخط بھی ثبت ہے۔

خلاصۃ البحث :-

نام کتاب :- ظفرنامہ (اکبری)

نام مرتب :- مرزا قوام الدین آصف خان جعفر بیگی المتخلص بہ جعفر متوفی سنہ ۱۰۲۱ھ،

سنہ تصنیف :- سنہ ۲۶ جلوس اکبری سنہ ۹۸۸ھ مطابق سنہ ۱۵۸۰ء

سنہ مصوری :- سنہ ۲۶-۳۰ جلوس مطابق سنہ ۹۸۸-۹۲ھ / ۱۵۸۰-۸۴ء

اختتام سنہ کتابت :- سنہ ۹۹۲ھ مطابق سنہ ۱۵۸۴ء (لاہور)

نام کاتب :- مولانا باقر بن ملا میر علی۔

ماخذ :- (۱) ظفرنامہ۔ شرف الدین علی یزدی (۲) بابرنامہ [تزک بابری]
(۳) ہمایوں نامہ گلبدن بیگم، تذکرۃ الواقعات، جوہر آفتابچی، [اور اس
زیر بحث نسخے کے اقتباسات "تاریخ الفی" کی تیسری جلد میں نقل ہیں]

مصور :- اس کی مصوری میں گیارہ مسلمان اور اڑتالیس ہندو مصوروں نے
حصہ لیا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ یعنی پندرہ تصویریں بساون کی بنائی ہوئی ہیں۔
آئین اکبری میں درج شدہ ۱۷ مصوروں میں سے میر سید علی، خواجہ عبدالصمد،
مہیش اور ہری بانس کے نام تصاویر پر نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی تیرہ
نام اور موجود ہیں۔

کاغذ :- چکنا، دبیز اور بادامی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیمائش :- تخمیناً ۱۸ انچ لمبی اور ۱۲ انچ چوڑی -

جلد :- موجودہ سرخ چمڑے کی جلد بعد کی تیار کردہ معلوم ہوتی ہے۔

قیمت :۔ عرضداشتوں میں ایک سو اکاون (۱۵۱) مہر قیمت درج ہے۔ دوسری جگہ آٹھ ہزار روپیہ ہے۔ اس طرح آج ۸۰۰۰ روپیہ مغلیہ یا ایک سو اکاون (۱۵۱) مہر اکبری کے حساب سے ۱۹۷۴ء کے نرخ سے اس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔

ملاخطات :۔ شاہان مغلیہ اور حکام انگریزی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم، رویندر ناتھ ٹیگور، سر سی، وی، رمن، گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم وغیرہ کے علاوہ سیکڑوں ادیب، عالم، تاریخ دانوں اور محققین نے اس نسخہ کو ملاخطہ کیا ہے۔

گذشتہ سالوں کے معارف کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

رسالہ معارف علوم و معارف کا گنجینہ، اور مغربی و مشرقی علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اسکی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، کیمبرج یونیورسٹی کے مشرقیات کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے جو مثنوی مولانائے روم کے مترجم بھی ہیں اور فارسی مکتب زبان کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اسکے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و معارف کی آمیزش کی بارہا داد دی ہے، اس رسالہ کا اچھا ذخیرہ ہمارے مکتبہ میں جمع ہو گیا ہے بعض بعض سالوں کی مرتب جلدیں بھی ہیں اور ہر سال کے متفرق پرچے تو بتعداد کثیر ہیں، جن صاحب کو ضرورت ہو، دفتر سے خط و کتابت کریں۔

لائبریری کوئی پرائیویٹ اور پبلک کتبخانہ معنوی لستبار سے اس بیش قیمت ذخیرہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔

منیجر۔ دارالمصنفین

مخدوم سید قاسم حاجی پوری

از جناب ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب انصاری استاد فارسی، ٹی، ان، بی کالج بھاگلپور،

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اپنے ایک مضمون پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں مطبوعہ معارف نومبر ۱۹۵۲ء میں مخدوم محمد عیسیٰ تاج کے حالات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مخدوم ملک فتح اللہ مخدوم محمد عیسیٰ کے خلیفہ تھے . . . . سید قاسم حاجی پوری کے جد کلاں سید ابو الحسن نے فتح اللہ کی خدمت میں ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی اور خلافت پائی، ملک فتح اللہ کی دامادی کا شرف بھی انکو حاصل تھا۔

اس مضمون میں سید قاسم حاجی پوری کا تعارف مقصود ہے۔ "م"

دریائے گنگا کے کنارے شہر حاجی پور (موجودہ صدر مقام ضلع ویشالی) سے دو میل کی دوری پر مینا پور میں صوفیوں کا ایک قدیم خاندان آباد تھا۔ اس دریا کے شمالی کنارے پر ایک بلند خطہ آج بھی موجود ہے جہاں چھوٹے بڑے مقبرے اور مزارات اور ایک اینٹ کی مسجد کے آثار اپنی گذشتہ عظمت وشان کی نشاندہی کر رہے ہیں ان مزارات میں سب سے بڑا اور نمایاں مزار حضرت پیر دمڑیا کے مزار کے نام سے مشہور ہے اس مزار کے سامنے متوازی الدین میں دریائے مذکور کی جنوبی کنارے پر پٹنہ کے شرقی حصے میں بھی ایک ایسا ہی مزار ہے۔ اس مزار کے متصل ایک قدیم مسجد ابھی تک قائم ہے جو پیر دمڑیا کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پیر دمڑیا کا یہ لقب دو بزرگ صوفیوں (باپ اور بیٹے) یعنی سید احمد اور سید محمد کے ناموں سے منسلک ہے۔

پیر دمڑیا اول یعنی حضرت سید احمد کے والد کا نام سید حسن دانشمند تھا۔ جو میرٹھ اور دہلی سے ہجرت کر کے صوبہ بہار میں وارد ہوئے، اور ضلع سارن کے حسن پورہ عشری محلہ میں میر ملک فتح اللہ کے مشہور مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے لگے، میر ملک فتح اللہ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کی اولاد میں تھے اور اپنی بزرگی اور تقویٰ کی وجہ سے عوام میں بہت معروف مقبول تھے۔ بقول شاہ عنایت حسین مصنف "حالات خاندان دمڑیا بابا"[1] ان بزرگ کی ایک صاحبزادی تھیں، ان کا ارادہ تھا کہ کسی عالی خاندان صاحب علم و معرفت سید زادے سے اس کی شادی کریں گے۔ اتفاق سے جب رات کے وقت میر صاحب کی کنیز حسب معمول طالب علموں کا کھانا لیکر آئی تو دیکھا کہ سید حسن دانشمند کمرے میں ایک چوکی پر بیٹھے کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہیں، سرہانے چراغدان رکھا ہے اور زیادہ رات گذر جانے کی وجہ سے ان پر غنودگی طاری ہے۔ نیند کی وجہ سے جب کبھی ان کا سر چراغدان پر جھک جاتا ہے، تو چراغدان خود بخود پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چراغدان کو کوئی پیچھے کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ کنیز یہ حالت دیکھ کر متعجب ہوئی، اور واپس جا کر میر ملک سے یہ واقعہ بیان کیا۔ میر صاحب فوراً گئے اور اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ اس وقت تو یہ خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے مگر جب صبح ہوئی اور سید حسن دانشمند سبق لینے ان کے پاس آئے تو انھوں نے فرمایا کہ میری ایک لڑکی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی آپ سے کر دوں۔ سید حسن دانشمند نے دست بستہ عرض کیا حضرت! میں اپنی بیوی اور ایک بچی کو چھوڑ کر حصول تعلیم کے لیے یہاں آیا ہوں، اگر شادی شدہ نہ ہوتا تو عدول حکمی کی جرأت نہ کرتا۔

---

[1] ملاحظہ ہو "حالات خاندان دمڑیا بابا" (مخطوطہ) کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ، بھاگلپور۔

ب نے فرمایا اچھا! کل ہم دونوں ایک جگہ بیٹھکر مراقبہ کریں گے، اس کے بعد جیسی
ت ہوگی اس پر عمل کریں گے۔ چنانچہ صبح کو جب سید حسن دانشمند استاد کی خدمت
ضر ہوئے، دونوں نے مراقبہ کیا، اتفاق سے اس درمیان میں سید حسن دانشمند کی بیوی
ا دونوں رحلت کر گئیں، اس کے بعد انھوں نے میر ملک صاحب کی لڑکی سے
کرلی اور یہیں رہ گئے۔

اس شادی سے سید حسن دانشمند کو جو اولادیں ہوئیں اُن میں سے دو لڑکے سید چندن
رزاق لاولد فوت ہوگئے، باقی تین لڑکے یعنی سید احمد پیر دمڑیا، سید مبارک اور
نے طویل عمر پائی، ان تینوں کی شادیاں بہار کے شریف خاندانوں میں ہوئیں سید حسن دانشمند کی وفات ۹۵۰ھ
رہ عشری میں ہوئی انکا مزار یہیں ہے، خادم حسین نے قطعۂ تاریخ وفات لکھی۔

بود شاہی بکشور دانش	میر سید شدہ بدار فنا
خردم سفت دُر تاریخش	واصل حق شدہ سر علما

خادم حسین) لکھتے ہیں کہ یہ وہی سید حسن دانشمند ہیں جنھوں نے ہندوستان میں
کی حکومت کو شیر شاہ کی حکومت پر ترجیح دی تھی اور ہمایوں کے لیے دعا کی تھی
ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر قندھار چلا گیا۔ اور وہاں سے جب دوبا
ستان آیا تو سید حسن دانشمند کی مدد معاش کے لیے ایک بڑی جائداد حسن پورہ عشری
اجی پور میں عطا کی۔ کہا جاتا ہے کہ حسن پورہ محلہ کا نام بھی انہی کے نام پر مشہور ہوا۔
سید حسن دانشمند کے تین لڑکوں میں سید مبارک حسن پورہ عشری میں سکونت پذیر
سید حسین بھاگلپور چلے گئے اور سید احمد اپنے والد سے رخصت لیکر سیاحت کے لیے

رہ تاج العارفین مع رحلت نامہ (مخطوطہ) از خادم حسین، کتب خانہ پیر دمڑیا باباخلیفہ باغ، بھاگلپور۔

نکل گئے اور سفر کے دوران میں بہت سے صوفیوں اور ولیوں سے ملے سیاحت سے واپسی کے بعد بیناپور، حاجی پور میں تشریف لائے اور یہیں قیام پذیر ہوئے۔ ان کا انتقال ۹۶۰ھ[2] میں ہوا۔ اور بیناپور میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔[1]

آں ولیعہد خاندان نبیؐ رہنمون قوم و پیشوای قوم
خود لبس معرفت اللہ بود سال رحلت عرف بک بود

ایک اور تاریخ "مشتاق لقا" ہے۔

سید احمد پیردمڑیا کے تین لڑکے ہوئے تینوں قطب زمان اور آفتاب دوران تھے، پہلے صاحبزادے کا نام مخدوم سید محی الدین عرف امیر بڑہ تھا، انھوں نے اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کی اور صاحب کشف و کرامات ہوئے۔ پھر اپنے چچا کے ساتھ حسن پورہ عشری میں اپنے دادا کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱ محرم ۱۰۱۲ھ میں ہوا، تاریخ وفات[2] حسب ذیل ہے۔

امیر بی نظیر میر بڑھا ن کہ شاہی داشتند از وی گدایان
ز سال ارتحال او دلم گفت ولی بودند صدر مقتدایان

ان کا مزار حسن پورہ عشری میں سید حسن دانشمند کے مزار کے صحن میں واقع ہے۔

مخدوم سید قاسم حاجی پوری (صاحب دیوان و مثنوی) سید احمد پیردمڑیا کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان کا تخلص "قاسم" اور لقب "صدر الدین جمال الدین زبدۃ النقباء محمود العقبیٰ مقتدائے اعظم" تھا۔

---

[1] تذکرہ تاج العلماء رحلت نامہ (مخطوط) از خادم حسین، کتب خانہ پیردمڑیا با خلیفہ باغ، بھاگلپور۔ [2] تاج العلماء رحلت نامہ، مخطوطہ۔

میر ملک فتح اللہ کے انتقال کے بعد ان کے داماد سید حسن دانشمندان کے سجادہ نشین ہوئے ان کے بعد ان کے لڑکے سید احمد پیر دمڑیا بابا کو حاجی پور کی خانقاہ کی سجادگی حاصل ہوئی۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مینا پور کی خانقاہ حسن پور عشری کی خانقاہ ہی کی ایک شاخ تھی۔ جس کا انتظام وہیں سے ہوتا تھا۔

خادم حسین کی تحریر کے مطابق سید احمد پیر دمڑیا کے تین لڑکے تھے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن حالات خاندان پیر دمڑیا بابا کے مصنف سید شاہ عنایت حسین (متوفی سنہ ۱۲۹۰ھ) نے دو ہی بیٹوں کا ذکر کیا ہے، مخدوم سید محی الدین عبدالقادر عرف امیر بڑھ کا ذکر نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت سید احمد کہ لقب اونکا پیر دمڑیا ہوا اور محلہ مینا پور میں مزار مبارک اونکا ہوا۔ یہہ فقیر با قبائل وہاں جاکر مشرف ہوا ہے، سبحان اللہ! مزار شریف ایک ڈال سنگ مرمر ہے اور آپ کی اہلیہ کا مزار بھی سنگ مرمر ہے، اور مینا پور ایک موضع متعلقہ مقام حاجی پور تختگاہ شاہان قدیم واقع در ضلع مظفر پور عبور گنگ برابر شمال پٹنہ کہ معروف شہر عظیم آباد ہے اور آپ کے دو بیٹے ہوئے نام بڑے صاحبزادے کا سید محمد ہے، یہ بھی ملقب پیر دمڑیا ہے، مزار ان کا شہر عظیم آباد میں جو محلہ لون گولہ اور معروف گنج معروف ہے اور اسی محلہ کو پیر دمڑیا بھی لوگ کہتے ہیں، اور چھوٹے بیٹے کا نام حضرت سید قاسم ہے، مزار حضرت سید قاسم کا موضع سید پور اور یس متصل مقام موضع جرد ھرکے ہے اور مینا پور اور سید پور محلوط سیوانہ ہے اس فقیر نے تمام بزرگوں کے مقابر پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا ہے۔"

سید قاسم حاجی پوری کی پیدائش اور تعلیم کا حال تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا،

ان کی پیدائش کی تاریخ کا ایک ذریعہ ان کے چچا سید حسین کی بیاض ہے جو کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ بھاگلپور میں موجود ہے۔ اس میں ان کی پیدائش کی تاریخ ۱۵ محرم الحرام تحریر ہے مگر سنہ کی جگہ خالی ہے، اس کی وجہ سے ان کی پیدائش کے سال پر روشنی نہیں پڑ سکی، ان کے فارسی دیوان[1] کے قلمی نسخے پر متولد حدود ۹۴۰ھ ثبت ہے وہ کاتب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔

قیاس ہے کہ مروجہ علوم انھوں نے اپنے والد ماجد سے حاصل کئے ہونگے غزلوں میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا خوبصورتی کے ساتھ استعمال اس کا ثبوت ہے کہ عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور تصوف و روحانیت کے تمام مقامات سے واقف تھے۔

قاسم حاجی پوری کو اپنے والد سید احمد پیر دمڑیا سے بیعت اور خلافت حاصل ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد مینا پور، حاجی پور میں ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کی والدہ مخدوم سید محمود چشتی کی صاحبزادی تھیں۔ انھوں نے چار شادیاں کیں۔ ان بیویوں سے نو لڑکے ہوئے اور سات لڑکیاں۔ پہلی بیوی پیر سید بڈھے بن مخدوم پیر برادر مخدوم سید حسن دانشمند کی صاحبزادی تھیں جن سے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ مگر لڑکے کا نام محمود تھا۔ جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ دوسری بیوی مریم تھیں جن کے بطن سے دو لڑکے سید یوسف اور سید ابراہیم ہوئے۔ سید یوسف کی شادی بی بی اولیا بنت سید جلال الدین بن سید حمزہ رسولدار ساکن رام بدر معروف بہ چکبدھ پرگنہ حاجی پور، سے ہوئی، تیسری بیوی سیدہ بخاری بنت سید علی بخاری قنوجی تھیں۔

---

[1] دیوان غزلیات سید قاسم حاجی پوری، مخطوطہ کتب خانہ پیر دمڑیا بابا، خلیفہ باغ بھاگلپور (اس کی ترتیب مع مقدمہ میں دے چکا ہوں، طباعت کی مشکلات کا سامنا ہے۔)

ان کے بطن سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لڑکوں میں سے ایک کا نام سید عبداللہ عرف سید حاجی تھا، جو جہانگیر کے زمانہ میں ایک بڑے منصب پر فائز تھے، چوتھی بیوی سہیبو (یا ہیبو) تھیں جن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔

خادم حسین نے اپنی کتاب میں سید قاسم حاجی پوری کے نو لڑکوں کا تو ذکر کیا ہے مگر لڑکیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"و فرزندان مخدوم سید قاسم بن سید احمد پیر و مرشد بن سید حسن دانشمند سید محمود و سید یوسف و سید حاجی و سید ہاشم و سید علی و سید عبدالرحمن و سید سلیم و سید ولی و سید عثمان۔"

سید قاسم حاجی پوری کے روحانی جلال و عظمت کا ذکر شاہ عنایت حسین، اور خادم حسین دونوں نے اپنے اپنے رسالوں میں کیا ہے۔ قاسم حاجی پوری کا انتقال ۴ ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ کو مینا پور حاجی پور میں ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات حسب ذیل ہے۔

روز رحیل جہاں چہارم ذی الحجہ بود سال وفات شریف مغفر آل نبیؐ

"مغفر آل نبیؐ" سے مذکورہ سال و تاریخ وفات کی تصدیق ہوتی ہے، ان کا مزار موضع سید پور، اور بسیں میں مقام جہ وحد (حاجی پور) کے متصل ہے، خادم حسین لکھتے ہیں۔

"در چہارم ذی الحجہ ازیں جہان فانی رحیل مکان جاودانی گشتہ، مزار مقدس ایوبی اقدس در سید پور است۔"

"و نا بینا و عدالت بر مزار آں حضرت جاریست ہر کسی کہ بہ بلائے ہر گونہ مبتلا شدہ چوکی چند روز می سازد کامیاب می باشد۔"

دین کی تبلیغ سید قاسم حاجی پوری کا مقصد حیات تھا۔ انھوں نے گاؤں گاؤں میں

گھوم کر اسلام کی تبلیغ کی اور اس نواح میں اسلام کا نور پھیلایا۔ ان کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ خیالات سے معمور ہے، چند اشعار ملاخطہ ہوں۔

اصل اور باقی رہنے والی زندگی آخرت کی ہے، دنیا فانی اور دھوکا ہے اس کے فریب میں نہ آنا چاہیے

تو قاسما بطلب حیات ملک بقا محو از دنیوی فانی پر از متاع غرور

اصل زندگی وہی ہے جو خدا کی یاد میں گذرے، عمر کا جو لمحہ بھی اس کی یاد اور ذکر کے بغیر گذرا وہ بیکار محض ہے اسلیے حرمان و خسران کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

حیات خود بدید ار تو دانم عجب باشد کہ بے تو زندہ مانم

زعمرم یک نفس بے تو گذشتہ ازان شرمندۂ ہر دو جہانم

کلمۂ شہادت سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔

یک بار کلمہ تو باخلاص ہر کہ گفت شد محو آنچہ کرد ہمہ عمر خود گناہ

اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے۔

گنہگارم تو ئی آمرزگارم امید عفو دارم با معافی

انسان ذات الٰہی کا پرتو ہے، فرشتہ اور حور و پری تک اسکے جمال کے مشتاق ہیں۔

اے شاہد انسان صفت ذات الٰہ مشتاق جمالت ملک و حور و پری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت جو پیدا جہان میں آپ کا کوئی مثیل نہیں۔

ہم چو صفات ذات ترا ہیچ کس ندید بی مثل آفرید ترا در جہان الٰہ

قاسم کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ شاہ عرب کا غلام ہے۔

وہ قاسم کہ شد غلام شاہ عرب زاں سعید است ہمچو سعد سعاد

قیامت میں اس کو جو کچھ امید ہے وہ محبوب الٰہی کی شفاعت سے ہے۔

قاسمؔ آلودہ عصیاں چہ کند روز حساب مگر امید کہ محبوب الٰہی است شفیع

اوقاف

اسلام و انسانیت کا داعی، اوقاف کی تنظیم جدید کا حامی کاروان ارتقا کا حرس اور جہاد زندگانی کا رجز ہے، اس میں علمی و ادبی مقالے بھی ہوں گے، اور سوانحی خاکے، شرعی و ثقافتی مباحث تحقیقاتی جائزے اور اصلاحی تبصرے بھی۔ اس کی مجلس ادارت میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ پروفیسر عبدالمجید خان، بیگم صالحہ عابد حسین، مولانا عبیدالمجید رحمانی۔ ڈاکٹر نظام الدین احمد، مولانا خلیل الرحمن جیسے مشاہیر علم و ادب ہیں۔ اور اڈیٹر حکیم اجمل خان ہیں۔

آپ آج ہی خود بھی مستقل خریدار بنئیے۔ اور اپنے دوست احباب کو بھی بنوائیں۔ سالانہ ۱۰ روپیے فی پرچہ ۲ روپیے ۵۰ پیسے۔

اشتہارات معیاری اور سنجیدہ قبول کئے جائیں گے۔

عہد ہشام کا سندھ

از جناب ڈاکٹر عبد الباری لکچرر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

۱۲۰ھ میں عراق کی وائسرائلٹی میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی آئی۔ وہاں کا مشہور گورنر خالد بن عبداللہ قسری معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ یوسف بن عمرو ثقفی گورنر مقرر ہوا۔ سندھ عراق کے ماتحت تھا اسلیے اس تبدیلی سے یہاں کی حکومت کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ حکم بن عوانہ خالد قسری کا مقرر کردہ افسر تھا۔ اب جب کہ خالد معتوب ہو چکا تھا۔ اور اسکی انتظامی کمزوریوں پر حکومت کی طرف سے مقدمات قائم کئے جا چکے تھے۔ حکم بن عوانہ نے اپنی ذات کے لیے بھی خطرہ محسوس کیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی بھی سرزنش ہوگی اور سیاسی اختلافات کے نتیجے میں اسے بھی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا[1]۔ کیونکہ موجودہ وائسرائے یوسف بن عمرو کے خاندان والے اور کلبی قبیلہ کے لوگ ایک دوسرے کے سیاسی حریف تھے۔ حکم بن عوانہ ایک دلیر کمانڈر تھا۔ اس نے سیاسی ادھیڑ بن میں پڑنے اور اپنے حریفوں کے ہاتھوں ذلت و رسوائی اٹھانے سے بہتر سمجھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد پورا کرلے۔

ہندوستان میں راجاؤں کے معاندانہ رویے نے تادیبی کاروائی کو ضروری بھی

---

[1] یعقوبی۔ تاریخ، جلد ۲ ص ۳۲۲-۳۱۸

بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کا ایک دستہ لیکر گجرات کی طرف بڑھا۔ اور سندھ میں مقیم اسلامی سپاہ کی کمان اور حکومت کی نیابت فاتح سندھ محمد بن قاسم کے بیٹے لڑکے عمرو بن محمد کے سپرد کر دی[1]۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جام شہادت نوش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس کی پیش قدمی گجرات سے سوراشٹر کی طرف ہوئی۔ بقول مجمدار ۷۳۹ء کے قریب سوراشٹر کے علاقے پر سندھوا خاندان کا راجا "پشے دیو" برسر حکومت تھا۔ جسے حکم بن عوانہ کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی[2]۔ اس کے بعد وہ دکھنی گجرات کی طرف بڑھا۔ اور نربدا ندی کو عبور کرنے کے بعد "نوسارک" ریاست پر حملہ کیا ہوگا[3]۔ اس پیش قدمی میں اس نے ایک طویل مسافت طے کر لی تھی۔ اس لیے جنگی نقطہ نگاہ سے کمک کا انتظام کرنا اور پیچھے چھوڑے ہوئے مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا۔ لیکن ایسے کسی انتظام کا عربی تاریخوں سے پتہ نہیں چلتا ہے، حکومت کے طرز عمل سے بیزاری کی بنا پر حکم بن عوانہ کی یہ مہم جنگی ضابطہ کی پوری کارروائیوں کے ساتھ نہیں تھی۔ اور اس کے دل میں صرف ایک ہی جذبہ باقی تھا اور وہ یہ کہ جہاد کرتے ہوئے جان دے، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ کمانڈر جس نے ہندوستان کی مشترک افواج کا منہ پھیر دیا تھا۔ اور ان کو نہ صرف سندھ کے حدود سے باہر بھگا دیا تھا۔ بلکہ انکا تعاقب کرتے ہوئے دکھنی ہندوستان تک پہنچ گیا تھا

---

[1] یعقوبی تاریخ۔ ص ۳۲۲ - ۳۱۸ [2] سوراشٹر ان دنوں متعدد خاندانوں مثلاً سندھوا، چالوکیا۔ چاپا وغیرہم کی حکمرانی میں تھا۔ ایک چالوکیا خاندان جوناگڑھ کے قریب بھی حکمرانی کرتا تھا۔ دیکھیے دی ہسٹری ایج آف امپیریل کنوج از مجمدار، ص ۱۰۰ - ۱۰۵ [3] ایم۔ سی۔ اے، وائنا سنگھ ہسٹری آف انڈیا جلد ۱، ص ۹

دکھنی گجرات کی ایک چھوٹی سی ریاست نوسارکھ کے راجا نامسے پولاکیس سے خود بھی
اس ریاست کا باجگذار راجا تھا۔[۱] شکست کھا گیا اور عوانہ جنگ میں کام آگیا[۲]

حکم بن عوانہ ایک مقتدر کمانڈر تھا۔ سندھ کا گورنر بھی تھا۔ اس کی ہیبت سے شمالی
اور جنوبی گجرات دونوں متاثر تھے۔ اس لیے اس کی شہادت کے بعد ان علاقوں نے
اطمینان کی سانس لی اور ایک بڑا خطرہ ہندوستانی ریاستوں کے سر سے ٹل گیا تھا۔
ان علاقوں پر عربوں کی جس قدر دہشت طاری تھی، اس کا اندازہ نوسارک پلیٹ سے
بخوبی ہوتا ہے۔[۳] اس لیے راجہ جنامسرے کے اس کارنامے پر اُسے طرح طرح کے اعزازوں
سے نوازا گیا۔ چالوکیا شاہنشاہ نے اُسے دکھنی ہندوستان کا مستحکم ستون "خاندان چالوکیا
کا جواہرپارہ اور پسپا نہ ہونے والی قوم کا پسپا کرنے والا" جیسے خطابات سے سرفراز کیا
حکم بن عوانہ کی موت سے ایک بار پھر مقامی راجاؤں کے حوصلوں کو نئی زندگی
مل گئی۔ اور سندھ کی اسلامی حکومت بھی تھوڑے عرصے کے لیے سیاسی انتشار
کا شکار ہوگئی۔ اور حکم بن عوانہ کی جانشینی کے لیے یزید بن عرار نامی شخص عمرو بن
محمد کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ عمرو بن محمد نے حکم بن عوانہ کی معیت میں بیش بہا جنگی
اور انتظامی خدمات انجام دی تھیں۔ محفوظہ کے فوجی مستقر سے مقامی افواج کے
خلاف کامیاب جنگی مہموں کی قیادت کی تھی۔ اور دو سال (۱۲۲ھ سے ۱۲۴ھ)
تک سندھ کی گورنری کے فرائض بھی حکم بن عوانہ کے نائب کی حیثیت سے انجام دئے تھے۔

---

[۱] دیپا۔ میڈیاول ہندو انڈیا، جلد ۱، ص ۲۷۷ [۲] بلاذری، فتوح ص ۴۴۴
ایم۔ سی۔ ر۔ ے، ڈائناسٹک ہسٹری، جلد ۲، ص ۳۰۷۔ ۹۳۵۔ [۳] تفصیل ص ۱۰ پر
گذر چکی۔ [۵] ڈاکٹر ڈی شرما، راجستھان جلد ۱، ص ۱۰۶۔

عمرو بن محمد کی ان کارگذاریوں کے صلہ میں عراق کے وائسرائے نے انہی کو سنہ ...ھ مین سندھ کا گورنر مقرر کر دیا تھا[1]۔ یزید بن عرار اور عمرو بن محمد کی کشمکش سے سندھ کے مستقل باغی عناصر اور مقامی راجاؤں نے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھیں گمان ہوا کہ حکم بن عوانہ کی موت سے سندھ کی اسلامی حکومت کمزور ہوچکی ہے۔ اور مسلمان اُن کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکین گے۔ سندھ پر پیش قدمی کا پلان بنایا اون کے مقابلہ اور اپنا ایک راجا بھی منتخب کرکے اس کی کمان میں ہند کی افواج منصورہ پر حملہ آور ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ راجہ وہی گوہیلا راجہ باپا تھا جس نے چتوڑ کے

---

[1] بلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۰۵۔ ۴۴۶۔ [2] بلاذری کی روایت کے مطابق عمرو بن محمد بن قاسم نے شہر منصورہ حکم بن عوانہ کی گورنری کے ایام میں اسوقت تعمیر کرایا جب سندھ کی حکومت کو ہندی افواج کی یورش سے محفوظ کر لیا گیا۔ ساتھ ہی عمرو نے اشہر کو سرکاری دفاتر کا مرکز بھی قرار دیا۔ سندھ میں شہر منصورہ کی تعمیر دراصل ہندوستان کی سرزمین میں پہلی سب سے اہم شہری تعمیر تھی۔ کیونکہ محفوظہ کی حیثیت ایک مرکزی فوجی چھاونی کی زیادہ تھی۔ لیکن منصورہ ایک وسیع و عریض شہری آبادی کا حامل اور صوبہ کا دارالخلافہ بھی تھا۔ بلاذری کی روایت سے اس کی تعمیر سنہ ...ھ کے لگ بھگ اور یعقوبی کی روایت کے مطابق سنہ ۱۳۰ھ میں ہوئی۔؛ دیکھیے فتوح البلدان ص ۴۰۴۔ ۵۴۴؛ تاریخ الیعقوبی جلد ۲ ص ۴۴۳؛ پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ نے اس شہر کو کھدائی کے بعد برآمد کر لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز منصورہ کا محل وقوع حیدرآباد ڈویژن کے ضلع سانگھڑ مین متعلقہ سنجھورو ہے۔ جو موجودہ شہر سے شاہداد پور سے جنوب مشرق آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ یہ ایک میل طویل اور ایک ہی میل عرض میں دریائے سندھ کے مشرقی جانب بسا ہوا تھا۔ یہ جگہ دریائے سندھ کے دو حصوں میں منقسم ہوجانے کی بناپر ایک جزیرہ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ شہر فصیل ۲۰۔ ۲۵ فٹ تک اونچی تھی۔ اور اس قدر چوڑی تھی کہ آسانی سے گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ کچھ دور شمال مشرق میں قدیم نہران ڈھی کی اس شاخ کے آثار ہیں۔ جو اب خشک ہوچکی ہے۔ مگر اس عہد میں قلعہ کی دیوار سے [illegible]

موری راجا کو جو اس کا چچا بھی تھا۔ اور مسلمانوں سے شکست کھا گیا تھا تخت سے اتار کر خود حکمران بن گیا تھا[1]۔ بعد میں اس نے عربوں کے خلاف جنگی مہم شروع کر دی اور میواڑ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جس میں راجستھان کا علاقہ بھی شامل تھا۔[2] اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ افواج کو جب شکست ہو گئی تو اس نے اپنی طاقت بڑھائی اور سندھ کی حکومت کے موروثی حقدار کی حیثیت سے اس کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے موری خاندان کا راجا ہی سندھ پر حکمران تھا۔

حکم بن عوانہ کی شہادت کے بعد سندھ پر حملہ کا اچھا موقعہ بھی ہاتھ آگیا تھا۔ حکم کے ہاتھوں مقامی شکست خوردہ افواج کو بھی چتا کو راجا منتخب کر لینے اور اسکی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۹) اور زبان حال سے پکار پکار کر بنانے والوں کی چابکدستی کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ قلعہ کی مشرقی، مغربی اور جنوبی دیواریں دریائے سندھ کی دونوں شاخوں کی گذرگاہ سے ملا کر بنائی گئی تھیں۔ اس طرح یہ شہر چاروں طرف دریائے سندھ کے پانی سے گھرا ہوا تھا۔ ایلیٹ اور آیزو وغیرہم مستشرقین کی جماعت کا خیال تھا کہ منصورہ قدیم شہر برہمن آباد پر بسا ہوا ہے، اور اس کے کافی حصے منصورہ میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ دیکھئے ایلیٹ، دی ہسٹری آف انڈیا، جلد ۱، ص ۳۷۰، ۳۷۱، مطبوعہ لندن، ۱۸۶۷ء۔ مگر اب حالیہ تحقیق نے اس دعوے کو غلط کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز برہمن آباد کے آثار منصورہ سے شمال مشرق ڈیپر گھنگرد کے مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں، چودھویں صدی عیسوی میں ایک زلزلہ سے یہ شہر تباہ ہو گیا۔ دیکھیے مقالہ از ڈاکٹر ممتاز اسلامک کلچر جلد ۱۱، ص ۲، حیدرآباد ۱۹۵۰ء۔ [1] ایچ۔ سی۔ رے۔ ڈائناسٹک ہسٹری جلد ۲۔ ص ۱۱۵۹،۱۱۵۰، ج۔ ٹوڈ: اینلس آف اینٹیکوئیٹیز آف راجستھان ج ۱، ص ۱۰۰۔ [2] ڈاکٹر ڈی شرما: راجستھان تھرو دی ایجز جلد ۱، ص ۱۰۷۔

قیادت میں مسلمانوں سے شکست کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے منصورہ کا محاصرہ کر لیا۔ عمرو بن محمد کے لئے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ اس نے عراق سے چار ہزار تازہ دم عربی فوج منگاکر راجہ کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ راجہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور اسکو منصورہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد عمرو بن محمد نے ایک بڑی فوج ترتیب دیکر ایک دوسرے ہوشیار کمانڈر معن بن زائدہ شیبانی کی معیت میں مقامی افواج پر شب خون مارا۔ دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی راجا کی فوج کا بڑا حصہ کام آیا اور اسکو شکست ہو گئی۔ خود راجا بھی زخمی ہوا۔ بھاگتی ہوئی مقامی فوج اپنے ساتھ . . . . . لے گئی تھی[1] مگر عمرو بن محمد نے ان سب کو شکست دے کر سندھ کے پورے علاقے سے نکال دیا۔ اور ایک بار پھر وہ مسلمانوں کے مکمل کنٹرول میں آگیا[2] اور عمرو بن محمد ہشام بن عبدالملک کے آخر زمانہ تک سندھ پر حسن تدبیر کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ ہشام کے زمانہ میں سندھ پر جو فوجکشیاں ہوئیں ان کا مقصد اسکو اموی سلطنت کا مستقل بنانا تھا۔ ورنہ عمرو بن محمد منصورہ کو جو سندھ کے آخری شہر تھا سندھ کا دارالحکومت نہ بناتا، چنانچہ بلاذری کے عہد ۲۵۵ھ تک منصورہ سندھ کا دارالحکومت[3] اور سندھ انگریزوں سے پہلے تک مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اس لیے سندھ کی فتوحات کا افسانہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

---

[1] یعقوبی ج ۲ [2] ایضاً [3] فتوح البلدان ۰۔ ۴۴۸ - ۴۵۰

تاریخ سندھ

سندھ کی تاریخ کی طرف سب سے پہلے دارالمصنفین نے توجہ کی، اور اپنے ایک لائق رفیق مولانا سید ابوظفر ندوی سے جن کو خود بھی سندھ اور گجرات کی تاریخ سے دلچسپی تھی، تاریخ سندھ کے نام سے کتاب لکھوائی اس میں خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ کی مکمل تاریخ آگئی ہے۔

طبع دوم۔ ضخامت ۔ ۴۰۰ صفحے۔ قیمت ۔ ۱۰/-

مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ از احمد شوقی مصری

از جناب مولوی حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضاء، لیبیا،

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت ایک بین الاقوامی شخصیت تھی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد مولانا نے خلافت کے قیام اور اسلامی رشتۂ اخوت کی بقا کے لیے جو کوششیں کی ہیں انھیں مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مولانا محمد علی جوہر کا انتقال یورپ میں ہوا۔ اور بیت المقدس میں آپ کو دفن کیا گیا۔ ان کے غم میں تمام عالم اسلامی میں تعزیتی جلسے کیے گئے، مصر میں سرکاری طور پر عظیم الشان تعزیتی جلسہ ہوا۔ جس میں وقت کی سیاسی اور علمی و ادبی اہم شخصیات نے مولانا جوہر کی انسانی و اسلامی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس وقت ہم امیر الشعراء احمد شوقی[1] کے مرثیہ کا آزاد ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اس تاریخی تعزیتی جلسے میں سنایا تھا، اور جس میں بیت المقدس کی مقدس اور لعل و جواہر[2] لبریز

---

[1] پیدائش ۱۸۶۸ء وفات ۱۹۳۲ء کہا جاتا ہے کہ عربی زبان نے ایک ہزار برس میں ایسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ [2] قرآن کی زبان میں "بارکنا حولہ" مفسرین نے لکھا ہے کہ اقتصادی برکات نیز انبیا کی آمد وغیرہ مراد ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ انبیاء کا مدفن ہے، اقبال نے دہلی سے غالب کے متعلق یقیناً مبالغہ کی زبان میں پوچھا تھا۔ . . . دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟ لیکن حقیقتاً سرزمین قدس میں مدفون بابرکت اور فخر روزگار شخصیتیں اندازہ اور شمار سے بھی زیادہ ہیں۔

سرزمین پاک میں جوہر کے جسد اطہر کو پیوست خاک کرنے کا نقشہ کھینچا گیا ہے،

مصر نے برسہا برس کے شعری جمود و تعطل کے بعد شوقی جیسا شاعر پیدا کیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ محمد علی جوہر جیسا مخلص اور مجاہد بھی سرزمین ہند نے بڑی مشکل سے پیدا کیا تھا۔ امیر المجاہدین کی وفات پر امیر الشعراء کا مرثیہ ایک زندگی بخش نغمہ ہے جو جوہر سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔

شوقی کا مرثیہ بیت المقدس کی فضیلت سے اس طرح شروع ہوتا ہے۔[1]

بیت علی ارض الہدی وسمائہ	الحق حائطہ واُسّس بنائہ
الفتح من اعلامہ والطہر من	اوصافہ والقدس من اسمائہ
تحفوا مناکبہ علی شعب الہدی	وتطل سدتہ علی سینائہ
من ذا ینازعنا مقالد بابہ	وجلال سدتہ وطرفنائہ
ومحمد صلی علی جنباتہ	واستقبل الرحمات فی ارجائہ

ایسا گھر جو ہدایت کے زمین و آسمان پر قائم ہے جس کی عمارت اور دیواریں حق و صداقت سے تعمیر ہوئی ہیں، فتح و ظفر جس کا علم ہیں، طہارت و پاکیزگی جس کے اوصاف ہیں، اور قدس جسکا نام ہے ہدایت یافتہ قوم کے لیے اس کے بازو شفیق ہیں، اور اس کے برآمدے سینا کے سمت جھانک رہے ہیں۔ کون ہے جو ہمارے مقابلے میں اسکے دروازوں کی کنجیوں اس کے برآمدوں کے جلال اور آنگن کی طہارت کا حقدار ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے پہلوؤں میں نماز پڑھی ہے اور رحمت کی جود و سخا کا استقبال بھی اس کے گوشوں میں کیا ہے۔

شوقی نے بیت المقدس کی تعریف میں یہ چند شعر کہے ہیں، ان کی مختصر تشریح ضروری ہے۔

---

[1] دیوان شوقی مسمی "شوقیات" جلد سوم صفحہ ۱۲۔

پہلے شاعر نے ہدایت وحق کی دیواروں اور ستونوں پر اسکی تعمیر بتائی ہے، بیت المقدس کی تعمیر کے سلسلے کی تین روایتوں میں سے جسے بھی صحیح مانا جائے یہ بات مسلم اور متحقق ہو جاتی ہے کہ وہ حق وطہر کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔ اگر یہ روایت مانی جائے کہ تعمیر بیت المقدس فرشتوں نے کی[1] تو وہ بلاریب حق وہدایت کا مظہر ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ روایت مانی جائے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کسی صالح شخص نے کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد اس کی تعمیر کی ہے۔[2] تب بھی صلاح وخیر پر اسکے ستونوں کے کھڑے ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر صحیح ترین قول یعنی اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر مانا جائے تب بھی پیغمبر کے زیر ہدایت جو تعمیر ہوئی وہ حق وہدایت کا منبع ضرور ہوگی۔[3]

تیسرے شعر میں۔ سینا سے مراد جغرافیائی طور پر پورا جزیرہ نمائے سینا یا تاریخی طور پر بائبل کی زبان میں بریہ "یا بیابان سینا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد سلسلۂ جبال سینا کی وہ پہاڑی یا وہ حصہ ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو تجلی ہوئی تھی۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے طور[4] یا جانب[5] طور، یا طور کا دایاں[6] حصہ۔ یا طور سینا[7]، اور طور سینین[8] کہا گیا ہے، اور تجلی خاص کے وقت اسے صرف جبل کے نام سے پکارا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸ میں ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے بیت المقدس کو خدا کے حکم سے کعبہ کے چالیس سال بعد بنایا ہو، کعبہ شریف کے سلسلے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے فرشتوں نے بنایا ہے۔ [2] مفسر ابن جریر طبری نے جلد ۴ ص پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلی مسجد، مسجد حرام ہے پھر مسجد اقصیٰ، انکی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے، کعبہ شریف کے سلسلے میں قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اسے حضرت آدمؑ نے بنایا ہے، پھر لکھا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس بنایا [3] صحیح ترین قول سنن نسائی کی وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے نقل ہوئی ہے کہ جب سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کی دعا مانگی (قرطبی ج ۴ ص ۱۳۸) بائبل کا بیان بھی نسائی کی روایت کی تصدیق کرتا ہے وہ بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد ۴۸۰ ویں سال اسرائیل پر سلیمانؑ کی سلطنت کے چوتھے برس زیو کے مہینہ میں جو دوسرا مہینہ ہے ایسا ہوا کہ اس نے خداوند کا گھر بنانا شروع کیا۔ (بقیہ حاشیہ ص ۳۰۵)

فلما تجلّی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا[۱]

اور جب اسکے رب کی تجلی پہاڑ پر ہوئی تو اُسے ڈھا گیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

بائبل میں اس تجلی گاہ کا نام "حورب" اس طرح آیا ہے[۲] اور موسیٰ اپنے خسر ثیرو کی جو کلیان کا کاہن تھا۔ بھیڑ بکریاں چراتا تھا۔ وہ بھیڑ بکریوں کو ہنکاتا ہوا ان کو بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک لے آیا۔ اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا[۳]۔ نیز ایلیا کو بھی ملاک الٰہی نے جبل حورب پر جانے کا حکم دیا تھا۔ "چالیس دن اور چالیس رات چل کر وہ خدا کے پہاڑ حورب تک گیا . . . . . اور خداوند کا یہ کلام اس پر نازل ہوا[۴]۔ اس پہاڑ کو کوہ سینا کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً تیسرے دن کوہ سینا پر خدا کے ظاہر ہونے کا وعدہ تھا۔ اور لوگ منتظر تھے کہ کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا۔ کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا۔ اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ اور سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔[۵] حورب کی چٹان ہی پر حضرت موسیٰ نے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۴ ۔ ۱ سلاطین ۶-۱) یہاں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں چالیس سال کا وقفہ جو بیان ہوا ہے اگر وہ روایت صحیح ہو تو اسکا حل کیا ہے؟ قرطبی نے یہ حل پیش کیا ہے حضرت ابراہیمؑ و سلیمانؑ، دونوں نے کسی ایسی عمارت کی تجدید کی ہو جو ان سے قبل بنائی گئی ہو، چاہے فرشتوں نے بنایا ہو یا آدمؑ نے یا اولاد آدمؑ نے۔ [۶] قصص۔ ۲۹ طور کے لفظ کے متعلق لسان العرب میں ہے کہ کلام عرب میں اسکے لغوی معنی پہاڑ کے ہیں، اور طور سینا سے وہ پہاڑ مراد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام کیا۔ قرطبی میں بھی واضح قول یہی ہے کہ جس پر تجلی ہوئی اور توراۃ عطا ہوئی، ایک قول مجاہد کا یہ بھی ہے کہ طور سریانی لفظ ہے جو ہر پہاڑ کے لیے بولا جاتا ہے۔ [۷] قصص۔ ۴۶ [۸] مریم۔ ۵۲ [۹] مومنون۔ ۲۰ [۱۰] تین۔ ۲ [۱۱] اعراف۔ ۱۴۳ [۱۲] خروج۔ ۳۔ ۱، ۲ [۱۳] ۱ سلاطین ۱۹۔ ۸ و ۹، قرآن کی زبان میں حضرت الیاسؑ [۱۴] خروج ۱۹۔ ۱۸

لاٹھی مار کر پانی نکالا تھا۔[۱]

موجودہ جغرافیائی حیثیت سے یہ تجلی کہاں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ کوہ سربال پر دوسرا یہ کہ کوہ موسیٰ پر۔ دوسرا قول اپنے نام کے اعتبار سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ کوہ موسیٰ حالیہ بستی یا شہر طور کے جنوب مغرب میں واقع ہے، بہرحال اتنی بات تو قطعاً صحیح ہے کہ پہاڑی سلسلے میں سے کسی پر تجلی ہوئی تھی، جس کا نام طور یا حورب کہا جاسکتا ہے، اور تجلی کی وجہ سے وہ ضرب المثل بن گیا ہے، بیت المقدس اس تجلی گاہ کے سامنے واقع ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے شاعر نے شاعرانہ لیکن حقیقت سے قریب تر تشبیہات کا استعمال کیا ہے،

یہ ذہن میں رہے کہ مرثیہ ۱۹۳۱ء میں کہا گیا ہے۔ اور فلسطین کا مسئلہ اُس وقت بھی بین الاقوامی سیاست کا محور بنا ہوا تھا، شوقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے حقدار اس میں بسنے والے پاکباز مومن ہیں جو پاکیزگی وعفاف اور حق وصداقت کے متوالے اور نبی امیؐ کے شیدائی ہیں، شاعر نے یہ حقیقت چوتھے شعر میں بیان کی ہے۔ یہ ایک سیاسی موضوع بھی تھا۔ لیکن شاعر کی شاعرانہ صلاحیت یہ ہے کہ وہ سیاسی، فلسفیانہ اور اجتماعی وانسانی زندگی سے متعلق موضوعات پر جب قلم اٹھاتا ہے، تو سیاسی، فلسفی، ناقد اور مبصر بن کر نہیں بلکہ صرف شاعر ہوتا ہے، اور شاعرانہ زبان میں جذبات انسانی کی ترجمانی کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی بات دل میں سما جاتی ہے۔

غرض جس مقدس پہاڑ پر تجلی ہوئی تھی قدس اسکے سامنے ہے، اور خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سرزمین مقدس میں لیلۃ المعراج میں نماز پڑھی تھی۔[۲] اسلیے اس زمین

---

[۱] خروج ۱۷۔ [۲] اسکی تفصیل بخاری، باب کیف فرضت الصلاہ حدیث نمبر ایک میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کی رفعت اور عروج پر اگر افلاک کو بھی رشک آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

آگے چل کر شوقی کہتے ہیں۔

والیوم ضم الناس ماتم ارضہ	وحوی الملائک مہرجان سمائہ
یاقدس ھیئی من ریاضک ربوۃ	لنزیل تربک واحتفل بلقائہ

آج اس سرزمین پر ماتم کے لیے لوگ جمع ہیں۔ اور آسمان پر فرشتوں کا مجمع ہے۔ اے قدس اپنے چمن میں ایک آشیانہ کا انتظام کرلے اور اپنی مٹی میں دفن ہونے والے کے لیے استقبال کی تیاریاں کر۔

اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی بعض خصوصی صفات کو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے۔

ھو من سیوف اللہ جل جلالہ	او من سیوف الھند عند قضائہ
بطل حقوق الشرق من اعمالہ	وقضیۃ الاسلام من اعبائہ
لم تنسہ الھند العزیزۃ قدرہ	للشرق او سھرا علی اشیائہ
وقبائل نیج الھنود فھل تری	دفنوا الذعیم مکفنا بقبائہ

وہ اللہ جل جلالہ کی تلواروں میں سے ایک تھے۔ یا شمشیر ہند کی طرح تھے، وار کرتے وقت وہ ایسے ہیرو تھے کہ مشرق کے حقوق تسلیم کرانا ان کا عمل تھا، اور اسلامی کاز کے لیے کوشش کرنا ان کا مقصد تھا۔ محبوب سرزمین ہند انکی تڑپ کو نہیں بھول سکتی اور نہ مشرق کے لیے ان کی بے خوابی کو ان کی قبا ہندستانی ہاتھوں نے بنائی تھی، تمھاری کیا رائے ہے؟ کیا لیڈر کو اس کی قبا ہی میں دفن بھی کیا گیا ہے۔؟

سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ کا لقب ہے، حضور رسالتؐ نے آپ کو یہ معزز لقب عطا کیا تھا۔ ہندی تلوار اس کی دھار سیف ہندی یا سیف ہند وغیرہ کی تعبیرات ایک جانی پہچانی ترکیب ہے، ہندوستان کے اسلامی مجاہد کی شمشیر ہند سے تشبیہ میں عربی شاعری کے قدیم معنی میں ایک جدید روح پیدا ہوگئی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ

شاعر نے شمشیر خدا کہکر جوہر کی شجاعت، اسلامی حمیت اور حضرت خالد بن ولیدؓ جذب وشوق شہادت واضح کیا ہے، اور شمشیر ہند کہکر قدیم ہندوستانی تلواروں کی صفات صیقل اور دھار کی تعریف سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جوہر دو آتشہ تھے، ایک طرف راسخ العقیدہ مرد مومن تھے ان کا دل مذہبی جذبات سے معمور تھا۔ اور مذہبی امور میں کسی مداہنت کے قائل نہ تھے، جس کو بعض تنگ نظروں نے فرقہ پروری سے تعبیر کیا ہے، لیکن دوسری طرف سچے قوم پرور اور وطن دوست تھے، اور اون کی پوری زندگی ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد اور انگریزوں سے ٹکر لینے میں گذری اور اسی پر انکا خاتمہ ہوا جسپر راونڈ ٹیبل کانفرنس میں انکی آخری تاریخی تقریر شاہد ہے۔

شاعر انکے غم میں انسو بہانے والون کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

النیل یذکر فی الحوادث صوتہ	والترک لاینسون صدق بلائہ
قل للزعیم محمد نزل الاسی	بالنیل واستولی علی بطحائہ
فمشی الیک بجفنہ ودمائہ	والی اخیک بقلبہ وعزائہ
ولقد تعود ان تمر بارضہ	مرا لغمام بظلہ وبمائہ

نیل مصیبتون کے وقت اس کی آواز کو یاد کرتا ہے اور ترک اس کے مخلصانہ جہاد کو نہیں بھول سکتے، زعیم محمد سے کہدو غم کی بارش ہوگئی، اور سرزمین نیل پر غم کے بادل چھا گئے۔ اس لیے نیل پلک اور آنسو بن کر تم کو روتی ہے اور جان ودل سے تمہارے بھائی کی تعزیت کرتی ہے اور تمھاری تو یہ عادت تھی کہ سرزمین نیل سے ایسا بادل بنکر گذرتے تھے جس میں سایہ بھی ہو اور سیرابی بھی۔

مخلص ترک اس مالی وجانی امداد اور کوششون کو نہیں ... بھول سکتے جو

برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزی سامراج کے علی الرغم بلقان وغیرہ کی جنگوں کے موقع پر مولانا جوہر کی قیادت میں کی تھیں، جسکی طرف شوقی نے ایک مصرعہ ہی میں اشارہ کیا ہے، نیل مصر کا حیات بخش دریا ہے، نیل سے مراد یہاں سرزمین مصر ہے۔
بھائی سے مراد مولانا شوکت علی مرحوم ہیں، علی برادران کی شہرت مصر میں کافی تھی، خلافت کیساتھ مولانا مصر کی آزادی کے بھی متمنی تھے، اور بار ہا مصر آئے تھے، شاعر نے انکی آمد کو ایسے بادل سے تشبیہ دی ہے جو امیدوں اور ارمانوں کا پیام تشنہ لبوں کیلئے لاتا ہو، شاعر اپنا مرثیہ اس انداز پر ختم کرتا ہے۔

نم فی جوار اللہ ما بک غربۃ	فی ظل بیت انت من ابنائہ
الفتح وھو قضیۃ قد سیۃ	یا طالما ناضلت دون لوائہ
رفقتی بدفنک عند سید القری	مفت اراد اللہ من افتائہ
بلد بنوہ الاکرمون قصورھم	وقبورھم وقف علی نزلائہ
قد عشت تنصرہ و تمنح اھلہ	عونا فکیف تکون من غربائہ

اللہ کے پڑوس میں سو جاؤ تمھیں مسافرت کی اجنبیت نہیں، ایسے وطن میں سو جس کی تم اولاد ہو، قدس کے قضیہ میں تم فتح و ظفر کے طالب تھے، اس پرچم کے سایہ میں کتنے بار لڑے تھے بستیوں کی سردار قدس کی زمین میں دفن ہونے کا فتوی ایک مفتی نے دیا، خدا کی مشیت میں جس کے لیے یہ سعادت لکھی تھی، یہ ایسا شہر ہے جس کی محترم ہستیوں کے محلات اور ان کے مقبرے آئے ہوئے مہمانوں کے لیے وقف ہیں۔ تم اپنی پوری زندگی اس سرزمین کی امداد اور اس کے عوام کی خدمت میں صرف کرتے رہے، اس لیے تم اجنبی کیسے ہو سکتے ہو۔
قدس میں دفن ہونے کے لیے مفتی اسلام کی اجازت یا فتوی کی ضرورت ہوتی تھی جسکی پیشکش خود مفتی فلسطین نے کی تھی، اسلیئے اسلام کا یہ مجاہد اس مقدس سرزمین میں دفن کر دیا گیا جسکے لیے "بارکنا حولہ" کا مژدہ خود قرآن نے سنایا ہے۔ بیت المقدس کی سرزمین مجد و قدس میں سونے والے ہندوستانی
[illegible]

ادبیات

مسجد قرطبہ کی واپسی

از جناب سید غلام سمنانی جونپوری

(۱)

ہے نگہ اشتیاق، محو تماشائے ذات — توڑ دیئے عشق نے عقل کے لات و منات
عشق ہے فتح مبین، عشق ہے نور یقین — عشق غیور و متین، عشق ہے صبر و ثبات
عشق کا سوز نفس، گرمیٔ بازار شوق — عشق کا اشک رواں دجلہ و نیل و فرات
کوہ کن و قیس ہیں بندۂ بے دام عشق — عشق رئیس الکرام، عشق امیر الثقات
عشق ہے مہر منیر، عشق سے روشن ہوئی — تیرہ و تاریک تھی، انجمن کائنات
جنبش ابروئے عشق، جنبش بال قضا — فتنۂ یوم نشور، عشق کی ادنیٰ سی بات
مٹ گئی اک آن میں کشمکش جسم و جاں — اٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات و صفات
وسعت دشت طلب عشق کو فردوس جاں — نیش غم جاوداں، عشق کو شاخ نبات
مرحلۂ عشق میں خار الم گل بدوش — میکدۂ عشق میں زہر ہے آب حیات
عشق کی تقدیر ہے آتش و خون و دگر — عشق کو پیش آئے ہیں ایسے بہت سانحات
عزم و عمل کیلئے کچھ نہیں ارض و سما — عزم و عمل کیلئے کچھ نہیں شش جہات
زیر قدم آگیا خیمۂ عرش بریں — ہو گئی ہے ریز ریز، شیشہ گہ ممکنات

میرے جنوں کا صلہ مملکتِ تحت و فوق — عقل نے یاں کوشش کی میرے جنوں کی مدحت

مجھ پہ ہوئے منکشف لوح و قلم کے رموز — پوچھ لے مجھ سے کوئی رازِ حیات و ممات

شاطرِ تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی — دیکھتے ہی دیکھتے کھا گئی تدبیر مات

کتنے دنوں پر ملا عشق کو اذنِ سجود — پھر وہی حسنِ ذات، پھر وہی لطفِ صفات

چشمِ تمنا میں ہے حسنِ سراپائے دوست
سامعہ افروز ہے لذتِ آوائے دوست

(۲)

قافلۂ وقت ہے، گرم دو و تیز گام — کس کیلئے ہے قعود، کس کیلئے ہو قیام

کمترک از برگِ خشک، کمترک از ریگِ دشت — وقت کے صحرا میں یہ شام و سحر کے خیام

وقت کے دریا کی موج جوششِ طوفاں بدوش — وقت کا ساحل نہیں، اسکا نہیں ہے مقام

وقت کے تیشہ سے آب زہرۂ فولاد و سنگ — کوشک و ایوان و کاخ، قصر و سقف و بام

وقت کی تیغِ اصیل، وقت کی شمشیرِ تیز — بے جگر و بے خطر، بے خبر و بے نیام

وقت کے محکوم ہیں قیصر و خاقان و میر — خواجہ و شاہ و سپاہ وقت کے ادنیٰ غلام

وقت سکون ناشناس، وقت ہے شورش اساس — وقت کا رہوار ہے تند رو و بے زمام

مرغِ بلند آشیاں، اس کا اسیرِ قفس — وقت کا صیاد ہے، تیز نگہ، تنگ دام

وقت کے معبد میں سب مجورِ رکوع و سجود — وقت کے سب مقتدی، وقت ہے سب کا امام

کس کو ملی ہے یہاں فرصتِ اظہارِ شوق — کس کو ملی ہے یہاں فرصتِ عیشِ دوام

خوابِ پریشاں سے کم آمدنِ دل نہیں — خواہشِ عیشِ دوام، ایک تمنائے خام

وقت کی اک آن میں ماضی و فردا و حال — وقت کی اک شان ہے انجمنِ صبح و شام

وقت عظیم و جلیل، وقت محیط و بسیط
وقت کو کچھ مت کہو، یہ ہے کسی کا پیام

وقت ہے دوران و دور، وقت ہے گرم و سرد
وقت ہی خود زخم ہے، وقت ہی خود التیام

وقت نہیں بے حدود، وقت نہیں بے ثبوت
اس کی بھی ہے انتہا، اس کا بھی ہے اختتام

وقت ہے سیل رواں، عشق ہے کوہ گراں
وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام

عشق ازل آشنا، عشق ابد افتخار
عشق ہے دار البقا، عشق ہے دار القرار

(۳)

اب نگہ شوق میں غیب ہے عین شہود
راز کہاں رہ گیا، عالم بود و نبود

شاہد تقدیر نے رخ سے الٹ دی نقاب
پھر وہی ذکر جمیل، پھر وہی گفت و شنود

عشق پہ تیری بنا، عشق سے تیرا خمیر
ہے یہی راز دوام، ہے یہی راز خلود

نقش ترا لازوال، نقش ترا بے مثال
کام تو کچھ کر گیا، عشق کا ذوق نمود

جس کے تھے قلب و نظر جلوہ شناس ازل
تھا وہ یقیناً ترا نقش طراز وجود

جس کے ہنر نے کئے جمع بحسن و کمال
کسوت تہذیب کے بکھرے ہوئے تار و پود

جس کو بہا لے گیا ساحل مقصود تک
لطمۂ بحر عطا، موجۂ دریائے جود

جس کی امیری سے تھا حسن فقیری عیاں
جس کی نگاہوں میں ہیچ، خوبی ایوان شوق ہو

راز کے بند قبا کھل گئے اک آن میں
عقدہ مشکل کی تھی جس سے کشاد و کشود

اس کی نگہ دل کشا، اس کی ادا حق نما
کتنے ہی فتنے اٹھے زیر سپہر کبود

بزم گہ ناز میں جلوہ فزائے کرم
رزم گہ کارزار میں ہو شرربائے جنود

زورق و طوفاں شکن، ہر دو جہاں تیغ زن
قیصر و خاقاں شکن، اس کا قدم در درود

جس کا خیال و عمل، باعث تجدید شوق
جس سے کہ ٹوٹا گیا مغربیوں کا جمود

خلوت و جلوت میں تھا نقش گر صد یقین اسکا قیام و قعود اسکا رکوع و سجود
اسکا ایمان عطا، شاہد تہذیب حرم اسکی رہین کرم، کارگہ دیر و زود
کتنے دنوں تک رہا ساز نوا بے خروش کتنے دنوں تک رہی محفل جاں بے سرود

اک نئے عنوان سے جشنِ بہاراں ہوا
جشنِ بہاراں ہوا، رقص نگاراں ہوا

(۴)

تیرے ہر اک سنگ میں نور دل جبرئیل تو ہے عدیم النظیر، تو ہے عدیم المثیل
تیری ہر اک خشت میں حسن نگہ دلبری تیرا ہر اک پیچ و خم، رقص گہ سلسبیل
منبر و محراب و در، یہ ترے نقش و نگار مصدر خیر کثیر، مرکز اجر جزیل
تیری بلندی سے پست ہفت سپہر بریں تجھ سے ہوا فرش خاک کتنا عظیم و جلیل
جن کی بہاروں سے فاش راز بہار ارم تیرے وہ گلزار و باغ، تیری وہ کشت نخیل
حکمت تعمیر کو تجھ سے ملی آب و تاب حکمت تعمیر کا تیری نہیں ہے عدیل
وسمۂ ابروئے نیست ہے ترا دود چراغ تیری کف خاک سے دیدۂ مغرب کحیل
شمع رہ دیں بنی ظلمت مغرب میں تو علم و ہنر کے لئے تیری بنا سنگ میل
مجھکو ہے معلوم [illegible] وہ آذر ترا آہ وہ فرد فرید، آہ وہ مرد نبیل
مرحلۂ حق میں تھا صبر و رضا کا نقیب جس سے ہوا آشکار سر ذبیح و خلیل*
اسکا عمل اسکا عزم اسکا حشم اسکا حرم چشم جہاں کے لئے ایک کتاب الدلیل
جس کی زرہ لا الٰہ جسکی سپر لا الٰہ جسکے لئے کچھ نہیں تیغ و سناں سب قلیل
عرصۂ پیکار میں، قلزم ذخار میں کچھ نہ رہا کیف و کم، کچھ نہ رہا قال و قیل
بن گیا مضراب جاں بن گیا مہمیز شوق اسکے قلم کا صریر، اسکے فرس کا صہیل
بندۂ مومن کی روح تجھ سی ہی ہے پرتوفشاں وہ بھی نہیں مستحیل، تو بھی نہیں مستحیل
پھر ہے وہی رستخیز، پھر وہی شور مستتیر تازہ نہ ہو جائے پھر قصۂ فرعون و نیل

ضرب کلیمی بھی ہے اور ید بیضا بھی ہے
ساحر عصر جدید! تو نے یہ دیکھا بھی ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

نذرِ عابد، مرتبہ جناب مالک رام صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۸۴ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ روپے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، نئی دہلی، بمبئی، علی گڈھ (۲)، علمی مجلس ۹ ۔ ۱۱ چھتہ نواب صاحب فراشخانہ دہلی نمبر ۶

نذرِ ذاکر و نذرِ عرشی کے بعد جناب مالک رام صاحب نے بزرگ صاحب علم و قلم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی خدمات و کمالات کے اعتراف کے لئے یہ کتاب شائع کی ہے، اس میں پہلے "تذکرہ" کے زیر عنوان چار مضامین ہیں، عابد صاحب کی سیرت شخصیت اور حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، عابد صاحب کی بیگم صالحہ نے ان کی گھریلو زندگی، روزمرہ کے واقعات اور عادات و خصائل کی بڑی بیساختگی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے، یہ مضمون نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے، فاضل مرتب نے ڈاکٹر صاحب کے خاندان اور تعلیم کے حالات اور تدریسی و تصنیفی کارنامے تحریر کئے ہیں، اور جمیل الدین قریشی نے ان کے مضامین و تصنیفات کا اشاریہ مرتب کیا ہے، اس حصہ میں ڈاکٹر صاحب کے عزیز غلام السیدین مرحوم کا ایک قابلِ قدر مقالہ بھی ہے، دوسرا حصہ مشاہیر علم و ادب کے بلند پایہ محققانہ مضامین پر مشتمل ہے، سرداس مسعود کی سیرت و شخصیت پر پروفیسر ہارون خاں شروانی اور شری شنکر اچاریہ کے فلسفہ ویدانت کی تشریح پر پروفیسر سلیم چشتی کے مضامین قابلِ مطالعہ ہیں، اس مجموعہ کے زیادہ اہم اور طویل مضامین دو ہیں، (۱) قاطع برہان کا پہلا مسودہ (مولانا امتیاز علی

خان خوشی، اور (۲) اقبال کا تصور زمان (شبیر احمد خاں غوری) پہلے میں برہان قاطع کے حاشیہ پر غالب نے قاطع برہان کے نام سے اس کا جو رد لکھا تھا اس پر نظر خیال کرکے اکی تائید یا تردید کی گئی ہے، دوسرے میں زمانہ کے متعلق ڈاکٹر اقبال کے خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ وہ تاثمہ زمان کے قائل تھے، گو بظاہر اس بارہ میں ڈاکٹر صاحب کے بعض خیالات محل نظر اور غیر معتدل معلوم ہوتے ہوں، لیکن مقالہ نگار نے بھی زود حسی اور بعض شاعرانہ خیال آرائیوں کی تعبیر میں شدت پسندی سے کام لیا ہے، لیکن مضمون کاوش اور دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے ترکی کے ابراہیم شناسی کے افکار پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ مولانا شبلی پر ماضی کی خوابناک فضاؤں میں گم ہو جانے، حال کو نظر انداز کر دینے اور مستقبل کی تعبیر سے غفلت پر طنز کیا ہے، حالانکہ اس زمانہ کے علماء میں مولانا شبلی زمانہ سے واقفیت اور باخبری کے لئے ممتاز تھے، اور انھوں نے حال و مستقبل کی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہی کیلئے ماضی کے سبق آموز واقعات مسلمانوں کو یاد دلائے تھے۔

اس واسطے چھیڑا ہے پرانوں کا فسانہ   شاید ترے کانوں تک پیغام عمل جائے

ڈاکٹر سید عابد حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین خدمت گذاروں اور بنیادی معماروں میں ہیں، اور اس کے کاموں میں وہ ڈاکٹر ذاکر مرحوم اور پروفیسر مجیب کے دست راست رہ چکے ہیں، ان کا اصل ذوق درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہے اور اردو کے صاحب طرز ادیب ہیں، اور اُن کی تصنیفی خدمات ان کی تعلیمی خدمات سے زیادہ اہم ہیں، اس لئے ان کے کمالات کا اعتراف بجا بھی ہے، اور قابل تحسین بھی، اس کے لئے مالک رام صاحب اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں،

اکابر تعلیم :- از جناب سعید انصاری صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت
عمدہ صفحات ۲۲۰، قیمت عہ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مصنف کی پوری زندگی تعلیمی خدمات میں گذری اور تعلیم اور اس کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے، اور وہ اس پر وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے دس ایسے مشاہیر کے تعلیمی افکار و نظریات کا خلاصہ تحریر کیا ہے، جنھوں نے جدید تعلیم کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں اور اس کے عملی پہلوؤں پر بحث کی ہے، ان میں افلاطون، روسو، پستالوزی اور جان ڈوئی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ہندوستان کے مشاہیر میں ٹیگور اور گاندھی جی کے نام ہیں، لائق مصنف نے ان کے تعلیمی تصورات کے ساتھ ان کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے لیکن جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہ مواد تدریس کی غرض سے اکٹھا کیا گیا تھا اس لئے اس میں بڑا اختصار ہے، اور کہیں کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے، اردو داں طبقہ گاندھی جی اور ٹیگور کے حالات سے تو واقف ہے، لیکن غیر ہندوستانی مشاہیر تعلیم کے حالات سے اسکو کم واقفیت ہے، اسلئے انکے حالات قدرے اور تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، یہ کتاب مصنف کے تعلیمی تجربے، وسیع مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہے، اسلئے بہت مفید اور خصوصاً مدرسین کے مطالعہ کے لائق ہے۔

صحیفۂ جمال :- از پروفیسر عبد السمیع خاں نکہت، تقطیع متوسط کاغذ کتابت طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۸۴
قیمت ہے، پتہ: نکہت منزل محلہ ہند پورہ شاہجہاں پور۔ یو۔ پی،

پروفیسر عبد السمیع خانصاحب نکہت شاہجہاں پوری کہنہ مشق شاعر بھی ہیں اور صاحب علم و قلم بھی، نظم و نثر میں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، ان کتابوں میں مذہبی اور صوفیانہ مسائل اور متکلمانہ و فلسفیانہ مباحث کی تشریح کی گئی ہے،

زیر نظر کتاب نکہت صاحب کی تازہ تصنیف ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ صحیفہ جمال میں دینی اور اخلاقی اور صوفیانہ حقایق سے متعلق آیات اور ان کے منظوم ترجمے پیش کئے گئے ہیں، دوسرے حصہ صحیفہ کمال میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے فضائل واثرات، تجلیات وصفات ربانیہ کی دلکش تفسیر اور ۹۹ ناموں کی خصوصیات ان کے روزمرہ ورد کے فوائد اور روحانی برکات بیان کئے گئے ہیں، تیسرے حصہ صاعقۂ جمال میں مذہب وتصوف اور کلام وعقائد کے مسائل کا ذکر اور موجودہ دور کے فاسد رجحانات اور بے راہ روی پر تنقید کی گئی ہے، اس طرح تینوں حصے اسم با مسمی ہیں، پہلا اور تیسرا حصہ منظوم اور دوسرا نثر میں ہے، لیکن تیسرے حصہ کے حواشی میں بعض کلامی مباحث کی تشریح نثر میں کی گئی ہے، اور دوسرے میں اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں کی تشریح میں ان کے مناسب مصنف کی ایک رباعی بھی ہے، آیتوں کی نقل اور تصحیح میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، اس لئے بعض آیتیں غلط نقل ہوگئی ہیں، ص۱۲ پر خیر وشر کے زیر عنوان واللہ خالق الظلمات والنور درج ہے، حالانکہ یہ کوئی آیت نہیں، کہیں کہیں تحریر کے الجھاؤ سے قطع نظر، نظم ونثر کا یہ گلدستہ مختلف النوع دینی معلومات کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔

تاریخ نور: مرتبہ جناب کلیم الدین احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ وکتابت، طباعت بہتر صفحات ۴۰، قیمت ۸ ریتہ:۔ ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی، پتھر کی مسجد پٹنہ نمبر ۹۔

یہ نواب نور زماں بیگم کے نام واجد علی شاہ کے ۴۴ خطوط کا مجموعہ ہے، ان میں ۳۴ خطوط واقعۂ نظربندی کے زمانہ کے اور دو رہائی کے بعد کے ہیں، تاریخ نور کا ایک قلمی نسخہ جناب کلیم الدین احمد صاحب کے ذخیرہ سے ملا تھا جس کو انھوں نے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، ابتدا میں حمد ونعت کے چند

اشعار اور کتاب کی تالیف کے آغاز کے متعلق نواب نور زماں بیگم کی ایک مختصر تحریر ہے، اور خاتمہ بھی بیگم صاحبہ ہی کی تحریر اور ان کے کاتب محمد حسن لکھنوی کی مختصر تحریر اور مدحیہ اشعار پر ہے، یہ خطوط چونکہ بادشاہ نے اپنی محبوبہ کو لکھے تھے، اس لئے ان میں بڑی رنگینی اور شوخی ہے، مقدمہ میں مخطوطہ کے متعلق مختصر اظہار خیال کے بعد واجد علی شاہ کے بارہ میں بعض تذکرہ نگاروں اور مورخین کے دلچسپ بیانات نقل کئے گئے ہیں، تاریخ نور واجد علی شاہ کی نظم نثر دونوں کا نمونہ اور ایک ادبی تبرک اور دستاویز ہے،

خوان خلیل، از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت ۱۲ پتہ: ناظم کتبخانہ یحیوی، مظاہر العلوم، سہارن پور،

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے افادات ہیں یہ مختصر رسالہ بھی ہے جو نامور محدث مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب بذل المجہول کی وفات کے بعد ان کے بعض سبق آموز واقعات و حالات بیان کرنے کے لئے تحریر کیا گیا تھا، مگر اس میں ضمناً دوسرے مفید سلوکی و فقہی نکات و مسائل بھی قلمبند کئے گئے ہیں، اب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری نے اس کو تلاش کراکے شائع کیا ہے، اور اس کے آخر میں مفید ضمیمہ اور جا بجا حاشی کا اضافہ کر دیا ہے، ان میں تشریح طلب امور کی وضاحت، حوالوں کا اندراج اور دوسری ضروری اور مفید باتوں کو ضبط کیا گیا ہے، اس لئے یہ رسالہ مزید بیش قیمت ہو گیا ہے، حضرت سہارنپوری کے حالات، حکیم الامت کے افادات، اور شیخ الحدیث کے ضمیمے نور علی نور اور قدر دانوں کی پذیرائی کے لائق ہیں،

قرآن اور پردہ، از مولانا امین احسن اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ، طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۴۲، قیمت: ۶۰ پیسے، پتہ دارالاشاعت الاسلامیہ، لاہور، کوثر روڈ، اسلام پورہ عہ، ر

اس مختصر کتابچہ میں پردہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں پردہ سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح کے علاوہ ان کے موقع اور محل کی تعیین کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ پردہ کے احکام دو طرح کے ہیں ایک تو گھر کے اندر کے لئے جن کی صراحت سورہ نور میں کی گئی ہے، دوسرے گھر کے باہر کے لئے جن کا ذکر سورہ احزاب میں ہے، اس فرق کو عموماً پردہ کے حامیوں نے نظر انداز کر دیا ہے اس لئے اُن کی تحریروں میں تضاد اور استدلال میں خامیاں پائی جاتی ہیں، اس حیثیت سے یہ رسالہ ان کے لئے بھی بڑا مفید ہے۔ اور اس سے پردہ کے مخالفوں کے شبہات و اعتراضات کا مکمل ازالہ بھی ہو جاتا ہے،

عظمت قرآن، تالیف جناب قاری عبد الحیٔ صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۸، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ جامع مسجد صدیقی بن اسٹاپ اڈ کورنگی کالونی، کراچی ۳۱

اس رسالہ میں قرآن مجید کی عظمت، تلاوت اور تعلیم کی فضیلت، ثواب اور آداب وغیرہ سے متعلق مفید اور ضروری باتیں تحریر کی گئی ہیں اور ختم قرآن، تلاوت کی دعائیں، قرآن کے سجدوں، موز اور اوقاف نیز حاشیہ پر درج مختلف النوع اشارات وغیرہ کی توضیح کی گئی ہے اور معلم قرآن کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، آخر میں قرأت سبعہ متواترہ سے متعلق ایک استفتا کا جواب بھی نقل کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرأت سبعہ متواترہ کا حصول فرض علی الکفایہ ہے،

سخن در سخن :۔ از جناب نواب مظفر الدین خان صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۱۴ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت للعہ پتہ :۔ ملا اکیڈمی "عزیز باغ" سلطان پورہ حیدر آباد دکن

یہ حیدر آباد کے نواب مظفر الدین خان صاحب کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے، وہ ۶ سال سے مشق سخن فرماتے ہیں لیکن ابھی انکا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے رباعی کے اوزان و بحور متعین ہونے کی وجہ سے مشکل صنف سخن ہے اسلئے ماہر فن اور قادر الکلام شعرا ہی اسمیں طبع آزمائی کرتے ہیں حیدر آباد کے بعض شعرانے اسکی جانب خاص اعتنا کیا ہے ان میں امجد حیدر آبادی اردو کے ممتاز ترین رباعی گو تھے، انکے معنوی فیض و اثر نے صاحب کو بھی اسکی جانب مائل کر دیا اور انھوں نے عشقیہ اخلاقی اور حزنیہ ہر طرح کی رباعیات کہی ہیں رباعیات کی طرح قطعات کے موضوع میں بھی تنوع ہے اور وہ عاشقانہ فلسفیانہ اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں رباعیات و قطعات دونوں میں روانی و بے ساختگی اور طرز ادا کی جدت و خوبی بھی ہے مزید مشق و ممارست سے انکے رنگ میں زیادہ پختگی اور نکھار پیدا ہوگا۔

آریہ سماج کی ترقیاں حصہ اول و دوم۔ مترجم جناب فدا حسین صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۰۴ و ۲۲۶ قیمت :۔ عہ و ۓ پتہ کٹرہ شہاب خان، اٹاوہ۔ یو۔ پی

ہندوؤں کی مشہور تنظیم آریہ سماج گذشتہ پون صدی سے زیادہ عرصہ سے اپنے مشن میں سرگرم ہے اس کتاب میں انکے مشہور ہندی آرگن آریہ مترا اور دوسری کتابوں اور اخبارات کی مدد سے انکی پچھتر سالہ کارگزاریوں اور مختلف النوع کاموں کا جائزہ لیکر مختلف شعبوں اور دائروں میں انکی ترقیاں دکھائی گئی ہیں، پہلے حصہ میں آریہ پرتی ندی سبھا اتر پردیش کا مختصر تعارف و تاریخ ۱۹۳۶ء میں آریہ سماج کی ڈائمنڈ جوبلی کے پیغامات اور تجویز وغیرہ نقل کیگئی ہیں پھر انکے اخبار صوبائی کانفرنس، بعض تقریبات مذہبی، سماجی، علمی اور تعلیمی خدمات اتر پردیش کے آریہ سماجی اسکولوں اور کالجوں اور بعض مشہور مذہبی و سیاسی رہنماؤں اور ضلع وار ترقیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں تبلیغی اداروں، ملک و بیرون ملک میں تبلیغی جد و جہد ہندی کے تحفظ اور ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے اور شدھی وغیرہ کے سلسلہ میں گوناگوں خدمات کا ذکر ہے اس سلسلہ میں مختلف سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے حمایتی بیانات اور آریہ سماجیوں کی مسلمانوں اور عیسائیوں سے ردو کد کا ذکر ہے، لائق مترجم نے آریہ سماج کی سرگرمیوں اور ترقیوں سے اردو داں طبقہ خصوصاً مسلمانوں کو واقف کرانے کیلئے یہ کتاب لکھی ہے تاکہ وہ ان پر غور و فکر کرکے اپنے متعلق انکے طرز عمل سے آگاہ ہوں۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں :-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکا خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ :- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدردانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمداللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشینِ شبلی مولنا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ وانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی علمی وادبی ولسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدامِ مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیامِ دارالمصنفین سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپیے۔

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

-----❋-----

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

دسمبر سنہ ۱۹۷۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت بارہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب تبلہ

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

حادثہ جانکاہ

دسمبر ۱۹۷۴ء کا معارف چھپ کر مکمل ہو چکا تھا کہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء بروز جمعہ بوقت ۴ بجے شام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین و اڈیٹر معارف کی حرکتِ قلب دفعتہً بند ہو گئی، اور رحلت فرما گئے

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ،

سید صباح الدین عبد الرحمن

جلد ۱۱۴ عدد ۶

ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

خدا خدا کر کے ہندوستان و پاکستان کے ڈاک، تار اور ٹیلیفون کی سہولتیں بحال کر دی گئی ہیں، اب دونوں ہمسایہ ملکوں کے اعزہ و اقربا کی خیریت معلوم کرنے میں پہلے کی طرح پھر آسانیاں ہوگئی ہیں، دونوں ایک دوسرے کو بے خبری سے بڑی بے چینی اور پریشانی تھی، ممکن ہے کہ آگے چل کر ان دونوں ملکوں کی آئندہ نسلوں میں رشتے ناطے کا سلسلہ ختم ہو جائے، مگر موجودہ نسل اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو ابھی بھول نہیں سکتی، ملک کی تقسیم سے خاندانوں کی بھی تقسیم ہوگئی ہے باپ بیٹے، بھائی بہن حتیٰ کہ شوہر بیوی سے اب تک جدا ہیں، کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب تک ایک دوسرے کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکے ہیں، حکومتوں کے سیاسی مصالح اپنی جگہ پر ہیں، مگر ان مصالح کے ساتھ انسانیت نوازی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے، اس کی اعلیٰ قدریں اگر سیاست پر غالب رہیں، تو بہت سی سیاسی پیچیدگیاں خود بخود دور ہوتی جائیں گی، ادھر ہندوستان نے پاکستان سے اچھے تعلقات پیدا کرنے میں فراخدلی کا ثبوت دیا ہے، پاکستان کو بھی اس کے جواب میں اپنی رواداری اور سیر چشمی کا اظہار کرنا چاہئے، سیاست میں نشیب و فراز ہوا ہی کرتا ہے، مگر وسعت قلبی، انسانی ہمدردی، مہر و محبت اور لطف و کرم کبھی رائگان نہیں جاتے، اگر ان انسانی قدروں سے عارضی طور پر کچھ سیاسی نقصان پہونچ بھی جاتا ہے تو اس نقصان کے پیچھے دیرپا فوائد بھی ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخوں میں ایسی مثالیں بہت ملیں گی۔

دونوں ملکوں میں ڈاک کی سہولتیں تو ضرور پیدا ہوگئی ہیں لیکن پہلے کی طرح ڈاک کی شرح قائم نہیں رہی

بلکہ اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا ہے، اسکی وجہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی پہلے دونوں ملکوں کی ڈاک کے محصول یکساں تھے، تو خیال ہوتا تھا کہ ان دونوں کی جغرافیائی تقسیم تو ضرور ہو گئی ہے لیکن دراصل دونوں ایک ہی ہیں، مگر اب نئے محصول سے اگر یہ خیال پیدا ہو تو یہ شاید غلط نہ ہو گا کہ برصغیر کے یہ دونوں ملک اب ایک نہیں رہے بلکہ ایشیا اور یورپ کے اور ملکوں کی طرح اجنبی ہو گئے، گو کارڈ اور لفافے کی شرح میں پھر بھی نسبتاً کچھ کمی رکھ کر دونوں ملکوں نے غیر شعوری طور پر اپنے اس احساس کو باقی رکھا ہے کہ ابھی وہ بالکل ہی بیگانہ نہیں ہوئے ہیں، ڈاک کی نئی شرح سے اب تک یہ واضح نہیں ہو سکا ہے کہ دونوں ملکوں میں اخبارات اور خصوصاً علمی رسائل کے بھیجنے میں خرچ کیا ہو گا، انجمن ترقی اردو کراچی نے ڈاک کھلتے ہی بڑی عجلت کے ساتھ اپنا سہ ماہی رسالہ اردو بھیج کر دار المصنفین سے اپنے علمی تعلقات قائم کئے مگر وہاں سے یہ دو رسالے ساڑھے چار روپیے میں آئے ظاہر ہے کہ اتنا گران تبادلہ کسی لحاظ سے مناسب نہ ہوگا، مگر ابھی پشاور سے رسالہ الحق دو پیسے کے ٹکٹ ہی میں یہاں پہونچ گیا ہے، پاکستان سے رسالہ معارف کی طلب جاری ہو گئی ہے، اور جس اشتیاق سے وہاں کے علمی حلقوں میں اس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس سے اسکی اہمیت اور مقبولیت کا اظہار ہوتا ہے، مگر اب تک یہ رسالہ وہاں بھیجنا ممکن نہ ہو سکا ہے، کیونکہ مقامی ڈاک گھروں میں اسکی سرکاری اطلاع باضابطہ نہیں پہونچی ہے کہ اسکے بھیجنے میں کتنے کا ٹکٹ لگانا ہوگا۔

پاکستان کے علمی حلقوں نے جہاں اس ادارہ سے اپنے خوشگوار تعلقات کے قائم ہونے پر اظہار مسرت کیا ہے وہاں ایک ہمدرد نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ سعید اینڈ سنز کراچی، سیرۃ النبیؐ کی جلدیں چھاپ رہے ہیں تین جلدیں تو چھاپ چکے ہیں، بقیہ اور چھاپنے کا ارادہ کر رہے ہیں، اس ادارہ کی طرف سے برابر یہ اپیل کی گئی ہے کہ پاکستان کے ناشرین اپنے ذاتی منافع کی خاطر اسکو نقصان نہ پہونچائیں، وہ اسکی مدد نہیں کر سکتے تو اسکو نقصان بھی نہ پہونچائیں ۱۹۲۹ء میں پاکستان میں قانونی طور پر اس کا اہتمام کیا گیا تھا کہ وہاں کے ناشرین یہاں کی مطبوعات نہ چھاپیں، ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائیگی، ضرورت ہوئی تو قانون کا سہارا لیا

لیا جائے گا، مگر ابھی تو پاکستان میں اس دارہ کے ہمدردوں سے بھی اپیل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی دباؤ سے ایسے ناشرین کو اس ادارہ کو نقصان پہونچانے سے باز رکھیں، ورنہ علم و فن کا یہ دیرینہ ادارہ ختم ہو جائیگا، اور اس کا خون پاکستان کے خود غرض ناشرین کے سر رہے گا، یوں بھی یہ ادارہ بڑھتی ہوئی ہنگائی کے ساتھ روز بروز مالی بحران میں مبتلا ہوتا جارہا ہے۔

ہر چیز کی گرانی کے ساتھ کاغذ کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اب تک تین گنی قیمت کا اضافہ ہو چکا ہے، چھپائی کے اور ضروری سامان کی قیمت بھی اسی حساب سے بڑھ رہی ہے۔ ایک کتاب کی لکھائی چھپائی میں جو اخراجات ہوتے ہیں، اسی لحاظ سے قیمت بھی رکھی جائے تو خریداروں کی قوت خرید ساتھ نہ دے سکے گی، اس لیے یہ ادارہ بڑی کشمکش میں مبتلا ہوتا جارہا ہے جس سے اس کی مالی پریشانیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں، پھر بھی یہاں کی مطبوعات کی قیمت اور کتابوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے، اگر ان کتابوں کی فروخت ہوتی رہے تو یہ ادارہ تائید ایزدی کے ساتھ اپنی علمی خدمت میں لگا رہے گا، اس کے خدمت گذاروں پر بہت سے فرائض برابر عائد کئے جاتے رہے ہیں، مگر وہ اپنے حقوق کے بھی طلب گار ہیں، جو صرف اتنے ہیں کہ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کر کے اسکو مالی بحران سے محفوظ رکھا جائے۔

معارف کے پرانے رسالوں کی بڑی تعداد محفوظ ہے، جو رعایتی قیمت پر اب فروخت کئے جارہے ہیں، زیادہ تر ہر سال کے پھٹکر پرچے ہیں، مگر ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے مکمل فائل موجود ہیں، معارف کے شائقین ان کو خرید سکتے ہیں۔

مقالات

دیار پورب کا دوسرا علمی دور

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

دیار پورب کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی ابتداے سلطنت ۶۰۲ھ سے شروع ہو کر خلجی دور سے ہوتا ہوا تغلق دور ۷۷۲ھ میں جون پور کی تعمیر و تمصیر پر ختم ہوا، اس پونے دو سو سالہ دور میں پورب میں علماء و فضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات و قریات میں پائی جاتی تھی، مگر مانک پور کڑا کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کر کے ایک عظیم علمی و دینی مرکز قائم کیا، اور حضرت قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہندی ظفرآبادی کی ذات والا صفات سے سواد جونپور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لیکر خاتمہ سلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال یہ شہر اپنے حدود سمیت علم و فضل اور علماء و فضلاء کا گہوارہ بنا رہا، اس چار سو سالہ دور میں تغلقی شرقی، لودی، تیموری سلطنتوں کی آمد و رفت رہی، مگر دیار پورب اور حدود جونپور کی علمی و دینی محفل کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا اور تخت و تاج کے انقلابات کی زد سے مسجد و مدرسہ اور خانقاہ و سجادہ محفوظ رہے، اس پورے دور کی علمی سرگرمی کا اجمالی

نقشہ مولانا خیر الدین محمد الہ آبادی جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں اس طرح کھینچا ہے:۔

"یہ شہر اپنی بنیاد کے وقت سے معدن علم اور مخزن فضل و کمال رہا ہے، ملا محمد اصفہانی نے سیر الملوک میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبہ جات دانشمندوں اور باکمال لوگوں کے مولد و منشا رہے ہیں خاص طور سے صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد، ان دونوں صوبوں کے ہر شہر و قریہ میں مدرسے، خانقاہیں اور مسجدیں اساتذۂ علوم و فنون سے آراستہ رہتی ہیں، اور ہر مدرسہ اور خانقاہ میں صدہا طالبانِ علوم اور کاسبانِ فیوض نعرۂ ہل من مزید بلند کرتے ہیں، صوبہ الہ آباد کے متعلقات میں ایک شہر ہے جسے سلطان فیروز دہلوی نے ۷۷۲ھ میں آباد کر کے جونپور کے نام سے موسوم کیا، یہ شہر سلاطین شرقیہ کے عہد میں دار السلطنت قرار پایا، اور شہر اور اس کے اطراف و جوانب میں صدہا مساجد و مدارس تعمیر ہوئے۔ مختلف اقلیموں کے علماء و فقراء اس شہر میں پہنچے اور ہر ایک کے لئے وہاں کے سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف اور جاگیریں مقرر ہوئیں، تاکہ مدرسین طالب علموں کی تعلیم و تدریس میں اور مشائخ تلقین و تربیت میں جمعیتِ خاطر کے ساتھ کوشش کریں، اور جو طلبہ دور دراز مقامات سے جوق در جوق آتے تھے، ان کی خاطر داری اور عزت و احترام میں مدرسوں اور خانقاہوں کے ذمہ داروں میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتا تھا۔

ایران کے بادشاہ طہماسپ نے سلطان ہمایوں سے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جونپور کے متعلق دریافت کیا، اور اس دیار میں علماء کی کثرت وانبوہ معلوم کر کے شہر شیراز کی ویرانی پر حسرت و افسوس کیا، اور اسی دن حکم صادر کیا کہ شیراز میں مدارس کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم و توقیر کی جائے، اور اصفہانی اور ایکے

اطراف و جوانب میں مدرسے اور خانقاہیں بنا کر علماء کو تعلیم و تدریس پر مامور کیا۔

تاریخ شاہجہانی میں لکھا ہے کہ صاحبقران شاہجہاں نے شہر جونپور کو شیراز ہند کا لقب دیکر اسے دار العلم سے موسوم فرمایا ہے۔ الغرض سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک یہ شہر مجمع فضلاء و مرجع طلبہ رہا ہے اور یہاں کے علماء و مشایخ کی تعظیم و توقیر کے لئے سلاطین کے احکام و فرامین حکام جونپور کے پاس پہونچتے رہے، ان بزرگوں کی معاشی مدد اور حفظ مراتب کے لئے صدر اور بخشی مامور کئے جاتے تھے، جو وقائع نگار سلاطین کے دربار سے جونپور کے حالات لکھنے پر مامور کئے جاتے تھے، وہ ہر مدرسہ اور خانقاہ میں خود جاکر ان کے کوائف معلوم کرکے سلاطین تک پہنچاتے، اور ہر زمانہ کے بادشاہ مدرسین اور مشایخ کا آمد و خرچ معلوم کرکے ان کی ضرورت کے مطابق وظائف اور قطائع میں اضافہ کیا کرتے تھے، جو شاہزادے اور امرائے سلطنت اس دیار سے گذرتے تھے، سلاطین کی رضاجوئی کے خیال سے معتقدانہ انداز میں ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہوکر زیادہ سے زیادہ نذر گذرانتے تھے الخ[۵]

[۵] تذکرہ مجلی ص ۳-۴- السلطانی پریس کلکتہ

دیار پورب کے اس چار سو سالہ علمی اور دینی دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرکے بنائے جونپور ۷۷۲ھ سے لیکر لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک کی ایک سو ساٹھ سالہ مدت کو یہاں کا دوسرا علمی دور قرار دیتے ہیں، جس میں تغلق، شرقی اور لودی سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا، آئندہ سطروں میں ہم ہر دور کے کی علمی و دینی سرگرمی کا جائزہ لیں گے، خاص طور سے سلاطین و امراء اور مشایخ و علماء کے خوشگوار تعلقات کو بیان کریں گے۔

تغلق دور میں علم و علماء | تغلق خاندان کا تیسرا حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق محرم ۷۵۲ھ

میں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ اس کے لئے آمادہ نہیں تھا، مگر شیخ نصیر الدین محمود ابن یحییٰ اودھی چراغ دہلی اور دیگر علما و مشایخ نے زور دیکر اسے راضی کیا، رمضان ۷۹۰ھ میں فوت ہوا، سلطان فیروز شاہ تعمیرات اور اہل علم و فضل کا شیدائی تھا، اسکے دور سلطنت میں علما و مشایخ کو سالانہ ۳۶ لاکھ ٹنکہ وظائف دیئے جاتے تھے، برنی نے اسی کے نام پر تاریخ فیروز شاہی لکھی، اس نے دہلی میں مدرسہ فیروزیہ اور مسجد تعمیر کی، فیروز آباد آباد کیا اور اپنی سلطنت کے بیسویں سال ۷۷۲ھ میں جونپور کو آباد کرکے دیار پورب کو دار العلم و العلما بنایا، حقیقت یہ ہے کہ اسی بادشاہ کی علم پروری اور علما نوازی نے سرزمین پورب کو دار العلم، دار الامان، دہلی ثانی اور شیراز ہند بنایا،

سلطان فیروز شاہ نے جونپور کو آباد کرکے بیک وقت اسکو مشرقی علاقہ کا دار الحکومت اور دار العلم بنایا اور شہزادہ فتح خاں کو وہاں کا حاکم اور مولانا علاء الدین دہلوی کو مدرس و معلم بنا کر بھیجا، ایک نے اسکا ملکی نظام سنبھالا اور دوسرے نے مملکت علم کے نظم و نسق کو درست کیا، تذکرۃ العلماء میں تاریخ شاہی کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ مولانا علاء الدین دہلوی تغلق دور کے مشاہیر علما اور اکابر فضلاء میں تھے، سلطان فیروز شاہ نے جونپور آباد کرکے ان سے منت و سماجت سے استدعا کی کہ وہاں تشریف لیجا کر طلبہ کو درس دیں، مولانا انکار کے بعد جب جانے کے لئے تیار ہوئے تو سلطان نے ان کی خدمت میں خود حاضر ہو کر انعام و اکرام سے خوب نوازا اور شاہانہ انداز پر لوازم سفر مہیا کئے، اپنا خاص گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا، اور خود رکاب پکڑ کر مولانا کو اس پر بٹھایا اور وہ چار سو شاگردوں کے ساتھ دہلی سے جونپور کے لئے روانہ ہوئے، سلطان نے ان تمام طالب علموں کو بھی عطایا دیئے، اور ایک شاہی امیر کو ان کا قافلہ

خدمت کے لئے ساتھ کیا، اور راستہ کے تمام امراء و حکام نے اپنی اپنی سرحد میں اس علمی و دینی کارواں کا شاندار استقبال کیا، شاہزادہ فتح خاں نے جو اپنے والد سلطان فیروزشاہ کی طرف سے حاکم جونپور تھا، یہاں موجود تھا، مولانا کی آمد کی خبر سنکر ارکان دولت کے ساتھ شہر سے بارہ۱۲ کوس باہر استقبال کیلئے آیا، اور کمال عقیدت کے ساتھ شہر کے حصار کے جلوخانہ سے ایوان تک مولانا کی رکاب میں پیدل آیا، اور سلطان کے حکم کے مطابق مولانا کو دوبارہ طلائی سکوں سے وزن کر کے یہ رقم ان کے نذر کی، مولانا علاء الدین دہلوی نے جونپور آنے کے بعد علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت میں ایسی کوشش کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں چوالیس۴۴ مدرسے قائم ہوگئے، اور ان کے غلغلہ سے پورا دیار پورب گونج اٹھا،

"در اندک ایام از یمن قدوم مولانا چہل و چہار مدرسہ در شہر جونپور و حوالی آں از مدرسان و طالبان علم آراستہ شدہ"

مولانا کا یہ علمی کارنامہ دس سال سے بھی کم مدت میں انجام پایا، وہ جونپور ہی میں ۷۸۳ھ میں فوت ہوئے، اور شہر کے جنوب میں بیرون حصار دفن کئے گئے، [۱]

۷۹۰ھ میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری بادشاہ سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے وزیر ملک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر جونپور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جونپور لایا، اور ان دونوں نے شاہزادہ فتح خاں اور مولانا علاء الدین کے کام کو آگے بڑھایا، تذکرۃ العلماء میں طبقات ناصری کے حوالہ سے ہے کہ مولانا شرف الدین لاہوری

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۱۰ و ۱۱

اشرف الشرفاء، اور افضل الفضلاء تھے، فضائل صوری و معنوی کے جامع اور عالم باعمل و عامل باعلم تھے، ۷۹۶ھ میں سلطان محمود شاہ نے خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر کشور مشرق کی فرمانروائی کا پروانہ دیا تو وہ مولانا شرف الدین کو بڑی عقیدت و ارادت سے لاہور سے بلا کر سلطان محمود شاہ کے حضور میں لے گیا، اور ملک العلماء کا خطاب دیکر اپنے ہمراہ جونپور لایا، خواجہ جہاں نے یہاں آکر یحییٰ منزل کو توڑ کر بدیع منزل کے نام سے عمارت بنوائی اور اس کے پہلو میں مولانا شرف الدین کے لئے مسجد مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی، وہ مولانا سے استفادہ کے لئے خود مدرسہ میں آتا تھا، اور ان کی امامت میں ان کی مسجد میں نماز پڑھتا تھا، مولانا ۸۰۰ھ میں جونپور میں فوت ہوئے، انکی وصیت کے مطابق لاش جونپور سے لاہور پہنچائی گئی، ان کے بڑے صاحبزادے امیر صدر الدین علم و فضل کے ساتھ دولت و ثروت کے بھی مالک تھے، خواجہ جہاں کے بعد سلطان مبارک شاہ شرقی کے وزیر بنے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دور میں وزارت چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے، پھر سلطان کی اجازت سے مکہ مکرمہ چلے گئے، اور وہیں فوت ہوئے، اُن کی تصانیف میں شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی اور حاشیہ شرح تفسیر بیضاوی وغیرہ ہیں[1]،

درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے، جن میں دو امراء اور دو علماء شامل ہیں، اور ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا ہوا، اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں تک علم و فضل کا چرچا رہا، ان میں شیخ مخدوم ظہیر الدین

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۱ و ۱۲،

صدیقی متوفی ۲۷ رذوالحجہ ۸۱۷ھ محمد آباد گہنہ میں آباد ہوئے، ان کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی تھی، شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی سے خرقۂ خلافت پایا تھا، ان کے صاحبزادے مخدوم جمال الدین بن ظہیرالدین ان کے سجادہ نشین ہوئے، اور ان کے بعد شیخ داؤد بن شیخ جمال الدین ابن شیخ ظہیرالدین کو ولایت وخلافت ملی، ان تینوں کی قبریں محمد آباد کے مغرب میں سڑک کے شمال جانب ٹیلہ پر آستانہ روضہ میں ہیں، جس پر گنبد ہے، اسی سے متصل ایک مسجد بھی ہے، اسی خانوادۂ ظہیریہ سے شیخ محمد ماہ تھے، جو مبارکپور سے متصل مقام الوہ میں جاگیر پاکر سکونت پذیر ہوئے، ۱۸۲۶ء کے کاغذات کشتواری میں ان کی جاگیر کا ذکر موجود ہے،

فیروز شاہ تغلق بانی جونپور کے دور میں ایک اور بزرگ محمد آباد گوہنہ میں آئے جن کے خاندان میں کئی اہل علم پیدا ہوئے، مولوی عبدالاحد ظفرآبادی نے مظہرالاحدیہ میں لکھا ہے کہ شیخ خلیل اللہ فاروقی بعہد تغلق باہر سے دہلی آئے اور ان کے بیٹے شیخ بایزید جونپور آئے جو نیا نیا آباد ہوا تھا، اور ارباب علم وفن کا مرکز بن رہا تھا، جوناخاں (سلطان فیروز شاہ تغلق بانی جونپور) نے ان کو پرگنہ محمد آباد میں کوریا پار، کبیر پور، اور چک میر کی جاگیر دی، ان کے بیٹے، شیخ جمال الدین نے محمد آباد میں سکونت اختیار کی، ان کے بیٹے شیخ محمد اعظم سلاطین شرقیہ سے وابستہ رہے، ان کو قیام پور کا علاقہ جاگیر میں ملا، انھوں نے اپنے والد کے نام پر موضع جمال پور بسایا، ان کے تین بیٹے تھے، شیخ دریائی خاں، شیخ کبیر خاں، اور شیخ گدائی خاں، یہ لوگ تیموری دور حکومت میں برسراقتدار رہے، اور کبیر پور، اور جمال پور میں کوٹ اور قلعے اور کنوئیں تعمیر کئے، شیخ سعد اللہ نبیرہ شیخ گدائی خاں کے بعد جاگیر پر دوسروں نے قبضہ کر لیا، مگر غلام علی پسر گدائی خاں نے اسکو دوبارہ حاصل لیا، یہ راجہ اعظم شاہ بانی اعظم گڈھ کے نائب دیوان تھے، اور ان کے برادر نسبتی

شاہ بدرِ عالم، راجہ اعظم شاہ کی دیوانی میں عہدہ دار تھے، شیخ سعد اللہ بن شیخ گدائی کے تین بیٹے تھے، جن میں سے حضرت شیخ غلام فرید صاحب علم و فضل اور سب میں ممتاز تھے انھوں نے ملا نظام الدین فرنگی محلی متوفی ۱۱۶۱ھ سے تعلیم پائی تھی، ان کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے چکلہ اعظم گڈھ کے دو تپوں پر قبضہ کر لیا تھا، ان کے والد شیخ عبد اللہ شیوخ محمد آباد میں سے تھے، اور ماں کسی معمولی خاندان سے تھیں، نواب فضل علی خاں نے مولانا غلام فرید سے چکلہ اعظم گڈھ پر قبضہ کے لئے دعا کی درخواست کی، مگر انھوں نے منظور نہیں کی،

"چہاں فضل علی خاں دو تپہ از چکلہ اعظم گڈھ بقبضۂ خود آوردہ، با آنحضرت عریضہ نوشت کہ تمنائے حکومت مستقل چکلہ دارم، بہ ہمت بزرگانہ امداد فرمایند، آنحضرت بجواب او این بیت نوشتہ فرستاد،

مسکین خرے آرزوے دم کرد
نایافتہ دم، دو گوش گم کرد[1]

شرقی دور میں علم و علماء | ۷۹۳ھ سے ۸۸۴ھ تک کے تقریباً پچیس سالہ دور میں تغلق خاندان کے سلاطین کی توجہ سے جونپور اور دیارِ پورب میں علم و علماء کی آمد آمد ہوئی، اسی دور میں اس دیار کے سیاسی و ملکی حالات نے کروٹ لی، اور یہاں ایک آزاد و مختارہ دم مسلم سلطنت کا قیام ہوا، اور دہلی کی مرکزی حکومت کی ابتری نے پورب میں نیا رنگ دکھایا، طبقات اکبری میں ہے کہ ارباب تواریخ متفق ہیں کہ جب سلطان محمد تغلق شاہ کی سلطنت کا آفتاب سمت الراس سے گذر کر مائل بہ مغرب ہوا تو پورے قلمرو میں

[1] مظہر الاعدیہ ص ۱۵۱ و ۱۵۲ مطبع کاظمی کانپور ۱۳۰۲ھ

خلل و اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی، سپاہ اور فوج میں جذبہ نفرت و بغاوت نے سر اٹھایا اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سلطنت کے اہم عہدوں پر چھوٹے لوگ قابض و دخیل ہو کر ہوا و ہوس میں مبتلا ہوگئے جس سے بڑے اور ذمہ دار لوگ بد دل ہوگئے، ان ہی حالات میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری حکمراں سلطان محمود شاہ کے زمانہ میں اس کے فرستادہ حاکم جونپور خواجہ جہاں ملک سرور نے ۷۹۶ھ یا ۸۰۰ھ میں اپنی مستقل حکومت کا اعلان کرکے "سلطان الشرق" کا خطاب اختیار کیا۔ سلاطین شرقیہ جونپور میں حسب ذیل چھ سلاطین ہوئے (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور از ۷۹۶ھ تا ۸۰۲ھ مدت چھ سال چند ماہ (۲) سلطان مبارک شاہ شرقی (ملک قرنفل متبنیٰ خواجہ جہاں ملک سرور) از ۸۰۲ھ تا ۸۰۴ھ مدت ایک سال چند ماہ (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی برادر خورد مبارک شاہ از ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ مدت چالیس سال چند ماہ (۴) سلطان محمود شاہ شرقی پسر سلطان ابراہیم شاہ از ۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ مدت اٹھارہ سال چند ماہ (۵) سلطان محمد شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ از ۸۶۲ھ تا ۸۶۲ھ مدت پانچ ماہ (۶) سلطان حسین شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ از ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ مدت انیس ۱۹ سال،

۱؎ جلد ۹ ص ۹

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق دہلی کی جانب پرگنہ کول اور ابری تک، بہار کی جانب ترہت تک، اور شمال کی جانب بہرائچ تک، سلطان الشرق خواجہ جہاں نے خود مختاری کے بعد پرگنہ کول و کیلہ و بہرائچ کو زیر کیا، اور بنگال (لکھنوتی) کے راجوں مہاراجوں سے ہاتھیوں کا تحفہ جاری کرا

جو شاہان تغلق کے زمانہ میں بند ہو گیا تھا۔[1]

جونپور کی بنیاد کا خمیر کا علمی تھا، پہلے ہی دن سے علم و علماء کا مادی و ملجا بنا، اور پچیس ۲۵ سال کے بعد یہاں جو سلطنت قائم ہوئی اس کا مزاج بھی سراسر علمی تھا، اور اس کے حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں علم و علماء کی بہترین خدمت کی، اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کا پہلا حاکم شاہزادہ فتح خاں اپنے ساتھ مولانا علاء الدین دہلوی کو جونپور لایا تھا، جن کے ہمراہ چار سو طالب علم آئے تھے، اور جنھوں نے قلیل مدت میں چوالیس مدرسے جاری کئے، اسکے بعد ۷۹۲ھ میں خواجہ جہاں کو یہاں کی حکومت ملی تو اس نے مولانا شرف الدین لاہوری کو جونپور لاکر ان کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ بنوائی، اور شرقی سلطنت قائم کرنے کے بعد بھی ان سے استفادہ کرتا رہا، اور جب ۸۰۰ھ میں ان کا وصال ہو گیا، تو انکے صاحبزادے مولانا صدر الدین درباری علماء میں ممتاز شخصیت کے مالک رہے، خواجہ جہاں کے بعد جب اس کا منہ بولا بیٹا سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہوا، تو اس نے مولانا موصوف کو وزارت عطا کی اور اپنے مختصر دور حکومت میں ان کو ہر طرح سے نوازا

جونپور کی تاسیس (۷۷۲ھ) سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمران کے آخری زمانہ ۸۰۲ھ تک دیار مشرق میں علم و علماء کی تازہ بہار آتی رہی، اس دور میں جب دہلی کا مرکز حوادث و فتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اور وہاں کی علمی اور دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں، جونپور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا، ایک صدی قبل تاتاریوں کے قتل و غارت کے اثرات پورے مشرقی عالم اسلام میں باقی ہی تھے کہ ۸۰۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وسط ایشیا کو روندتا

---

[1] طبقات اکبری ص ۷۰۶، ۲

ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی پہنچ گیا، جس سے وہاں کے اہل علم پریشانی میں مبتلا ہو گئے، ادھر جونپور امن و امان اور علم و علماء کا گہوارہ بن رہا تھا، ان حالات میں خاص طور سے دہلی کے اکثر علماء و فضلا اور ان کے تلامذہ و مسترشدین نے جونپور کا رخ کیا، اور دہلی کی تباہی کے نتیجہ میں جونپور کی آبادی ہوئی، مصائب قومٍ عند قومٍ فوائد،

شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور اس سلطنت کا عہدِ زریں اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے اسکے مبارک و مسعود عہد میں مختلف دیار و امصار کے ارباب علم و فضل جونپور کے دارالامان میں پناہ گزیں ہوئے، سلطان موصوف مورخوں کے بیان کے مطابق گرویدۂ مشایخ و فقراء، محب علم و علماء، عدل پرور، رعایا نواز اور خدا ترس بادشاہ اور اس کا دور سلطنت نہایت بابرکت تھا، مولانا نظام الدین احمد بن مقیم ہروی نے طبقات اکبری میں اس عہد زریں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

بعد از وفات مبارک شاہ امرائے	سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد
دولت شرقی برادر کہتر او را سلطان	امرائے دولت نے اس کے چھوٹے بھائی کو
ابراہیم خطاب دادہ بر تخت سلطنت	سلطان ابراہیم کا خطاب دیکر تخت سلطنت
و اورنگ حکومت اجلاس نمودند و طبقات	پر بٹھایا اور عوام نے امن و امان کے گہوارے
انام در مہدِ امن و امان قرار گرفتند	میں سکون پایا، جو علماء اور مشایخ آشوب
علماء و بزرگان کہ از آشوب جہان	جہاں سے پریشان خاطر تھے، جونپور آ گئے،
پریشان خاطر بودند بجونپور کہ دراں	جو اس وقت دارالامان تھا، دارالسلطنت
ایام دارالامان بود سر برآوردند	جونپور علماء کی آمد سے دارالعلم بن گیا، او

آں دار السلطنت از فرقدوم علما
دارالعلم گردید، وچندیں کتب و رسائل
بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی
بحرالمواج و فتاوی ابراہیم شاہی، و
رشاد وغیرہ ذلک چوں عونِ الٰہی قرین
ل بادشاہ بود، لاجرم در عنفوان دولت
تجارب و کامرانی از جمیع سلاطین ہند
رمضمار معانی قصب السبق ربودہ[۱]،

کئی کتب و رسائل سلطان ابراہیم
کے نام سے تصنیف ہوئے، جیسے
حاشیہ ہندی، بحرالمواج، فتاویٰ
ابراہیم شاہی اور ارشاد وغیرہ
چونکہ توفیق خداوندی اس بادشاہ
کا ساتھ دے رہی تھی اس لئے
وہ امور سلطنت کے تجربات اور مقاصد
کی کامیابی میں ہندوستان کے تمام بادشاہوں

محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے:-

ادشاہے بود متصف بعقل و دانش
و تدبیر در عصر وے فضلاے ممالک ہندوستان
دانشمندانِ ایران و توران کہ از
آشوب جہاں پریشان خاطر بودند بدارالامان
جونپور آمدہ در عہد امن و امان غنودند،
از خوانِ احسان او ذلہا بر داشتہ بنام
نامی او رچنانچہ بزبان قلم خواہد آمد چندیں
کتب و رسائل پرداختند، امرا و وزرا
صاحب عقل و سیاست و شجاعت در دولت

سلطان ابراہیم شاہ شرقی عقل و دانش اور تدبیر
کے اوصاف سے متصف تھا، اس کے دور میں
ہندوستان کے مختلف شہروں کے فضلا اور ایران
و توران کے ارباب علم و دانش جو آشوب جہاں
سے پریشان خاطر تھے، جونپور میں آکر امن و امان
کے گہوارے میں آرام سے سوئے، اور اس کے
دستر خوان کرم سے بہرہ ور ہوئے، اور اس کے
نام سے کئی کتب و رسائل لکھے، عقل و تدبیر
اور سیاست و شجاعت رکھنے والے امراء اور

---

[۱] طبقات اکبری ص ۵۲۹،

خانۂ او جمع شدہ مثل درگاہ سلاطین ایران رنگین گردید،

وزراء اسکے دربار میں جمع ہوئے جن کی وجہ سے اسکا دربار سلاطین ایران کے دربار کی طرح پرکشش اور رنگین ہو گیا تھا،

جہاں آفرین تا جہاں آفرین
بچو او مرزبانے نیاید پدید

جہاں آفرین تا جہاں آفرین،
چو او مرزبانے نیامد پدید

۸۱۶ھ میں آخری بار ابراہیم شاہ شرقی دہلی کی تسخیر کیلئے چلا مگر راستہ سے لوٹ آیا اور اپنی توجہ ملک اور رعایا کی خدمت، امن و امان کی بحالی، عدل و انصاف کی فراوانی، علماء و فضلاء اور مشائخ کی خبرگیری پر مرکوز کر دی، فرشتہ میں لکھا ہے:

"وبعد از کوچ چند از راہ برگشتہ بدار العلم جونپور آمد و بصحبت علماء و مشائخ و تعمیر ولایت، و تکثیر زراعت مشغول شد سالہا ہیچ طرف سواری نفرمود، و مردم از اطراف و اکناف ہندوستان کہ مشحون از خلل شدہ بود روئے بجونپور آوردہ ہر یک فراخور مرتبت و حالت نوازش می یافتند، و از خادم و مشائخ و علماء و سادات و نویسندہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جونپور را دہلی ثانی می گفتند، و کوچک و بزرگ آں دیار وجود شاہ

چند بار دہلی کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کرنے کے بعد سلطان ابراہیم دار العلم جونپور میں واپس آکر علماء و فضلاء کی صحبت، ملک کی تعمیر اور زراعت کی تکثیر میں مشغول ہو گیا اور کئی سال تک باہر نہیں نکلا، اس درمیان میں ہندوستان کے مختلف دیار کے لوگ پریشان حالی و بے چینی کی وجہ سے جونپور چلے آئے اور اُن میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق شاہی نوازش سے حصہ پایا معمولی درجہ کے خدام سے لیکر علماء و مشائخ، سادات اور لکھنے پڑھنے والے عہدے اور منصب

لہ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵،

ابراہیم شاہ شرقی از جملہ مغتنمات شمردہ دورۂ حیات را بنشاط و انبساط می گذرانیدند، از شاہ گرفتہ تا گدا باتمام خوش وقت بودند، حزن و اندوہ از ان دیار بستہ بود،
(تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۷)

....

سے یوں نوازے گئے کہ جونپور دہلی ثانی کے نام سے مشہور ہوگیا، اور تمام چھوٹے بڑے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت جان کر دوڈن کی زندگی کو نشاط و انبساط کے ساتھ بسر کرنے لگے، شاہ و گدا خوش وقت تھے اور اس دیار سے رنج و غم اپنا بوریا بستر لپیٹے ہوئے تھا،

ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علما، و مشائخ کھنچ کھنچ کر جونپور آگئے، اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہوگیا، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیرالدین دہلوی، شیخ ابوالفتح بن عبدالحئی بن مولانا عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی، شیخ نصیرالدین ابن نظام الدین غزنوی دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی، شیخ محمد عیسیٰ دہلوی جونپوری، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری، شیخ محمد بن خضر دہلوی وغیرہ نے بڑے اطمینان و سکون سے تعلیم و تدریس، ارشاد و تلقین، ذکر و شغل اور رشد و ہدایت میں مشغول ہوئے، اور ان کے خانوادے کئی صدیوں تک معدنِ علم و فضل رہے،

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو غایت عقیدت اور کمال محبت سے جونپور آنے کی دعوت دی، اور اپنے خاص نمایندوں کو ہدایا و تحائف دیکر ان کی خدمت میں بھیجا، قاضی صاحب علما، و فضلا اور طلبہ کی ایک جماعت ساتھ روانہ ہوئے، سلطان نے بڑھکر استقبال کیا، اور جامع مسجد (اٹالہ مسجد) کے پہلو میں ان کے لئے مدرسہ اور مکان بنوایا، فرشتہ کا بیان ہے، کہ سلطان نے قاضی صاحب

کی توقیر و تعظیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، خاص خاص تقریبوں میں قاضی صاحب کو شاہی دربار میں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا، ایک مرتبہ قاضی صاحب بیمار پڑے تو سلطان مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر گیا، اور پانی کا بھرا ہوا ایک پیالہ لے کر قاضی صاحب کے سر پر گھمایا اور یہ کہہ کر پانی پی گیا کہ یا خدایا جو مصیبت ان پر آنے والی ہو، اسے میرے نصیب میں کرکے ان کو شفا دیدے، اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحب تخت و تاج کو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے کس قدر انسیت و محبت تھی[1]،

تذکرۃ العلماء میں ہے کہ ایک مرتبہ قاضی عبد المقتدر شریحی نے دہلوی نے اپنے تلمیذ رشید قاضی شہاب الدین کی خواہش اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے شوق زیارت پر جونپور کا قصد فرمایا، قاضی شہاب الدین اور سلطان ابراہیم سیکڑوں علماء و فضلاء، ہزاروں طلبہ، شہزادوں اور ارکانِ دولت کو لیکر بارہ کوس تک پیشوائی کے لئے نکلے، سلطان نے جب دیکھا کہ قاضی صاحب اپنے استاد کی رکاب میں پیدل چل رہے ہیں تو خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا، آگے بڑھے تو شاہی اصطبل کے تین گھوڑے موجود تھے، سلطان نے قاضی عبد المقتدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھوڑے پر بٹھایا، دوسرے پر قاضی شہاب الدین سوار ہوئے، اس کے بعد سلطان سوار ہوا، اور تینوں ساتھ روانہ ہوئے، جہاں راستہ تنگ ہوتا تو سلطان دونوں عالموں کو آگے کرتا اور خود ان کے پیچھے چلتا اسی ترتیب سے شہر میں داخل ہوئے، جلوخانہ سے لیکر ایوان شاہی تک انواع و اقسام کے طلا باف کپڑے بچھائے گئے تھے، قصر شاہی کے قریب پہنچے

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۷،

تو سلطان نے قاضی عبد المقتدر کی رکاب پکڑ کر ان کو اتارا اور شاہی مسند پر بٹھا کر خود قاضی شہاب الدین کے ساتھ خدمت میں کھڑا رہا، اس موقع پر جو شاہی ہدایا و تحائف پیش کئے گئے ان کی مجموعی قیمت ایک لاکھ سے زیادہ تھی، قاضی عبد المقتدر ایک سال تک اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ جونپور میں مقیم رہے، ہر ہفتہ ایک دن محفل وعظ منعقد ہوتی تھی، جس میں سلطان ابراہیم، شاہزادے، بیگمات اور ارکان دولت شریک ہوتے اور صدہا غیر مسلم مشرف باسلام ہوتے تھے، اور عوام زار و قطار روتے تھے، ایک سال کے بعد قاضی عبد المقتدر نے ضعف اور پیری کا عذر کرکے سلطان سے دہلی جانے کی اجازت چاہی، اور سلطان کی درخواست پر اپنے صاحبزادے شیخ عبد الواحد کو جونپور میں چھوڑ کر خود دہلی تشریف لے گئے[1]، تذکرۃ العلماء کا یہ بیان قاضی عبد المقتدر سے متعلق محلِ نظر ہے، کیونکہ ان کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی ہے، جب کہ شرقی سلطنت کا قیام بھی نہیں ہوا تھا، اور اس کا تیسرا حکمراں سلطان ابراہیم ۸۰۴ھ میں تخت نشین ہوا ہے، اس لئے اس کا تعلق کسی دوسرے نامور عالم سے معلوم ہوتا ہے،

مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں ہیں، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم شاہ قصبہ ایچولی گیا، تو شیخ احمد عبد الحق نے ملاقات کرنی چاہی، اور فرمایا کہ الناس علی دین ملوکھم کے رو سے ابراہیم مسلمان بادشاہ ہے اس کی رعایا کو مسلمان رہ کر اس کی محبت کا دم بھرنا چاہئے، جب لشکر شاہی کے قریب پہونچے تو قاضی رضی نے بڑھ کر استقبال کیا، اور ان کو اپنی قیام گاہ میں ٹھہرا کر سلطان سے کہا کہ ایک درویش جو قطب وقت ہے، ملاقات کے لئے آیا ہے، سلطان ابراہیم

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۷،

شاہ نے کہا کہ میں خود ان سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں، قاضی رضی نے کہا کہ رات میں ان سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، پہلے ان کی خدمت میں کچھ نذر کرنا چاہیے، اگر قبول کر لیں گے تو سلطان کا ملنا مناسب ہوگا، سلطان کو یہ بات پسند آئی، اور فوراً ردولی کے علاقہ میں چار گاؤں اور ہزار بیگھہ زمین جاگیر میں دینے کا حکم دیا، قاضی رضی پروانہ اور کچھ نقدی لیکر شیخ احمد عبد الحق کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ سلطان نے یہ نذر پیش کی ہے، شیخ صاحب نے قاضی رضی سے فرمایا:۔

تو و ابراہیم خدایان دیگر پیدا شدہ اند	تم اور ابراہیم کیا دوسرے خدا ہو گئے ہو
کہ دعوی رزاقی می کنند، خدائے کہ	جو رزاقی کا دعوی کرتے ہو، جو خدا ابراہیم
ابراہیم را، و حشم ابراہیم را و اسپان ابراہیم	اور اس کے ملازموں، گھوڑوں اور ہاتھیوں
را و فیلان ابراہیم را رزق می دہد	کو روزی دیتا ہے، اور تمکو، تمھارے نوکروں اور
(ترا)، و اسپان ترا و حشم ترا رزق می دہد	گھوڑوں کو روزی دیتا ہے کیا وہ مجھے کہ اسکے
منکہ یک فقیر درگاہ او یم فرزندان مرا	در کا فقیر ہوں، اور میرے لڑکوں کو روزی
رزق نخواہد داد، کہ تو و ابراہیم درمیان	نہیں دے گا، جو تم اور سلطان درمیان
آیندہ،	میں آتے ہو؟

اس کے بعد اپنے خادم بختیار سے مخاطب ہو کر کہا:۔

کنواں ہوئے تو پانوں سمند کہ پاٹن جائے بارا ہوئے تو برجوں جھیل کہ برچن جائے

اور سلطان سے ملاقات کئے بغیر رات ہی کو واپس چلے گئے۔[1]

ایک مرتبہ شیخ احمد عبد الحق جونپور تشریف لے گئے، اور سلطان ابراہیم سے ملاقات

---

[1] انوار العیون فی اسرار المکنون ص ۱۰۳ - ۳۲ - ۱۰۱

فرمائی، دربار میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی موجود تھے، شیخ اور سلطان میں گفتگو ہو رہی تھی، قاضی صاحب نے کسی بات میں دخل دیدیا، مگر بعد میں حضرت کی اجب یہ بات میر صدر جہاں سید اجمل کو معلوم ہوئی تو انھوں نے قاضی صاحب سے کہا کہ اگر سلطان ابراہیم اور شیخ احمد عبدالحق میں ملاقات ہوگئی، تو پھر ہلوگوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ سلطان ہم پر یا شاہی امور پر توجہ دے سکیں گے، یہ درویش صاحب حال اور اہلِ کمال ہیں، ان کی نظر کیمیا اثر سے تانبا سونا بن جاتا ہے[۱]،

میر صدر جہاں سید اجمل شریعت وطریقت کے جامع، علوم ومعارف کے حامل اور ورع وتقویٰ میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، سلطان ابراہیم ان سے بیحد عقیدت ومحبت رکھتا تھا انکو صدر جہاں کے منصب پر مامور کیا اور انکے لئے دریا کے کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی جو آج بھی جھجری مسجد کے نام سے موجود ومشہور ہے، سلطان کا ایک شاہزادہ بھی ان کی خانقاہ کے جوار میں دفن ہے[۲]،

شیخ عیسیٰ دہلوی کو سلطان ابراہیم شاہ نے کمال آرزو سے دہلی سے جونپور بلایا، وہ اپنے چاروں فرزندوں یعنی خواجہ احمد، خواجہ محمد، خواجہ حامد اور خواجہ محمود کے ہمراہ یہاں تشریف لائے، سلطان ان کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا، اور بہت کچھ مال ومتاع سے نوازنا چاہا، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، البتہ سلطان نے ان کے لئے ایک خانقاہ بنوادی، جس میں متوکلانہ زندگی بسر کرکے تلامذہ ومریدین کی علمی ودینی خدمت اور ان کی تعلیم وتربیت کا کام انجام دیتے رہے، سلطان ہر ہفتہ شاہزادوں کے ساتھ انکی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اور فیض اٹھاتا تھا[۳]،

شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۵۰ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور آئے، اور ایک میدان

---

[۱] نواد العیون ص۲۳، [۲] تجلی نور ج ا ص۳۵ [۳] تذکرۃ العلماء ص۲۰،

میں درخت کے سایہ میں فروکش ہوئے، سلطان ابراہیم کو ان کی خبر ملی تو کمال عقیدت سے ان کے لئے مکان کا انتظام کیا، اور پورے اعزاز و احترام کے ساتھ رکھا، اور انکے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مینڈ کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے، بعد میں شیخ مینڈ کا خاندان وہیں منتقل ہوگیا، جس میں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر، شاہ اسمٰعیل، ملا محمود، شاہ ابوالغوث اور شاہ ابواسحٰق وغیرہ پیدا ہوئے،[1]

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبداللہ انصاری اودھی دہلی سے جونپور آئے، وہ جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں امرار و اعیان بھی شریک ہوتے تھے، قاضی وقت نے جامع مسجد میں ان سے ملاقات کی، اور ان کے وعظ میں برابر حاضر ہوتا رہا، بعد میں ان کو پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے، جہاں شیخ فتح اللہ منتقل ہوگئے، اور اس کے قریب اپنے لڑکے کے نام پر بہاء الدین پور ایک گاؤں بسایا، پھر کندھیارا کے نام سے دوسرا گاؤں بسایا، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ چلتا رہا، آخری دور میں شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولوی حسن علی حسن بن شیخ نوازش علی ماہلی متوفی ۱۲۵۰ھ پیدا ہوئے،[2]

اسی دور میں ایک بزرگ شیخ عبدالحکیم اپنے دس لڑکوں کے ساتھ وارد جونپور ہوئے، سلطان ابراہیم نے ان کی بھی آؤ بھگت کی اور کئی مواضعات جاگیر میں دیئے، اور ان کے اونچے عہدوں پر فائز ہوئے، خود شیخ عبدالحکیم کو سلطان کی طرف سے خان کا خطاب ملا، اور نتھوپور (گھوسی) وغیرہ کئی پرگنوں کے مدار المہام مقرر ہوئے، انھوں نے مبھولی سے لیکر بہار تک کے علاقوں کا نہایت عمدہ نظم و نسق

---

[1] تجلی نور ج ا ص ۱۰۹ وغیرہ، [2] تذکرۂ صبح وطن ص ۴۶ و تاریخ الافکار ص ۲۳ وغیرہ،

قائم کیا اور وہاں سلطان کے نام کا سکہ جاری کیا، بعد میں ان کی اولاد محمود پور عوث پیاہ میں آباد ہو گئی، اور جب آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین شاہ کو سکندر لودی نے شکست دی اور نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی تو مقامی سرکشوں نے شیخ عبد الحکیم اور اُن کے کئی لڑکوں کو قتل کر ڈالا، شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیروی لہرادی کی والدہ اسی خاندان سے اور شیخ میرجان صدیقی کی صاحبزادی تھیں[1]،

شیخ عیسٰی کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے، ان کے فرزند حضرت شیخ محمد بن عیسٰی تاج جونپوری متوفی ۸۷۸ھ علمائے ربانیین اور اولیاء کاملین میں سے تھے، سلطان ابراہیم شاہ اور اس کے بیٹے سلطان محمود شاہ دونوں ان سے انتہا درجہ کی عقیدت و محبت رکھتے تھے، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم نے کمال عقیدت سے ان کی خدمت میں بڑے قیمتی کپڑے بھیجے، شیخ محمد بن عیسٰی تاج نے ان کے لینے سے انکار کر دیا اور یہ اشعار پڑھے،

من دلق خود باطلس شاہاں نمی دہم	من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم
از رنجِ فقر در دلِ گنجے کہ یافتم	ایں رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

شیخ محمد بن عیسٰی جمعہ کی نماز محلہ دریبہ کی مسجد خالص مخلص میں پڑھتے تھے، بڑھاپے تک ان کا یہی معمول رہا، ایک مرتبہ سلطان محمود نے ان کی پیری اور کمزوری دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو آپ کی خانقاہ کے قریب ایک مسجد تعمیر کرا دی جائے، اور آپ کی اجازت سے سلطان نے جامع مسجد دجامع الشرق کی تعمیر شروع کی، جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ نے کی[2]،

---

[1] مناقب غوثی باب ششم قلمی [2] تجلی نور ج ۱ ص ۲۳،

سلطان ابراہیم کے فقراء و مشایخ سے بہرحال میں حسن ظن رکھنے کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ شیخ رکن الدین بن مخدوم شیخ صدرالدین سہروردی جونپوری متوفی ۸۷۷ھ سے ایک مرتبہ خلاف شرع کوئی فعل سرزد ہوگیا، قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے اس پر سخت نکیر کی، اور اپنے شاگرد شیخ عبد الملک عادل کو تنبیہ کے لئے بھیجا، مگر وہ شیخ رکن الدین کی مشیخت کے مقابلہ میں اپنی علمیت سے کام نہ لے سکے، اور انکے ہمنوا بن گئے، اس لئے قاضی صاحب نے کوتوال شہر نصرت خاں کو پروانہ لکھا کہ وہ شیخ رکن الدین کو شہر بدر کردے، کوتوال نے بھی شیخ رکن الدین کی طرفداری کی اور سلطان ابراہیم سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہے، چنانچہ سلطان نے بھی چشم پوشی کرلی، ایک مرتبہ قلندروں کی ایک جماعت نے شیخ رکن الدین سے کچھ سوال کیا انھوں نے اپنے فرزند جلال کا ہاتھ پکڑ کر ان کے حوالہ کردیا، اس واقعہ کی خبر سلطان ابراہیم کے وزیر عماد الملک قاضی خاں کو ہوئی تو انھوں نے قلندروں کو پانچ سو کی رقم دیکر جلال کو ان سے لے لیا اور شیخ رکن الدین کے گھر پہنچادیا[1]،

(باقی)

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۳۳،

حیاتِ شبلی

مولانا شبلی کے شایان شان انکی بہت مفصل سوانحعمری جانشین شبلی علامہ سید سلیمان ندوی کے حقیقت نگار قلم سے اسکے عالمانہ و محققانہ مقدمہ میں دیار پورب خصوصاً جونپور، اعظم گڈھ اور غازیپور کی مجلس علمی تاریخ کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر علم و ادب اور ارباب درس و تدریس کا بھی ذکر آگیا ہے، قیمت ۲۲ روپے (طبع دوم) منیجر دار المصنفین،

شرح السنۃ امام بغویؒ

از ۔ ضیاء الدین اصلاحی

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے شوافع میں تین اشخاص کو حدیثوں کی شرح و توجیہ میں نہایت قابل اعتماد اور بے نظیر قرار دیا ہے[1]، ان میں دو امام خطابیؒ اور امام نوویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی شرحوں کی خصوصیات معارف میں پہلے تحریر کی جاچکی ہیں۔ اس مضمون میں امام بغویؒ کی شرح السنۃ کا ذکر مقصود ہے۔

امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی (م سنہ ۵۱۶ھ) حدیث و فقہ اور تفسیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان سہ گانہ علوم میں ان سے بیش قیمت اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، شرح و توجیہ حدیث میں شرح السنۃ بڑی جامع اور اہم کتاب ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں،

خصوصاً شرح السنۃ در فقہ حدیث و توجیہ مشکلات کافی و شافی است گویا شرح مصابیح و مشکوٰۃ از آں کتاب حاصل است[2]

خاص طور سے امام بغویؒ کی شرح السنۃ فقہ، حدیث اور حل مشکلات میں کافی و شافی ہے اور گویا کہ مصابیح[3] و مشکوٰۃ کی شرح اس سے ہوجاتی ہے۔

زمانہ حال کے فاضل شعیب ارناؤوط تحریر کرتے ہیں۔

" یہ سنت و حدیث کی اہم اور سلف کی بہترین کتابوں میں ہے، ترتیب و تنقیح اور

---

[1] عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۰۔ [2] ایضاً۔ [3] مصابیح السنۃ بھی امام بغوی ہی کی تصنیف ہے، مشکوٰۃ کی ترتیب و تالیف اسی نہج پر کی گئی ہے۔

وثوق و اعتبار کے لحاظ سے اس کا پایہ نہایت بلند ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث، اس کے ناقلین، اس کی فہم و درایت اور علل نیز صحابہ و تابعین، ائمۂ مجتہدین اور فقہائے امصار کے اقوال سے مصنف پوری طرح واقف اور نقل و تحقیق میں ہر طرح قابل اعتماد ہیں"[۱]

۱۹۷۱ء میں اس کتاب کی ابتدائی پانچ جلدیں بیروت سے شعیب ارناؤوط اور محمد زہیر الشاویش کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ پہلی دفعہ شائع ہوئی ہیں، یہ مضمون انہی جلدوں کو پیش نظر رکھکر تحریر کیا گیا ہے، ان جلدوں میں ایمان، علم، طہارۃ، صلاۃ، فضائل قرآن، ادعیہ اور جنائز کے جملہ ابواب اور زکوٰۃ کے چند ابواب شامل ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بقیہ جلدیں بھی چھپ گئی ہیں یا نہیں؟

مصنف کے زمانہ کی دینی بےحسی نے ان کے دل میں شرح السنۃ کی جمع و تالیف کا داعیہ پیدا کیا، انھوں نے جب دیکھا کہ لوگوں کی توجہات فقہی کتابوں کی طرف زیادہ مرکوز ہوتی جا رہی ہے، اور قرآن و سنت کے علوم اور ان کے معانی کی بحث و تحقیق سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے تو انھوں نے مسلمانوں کی خیر خواہی کا لازمی تقاضا اور اپنا یہ دینی حق سمجھا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں جو روایت و درایت دونوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہو اور اس کے ذریعہ لوگوں کو ان ائمہ سلف کے اقتداء کی دعوت دیں جنکو اللہ نے اسلام کا صحیح فہم، کتاب و سنت میں تفقہ و بصیرت اور ان کے اصول و ضوابط سے رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"گو سلف کی کتابیں کافی تھیں، تاہم اس کتاب کی جمع و ترتیب کا مقصد بھی

---

[۱] مقدمہ شرح السنۃ ص ۳۔

ان کے افعال کی اقتدا اور اس رشتہ سے منسلک ہوتا ہے، جس کا ایک سرا اصدر نبوت سے جڑا ہوا ہے، باوجودیکہ ان بزرگوں کے مقابلہ میں میری کوشش نہایت حقیر اور معمولی ہے۔ مگر میرا منشا اقامت دین اور احیاء سنت کی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہونا ہے کیونکہ مجھے ان سے محبت اور ان کے طریقہ سے شغف ہے حدیث میں ہے کہ

المرء مع من احب — آدمی انھیں لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جنکو وہ محبوب رکھتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ دین کے نشانات مٹ رہے ہیں۔ اور لوگوں پر ہوائے نفس کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اہل زمانہ کے نزدیک باطل نے حق کی صورت اور جہالت نے علم کی شکل اختیار کر لی ہے، اور ٹھیک وہی کیفیت ہوتی جارہی ہے، جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تھا کہ

ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔	بیشک اللہ تعالٰے علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ بندوں (کے سینوں) سے اسکو نکال لے بلکہ علماء کو موت دیکر علم کو اٹھائے گا یہانتک کہ جب کسی عالم کو باقی نہ رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے پس ان سے (دینی مسائل) دریافت کئے جائیں گے اور وہ بغیر جانے بوجھے فتوے دیں گے یہ لوگ

(بخاری [illegible] مسلم [illegible])

اسی صورت حال نے مجھکو تجدید علم کے لیے آمادہ کیا تاکہ لوگوں میں تازگی اور بیداری

پیدا ہو، میرا حال اس شخص جیسا ہے، جس نے تاریکی میں چراغ روشن کیا ہو تاکہ بھٹکنے والے راہ یاب ہو جائیں یقیناً سعی و کوشش کرنے والا خائب و خاسر نہیں ہوتا۔"[1]

صحت و وثوق کے اعتبار سے اسکا درجہ بلند پایہ ہے کیونکہ مصنف نے معتبر کتابوں سے مستند حدیثیں نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے، چنانچہ خود رقمطراز ہیں۔

"اس میں وہی حدیثیں درج کی گئی ہیں جو ان ماہرین اور ائمہ فن کے نزدیک قابل اعتماد ہیں جن کی صداقت و امامت فن اپنے اپنے دور میں مسلّم رہی ہے اور انھوں نے ان روایات کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ باقی جن مقلوب، موضوع اور مجہول حدیثوں کو انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے یا جنکو ترک کرنے پر انکا اتفاق رہا ہے ان سے میں نے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔"[2]

علاوہ ازیں انھوں نے معتبر کتابوں سے وہی روایتیں لی ہیں جن کی سندیں ان کے مصنفین تک متصل ہیں اور عموماً خود بھی مکمل سندیں تحریر کی ہیں لیکن کہیں کہیں بعض اسناد نقل نہیں کئے گئے ہیں اس کا سبب انہی کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:۔

"میں نے جن حدیثوں کی سندیں نقل نہیں کی ہیں ان میں اکثر تو عام اور مشہور کتابوں میں مذکور ہیں اسلئے طوالت سے بچنے کیلئے میں نے انھیں ترک کر دیا کیونکہ ائمہ کے نقل پر مجھکو پورا اعتماد ہے۔"[3]

مگر اس اہتمام اور سعی بلیغ کے بعد بھی ضعیف روایتوں سے یہ مجموعہ خالی نہیں ہے لیکن ان سے اسکی اہمیت و عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ عموماً مصنف نے ان کے ضعف کی وضاحت کر دی ہے اور کہیں کہیں شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا کسی صحیح حدیث کے مجمل مفہوم کی توضیح و بیان کیلئے انھیں نقل کیا گیا ہے بعض ابواب میں صحیح روایات نہ ہونے کی وجہ سے بھی اس طرح کی حدیثیں شامل کر دی گئی ہیں۔

شرح السنۃ احادیث و روایات کا مجموعہ ہی ہے اور اسمیں ان کی شرح و توضیح بھی کی گئی ہے اسکو موضوع اور مضمون کے

---

[1] شرح السنۃ ج اول ص ۳ [2] ایضاً ص ۲ [3] ایضاً

مرتب کیا گیا ہے یعنی کسی موضوع کی اس سے متعلق روایت ایک ہی جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔
چنانچہ پہلے وہ کتاب کے مطلق لفظ سے عنوان قائم کرتے ہیں جو متعدد احادیث اور ایک ہی طرح کے مختلف ابواب پر مشتمل ہوتی ہے، ہر باب کے ماتحت ایسی حدیثیں لائی گئی ہیں، جو کسی خاص اور متعین مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں، امام بخاریؒ کی طرح امام بغوی نے بھی ابواب قائم کرنے میں بڑی دقت نظر اور خاص کاوش سے کام لیا ہے اور بعض جگہ امام بخاریؒ کے ابواب کے عنوانات ہی بعینہ درج کر دئے ہیں۔

اکثر کتب اور بعض ابواب کی ابتداء اُن آیات قرآنی سے کی گئی ہے جو موضوع کے لحاظ سے مناسب ہیں ضمناً صحابہ و تابعین کے حوالہ سے ان کی جو تفسیریں منقول ہیں ان کو بھی تحریر کیا گیا ہے، حدیثوں کا متن تحریر کرنے کے بعد ان کی توثیق و تصحیح اور حوالے و مآخذ کی تعیین کی گئی ہے۔ مثلاً جو حدیثیں صحیحین سے لی گئی ہیں ان کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ وہ متفق علیہ ہیں اور اگر شیخین میں سے کسی ایک ہی نے اس کی تخریج کی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں اور اگر دونوں بزرگوں کے روایتیا الفاظ میں کوئی فرق و اختلاف ہوتا ہے تو اس کی توضیح کرتے ہیں، تصحیح کا فیصلہ عموماً اکابر محدثین کے حوالہ سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں براہ راست خود اپنا فیصلہ بھی دیا گیا ہے۔

سندیں اور حدیثیں نقل کرنے اور انکی صحت یا ضعف کا حکم لگانے کے بعد وہ حدیثوں کی مختلف حیثیتوں سے تشریح و توجیہ کرتے ہیں، شرح میں مشکلات کو حل، غریب الفاظ کی تفسیر اور رواۃ کی قوت و ضبط یا ضعف و جرح کا ذکر کیا گیا ہے، بعض روایات کے مختصر تراجم بھی دئے گئے ہیں، حدیثوں سے مستنبط احکام و مسائل، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے اقوال و دلائل، حدیثوں کے اسرار و نکات، جمع و تطبیق، مختلف،

حدیثی فوائد، تفسیر و قرأت اور لغت و ادب وغیرہ کی متعدد مفید بحثیں تحریر کی گئی ہیں، مصنف لکھتے ہیں :-

" یہ کتاب حدیث کے مختلف علوم اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے اس میں ان کی مشکلات اور غریب الفاظ کو حل کیا گیا ہے اور وہ احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں جن پر فقہ و خلاف کا دارومدار ہے اور جن کی معرفت ضروری ہے۔" [۵]

یہ سب خصوصیات آگے مثالوں کے ذریعہ واضح کی جائیں گی۔ پہلے مصنف کے طریقہ تالیف، طرز ترتیب اور انداز بیان وغیرہ کا اندازہ کرنے کے لیے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کتاب کی ابتدا کتاب الایمان سے کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل آیتوں سے مزین ہے۔

(۱) هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (البقرہ - ۲-۳)	(یہ کتاب) خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب میں رہکر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہمنے ان کو بخشا ہے
(۲) إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹)	بیشک اللہ کا اصل دین اسلام ہی ہے۔
(۳) وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (مائدہ - ۳)	اور میں نے تمہارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا۔
(۴) وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران - ۸۵)	اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو وہ اس کو قبول نہیں کیا جائیگا۔

---

[۵] شرح السنۃ ج ۱ ص ۲

اس کے بعد سند ذکر کرکے مندرجہ ذیل اثر اور حدیث نقل کی ہے۔

عن يحيى بن يعمر قال كان اول
من تكلم في القدر يعني بالبصرة
معبد الجهني فخرجت انا وحميد بن
عبد الرحمن نريد مكة فقلنا
لو لقينا احدا من اصحاب رسول الله
صلى الله عليه وسلم، فسألناه عما يقول
فلقينا عبد الله بن عمر فاكتنفته
انا وصاحبي احدنا عن يمينه و
والآخر عن شماله فعلمت انه
سيكل الكلام الي. فقلت ابا
عبد الرحمن انه قد ظهر قبلنا ناس
يتقفرون هذا العلم ويطلبونه
يزعمون ان لا قدر انما الامر انف
قال فاذا لقيت اولئك فاخبرهم
اني منهم بريء وانهم مني براء
والذي نفسي بيده لو ان لاحدهم
مثل احد ذهبا فانفقه في سبيل الله
ما قبل الله منه شيئا حتى يؤمن
بالقدر خيره وشره ثم قال

یحیٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ تقدیر کے مسئلہ
میں سب سے پہلے کلام کرنے والا شخص بصرہ کا
معبد جہنی تھا۔ میں اور حمید بن عبد الرحمٰن مکہ کے
ارادے سے (حج کے لئے) روانہ ہوئے تو ہم نے
کہا کہ کاش ہماری ملاقات کسی صحابی سے ہو جاتی
تو ہم اس سے اس چیز کے بارے میں دریافت
کرتے جو کچھ (قضا وقدر) کے متعلق یہ (معبد
وغیرہ) کہتے ہیں۔ حسن اتفاق سے ہماری ملاقات
حضرت عبد اللہ بن عمر سے ہوگئی، پس میں نے اور
میرے ساتھی نے ان کو اس طرح گھیرے میں لے لیا
کہ ایک انکے دائیں اور دوسرا بائیں ہوگیا،
میں نے اندازہ کیا کہ میرا ساتھی مجھی سے بات
چیت کرانا چاہتا ہے اس لئے میں نے عرض
کیا کہ ابو عبد الرحمٰن! ہمارے یہاں کچھ ایسے
لوگ پیدا ہوگئے ہیں، جو علم میں بہت کد و کاوش
کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز ہی
نہیں ہے بلکہ (دنیا کے معاملات بغیر تقدیر کے
اپنے آپ) رونما ہو جاتے ہیں۔

حدثنا عمر بن الخطاب رضی اللہ
عنهما قال بینا نحن عند رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اذ اقبل رجل شدید
بیاض الثیاب، شدید سواد
الشعر، ما یری علیہ اثر السفر ولا
یعرفہ منا احد فاقبل حتی جلس
بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ورکبتہ تمس رکبتہ قال یا محمد
اخبرنی عن الاسلام فقال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ان تشہد ان لا الٰہ الا اللہ
وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلاۃ
وتؤتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان
وتحج البیت ان استطعت الیہ
سبیلا فقال صدقت فتعجبنا
من سوالہ وتصدیقہ ثم
قال: فما الایمان؟ قال
ان تؤمن باللہ وحدہ و
ملائکتہ وکتبہ ورسلہ و
البعث بعد الموت والجنۃ

انھوں نے فرمایا کہ جب ان لوگوں سے
تم ملو تو ان کو مطلع کر دینا کہ نہ میرا ان سے
کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی واسطہ
ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں
میری جان ہے۔ اگر ان میں سے کسی کے پاس
احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو جائے اور وہ
اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالے تو اللہ
تعالیٰ اس کا یہ صدقہ اس وقت تک قبول
نہیں کرے گا جب تک کہ وہ تقدیر کے اچھے
یا برے ہونے پر ایمان نہ لائے۔ پھر انھوں
نے فرمایا کہ ا۔ ہم سے عمر بن خطاب رضی اللہ
عنہ نے بیان کیا کہ ہم لوگ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے
کہ ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت
سفید اور بال نہایت کالے تھے، اس پر
سفر کا کوئی اثر (تھکان وغیرہ) نہیں دکھائی
دیتا تھا۔ اور نہ ہم میں سے کوئی آدمی اسے
پہچانتا تھا۔ وہ آپ کے سامنے اس طرح
بیٹھا کہ اس کے اور آپ کے گھٹنے ایک

والنار وبالقدر خيره وشره
فقال صدقت ثم قال فما الاحسان
قال ان تعمل لله كانك تراه
فانك ان لم تكن تراه فانه
يراك، قال صدقت قال
فاخبرني عن الساعة فقال
ما المسئول عنها باعلم بها
من السائل قال صدقت قال
فاخبرني عن اماراتها قال
ان تلد الامة ربها وان ترى
العراة الحفاة رعاء الشاء
يتطاولون في بنيان المدر قال
صدقت ثم انطلق فلما كان
بعد ثالثة قال لي رسول الله
صلى الله عليه وسلم يا عمر هل تدري
من الرجل قال قلت الله ورسوله
اعلم قال ذاك جبريل اتاكم
يعلمكم امر دينكم وما اتاني
في صورة الا عرفته فيها۔

ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے، اس نے
کہا اے محمدؐ! مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے!
آپؐ نے فرمایا کہ تم اس کی شہادت دو کہ
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمدؐ اللہ کے
رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، اور زکات
دو اور رمضان کے روزے رکھو اور
حج کرو بشرطیکہ تم کو اس کی وسعت ہو،
اس نے کہا آپؐ نے سچ کہا ہم لوگوں کو
تعجب ہوا کہ وہ خود ہی سوال کر رہا ہے،
اور پھر اسکی تصدیق بھی کر رہا ہے، پھر اس نے
دریافت کیا ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد
فرمایا کہ تم اللہ وحدہ، اس کے ملائکہ، اس کی
کتابوں، اسکے رسولوں، اور موت کے بعد
اٹھائے جانے اور جنت و دوزخ، اور
تقدیر کے اچھے برے ہونے پر ایمان لاؤ، اس نے
کہا آپؐ نے صحیح فرمایا، پھر اس نے پوچھا
احسان کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کہ
تم اللہ کے لیے اس طرح عمل کرو گویا تم اسے
دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حالت نہ پیدا ہو سکے تو

الا فی صورتہ ھذہ

یہ بہرحال خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہا ہے،
اس نے کہا آپؐ نے درست کہا، پھر اس نے کہا مجھے
قیامت کے بارے میں بتائیے، آپؐ نے کہا جواب
دینے والے کو اسکے بارہ میں سائل سے زیادہ علم
و واقفیت نہیں، اس نے کہا آپؐ نے ٹھیک کہا،
مگر اسکی علامت بیان کیجئے، آپؐ نے کہا لونڈی
اپنے آقا کو جنے گی، اور تم مفلوک الحال اور بے گھر
اونٹ چرانے والوں کو دیکھو گے کہ عمارتوں میں رہنے
لگے ہیں، اس نے کہا آپؐ نے ٹھیک فرمایا، اور
چلا گیا۔ اس واقعہ کے تیسرے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھ سے کہا عمر! کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ کون آدمی
تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول کو بہتر
معلوم ہے، آپؐ نے فرمایا یہ حضرت جبرئیلؑ تھے،
جو تمھارے پاس تم کو دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔
اور سوائے اس صورت کے وہ میرے پاس جس
صورت میں بھی آتے تھے میں ان کو ضرور پہچان
لیتا تھا۔

اس کے بعد وہ حدیث کی تصحیح و تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے، امام مسلم
نے اسکو عبید اللہ کے اور انھوں نے اپنے والد معاذ عنبری کے اور معاذ نے کہمس کے واسطے

روایت کیا ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے اس کی روایت کی تخریج میں دونوں بزرگ یعنی امام بخاری و مسلم متفق ہیں۔

پھر وہ راوی پر گفتگو مشکلات کو حل اور بعض متعلقہ مباحث کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

"عمر بن خطاب بن نفیل کی کنیت ابوحفص اور قرشی و عدوی نسبتیں ہیں، ذی الحجہ ۲۳ھ میں ترسٹھ سال کی عمر میں شہید ہوئے، ابن شہاب کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ دس سال تک خلیفہ رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے ہر سال حج کیا۔"

یتقفرون العلم کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ علم کی ٹوہ اور تلاش و جستجو کر رہے ہیں۔ تقفر، تتبع اثر الشیٔ "یعنی کسی چیز کے نشان اور نقش کے پیچھے پیچھے ہو لینے کو کہتے ہیں۔ انما الامر انف کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ نیا ہے یعنی معاملہ تیرے اختیار میں ہے، پہلے سے کوئی قدر و مشیئت متعین نہیں ہوتی۔ "روضۃ انف" اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کسی جانور نے منہ نہ ڈالا ہو۔ اور انف الشیٔ چیز کے اول کو کہتے ہیں۔ فاخبرنی عن امارتہا میں امارت کے معنی علامت ہیں امار اور امارۃ دونوں مستعمل ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک امار امارۃ کی جمع ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ظاہری اعمال کو اسلام کا اور باطنی اعتقاد کو ایمان کا نام دیا ہے مگر ایسا اس بنا پر نہیں کیا ہے کہ اعمال کا تعلق ایمان سے یا تصدیق بالقلب کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ یہ دونوں درحقیقت اس مجموعہ کا نام ہیں جو فی نفسہ ایک ہی چیز ہے، اور دین کا لفظ ان سب کا جامع ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ [ذاک جبریل اتاکم یعلمکم امر دینکم] اور تصدیق و عمل دونوں کو ایمان و اسلام کے مجموعی الفاظ شامل ہیں، اس کی دلیل وہ آیات ہیں جو اوپر گذری ہیں۔ ان میں اللہ نے

بتایا ہے کہ اس کا پسندیدہ اور مقبول دین اسلام ہے، اور ظاہر ہے کہ دین قبولیت و رضا کے محل میں اسی وقت ہوگا جب تصدیق میں عمل بھی شامل ہو۔ ابوسلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ مسلم بعض حالتوں میں مومن ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں ہوتا۔ مگر مومن تمام احوال میں مسلم ہوتا ہے کیونکہ اسلام کی اصل استسلام و انقیاد ہے ——— اور ایمان کی اصل تصدیق ہے، چنانچہ آدمی ظاہر میں مستسلم ——— ہوتا ہے مگر باطن میں وہ مطیع و منقاد نہیں ہوتا جب کہ وہ باطن کا سچا اور ظاہر کا غیر منقاد نہیں ہو سکتا، اس قضیہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم مومن نہیں، آپ کے ارشاد ما الاحسان مین احسان کے معنی اخلاص ہیں اور یہ ایمان و اسلام دونوں کی صحت کے لیے شرط ہے،

ان تلد الامتہ ربھا۔ کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کا دائرہ نہایت وسیع ہو جائے گا اور قیدیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی، اس لئے لوگ بکثرت لونڈیاں حاصل کریں گے۔ اور ان سے اولادیں ہوں گی اس طرح آدمی کی لونڈی کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا وہ اپنی ماں کے لیے سید و آقا کے درجہ میں ہوگا۔ کیونکہ لونڈی اس کے باپ کی مملوکہ تھی اور باپ کی ملکیت بیٹے کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

ان تری العراۃ الحفاۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان کا مفہوم امام خطابیؒ نے یہ تحریر کیا ہے کہ اس سے اونٹ پالنے اور چرانے والے خانہ بدوش عرب مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ اسلام کا دائرہ جب وسیع ہو جائے گا تو یہ خانہ بدوش اور بے گھر لوگ شہروں کو فتح کر کے ان میں بود و باش اختیار کر لیں گے اور عظیم الشان محل اور عمارتیں تعمیر کریں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا وہی مطلب ہے جو اشراط قیامت کے متعلق ایک دوسری حدیث (ویتکلم فیھم الرویبضۃ) کا ہے۔ رویبضہ اس آدمی کو کہتے ہیں جو

عام لوگوں کے معاملات میں دخل دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو رابضہ یعنی بھیڑیں چرانے والا کی تصغیر بتایا ہے۔" اور "ہا" کو مبالغہ کے لیے مانا ہے (شرح السنۃ ج ۱۴ ص ۴۳۸)

مصنف کے علمی و تحقیقی رنگ کا اندازہ ان مبسوط اور مفصل مباحث سے کیا جا سکتا ہے۔ جو کتاب میں جابجا ملتے ہیں۔ ذیل میں اسکی ایک مثال تحریر کی جاتی ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ انزل القرآن علی سبعۃ احرف (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے) اسکو متعدد سندوں سے نقل کرکے ان کی توثیق و تصحیح اور حوالے کی تصریح کرنے کے بعد امام بغویؒ لکھتے ہیں :۔

احرف سبعہ کے بارے میں اہل علم مختلف الرائے ہیں، اس کی توجیہ میں ان سے متعدد اقوال منقول ہیں، بعض کے نزدیک اس سے وعدہ و وعید، حلال و حرام، مواعظ و امثال اور احتجاج مراد ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ امر، نہی، حظر، اباحت، گذشتہ اور آئندہ کی خبریں اور امثال مراد ہیں، لیکن صحیح اور ظاہر حدیث کے مطابق یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حروف سے لغات مراد ہیں، یعنی قرآن کو یوں کا ہر قبیلہ اپنی اپنی زبان میں ادغام، اظہار، امالت، تفخیم، اشمام، اتمام، ہمزہ اور تلیین وغیرہ کے ان سات وجوہ کے مطابق پڑھتا ہے، جو ایک ہی لفظ کے لیے اس کی زبان میں مروج تھے۔

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ اسی طرح ہے جیسے ھَلُمَّ، تَعَالَ اور اَقْبِل ہے۔ اس کی توضیح ابن سیرین نے یوں کی ہے کہ ان کے نزدیک (ان کانت الا زقیۃ واحدۃ) قرأت ہے جو عام قرأت میں (صیحۃ واحدۃ) ہے مگر ان دونوں کا معنی یکساں ہے۔

ابو عبید کے نزدیک اس سے اہل عرب کی سات زبانیں مراد ہیں، وہ اسکو صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ اس سے ایک ہی حرف کی سات لغات مراد ہیں، ان کے خیال میں یہ ساتوں لغات قرآن کے اندر متفرق طور پر موجود ہیں بس بعض قرآن قریش کی بعض ہوازن کی بعض ہذیل کی اور بعض اہل یمن وغیرہ کی لغات کے مطابق ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن اس طرح نازل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اجازت ہے کہ وہ اسکو ان وجوہ مختلف میں سے جس طور پر چاہے پڑھے کیونکہ اگر ہر ہر قبیلہ کو اس کی زبان اور طبعی عادت چھوڑنے کا مکلف بنایا جاتا تو یہ اس کے لیے نہایت دشوار ہوتا، اس کی دلیل حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ روایت بھی ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت جبریلؑ سے فرمایا کہ میں امیوں میں مبعوث کیا گیا ہوں، ان میں بعض بوڑھے مرد اور عورتیں ہیں، بعض لڑکے اور لڑکیاں ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو سرے سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اے محمدؐ! قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف سے لغات مراد ہیں، کیونکہ اگر امرونہی یا وعدہ وعید مراد ہوتے تو قرأت کی بعض صورتیں دوسری صورتوں سے آسان نہ ہوتیں۔

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں آدمیوں سے جنھوں نے دو مختلف طریقے سے قرآن کی قرأت کی تھی یہ فرمایا کہ "ھکذا انزلت" یعنی اس طرح بھی قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اور اس طرح بھی۔ لیکن اگر ان دونوں قاریوں کے درمیان حلال یا حرام اور وعد یا وعید یا خبر اور واقعہ کا اختلاف ہوتا تو آپ ان دونوں کی ہرگز تصدیق نہ فرماتے، کیونکہ اس سے قرآن کے اندر اختلاف و تناقض لازم آتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس سے منزہ ہے۔ رہا دونوں قاریوں کی قرأت کا اختلاف تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں داخل نہیں ہے۔

ولو کان من عند غیر اللہ	اگر (قرآن) خدا کے بجائے اور کسی
لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً	کا کلام ہوتا تو یہ لوگ اس میں متعدد
(نساء ۸۲)	اختلافات پاتے۔

کیونکہ ان حروف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بغیر توقیف کے جو شخص جس طرح بھی چاہے اپنی لغت کے مطابق قرآت کرے بلکہ یہ حروف منصوص اور اللہ کا وہی کلام ہیں جنکو لے کر حضرت جبریلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترے، اس کا ثبوت خود زیر بحث روایت ہے کہ

اِنَّ ھٰذَا القرآنَ اُنْزِلَ	یہ قرآن سات حرفوں پر اتارا
عَلٰی سبعۃ احرف	گیا ہے۔

اس میں تمام حروف کو منزل بتایا گیا ہے اور جس قدر قرآن مجید نازل ہو چکا ہوتا تھا اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان کے مہینہ میں حضرت جبریلؑ سے دورد کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ اس میں سے جس کو چاہتا تھا باقی رکھتا تھا۔ اور جس کو چاہتا تھا منسوخ کر دیتا تھا۔ آپ ہر دورہ میں ان صورتوں میں سے جن کو خدا نے مباح قرار دیا تھا کسی ایک صورت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ حالانکہ آپ کو اجازت تھی کہ ان تمام وجوہ کے مطابق قرآن کو پڑھیں اور پڑھائیں جن کے معانی یکساں تھے گو ان کے حروف میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ عبد الرحمٰن نے اپنے والد ابوبکرہؓ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت جبریلؑ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ اقرا القرآن علی حرف (قرآن کو ایک حرف پر پڑھئے) تو حضرت میکائیلؑ نے کہا کہ استزدہ (ابھی اس میں اور اضافہ کرو) تو حضرت جبریلؑ نے آپ سے دو حرفوں پر پڑھنے کے لیے کہا۔ اس طرح سات حرفوں پر پڑھنے کیلئے کہا اور فرمایا کہ

کلھا شان کاف کقولک ھلم	یہ سب وجوہ کافی اور تمھارے قول ہلم
وتعال لہ مالم یختم آیتہ رحمۃ	وتعال کی طرح ہیں جب تک کہ رحمت
بایۃ عذاب وآیتۃ عذاب	کی کسی آیت کو عذاب کی کسی آیت پر
بآیۃ رحمۃ	اور عذاب والی کو رحمت والی آیت پر ختم

بعینہ اسی طرح کی روایت ابی بن کعبؓ سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو۔

لیس منھا الاشاف کاف ان	یہ سب (ساتوں وجہیں) کافی ہیں
قلت سمیعا علیما عزیزا	اگر تم سمیعا علیما کہو یا عزیزا حکیما تو درست
حکیما مالم تختم آیتہ عذاب	ہوگا تاآنکہ عذاب کی آیت کو رحمت کی
برحمۃ او آیتہ رحمۃ بعذاب	آیت پر اور رحمت کی آیت کو عذاب کی
	آیت پر نہ ختم کردو

یہ معاملہ آپ کی مبارک زندگی میں اور آپ کے بعد بھی اسی طرح رہا چنانچہ لوگ ان قرأتوں کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے تھے جن کی آپ نے خدا کے حکم سے تلقین فرمائی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قاریوں کے درمیان اختلاف رونما ہوا اور معاملہ نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ ایک قاری دوسرے کو برا بھلا کہنے لگا اور لوگوں کو افتراق و انتشار کا خطرہ نظر آنے لگا تو حضرت عثمانؓ نے تمام صحابہ کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ لیا اور سب کے اتفاق سے ایک ایسے مصحف کو تجویز و اختیار کیا گیا جس کا رسول اللہؐ نے حضرت جبریلؑ سے آخری بار دور کیا تھا، اور جس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کے مشورہ سے جمع کیا تھا، کیونکہ ان کے زمانہ تک قرآن مختلف ٹکڑوں میں منتشر تھا لیکن جنگ یمامہ میں جب متعدد حفاظ قرآن شہید ہوئے اور صحابہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن

ضایع نہ ہو جائے تو حضرت ابو بکرؓ نے کاتبوں کو ایک مصحف کے اندر مکمل قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیا تاکہ لوگ اس پر اعتماد کریں۔ اور اسی کی جانب رجوع کریں۔ حضرت عثمانؓ نے اسی کو نقل کرنے اور بقیہ نسخوں کو جلا ڈالنے کا حکم دیا تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی مسمار ہو جائے اسطرح جو اس متفق علیہ خط سے مختلف تھا۔ وہ منسوخ کے حکم میں ہو گیا۔ جس طرح اور باتیں بھی صحابہؓ کے اتفاق اور اجماع سے منسوخ قرار پا چکی ہیں۔

اس تحریر سے ظاہر ہو گیا کہ لوحین کے درمیان مکتوب ہی کو اللہ عزوجل کی جانب سے بندوں کے لئے محفوظ کیا گیا ہے۔ اور یہی امت مرحومہ کا امام و رہنما بھی ہے اس بنا پر اس کے الفاظ مین کسی طرح کا تجاوز اور اسکی کتابت و تحریر کی مخالفت جائز نہیں ہاں مختلف لغات میں وہ قرأت روا ہے جس کا خط اور تحریر اس کے موافق ہو، اس قدر گنجائش اور وسعت کو اب بھی باقی کہا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آنحضورؐ سے عادل رواۃ کی نقل کے مطابق اس کی صحت و ثبوت مسلم ہو جیسا کہ مشہور قرّاء کی معروف قرأتیں بطریقہ صحت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے، منقول ہیں۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی اثر (القرآن سنۃ متبعۃ) کا مفہوم یہ ہے کہ حروف و قرأت میں متقدمین کا اتباع ایسی سنت متبعہ ہے جس میں مصحف اور مشہور قرأت کی مخالفت جائز نہیں اگرچہ از روئے لغت وہ صحیح اور جائز ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ صحابہ و تابعین کا اجماع ہے کہ قرأت سنت ہے، اس لیے کسی حرف کی وہی قرأت درست ہو گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر اور مصحف کے مطابق ہو۔

"کلھا شاف کاف" کا مفہوم یہ ہے کہ ان حروف سبعہ میں سے ہر حرف مومنین کے سینوں کے لیے شافی ہے کیونکہ ان کے معانی ایک ہیں اور وہ سب وحی و تنزیل ہیں جیسا کہ فرمایا۔

قل ھو للذین اٰمنوا ھدی وشفاء (فصلت ۴۴) تم کہو کہ وہ (قرآن) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور موجب شفا ہے

اور کافی اس حیثیت سے ہے کہ وہ رسول اللہ کی سچائی پر اپنے نظم کے اعجاز اور دوسروں کے اس جیسا کلام لا سکنے میں بے بس ہونے کی بنا پر حجت ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالےٰ اعلم۔
(باقی)

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا اور ہزاروں محققانہ علمی و ادبی تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے جو ۴۰ سال سے اپنی شاندار روایات کے ساتھ یکساں جاری ہے، اس کے مضمون نگاروں میں تلامذۂ شبلی کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش ہیں، جن کے تحقیقی مضامین و ادبی نگارشات سے اس کے صفحات مزین ہیں، کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے مشکل ہی سے اردو کا کوئی رسالہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، یورپ کے ہر ملک کے مستشرقین نے اس کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات اور مستشرقانہ معلومات کی داد دی ہے، اس رسالہ کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے کتبہ میں محفوظ ہے، بعض بعض سالوں کی مرتب جلدیں بھی ہیں، اور ہر سال کے متفرق پرچے تو بہت زیادہ ہیں، جن صاحب کو اس بیش بہا علمی ذخیرہ کی ضرورت ہو، دفتر سے خط و کتابت کریں۔ کوئی کتب خانہ خواہ وہ پرائیویٹ ہو، یا پبلک اس متاع علمی سے

قبل اسلام کی عربی شاعری پر دین حنیفی کے اثرات

مترجمہ

محمد نعیم ندوی صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

ادب میں زندگی کی جتنی بھرپور عکاسی زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری میں ملتی ہے، اس کی مثال غالباً دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں نہیں مل سکتی، اسی باعث عربی شاعری کو عربوں کا دفتر کہا گیا ہے کہ اس کے آئینہ میں عربوں کے اخلاق و عادات تہذیب و تمدن اور معاشی و معاشرتی کوائف کی ہوبہو تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے، اسی لیے محققین نے جاہلی شاعری کی بنیاد پر اس عہد کے مختلف پہلوؤں پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مخدوم گرامی جناب ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب (ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی) کی انگریزی کتاب "قبل اسلام کی عربی شاعری میں مذہبی رجحانات" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مسلم یونیورسٹی نے موصوف کو اس گرانقدر تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بلاشبہ بڑی عرق ریزی، دیدہ وری اور کاوش کے ساتھ جاہلی شعراء کے مذہبی رجحانات کو اجاگر کیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض بڑے اہم اور فکر انگیز نکات پیش کیے ہیں۔ ذیل میں اس قابل قدر کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ناظرین معارف کی ضیافت طبع

کے لئے پیش کیا جارہا ہے جس میں جاہلی شاعری پر دین حنیفی کے اثرات و میلانات سے بحث کی گئی ہے۔

"نعیم"

تمہید قبل اسلام کی عربی شاعری کا دستیاب حصہ بلاشبہ نہایت قیمتی اور اہم ہے اس میں زمانہ جاہلیت کے عربوں، ان کے عادات واطوار اور انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ اسی باعث "الشعر دیوان العرب" کا مقولہ بہت مشہور رہا۔ یعنی عربی شاعری عربوں کا عوامی رجسٹر ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری و بدیہی امر ہے۔ کہ اس عہد کی شاعری میں عربوں کے مذہبی جذبات کی ترجمانی بھی موجود ہوگی۔ اور جیسا کہ پیش نظر جائزہ سے ظاہر ہے۔ اس شاعری میں مذہبی رنگ کافی نمایاں ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ زیر بحث مضمون میں محض ان ہی عقائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کے اثرات اس دور کی شاعری میں کافی نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اور جن عقائد مثلاً صابیہ، مجوسیہ اور زندقہ کا نمایاں ذکر اس عہد کی عربی شاعری میں نہیں ملتا۔ ان کو میں نے عمداً اس جائزہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ حالانکہ دوسرے ذرائع سے ان کے وجود کا بھی ثبوت مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بت پرستی کو لیجیے جو قبل اسلام کے عربوں میں بہت عام تھی۔ لیکن بت پرستانہ افکار و خیالات کی جھلک ان کی شاعری میں بہت شاذ و نادر ہی ملتی ہے، اس بارے میں محققین نے مختلف مرائین ظاہر کی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ مسلمان راویوں نے جان بوجھ کر ان نظموں کو نظرانداز کر دیا جن میں بت پرستی کا تذکرہ تھا؛ چونکہ اسلام کے نزدیک بت پرستی ایک قبیح و بدترین فعل شمار ہوتی تھی۔ اس لیے مسلم راوی اس کا ذکر بھی پسند

لہ الحیاۃ العربیہ حوفی ص ۳۹۰ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان جلد ا ص ۶۱۔

نہیں کرتے تھے۔ اور ان کو اس خیال ہی سے شرم آتی تھی کہ ان کے اسلاف بت پرستی کا شکار رہے۔ لیکن راقم سطور کے خیال میں یہ اسکی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اگر اس میں کوئی حقیقت ہوتی تو بت پرستی کے بارے میں کوئی بھی شعر ہم تک نہ پہونچ سکا ہوتا۔ حالانکہ ہمارے پاس قبل اسلام کی عربی شاعری کا جو بھی ذخیرہ ہے اسمین اصنام پرستی کا واضح تذکرہ موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مسلمان راویوں کے ذریعہ ہی ہم تک پہونچا ہے۔ ان رواۃ شعر نے ایسے اشعار کو بھی محفوظ رکھا ہے جن مین رسول خدا علیہ الصلوۃ والتسلیم کے صحابہ کرام کا ان کے مخالفین نے مذاق اڑایا یا اسلامی اصولوں کا تمسخر کیا گیا ہے۔ ایسی صورت مین یہ رواۃ اپنے اسلاف کے قیمتی ورثہ کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔

بہرحال اگر ہم اس نظریے کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لین تو عہد جاہلیت کے مذہبی ارکان جو بعد میں خود اسلام کے بھی ارکان بن گئے۔ مثلاً زیارت کعبہ کے بارے میں اشعار کا وسیع ذخیرہ دستیاب ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر ایسے اشعار تھے تو ان کو مسلمانوں نے یقیناً نظر انداز نہ کیا ہوگا۔ لیکن درحقیقت ایسی نظمین بھی ہم کو شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دوسرا نظریہ یہ ہو کہ قبل اسلام کے عرب مذہب سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے[1] یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر جاہلی شاعری سے کوئی شخص یہ پتہ لگانا چاہے کہ کفار عرب اپنے بتوں کے سامنے کسطرح سجدہ ریز ہوتے اور عبادت کے وقت کس طرح انکی حمد و ثنا پڑھتے تھے۔ تو اس کو یقینی طور پر مایوسی ہوگی۔ کیونکہ جہانتک میرے علم کا تعلق ہے ایسی کوئی بات زمانہ

---

[1] عربوں کی ادبی تاریخ (انگریزی) نکلسن ص ۱۳۵، تاریخ الادب العربی حنا الفاخوری ص ۱۶

جاہلیت کے عربوں میں موجود نہیں تھی۔ ان کی بت پرستی صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک اپنے بتوں کا طواف، دوسرے ان کے لیے قربانیاں کرنا اور ان باتوں کا حوالہ قبل اسلام کی عربی شاعری میں واضح طور پر موجود ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان موضوعات پر مکمل نظمیں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ طویل نظموں کے درمیان اس بارے میں متفرق و مختصر اشعار ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قبل اسلام کی شاعری ایک خاص قسم کے انداز و نہج پر مشتمل تھی۔ اور ہر شاعر حصول شہرت کی خاطر اسی طرز کو اپناتا تھا۔ ان اشعار میں عام طور پر یا تو جنگجویانہ انداز کی ڈینگیں ہوتی تھیں یا شاعر مختلف قبائل وافراد کی شجاعت کے کارناموں کا تذکرہ کرتا تھا۔ یا پھر چٹیل میدانوں میں سفر کی صعوبتیں، خون کا بدلہ لینے کی خواہش کا اظہار۔ خطرات کے مقابلہ میں شجاعت وقوت تحمل کا مظاہرہ یا مہمان نوازی کی تعریف ہوتی تھی۔ اس عہد میں صرف ایسی ہی نظموں کو قبول عام حاصل تھا۔ لہٰذا راوی ان نظموں کو یا تو مجمع عام میں یا مخصوص شعری نشستوں میں پڑھتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی کسی خاص جذبہ کے تحت مکمل مذہبی نظمیں بھی کہی گئی ہوں، لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہوتی تھیں۔

ایک دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ اسلام کی طرح خدائے واحد کی عبادت کا ذکر جاہلی شاعری میں کافی بڑی حد تک موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بت پرستی کے بارے میں بھی بکثرت اشعار ملتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ہی جاہلی شاعر کے یہاں کسی وقت تو خدائے وحدہٗ کی پرستش کو نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور کبھی بت پرستی کے جذبات ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ بھی خوب اجتماع ضدین ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی افکار کا حامل اس دور کے بعض اشعار کو

مسلم رواۃ کے منحول اشعار بتایا جاتا ہے [۱] اس امکان سے انکار نہیں کہ کچھ راویوں نے ایسا من گڑھت کام کیا ہو۔ لیکن اس کی وجہ سے جاہلی شاعری کے تمام ذخیرہ کو جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے خیال میں بغیر کسی معقول دلیل اور واضح ثبوت کے ان نظموں کی اصلیت سے انکار مناسب نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عقائد سے مماثل بہت سے مذہبی عقائد و ارکان زمانہ جاہلیت کے عرب میں موجود تھے۔ اسلام نے ان چیزوں کو یا تو بعینہ یا بہت معمولی تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ قبل اسلام کی عربی شاعری میں اسی طرح مذہبی حوالے بھی بکثرت ملتے ہیں۔ بعض مستشرقین ان اشعار کی اصلیت یہ کہکر تسلیم کرتے ہیں کہ ان پر عیسائیت اور یہودیت کے اثرات پڑے ہیں [۲] لیکن میرے خیال میں یہ اشعار دین ابراہیمی کے تاثر کا نتیجہ ہیں،

اگر ہم زمانہ ماقبل اسلام کے عرب کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اور واضح ہو کر سامنے آئے گی۔ رینان کا یہ خیال کہ قدیم عرب دوسری سامی قوموں کی طرح فطرۃً توحید پرست تھے، غلط معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے علاوہ متعدد محققین نے بھی ثابت کیا ہے [۳] لیکن یہ درست ہے کہ حجاز کے عرب باشندے حضرت ابراہیمؑ کی آمد اور حضرت اسماعیلؑ کے قیام مکہ کے بعد توحید سے بخوبی روشناس ہو گئے تھے۔ کیونکہ سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما السلام خود توحید کے نمبردست

---

[۱] Mohammad and The Rise of Islam by D.S. Margoliouth. P. 60

[۲] Ancient Arabian Poetry by C.J. Lyall P. 92

[۳] تاریخ العرب جواد علی ج ۱ ص ۲۵۴

علمبردار تھے۔ انھوں نے کعبہ کی تعمیر کی اور خلق کو خدائے وحدہ کی پرستش کی دعوت دی
یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جنوبی عرب کے مہاجرین عربوں کو چھوڑ کر باقی تمام عرب
جنھیں عروج حاصل ہوا۔ اور جو شمال کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سب حضرت
اسماعیلؑ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[1]

اس لیے مسلمان مورخین اور رواۃ کا یہ عام نظریہ ہے کہ حجاز کے عوام عرصۂ دراز
سے دین ابراہیمی کی پیروی کر رہے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ چونکہ ان لوگوں کا
اختلاط دیگر مذاہب کے متبعین سے ہوتا رہا اس لیے ان کے دین میں ابتدائی پاکیزگی باقی
نہ رہ گئی۔ اور کافی حد تک مشرکانہ خیالات و افعال ان کے مذہب کا جزو بن گئے۔[2]
لیکن دین ابراہیمی کے عقائد سے دور ہو جانے کے باوجود وہ کچھ امور میں اب بھی ان کے عقا
کافی حد تک اتباع کرتے رہے۔ مثلاً خدا کی وحدانیت، زیارت مکہ اور خانہ کعبہ کے
پاس قربانی کرنا وغیرہ،[3]

اس طرح عہد قبل اسلام کے عرب نہ تو صحیح معنوں میں مکمل توحید پرست تھے
نہ خالص اصنام پرست، بلکہ علاوہ ایک ایسے مخلوط مذہب کے متبع تھے جس میں مقامی
و بیرونی مذاہب کے ملے جلے عقائد و ارکان شامل تھے۔ چنانچہ ان میں اگر ایک طرف
بت پرستی رائج تھی تو دوسری طرف ان کے دلوں میں ایک عظیم خدا کی وحدانیت کا
عقیدہ بھی موجود تھا۔ ان کی اصنام پرستی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خدا کے وجود کے
قائل نہیں تھے۔ اور نہ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو خدا کے درجہ کے برابر ہی سمجھتے تھے
بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے دیوی دیوتا اللہ تعالےٰ اور اس کی مرضی کے تابع و تحت تھے

---
[1] تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۵۲ [2] کتاب الاصنام لابن الکلبی ص ۶-۸ [3] ایضاً

باایں ہمہ مجموعی حیثیت سے عرب مشرکانہ عقائد کے حامل تھے، اور ان کا شرک اس نظریہ پر مبنی تھا کہ مادی اور روحانی طاقتوں میں کافی حد تک مماثلت موجود ہو۔ درحقیقت ان کا خیال تھا کہ جس طرح کوئی بادشاہ اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں پر اپنے وفاشعار ملازموں کو حاکم بنا کر بھیجتا ہے۔ اور ان کو اپنے علاقہ عوام کے چھوٹے موٹے مسائل کو طے کرنے کا اختیار بھی دیتا ہے۔ نیز وقتاً فوقتاً ان سے مشورے بھی کرتا ہے، اور رعایا کے بارے میں ان کی بعض سفارشات کو شرف قبول بھی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ جل شانہ نے بھی نظام عالم کو چلانے کی کچھ ذمہ داری اپنے ان وفادار ماتحتوں کو دے رکھی ہے جنھوں نے اپنی ریاضت، طہارت اور عبادت کے ذریعہ اعلیٰ روحانی مدارج طے کیے ہوں۔ اس لئے وہ خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اور اس غرض کے لیے وہ قربانیاں کرتے، ان کی قسمیں کھاتے اور نذریں چڑھاتے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دیوتاؤں کے مجسمے بھی بنالیے، اور ان مجسموں کو وہ اپنے دیوتاؤں کی روح کا مامور سمجھتے تھے۔ مورتیاں بنانے اور ان کی پوجا کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ اتنا عام ہوگیا کہ کوئی بھی چیز جس میں کسی روح کے موجود ہونے کا گمان ہوتا تھا، ان لوگوں کی تعلیم و عبادت کا مرکز بن جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں جس طرح کی بھی مذہبی تقریبات انھیں پسند آتیں ان کا انعقاد کرتے تھے۔[۵]

اپنے بتوں کے بارے میں ان کے نظریات مختلف تھے۔ ممکن ہے کچھ جاہل بدو ان کو اصل خدا ہی سمجھتے رہے ہوں۔ لیکن کفار عرب کی اکثریت ان کو محض ایک عظیم

---

[۵] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الفوز الکبیر ص ۴۰۶

طاقت کی علامت خیال کرتی تھی۔ کچھ کا خیال تھا کہ ان کے بت خدا اور بندے کے درمیان ایک وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (کیونکہ ان کے نزدیک خدا تک براہ راست رسائی ناممکن تھی) ایک فرقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل تھا جو اس عقیدہ کے حامل تھے کہ خدا نے بتوں کے لیے کچھ ارواح کو مخصوص کر رکھا ہے۔ اور ان بتوں کو اللہ نے کچھ ایسی طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ جن کے باعث وہ کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔[۱]

مندرجہ بالا بحث سے بہت صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اگرچہ کفار عرب لاتعداد بتوں کی پرستش کرتے تھے، تاہم خدائے برتر و عظیم کی وحدانیت کا عقیدہ ان کے دلوں میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھا، اس بارے میں بکثرت آیات قرآنی سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ اور بلاشبہ قرآن کریم کی شہادت بہت اہمیت رکھتی ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

(سورہ یونس، پ ۱۱)

(ان لوگوں سے) کہئے کہ تم کو آسمان و زمین سے کون روزی دیتا ہے یا تمہارے کان اور آنکھیں کس کے قبضہ میں ہیں اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ اور کون (دنیا کا) انتظام چلا رہا ہے۔ تو وہ بے تامل بول اٹھیں گے کہ اللہ۔ تو ...

---

[۱] بلوغ الارب ج ۲ ص ۹۸-۱۹۷

قل لمن الارض ومن فیھا
ان کنتم تعلمون، سیقولون
للہ۔ قل افلا تذکرون۔
قل من رب السمٰوات
السبع ورب العرش العظیم
سیقولون اللہ قل افلا
تتقون، قل من بیدہ
ملکوت کل شئی وھو یجیر
ولا یجار علیہ ان کنتم
تعلمون سیقولون للہ
قل فانی تسحرون

(ان لوگوں سے) کہئیے کہ اگر تم کو علم
ہے تو بتاؤ کہ جو کچھ زمین اور اس میں ہے
وہ کس کا ہے؟ وہ فوراً جواب دیں گے کہ
اللہ کا۔ ان سے کہئیے کہ پھر تم کیوں غور
نہیں کرتے۔ ان سے پوچھیے کہ سات آسمانوں
.... اور عرش عظیم کا مالک
کون ہے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ اللہ
ہی کا ہے؟ اب آپ (اے پیغمبر) ان سے
کہئے کہ کیا پھر تم کو اس سے ڈر نہیں لگتا ہے؟
آپ ان سے کہئے اگر تم کو معلوم ہے تو
بتاؤ کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز
کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے۔
اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ
نہیں دے سکتا۔ وہ فوراً بول اٹھیں گے
کہ وہ اللہ کی ذات ہے! آپ کہدیجئے کہ
پھر تم کیسے سحر زدہ ہو جاتے ہو۔

ویعبدون من دون اللہ
ما لا یضرھم ولا ینفعھم و
یقولون ھؤلاء شفعاءنا

اور (مشرکین) خدا کے سوا ایسی چیزوں
کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو ان کو
نقصان ہی پہونچا سکتی ہیں اور نہ

عند اللہ	فانہ وہ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبود اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔
والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ	اور جن لوگوں نے خدا کے سوا حمایتی بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اسلئے کرتے ہیں کہ خدا سے ہم کو نزدیک کریں۔

یہاں غالباً یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کریم کا خطاب ایک ہی مذہب کے متبعین کے کسی خاص طبقہ یا فرقہ سے نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ کچھ یوروپین محققین غلطی سے سمجھتے ہیں، اور اسی سوء تفاہم کے باعث وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں متضاد بیانات ملتے ہیں[۵] حالانکہ قرآن نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو مختلف آیات کے ذریعہ خطاب کیا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جو خدا کے وجود کے منکر تھے۔ اور کچھ لوگ اس کے وجود پر تو ایمان رکھتے تھے مگر عقیدہ بعث بعد الموت کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو خدا کے وجود اور حیات بعد الممات دونوں کا قائل تھا لیکن وہ انبیاء کی بعثت اور ان کے جسمانی شکل میں ظاہر ہونے کو نہیں مانتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں پر مشتمل ایک اور گروہ بھی تھا جو نہ صرف خدا پر ایمان رکھتا تھا۔ بلکہ حیات بعد الموت اور رسالت کا بھی قائل تھا، اسی آخر الذکر طبقہ کو عام طور سے ملت حنیفی کہا جاتا ہے۔[۵۵]

---

۵۴ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲ ص ۵۰۵ ۵۵ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۵۰۸ - ۵۰۹۔

مندرجۂ بالا تفصیلات سے واضح ہوجاتا ہے کہ جاہلی عربوں میں شرک وبت پرستی کا فعل اور توحید کے عقائد دوش بدوش پائے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا زمین وآسمان کا خالق، کائنات کا چلانے والا، موت وحیات عطا کرنے والا، نعمتیں بخشنے والا، کائنات کی شیرازہ بندی کرنے والا اور عالم الغیب تھا۔ لیکن یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عہد جاہلیت کے عرب یہی سب عقائد رکھتے تھے تو پھر انھوں نے حضور اکرمؐ کی اتنی شدید مخالفت کیوں کی؟ ان کے مشن میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اور آخر میں ان کے ساتھ لڑنے مرنے تک کو تیار ہوگئے۔ بلاشبہ اہل مکہ کی یہ مخالفت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض تعلیمات کا ردعمل نہ تھی۔ بلکہ ان کے مشن کے مختلف مراحل سے پیدا ہونے والا ردعمل تھا۔ حضورؐ نے عربوں کو صرف توحید کی دعوت دینے ہی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ انھوں نے لوگوں کو ہر قسم کی بت پرستی اور مشرکانہ افعال سے دور رہنے کی بھی تلقین کی۔ سرور کائناتؐ نے ان بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی یہ کہکر مذمت کی کہ یہ تو خود انسانوں کی تخلیق ہیں۔ لہٰذا ان کو انسانوں پر کوئی قدرت وفوقیت حاصل نہیں ہے۔ اہل مکہ نے جو نہایت مغرور وسرکش تھے، اس چیز کو اپنی تذلیل محسوس کیا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ مگر ذلت نہیں۔ کیونکہ یہ چیز انکی فطرت وجبلت کے خلاف تھی۔ اسی لیے وہ حضور اکرمؐ کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے۔ شروع شروع میں تو ان کی مخالفت محض اپنے دین واخلاق کی دیرینہ روایات کو قائم رکھنے کے لیے زبان کی حد تک محدود رہی۔ لیکن جب حضورؐ نے یہ فرمایا کہ ان کے اسلاف خود ہی صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہ ہوگئے تھے، تو یہ لوگ شدید برہم ہوگئے۔ اور ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اسلیے

جاہلی عربوں کو اپنے اسلاف پر بے حد فخر و ناز تھا۔ اور وہ اپنی قدیم روایات کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جیسا کہ ان کی شاعری سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض حضور سے ان کی مخالفت و عداوت رفتہ رفتہ بڑھتی ہی رہی، اور بالآخر وہ نہایت سنگین مراحل تک پہونچ گئی۔

مذہب کے علاوہ سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی محرکات بھی اس سلسلہ میں کارفرما تھے۔ اہل مکہ کی خانہ کعبہ کے محافظ کی حیثیت سے پورے ملک میں بڑی عزت تھی۔ اور یہ لوگ اپنے نفع بخش تجارتی پیشوں کے باعث بہت دولت مند بھی تھے اسکے برخلاف حضور اکرمؐ اہل ثروت نہ تھے لہذا مشرکین مکہ ایک غریب آدمی کی باتوں کی اتباع اپنے لیے باعث ننگ خیال کرتے تھے۔ اور اس کی مذہبی قیادت کو تسلیم کرنے میں انھیں اپنی ذلت محسوس ہوتی تھی۔ قرآن کریم میں ان کے اعتراضات کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

وقالوا لولا نزل ھذا	اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن دو بستیوں
القرآن علی رجل من	(مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی
القریتین عظیم ۔	پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

مزید برآں ان کا قبائلی یا جاگیردارانہ سماجی ڈھانچہ کچھ اس قسم کا تھا کہ خون اور نسل کی بنیاد پر سماج میں کچھ لوگوں کو دوسروں پر فوقیت حاصل رہتی تھی لیکن سرور دو عالمؐ اس تفریق کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دینا چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد اخوت و مساوات کے اصولوں پر ہو، اور جس میں امیر و غریب

کالے اور گورے کی تفریق کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اس کے علاوہ حضور نے ان کے اخلاقی کردار کی بھی مذمت کی۔ مثلاً یہ کہ وہ بدلہ لینا نہایت ضروری قرار دیتے تھے جبکہ حضورؐ کی تعلیمات اس کے بالکل خلاف تھیں۔ آپؐ نے عفو و درگذر کی تعلیم دی۔ اسطرح وہ اس کو بھی ضروری خیال کرتے تھے کہ قبیلہ کے ہر فرد کو اپنے قبیلہ کے ہر معاملہ میں ساتھ دینا چاہیے، جب کہ حضورؐ نے انھیں یہ ہدایت کی کہ محض حق و انصاف کا ساتھ دو۔ اسی طرح انھیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر نہایت فخر تھا۔ جب کہ سرورکائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے انھیں روایات پرستی سے باز رہنے اور خود اپنے اندر اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کی تلقین کی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف وحدانیت کی دعوت ہی نہیں بلکہ مذکورۃ الصدر تمام ہی حقائق و محرکات ان اسباب کے ذمہ دار تھے، جن کے باعث مشرکین مکہ حضور اکرمؐ کی کھلم کھلا مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو ان کی دولت مندانہ فوقیت ختم ہو جائے گی۔ اور ان کے دیرینہ سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی رسوم و رواج سب درہم برہم ہو جائیں گے، اسی لئے وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جائز یا ناجائز کسی بھی طریقہ سے اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر حضور اکرمؐ نے اپنے کو صرف زبانی تعلیمات تک ہی محدود رکھا ہوتا اور اپنے متبعین سے محض نمائشی اتباع کا مطالبہ کیا ہوتا۔ نیز انھوں نے مشرکین مکہ کی روزمرہ کی زندگی میں دخل اندازی نہ کی ہوتی تو مکہ میں کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پھر کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہ ہوا ہوتا۔

حنیفیت

عرب کے حنیفی۔ ظہور اسلام سے قبل عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کو بت پرستی اور شرک سے بے انتہا نفرت تھی۔ اور وہ اپنے دور میں مروج مشرکانہ تقریبات میں کبھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو صاف صاف ان باتوں کی مذمت بھی کرتے تھے بعض روایات کے مطابق عہد جاہلیت میں بہت سے مذہبی مفکرین اور فلاسفہ ایسے بھی تھے جو ان مشرکانہ افعال سے اجتناب کرتے تھے جو عمرو بن لوئی نے مذہب میں شامل کر رکھے تھے۔ (یہی وہ شخص ہے جو عرب میں رسم بت پرستی کا بانی خیال کیا جاتا ہے) اس کا برخلاف وہ لوگ دین ابراہیمی پر شدت سے قائم تھے[1]۔ یہ لوگ نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی۔ بلکہ وہ حنیفی کہے جاتے تھے۔ کیونکہ حنیف سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی عرفیت تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا سچا پیرو کہتے تھے۔ جس کی بنیاد وحدانیت پر قائم تھی۔

اسلام سے پہلے لفظ حنیف میں کوئی مذہبی تصور شامل نہیں تھا۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ جیران العود کہتا ہے۔

واد رکن أعجازاً من اللیل بعد ما   اقام الصلوٰۃ العابد المتحنفٗ

ابوذویب الہذلی کا درج ذیل شعر بھی اسکا شاہد ہے۔

اقامت بہ کمقام الحنیف   بشہری جمادی وشہری صفر[3]

اس سلسلہ میں امیہ بن ابی الصلت کا یہ شعر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ الیعقوبی ج ۱ ص ۲۰۱ ، بلوغ الادب ج ۲ ص ۱۹۴ تاریخ العرب جواد علی ج ۵ ص ۵۶ [2] لسان العرب ج ۹ ص ۵۰ [3] ایضاً

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ إلا دین الحنیفۃ زور

(دینِ حنیفی کے علاوہ تمام دین قیامت کے دن خدا کے نزدیک جھوٹے ہوں گے)

علاوہ ازیں لفظ حنیف قرآن کریم میں متعدد جگہ استعمال کیا گیا ہے اور تقریباً ہر جگہ یہ شرک کی ضد کے طور پر آیا ہے۔ یہاں چند آیات قرآنی درج کیجاتی ہیں۔

(۱) فاتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفاً وما کان من المشرکین	پس ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک خدا کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔
(۲) ولکن کان حنیفاً مسلماً وما کان من المشرکین	بلکہ وہ ایک بندہ فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔
(۳) وان اقم وجھک للدین حنیفاً ولا تکونن من المشرکین	اور یہ کہ اسی دین کی طرف اپنا منہ سیدھا کیے چلا جا اور مشرکوں کو زمرے میں ہرگز شامل نہ ہو
(۴) حنفاء للہ غیر مشرکین بہ	.... بس ایک اللہ کے ہو رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

مذکورہ بالا حقائق اس بات کو شک وشبہہ سے بالاتر قرار دیتے ہیں کہ لفظ حنیف اسلام سے پہلے بھی مستعمل تھا۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ جو کردار کی پاکیزگی کے قائل، بت پرستی اور شرک کے مخالف اور توحید کی طرف مائل تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حنیفی یہود ونصاری کی طرح کوئی منظم فرقہ نہیں تھے۔ بلکہ اس طرح کے عقائد وخیالات رکھنے والے افراد ہر قبیلہ میں پائے جاتے تھے۔

اگرچہ حنیفیوں میں سے کچھ نے آخر میں عیسائیت کو اپنا لیا تھا لیکن وہ دراصل حقیقی حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کے متلاشی تھے۔ اور اس کی جستجو میں انھوں نے دور دراز

مالک کا سفر بھی کیا۔

حنیفی شاعری | غالباً کچھ حنیفیوں میں شاعرانہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی ان سے منسوب اشعار کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ ان اشعار میں مکمل طور پر تو نہیں مگر کافی حد تک ان کے مذہبی خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم اسے مذہبی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اس شاعری کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم کو ان نظموں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جو اگرچہ مشرک شعراء کی طرف منسوب ہیں مگر بت پرستی اور شرک کی مخالفت اور حنیفیت کی حمایت سے معمور ہیں ایسے اشعار یا تو قطعات کی شکل میں ہیں یا طویل نظموں کا جزو ہیں۔

توحید

لفظ "اللہ" | کفار عرب اعلیٰ ترین طاقت کو لفظ "اللہ" کے ذریعہ بیان کرتے تھے۔ آگے چل کر یہی لفظ اسلام نے بھی اسی مفہوم و معنی میں اپنا لیا۔ "اللہ" کا لفظ جاہلی شاعری میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ جو اس کا ثبوت ہے کہ قبل اسلام بھی یہ لفظ عام تھا، اور اس متذکرۂ بالا حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام سے پہلے اس لفظ میں وہی مفہوم پوشیدہ تھا جو اب اسلام میں ہے آئندہ سطور میں ہم تفصیل سے دیکھیں گے کہ زمانۂ جاہلیت کے غیر مسلم عرب اور ان کی شاعری میں اس لفظ کی کیا اہمیت تھی۔

اللہ کی قسم | جاہلی شاعری میں ایسے اشعار بڑی کثرت سے ملتے ہیں جن میں خدا کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور دراصل شاعری میں یہ لفظ بیشتر اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ قبل اسلام کے مشرکانہ معاشرہ میں قسم کی اہمیت اور ضرورت

مفصل روشنی ہم گزشتہ اوراق میں ڈال چکے ہیں۔ یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قسمیں کس نوع کی کھائی گئی ہیں۔ کیونکہ اس سے ہم کو کفار عرب کے توحیدانہ رجحانات کا جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ ایسے اشعار لاتعداد ہیں۔ لیکن میں ذیل میں صرف ممتاز شعراء کے کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

امرؤالقیس مختلف جگہوں پر کہتا ہے۔

فقالت یمین اللہ مالک حیلۃ　　　　وما إن اری عنک الغوایۃ تنجلی[۱]

(سو محبوبہ نے مجھکو دیکھکر کہا کہ بخدا مجھکو تیرے ٹالنے کا کوئی حیلہ و بہانا نہیں آتا۔ اور مجھکو امید نہیں کہ یہ عشق کی گمراہی تجھ سے دور ہو۔)

فقلت یمین اللہ ابرح قاعداً　　　　ولو قطعوا رأسی وا وصالی[۲]

(چنانچہ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں یہیں جمکر بیٹھا رہونگا خواہ لوگ تیرے سامنے میرا سر اور جوڑ جوڑ کاٹ ڈالیں۔)

اس طرح زہیر بن ابی سلمی کہتا ہے۔

تا اللہ قد علمت قیس اذا قذفت　　　　ریح الشتاء بیوت الحی بالعنن[۳]

(جب موسم سرما کی ہواؤں نے قبیلہ کے مکانات کو عنن پر پھینک مارا تو بخدا قبیلہ قیس نے جان لیا۔)

فو اللہ انا والاحالیف هؤلاء　　　　لفی حقبۃ اظفارها لم تقلم[۴]

(بخدا ہم لوگ اور ہمارے یہ تمام حلفاء ایک ایسے زمانہ میں ہیں جن کے ناخنوں کاٹے نہیں گئے)

---

[۱] شرح المعلقات للزوزنی ص ۱۰۔ [۲] دیوان امراؤالقیس ص ۲۰۵۔ [۳] دیوان زہیر ص ۱۲۱۔ [۴] ایضاً ص ۲۲

ذو الاصبع العدوانی کا درج ذیل شعر بھی استشہاد میں پیش کیا جاتا ہے۔

واللہ لو کرھت کفی مصاحبتی		لقلت اذ کرھت قربی لھا بینی[۱]

مذکورۂ بالا اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ قسم کھانے کے لیے الفاظ کے کچھ مرکبات تھے جو قبل اسلام کے معاشرہ میں رائج تھے۔ مثلاً اللہ کی قسم اللہ کی زندگی کی قسم، اللہ کا حلف اور شعراء ان قسموں کا استعمال اپنے کلام میں جوش و زور بیان پیدا کرنے کے لیے کرتے تھے۔ کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مواقع پر اللہ کی قسم اسکو شاہد بنانے کے ارادے سے یا باہمی معاہدوں کا نگراں بنانے کی نیت سے کھائی جاتی تھی، کیونکہ عوام کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ان لوگوں کو ضرور سزا دے گا۔ جو اس کی قسم کھا کر کئے ہوئے معاہدات کی خلاف ورزی کریں گے۔ مثال کے طور پر نابغہ ذبیانی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فلما وقاھا اللہ ضربۃ فأسہ		وللبرّ عین لا تغمض ناظرہ

فقال تعالی نجعل اللہ بیننا		علی ما لنا او تنجزی لی آخرہ

فقالت یمین اللہ أفعل اننی		رأیتک مسحوراً یمینک فاجرہ[۲]

(جب اللہ نے اسکو اس شخص کی کلہاڑی کی ضرب سے بچا دیا ـــــ اور قسم کی آنکھ اپنے کھانے والے سے اغماض نہیں برتتی ـــــ تو اس نے کہا آہم لوگ خدا کو اپنے درمیان شاہد بنالیں وہ بولی بخدا میں اس کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں تجھے دھوکہ باز اور قسم میں جھوٹا خیال کرتی ہوں)

جاہلی شاعری کا ایک دوسرا میدان جس میں لفظ "اللہ" کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ استمداد و دعا ہے۔ اور	استمداد و دعا کے لیے لفظ "اللہ" کا استعمال

---

[۱] دیوان زہیر ص ۱۸۴ - [۲] دیوان النابغہ ص ۶۳ -

جاہلی شاعری میں اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والا یہ واحد لفظ تھا۔ جہاں تک قسموں کا تعلق ہے۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں کے نام بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن استمداد و دعا (Invocation) کے لیے ان بتوں اور دیوتاؤں کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

امرؤ القیس کہتا ہے۔

الا قبح اللہ البراجم کلها — وجدع یربوعا وعفر دارما[1]

(سن لو، اللہ تعالے براجم کے تمام لوگوں کو رسوا کردے اور یربوع کی ناک کاٹ دے اور دارم کو ذلیل کردے)

عروہ بن الورد:

لحی اللہ صعلوکا اذا جن لیلہ — مصافی المشاش الفا کل مجزر[2]

(خدا ایسے فقیر پر لعنت کرے جو تاریکی پھیل جانے کے وقت نرم ہڈی اور ہر ذبح کو پسند کرے)

جزی اللہ خیرا کلما ذکر اسمہ — ابا مالک ان ذالک الحی اصعدا[3]

(ابو مالک کو خدا جزائے خیر عطا فرمائے۔ جب جب اس کا نام لیا جائے۔ بلاشبہ وہ قبیلہ بلند ہوگیا۔)

المرقش الاکبر:

لایبعد اللہ التلبب وال . . . غارات اذ قال الخمیس نعم[4]

(جب لشکر کہے کہ یہ اونٹ ہیں تو خدا تیاری جنگ اور لوٹ مار کو ختم نہ کرے۔)

---

[1] دیوان امرؤ القیس ص ۱۰۴۔ [2] دیوان عروہ ص ۱۵۔ [3] ایضاً ص ۲۔

[4] المفضلیات ج ۲ ص ۴۰۔

نابغہ الذبیانی:۔

جزی اللہ عبساً والجزاء بکفہ جزاء الکلاب العادیات وقد فعل[1]

(خدا قبیلہ عبس کو ایسا بدلہ دے، جیسا کہ بھونکنے والے کتوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس نے ایسا کر دیا ہے۔)

الاعشی:۔

علیہ صلوٰۃ اللہ ما ہبت الصبا وما ناح طیر فوق غصن وغردا[2]

(اس پر خدا کی رحمت ہو۔ نہ تو ہوا ہی چلی۔ اور نہ کسی شاخ پر پرند نے نوحہ کیا اور چہچہایا۔)

دردالجعدی:۔

خلیلی عوجا بارک اللہ فیکما وان لم تکن ہند لارضکما قصداً[3]

(میرے دونوں دوستو! مقیم ہو جاؤ۔ خدا تم میں برکت عطا فرمائے۔ اگرچہ ہند تمہاری سرزمین کا قصد نہ کرے۔)

برج المشیر الطائی:۔

فسائل ھداک اللہ ای بنی اب من الناس یسعی سعینا ویقارض[4]

(لوگوں سے پوچھو ــــ خدا تم کو ہدایت دے ــــ لوگوں میں سے کس باپ کا بیٹا ہماری طرح کوشش کرتا اور برائی کا برائی سے مقابلہ کرتا ہے۔)

حاتم الطائی:۔

سقی اللہ رب الناس سحاً دیمۃ جنوب السراۃ من مآب الی زغر[5]

---

[1] دیوان نابغہ ص ۸۵۔ [2] دیوان الاعشی ص ۲۳۹۔ [3] دیوان الحماسہ لابی تمام ج ۲ ص ۱۱۰۔ [4] ایضاً ج ۱ ص ۳۴۹۔ [5] دیوان حاتم ص ۱۴

(اللہ تعالیٰ جو مخلوق کا پروردگار ہے۔ آپ سے زعمک جنوب سرات کو برستی ہوئی بدلی سے سیراب کرے۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کی دعا یا بد دعا کے لیے کچھ متعین اصطلاحات تھیں جن کو شعرا عموماً بغیر لغوی معنی کا لحاظ کیے ہوئے استعمال کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ کچھ ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جن میں شاعروں نے اپنی کسی مقصد برآری یا حصول کامیابی کے لیے خدا سے دعا مانگتے ہوئے لفظ اللہ کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً نابغہ الذبیانی خدا سے اپنے ممدوح شاہ حیرہ نعمان کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہوئے کہتا ہے۔

نحن لدیہ نسأل اللہ خلدہ　　　یرد لنا ملکا وللأرض عامرا

(ہم خدا سے اس کی زندگی جاوداں کی دعا کرتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے بادشاہ کو واپس لوٹا دے جو زمین کو آباد کرنے والا تھا۔)

خدا سب سے عظیم ہے، | اب ہم کو دیکھنا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب خدا کو کن طاقتوں اور اوصاف کا حامل سمجھتے تھے۔ اور اس کی جھلک کس حد تک ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری نگاہ سب سے پہلے ان اشعار پر پڑتی ہے جن میں شاعر کا خدا کی عظمت و قدرت پر عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ نابغہ الذبیانی کہتا ہے۔

خلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ　　　ولیس وراء اللہ للمرء مذھب[2]

اس شعر میں نابغہ اپنے مربی کو دھیان دلاتا ہے کہ اب میں نے قسم کھالی ہے۔ چنانچہ تمہارے لیے میں نے شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے اور اللہ کے بعد انسان کی کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں ہے۔ شاعر اس بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ چونکہ اس نے

---

[1] دیوان نابغہ ص ۴۵　[2] ایضاً ص ۱۲

اللہ کی قسم کھائی ہے لہذا اوس کے سرپرست کو اوس پر کامل اعتماد کرنا چاہئے چونکہ اللہ کی قسم کے بعد (جو سب سے عظیم ہے) اس سلسلہ میں دوسری راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہاں لبید کے درج ذیل اشعار بھی قابل توجہ ہیں، شاعر نے لفظ اللہ کے ساتھ ایک ایسی صفت وابستہ کی ہے جس کا مفہوم "عظیم ترین" ہے۔

واکذب النفس اذا حدثتها ... إن صدق النفس يزري بالأمل

غير أن لا تكذبنها في التقى ... واخزها بالبر لله الأجل[1]

(اور نفس کے ساتھ جھوٹ بولو جب اس سے بات کرو کیونکہ نفس کے ساتھ سچ بولنا امیدوں کو کوتاہ کر دیتا ہے۔ ہاں مگر پرہیزگاری اور خدا سے ڈرنے کے بارے میں اس سے جھوٹ نہ بولو اور اللہ جل شانہٗ کے حقوق ادا کرنے میں اسے دباؤ۔)

درج ذیل شعر میں اوس بن حجر کچھ بتوں اور ان کے پیرووں کی قسم کھانے کے بعد اللہ کی بھی قسم کھاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتا ہو کہ اللہ ان سب میں برتر عظیم ہے۔

وباللات والعزى ومن دان دينها ... وبالله إن الله منهن أكبر

(لات وعزی اور ان کے ماننے والوں کی قسم اور اللہ کی قسم۔ بلاشبہ اللہ ان سے بڑا ہے)

خدا ایک ہے ذیل میں لبید کے چند بہت مشہور و اہم مذہبی اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا گیا ہے۔

فوا عجباً كيف يعصى الإله ... أم كيف يجحده الجاحد

وفي كل شيء له آية ... تدل على أنه واحد

ولله في كل تحريكة ... وتسكينة ابداً شاهد

---

[1] دیوان لبید (طبع لیڈن) ص ۱۲۔

شاعر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کیسے کی جا سکتی ہے۔ یا کوئی اس کی ذات سے انکار کس طرح کر سکتا ہے۔ جب کہ ہر چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک ہے۔ اور ہر ساکن و متحرک چیز میں اس کی ذات کی شہادت موجود ہے۔ سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ قبل اسلام کے عربوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے ناموں کا مطلب "اللہ" کا بندہ (عبداللہ) ہوتا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خدا کے ساتھ تعلق کے نظریے پر روشنی پڑتی ہے۔ کچھ اشعار میں بھی اس طرح کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً عبد یغوث اپنے درج ذیل شعر میں عوام کو خدا کا بندہ کہکر مخاطب کرتا ہے۔

احقًا عباد اللہ أن لست سامعًا نشید الرعاء المعزبین المتالیا[1]

(اے اللہ کے بندو! کیا میں اہل و عیال سے دور پڑے ہوئے چرواہوں کی آواز کو واقعی نہیں سنوں گا)

اس طرح ذیل کے شعر میں الاعشی بھی خدا کی قسم کھاتے ہوئے خود کو اس کا بندہ تسلیم کرتا ہے۔

فاقسم باللہ الذی أنا عبدہ لتصطفقن یومًا علیك الماتم

(میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کا میں بندہ ہوں کہ تم پر کسی دن غمزدہ لوگ ضرور تالی بجائیں گے)

(باقی)

---

[1] المفضلیات ج ۱ ص ۱۵۵۔

رجال السند والہند (عربی)

پہلی صدی سے ساتویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی اور صوبہ سندھ کے ان ارباب کمال کا تذکرہ و تعارف جنکی تصنیفی زبان عربی تھی مولفہ۔ قاضی اطہر مبارکپوری۔ قیمت:- عہ

باب التقریظ والانتقاد

دکن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ

جلد اوّل

(۱۲۹۵ء - ۱۵۲۴ء)

از صباح الدین عبد الرحمٰن

ہندوستان میں پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ تاریخ نویسی کا ذوق برطانوی حکومت کے زمانہ میں پیدا ہوا، خود انگریزوں نے اس ملک کی تاریخ لکھنے میں بڑی دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار کیا، اور ہندو اور مسلمان دونوں حکمرانوں کی عہد کی تاریخیں مرتب کیں، اس سلسلہ میں ونسنٹ اسمتھ، الفنسٹن، ہنری ایلیٹ، گرینڈ ڈف، ٹاڈ، راورٹی، ولیم ارسکن، لین پول، فرانسس گلیڈ دن، چارلس اسٹورٹ، بلاخ من، کنگھم، ہیول، پرسی براؤن، رش بروک ولیم، اور ایچ بیورج وغیرہ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے مورخین تھے، جنھوں نے ہمارے ملک کی تاریخ قلمبند کرنے میں اپنے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھا اور سارے تاریخی واقعات کو اس طرح مرتب کیا کہ پڑھنے والوں پر یہ اثر قائم ہو کہ پہلے کی حکومتوں کے مقابلہ میں ان کی حکومت ایک سایۂ رحمت ہے، ہندوؤں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی خاطر مسلمانوں کی حکومتوں کی تاریخ لکھنے میں بڑی رنگ آمیزی کی، تاریخ نویسی ایک معصوم فن تھا، مگر انگریز مورخوں نے اس کو اپنی سیاست کا کھیل بنا دیا، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تاریخی واقعات کو الٹ پلٹ کر کچھ اس طرح لکھا، سمجھایا اور پڑھوایا کہ جو دل

ان واقعات کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے جڑ نہ سکے، لیکن ان کی مصلحت اندیشانہ تاریخ نویسی سے جو مضرت رساں اثرات پیدا ہوئے، ان کا احساس ہندوستانی مورخوں کو ہوا۔ تو اسی دور میں انھوں نے کچھ ایسی تاریخیں لکھیں جن سے یہ تلخیاں بڑی حد تک دور ہوئیں، ان میں ان لا تارا چند، ایشوری ٹوپا، کالکارنجن قانون گو، رام پرشاد ترپاٹھی، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، رام پرشاد کھوسلا اور ایس، کے بنرجی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر آیندہ بھی برابر یاد رکھے جائیں گے،

انگریزوں نے تاریخ کے کچے مواد سے جو استدلال کئے یا ان سے جو نتائج استنباط کئے گئے ان کے اثرات بہت کچھ ابھی تک باقی ہیں، لیکن ہندوستان کے مورخوں کو اس کا احساس بڑھتا جاتا ہے کہ ان کے ماضی کی تاریخ ان ہی کے نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہئے، اس سلسلہ میں ہندو مورخوں کا شعور زیادہ بیدار ہوا، انھوں نے ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ اس طرح مرتب کر دی ہے کہ اس عہد کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آگئی ہیں، ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہونے لگا ہے کہ یہ دور بہت ہی مہذب اور ترقی یافتہ تھا، تاریخ نویسی کا ذوق ہندؤں میں مسلمان حکمرانوں کے زمانے ہی میں پیدا ہوا، اس سے پہلے تاریخ لکھنے سے ان کو دلچسپی نہیں رہی، لیکن موجودہ دور میں انھوں نے اسکی پوری تلافی کر دی ہے، اور نہ صرف ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ لکھنے میں اپنے انہماک کا ثبوت دیا ہے، بلکہ مسلمانوں کے دور حکومت کا بھی کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جسمیں انھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں نہیں دکھائی ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد سے متعلق مسلمان مورخین سے زیادہ انھوں ہی نے کتابیں لکھ کر ڈھیر لگا دی ہیں، اسی لئے ہندوستان کے ہر دور کے ہر موضوع پر تاریخیں بہت کچھ لکھی جا چکی ہیں، اور اور جو باقی ہیں وہ قلمبند ہو رہی ہیں،

مذکورۂ بالا کتاب دکن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی پہلی جلد بھی انہی مساعی جمیلہ کا ایک شاندار نتیجہ ہو، یہ اندھرا پردیش کی حکومت کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اسکی تدوین باضابطہ ایک بورڈ کی طرف سے ہوئی ہے، جس کے اڈیٹر پروفیسر ہارون خاں شروانی اور جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر پی ایم جوشی ہیں، پروفیسر ہارون خاں شروانی کا شمار ہندوستان کے بہت ہی ممتاز اور نمایاں مورخوں میں ہوتا ہے، وہ اپنی تحقیق کی کہنہ مشقی اور نقطۂ نظر کی اعتدال پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ جو کتاب ان کی نگرانی میں شائع ہوگی وہ نہ صرف پورے معیار کی ہوگی، بلکہ امید ہے کہ ہر طبقۂ خیال میں مقبول بھی ہوگی۔

اس تاریخ کے مختلف ابواب کو مختلف مشہور مورخوں نے لکھا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا۔

(۱) عہد وسطیٰ کے دکن کا تاریخی جغرافیہ از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی (۲) دکن میں خلجی اور تغلق از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی اور ڈاکٹر اے مہدی حسن، کلکتہ، (۳) سلطنت معبر از ڈاکٹر پی ایس اے، کیو، حسینی، مدورائی (۴) وجیانگر از ڈاکٹر آر۔ سبرا ینیم حیدرآباد ضمیمہ تاسیس وجیانگر از ڈاکٹر بی بی دیسائی، دھارواڑ، (۵) بہمنی خاندان از پروفیسر ایچ کے شیروانی ضمیمہ، بہمنیوں کے عہد کے اقتصادی اور معاشرتی حالات از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی، (۶) نظام شاہی اور عماد شاہی خاندان از ڈاکٹر رادھے شیام الہ آباد (۷) عادل شاہی اور بریدی حکمراں، از ڈاکٹر پی، ام جوشی بمبئی، ضمیمہ عادل شاہیوں کے دور میں معاشرتی اور اقتصادی حالات از ڈاکٹر پی، ام جوشی بمبئی، (۸) قطب شاہی حکمراں از پروفیسر ہارون خاں شروانی حیدرآباد (۹) خاندیس از ڈاکٹر پی، ام جوشی بمبئی، (۱۰) سلطنت ریڈی اور دوسری چھوٹی ریاستیں، از ڈاکٹر ان راجنش، حیدرآباد (۱۱) مرہٹے از ڈاکٹر اے آر کلکارنی (۱۲) دکن میں مغل ۱۶۲۴ء-۱۶۸۷ء از پروفیسر کے ساجن لال حیدرآباد۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت کے کسی پہلو پر کسی ہندو مورخ کی تحریر سامنے آتی ہے تو اس کے مطالعہ کے وقت یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں اس میں تنقیدوں اور تبصروں کے نیش خار اور نوک سوزن تو نہیں، اسی لئے پہلی نظر تو اس کتاب کے ان ابواب پر گئی جن میں ہندو مورخوں نے دکن کے مسلمان فرمانرواؤں کی تاریخ قلمبند کی ہے، ان کے مطالعہ کے بعد اطمینان ہوا کہ ان مورخوں نے اپنی تحریروں میں توازن اور اعتدال قائم رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے، سلاطین دہلی میں علاء الدین خلجی اور مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب سے متعلق ہندو مورخین کے قلم سے تیز، تند اور زہریلے جملے ضرور نکل جاتے ہیں، علاء الدین خلجی اور ملک کافور نے دہلی کی سلطنت کی توسیع کے سلسلہ میں جنوبی ہند میں جو لشکر آرائی کی وہ مسلمان مورخوں کی نظر میں تو ان دونوں کا بڑا شاندار کارنامہ ہے، جس کو قلمبند کرنے میں ان کا قلم بڑا ہی شگفتہ ہو جاتا ہے، مگر جنوبی ہند کے ہندو مورخین کے قلم سے اس مہم کے ذکر میں ناگواری کا اظہار ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، مگر قلم کی اس شگفتگی اور ناگواری کے اظہار کے وقت یہ سوچنا چاہئے کہ اس سے تاریخ نویسی کی دیانت داری کا حق ادا ہوتا ہے، یا اس میں نسلی تعصب اور شخصی جذبات یا محرورالمزاجی کا دخل ہو جاتا ہے، لیکن زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر پی ایم، جوشی نے خلجیوں کی فوجی سرگرمیوں کی جو تفصیلات لکھی ہیں، ان میں کسی قسم کی ناخوشگواری کا اظہار نہیں ہے، بلکہ واقعات کو واقعات کی حقیقت کی روشنی میں دکھلانے کی کوشش کی ہے، یہ حقیقت شناسی دوسروں کے لئے باعث ہدایت ہو سکتی ہے، جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کی فوجی مہم کا ذکر عصامی نے فتوح السلاطین اور امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر کیا ہے، دیوگیر کے رام دیو کے تعلقات علاء الدین خلجی سے بہت ہی اچھے ہو گئے تھے، عصامی نے اس کا

ذکر "سرفراز ہنود" اور "بندہ خاص درگاہ شاہ" لکھ کر کیا ہے، عصامی کا یہ بھی بیان ہے کہ جب رام دیو علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اس پر موتی نچھاور کیے گئے، دو لاکھ تنگے نذر دیئے گئے، رائے رایان کا خطاب اور کچھ دنوں کے بعد چتر بھی دیا گیا (فتوح السلاطین، آگرہ اڈیشن ص ۲۷۰) شہزادہ خضر خاں کی شادی الپ خاں کی لڑکی سے ہوئی تو اس تقریب جشن میں رام دیو بھی مدعو کیا گیا، وہ اور ہندو راجاؤں کے ساتھ اس میں شریک ہوا، (فتوح السلاطین ص ۳۱۷) اسی سال یعنی ۱۳۱۲ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر بھی ایک فوج بھیجی تو رائے رایان رام دیو نے شاہی لشکر کی ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں اسکی تعریف "رائے اصل برائے اصیل" اور "رائے نیک اصل کہ نہال کردۂ روزگار خلافت پناہ است" لکھ کر کی ہے، اور پھر لکھا ہے کہ جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے ہوئے دیوگیر سے گذرا تو رام دیو نے پورے اخلاص سے شہر دیوگیر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا، اور حکم دیا کہ لشکر کی ضروریات کی تمام چیزیں موجود رہیں، اور اگر شاہی لشکر کے پہلوانوں کو اپنے تیروں کے لئے سیمرغ کے پر کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں تاکہ دھور سمندر اور معبر کو زیر کیا جا سکے، دیوگیر کا بازار بوستان ارم کی طرح آراستہ کیا گیا کہ جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذریں تو انکو معلوم ہو کہ بہشت شداد سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے سجایا گیا، صراف سونے چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں کی دوکانیں لگا رکھی تھیں، پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ان میں بعض تو انار سے زیادہ شیریں اور آم سے زیادہ بہتر تھے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی ہوئی تھیں کہ مناسب قیمتوں پر خریدی جا سکیں، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نه ترکے کرد بر ہندو جفائے شه ہندو را مخالف بود رائے

رائے رایان رام دیونے اپنے ایک فوجی سردار پرسو رام دیو کو ہدایت دی کہ وہ شاہی لشکر کو دھور سمندر تک پہنچانے میں ہر قسم کی مدد کرے، (خزائن الفتوح ص ۱۳۸-۱۳۶)

دھور سمندر کی طرف شاہی فوج بڑھی تو وہاں کے راجہ کے خاندان میں اختلاف تھا، دو بھائی سندر پانڈیا اور ویر پانڈیا تھے۔ دونوں تخت کے دعویدار ہوئے تو سندر پانڈیا نے علاء الدین خلجی کی امداد طلب کی، ویر پانڈیا نے شاہی لشکر کا مقابلہ کیا، پھر صلح کرلی، اور شاہی لشکر کا بہت بڑا معاون ہوگیا، جب فوج نے معبر کی طرف کوچ کیا تو ویر پانڈیا نے اس کی رہبری کی، عصامی اس کو "فخر رایان ہندوستان" بتاتا ہے، اس سے صلح ہوتی ہو تو عصامی لکھتا ہے۔

بسے خدمتے پیش کردہ بلال چہ اسپ و چہ گوہر چہ پیل و چہ مال

رواں شد سوے نائب خاص شاہ بپوسید پایش در اثنائے راہ

ملک کافور بھی اس کے ساتھ بڑی عنایتوں سے پیش آیا، اور خلعت عطا کیا،

چو دیدش ملک نائب سرفراز کہ دشمن شکن بود و مہماں نواز

بہ صد پرسش عذر بنواختش چو صاحب کلاہان سرافراختش

یکے خلعت زرنگار اشنا بہ داد در لطف و اکرام بر وے کشاد

کچھ دنوں کے بعد راجہ بلال یعنی ویر بلال دیو سے کہا گیا کہ جب وہ شاہی لشکر کا دل و جان سے یار ہوگیا ہے، تو وہ معبر کی طرف لشکر کشی میں شاہی فوج سے تعاون کرے، وہ اس کے لئے راضی ہوگیا، عصامی نے راجہ کو فخر رایان ہندوستان اور فخر ہندوستان کہا ہے، (فتوح السلاطین ص ۲۸۷)

پس از ہفتہ گفتش آں کامراں کہ اے فخر رایان ہندوستاں

تو چو از دل و جاں شدی یارِ ما | دل و جانِ تو با دعشرت گرا
کنوں بشنو اے فخر ہندوستاں | چنیں است فرمانِ شاہِ جہاں
کہ ایں یار ہمراہ لشکر شوی | زنی کوس و در سمتِ معبر شوی

اس کے بعد معبر بھی فتح ہو گیا، اس طرح دھور سمندر اور معبر کی فتوحات میں راجہ رام دیان رام دیو، پرس دیو دلوے اور راجہ ویر بلال کا بھی تعاون رہا، اس قسم کے واقعات کے ذکر سے ہندوستان میں جذباتی ہم آہنگی کی موجودہ تحریک کو مدد مل سکتی ہے، ڈاکٹر پی ام جوشی نے اپنے مقالہ میں خزائن الفتوح اور فتوح السلاطین کے حوالے تو دیئے ہیں لیکن مذکورۂ بالا تفصیلات کو معلوم نہیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے، انھوں نے یہ لکھا ہے کہ مدورا کے حملے میں ملک کافور کو وکرم پانڈیا سے شکست ہوئی، (ص ۸۴) لیکن اس کی تائید معاصر فارسی تاریخوں سے نہیں ہوتی ہے، ان کے محتاط قلم سے دیوگیر کے ذکر میں یہ تحریر بھی نکل پڑی ہے کہ پہلے تو اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں اس مذہب کا قبول کرنا مرضی کے مطابق رہا، لیکن بعد کو سیاسی قوت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی تو تبلیغ کی سرگرمیوں میں مبلغین اور حکمرانوں نے شاید مقابلۃً جارحانہ پالیسی اختیار کی، (ص ۱۹۱) اس کے لئے فاضل مورخ نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، اور لفظ شاید لکھ کر اس حقیقت کے عدم وثوق کا بھی اظہار کر دیا ہے، لیکن اس غیر مستند بات کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ایسی باتیں قلمبند کرنے سے خواہ مخواہ مذہبی اور نسلی نفرت پھیلتی ہے، مورخ کا مقصد باہمی نفرت پھیلانا ہرگز نہ ہونا چاہیئے، اسی خیال سے انھوں نے بھی بہمنی حکمرانوں کے عہد کے معاشرتی اور اقتصادی حالات کے عنوان کے باب میں لکھا ہے کہ ہندو مذہب کو مسلمان حکمراں مخالفانہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے، (ص ۲۰۰) گو وہ اسی باب میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اس زمانہ میں عام

ہندوؤں اور خصوصاً برہمن حکمراں طبقہ کے ذبیحۂ گاؤ اور کبھی کبھی ان کی بت شکنی کی سرگرمیوں سے سراسیمہ رہے، (ص ۲۰۹) اس کتاب کے فاضل اڈیٹر پروفیسر ہارون خاں شروانی کو بھی اسکا احساس ہے کہ اس قسم کی تحریر مضرت رساں ہوتی ہے، اسی لئے اس باب میں محمد بن تغلق کے عہد میں ہر ہیرا اور بکہ کے قبول اسلام کا ذکر آیا ہے، تو انھوں نے اس کے نیچے یہ حاشیہ لکھدیا ہے کہ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے (ص ۲۰۵) نئی تحقیقات میں جبری تبلیغ اسلام بت شکنی اور انہدام مندر ایک فرسودہ موضوع ہو چکا ہے، ان کا ذکر کرکے با وقار تحریر کو محض داغدار کرنا ہے،

ڈاکٹر کے، ساجن لال نے اس کتاب کے بارھویں باب میں دکن میں اورنگ زیب کی سرگرمیوں کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ مختصر ضرور ہے، لیکن بہت ہی جامع اور پُر مغز ہے، اس سے بیجاپور اور گولکنڈہ سے متعلق اس مغل بادشاہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں دور ہو جائینگی ڈاکٹر ساجن لال نے یہ دکھایا ہے کہ ان ریاستوں کے خلاف اورنگزیب کا رویہ کسی مذہبی تعصب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ خالص سیاسی اور اقتصادی اسباب کارفرما ہے (صلہ ۳-۶۰۲) انھوں نے عام مورخوں کی طرح اورنگ زیب کے متعلق ناخوشگوار اور نا روا الفاظ بھی استعمال نہیں کئے ہیں، بلکہ پورا باب مورخانہ سنجیدگی اور ناقدانہ متانت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے، وہ اورنگ زیب سے متعلق جادو ناتھ سرکار کی مخالفانہ رائے سے متاثر نظر نہیں آتے، ورنہ عام طور سے مورخین اورنگ زیب کو جادو ناتھ سرکار ہی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، جنھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں یہ لکھ کر دکھائی ہیں، کہ اورنگزیب حکمراں کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا' (اسٹڈیز ان موغل انڈیا جادو ناتھ سرکار ص ۲-۶۰۰) اس ریویو میں یہ بات اپنے موضوع

سے ہٹ کر آجائیگی، اگر یہاں پر یہ قلمبند کیا جائے کہ جادو ناتھ سرکار صرف اورنگزیب کو برا کہنے پر اکتفا کرتے تو یہ سمجھا جاتا کہ مورخ کی حیثیت سے ان کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق تھا مگر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "ہسٹری آف اورنگزیب" کی تیسری جلد کے ۳۴ ویں باب "اسلامک اسٹیٹ چرچ ان انڈیا" میں اسلام اور اسلامی حکومت کا جو تخیل ادھر اُدھر کے غیر مستند حوالوں سے پیش کیا ہے، اسکو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اورنگزیب کی آڑ لیکر اسلام اور اسلامی تاریخ کو بھی بدنام بلکہ مسخ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس میں انھوں نے جہاں اور بہت سی دل آزار باتیں لکھی ہیں وہاں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے، جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں...... ایک مذہب جو اپنے پیرؤں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے، (جلد سوم صفحہ ۲۸۳-۲۶۴) یہ [illegible] تحریر صرف انگریزوں کو خوش کرنے کیلئے لکھی گئی، کیونکہ وہ اپنی ہی کتاب کی جلدوں صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں

"اورنگزیب کے عہد حکومت میں جب مغلوں کا ہلال بدر کامل ہو گیا تھا، زوال دکھائی دینے لگا، اور ایک نئی صبح کی روشنی ہمارے سیاسی آسمان پر ظاہر ہونے لگی، ہمارے ملک کے مستقبل کے مالکوں نے اس سرزمین میں مستحکم اور محفوظ قدم جما لیا، مدراس اور بمبئی میں ۱۶۵۳ء اور ۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کے ماتحت دو پریسیڈنسیاں ہو گئیں اُن پناہ گاہوں کی وجہ سے یوروپینوں نے سلطنت کے اندر سلطنت بنالی، اور وہاں محفوظ ہو کر ملک کی اندرونی قوتوں کی خلاف ورزی کرنے لگے، یہاں جا بجا سوداگروں نے مشرقی حکومت اور قانون سازی میں اپنے تجربے شروع کر دیئے، رفتار زمانہ کے ساتھ ان تجربوں سے ایک ایسا امپائر وجود میں آیا، جو رومن امپائر سے بڑا تھا اور چارلس پنجم کے امپائر سے زیادہ

آباد تھا، اور اس میں ایسا متمدن اور ترقی پسند نظام سلطنت قائم ہوا جس کی مثال
نہ عہد قدیم اور نہ دور جدید میں دنیا پیش کر سکی"

انگریزوں کی حکومت کی مدح سرائی کی خاطر وہ ہسٹری آف اورنگزیب کی پانچ اور فال آف دی موغل امپائر کی چار جلدوں میں واقعات کی ماہرانہ تنظیم و ترتیب کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے گئے ہیں کہ ہسٹری آف اورنگ زیب سے تو ہندوؤں کو مسلمانوں اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے باہمی نفرت پیدا ہوتی ہے، اور فال آف دی موغل امپائر میں راجپوتوں کو مرہٹوں اور مرہٹوں کو راجپوتوں اور مسلمانوں کو مرہٹوں اور مرہٹوں کو مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز جذبات ابھرتے ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے دور حکومت کے مورخوں کی تحریروں سے آج کل کے ہندوؤں کو اشتعال پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جادوناتھ سرکار کی تحقیقاتی سرگرمیوں سے تکدر اور آزردگی پیدا ہونا ناگزیر ہے، آگے چل کر جب ہندوستان کی تاریخ کے تحقیقاتی گوشے بہت ہی صاف اور واضح ہو کر ناظرین کے سامنے آئیں گے، تو جادوناتھ سرکار کی ساری تحقیقات ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تشکیل اور فروغ میں بہت ہی مضرت رساں قرار دیجائیں گی، مگر ابھی تو عام مورخوں کے دماغ اور تحقیقات پر اورنگزیب سے متعلق جادوناتھ سرکار نے جو ذہن بنایا ہے وہی چھایا ہوا ہے، حالانکہ مولانا شبلی کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ عالمگیر کی جو تصویر اسکے مخالفوں نے کھینچی ہے اس میں تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھر گیا ہے، موجودہ دور کے مورخین اورنگ زیب سے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے وہ سوچیں کہ وہ تاریخ نویسی کا حق ادا کر رہے ہیں یا اپنے ذاتی تعصب اور عداوت کا رنگ بھر رہے ہیں؟

زیر نظر کتاب میں جادوناتھ سرکار کے حوالے کافی آئے ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے مغلوں یا اورنگزیب سے متعلق تعصب اور عداوت کا رنگ نہیں آنے پایا ہے، البتہ اس کتاب کے

گیارھویں باب میں ڈاکٹر رائے آر کلکارنی نے سیواجی کی تاجپوشی کے سلسلہ میں جو حسب ذیل باتیں لکھی ہیں، وہ اگر نہ لکھتے تو ان کی پوری تحریر کے وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"سیواجی کی تاجپوشی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے سبھاسد نے لکھا ہے کہ ابتک اس عہد میں زمین پر ملیچھ شاہنشاہی حکومت کرتے رہے لیکن اب ایک پہلا مرہٹہ بادشاہ ہوا جس نے شہنشاہ کا رتبہ اختیار کیا، یہ واقعہ معمولی اہمیت کا نہ تھا۔" (ص ۱۰۵)

ایسی تحریر تو جادوناتھ سرکار ای کے بنائے ہوئے ذہن کی عکاسی کرتی ہے تعجب ہوتا ہے کہ اب بھی ایسے مورخین ہیں جو ایسی تحریریں لکھ جاتے ہیں مثلاً موجودہ دور میں آر۔ سی موزمدار بہت ہی لائق مورخ سمجھے جاتے ہیں وہ ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل کی جلد پنجم کی تمہید (ص ۲۷) میں لکھتے ہیں۔

"گیارہویں صدی کے شروع ربع میں ہندوستان کے لئے ایک بڑا المیہ پیش آیا یا لیا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے، اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت انسان کی [illegible] جاتی رہی، بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقے سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا جہاں سے انکو اندرون ملک کیلئے ایک شاہراہ مل گئی،.... کچھ ہندوؤں نے مسلمانوں کو شکست دی اور انکی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا، ان راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں (یعنی مسلمانوں) کو نکال باہر کیا ہے تاکہ یہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو، اور یہ آریاؤں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اسلئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے ہندو راجاؤں نے مل کر اسکی کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیتے اپنے گوشت سے کانٹا نکال پھینکنے کے بہت سے مواقع آئے جبکہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا.... لیکن وہ تو ہندوستانی راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرے کی توسیع کی فکر میں لگے رہے"

اور انھوں نے اس قومی فریضہ کے انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی، کہ ایک غیرملکی مذہب کے پیرو نی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کراتے "

مورخوں کی اس قسم کی دل آزار تحریروں سے ہندوستان کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی، مورخوں کو اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا پورا حصہ ادا کرنا ہے خوشی کی بات ہے کہ زیر نظر کتاب میں ایسی ناخوشگوار باتیں حتی الامکان لکھنے سے پرہیز کیا گیا ہے جس کے لئے اس کے مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں،

زیر نظر کتاب میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے دو مقالات "بہمنی" اور "قطب شاہی" کے عنوانات سے ہیں، وہ دکن کی تاریخ کے بہت ہی مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کے سلاطین خصوصاً بہمنی اور قطب شاہی فرمانرواؤں کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی حالات لکھ کر ان کے کارناموں کو موجودہ دور میں زندہ جاوید کر دیا ہے ان کی تحریروں میں قابل قدر متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے، اس کتاب میں ان دو خاندانوں کی تاریخ قلمبند کرکے اپنی تحریر کے ایجاز کا اعجاز دکھایا ہے، ان کے اجمال میں ساری تفصیل آگئی ہے، ڈاکٹر اس اے کیو حسینی نے معبر کی تاریخ تذکروں اور کتبات سے مرتب کر دی ہے، ان کی یہ محنت اور کاوش ان مورخوں کے لئے باعث عبرت ہے جو اپنی تحقیقات میں سہل انگاری سے کام لینے کے عادی ہوگئے ہیں، جس طرح ڈاکٹر پی ایم جوشی نے بہمنی اور عادل شاہی حکمرانوں کے عہد کے معاشرتی اور اقتصادی حالات قلمبند کرکے اس کتاب کو باوزن بنایا ہے، اسی طرح ڈاکٹر رادھے شیام کے مقالے نظام شاہی اور عماد شاہی حکمرانوں کے عہد میں بھی اقتصادی اور معاشرتی حالات کی تاریخ قلمبند کر دیجاتی، تو اس کتاب میں کوئی کمی باقی نہ رہتی،

تمام مقالات پورے تاریخی شواہد اور اسناد کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، مگر حوالوں میں ثانوی ماخذوں کی بھی فراوانی ہے، جس سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں آیندہ معاصر ماخذوں کی اہمیت ثانوی ماخذوں کی کثرت سے نظر انداز نہ ہو جائے،

پوری کتاب ۶۵۳ صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں دکن کا ایک نقشہ بھی منسلک کر دیا گیا ہے، قیمت ایک سو دس روپیے ہے، پرنٹنگ اینڈ پبلیکیشن بیورو گورنمنٹ آف اندھرا پردیش، چنچل گوڑا، حیدر آباد ۲۶ ... ۵ سے مل سکتی ہے،

یہ کتاب جس محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے کسی بھی کتب خانہ کے لئے زینت بن سکتی ہے۔

سلسلۂ تاریخ ہند کی چند کتابیں

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ ہندو اور مسلمان اہل قلم اور مورخوں کے قلم سے، قیمت ۱-۱۳ روپیے،

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس عہد کے فوجی نظام، مثلاً آلات حرب، فوجوں کی صف آرائی، میدان جنگ، فوجی عہدہ داروں کے فرائض، [illegible] کی نہایت دلچسپ تفصیل۔ قیمت ۱-۱۲ روپیہ ۷۵ پیسے

ہندوستان کے سلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

سلاطین دہلی اور شاہان مغل کے عہد کے تمدن و معاشرت، تقریبات اور فنون لطیفہ وغیرہ کی تفصیل، قیمت ۶ روپیے ۲۵ پیسے،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

سلاطین دہلی اور شاہان مغل کے فن تعمیر، باغات، پرورش حیوان، تعلیمی ترقی وغیرہ پر مختلف اہل قلم کے مضامین، قیمت ۵۰-۵-۸ مرتبہ ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، "منیجر"

مطبوعات جدیدہ

معراج العاشقین کا مصنف ۔ از، ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۸۰، قیمت تحریر نہیں، غالباً مصنف سے شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ملے گی۔

اسمیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحؒ کی جانب معراج العاشقین کی نسبت کو غلط قرار دیکر اسے دکن کے بارہویں صدی کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، معراج العاشقین کو ۱۳۴۳ھ مین بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے شائع کیا تھا، اور اسکے مقدمہ میں اسکو خواجہ بندہ نواز رحؒ کی تصنیف بتایا تھا۔ لیکن اب شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مولوی صاحب کے خیال کی تردید کی ہے اور بڑی تحقیق و کاوش، خارجی و داخلی شہادتوں اور قرائن سے ثابت کیا ہے کہ یہ خواجہ صاحب کے بجائے مخدوم حسینی کی تصنیف ہے، مصنف کے دلائل میں وزن نظر آتا ہے، مگر آیندہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کی یہ تحقیق ارباب نظر کے حلقہ مین کہان تک صحیح قرار دی جاتی ہے، اس کی اشاعت سے اردو زبان و ادب میں ایک مفید ادبی و تحقیقی کتاب کا اضافہ ہوا۔

نقشِ ناتمام ۔ از- جناب مانوس سہسرامی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت عہ، پتہ۔ مصنف سے محلہ اِلی آدم خان سہسرام، (رہتاس، بہار)

جناب مانوس سہسرام ضلع رہتاس بہار کے معمر شاعر ہیں، انکا پہلا مجموعہ کلام "ساز الم" کے نام سے چھپا تھا، اب انہوں نے یہ دوسرا مجموعہ "نقشِ ناتمام" کے نام سے شائع کیا ہے، اسکا زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، آخر مین چند رباعیاں اور دو نظمین ہیں، مانوس صاحب کی تعلیم زیادہ نہیں ہے، مگر ان میں شعر و سخن کی فطری صلاحیت ہے، انکی زندگی کلفت و عسرت میں بسر ہوئی ہے، اسکی جھلک انکے کلام میں بھی نظر آتی ہے، تاہم یاس و غم کے ماحول میں امید و رجا کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے، یہ مجموعہ انکے شاعرانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے، کلام میں بعض ناہمواریوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے اہل ذوق کے لطف کا سامان ہے، شروع میں عبدالغنی صاحب استاد پٹنہ یونیورسٹی نے ان کی

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی
...ابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو
...لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر
...ل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵/- شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکا...
...ر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت
...مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا۔ یہ
...ان کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں ان کے حالاتِ زندگی
...ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی
...قات کے بعد ان میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے
...اتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ: قاضی تلمذ حسین مرحوم

منیجر